بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر مظہری جلد ہفتم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیرِ اہتمام: اِدارہ ضیاء المصنفین ۰ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور — کراچی — پاکستان

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد ہفتم)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ
	مولانا محمد انور مگھالوی
	فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

فیکس:۔ 042-7238010

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۃ الفرقان

آیاتھا ۷۷ | سُوْرَۃُ الْفُرْقَانِ مَکِّیَّۃٌ ۲۵ | رکوعاتھا ۶

(سورۃ الفرقان مکی ہے اور اس کی ستتر آیتیں اور چھ رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا ۙ۝۱

"بڑی (خیرو) برکت والا ہے ۱؎ وہ جس نے اتارا ہے الفرقان ۲؎ اپنے (محبوب) بندہ پر تا کہ وہ بن جائے سارے جہان والوں کو (غضب الٰہی سے) ڈرانے والا ۳؎"

۱؎ تَبٰرَكَ یہ برکۃ سے باب تفاعل ہے۔ اور برکت کا معنی کثرت خیر ہے۔ یعنی تَکَاثَرَ خَیْرُہٗ۔ (اس کا خیر بہت زیادہ ہے) اس صیغہ سے اور مشتقات نہیں بن سکتے اور نہ ہی یہ صیغہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کے لئے استعمال ہوسکتا ہے حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے، ہر قسم کی برکت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اس طرح حسن نے بھی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ اپنی صفات اور افعال میں ہر چیز سے زائد اور بلند ہے۔ کیونکہ برکت زیادتی کے معنی کو متضمن ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ضحاک نے اس کا معنی تعظم کیا ہے (۱)۔

۲؎ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ فرقان مصدر ہے۔ جب کوئی دو چیزوں کے درمیان فاصلہ کردے تو کہتے ہیں فَرَّقَ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ۔ قرآن کریم کا نام فرقان اس لیے ہے کہ یہ اپنی وضاحت سے حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ اور اپنے اعجاز سے حق اور باطل کو جدا جدا کرنے والا ہے یا پھر فرقان کہنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ نزول کے اعتبار سے اس کے بعض اجزاء بعض سے جدا جدا ہیں۔ (یعنی قرآن

(۱) امام مالک اور شیخین نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی ہشام بن حکیم کو سورۂ فرقان پڑھتے سنا۔ تو میں نے اسے ایسے کثیر الفاظ پر اس کی قرأت کرتے سنا جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔ پس قریب تھا کہ میں نماز کے دوران ہی اسے دبوچ لیتا لیکن میں نے صبر کیے رکھا لیکن جونہی اس نے سلام پھیرا تو میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور پوچھا تجھے یہ سورت کس نے پڑھائی ہے جو ابھی میں نے تجھ سے سنی ہے۔ اس نے جواب دیا مجھے رسول اللہ ﷺ نے سورت پڑھائی ہے۔ تو میں نے کہا تو جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ مجھے تو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح نہیں پڑھائی جیسے تو نے پڑھی ہے۔ چنانچہ میں اسے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں لے گیا۔ وہاں جا کر عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں نے اسے ایسے حروف پر سورۂ فرقان پڑھتے سنا ہے جن پر آپ نے مجھے نہیں پڑھائی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ہشام! پڑھو۔ چنانچہ اس نے ایسے ہی پڑھ کر سنائی جیسے میں نے اس سے سنی تھی۔ تو سن کر آپ ﷺ نے فرمایا اسی طرح ہے۔ اسی طرح یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے مجھے فرمایا اب تم پڑھو۔ چنانچہ میں نے ایسے ہی قرأت کی جیسے آپ نے مجھے پڑھائی تھی۔ تو آپ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر فرمایا یہ قرآن کریم سات قرأتوں (لہجوں) پر نازل ہوا ہے۔ ان میں سے جو آسان لگے اسی کے مطابق اسے پڑھو۔

کریم متفرق طور پر نازل ہوا اس لیے اسے فرقان کہا گیا) اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے قول تَبٰرَكَ کو انزال القرآن پر مرتب کیا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اس میں خیر کثیر ہے اور اس لیے بھی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت ورفعت پر دلالت کرتا ہے۔

۳ عَلٰى عَبْدِهٖ سے مراد حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ ہیں۔ تاکہ وہ بندہ یا فرقان عام جن وانس کے لیے ڈرانے والا ہو جائے۔ اور رسالت کا عام ہونا آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔ اور نذیراً بمعنی منذر یا انذار ہے جیسے نکیر بمعنی انکار ہے۔ یہ جملہ اگرا اہل مکہ کے انکار کے محل میں ہے جو اس کا مخاطب ہیں حالانکہ صلہ کا معلوم ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن یہ جملہ قوت دلیل کی وجہ سے صلہ معلوم کے قائم مقام ہے۔

الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا۝

''وہ جس کے لئے حکومت ہے آسمانوں اور زمین کی ۱؎ اور نہیں بنایا ہے اس نے کسی کو بیٹا اور نہیں اس کا کوئی شریک سلطنت میں ۲؎ اور اس نے پیدا فرمایا ہے ہر چیز کو۔ پس اس نے مقرر کیا ہے ہر چیز کا ایک اندازہ ۳؎''

۱؎ یعنی اس کی سلطنت زمین وآسمان میں ہے۔ اس آیت میں الَّذِی اسم موصول پہلے موصول سے بدل ہے۔ اور لِیَكُوْنَ کے قول سے بدل اور مبدل منہ کے درمیان فاصلہ جائز ہے۔ کیونکہ مبدل منہ یعنی موصول صلہ کے ساتھ اور صلہ کے متعلقات میں سے اس کا قول لِیَكُوْنَ مبدل منہ کے لیے علت ہے۔ گویا مبدل منہ اس کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ موصول کو مرفوع بنانا بھی جائز ہے۔ اس صورت میں اس سے پہلے هُوَ مبتدا مقدر ہوگا۔ یا پھر موصول منصوب ہوگا۔ اس صورت میں اس سے پہلے اَعْنِیْ یا اَمْدَحُ فعل مقدر ہوگا۔

۲؎ اور اس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا جیسا کہ عیسائیوں کا گمان ہے۔ اور نہ ہی اس کی سلطنت میں کوئی شریک ہے۔ جیسا کہ مجوسی اور بت پرست کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنے لیے مطلق سلطنت اور بادشاہی کو ثابت کیا ہے اور جو بھی اس میں قائم مقام (مقابل) ہو سکتا ہے اس کی نفی کر دی ہے۔ پھر اس کے بعد ان امور کا ذکر فرمایا جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔

۳؎ یعنی اس نے ہر چیز کو اس میں ایک خاص اندازہ کا لحاظ رکھتے ہوئے پیدا فرمایا مثلاً اللہ تعالیٰ کا انسان کو مخصوص مواد سے معینہ اشکال وصور پر پیدا کرنا وغیرہ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ہر شئی کو ان خصائص اور افعال کے لیے مکمل طور پر بنایا اور تیار کیا جس کا اس نے اس کے لئے ارادہ فرمایا مثلاً انسان کو فہم وادراک، نظر وفکر، متنوع صنائع کے استنباط اور مختلف اعمال کی کوشش اور جدوجہد کے لیے تیار کرنا وغیرہ۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مقررہ مدت تک باقی رکھنے کے لیے اسے مقرر فرمایا۔ اور کبھی خلق کا اطلاق سبب اشتقاق کا لحاظ رکھے بغیر صرف ایجاد پر بھی ہوتا ہے۔ تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شئی کو ایجاد کیا اور اس کی ایجاد میں ایک اندازہ مقرر کیا تا کہ وہ متفاوت نہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شئی کے لیے عمر، عمل اور رزق کے اعتبار سے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ اور یہ مقادیر (اندازے) اسی طرح جاری ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے بنائے۔ جب کلام توحید اور نبوت کے اثبات کو شامل ہے تو اللہ تعالیٰ نے منکرین کا رد کیا اور ان کے معبودان باطلہ کا نقص اور عیب بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ وَ لَا یَمْلِكُوْنَ

لَا أَنفُسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا حَيٰوةً وَلَا نُشُورًا ﴿٣﴾

''اور بنا رکھے ہیں انہوں نے خدائے برحق کو چھوڑ کر ایسے خدا جو پیدا نہیں کر سکتے کسی چیز کو لے اور وہ خود پیدا کئے گئے ہیں ۲ے اور نہیں قدرت رکھتے اپنے آپ کو نقصان (سے بچانے) کی اور نہ نفع پہنچانے کی ۳ے اور نہیں طاقت رکھتے کسی کو مارنے کی اور نہ زندہ کرنے کی اور نہ مرنے کے بعد جلانے کی ۴ے''

لے وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ سے مراد وہ منذرین (جنہیں ڈرایا گیا ہے) ہیں جن پر نذیر کا قول دلالت کرتا ہے، یعنی کفار مکہ نے غیر اللہ کو الٰہ بنالیا ہے۔ یہ جملہ تَبٰرَكَ کے قول پر معطوف ہے۔ من دونہ میں مِن زائدہ ہے۔ اور یہ ''اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا'' کے قول سے حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ ''اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا'' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ جواہر، اعراض، اعمال اور احوال میں سے کسی کو بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ جملہ اٰلِهَةً کی صفت ہے۔

۲ے اس اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شئی کو پیدا فرمایا ہے۔ یہ معنی تمام معبودانِ باطلہ کو شامل ہے۔ اور اگر اٰلِهَةً سے مراد بت ہوں تو پھر یہ معنی بھی جائز ہے کہ انہیں گھڑا جاتا ہے اور ان کی شکلیں بنائی جاتی ہیں۔ یعنی انہیں یہ شکلیں اور صورتیں ان کی عبادت کرنے والوں کے کسب سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ جملہ ماسبق کلام پر معطوف ہے یا حال ہے۔ یہاں استحضار کے لیے مضارع کا صیغہ ماضی کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

۳ے اور وہ قدرت نہیں رکھتے ضرر کو دور کرنے کی۔ اس سے مراد یہ ہے وَإِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ (اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے نہیں بچا سکتے) اور نہ ہی نفع لانے کی۔ یہ حال ہے بتوں کا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شئی کا یہی حال ہے۔ بیشک حضرت عیسیٰ علیہ السلام، عزیر علیہ السلام اور ملائکہ اپنے علو مرتبہ کے باوجود اپنے نفسوں کے لیے نفع اور نقصان کی قدرت نہیں رکھتے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۖ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ (آپ کہئے نہیں مالک ہوں میں اپنے آپ کے لیے نفع کا اور نہ ضرر کا مگر جو چاہے اللہ تعالیٰ اور اگر میں (تعلیم الٰہی کے بغیر) جان لیتا غیب کو تو خود ہی بہت جمع کر لیتا خیر سے اور نہ پہنچتی مجھے کوئی تکلیف)

۴ے یعنی وہ کسی کو مارنے کی قدرت نہیں رکھتے اور نہ ہی کسی کو پہلی مرتبہ زندہ کرنے کی اور نہ ہی دوسری مرتبہ زندہ کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یہ امور الوہیت کے لوازمات میں سے ہیں۔ لہٰذا جس میں ان کی قدرت نہیں وہ الٰہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں اس طرف اشارہ موجود ہے کہ بیشک الٰہ کے لیے بعث (دوبارہ اٹھانے) اور جزاء دینے پر قادر ہونا واجب ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ﴿٤﴾

''اور کہنے لگے کفار لے کہ نہیں یہ (قرآن) مگر محض بہتان جو گھڑ لیا ہے اس نے اور مدد کی ہے اس کی اس معاملہ میں ایک دوسری قوم نے ۲ے سو یہ (کہہ کر) انہوں نے بڑا ظلم کیا ہے۔ اور سفید جھوٹ بولا ہے ۳ے''

لے اس کا عطف اِتَّخَذُوْا پر ہے۔ اس میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نبوت کا انکار اسی طرح کفر ہے

جیسے توحید کا انکار کفر ہے۔اس لیے کہ حقیقت توحید صرف عقل سے سمجھی نہیں جاسکتی بلکہ اس کا ادراک شریعت سے حاصل ہوتا ہے۔کیا آپ فلاسفہ اوران کی مثل لوگوں کے بارے نہیں جانتے کہ وہ الٰہیات میں بغیر غوروفکر کے کیسے کیسے کام کرتے رہے یہاں تک کہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔صحیحین میں وفد عبدالقیس کے قصہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا"کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ کے ساتھ ایمان لانے کا مطلب کیا ہے؟" تو انہوں نے عرض کی اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ۔تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا تم شہادت دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔"الحدیث(1)

۲۔وہ قرآن جو محمد ﷺ لے کر آئے۔(وہ نہیں ہے) مگر جھوٹ جس سے کسی وجہ سے منہ پھیرلیا گیا ہے۔یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے جیسا کہ محمد ﷺ کہتے ہیں۔بلکہ آپ ﷺ نے اسے گھڑا ہے۔اور محمد ﷺ کی قرآن گھڑنے پر ایک (دوسری قوم نے) مدد کی ہے۔مجاہد نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں۔اورحسن نے کہا ہے کہ اس سے مراد عبید بن الحصر الحبشی الکاھن ہے۔(2) یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد جبر، یسار اور عداس ہیں جو مکہ مکرمہ میں اہل کتاب کے غلام تھے۔مشرکین کا گمان یہ تھا کہ محمد ﷺ ان سے قرآن اخذ کرتے ہیں۔

۳۔یعنی یہ بات کہنے والوں نے ظلم کیا ہے اس طرح کہ انہوں نے کلام معجز کے بارے میں کذب، من گھڑت اور یہود سے اخذ شدہ ہونے کا فیصلہ کیا۔(اور یہ سفید جھوٹ ہے) اس اعتبار سے کہ انہوں نے افتراء کی نسبت اس کی ذات کی طرف کی ہے جو اس سے بری ہے۔علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اتی اور جآء دونوں مطلق فعل کے معنی میں ہیں اور اس کے متعدی ہونے کے سبب یہ متعدی ہوتے ہیں(3) (لہٰذا ظلما اور زورا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں) اور یہ قول بھی ہے کہ یہ دونوں حرف جر کے حذف کے سبب منصوب ہیں۔تقدیر عبارت یہ ہے "فَقَدْ جَآءُوْ بِظُلْمًا وَّزُوْرًا"

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝

"اور کفار نے کہا یہ تو افسانے ہیں پہلے لوگوں کے، اس شخص نے لکھوالیا ہے انہیں۔پھر یہ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اسے ہر صبح وشام (تاکہ از بر ہوجائیں)۔"[1]

[1] اس کا عطف "قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا" پر ہے۔یعنی ان میں سے بعض نے کہا۔اس سے مراد نضر بن حارث ہے کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے۔بلکہ یہ ان قصص میں سے ہے جو پہلے لوگوں نے لکھے ہیں مثلاً قصہ رستم اور اسفندیار وغیرہ۔اور اسے محمد ﷺ نے جبر، یسار، عداس اور ان جیسے لوگوں سے لکھوایا ہے۔پس یہ افسانے پڑھ کر سنائے جاتے ہیں تاکہ وہ انہیں یاد کرلیں کیونکہ آپ تو امی ہیں، نہ لکھنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی کتاب سے پڑھ سکتے ہیں۔

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

"آپ فرمایئے اتارا ہے اس کو اس (خدا) نے جو جانتا ہے آسمانوں اور زمین کے سارے رازوں کو واقعی وہ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔"[1]

1۔صحیح ... تعلیم ... 2۔تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔تفسیر بیضاوی زیر آیت ہذا

لے یہ جملہ مستانفہ ہے کیونکہ یہ مَا ذَا اَقُوْلُ لَهُمْ کے جواب میں ہے۔ یعنی آپ انہیں ان کی بات رد کرتے ہوئے فرمائیے معاملہ اس طرح نہیں جیسے تم نے کہا ہے بلکہ اسے اس نے نازل کیا ہے جو زمین وآسمان کے رازوں کو جانتا ہے۔ جیسا کہ اس کا ان کے بُلغاء کو اپنا معارض لانے سے عاجز کر دینا اور اس کا ایسے علوم پر مشتمل ہونا جنہیں کوئی نہیں جانتا مگر وہی اللہ تعالیٰ جو رازوں اور خفیہ چیزوں کو جاننے والا ہے۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ تم یہ کیسے فیصلہ کرتے ہو۔ یہ متقدمین یا متاخرین میں سے کسی بشر کا کلام ہے۔ س لیے وہ تمہیں ان باتوں پر جلدی سزا نہیں دیتا جو تم کہتے ہو حالانکہ وہ اس پر مکمل قدرت رکھتا ہے اور تم اس سزا کے مستحق بھی ہو۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۙ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ

''اور کفار بولے کیا ہوا ہے اس رسول کو کہ کھانا کھاتا ہے اور چلتا پھرتا ہے بازاروں میں لے، ایسا کیوں نہ ہوا کہ اتارا جاتا اس کی طرف کوئی فرشتہ اور وہ اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا ۲''

لے اس کا عطف ''قَالُوْا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ'' پر ہے۔ یعنی انہوں نے نبوت کا انکار کرتے ہوئے اپنے استدلال میں یہ کہا ''مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ'' کیا ہے یہ جو رسالت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس میں حقارت اور تمسخر پایا جا رہا ہے۔ یہ ایسے ہی کھانا کھاتا ہے جیسے ہم۔ یہ جملہ مشار الیہ سے حال ہے اور اس میں عامل معنی اشارہ ہے۔ اور وہ ہماری طرح بازاروں میں چلتا ہے۔ یعنی اگر یہ نبی ہوتا تو یقیناً دوسرے لوگوں سے ممتاز ہوتا۔ لیکن اس طرح نہیں ہے۔ لہٰذا یہ نبی بھی نہیں ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے تم فرشتے تو نہیں ہو کیونکہ تم کھاتے ہو اور فرشتہ تو نہیں کھاتا۔ اور تم بادشاہ بھی نہیں ہو کہ وہ بازار میں نہیں چلتا، حالانکہ تم چلتے ہو اور کاروبار بھی کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ ان کا یہ کلام فاسد ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرشتہ ہونے یا بادشاہ (سلطان) ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ بلکہ آپ ﷺ نے تو یہ کہا تھا اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (کہ میں بشر ہی ہوں تمہاری طرح، میری طرف وحی کی جاتی ہے۔) اور آپ کا دعویٰ نبوت کھانا کھانے اور بازار میں چلنے کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ اس بشریت کے تقاضے ہیں جو نبوت کے لوازم میں سے ہے۔ نبی کریم ﷺ بشر ہی ہیں کیونکہ افاضہ اور استفاضہ کے لیے ہم جنس ہونا شرط ہے۔ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (اگر زمین پر ملائکہ ہوتے اور زمین پر اطمینان کے ساتھ چلتے پھرتے تو پھر ہم ان پر آسمان سے فرشتہ ہی رسول اتارتے) چونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس لیے انسانوں کی ہدایت کے لیے انسان ہی پیغمبر ہونا چاہیے۔

۲ کیوں نہ اس کی طرف کوئی فرشتہ اتارا جاتا، کہ ہم اسے دیکھ سکتے ''فَيَكُوْنَ'' یہ لَوْلَا بمعنی هَلَّا کا جواب ہے۔ اور یہ فاء کے بعد اَنْ مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے۔ تو ہم فرشتے کی تصدیق کے سبب اس کی سچائی کو جان لیتے۔ لولا اپنے جواب کے ساتھ مل کر سابقہ جملے سے بدل اشتمال ہے۔ یعنی کیا ہوا ہے اس رسول کو جو بشر ہے کہ یہ ذاتی طور پر بھی قوی بادشاہ نہیں اور نہ ہی مذکورہ تین امور میں سے کسی سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس کی طرف فرشتہ اتارا جائے۔

اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ

اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿٨﴾

''یا (ایسا کیوں نہ ہوا) کہ اتارا جاتا اس کی طرف خزانہ یا (کم از کم) اس کا ایک باغ ہی ہوتا، کھایا کرتا اس (کی آمدنی) سے [1] اور ان ظالموں نے (یہاں تک) کہہ دیا کہ تم پیروی نہیں کر رہے ہو مگر ایک ایسے شخص کی جس پر جادو کیا گیا ہے [2]''

[1] اس کی طرف آسمان سے اتارا جاتا کوئی خزانہ جسے یہ خرچ کرتا اور اسے طلب معاش کے لیے بازار میں چلنے پھرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ یہ جملہ جَنَّۃٌ کی صفت ہے۔ حمزہ اور کسائی نے یَاْکُلُ کی بجائے صیغہ جمع متکلم نَاْکُلُ نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ انھوں نے تینوں چیزوں کا ذکر علی سبیل التنزل کیا ہے۔ ان کی مراد یہ ہے۔ کہ اگر یہ رسول ہوتا تو پھر یہ فرشتہ ہوتا، اور اگر یہ خود فرشتہ نہیں، تو پھر اس کے ساتھ فرشتہ ہوتا جو اس کی تصدیق کرتا اور اگر اس طرح بھی نہیں، تو پھر اس کی طرف کوئی خزانہ اتارا جاتا، اور اگر اس طرح بھی نہیں تو پھر کم از کم اس کے لیے کوئی باغ ہوتا جیسا کہ سرداروں اور خوشحال لوگوں کے ہوتے ہیں تو یہ اس کے منافع کے سبب خوشحال زندگی گزارتا۔

[2] یہاں ضمیر کی جگہ پر ظالِمُوْنَ ذکر کیا گیا ہے تا کہ ان کے خلاف ان باتوں میں ظلم ثابت ہو جائے جو انہوں نے کہیں۔ اے مسلمانو! تم محمد ﷺ کی پیروی کرنے کی صورت میں اتباع نہیں کر رہے ہو۔ مگر ایسے شخص کی جس پر جادو کیا گیا ہے۔ یعنی جادو اس کی عقل پر غالب آ گیا ہے۔ مَسْحُوْر کا ایک معنی مَخْدُوْع (جس کے ساتھ دھوکہ کیا جائے) کیا گیا ہے۔ اور ایک معنی یہ کیا گیا ہے مَسْحُوْر وہ آدمی ہے جسے حق سے پھیر دیا جائے۔ اور ایک معنی یہ کیا گیا ہے۔ ایسا آدمی جس پر جادو کیا گیا ہو۔ اور یہ بشر دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مفعول بمعنی فاعل ہے۔ یعنی جادو کرنے والا۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٩﴾

''ملاحظہ تو کیجیے کیسے بیان کرتے ہیں آپ کے متعلق طرح طرح کی مثالیں سو وہ (اس بے ادبی کے باعث) گمراہ ہو گئے [1] پس وہ راہ نہیں پا سکتے [2]''

[1] اے محمد ﷺ! ملاحظہ تو کیجئے اور كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ میں كَيْفَ ظرف ہے اور ضَرَبُوْا کے متعلق ہے۔ اور یہ مقدم اس لیے ہے کہ صدر کلام کو متضمن ہے۔ اور مکمل جملہ بتاویل مفرد ہو کر اُنْظُرْ فعل کا مفعول ہے۔ معنی یہ ہے کہ ان کے مثالیں بیان کرنے کی کیفیت ملاحظہ کیجئے۔ یعنی انہوں نے آپ کو بہتان تراشنے والوں اور قصے بیان کرنے والوں کی مثل بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے آپ کے بارے افتراء اور قصص لکھوانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے آپ کو ان لوگوں کی مثل قرار دیا جن پر جادو کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کی مثل جو فرشتہ ہونے یا بادشاہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے آپ کے بارے کھانے اور بازار میں چلنے پھرنے کے محال ہونے کے بارے فیصلہ کیا۔ اور ایسی چیزوں کو آپ کے لیے لازم قرار دیا جو اغنیاء اور سلاطین کے لوازمات میں سے ہیں مثلاً خزانہ اور باغ وغیرہ۔ فَضَلُّوْا کا عطف ضَرَبُوْا پر ہے، یعنی انہوں نے کیسے مثالیں بیان کیں اور وہ کیسے اس راستے سے بھٹک گئے جو حق تک پہنچانے والا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے خواص پہچاننے کے سبب آپ کی نبوت کا عرفان ملتا ہے۔ اس طرح کہ نبی بشر اور معصوم ہوتا ہے اور اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے۔ اور وہ اس راستے سے گمراہ ہو گئے جو ان معجزات کے سبب نبی اور

۲؎ پس وہ رشد و ہدایت کی طرف راہ نہیں پا سکتے۔ اس کا عطف فَضَلُّوا پر ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ انہوں نے آپ کے بارے ایسی مثالیں بیان کی ہیں جو باہم متناقض ہیں۔ لہٰذا وہ آپ کی نبوت میں عیب نکالنے کی کوئی راہ نہیں پاتے۔ کیونکہ متناقض کلام ساقط الاعتبار ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝

"بڑی (خیر و) برکت والا ہے اللہ تعالیٰ جو اگر چاہے تو بنا دے آپ کے لیے بہتر اس سے ۱؎ (یعنی ایسے) باغات رواں ہوں جن کے نیچے نہریں اور بنا دے آپ کے لیے بڑے بڑے محلات ۲؎"

۱؎ ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت خیثمہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو یہ کہا گیا کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو زمین کی چابیاں اور اس کے خزانے عطا فرما دیں اور اس طرح کرنا ہمارے پاس آخرت میں کسی چیز کو کم نہیں کرے گا۔ اور اگر آپ چاہیں تو میں انہیں آخرت میں آپ کے لیے جمع کر دوں (1)۔ تو اس پر آپ ﷺ نے عرض کی نہیں بلکہ دونوں کو آخرت میں میرے لیے جمع فرما دے۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ بڑی خیر و برکت والا ہے اللہ تعالیٰ جو اگر چاہے تو دنیا میں آپ کے لیے بنا دے اس سے بہتر، جس خزانے اور باغ کے بارے انہوں نے کہا ہے۔ لیکن اس نے اسے آخرت کے لیے مؤخر کر دیا ہے کیونکہ یہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ اس میں خیراً جعل کا مفعول اول ہے اور لک مفعول ثانی ہے۔ امام بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت عکرمہؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ بازاروں میں چلنے اور کسب معاش تلاش کرنے سے بہتر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس خیر کی وضاحت اپنے اس قول سے فرمائی "جنات" خیراً سے بدل ہے۔

۲؎ یہ جَنّٰتٍ کی صفت ہے۔ اس کا عطف جَعَلَ پر ہے۔ ابن کثیر، ابن عامر، اور عاصم نے ابوبکر کی روایت کے مطابق اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ نے جزم کے ساتھ۔ کیونکہ شرط اگر فعل ماضی ہو تو اس کی جزاء میں جزم اور رفع دونوں پڑھنا جائز ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس میں رفع استیناف کے لیے ہو کیونکہ یہ ان نعمتوں کا وعدہ ہے جو آخرت میں آپ ﷺ کے لیے ہوں گی۔ یعنی مضبوط اور پختہ محلات۔ عرب میں ہر پختہ اور مضبوط گھر کو قصر (محل) کہا جاتا ہے۔ امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے حضرت ابوامامہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا" عَرَضَ عَلَيَّ رَبِّي اَنْ يَجْعَلَ لِيْ بَطْحَاءَ مَكَّةَ ذَهَبًا فَقُلْتُ لَا يَارَبِّ وَلٰكِنْ اَشْبَعُ يَوْمًا وَاَجُوْعُ يومًا" (2) اسے ترمذی نے حسن کہا ہے۔ (کہ میرے رب نے مجھے فرمایا کہ وہ میرے لیے بطحاء مکہ کو سونا بنا دے تو میں نے عرض کی اے میرے پروردگار نہیں، بلکہ میں تو ایک دن سیر ہو کر کھاؤں گا اور ایک دن بھوکا رہوں گا) اور امام بغویؒ نے ایک روایت میں اس طرح ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ نے تین دن کا ذکر فرمایا کہ جب میں بھوکا ہوں گا تو میں تیری بارگاہ میں تضرع اور عاجزی کروں گا اور جب میں سیر ہوں گا تو میں تیری حمد اور شکر ادا کروں گا۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ ساتھ چلیں۔ میرے پاس ایک فرشتہ آیا جس کی عفت و پاکدامنی کعبہ کے مساوی ہے۔ تو اس نے آ کر کہا کہ آپ کا رب

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 16-115 (العلمیہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 58 (وزارت تعلیم)

آپ کو سلام فرماتا ہے۔ اور ساتھ ہی فرما رہا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو نبی عبد بنیں اور اگر چاہیں تو نبی ملک (بادشاہ) بنیں۔ تو میں نے جبرئیل امین کی طرف دیکھا تو اس نے اشارہ کیا کہ اپنے نفس کو جھکا دو۔ لہٰذا میں نے کہا میں نبی عبد بننا پسند کرتا ہوں۔ تو ام المومنین ارشاد فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ تکیہ لگا کر کھانا نہیں کھاتے تھے اور فرماتے تھے میں ایسے کھاؤں گا جیسے غلام کھاتے ہیں اور میں ایسے بیٹھوں گا جیسے غلام بیٹھتے ہیں۔(1)

بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ ۖ وَأَعْتَدْنَا لِمَن كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا ﴿١١﴾

"بلکہ یہ تو جھٹلاتے ہیں قیامت کو[1] اور ہم نے تیار کر رکھی ہے ان کے لیے جو جھٹلاتے ہیں قیامت کو بھڑکتی ہوئی آگ[2]"

[1] اس کا عطف قالُوا پر ہے۔ یعنی انہوں نے یہ کہا بلکہ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز قول کیا۔ یا یہ اس کلام سے متصل ہے جو قالوا کے بعد آ رہی ہے۔ یعنی بلکہ ان کی نظریں دنیوی ساز و سامان پر محصور ہو گئیں اور وہ یہ گمان کرنے لگے کہ بیشک عزت و کرامت، مال و متاع کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اس لیے انہوں نے آپ کو جھٹلا دیا۔ اور انہوں نے آپ کو فقر و افلاس کا طعنہ دیا اور ایسی چیزوں کے ساتھ مطعون کرنے کا حیلہ کیا جو بالکل فاسد اور لایعنی ہیں۔ یا پھر معنی اس طرح ہے۔ بلکہ انہوں نے تو قیامت کو جھٹلا دیا تو وہ اس جواب کی طرف کیسے متوجہ ہوں گے۔ اور وہ آپ کے بارے ان چیزوں کے متعلق کیسے تصدیق کریں گے جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے آخرت میں کیا ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ ان کا آپ کو جھٹلانا تعجب کا باعث نہیں کیونکہ یہ (قیامت کو جھٹلانا) اس کی نسبت زیادہ تعجب انگیز ہے۔

[2] اس کا عطف كَذَّبُوا پر ہے۔ یعنی ایسی آگ جو سخت بھڑکنے والی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سعیر جہنم کا نام ہے۔ اور یہ ظرف مکان ہونے کے اعتبار سے منصرف ہے۔

إِذَا رَأَتْهُم مِّن مَّكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا ﴿١٢﴾

"جب یہ آگ دیکھے گی انہیں[1] دور سے تو وہ سنیں گے اس کا جوش مارنا اور چنگھاڑنا[2]"

[1] جب آگ کفار کو دیکھے گی۔ بعض محققین نے آگ کی طرف رؤیت کی نسبت کو حقیقت پر محمول کیا ہے۔ جیسا کہ امام بغویؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ بَيْنَ عَيْنَيِ النَّارِ قَالُوا وَهَلْ لَهَا مِنْ عَيْنَيْنِ قَالَ أَلَمْ تَسْمَعْ قَوْلَ اللّٰهِ تَعَالٰى إِذَا رَأَتْهُمْ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ" (جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کی نسبت کی تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ آگ کی آنکھوں کے درمیان بنا لے۔ صحابہ نے عرض کی کیا آگ کی آنکھیں ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا "جب یہ آگ انہیں دور سے دیکھے گی")۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ نسبت مجازی ہے حقیقۃً یہاں مضاف محذوف ہے یعنی (جب آگ کے درو غے انہیں دیکھیں گے) اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ جب آگ ایسی جگہ ہو گی جہاں سے وہ دیکھ سکے گی۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ان میں سے دو کی آگ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکے گی(2) یعنی وہ ایسی جگہ پر ایک دوسرے کے قریب نہیں ہوں گے کہ وہاں سے ایک دوسرے کو دیکھ سکے۔

[2] کلبی نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایک سو سال کی مسافت اور ایک قول یہ ہے۔ کہ پانچ سو سال کی مسافت سے وہ آگ انہیں دیکھ

2 سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 356 (وزارت تعلیم)

لے گی(1)۔ کفار آگ کے جوش مارنے کی آواز سن لیں گے۔ تغیظ سے مراد آگ کے کھولنے اور جوش مارنے کی آواز ہے جو کہ غیظ وغضب والے آدمی کی بڑبڑاہٹ کے مشابہ ہوگی۔ اور زَفِيْرًا سے مراد وہ آواز ہے جو پیٹ سے سنائی دیتی ہے۔ یہ جملہ شرطیہ سعیر کی صفت ہے۔ اور رَاَتْهُمْ کی ضمیر اس لیے ہے کہ اس سے مراد آگ (النار) یا جہنم ہے۔

وَ اِذَاۤ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾

''اور جب انہیں پھینکا جائے گا اس آگ میں کسی تنگ جگہ سے لے زنجیروں میں جکڑ کر تو پکاریں گے وہاں موت کو ۲ے''

لے اس کا عطف پہلے جملہ شرطیہ پر ہے۔ مِنْهَا یعنی جہنم سے یہ اپنے مابعد سے حال ہے۔ ''مَكَانًا'' یہ اُلْقُوْا کی ظرف ہے۔ ''ضَيِّقًا'' عذاب میں زیادتی کے لیے تنگ جگہ سے۔ کیونکہ مشقت اور تکلیف تنگی کے ساتھ ہوتی ہے اور راحت واطمینان وسعت اور کشادگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ابن کثیر نے اسے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے یا مشدد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن ابی حاتم نے یحییٰ بن اسید سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے وہ اس طرح آگ میں گھس جائیں گے جیسے دیوار میں کیل گاڑ دیا جاتا ہے(2)۔ آیت کے بارے میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ اس طرح آگ میں گھس جائیں گے جیسے نیزے کے پچھلے حصے کا لوہا اس میں گھسا ہوتا ہے(3)۔

ابن مبارکؒ نے قتادہ کی سند سے نقل کیا ہے کہ ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہؓ کہا کرتے تھے جہنم کافروں پر اس طرح تنگ ہو جائے گی جیسا کہ نیزے کا لوہا اس پر تنگ ہوتا ہے(4)۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب انہیں آگ میں پھینکا جائے گا جو ہمیشہ آگ میں رہیں گے تو انہیں لوہے کے صندوقوں میں ڈالا جائے گا جن میں لوہے کی میخیں ہوں گی۔ پھر ان صندوقوں کو لوہے کے اور صندوقوں میں رکھا جائے گا۔ پھر انہیں جہنم کے نچلے حصے میں پھینک دیا جائے گا۔ پس ان میں سے کوئی بھی نہیں دیکھ سکے گا کہ اس کے علاوہ کسی اور کو بھی عذاب دیا جا رہا ہے(5)۔ ابونعیمؒ اور بیہقی نے سوید بن غفلہ سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

۲ے مقرنین اُلْقُوْا کی ضمیر مرفوع سے حال ہے، یعنی ان کے ہاتھوں کو ان کی گردنوں کے ساتھ زنجیروں کے ساتھ جکڑ دیا جائے گا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ انہیں شیاطین کے ساتھ جکڑ دیا جائے گا۔ اور دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا شرط کی جزاء ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ ثبور سے مراد ویل (ہلاکت) ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہلاکت ہے(6)۔ امام احمدؒ، بزارؒ، ابنؒ ابی حاتم اور بیہقیؒ نے سند صحیح کے ساتھ حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے ابلیس کو آگ کا لباس پہنایا جائے گا۔ پس وہ اسے اپنے ابروؤں پر رکھے گا اور اسے اپنے پیچھے گھسیٹے گا اور اس کے بعد اس کی ذریت (اولاد) کو وہ لباس پہنایا جائے گا اور اس وقت وہ پکارے گا ہائے اس کی ہلاکت اور پھر وہ کہیں گے ہائے وہ برباد اور ہلاک ہو گئے یہاں تک کہ وہ آگ پر کھڑے رہیں گے۔(7)

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۴﴾

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 117 (العلمیہ) 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
5۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 4 صفحہ 176 (السعادۃ) 6۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 7۔ مسند امام احمد، جلد 3 صفحہ 152 (صادر)

"(کہا جائے گا بدبختو!) نہ مانگو آج ایک موت بلکہ مانگو بہت سی موتیں ۔[1]"

[1] یہ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یہ اس سوال کا جواب ہے کہ انہیں کیا کہا جائے گا جب وہ ہلاکت کو پکاریں گے؟ یعنی تمہاری ہلاکت اس سے زیادہ ہے کہ تم اسے ایک مرتبہ پکارو۔ لہٰذا تم کثیر ہلاکتوں کو بار بار پکارو اور اس لیے بھی کہ تمہارے عذاب کی کثیر انواع ہیں اور ان میں سے ہر قسم اپنی شدت کے باعث ہلاکت ہے۔ یا پھر اس اعتبار سے کثیر ہلاکتیں ہیں کہ وہ ہلاکت متجدد ہوتی رہے گی جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ (جب بھی ان کی کھالیں پک جائیں گی تو ہم ان کی (جلی ہوئی) کھالیں دوسری کھالوں سے بدل دیں گے تا کہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔) یا پھر اس لیے کہ وہ ختم نہیں ہوگی، لہٰذا ہلاکت ہر وقت برقرار رہے گی۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا ⑮

"ان سے پوچھیے (ذرا بتاؤ) یہ بھڑکتی ہوئی آگ بہتر ہے یا دائمی جنت [1] جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے [2] ہوگی یہ جنت ان کے اعمال کا صلہ اور (ان کی زندگی کا) انجام [3]"

[1] اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "قل" "اے محمد! ﷺ ان سے پوچھیے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ کیا وہ جو میں نے تمہارے لیے جہنم اور اس کے باسیوں کی صفت ذکر کی ہے۔ یا کیا وہ خزانہ اور باغ جو دنیا میں ہے ہمیشہ کی جنت سے بہتر ہے یا ہمیشہ کی جنت اس سے بہتر ہے۔ یہ استفہام کفار کو زجر و توبیخ کے لیے ہے اور ڈانٹ ڈپٹ کو پختہ کرنے کے لیے ہے اور خلد کی طرف جنۃ کی اضافت مدح کے لیے ہے۔ یا اس کے دائمی ہونے پر دلالت کرنے کے لیے ہے۔ یا پھر اسے دنیا کے باغوں سے ممتاز کرنے کے لیے ہے۔

[2] اس میں اسم موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے۔ اور متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک اور تکذیب سے بچتے ہیں اور اس معنی پر دلالت اس طرح ہوتی ہے کہ ان کا ذکر کفار کے مقابلہ میں ہے ورنہ ہر مومن کی جزاء جنت ہوگی۔

[3] یہ جنت ان کے لیے علم الٰہی میں ہے یا لوح محفوظ میں لکھا ہے یا اب ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جس کے تحقق کا وعدہ کیا ہے وہ ایسے ہی ہے گویا واقع ہو چکا ہے۔ اور یہ ان کے اعمال کا صلہ اور انجام ہے جس کی طرف وہ لوٹ رہے ہیں۔ اس میں تنوین تنکیر تعظیم کے لیے ہے۔ اور جزاء و مصیر دونوں کانت کی ضمیر مرفوع سے حال ہیں۔ یا اس کے لیے دوسری خبر ہے اور كَانَتْ لَهُمْ کا جملہ وُعِدَ کے مفعول مقدر سے حال ہے۔ لہٰذا تقدیر عبارت یہ ہوگی جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ اِيَّاهَا وَقَدْ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَّمَصِيْرًا یا یہ جملہ الْمُتَّقُوْنَ سے حال ہے اور اس میں رابطہ لَهُمْ ضمیر ہے۔

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔـوْلًا ⑯

"ان کے لیے اس میں ہر وہ نعمت ہوگی جس کی وہ خواہش کریں گے وہاں ہمیشہ رہیں گے [1] آپ کے رب کے ذمہ وعدہ ہے، جس کا ایفاء لازم ہے [2]"

[1] ان کے لیے جنت میں وہی (نعمت) ہوگی۔ اس میں ضمیر عائد محذوف ہے، یعنی "مَا يَشَاۗءُوْنَهُ مِنَ النَّعِيْمِ"، جس نعمت کی وہ خواہش کریں گے۔ یعنی جو نعمت ان کے رتبہ اور درجہ کے مناسب ہوگی۔ کیونکہ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ ناقص صرف خواہش کرنے سے اس نعمت کو نہیں ۔۔۔ اور اس میں ۔۔۔ بھی تنبیہ ہے کہ تمام مرادیں صرف جنت میں ہی حاصل ہوں گی۔ خٰلِدِيْنَ یہ ان

کی ضمیروں میں سے کسی ایک سے حال ہے اور کَانَ کی ضمیر مَایَشَآءُوْنَ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

۲۔ یعنی جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس میں علیٰ کا کلمہ وجوب کے لیے استعمال ہوا ہے یعنی اس کی وضاحت کے لیے کہ وعدہ کی خلاف ورزی محال ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس پر پورا کرنا لازم ہے۔ کیونکہ موعود کے ساتھ ارادے کا تعلق اس وعدہ سے پہلے ہے جو پورا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ اور یہ اختیار کا ثبوت ہے جو پورا ہوگا اس طرح کہ وہ پوچھے گا اور طلب کرے گا۔ یا ایسا وعدہ ہے جس کے بارے سوال کیا جائے گا یعنی لوگ اپنی دعاؤں میں اس کے بارے سوال کریں گے رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ ''اے ہمارے پروردگار تو ہمیں وہ نعمت عطا فرما جس کا تو نے ہمارے لیے اپنے رسولوں کے ساتھ وعدہ کیا ہے''۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے کہ اس کے بارے میں ملائکہ کی طرف سے اس قول کے ساتھ سوال کیا گیا ہے رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ ''اے ہمارے پروردگار تو انہیں اس جنت عدن میں داخل فرما دے جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ (1)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝

''اور جس روز (محشر میں) اللہ انہیں اکٹھا کرے گا ۱؎ اور ان (باطل خداؤں) کو جنہیں یہ پوجتے ہیں اللہ کے سوا تو اللہ پوچھے گا (ان معبودوں سے) کیا تم نے گمراہ کیا میرے ان بندوں کو یا وہ خود ہی سیدھی راہ سے بھٹک گئے تھے ۲؎''

۱؎ یہ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ کے متعلق ہے اور قَالُوْا سُبْحٰنَكَ کا جملہ اپنے متعلقات کے ساتھ مل کر وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً پر معطوف ہے۔ ابن کثیر، ابوجعفر، یعقوب اور حفص نے صیغہ غائب ہونے کی بناء پر اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تعظیم اور تکلم کی بناء پر اسے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا ہر وہ معبود جس کی عبادت باطل طریقہ سے کی جائے، چاہے وہ عاقل ہو یا غیر عاقل۔ کیونکہ اصح قول کے مطابق ما کا لفظ ان دونوں قسموں کو شامل ہوتا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے یعنی ملائکہ، جن، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیز علیہ السلام (2)۔ (جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں) یہاں انہیں سوال و جواب کے قرینے سے خاص کیا گیا ہے۔ اور عکرمہ، ضحاک اور کلبی نے کہا ہے یعنی وہ بت جن کی وہ عبادت کرتے ہیں (3)۔ کیونکہ اس میں ما کا کلمہ غیر ذوی العقول کے لیے ہے۔ اور اس قول کو اس معنی پر محمول کیا گیا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں حیات عطا فرمائے گا اور ان سے کلام کرے گا تو وہ بھی کلام کریں گے جیسا کہ جوارح (اعضاء) اور امکنہ (جگہیں) وغیرہ گفتگو کریں گی۔ تو اللہ تعالیٰ معبودان باطلہ سے کہے گا۔ فیقول کا عطف یَحْشُرُ پر ہے۔ ابن عامر نے اسے تکلم اور تعظیم کی بناء پر نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے صیغہ غیب کی بناء پر یاء سے پڑھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کو کہے گا۔

یعنی کیا تم نے انہیں اپنی عبادت کی طرف دعوت دے کر انہیں گمراہ کیا۔ یا وہ خود اپنی صحیح نظر وفکر میں خلل ڈالنے اور فصیح و بلیغ نصیحت کرنے والے راہنما سے اعراض کرنے کے سبب حق کی پہچان سے گمراہ ہو گئے۔ یہ سوال ڈانٹ ڈپٹ کے لیے اور عبادت کرنے والوں کو رلانے اور رسوا کرنے کے لیے ہے۔ اور اصل عبارت ءَ اَضْلَلْتُمْ اَمْ ضَلُّوْا (کیا تم نے گمراہ کیا یا وہ گمراہ ہو گئے)؟ ترتیب

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

تکلّم کو بدلا گیا تا کہ فعل حرف استفہام کے قریب ہو کیونکہ فعل ہی مقصود ہے نہ کہ نفس سوال جو کہ فعل کے قرب کے سبب سوال سے ظاہر ہے تو یہ اس لیے ہے کہ یہ حکم قطعی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ورنہ عتاب متوجہ نہ ہوتا۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَ كَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۸﴾

'' وہ کہیں گے تو پاک ہے ہر عیب سے ۱؎ ہمیں یہ بات زیبا نہ تھی کہ ہم بناتے تیرے سوا کسی غیر کو دوست ۲؎ لیکن تو نے آرام و آسائش عطا کی انہیں اور ان کے آباء کو یہاں تک کہ انہوں نے بھلا دیا تیری یاد کو اور (یوں) وہ لوگ تباہ و برباد ہو گئے ۳؎ ''

۱؎ یہاں مستقبل کے لیے صیغہ ماضی کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے کہ اس کا واقع ہونا یقینی ہے۔ وہ یہ قول تعجب کرتے ہوئے کہیں گے کیونکہ بات ان کی عصمت کے بارے کہی گئی اگر وہ ملائکہ یا انبیاء ہوئے، یا وہ یہ قول تعجب گمراہ کرنے کی قدرت نہ رکھنے کے سبب کہیں گے اگر وہ جمادات یا ان کے علاوہ دوسرے ہوئے تو۔ یا پھر اس بات کا احساس دلانے کے لیے وہ یہ کہیں گے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کے ساتھ پہلے ہی موسوم کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (ہر شئی اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتی ہے) تو اس کے بندوں کو گمراہ کرنا کیسے ان کے لائق ہو سکتا ہے۔ یا پھر وہ یہ قول تعجب اللہ تعالیٰ کی کسی بھی شریک سے تنزیہ اور پاکی بیان کرنے کے لیے کریں گے۔

۲؎ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ میں يَنْۢبَغِيْ کا جملہ كَانَ کی خبر ہے اور اس کا اسم ضمیر شان ہے۔ اور اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ میں مِنْ زائدہ ہے اور نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی ہمارے لیے یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم تیرے بغیر کسی کو عصمت اور عدم قدرت کے سبب والی بنائیں تو پھر یہ ہمارے لیے کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم دوسروں کو یہ دعوت دیں کہ تیرے سوا کسی اور کو ولی بنائیں۔ یہ جواب انبیاء، ملائکہ اور جمادات کی طرف سے تو صحیح ہے۔ لیکن جن و انس میں سے جن شیاطین نے الوہیت باطلہ کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ جواب ان کی طرف سے بھی ہوگا جیسا کہ ان کا قول وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (قسم بخدا اے ہمارے پروردگار! ہم مشرک نہیں تھے) اور شیطان کا قول لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ الآیہ'' جب فیصلہ ہو چکا ہوگا تو شیطان کہے گا اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا، وہ سچا وعدہ تھا، اللہ نے پورا کر دیا اور میں نے جو تم سے وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور مجھے تم پر جبر و قدرت حاصل نہ تھی''

۳؎ لیکن تو نے انہیں اور ان کے آباء کو لمبی عمر، صحت اور مختلف قسم کی نعمتوں کے ساتھ آرام و آسائش عطا کیا تو وہ شہوات میں غرق ہو گئے۔ اس کا عطف مَتَّعْتَهُمْ پر ہے۔ یعنی حتیٰ کہ وہ تیرے ذکر سے غافل ہو گئے۔ اور تیری نعمتوں کو یاد کرنے اور تیری ان آیات میں تدبر کرنے سے غافل ہو گئے۔ جنہیں اس پر دلالت کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے اور تیرا محتاج ہونے سے غافل ہو گئے۔ یا پھر انہوں نے نصیحت اور قرآن پر ایمان لانے کو ترک کر دیا۔ پس اس میں ضلال اور گمراہی کی نسبت اس حیثیت سے ان کی طرف ہے کہ یہ ان کا کسب ہے۔ اور جو نسبت اس کی اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس کی طرف گمراہی کی نسبت اس اعتبار سے ہے کہ اس نے اس کو پیدا کیا ہے ... تجاوز ... نہیں ... کیا ہے۔ لہٰذا یہ آیت معتزلہ کے خلاف ہماری دلیل ہے نہ کہ ہمارے خلاف ان کی۔ اور وہ تیرے

فیصلے کے مطابق تباہ و برباد قوم ہو گئے۔ کانوا کا عطف نَسُوا پر ہے۔ اس میں بوْر مصدر ہے جس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے۔ اسی لیے اس میں واحد اور جمع مساوی ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بَائِرٌ کی جمع ہے جیسا کہ عَائِذٌ کی جمع عُوذٌ ہے۔

فَقَدْ كَذَّبُوكُمْ بِمَا تَقُولُونَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيرًا ﴿١٩﴾

"(اے کفار!) تمہارے معبودوں نے تمہیں جھٹلا دیا[1] جو تم کہتے ہو[2] پس اب نہ تم اپنے سے عذاب کو پھیر سکتے ہو اور نہ تمہاری مدد کی جائے گی[3] اور جس نے ظلم کیا تم میں سے تو ہم چکھائیں گے اسے عذاب بڑا[4]"

[1] یہ دنیا میں شرک کرنے والوں کو خطاب ہے، یعنی عنقریب آخرت میں تمہیں تمہارے وہ الہ جھٹلا دیں گے جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اس کے بالیقین واقع ہونے کی وجہ سے صیغہ ماضی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے "اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ" اور یہ بھی جائز ہے کہ یہاں قول مقدر ہو، یعنی ہم اس وقت مشرکین کو کہیں گے تحقیق معبودوں نے تمہیں جھٹلا دیا ہے۔

[2] بِمَا تَقُولُونَ میں باء بمعنی فِی ہے۔ یعنی تم اس قول میں جھوٹے ہوئے کہ بے شک وہ معبود ہیں یا انہوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ بِمَا تَقُولُونَ كَذَّبُوكُمْ کی ضمیر منصوب سے بدل اشتمال ہو یعنی "كَذَّبُوا قَوْلَكُمْ" (انہوں نے تمہارے قول کو جھٹلا دیا ہے)

[3] فَمَا تَسْتَطِيعُونَ اس کا عطف "فَقَدْ كَذَّبُوكُمْ" پر ہے۔ حفص نے اسے عبادت کرنے والوں کو خطاب ہونے کی بناء پر تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ اس بناء پر تاء کہ اس کی ضمیر معبودین کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یہ معبود تم سے عذاب پھیرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے اور نہ تمہاری مدد کر سکیں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ تم اپنے آپ سے عذاب پھیر سکتے ہو اور نہ اپنی مدد کی طاقت رکھتے ہو۔ اور یہ قول بھی ہے کہ صرف کا معنی حیلہ کرنا ہے۔ اسی سے عربوں کا یہ قول ہے انه يتصرف ای يحتال۔ (یعنی وہ حیلہ کرتا ہے)

[4] اے لوگو! جس نے بھی تم میں سے ظلم کیا۔ اگر ظلم سے مراد شرک ہے تو پھر جزاء بالاجماع لازم ہے۔ اور اگر یہ کفر اور فسق دونوں کو شامل ہو تو پھر جزاء کا مقتضی بالاتفاق عدم مزاحم کے ساتھ مقید ہوگا۔ اور ہمارے نزدیک مزاحم سے مراد توبہ، اطاعت اختیار کر کے فسق کو مکمل طور پر ختم کرنا اور عفو ہے۔ (یعنی اگر ان میں سے کوئی چیز بھی نہ پائی گئی تو پھر اسے عذاب ہوگا اور اگر ان میں سے کوئی صورت پائی گئی تو پھر عذاب نہیں ہوگا)

واحدی نے جویبر کی سند سے، بغوی نے ضحاک کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے اور اسی طرح ابن جریر نے آپؓ سے سعید یا عکرمہ کے واسطہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو فاقہ کی عار دلائی اور یہ کہا وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ تو رسول اللہ ﷺ غمزدہ ہو گئے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۗ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۗ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿٢٠﴾

''اور نہیں بھیجے ہم نے آپ سے پہلے رسول مگر وہ سب کھانا کھایا کرتے اور چلا پھرا کرتے بازاروں میں ۱؎ اور ہم نے بنا دیا تمہیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش ۲؎ کیا تم (اس آزمائش میں) صبر کرو گے؟ اور آپ کا رب سب کچھ دیکھ رہا ہے ۳؎ ''

۱؎ ہم نے آپ سے پہلے نہیں بھیجے مگر ایسے رسول جو کھانا کھاتے تھے۔ اس میں موصوف کو محذوف کیا گیا ہے اس لیے کہ اس پر المرسلین دلالت کرتا ہے۔ اور صفت کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ اور معنی یہ ہے اِلَّا رُسُلًا اٰکِلِیْنَ الطَّعَامَ وَالْمَاشِیْنَ فِی الْاَسْوَاقِ (ترجمہ: ہم نے نہیں بھیجے مگر کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے رسول) جیسا کہ اس ارشادِ گرامی میں ہے وَمَامِنَّآ اِلَّا لَہٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (ہم میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے مگر اس کے لیے مقام معلوم ہے۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو اور اس میں اکتفا ضمیر پر ہی ہو۔ یعنی ''مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ اَحَدًا مِّنَ الْمُرْسَلِیْنَ فِیْ حَالٍ مِّنَ الْاَحْوَالِ اِلَّا وَالْحَالُ اِنَّھُمْ لَیَاْکُلُوْنَ'' (ہم نے کسی بھی حال میں آپ سے قبل رسولوں میں سے کوئی نہیں بھیجا مگر وہ اس حال میں کھانا کھاتے تھے) مَآ اَرْسَلْنَا جملہ معترضہ ہے اور یہ حضور نبی کریم ﷺ کی تسلی کے لیے ہے۔

۲؎ اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لیے آزمائش بنا دیا ہے۔ پس غنی فقیر کے لیے فتنہ ہے کہ فقیر کہتا ہے کیا ہے مجھے میں اس کی مثل نہیں ہوں۔ اور صحت مند مریض کے لیے آزمائش ہے اور شریف خسیس آدمی کے لیے فتنہ ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ تم میں سے بعض کو بعض کے لیے آزمائش بنایا گیا ہے تاکہ تم اس پر صبر کرو جو تم ان کے بارے میں سنتے ہو اور ان کے خلاف دیکھتے ہو۔ اور ہدایت تلاش کرو (1) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت خسیس کے سبب شریف کی ابتلاء کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ اس طرح کہ شریف آدمی (صاحب مرتبہ) جب اسلام لانے کا ارادہ کرتا ہے پھر وہ ادنیٰ آدمی کو دیکھتا ہے کہ وہ اس سے قبل اسلام لا چکا ہے تو وہ اس کے بعد اسلام لانا ناپسند کرتا ہے۔ کیونکہ اس طرح ادنیٰ کو صاحب مرتبہ (شریف) پر سبقت اور فضیلت حاصل ہو جائے گی نتیجۃً وہ کفر پر ہی ڈٹا رہتا ہے اور اسلام سے انکار کر دیتا ہے۔ پس اس طرح بعض بعض کے لیے آزمائش ہوتے ہیں۔ یہ کلبی کا قول ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوجہل، ولید بن عتبہ، عاص بن وائل اور نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس لیے کہ جب انہوں نے حضرت ابوذر، ابن مسعود، عمار، بلال، صہیب اور عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا تو کہا اگر ہم اسلام لے آئیں تو پھر ہم بھی ان کی مثل ہو جائیں گے۔(2)

حضرت قتادہؓ نے کہا ہے کہ یہ آیت ان مومنین کی ابتلاء کے بارے نازل ہوئی جن کے ساتھ قریش استہزاء کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے دیکھو ان کی طرف جنہوں نے ہمارے غلاموں اور رذیل افراد میں سے محمد (ﷺ) کی اتباع کی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان مومنین کو فرمایا:

۳؎ کیا تم فقر، شدت اور اذیت کی اس حالت میں صبر کرو گے (3) تو تمہیں اجر دیا جائے گا یا تم صبر نہیں کرو گے تو اس طرح تم اپنے غم میں اضافہ کر لو گے۔ لہٰذا حاصل معنی یہ ہے کہ تم صبر کرو اور آپ کا رب صبر کرنے والوں اور غم و اندوہ کا اظہار کرنے والوں کو خوب دیکھ رہا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی ایسے آدمی کی طرف دیکھے جو مال اور جسم میں اس پر فضیلت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ایسے آدمی کی طرف دیکھے جو اس سے کم تر ہو (4) اسے شیخین نے صحیحین میں

اور امام احمدؒ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰی رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ وَ عَتَوْ عُتُوًّا كَبِیْرًا ﴿۲۱﴾

''اور کہا ان لوگوں نے جو امید نہیں رکھتے تھے ہم سے ملنے کی لے کہ کیوں نہ اتارے گئے ہم پر فرشتے۔ یا ہم دیکھ لیتے اپنے رب کو ۲ے، وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگے تھے اپنے دلوں میں۔ اور انہوں نے حد سے بڑھ کر سرکشی کی ۳ے''

لے اس کا عطف قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا پر ہے۔ وہ امید نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی خیر کے ساتھ اور نہ ہماری ملاقات کی شر کے ساتھ اسی لیے کہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتے ہیں۔ یہ معنی مجازاً ہے یا بنی تہامہ کی لغت کے مطابق ہے۔ فراء نے کہا ہے کہ تہامہ کی لغت کے مطابق رجاء کا معنی خوف ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے مَالَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا(1)، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت درفعت ہوتے ہوئے اس کا خوف نہیں رکھتے۔ لقاء کا اصل معنی کسی شے تک پہنچنا ہے۔ اور اسی سے رؤیت بھی ہے کیونکہ اس میں بھی دکھائی دینے والی چیز تک پہنچنا ہوتا ہے۔ اور یہاں اس سے مراد اپنی جزاء اور انجام تک پہنچنا ہے۔

۲ے یہاں لَوْلَا بمعنی هَلَّا ہے۔ کیوں نہیں۔ ہم پر فرشتے اتارے گئے کہ وہ ہمیں محمد (ﷺ) کے سچا ہونے کی خبر دیتے یا وہی ہماری طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول ہوتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیتے۔ پس وہ خود ہمیں اپنی اتباع کرنے کا حکم دیتا ہے۔

۳ے یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ وہ اپنے دلوں میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگے تھے اس طرح کہ انہوں نے اپنے نفسوں کے لیے ایسی چیز کا مطالبہ کیا جس کا اتفاق کبھی کبھی ان افراد انبیاء کو ہوتا ہے جو تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں سے اکمل ہوتے ہیں۔ اور وہ چیز اس سے بھی اعظم ہے۔ اور انہوں نے ظلم میں حد سے تجاوز کیا۔ مجاہد نے کہا انہوں نے سرکشی کی (2)۔ مقاتل نے کہا قول میں انہوں نے تکبر کیا (3) اور بغوی نے کہا کہ عتو کا معنی شدید ترین کفر اور فحش ترین ظلم ہے۔ ظلم اور سرکشی کی انتہائی حدوں تک پہنچتے ہوئے اس طرح کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا مطالبہ کر دیا اور اس سے اوپر تو کوئی شئی نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا ظلم اور سرکشی یہ ہے کہ انہوں نے واضح معجزات کو دیکھا اور پھر ان سے اعراض کیا اور انہوں نے اپنے لیے ایسا غلط مطالبہ رکھا جس کے قریب بھی کامل طالبین کی گردنیں نہیں جاتیں۔

یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ وَ یَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾

''جس روز وہ دیکھیں گے فرشتوں کو تو کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی لے اس روز ۲ے مجرموں کے لیے اور فرشتے کہیں گے تمہارے لیے (جنت کا داخلہ) قطعاً حرام ہے ۳ے''

لے جس دن کفار دیکھیں گے فرشتوں کو یعنی موت کے وقت یا قیامت کے دن۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور ظرف یا تو اُذْكُرْ کے متعلق ہے۔ اور وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا کا عطف یَرَوْنَ پر ہے۔ اور دوسرا جملہ معترضہ ہے۔ یا پھر ظرف قول باری تعالیٰ ''لَا بُشْرٰی'' کے متعلق ہے۔ اس طرح کہ اس سے پہلے قول مقدر ہے، یعنی یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ یَقُوْلُوْنَ (جس دن وہ ملائکہ کو دیکھیں گے تو ملائکہ کہیں گے) ''لَا بُشْرٰی'' مجرموں کے لیے کوئی بشارت نہیں، عطیہ نے کہا ہے کہ ملائکہ قیامت کے دن مومنوں کو خوشخبری دیں گے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر قرطبی زیر آیت ہذا

اور کافروں کو کہیں گے تمہارے لیے کوئی بشارت نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے جس دن وہ ملائکہ کو دیکھیں گے تو وہ انہیں بشارت نہیں دیں گے جس طرح وہ مومنین کو جنت کی بشارت دیں گے۔

۳؎ یہ یا تو تکریر کے لیے ہے۔ یا پھر لَا کی خبر ہے۔ یا یہ اس فعل یا شبہ فعل کی ظرف ہے جس کے متعلق لِّلْمُجْرِمِیْنَ ہو رہا ہے۔ اور "لِّلْمُجْرِمِیْنَ" یا تو ظرف مستقر کے متعلق ہے یعنی یومئذ کے۔ یا یہ لَا کی خبر ہے۔ یا یہ بُشْرٰی کے متعلق ہے۔ اگر اسے منون تصور کرلیا جائے اور لَا کے ساتھ اس کا حصر نہ ہو۔ کیونکہ اس صورت میں یہ عمل نہیں کرسکتا۔ اور للمجرمین یا تو عام ہے اور اس کا حکم ان کے حکم کو شامل ہے۔ یا یہ خاص ہے اور ان کے جرموں پر مہر ثبت کرنے کے لیے ان کی ضمیر کی جگہ اسے رکھا گیا ہے۔ اور اس چیز کا احساس دلانے کے لیے ہے جو بشارت کے مانع ہے اور اس کے مقابل (غم زدہ کرنے والی خبر) کا موجب ہے۔

۴؎ اور ملائکہ کہیں گے۔ اس کا عطف یقولون لَا بُشْرٰی پر ہے۔ جیسا کہ امام بغویؒ نے عطا کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ فرشتے کہیں گے جنت میں داخل ہونا قطعاً حرام ہے مگر ان ہی کے لیے جنہوں نے لا اله الا الله محمد رسول الله (ﷺ) کہا۔ اور مقاتل سے روایت ہے کہ جب کفار اپنی قبروں سے نکلیں گے تو فرشتے انہیں کہیں گے کہ تمہارے لیے جنت کا ہونا قطعاً حرام ہے(1)۔ اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ مجرم حِجْرًا مَّحْجُوْرًا کہیں گے جب وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے اور ملائکہ کو دیکھیں گے۔ امام بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ ابن جریج نے کہا ہے جب اہل عرب پر کوئی تکلیف آتی اور وہ کسی ناپسندیدہ چیز کا مشاہدہ کرتے تو کہتے حجرًا محجورًا۔ لہٰذا وہ یہی کلمات کہیں گے جب ملائکہ کو دیکھیں گے اور اس کا معنی ہے قطعی پناہ مانگنا۔ مجاہد نے کہا ہے کہ وہ ملائکہ سے پناہ طلب کریں گے(2)۔ یعنی جس دن وہ ملائکہ کو دیکھیں گے اور ملائکہ انہیں کہیں گے تمہارے لیے کوئی بشارت نہیں۔ اور مجرم کہیں گے حِجْرًا مَّحْجُوْرًا یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے مطالبہ کریں گے کہ وہ ان کی ملاقات روک دے۔

وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾

"اور ہم متوجہ ہوں گے ان کے کاموں کی طرف ۱؎ اور انہیں گرد و غبار بنا کر اڑا دیں گے ۲؎"

۱؎ اور ہم اس دن قصد کریں گے۔ اس کا عطف وَیَقُوْلُوْنَ پر ہے۔ ان اعمال کی طرف جو اچھے اعمال میں سے کفار نے کیے۔ مثلاً مہمان کی تکریم کرنا، صلہ رحمی اور مظلوم کی مدد کرنا وغیرہ۔

۲؎ یہ ضمیر مَا عَمِلُوْا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ تو ہم ان اعمال کو باطل کردیں گے۔ ان کے لیے کوئی ثواب نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ ان پر ثواب ملنے کی شرط نہیں پائی جارہی اور وہ شرط اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اعمال کو خالصتاً اسی کے لیے کرنا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا ہے کہ ھبآء سے مراد غبار کی طرح کے وہ ذرات ہیں جو روشن دان میں دکھائی دیتے ہیں جب اس میں دھوپ لگ رہی ہو۔ انہیں نہ ہاتھوں سے مس کیا جاسکتا ہے اور نہ سائے میں دیکھا جاسکتا ہے(3)۔ یہی قول حسن، عکرمہ اور مجاہد کا ہے۔ اور منثور سے مراد بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ ھَبَآءً کی صفت ہے۔ اور حضرت ابن عباس، قتادہ اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ ھَبَآءً سے مراد وہ غبار ہے جو تیز ہوا مٹی اور خشک درختوں میں سے اڑاتی ہے(4)۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ گرد ہے جو چوپاؤں کے چلتے وقت ان کے پاؤں سے لگ کر اڑتی ہے(5)۔ یہ بھی کہا گیا ہے الھباء المنثور وہ غبار ہے جو روشن دان میں دکھائی دیتا ہے۔ اور الھباء المنبث وہ

ہے جسے گھوڑوں وغیرہ کے پاؤں سے لگنے کے سبب ہوا اڑاتی ہے۔ تو یہاں ان کے وہ اعمال جنہیں نفع نہ دینے اور حقیر ہونے کے سبب ضائع کر دیا جائے گا انہیں اولاً غبار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور پھر ان کے بکھرے ہونے کے سبب انہیں منثور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس حیثیت سے کہ انہیں بھی ھباءً منثورا کی طرح اکٹھا کرنا اور منظم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ یا یہ متفرق ہونے میں ان اعراض کی مثل ہوں گے جس کی طرف وہ متوجہ رہتے تھے۔ یا یہ خبر کی طرح ہونے کی وجہ سے تیسرا مفعول ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے: كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِيْلًا ۝۲۴

"اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانہ ہوگا اور دوپہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہوگی۔[1]"

[1] یعنی جس دن وہ ملائکہ کو دیکھیں گے "مُسْتَقَرًّا" مستقر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں اکثر اوقات ٹھکانہ کیا جاتا ہو۔ اور مَقِيْل سے مراد وہ جگہ ہے جہاں بیویوں سے راحت حاصل کرنے کے لیے پناہ لی جاتی ہے اور اس سے مراد ان سے لطف اندوز ہونا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد دوپہر کے قیلولہ کی جگہ ہو۔ اس تشبیہ کی بناء پر کہ جنت میں نیند نہیں ہوگی۔ ازہری نے کہا ہے کہ قیلولہ اور مقیل سے مراد دوپہر کے وقت آرام کرنا ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ نیند نہ بھی ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَاَحْسَنُ مَقِيْلًا" (اور دوپہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہوگی) اور جنت میں نیند نہیں ہوگی (1)۔ اور اَحْسَنُ میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا قیلولہ حسین وجمیل صورتوں اور دیگر محاسن سے مزین ہوگا۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ مستقر اور مقیل سے مراد مصدر یا ظرف زمان ہو اور اشارہ اس طرف ہو کہ ان کی جگہ اور زمانہ اس سے انتہائی اچھا اور اعلیٰ ہوگا جو کچھ عام جگہوں اور زمانوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے۔ اور یہ فضیلت یا تو مطلقاً زیادتی کے اعتبار سے ہے یا یہ فضیلت ان چیزوں کی نسبت ہے جو دنیا میں خوشحال لوگوں کی طرف منسوب ہوتی ہیں۔ ابن مبارک نے الزہد میں، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور حاکم نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے اور حاکم نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن نصف النہار نہیں ہوگا کہ یہ (اہل جنت) اور وہ (اہل جہنم) قیلولہ کر لیں گے (2)۔ امام بغویؒ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یوم قیامت کو دن نصف تک نہیں پہنچے گا یہاں تک کہ اہل جنت جنت میں قیلولہ کریں گے اور اہل النار دوزخ میں قیلولہ کریں گے۔ اور پھر یہ پڑھا "ثُمَّ اِنَّ مَقِيْلَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ" اسی طرح وہ پڑھا کرتے تھے۔

ابن مبارک، سعید بن منصور، ابن جریر، ابن منذر اور ابونعیم نے حلیہ میں حضرت ابراہیم نخعی سے قول نقل کیا ہے کہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کے حساب سے نصف النہار کے وقت فارغ ہوگا۔ پس اہل جنت جنت میں قیلولہ کریں گے اور اہل النار دوزخ میں (3)۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اس آیت کے بارے کہا کرتے تھے کہ اس دن حساب اس کے اول حصہ میں ہوگا اور قوم اس وقت یہ قول کرے گی جبکہ وہ جنت میں اپنے مراتب پر ہوں گے اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ روایت بھی ہے کہ قیامت کا دن مومنین کے لیے انتہائی چھوٹا ہوگا حتیٰ کہ یہ عصر اور مغرب کے درمیانی وقت کی مثل ہو جائے گا۔

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ۝۲۵

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　2۔ مستدرک حاکم، جلد 2 صفحہ 437 (العلمیہ)　3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

''اور یاد کرو جس روز پھٹ جائے گا آسمان اور بادل نمودار ہوگا[1] اور اتارے جائیں گے فرشتے گروہ در گروہ[2]''

[1] اس کا عطف یَوْمَ یَرَوْنَ پر ہے۔ اہل کوفہ اور ابو عمرو نے یہاں شین کو مخفف پڑھا ہے اور سورۂ ق میں دو تاء میں سے ایک کے حذف کے ساتھ۔ اور بقیہ قراء نے تاء کو شین میں مدغم کر کے مشدد پڑھا ہے۔ یاد کرو جس روز بادل کے نمودار ہونے کے سبب آسمان پھٹ جائے گا۔ اس سے مراد وہی بادل ہے جس کا ذکر اس ارشاد گرامی میں ہے هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یہ کہر کی مثل سفید رنگ کا باریک بادل ہوگا۔ اور یہ صرف بنی اسرائیل کے میدانوں میں ظاہر ہوا ہے۔ امام بغویؒ نے کہا ہے کہ اس میں باءعن کے معنی میں ہے، یعنی یہ دونوں عمل ایک دوسرے کے پیچھے ہوں گے جیسا کہ کہا جاتا ہے ''رَمَيْتُ السَّهْمَ بِالْقَوْسِ وَعَنِ الْقَوْسِ'' پس معنی یہ ہے کہ آسمان پر بادل نمودار ہونے کے ساتھ ہی پھٹ جائے گا۔

[2] عام قاریوں نے نُزِّلَ کو ایک نون، زاء مشدد اور لام کے فتحہ کے ساتھ صیغہ ماضی مجہول کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور ملائکہ کو مسند الیہ ہونے کی بناء پر رفع دیا ہے۔ اور ابن کثیر نے تعظیم کی بناء پر اسے دو نون، زاء مخفف اور لام کے ضمہ کے ساتھ صیغہ جمع متکلم فعل مضارع معروف کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور اسے انزال سے بنایا ہے اور ملائکہ کو مفعول ہونے کی بناء پر نصب دی ہے۔ حاکم، ابن ابی حاتم، ابن جریر اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الاموال میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے یہ پڑھا ''يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ'' اور کہا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک ہی میدان میں مخلوق کو جمع فرمائے گا جن میں جنات، انسان، چوپائے، درندے، پرندے اور تمام مخلوق ہوگی۔ پس اتنے میں آسمان دنیا پھٹ جائے گا۔ اور اس کے باسی بھی اتر آئیں گے۔ اور ان کی تعداد زمین میں موجود جن وانس اور تمام مخلوق سے زیادہ ہوگی حتیٰ کہ وہ جن وانس اور تمام مخلوق کو گھیر لیں گے۔ تو اہل زمین انہیں کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے نہیں۔ پھر دوسرے آسمان میں رہنے والے اتریں گے اور وہ تعداد میں آسمان دنیا اور زمین کے باسیوں سے زیادہ ہوں گے۔ پس وہ انہیں کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ تو وہ کہیں گے نہیں۔ نتیجۃً وہ اپنے سے پہلے اترنے والے ملائکہ، جنات، انسان اور تمام مخلوق کو گھیر لیں گے۔ پھر تیسرے آسمان کے رہنے والے اتریں گے ان کی تعداد دوسرے اور پہلے آسمان اور اہل زمین سے زیادہ ہوگی۔ پس یہ ان سے کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے نہیں پھر چوتھے آسمان کے مکین اتریں گے۔ ان کی تعداد پہلے، دوسرے اور تیسرے آسمان اور اہل زمین سے زیادہ ہوگی۔ تو یہ ان سے کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے نہیں۔ پھر پانچویں آسمان کے باسی اتریں گے اور ان کی تعداد سابقہ مکمل تعداد سے زیادہ ہوگی۔ پھر چھٹے آسمان کے رہنے والے اتریں گے ان کی کیفیت بھی یہی ہوگی۔ پھر ساتویں آسمان کے رہنے والے اتریں گے اور ان کی تعداد تمام آسمانوں اور اہل زمین کی تعداد سے زیادہ ہو گی۔ تو یہ ان سے کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے نہیں۔ پھر ہمارا رب (اپنی شان کے مطابق) بادل کے سائے میں نزول فرمائے گا اور اس کے ارد گرد کروبیون ہوں گے اور ان کی تعداد تمام آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے باسیوں سے زیادہ ہوگی ان کے قدموں کے درمیان حاملین عرش ان کے ساتھ نیزے کی گانٹھوں کی طرح اس طرح ملے ہوئے ہوں گے۔ ان کے قدم کے نچلے حصے سے لے کر اس کے ٹخنے تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی۔ ٹخنے سے گھٹنے تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی، گھٹنے سے کمر تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی، کمر سے ہنسلی تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی اور ہنسلی سے لے کر کان تک پانچ سو سال کی مسافت ہو گی(1)۔ یہ حدیث اور اللہ تعالیٰ کے نزول کی تاویل کے بارے میں علماء کے اقوال سورۂ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر میں گزر چکے ہیں هَلْ

يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ (آخرت کے معاملات کو دنیاوی امور پر قیاس نہیں کیا جا سکتا)۔ ابن جریر اور ابن المبارک نے ضحاک سے نقل کیا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ آسمان کو حکم فرمائے گا وہ پھٹ جائے گا۔ اور فرشتے اس کے کناروں پر جمع ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں حکم فرمائے گا تو وہ نیچے اتر جائیں گے اور زمین پر رہنے والوں کا احاطہ کر لیں گے بعد ازاں دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے اور پھر ساتویں آسمان کے فرشتے اتریں گے۔ پس وہ ایک دوسرے کے پیچھے صف درصف کھڑے ہو جائیں گے۔ پھر ملک (شہنشاہ مراد رب کریم) نزول فرمائے گا مگر اس کی بائیں جانب جہنم ہوگا جب اہل زمین اسے دیکھیں گے تو وہ بھاگ کھڑے ہوں گے لیکن زمین کی اطراف میں سے جس طرف بھی جائیں گے ادھر ہی ملائکہ کی سات صفیں پائیں گے۔ لہٰذا واپس اسی جگہ کی طرف لوٹ آئیں گے جہاں وہ پہلے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۝ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ اور رب کریم کا یہ ارشاد بھی ہے وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ وَجِايْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ اور قول باری تعالیٰ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا اور یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے۔ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَىِٕذٍ وَّاهِيَةٌ ۝ وَّالْمَلَكُ عَلٰۤى اَرْجَآىِٕهَا یعنی آسمان نہیں پھٹے گا کہ اسی اثناء میں وہ لوگ ایک آواز سنیں گے اور حساب کے لیے آ جائیں گے۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذِ اِلْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ۝۲۶

"اس دن سچی بادشاہی (خداوند) رحمٰن کی ہوگی اور وہ دن کافروں کے لیے بڑا مشکل ہوگا [1]"

[1] اَلْمُلْكُ مبتدا ہے یومئذ اَلْمُلْک کے متعلق ہے اور الحق اَلْمُلْک کی صفت ہے اور لِلرَّحْمٰنِ مبتدا کی خبر ہے یعنی وہ ملکیت جو ثابت اور متحقق ہے اور اسے کبھی بھی زوال نہیں۔ اس دن وہ صرف رحمٰن کے لیے ثابت ہوگی۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یَوْمَىِٕذٍ مبتدا کی خبر ہو اور للرحمٰن اس کے متعلق ہو۔ اور یومًا کَانَ کی خبر ہے اور اس کا اسم ضمیر مستتر ہے۔ اور میں عَسِیْرًا یَوْمًا کی صفت ہے اور عَلَی الْکَافِرِیْنَ اس کے متعلق ہے، یعنی اصل عبارت اس طرح ہے "کَانَ ذَالِکَ الْیَوْمُ یَوْمًا شَدِیْدًا عَلَی الْکَافِرِیْنَ" حضرت ابو سعیدؓ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس دن کے بارے پوچھا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے کیا وہ دن اتنا طویل ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ مومن پر وہ دن انتہائی خفیف (آسان) ہوگا حتیٰ کہ اس پر وہ دن اس فرض نماز کی نسبت زیادہ آسان ہوگا جو وہ دنیا میں ادا کرتا تھا(1)۔ (یعنی جتنا وقت فرض نماز کی ادائیگی میں خرچ ہوتا تھا اس سے بھی کم وقت میں یہ طویل دن گزر جائے گا) واللہ اعلم

امام بغویؒ نے کہا ہے کہ عقبہ بن ابی معیط جب سفر سے واپس آتا تو اپنی قوم کے اشراف کو اپنے پاس کھانے پر بلایا کرتا تھا۔ وہ اکثر حضور نبی کریم ﷺ کی مجالست بھی کیا کرتا تھا۔ وہ ایک دن سفر سے واپس آیا۔ تو اس نے کھانے کا اہتمام کیا اور لوگوں کو کھانے کی دعوت دی اور ساتھ ہی حضور نبی کریم ﷺ کو بھی کھانے کے لیے بلایا جب کھانے کا وقت قریب ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تیرا کھانا نہیں کھاؤں گا یہاں تک کہ تو یہ شہادت دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ تو یہ سن کر عقبہ نے کہہ دیا "اشھدان لاالٰہ الااللّٰہ وان محمدًا رسول اللّٰہ" تو بعد ازاں آپ ﷺ نے اس کا کھانا تناول فرما

1۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 324 (العلمیہ)

لیا۔ عقبہ ابی بن خلف کا دوست تھا۔ جب اس نے ابی بن خلف کو اس واقعہ سے آگاہ کیا۔ تو اس نے کہا اے عقبہ تو صابی ہو گیا ہے۔ (یعنی تو نے اپنے آباء و اجداد کا دین چھوڑ دیا ہے)۔ اس نے جواباً کہا قسم بخدا میں صابی نہیں ہوا۔ میں نے تو صرف اس لیے ایسا کیا ہے کہ ایک آدمی میرے پاس آیا اور اس نے اس وقت تک میرا کھانا کھانے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ میں اس کی شہادت دوں۔ اس لیے مجھے حیا محسوس ہوئی کہ وہ میرے گھر سے چلا جائے اور میرا کھانا نہ کھائے۔ لہٰذا میں نے اس کی شہادت دے دی۔ تو اس نے میرا کھانا کھا لیا۔ یہ سن کر ابی بن خلف نے کہا میں کبھی بھی تجھ سے راضی نہیں ہوں گا مگر اس صورت میں کہ تو اس کے پاس جائے اور اس کے منہ پر تھوک دے۔ چنانچہ عقبہ نے ایسا ہی کیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مکہ سے باہر تیرے ساتھ ملاقات ہو گی تو میں تیرا سر تلوار سے اڑا دوں گا چنانچہ عقبہ غزوۂ بدر میں قید ہو کر مارا گیا۔ اور ابی بن خلف کو حضور نبی کریم ﷺ نے غزوۂ احد میں اپنے دست مبارک سے قتل کیا۔ اسی طرح اسے ابن جریر نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ ابی نے عقبہ کو کہا میں تجھ سے راضی نہیں ہوں گا مگر اسی صورت میں جبکہ تو اس کی گردن کو جھکائے اور اس کے منہ پر تھوک دے۔ چنانچہ اس نے آپ ﷺ کو دار الندوہ میں سجدہ کرتے ہوئے پایا تو اس نے ایسا کر دیا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا جب تو مکہ سے باہر نکلے گا تو میں تیرا سر تلوار سے اڑا دوں گا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے دن اسے قید کر لیا گیا اور آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسے قتل کرنے کا حکم فرمایا۔ اور ابی کو آپ ﷺ نے غزوۂ احد کے دوران نیزہ مارا اور وہ مکہ کی طرف واپس لوٹتے ہوئے راستے میں مر گیا (1)۔ عقبہ اور ابی دونوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾

"اور اس روز ظالم (فرط ندامت سے) کاٹے گا اپنے ہاتھوں کو لے (اور) کہے گا کاش! میں نے اختیار کیا ہوتا رسول (مکرم) کی معیت میں (نجات کا) راستہ لے"

لے اس کا عطف يَوْمَ تَشَقَّقُ پر ہے۔ "اَلظَّالِمُ" سے مراد عقبہ بن ابی معیط ہے۔ عَلٰى يَدَيْهِ یعنی حد درجہ حسرت اور ندامت کے سبب ظالم اپنے ہاتھ کاٹے گا۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ابی بن خلف حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا تھا تو عقبہ بن ابی معیط نے اسے ڈانٹا۔ اس وقت یہ آیت خَذُوْلًا تک نازل ہوئی۔ اسی طرح انہوں نے شعبی اور مقسم سے بھی نقل کیا ہے۔

قاضی بیضاوی نے فرمایا عض الیدین (ہاتھ کاٹنا)، اکل البنان (پورے کھانا) اور حرق الاسنان (دانت پیسنا) وغیرہ الفاظ غصے اور حسرت سے کنایہ ہوتے ہیں۔

حضرت ضحاک نے کہا ہے کہ جب عقبہ نے رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک پر تھوکا تو اس کی تھوک اس کے اپنے رخسار پر آ لگی جس کے سبب اس کے رخسار جل گئے اور اس کا نشان اس کے مرنے تک باقی رہا۔ (2)

شعبی نے کہا ہے کہ عقبہ بن ابی معیط امیہ بن خلف کا دوست تھا۔ عقبہ اسلام لے آیا تو امیہ نے کہا اگر تو نے محمد ﷺ کی بیعت کی ہے تو پھر میرا چہرہ تیرے لئے حرام ہے۔ چنانچہ اس نے کفر اختیار کیا اور مرتد ہو گیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی "وَ

يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ ” یعنی عقبہ بن ابی معیط بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف اللہ تعالیٰ کے بارے اختیار کردہ رویہ پر ندامت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ہاتھ کاٹے گا۔ اور اس نے اپنے آپ کو ایسے دوست کی اتباع کی خاطر معصیت اور کفر پر باقی رکھا جس نے اسے اللہ تعالیٰ کے راستے سے روک دیا(1)۔ عطاء نے کہا ہے وہ اپنے ہاتھ کھائے گا۔ یہاں تک کہ کہنیوں تک پہنچ جائے گا پھر وہ اگ آئیں گے پھر وہ انہیں اسی طرح کھائے گا حتیٰ کہ ہاتھ اگتے رہیں گے اور وہ انہیں اپنے کیے پر حسرت اور ندامت کرتے ہوئے کھاتا رہے گا۔(2)

۲ؐ اس میں تقدیر عبارت یہ ہے یَا قَوْمِ لَيْتَنِي اسے ابو عمروؒ نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور دوسروں نے سکون کے ساتھ اس صورت میں یہ يَعَضُّ کے فاعل سے حال ہے۔ اے کاش دنیا میں میں نے محمد ﷺ کی اتباع کی ہوتی۔ یا میں نے ان کی معیت میں ہدایت اور نجات کا کوئی راستہ اختیار کیا ہوتا۔ اور وہی حق کا راستہ ہے اور میں گمراہی اختیار نہ کرتا۔

يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾

”ہائے افسوس! کاش نہ بنایا ہوتا میں نے فلاں کو اپنا دوست ؎“

؎ اس سے مراد ابی بن خلف ہے اور فُلَانٌ یہ اعلام سے کنایہ ہے۔ (ہائے افسوس! کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا)

لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾

”واقعی اس نے بہکا دیا مجھے اس قرآن سے اس کے میرے پاس آجانے کے بعد ؎ اور شیطان تو ہمیشہ سے انسان کو (مشکل کے وقت) بے یار و مددگار چھوڑنے والا ہے ۲ؐ“

؎ واقعی فلاں نے مجھے بہکا دیا۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے یا اس کی کتاب سے یا رسول اللہ ﷺ کی نصیحت سے یا کلمہ شہادت سے یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے سبب اس ذکر کے میرے پاس آجانے کے بعد۔

۲ؐ یعنی گمراہ کرنے والا دوست۔ پس جن و انسان میں سے جو بھی سرکش ہے اور جو بھی اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روکنے والا ہے وہی شیطان ہے۔ خذلان سے فعول کے وزن پر ہے۔ اور اس کا معنی ہے اعانت اور مدد کو ترک کر دینا۔ یعنی یہ انسان کے ساتھ دوستی اختیار نہیں کرتا حتیٰ کہ اسے ہلاکت تک پہنچا دیتا ہے پھر اسے چھوڑ دیتا ہے اور اسے کوئی نفع نہیں دیتا۔ یہ آیات اگرچہ نزول کے اعتبار سے خاص ہیں لیکن عبارت کے لحاظ سے عام ہیں۔ لہٰذا ان کا حکم ایسے تمام لوگوں کو شامل ہے جو معصیت اور گناہ کے سبب ایک دوسرے کے دوست بنتے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا اچھا دوست کستوری والے (عطر فروش) کی طرح ہے۔ اور برا دوست بھٹی میں پھونک مارنے والے (لوہار) کی مثل ہے۔ کیونکہ عطر فروش یا تو آپ کو کچھ خوشبو عطا کر دے گا، یا آپ اس سے وہ خرید لیں گے ورنہ آپ اس کے پاس بیٹھنے کی دیر اچھی خوشبو پاتے رہیں گے۔ جب کہ اس کے برعکس بھٹی میں پھونک مارنے والا یا تو آپ کے کپڑوں کو جلا دے گا یا۔ پھر وہاں بیٹھنے کی دیر آپ ناپسندیدہ بو پاتے رہیں گے۔“ اسے بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔(3) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ”تم مومن سے مصاحبت اختیار کرو۔ وہ آپ کا وہی کھانا کھائے گا جو فالتو اور بچا ہوا ہوگا“(4)۔ اسے احمد، ابو داؤد، ترمذی،

1۔ ایضاً 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 282 (وزارت تعلیم) 4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 62 (وزارت تعلیم)

ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے لہٰذا اسے خوب غور وفکر کرنا چاہئے کہ وہ کسے دوست بنا رہا ہے؟(1) اسے بغویؒ نے روایت کیا ہے۔

شیخین نے صحیحین میں، امام احمد اور اصحاب سنن نے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور شیخین نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کی محبت ہوگی۔(2)

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾

''اور رسول عرض کرے گا میرے رب! بلاشبہ میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔[1]''

[1] یعنی محمد ﷺ اس دن کہیں گے۔ اس کا عطف يَعَضُّ الظَّالِمُ پر ہے۔ "يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي" نافع، ابو عمرو اور بزی نے اِنَّ قَوْمِي کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ اور قوم سے مراد قریش ہیں۔ جبکہ آیت طیبہ میں مہجور بمعنی متروک ہے (یعنی جسے چھوڑ دیا جائے)۔ یعنی میری قوم نے اس قرآن سے اعراض کر لیا اور اس کے ساتھ ایمان نہیں لائی۔ اور نہ ہی اس کے احکام کے مطابق عمل کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کو ہجر، ہذیان اور ناپسندیدہ قول کے قائم مقام قرار دیا اور یہ گمان کیا کہ قرآن کریم شعر ہے، یا جادو ہے یا پھر کہانت ہے۔ یہ نخعی اور مجاہد کا قول ہے(3)۔ ایک معنی اس طرح بھی کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دنیا میں فرمایا کہ وہ اپنے رب کی بادگاہ میں اپنی قوم کی یہ شکایت کریں گے'' کہ بیشک میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔'' اس معنی کی بناء پر قَالَ الرَّسُوْلُ کا عطف "قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ" پر ہے۔ اور جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کی بارگاہ میں اپنی قوم کی شکایت کی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ آپ کو تسلی دی۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾

''اور (اے حبیب) اسی طرح بنائے ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن جرائم پیشہ لوگوں سے [1] اور کافی ہے آپ کا رب (آپ کے لئے) منزل مقصود تک پہنچانے والا اور مدد فرمانے والا [2]''

[1] جس طرح ہم نے تیرے لیے مشرکین قریش میں سے دشمن بنائے ہیں اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے مشرکین میں سے دشمن بنائے ہیں۔ آیت کا عطف قَالَ الرَّسُوْلُ پر ہے۔ اور اس میں لفظ عدو واحد اور جمع دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ لہٰذا آپ اس طرح صبر کیجئے جیسے انہوں نے صبر کیا۔ بے شک میں تمہارا مددگار اور ھادی ہوں۔

[2] اور ان پر غلبہ پانے کے راستے کی طرف راہنمائی کرنے والا اور ان کے خلاف مدد کرنے والا تمہارا رب کافی ہے۔ ترکیب کلام میں هَادِيًا وَّنَصِيْرًا كَفٰى کے فاعل سے حال ہے۔ یا یہ نسبت سے تمیز ہیں جیسا کہ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا کا قول ہے۔ اسی طرح اس قول میں بھی ہے: "لِلّٰهِ دره فارساً" اور كَفٰى بِرَبِّكَ کا عطف كَذٰلِكَ جَعَلْنَا پر ہے۔

ابن ابی حاتم اور حاکم نے اور ضیاء نے المختارۃ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے اور اسے حاکم نے صحیح

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 60 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 911 (وزارت تعلیم)

قرار دیا ہے کہ مشرکین نے کہا اگر محمد (ﷺ) نبی ہیں (جیسا کہ وہ گمان کرتے ہیں) تو ان کا رب انہیں دکھ تکلیف کیوں دیتا ہے یا پھر ان پر قرآن کریم یکبارگی نازل کیوں نہیں کیا(1)۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝

''اور کہنے لگے کفار (ازراہ اعتراض) کیوں نہیں اتارا گیا ان پر قرآن یکبارگی؟ ا اسی طرح اس لیے کیا کہ ہم مضبوط کر دیں اس کے ساتھ آپ کے دل کو ۲ اور اسی لیے ہم نے ٹھہر ٹھہر کرا سے پڑھا ہے ۳''

ا اس کا عطف ''قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ'' پر ہے۔ ''لَوْلَا'' یہاں لَوْلَا هَلَّا (کیوں نہیں) کے معنی میں ہے۔ اور ''نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ'' میں نُزِّلَ اُنْزِلَ کے معنی میں ہے (یعنی کیوں نہیں ان پر قرآن یکبارگی اتارا گیا) جیسا کہ خَبَّرَ بمعنی اَخْبَرَ ہے۔ تا کہ وہ اس قول کے مناقض نہ ہو جائے۔ ''جُمْلَةً وَّاحِدَةً'' یعنی ترکیب کلام میں یہ القرآن سے حال ہے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام پر تورات، عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل اور داؤد علیہ السلام پر زبور یکبارگی نازل کی گئی۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ان کے اس اعتراض کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ (قرآن کریم کا) اعجاز اس کے یکبارگی نازل ہونے یا اس کے متفرق طور پر نازل ہونے سے مختلف نہیں ہوتا۔ بلکہ متفرق نزول میں کئی فوائد ہیں۔ جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول سے اشارہ کیا ہے۔

۲ یہ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ''اَنْزَلْنٰهُ كَذٰلِكَ مُفَرَّقًا'' (یعنی ہم نے اسے متفرق طور پر اس لیے نازل کیا ہے) تا کہ اس متفرق نزول کے سبب ہم آپ کے دل کو اسے یاد کرنے اور سمجھنے کے لیے مضبوط کر دیں، اس لیے بھی کہ واقعات کے مطابق اس کا نازل ہونا معنی کی بصیرت عطا کرتا ہے، اور اس لیے بھی کہ جب یہ بتدریج نازل ہوگا اس حال میں کہ اس کا ہر جز چیلنج ہوگا اور وہ اس کا معارض لانے سے عاجز ہوں گے تو یہ آپ کے دل کی قوت میں اضافہ کا سبب ہوگا۔ اور اس کے متفرق نزول کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ جب مختلف حالات میں جبریل نازل ہوں گے تو اس سے آپ کا دل پختہ ہو جائے گا۔ ان فوائد میں سے ایک ناسخ و منسوخ کی پہچان ہے اور قرائن حالیہ کو دلالات لفظیہ کے ساتھ ملانا ہے۔ کیونکہ یہ طریقہ بلاغت میں زیادہ پر زور ہوتا ہے۔

۳ اس کا عطف اس فعل مقدر اَنْزَلْنٰهُ پر ہے جس کے متعلق لِنُثَبِّتَ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے۔ ''بَيَّنَهٗ بَيَانًا'' (اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی واضح اور بین نازل فرمایا)۔ ترتیل کا معنی ہے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا۔ سدی نے کہا ہے کہ اس کا مطلب ہے ''فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيْلًا'' (کہ ہم نے اسے تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے)۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا بعض حصہ بعض کے بعد نازل فرمایا۔ اور نخعی اور حسن کا قول ہے ''فرقناہ تفریقا'' (2) (کہ ہم نے اسے جدا جدا کر کے نازل کیا ہے) ترتیل فی الاسنان کا اصل معنی دانتوں کا کشادہ ہونا ہے۔

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝

''اور نہیں پیش کریں گے آپ پر کوئی اعتراض مگر ہم لائیں گے آپ کے پاس اس کا صحیح جواب ا اور عمدہ تفسیر (جو

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا — 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اعتراض کورد کردے گی)۔ ؎۲ ''

؎۱ اور وہ آپ پر کوئی عجیب سوال پیش نہیں کریں گے۔ گویا کہ اس سوال سے وہ آپ کی نبوت پر اعتراض کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ مگر ہم ان کے سوال کا ایسا جواب لائیں گے جو ان کے اعتراض کو بالکل رد کردے گا۔

؎۲ اس کا عطف جار اور مجرور پر ہے یعنی وہ جواب جو بیان کے اعتبار سے اتنا حسین اور اعلیٰ ہوگا کہ ان کے اشکال کو زائل کردے گا۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ آپ کے پاس کسی عجیب حال کے ساتھ نہیں آئیں گے کہ وہ یہ کہیں اس کا حال یہ تھا، مگر ہم آپ کو ایسا حال عطا کریں گے جو ہماری حکمت کے مطابق آپ کے شایانِ شان ہوگا اور وہ آپ کے مقصد بعثت کو بہتر انداز میں واضح کرنے والا ہوگا۔ اَلْفَسْرُ کا معنی ہے ظاہر کرنا اور پردے کو ہٹانا۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾

'' جو لوگ ہانکے جائیں گے اوندھے منہ جہنم کی طرف ان کا بہت برا ٹھکانا ہوگا اور وہ سب سے زیادہ گم کردہ راہ ہوں گے ؎۱ ''

؎۱ یہ مذمت ہے ان لوگوں کی جنہیں منہ کے بل جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ اس اعتبار سے اسم موصول یا محل نصب میں ہے یا محل رفع میں۔ یا پھر یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اُولٰٓئِكَ الخ ہے۔ (اس میں اَضَلُّ صیغہ اسم تفضیل ہے) اس میں مفضل علیہ الرسول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے طریقہ پر قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ گویا یہ کہا گیا کہ انہیں ان سوالوں پر ابھارنے والی شئی آپ کے راستہ کو بھٹکا ہوا سمجھنے کے سبب آپ کے مکان کو حقیر جاننا ہے۔ اور وہ اپنی حالت کو نہیں جانتے کہ انہیں معلوم ہو جائے ان کا اپنا ٹھکانا زیادہ برا اور وہ زیادہ گم کردہ راہ ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول اس قول باری تعالیٰ سے متصل ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا اس آیت میں بھی مفضل علیہ عام ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ان کا ٹھکانہ ہر کمین کی نسبت زیادہ برا اور ہر گم کردہ راہ کی نسبت وہ زیادہ گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں کلمے مکاناً اور سبیلاً نسبت سے تمییز ہیں اور سبیل کی صفت ضلال سے بیان کرنا مبالغہ کے لئے اسناد مجازی کی بناء پر ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' قیامت کے دن لوگوں کو تین حالتوں پر چلایا جائے گا سوار، پیدل اور منہ کے بل۔'' ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا وہ اپنے مونہوں کے بل چل سکیں گے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ ذات جس نے انہیں قدموں پر چلایا وہ انہیں منہ کے بل چلانے پر بھی قادر ہے۔ اسے ابوداؤد اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ (1)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کافر کو منہ کے بل کیسے چلایا جائے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا وہ ذات جس نے اسے دنیا میں پاؤں کے بل چلایا وہ اسے قیامت کے دن منہ کے بل چلانے پر قادر نہیں ہو گی۔ متفق علیہ۔ (2)

حضرت معاویہ بن حیدہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے بیشک تمہیں پیدل اور سواریوں پر چلایا جائے گا اور تمہیں اپنے مونہوں کے بل گھسیٹا جائے گا۔ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور حسن کہا ہے۔ (3)

1۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 318 (العلمیۃ)   2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 701 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 142 (وزارت تعلیم)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے صادق مصدوق نبی ﷺ نے فرمایا لوگوں کو قیامت کے دن تین گروہوں کی صورت میں نکالا جائے گا ان میں سے ایک گروہ خوش خوراک، خوش پوش اور سوار ہوگا، دوسرا گروہ چل رہا ہوگا اور دوڑ رہا ہوگا اور تیسرا گروہ وہ ہے جسے ملائکہ مونہوں کے بل گھسیٹ رہے ہوں گے۔ اسے نسائی، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔(1)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۟ۖۚ ﴿۳۵﴾

''اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ کو کتاب اور مقرر کیا ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو (ان کا) وزیر [1]''

[1] اس میں کتاب سے مراد تورات ہے۔ (جو ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی) اور ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے لیے اعلاء کلمۃ اللہ اور دعوت حق دینے کے لیے وزیر اور معاون بنایا۔ اور یہ نبوت میں ان کی مشارکت کے منافی نہیں کیونکہ کسی امر میں دو شریک اس میں ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں۔

فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ۟ؕ ﴿۳۶﴾

''پھر ہم نے حکم دیا دونوں جاؤ اس قوم کی طرف جنہوں نے جھٹلایا ہے ہماری آیتوں کو [1] (وہ گئے، قوم نے ان کو ٹھکرا دیا) تو ہم نے ان کو بالکل برباد کر دیا [2]''

[1] پھر ہم نے دونوں کو کہا کہ تم دونوں اس قوم کو اللہ تعالیٰ اور اس کی ان آیات پر ایمان لانے کی دعوت دو جو اس کے وجود، وحدانیت اور اس کی صفات کاملہ پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ صانع کے وجود کا انکار کرتے تھے یا پھر غیر کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے اور بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ اور یہاں آیات سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے معجزات لینا بھی جائز ہے۔ اس بناء پر ''الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا'' کی نسبت زمانۂ حکایت کی طرف کرنا صحیح ہے۔ زمانۂ حکایت سے مراد قرآن کریم کے نزول کا زمانہ ہے۔ لیکن آیات سے مراد تورات کی آیات لینا جائز نہیں۔ کیونکہ وہ فرعون اور اس کی قوم کے ہلاک ہونے کے بعد نازل ہوئیں۔

[2] یہاں اختصار کے لیے کچھ کلام محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے۔ ''فَذَهَبَا اِلَيْهِمْ فَدَعَوَاهُمْ اِلَى الْاِيْمَانِ بِاللّٰهِ وَ اٰيَاتِهٖ فَكَذَّبُوْهُمَا فَدَمَّرْنَاهُمْ تَدْمِيْرًا'' (یعنی وہ دو قوم کی طرف گئے اور اسے اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات پر ایمان لانے کی دعوت دی تو قوم نے انہیں جھٹلا دیا تو ہم نے انہیں (قوم کو) بالکل برباد کر دیا) کلام میں صرف اتنے الفاظ پر اکتفا کیا گیا جو سارے واقعہ سے مقصود ہیں۔ اور وہ رسولوں کی بعثت پر حجت قائم کرنا اور انہیں جھٹلانے کے سبب بربادی اور ہلاکت کا استحقاق ثابت کرنا ہے۔

وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۟ۚۖ ﴿۳۷﴾

''اور قوم نوح کو یاد کرو [1] جب انہوں نے جھٹلایا رسولوں کو [2] تو ہم نے انہیں غرق کر دیا اور بنا دیا انہیں دوسرے لوگوں کے لیے عبرت اور تیار کر رکھا ہے ہم نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب [3]''

[1] یہ یا تو ''اُذْكُرْ'' فعل کے سبب منصوب ہے۔ یا پھر اس مضمر فعل کے سبب جس کی تفسیر ''اَغْرَقْنَا هُمْ'' کرتا ہے یعنی ''اَغْرَقْنَا قَوْمَ نُوْحٍ'' لیکن اسے ''دَمَّرْنَاهُمْ'' میں ''هُمْ'' ضمیر پر معطوف کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس طرح کیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ موسیٰ

1۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 399 (العلمیہ)

علیہ السلام کے آنے کے بعد نوح علیہ السلام کی قوم برباد ہوئی۔ حالانکہ وہ قوم ان سے پہلے تھی۔

ؔ۲ یہ "قَوْمَ نُوْحٍ" کو نصب دینے والے مضمر فعل کی ظرف ہے۔ یا اپنے مابعد فعل کی ظرف ہے۔ اور تکذیب الرسل سے مراد نوح علیہ السلام اور ان رسولوں کو جھٹلانا ہے جو ان سے پہلے تھے۔ یا اس سے مراد صرف نوح علیہ السلام کو جھٹلانا ہے۔ تو اس صورت میں صیغہ جمع لانے کا سبب یہ ہے کہ رسولوں میں سے کسی ایک کو جھٹلانا تمام رسولوں کو جھٹلانے کی مثل ہے۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے رسولوں کی بعثت کا انکار کر دیا۔

ؔ۳ ہم نے انہیں طوفان کے سبب غرق کر دیا۔ اور ہم نے ان کے غرق یا ان کے قصے کو لوگوں کے لیے عبرت بنا دیا اور ہم نے کفر کے سبب اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے

وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾

"اور یاد کرو قوم عاد، ثمود ؔ۱ اور اصحاب الرس کو ؔ۲ اور ان کثیر التعداد قوموں کو جو ان کے درمیان گزریں ؔ۳"

ؔ۱ اس کا عطف جَعَلْنٰهُمْ میں هُمْ ضمیر پر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس فعل محذوف کے سبب منصوب ہو جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے۔ یعنی "اَهْلَكْنَا عَادًا وَثَمُوْدَا" یا اس سے پہلے "اُذْكُرْ" فعل محذوف ہے۔ ان دونوں کا قصہ سورۂ اعراف وغیرہا میں گزر چکا ہے۔

ؔ۲ قاموس میں ہے کہ الرس کا معنی کسی شئی کی ابتداء ہے۔ اسی سے "رَسُّ الحمّٰى وَرَسِيْسُهَا" ہے۔ (بخار کی ابتدا ہونا اور پھر اس کا پختہ ہو جانا) علاوہ ازیں اس کے یہ معانی بھی ہیں۔ وہ کنواں جسے پتھروں کے ساتھ بنایا جائے (1) صلح کرانا، فساد ڈالنا یعنی یہ اسمائے اضداد میں سے ہے۔ آذربائیجان کی ایک وادی ہے جس پر ایک شہر تعمیر کیا گیا، کھودنا اور میت کو دفن کرنا ہے۔ اور اصحاب الرس کا اطلاق مخصوص قوم پر ہے۔ (اس نام کی متعدد وجوہات ہیں) یا تو اس لیے کہ وہ کفر اور شر ظاہر کرتے تھے اور زمین میں فساد برپا کرتے تھے، یا اس لیے کہ وہ کنویں کے مالک تھے، یا اس لیے کہ وہ اس وادی کے رہنے والے تھے، یا پھر اس لیے کہ انہوں نے اپنے نبی کو قتل کر دیا اور اسے دفن کر دیا۔ یہاں ان سے مراد وہ قوم ہے جو کنویں کے مالک تھے اور اپنے مال مویشی لے کر ان پر رہتے تھے اور عبادت بتوں کی کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کی طرف بلانے کے لیے حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا۔ لیکن انہوں نے اپنی سرکشی کے سبب حضرت شعیب علیہ السلام کو اذیت پہنچانے میں انتہائی زیادتی کی۔ پس اس اثناء میں کہ وہ کنویں کے اردگرد اپنے گھروں میں تھے کنواں بہنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے گھروں اور ساز و سامان سمیت دھنسا دیا۔ اس طرح وہ تمام کے تمام ہلاک ہو گئے۔ وہب بن منبہ نے اسی طرح کہا ہے۔ اور اسے ابن جریر اور ابن عساکر نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے۔ قتادہ اور کلبی نے کہا ہے کہ الرس یمامہ اُن کے کسانوں کا ایک کنواں تھا جنہوں نے اپنے نبی کو قتل کر دیا تھا تو پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ بعض نے یہ کہا ہے۔ کہ اصحاب الرس حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ثمود کے باقی رہ جانے والے لوگ تھے۔ اور وہی اس کنویں کے مالک تھے۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے: وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ۔ اسی طرح عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ سعید بن جبیرؓ نے فرمایا ان کا ایک نبی تھا جسے حنظلہ بن صفوان کہا جاتا تھا۔ انہوں

1۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 753 (التراث العربی)

نے انہیں قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک و برباد کر دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بہت بڑے پرندے کے ساتھ آزمایا جس میں تمام قسم کے رنگ موجود تھے۔ انہوں نے اس کا نام اس کی گردن لمبی ہونے کی وجہ سے عنق رکھا۔ وہ ان کے فتح ادمغ پہاڑ پر رہتا تھا۔ وہ ان کے بچوں پر جھپٹتا اور انہوں اچک کر لے جاتا تھا۔ تو حنظلہ نے اس کے لیے بددعا کی۔ پس اس پر آسمانی بجلی آپڑی پھر انہوں نے حنظلہ کو قتل کر دیا نتیجۃً انہیں بھی ہلاک کر دیا گیا۔

بغویؒ نے کہا ہے کہ کعب، مقاتل اور سدی نے کہا ہے کہ الرس سے مراد انطا کیہ کا کنواں ہے جس میں انہوں نے حبیب النجار کو قتل کیا تھا۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ یٰس میں کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے مراد وہ اصحاب اخدود ہیں جنہوں نے کھائی کھودی تھی۔ عکرمہ نے کہا ہے کہ انہوں نے اپنے نبی کو کنویں میں دفن کر دیا تھا(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرس کا معنی معدن ہے۔ اور اس کی جمع رساس ہے۔

سے کا عطف اصحب الرس پر ہے۔ یعنی "وَاَهْلَكْنَا قُرُوْنًا" قُرُوْن قَرْن کی جمع کثرت ہے۔ اور اس سے مراد وہ قوم ہے جو ایک زمانے سے متصل ہوتی ہے۔ قرن کی اضافت جب معین شخص یا معلوم جماعت کی طرف ہو تو اس سے مراد وہ ہوتے ہیں جو اس شخص یا اس جماعت سے متصل اور ملنے والے ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں سے اکثر یا ان ہی میں سے کوئی ایک۔ اسی میں سے وہ قول بھی ہے جس میں تین قرون کے لیے خیر کی شہادت دی گئی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے "خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُم(2) (سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے پھر ان کا جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں پھر ان کا جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں)۔ پس حضور نبی کریم ﷺ کا زمانہ ان صحابہ کرام کا زمانہ ہے جنہوں نے آپ ﷺ کا دیدار کیا، قرن ثانی سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے صحابہ کرام میں سے کسی ایک کو یا زیادہ کو دیکھا اور قرن ثالث سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان میں سے کسی ایک کو یا زیادہ کو دیکھا۔ اور اگر یہ مضاف نہ ہو تو اس سے مراد وہ قوم ہے جو ایک ہی زمانے سے متصل ہو۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کے جب ایک جماعت ایک زمانے سے مقترن ہو تو ان کے بڑے ان کے چھوٹوں سے ملے ہوتے ہیں (یعنی وہ ان کے ہمعصر ہوتے ہیں)۔ پھر یہ چھوٹے بچے جب بڑھاپے کی عمر کو پہنچتے ہیں تو ان کے زمانے کے بچے ان کے ہمعصر ہو جاتے ہیں۔ علماء نے قرن کا اطلاق ایک خاص مدت پر بھی کیا ہے۔ اور وہ مدت چالیس، دس، بیس، تیس، پچاس، ساٹھ، ستر، نوے، سو یا ایک سو بیا لیس سال ہے۔ اصح کا قول یہ ہے کہ قرن سے مراد سو سال ہیں۔ اس لیے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک بچے کو فرمایا "عش قرنًا" کہ تو ایک قرن زندہ رہے "فَعَاش مائة سنة" تو وہ سو سال تک زندہ رہا۔ تو اس بنا پر معنی یہ ہوگا کہ ہم نے کثیر زمانوں میں رہنے والے کافروں کو ہلاک کیا۔ اور ان کو جو عاد، ثمود، اصحاب الرس اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے درمیان تھے اور کثیر اقرون کی صفت ہے۔

وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۡ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾

"حق سمجھانے کے لیے ہم نے بیان کیں ہر ایک کے لیے مثالیں لے اور ہم نے سب کو نیست و نابود کر دیا۲"

لے یہ اس مضمر فعل کے سبب منصوب ہے جس پر ضربنا دلالت کرتا ہے۔ اور اس کی تنوین مضاف الیہ کے عوض ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے وَاَنْذَرْنَا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْ تِلْكَ الْقُرُوْنِ ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ (اور ہم نے ان قرون میں سے ہر ایک کو ڈرایا اور ان کیلئے مثالیں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 362 (وزارت تعلیم)

بیان کیں) یعنی ہم نے اس کے لیے پہلے قصوں میں عجیب وغریب قصے بیان کیے تاکہ وہ ان سے عبرت حاصل کریں۔

۲؎ ''ان میں سے تمام کو ہم نے مکمل طور پر ہلاک کر دیا جب انہوں نے مثالوں سے عبرت حاصل نہ کی اور ڈرانے والوں کو جھٹلایا۔ اخفش نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے ان کی قوت کو مکمل طور پر توڑ دیا''۔ زجاج نے کہا ہے كُلُّ شَيْءٍ كَسَّرْتَهُ وَفَتَّتَّهُ فَقَدْ تَبَّرْتَهُ(1) یعنی ہر وہ شئی جسے تو توڑ دے اور ریزہ ریزہ کر دے تو تو نے اس کی تتبیر کر دی۔ اسی وجہ سے سونے اور چاندی کے چورے (ریزوں) کو تبر کہتے ہیں۔

وَلَقَدْ أَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۚ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ نُشُورًا ﴿٤٠﴾

''اور کئی بار گزر رہے ہیں یہ مشرک اس قصبہ کے پاس سے جس پر پتھراؤ کیا گیا تھا بری طرح ۱؎ کیا (وہاں سے گزرتے ہوئے) وہ اسے نہیں دیکھا کرتے ۲؎ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں دوبارہ جینے کی امید ہی نہیں ہے ۳؎''

۱؎ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ پر معطوف ہے۔ اور ضمیر اہل مکہ کی طرف راجع ہے۔ اس میں بعض کا فعل تمام کی طرف منسوب ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ہے: فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا، یعنی ''وَاللّٰه لَقَدْ مَرَّ اهل مكة'' یعنی ان میں سے اکثر شام کی طرف اپنے سفروں کے دوران ان مقامات سے گزرے ہیں۔ یعنی سدوم عظمیٰ یہ قوم لوط کی بستیاں ہیں جن پر پتھر برسائے گئے اس لیے کہ وہ اعمال بد کیا کرتے تھے یعنی وہ مردوں کے ساتھ دبروں میں لواطت کا عمل کرتے تھے۔ بغویؒ نے کہا ہے کہ قوم لوط کی پانچ بستیاں تھیں جن میں سے چار کو اللہ تعالیٰ نے تباہ و برباد کر دیا۔ اور ان میں سے ایک چھوٹی سی بستی اس سے بچ گئی۔ اس لیے کہ اس کے باشندے اس فعل بد کا ارتکاب نہیں کرتے تھے۔ اور یہ بستیاں اہل مکہ کے شام کی طرف جانے والے راستے پر واقع تھیں۔

۲؎ یہ استفہام انکاری ہے۔ اور نفی کا انکار اثبات اور تقریر ہوتا ہے۔ یعنی انہوں نے انہیں ضرور دیکھا ہے تو پھر انہیں کیا ہوا کہ انہوں نے اس سے عبرت حاصل نہیں کی۔ اور نہ ہی نصیحت حاصل کی۔ اور ان کا نصیحت حاصل نہ کرنا ان کے نہ دیکھنے کے سبب نہیں بلکہ اس کا سبب ان کے دلوں کا اندھا ہونا ہے۔ اور دوبارہ زندہ کیے جانے اور آخرت کی توقع ہی نہیں رکھتے یا دوبارہ جینے کی وہ اس طرح امید نہیں رکھتے جس طرح مومنین اس میں ثواب حاصل ہونے کی امید رکھتے ہیں۔ یا پھر لغت تہامہ کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ وہ دوبارہ زندہ کیے جانے کا خوف نہیں رکھتے۔

وَإِذَا رَأَوْكَ إِنْ يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا أَهَٰذَا الَّذِي بَعَثَ اللَّهُ رَسُولًا ﴿٤١﴾

''اور جب وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ (کہتے ہیں) کیا یہ وہ صاحب ہیں جن کو خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے ۱؎''

۱؎ اس کا عطف لَا يَرْجُوْنَ پر ہے۔ یہ (ان نافیہ ہے) یعنی مَا يَتَّخِذُوْنَكَ استثناء مفرغ ہے اور يتخذونك مفعول ثانی ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ هُزُوًا مصدر بمعنی مفعول ہے، یعنی مَهْزُوًّا بِهٖ (جس کا مذاق اڑایا جائے) بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرتے تو استہزاء کرتے ہوئے کہتے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

"اَھٰذَا" اور اس سے وہ اشارہ رسول اللہ ﷺ کی طرف کرتے تھے۔ ترکیب کلام میں یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر یہ ہے جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اھذا کا مکمل جملہ فعل محذوف کا معمول ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "یقولون اَھٰذا الَّذِی بَعَثَہُ اللّٰہُ رَسُوۡلًا" (وہ کہتے ہیں کیا یہ ہے وہ جسے اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے) اس میں استفہام تعجب اور انکار کے لیے ہے۔ اور ھٰذَا کا کلمہ تحقیر کے لیے ہے۔ اور یقولون کا مکمل جملہ سابقہ کلام یتخذونک مھزوًا بہ کا بیان ہے۔

اِنۡ کَادَ لَیُضِلُّنَا عَنۡ اٰلِہَتِنَا لَوۡ لَاۤ اَنۡ صَبَرۡنَا عَلَیۡہَا ؕ وَ سَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ حِیۡنَ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ مَنۡ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ﴿۴۲﴾

"قریب تھا کہ یہ شخص ہمیں بہکا دیتا اپنے خداؤں سے [1] اگر ہم ثابت نہ رہے ہوتے ان کی (پوجا) پر۔ (اے حبیب) یہ جان لیں گے جب (ہمارے) عذاب کو دیکھیں گے کہ کون بھٹکا ہوا ہے راہ (راست) سے [2]"

[1] یعنی قریب تھا کہ وہ توحید کی طرف دعوت دینے میں اپنی حد درجہ کوشش، اسے جلدی ذہن نشین کرانے والے کثیر دلائل اور معجزات لانے کے سبب ہمیں اپنے خداؤں کی عبادت سے پھیر دیتا۔ یہ اِنْ مخففۃ عن المثقلۃ ہے۔ اور لام اِنْ نافیہ اور اِنْ مخففہ میں فرق کرنے کے لیے ہے۔ اور اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں دعوت توحید دینے میں بہت زیادہ کوشش کی اور ان کے لیے وافر اور کثیر مقدار میں معجزات پیش کیے حتی کہ وہ اپنے گمان کے مطابق اس کیفیت تک پہنچ گئے کہ وہ اپنے غلط اور ٹیڑھے دین کو آپ ﷺ کے صحیح اور سیدھے دین کے لیے چھوڑ دیتے اگر وہ اپنے خداؤں کی عبادت کرنے میں حد درجہ مضبوط اور پختہ نہ ہوتے۔ اور جس کی حالت یہ ہو کہ وہ اتنے کثیر مقدار میں واضح معجزات دیکھنے کے باوجود نصیحت حاصل نہ کرے تو وہ خالی بستیوں کے پتھروں کو دیکھ کر کیسے عبرت حاصل کر سکتا ہے۔

[2] اگر ہم ثابت نہ رہتے اور ان کی عبادت میں پختہ نہ ہوتے۔ لَوْ لَا کا جواب محذوف ہے اور اس پر اس کا ماقبل دلالت کرتا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "لَوْ لَا صَبْرُنَا ثَابِتٌ اَوْ لَوْلَا ثَبَتَ صَبْرُنَا لَاَضَلَّنَا" (اگر ہمارا صبر ثابت نہ رہتا تو وہ ہمیں ضرور بہکا دیتا) ایسے مقامات پر لَوْ لَا معنی کے اعتبار سے حکم مطلق کا فائدہ دیتا ہے نہ کہ لفظ کے اعتبار سے جب ان کا یہ کلام احساس دلاتا ہے کہ انہوں نے ضلال کی نسبت رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کی طرف کی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا "وَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ حِیْنَ یَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِیْلًا" یہ جان لیں گے کہ کیا وہ راستے سے بھٹکنے والے ہیں یا مومنین۔ تو اس میں وعید بھی ہے اور اس پر دلالت بھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں چھوڑے گا نہیں۔

اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـہَہٗ ہَوٰىہُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَکُوۡنُ عَلَیۡہِ وَکِیۡلًا ﴿ۙ۴۳﴾

"کیا آپ نے ملاحظہ فرمایا اس (احمق) کو جس نے بنالیا ہے اپنا خدا اپنی خواہش کو۔ کیا آپ اس کے ذمہ دار ہیں؟ [1]"

[1] اس طرح کہ اس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور اسی پر اپنے دین کی بنیاد رکھی اس نے نہ کوئی حجت سنی اور نہ کسی دلیل کی طرف دیکھا۔ اسی اہتمام کے لیے مفعول ثانی کو مقدم کیا۔ امام بغوی نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کیا آپ نے اس کو دیکھا ہے جس نے اپنے خالق اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑا ہے اور پتھر کی طرف مائل ہو کر اس کی عبادت کرنے لگا ہے؟ یہ مَنْ شرطیہ ہے۔ اور اس کی جزاء یہ ہے "اَفَاَنْتَ تَکُوْنُ عَلَیْہِ وَکِیْلًا" وکیل سے مراد وہ حفاظت کرنے والا ہے جو اسے اس (نظریہ) سے روک دے

یعنی مانع جملہ شرطیہ رایت کے دومفعولوں کے قائم مقام ہے۔ پہلا استفہام تقریر اور تعجیب کے لیے ہے اور دوسرا انکار کے لیے۔ یعنی آپ ان کے محافظ نہیں ہیں۔ کلبی نے کہا ہے کہ آیۃ القتال اس کی ناسخ ہے۔(1)

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾

"کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے ہیں یا (کچھ) سمجھتے ہیں[1] نہیں ہیں یہ مگر ڈنگروں کی مانند، بلکہ یہ تو ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں[2]"

[1] یہ ام منقطعہ ہے، یعنی بل اتحسب (بلکہ آپ کیا خیال کرتے ہیں) کہ ان میں سے اکثر آپ سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے ہیں یا وہ سمجھتے ہیں جو (مفہوم) اس سے مستفاد ہوتا ہے۔ یہ استفہام انکار کے لیے ہے۔ یعنی بے شک نہ وہ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے۔ یہاں سمع سے مراد ان کے دلوں کا سننا ہے کہ وہ مواعظ اور دلائل سے نفع نہیں اٹھا سکتے۔ اور اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ برہان کا معلوم نتیجہ کا فائدہ دینا امر عادی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ معلق ہوتا ہے۔ اور ان میں سے اکثر کی تخصیص اس لیے ہے کیونکہ ان میں سے بعض ایمان لائے تھے اور بعض نے حق کو سمجھا تھا لیکن تکبر یا ریاست کے خوف سے مخالفت کرتے رہے۔

[2] "اِنْ هُمْ" "وہ نہیں ہیں۔ یہ ضمیر (اکثرھم) کی طرف لوٹ رہی ہے۔ وہ اپنے کانوں سے چوپاؤں کی طرح سنتے ہیں لیکن اپنے دلوں سے نہیں سنتے اسی لیے وہ اس سے نفع حاصل نہیں کر سکتے اور جن دلائل اور معجزات کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں ان میں وہ غور و فکر اور تدبر نہیں کرتے۔ بلکہ یہ چوپاؤں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ کیونکہ چوپاؤں کو تو حق اور باطل کا ادراک ہی نہیں ہوتا اور نہ وہ حق کو باطل اور باطل کو حق گمان کرتے ہیں۔ پس چوپائے جہل بسیط ہیں اور کفار جہل مرکب ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو جہل مرکب کے سبب جاہل ہو وہ اس کی نسبت زیادہ گمراہ اور حق سے دور ہوتا ہے جو جہل بسیط کے سبب جاہل ہو۔ چوپائے تو حق اور باطل کے درمیان تمیز ہی نہیں کر سکتے اور کفار شرک کی حقیقت جانتے ہیں اور بلا دلیل بلکہ بطلان کے ظاہر ہونے کے باوجود پتھروں کی عبادت کرتے ہیں اور دلائل اور معجزات کا مشاہدہ کرنے اور برہان واضح ہونے کے باوجود رسولوں کا انکار کرتے ہیں۔ یہ وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ چوپائے اس کی پیروی کرتے ہیں جو ان کی دیکھ بھال کرتا ہے اور اپنے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے کو اس سے ممتاز کرتے ہیں جو اس سے برا سلوک کرتا ہے۔ اور وہ اس چیز کی خواہش کرتے ہیں جو ان کے لیے نفع بخش ہوتی ہے اور اس سے وہ دور بھاگتے ہیں جو ان کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ کفار نہ تو اپنے رب کی پیروی کرتے ہیں اور نہ وہ اپنے رب کا احسان شیطان کی برائیوں کے مقابلہ میں پہچانتے ہیں۔

اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ چوپائے اپنے خالق کو پہچانتے ہیں، اسے سجدہ کرتے ہیں اور اس کی تسبیح و تحمید بیان کرتے ہیں اور وہ عقل رکھتے ہیں اگرچہ عوام ان کی عقل کا ادراک نہیں کر سکتے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس اثناء میں کہ ایک آدمی گائے ہانک کر لا رہا تھا جب وہ تھک گیا تو اس پر سوار ہو گیا۔ تو گائے نے کہا ہمیں

اس لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ بلکہ ہمیں تو زمین کی کھیتی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تو لوگوں نے کہا سبحان اللہ گائے نے بات کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اس کے ساتھ ایمان رکھتا ہوں اور ابوبکر اور عمر بھی رضی اللہ عنہما حالانکہ وہ دونوں وہاں نہیں تھے۔ اور فرمایا کہ ایک آدمی اپنے ریوڑ کے پاس نہیں تھا۔ پس اچانک بھیڑیے نے بکری پر حملہ کیا اور اسے پکڑ لیا۔ اتنے میں اس کے مالک نے اس کا پیچھا کیا اور اسے بچالیا۔ تو بھیڑیے نے اسے کہا یوم سبع (قیامت کا دن) کو اس سے کون بچائے گا جب کہ اس کا نگران میرے بغیر کوئی نہ ہوگا۔ تو لوگوں نے کہا سبحان اللہ بھیڑیا باتیں کرتا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں، ابوبکر اور عمر اس پر ایمان لاتے ہیں۔ حالانکہ وہ دونوں وہاں موجود نہیں تھے۔ (1)

فائدہ: ۔ ملائکہ کے لیے روح اور عقل ہوتی ہے اور چوپاؤں کے لیے نفس اور خواہش ہوتی ہے اور آدمی میں یہ ساری چیزیں جمع ہوتی ہیں۔ لہٰذا اگر اس کا نفس اور خواہش روح اور عقل پر غالب آجائے تو وہ چوپاؤں سے زیادہ گمراہ ہوتا ہے اور اگر اس کی عقل اور روح نفس اور خواہش پر غالب آجائے تو وہ ملائکہ سے افضل ہو جاتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾

"(کیا آپ نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف) کیسے پھیلا دیتا ہے سایہ کو[1] اور اگر چاہتا تو بنا دیتا اسے ٹھہرا ہوا[2] پھر ہم نے بنا دیا آفتاب کو اس پر دلیل[3]"

[1] کیا تم نے اپنے رب کی صفت (کاری گری) کی طرف نہیں دیکھا کہ وہ سایہ کو کیسے پھیلا دیتا ہے۔ یا معنی یہ ہے کیا آپ نے سایہ کی طرف نہیں دیکھا کہ تیرا رب اسے کیسے پھیلاتا ہے۔ اسلوب کلام کی تبدیلی یہ احساس دلاتی ہے کہ دلیل کی جو وضاحت اس کلام سے سمجھی گئی ہے وہ سائے کا حادث ہونا اور اسباب ممکنہ کے ساتھ نفع بخش صورت پر اس کا گردش کرنا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ حکیم صانع کا فعل ہے جیسا کہ دکھائی دینے والی چیز کا مشاہدہ تو محسوس کیفیت ہے یا معنی یہ ہے کہ آپ کے علم نے آپ کو اپنے رب تک نہیں پہنچا دیا کہ وہ کیسے سایہ کو پھیلاتا ہے۔ اس سے مراد وہ سایہ ہے جو طلوع فجر سے لے کر طلوع شمس کے درمیانی وقت میں ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اسے ممدود (پھیلا ہوا) بنا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ ظل ہے جس کے ساتھ سورج نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے سایہ کے بارے فرمایا وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ یا ظل سے مراد وہ سایہ ہے جو سورج طلوع ہونے کے بعد دیواروں اور درختوں کا ہوتا ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ الظل وہ سایہ ہے جسے سورج ختم کردے۔ اور فی وہ سایہ ہے جو سورج کو ختم کردے لہٰذا زوال سے پہلے سایہ کو ظل کہا جاتا ہے اور زوال کے بعد سایہ کو فی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ مشرق کی جانب سے لوٹ کر مغرب کی طرف آتا ہے۔ اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ ظل سے مراد رات کی تاریکی ہے جسے سورج طلوع ہونے کے بعد ختم کر دیتا ہے۔

[2] اور اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ اسے ثابت اور ایک ہی جگہ ٹھہرا ہوا بنا دیتا۔ یہ سَكَنَ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے قرار اور سکون اختیار کرنا ٹھہرنا۔ اس طرح کہ وہ یوم قیامت تک ہمیشہ کے لیے رات ہی بنا دیتا۔ یا یہ سُكُوْن سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے نہ سکڑنے والا سایہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایک ہی حالت پر سورج کو قائم رکھتا۔ ترکیب کلام میں وَلَوْ شَآءَ کا جملہ "من ربک" سے حال

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 494 (وزارت تعلیم)

ہے۔یا یہ جملہ معترضہ ہے۔

۳؎ پھر ہم نے آفتاب کو سائے پر دلیل بنادیا۔یعنی اگر سورج (دھوپ) نہ ہوتا تو سایہ سائے کی صورت میں نہ پہچانا جاتا اور اگر نور نہ ہوتا تو کوئی تاریکی کو نہ پہچانتا۔کیونکہ چیزوں کی پہچان اپنی اضداد سے ہوتی ہے۔اور یہ بھی ہے کہ سایہ کا وجود اور اس میں تفاوت سورج کی حرکات کے سبب ہوتا ہے۔اور اس آیت میں غیب سے متکلم کی طرف التفات کیا گیا ہے۔

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾

''پھر ہم سمیٹے جاتے ہیں سایہ کو اپنی طرف ۱؎ آہستہ آہستہ ۲؎''

۱؎ پھر ہم نے اسے سورج کے طلوع ہونے،اس کے بلند ہونے اور سایہ کی جگہ پر اس کی شعاعیں پڑنے کے سبب زائل کر دیا۔کیونکہ سائے کے پھیلانے کو مد اور اس کے زائل کرنے کو قبض سے تعبیر کیا گیا ہے۔''اِلَيْنَا''یعنی اس جگہ کی طرف جس کا ہم اس سے ارادہ کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ القبض الی نفسہ روکنے سے کنایہ ہے۔

۲؎ قَبْضًا يَّسِيْرًا سے مراد یہ ہے کہ آسانی سے بغیر کسی مشکل کے یا تھوڑا تھوڑا کر کے جیسے جیسے سورج بلند ہوتا ہے سایہ کم ہوتا جاتا ہے۔اور اگر ظل سے مراد رات کی تاریکی ہو تو قبضۃ الیسیر کا معنی ہوگا طلوع فجر کے وقت آہستہ آہستہ تاریکی کو زائل کرنا۔آہستہ آہستہ تاریکی کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ روشنی بہت زیادہ ہو جاتی ہے پھر جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ان تمام مقامات سے تاریکی دور ہو جاتی ہے جہاں سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں۔اور ان مقامات سے تاریکی کم ہو جاتی ہے جہاں اس کی روشنی پردوں میں سے واقع ہوتی ہے اور یہ نور پردوں کے مختلف ہونے کے اعتبار سے کم وبیش ہوتا ہے۔دونوں مقامات پر لفظ ''ثُمَّ''سورج کے ظاہر ہونے کے اوقات کے تفاضل کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔گویا یہاں ان دونوں کے درمیان فضل کے اعتبار سے جو بعد پایا جاتا ہے اسے حوادث کے مابین وقت کے اعتبار سے پائے جانے والے بعد کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔اور میرے نزدیک یہاں اس کی دوسری تاویل بھی ہے وہ یہ کہ ظل سے مراد عالم امکان لیا جائے کیونکہ مرتبۃ الوجوب کا ظل خارج ظلی میں وجوب ظلی کے ساتھ موجود ہے۔اور شمس سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے اسماء کے مراتب لیے جائیں۔اور معنی یہ ہوگا کہ آپ نے اپنے رب کی صفت کی طرف نہیں دیکھا اس نے عالم امکان کیسے بنایا اور ان ماہیات ممکنہ کی صورتوں پر پھیلنے والے وجود کو پھیلایا جو حق کے وجود کا ظل ہے۔اور اگر وہ چاہتا تو وہ اسے ایک ہی حالت میں ٹھہراتے ہوئے ساکن بنا دیتا،لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا،بلکہ اسے تغیرات اور فنا کے لیے تیار کرتے ہوئے حوادث کا محل بنایا تاکہ اس کا ممکن ہونا اور اس ماہیت کا محتاج ہونا واضح ہو جائے جو اہل الوجود ہے اور اس کی ذات واجب اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا۔اور جس وقت صوفی پر اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات ظاہر ہوتی ہیں اور وہ بصیرت قلبی سے حق کے وجود کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس وقت اس کے لیے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ عالم امکان اس کے ظلال میں سے ایک ظل ہے۔حالانکہ ان تجلیات اور مشاہدات سے قبل وہ یہ گمان رکھتا تھا کہ عالم امکان فی الحقیقت موجود ہے۔پھر ان تجلیات اور مشاہدات کے بعد ہم نے اسے اپنی طرف سمیٹا یعنی ہم نے اسے چن لیا اور ہم نے اسے ایسا قرب عطا کیا جو کسی کیفیت سے متکیف نہیں،اپنی صفات اور ذات کے مراتب کی طرف آہستہ آہستہ قریب کرتے ہوئے۔رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رب کریم نے فرمایا ''لَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهُ فَاِذَا اَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ

الْحَدِیْث"(1) (میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پس جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی قوتِ سماعت ہوتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔) اور صوفیہ نے کہا ہے "مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ" (جس کے دو دن برابر ہوں گے یعنی ترقی درجات نہ کرے تو وہ ضعیف الرائے ہوگا یعنی وہ خسارے میں ہوگا)

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾

"اور وہی ہے جس نے بنایا ہے تمہارے لیے رات کو لباس اور نیند کو باعث راحت اور بنایا ہے دن کو (طلب معاش کے لیے) دوڑ دھوپ کا وقت [1]"

[1] الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا اس میں رات کی تاریکی کو ڈھانپ دینے کے وصف میں لباس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ (یعنی تیرا رب وہ ہے جس نے تمہارے لیے رات کو لباس بنایا) اور نیند کو ابدان کے لیے راحت بنایا اس طرح کہ اس سے مشاغل ومصروفیات منقطع ہو جاتی ہیں۔ سبت کا اصل معنی کاٹنا ہے۔ یا سبات کا معنی موت ہے۔ (یعنی نیند کو موت بنایا) جیسا کہ اس ارشاد میں ہے وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰكُمْ بِالَّیْلِ۔ اسی وجہ سے میت کو مَسْبُوْت کہا جاتا ہے۔ اور دن کو دوڑ دھوپ کرنے اور منتشر ہونے کا وقت بنایا اس میں لوگ دینی اور دینوی منافع کے حصول کے لیے پھیل جاتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾

"اور وہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو خوش خبری دینے کے لیے اپنی رحمت (بارش) سے پہلے [1] اور ہم اتارتے ہیں آسمان سے پاکیزہ پانی۔ [2]"

[1] ابن کثیر نے الرِّیْح کو جنس مراد لے کر صیغہ واحد کی صورت میں الرِّیْح پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے افراد کا اعتبار کرتے ہوئے صیغہ جمع کی صورت میں قرأت کی ہے۔ اور "بُشْرًا" کو جمہور نے نون اور شین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس طرح یہ نُشُوْر سے ماخوذ ہے۔ ابن عامر نے اسے نون کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ تخفیف کی صورت پر پڑھا ہے۔ حالانکہ اصل میں شین پر ضمہ ہے۔ اس صورت میں یہ ناشرۃ کی جمع ہے۔ یعنی بادلوں کو گھیرنے والی ہوا۔ حمزہ اور کسائی نے اسے نون کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ مصدر ہے اور اس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے اور عاصم نے اسے باء کے ضمہ اور شین مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بُشْرٌ یہ بَشِیْر کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے خوشخبری دینے والی۔ "بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ" سے مراد بارش سے پہلے ہے۔

[2] وانزلنا میں غیب سے تکلم کی طرف التفات کے طریقے پر اس کا عطف ارسل پر ہے۔ اور الطَّهُوْرُ سے مراد وہ شی ہے جس سے پاکیزگی وطہارت حاصل کی جاتی ہے۔ جیسا کہ سحور سے مراد وہ شے ہوتی ہے جس سے سحری کی جائے اور فطور سے مراد وہ جس سے افطاری کی جائے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کے اس ارشاد میں ہے کہ بے شک پاک مٹی مسلمان کے لئے طہارت کے حصول کا سبب ہے۔ جبکہ وہ پانی نہ پائے اگرچہ ایسا دس سال تک ہو(2)۔ اسے احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "ہمارے لیے تمام زمین مسجد بنا دی گئی ہے اور اس کی مٹی کو پاک کرنے والا بنایا گیا ہے(3)۔ یا پھر طہور مصدر ہے جیسا کہ قبول۔ چنانچہ آقائے دو جہاں ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 963 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 18-17 (وزارت تعلیم) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 407 (رشیدیہ)

منہ ڈال لے تو اس کی پاکیزگی اس میں ہے کہ وہ اسے سات مرتبہ دھوئے اور ان میں سے پہلی مرتبہ مٹی کے ساتھ صاف کرے(1)۔ اسے امام مسلم اور ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ پانی (مآء) کی اس کے ساتھ صفت مبالغہ کے لئے لگائی گئی ہے۔ اور کوئی صفت مبالغہ کے لئے نہیں ہوتی۔ جیسا کہ صبور، شکور، قطوع اور ضحوک۔ یہ پاکیزگی میں کامل ہونے کے معنی میں ہے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ بعض نے یہ کہا ہے کہ طہور سے مراد وہ شے ہے، جس سے بار بار طہارت حاصل ہو۔ جیسا کہ صبور اس شی کا نام ہے جس سے بار بار صبر کیا جائے اور شکور اس شے کا نام ہے۔ جس سے بار بار شکر ادا کیا جائے۔ یہ حضرت امام مالک کا قول ہے اسی لیے انہوں نے اس پانی سے وضو جائز قرار دیا ہے جسے ایک بار وضو کے لئے استعمال کر لیا جائے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ کوئی شی نہیں۔ کیونکہ فَعُوْلٌ کے وزن پر صیغہ نہ تو کسی شی میں عمل کرنے (تفعیل) پر دلالت کرتا ہے اور نہ ہی تکرار پر، بلکہ مبالغہ پر بھی دلالت نہیں کرتا ہے۔ مگر یہ جو کہا جاتا ہے۔ "اَلْکَمَالُ فِی الطَّاھِرِیَّۃِ" تو اس کا معنی یا تو یہ ہے کہ یہ طاھر فی نفسہ اور مطھر لغیرہ ہے۔ (یعنی یہ خود پاک ہے اور دوسرے کو پاک کرنے والا ہے) اور پانی کا اس صفت سے متصف ہونا تو نصوص، اجماع اور نقل متواتر سے ثابت ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ اس طرح پاک ہے کہ اسے کوئی شی نجس نہیں بنا سکتی۔ یہ قول حضرت امام مالک نے رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا پانی کو کوئی چیز نجس نہیں بنائے گی(2)۔ اسے امام احمد، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور اصحاب سنن اربعہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ "ان المآء لا یخبث" (کہ بے شک پانی نجس نہیں ہوگا)۔ دار قطنی نے اسے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے، طبرانی نے الاوسط میں، ابو یعلی، بزار اور ابو علی بن السکن نے اپنی صحاح میں حدیث شریک سے نقل کیا ہے اور احمد، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کی گئی کیا ہم بئر بضاعہ سے وضو کر سکتے ہیں حالانکہ اس میں حیض کے کپڑے کتوں کا گوشت اور بدبودار چیزیں پھینکی جاتی ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا "بے شک پانی اس طرح پاک ہے کہ اسے کوئی شے پلید نہیں کر سکتی۔"(3)

ابن ماجہ نے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حوضوں پر درندے، کتے اور گدھے آتے رہتے ہیں ان کے لئے وہ پانی ہے جو وہ اپنے پیٹوں میں اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے لیے اس کے علاوہ وہ پانی ہے جو پاک ہے(4)۔

اگر کہا جائے کہ یہ احادیث بالا جماع متروک ہیں حتیٰ کہ امام مالک فرماتے ہیں کہ پانی کے اوصاف میں سے کوئی ایک جب تبدیل ہو جائے تو وہ نجاست گرنے سے پلید ہو جاتا ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ جب پانی کے اوصاف میں سے کوئی تبدیل ہو جائے تو وہ پانی ماء مطلق نہیں ہوتا اور ہمارا کلام تو الماء المطلق کے بارے میں ہے۔ اور اس استدلال کا جواب کہ یہاں مآء سے مراد مآء معہود ہے۔ یعنی وہ کثیر پانی جو حوضوں اور بئر بضاعہ میں موجود ہے یا اسی کی مثل کہیں موجود ہو۔ تا کہ ان احادیث اور دوسری ان احادیث کے درمیان تعارض ختم ہو جائے جو نجاست واقع ہونے کے سبب پانی کے پلید ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر چہ اس کے اوصاف میں سے کوئی بھی تبدیل نہ ہو۔

ان میں سے آپ ﷺ کا ایک قول یہ ہے کہ جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ ڈال دے تو اسے پاک کرنے کا طریقہ یہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 137 (قدیمی)

2۔ مسند امام احمد مع حاشیہ احمد شاکر، جلد 4 صفحہ 289 (دار المعارف)

ہے کہ اسے سات مرتبہ دھویا جائے اور ان میں سے پہلی مرتبہ مٹی سے (پاک کیا جائے) اسے مسلم اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ کا ایک ارشاد گرامی یہ ہے کہ تم میں سے کسی کو نہیں چاہئے کہ وہ ایسے کھڑے پانی میں پیشاب کرے جو جاری نہ ہو اور پھر اسی سے وضو کرتا ہو(1) متفق علیہ۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ ایک حدیث طیبہ اس طرح ہے کہ جب تم میں سے کوئی اپنی نیند سے بیدار ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا ہاتھ کسی برتن میں داخل نہ کرے یہاں تک کہ انہیں تین مرتبہ دھو لے کیونکہ تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اس کا ہاتھ رات کہاں کہاں لگتا رہا(2)۔ اسے امام مالک، شافعی، احمد، بخاری، مسلم اور اصحاب سنن رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اسی قسم کی حدیث حضرات ابن عمر، جابر اور عائشہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کی ہے۔

ہم نے ان احادیث کو ماء قلیل (تھوڑے پانی) پر محمول کیا ہے جو پانی کے نجس ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور جو اس کے نجس نہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ انہیں پانی کی کثیر مقدار پر محمول کیا ہے۔ اب کثیر پانی کی مقدار کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جب پانی کی مقدار دو قلے ہو جائے تو وہ کثیر ہوگا اور وہ اس وقت تک نجس نہیں ہوگا جب تک نجاست کے ساتھ اس کا ذائقہ، رنگ یا بو تبدیل نہ ہو جائے۔ اور اگر پانی کی مقدار اتنی نہ ہو تو وہ قلیل ہوگا اور وہ پلید ہو جائے گا۔ (قُلَّة سے مراد وزن کے اعتبار سے پانچ سو رطل بغدادی اور پیمائش (مساحت) کے اعتبار سے طولاً، عرضاً اور عمقاً ایک ذراع اور ایک ذراع کا چوتھائی حصہ ہے)

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا اگر پہچان کرنے والوں کی ایک بڑی رائے کے مطابق نجاست پانی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک نہ پہنچے تو وہ پانی کثیر ہوگا ورنہ قلیل ہوگا۔ متأخرین میں سے بعض نے کثیر پانی کی مقدار دس در دس مقرر کی ہے۔ علاوہ ازیں پندرہ در پندرہ، بارہ در بارہ، آٹھ در آٹھ اور سات در سات ذراع الکرباس کپڑے کا گز کے ساتھ بھی مقدار مقرر کی گئی ہے۔ ذراع الکرباس سے مراد یہ ہے کہ ایسا ہاتھ جس میں سات قبضے ہوں اور ہر قبضہ میں چار انگلیاں ہوں۔ کثیر پانی کی یہ مقدار امام اعظم ابو حنیفہ اور صاحبین میں سے کسی سے بھی منقول نہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ شارع کی جانب سے کوئی خاص مقدار مروی نہیں ہے۔ اور قلتین کی حدیث ضعیف ہے۔ لہٰذا اسے پہچاننے والے کی رائے کے سپرد کرنا ضروری ہے۔ جبکہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے حدیث القلتین سے استدلال کیا ہے۔ اور حق یہی ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اسے امام شافعیؒ، احمدؒ، اصحاب سنن اربعہ، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم، دار قطنی اور بیہقی نے عبداللہ بن عبد اللہ بن عمر بن خطاب عن ابیہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور ابوداؤد کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے پانی کے بارے میں پوچھا گیا جس پر درندے اور چوپائے آتے ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب پانی دو قلے ہو تو وہ پلید نہیں ہوگا(3)۔ اور حاکم کے الفاظ یہ ہیں کہ جب پانی دو قلے ہو تو کوئی شے اسے نجس نہیں کرتی۔(4) ابن ماجہ اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ وہ پانی نجس نہیں ہوگا(5)۔ حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث اپنی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ اور ان دونوں نے اس کے جمیع رواۃ سے استدلال کیا ہے۔ ابن مندہ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔ امام طحاویؒ نے بھی اس کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 37 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 28 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 9 (وزارت تعلیم)
4۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 225 (العلمیۃ)
5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 9 (وزارت تعلیم)

اور اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث کا دارومدار ولید بن کثیر پر ہے۔ اور اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ محمد بن جعفر بن زبیر سے روایت کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ محمد بن عباد بن جعفر سے اور کبھی وہ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر اور کبھی عبد اللہ بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کرتا ہے۔؟ تو ہم یہ کہیں گے۔ کہ حافظؒ نے کہا ہے کہ یہ اضطراب جرح کا سبب نہیں بن سکتا کیونکہ یہ تمام کے تمام محفوظ ہیں اور ان میں ایک ثقہ سے دوسرے ثقہ کی طرف ہی انتقال ہے۔ اور ان میں تحقیق کے مطابق صحیح سند اس طرح ہے: عن الولید بن کثیر عن محمد بن عباد بن جعفر عن عبد اللہ بن عبد اللہ بن عمر المکبر رضی اللہ عنہم اور عن محمد بن جعفر بن زبیر عن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر المصغر رضی اللہ عنہم۔ اور جس کسی نے اس کے علاوہ دوسری سند سے اسے نقل کیا ہے تو اسے وہم ہوا ہے۔ اور مذکورہ دونوں سندوں کے مطابق ولید بن کثیر سے محدثین کی ایک جماعت نے اسے روایت کیا ہے۔

دارقطنی نے کہا ہے کہ دونوں قول عن الاسامہ عن الولید صحیح ہیں۔ اور اس کی ایک تیسری سند بھی ہے کہ اسے حاکم وغیرہ نے حماد بن سلمہ عن عاصم بن منذر عن عبد اللہ بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کی سند سے اسے روایت کیا ہے۔ ابن معین سے اس سند کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا اس کی سند جید ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ کسی روایت میں یہ الفاظ ہیں "لم یحمل خبثاً" کسی میں یہ ہیں "لَمْ يُنَجِّسْهُ شَيْءٌ" اور کسی میں یہ مروی ہیں "لَا يَنْجُسُ" (تو پھر یہ کیسے قابل حجت ہو سکتی ہے)؟ تو ہم یہ کہیں گے کہ اس کا دارومدار روایت بالمعنی پر ہے۔ اور روایت بالمعنی صحیح ہوتی ہے۔ اور متن میں تعارض کا قول اس وقت تک نہیں کہا جا سکتا جب تک (معنی میں) تعارض موجود نہ ہو۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ روایت حرف شک کے ساتھ مروی ہے۔ یعنی قلتین اوثلاثاً (دو قلے یا تین) جیسا کہ امام احمدؒ نے وکیع سے اور دارقطنی نے یزید بن ہارون سے اور پھر انہوں نے حماد بن سلمہ عن عاصم بن منذر عن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر عن ربیہ رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ جب پانی دو یا تین قلے ہو جائے تو پھر اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی؟ (1)

تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ علامہ ابن جوزیؒ نے کہا ہے کہ حماد سے روایت میں اختلاف ہے کیوں کہ ان سے ابراہیم بن حجاج نے روایت کی اور اس کی تہذیب و تنقیح کی اور پھر کامل بن طلحہ نے اسے روایت کیا۔ تو ان تمام نے کہا دو قلے یا تین۔ اور حماد سے ہی عفان، یعقوب بن اسحاق حضرمی، بشر بن سری، علاء بن عبد الجبار، موسیٰ بن اسماعیل اور عبید اللہ بن موسیٰ العبسی نے روایت کیا کہ جب پانی دو قلے ہو جائے۔ اور انہوں نے تین کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اور یزید بن ہارون سے بھی اختلاف ہے کہ ان سے ابن السباح نے شک کے ساتھ روایت کیا ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بغیر شک کے۔ لہٰذا ان کے قول پر عمل کرنا واجب ہے جنہوں نے بغیر شک کے یقین کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اَوْ کا کلمہ شک کے لیے نہیں بلکہ تردید اور تخییر کے لیے ہو۔ اور معنی یہ ہو کہ دو مقداروں میں سے جس تک بھی پانی پہنچ جائے وہ پلید نہیں ہوگا۔ لہٰذا جب پانی کی مقدار دو قلوں تک پہنچ جائے تو وہ اسی طرح نجس نہیں ہوگا جیسا کہ اس کی مقدار تین قلے ہونے کی صورت میں وہ نجس نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ چالیس قلوں کی روایت بھی موجود ہے جیسا کہ دارقطنی، ابن عدی اور عقیلی نے قاسم بن عبد اللہ العمری عن محمد بن منکدر عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب پانی چالیس قلوں تک پہنچ جائے تو پھر وہ ناپاک نہیں ہوگا" (2)۔ تو اس کے بارے ہمارا قول یہ ہے کہ امام احمدؒ

نے قاسم کے بارے میں کہا ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے اور حدیثیں وضع کرتا ہے۔ اسی طرح یحییٰ بن معین، ابو حاتم الرازی اور ابو زرعہ نے کہا ہے۔ لہٰذا اس کی روایت کے سبب حدیث صحیح مضطرب نہیں ہو گی۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ دار قطنی نے اسناد صحیح کے ساتھ روح بن قاسم عن محمد بن منکدر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کے طریق سے موقوف روایت نقل کی ہے۔ ''کہ جب پانی چالیس قلے ہو جائے تو وہ نجس نہیں ہوتا'' (1) اسی طرح وکیع عن سفیان ثوری عن ابن منکدر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ عبد الرزاق عن معمر عن ابن منکدر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بھی اسی طرح مذکور ہے۔ اور پھر راوی کا قول اس روایت کے خلاف ہے جس کے بارے میں اس نے حدیث پر طعن ذکر کیا ہے؟ تو اس کے بارے میں ہمارا پہلا قول تو یہ ہے کہ شرط کا مفہوم مطلقاً امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حجت نہیں۔ اور اسی طرح وہ امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک بھی حجت نہیں جب وہ سوال کی مطابقت سے خارج ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ قُلّۃ کا لفظ مشترک ہے۔ اس کا اطلاق کوزے پر بھی ہوتا ہے اور گھڑے پر بھی۔ چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ لہٰذا چالیس کی حدیث کو ایسے چھوٹے قلوں پر محمول کیا جائے گا جن میں سے بیس ایک بڑے قلے کے مساوی ہوں گے تاکہ تعارض ختم ہو جائے۔ اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب قلۃ کا لفظ گھڑے، مشکیزے، ڈول اور پہاڑ کی چوٹی وغیرہ معانی میں مشترک ہے جیسا کہ قاموس میں ہے کہ اَلْقُلَّةُ بِالضم سے مراد سر، کوہان اور پہاڑ کی بلند جگہ ہے۔ یا ہر شئی کی بلند جگہ کو قُلّہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح بڑا کنواں، بڑا گھڑا چھوٹا گھڑا یا مٹی سے بنا ہوا پیالہ اور چھوٹے کوزے کو قلہ کہا جاتا ہے (2)۔ اور حدیث صحیح مرفوع میں قلال ہجر کی قید ثابت نہیں۔ اور وہ حدیث جو ابن عدی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے ''کہ جب پانی قلال ہجر میں سے دو قلوں تک پہنچ جائے تو کوئی شئی اسے نجس نہیں کرتی'' (3)۔ اس کی سند میں مغیرہ بن صقلان راوی منکر الحدیث ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس حدیث پر عمل چھوڑ دیا جائے جس کا معنی مراد منہ واضح اور ظاہر نہ ہو۔ جیسا کہ مجمل روایت کا حکم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے امام طحاویؒ نے کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے لیکن قلتین کا یقینی علم نہ ہونے کے سبب ہم نے اس پر عمل ترک کر دیا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس کے معانی میں سے ایک معنی بوجوہ ارجح ہے اور وہ ہے قلال ہجر۔ لہٰذا اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہے۔ کیونکہ اس کا معنی پہاڑ کی چوٹی اور سر اور کوہان کی بلند جگہ مراد لینا بالا جماع درست نہیں۔ کیونکہ پانی کا پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچنا بحر محیط یا طوفان کے وقت ہی متصور ہو سکتا ہے۔ اور اعلی الرأس والسنام مراد لینا بھی بالا جماع درست نہیں کیونکہ پانی اکثر اس مقدار سے کم ہوتا ہے۔ لہٰذا برتنوں کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ اور برتنوں کی طرف متوجہ ہونے کے بعد قلال ہجر مراد لینا بوجوہ ارجح ہے۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اہل عرب لفظ قُلّہ اکثر اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں جیسا کہ ابو عبیدہ نے کتاب الطہور میں کہا ہے۔ بیہقی نے کہا ہے کہ قلال ہجران کے نزدیک مشہور تھے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے شب معراج ان کے ساتھ تشبیہ دی۔ جب آپ ﷺ نے سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھا تو فرمایا اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کی مثل ہیں اور اس کا پھل قلال ہجر کی مثل ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قلال ہجران تمام میں سے بڑے تھے۔ اسی طرح ازہری نے کہا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کا عدد کے اعتبار سے حد مقرر فرمانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان سے مراد بڑے ہی ہیں۔ کیونکہ ایک بڑے پر قدرت ہونے کے باوجود دو چھوٹے قلوں کو مقرر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ان سے مراد بڑے قلے ہیں کیونکہ اگر ان سے چھوٹے قلے مراد ہوں تو پھر جب

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 27 (المحاسن) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1386 (التراث العربی) 3۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 1 صفحہ 264 (الفکر)

پانی دو بڑے قلوں کی مقدار تک پہنچ جائے تو بدرجہ اولیٰ نجس نہیں ہوگا کیونکہ چھوٹا قلہ بالیقین بڑے قلے میں پایا جاتا ہے۔لہٰذا ہم نے احتیاطاً اسے دو بڑے قلوں پر محمول کیا ہے۔اسی سے یقین حاصل ہوتا ہے۔واللہ اعلم۔اگر کہا جائے کہ حدیث الْقُلّتین کو حافظ ابن عبدالبر، العاصی اسماعیل بن اسحاق اور ابوبکر بن الولی المالکیون نے ضعیف قرار دیا ہے۔ابن عبدالبر نے کہا ہے جو مذہب امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے وہ نظر وفکر کے اعتبار سے ضعیف ہے اور اثر کے اعتبار سے ثابت نہیں کیونکہ یہ وہ حدیث ہے جس کے بارے اہل علم کی جماعت نے کلام کی ہے۔کیونکہ کسی اثر میں قلتین کی مقررہ مقدار ثابت نہیں۔اور نہ اجماع سے ثابت ہے۔ہم کہتے ہیں مذکورہ بالا سوالوں کے بارے ان کے مجمل اقوال ہیں اور اس کے رواۃ میں سے کسی کے ضعف کے بارے کسی نے کوئی قول نہیں کیا۔کیونکہ وہ صحیحین کے رواۃ ہیں جب مذکورہ سوالات کے جوابات ظاہر ہوگئے تو ان کے اعتراضات ختم ہوگئے۔واللہ اعلم۔

مسئلہ: بالا جماع پانی کے علاوہ پاک مائعات میں سے کسی کے ساتھ وضو اور غسل کرنا جائز نہیں۔کیونکہ رب کریم نے ارشاد فرمایا فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (سوال یہ ہے) کیا پانی کے علاوہ پاک مائعات میں سے کسی کے ساتھ نجاستِ حقیقیہ سے طہارت حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کے بارے جمہور نے کہا ہے کہ یہ جائز نہیں۔اور امام ابوحنیفہؒ نے کہا ہے جائز ہے۔امام بغویؒ نے جمہور کا استدلال اسی آیت سے کیا ہے اور کہا ہے کہ آیت میں طہور بمعنی مطہر ہے۔جیسا کہ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ تو اس سے یہ ثابت ہوا، کہ تطہیر پانی کے ساتھ مختص ہے۔اور اگر اس کے ساتھ نجاست کو زائل کرنا جائز ہے تو اس کے ساتھ حدث کو زائل کرنا بھی جائز ہے۔لیکن یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ پانی کا مطہر ہونا پانی میں تطہیر کے محصور ہونے پر دلالت نہیں کرتا جیسا کہ پانی کا طاہر ہونا طہارت کے اس کے ساتھ محصور ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک احداث اور انجاس کے درمیان فرق یہ ہے کہ حدث نجاست حکمیہ غیر مرئیہ ہے اس کے وجود اور زوال کا ادراک شریعت کی جانب سے ہوتا ہے۔اور پانی کے استعمال سے اس کا زائل ہونا نص اور اجماع سے ثابت ہے۔لیکن پانی کے بغیر کسی اور کے استعمال سے اس کا زوال نص اور اجماع سے ثابت نہیں۔اور قیاس سے اس کا اثبات بھی جائز نہیں۔کیونکہ اس میں اصل ہی قیاس کے طریقوں سے معدول ہے۔اور نجاست حقیقیہ دیکھائی دینے والی نجاست ہے اور اسے پانی کے ساتھ زائل کرنا معقول ہے۔کیونکہ پانی طاہر ہے اور نجاست کو زائل کر سکتا ہے۔لہٰذا اسی معنی مشترک کی وجہ سے دیگر تمام مائعات کو اس پر قیاس کیا جائے گا۔میں کہتا ہوں کہ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب پانی نجس چیز پر انڈیلا جائے تو وہ پانی پہلی ملاقات کے ساتھ ہی نجس ہو جاتا ہے۔لہٰذا تین یا سات مرتبہ دھونے کے ساتھ طہارت کا حاصل ہونا امر تعبدی ہے۔اور نچوڑنے کے ساتھ پانی کے جمیع اجزاء اس شئی سے خارج نہیں ہوتے۔لہٰذا قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ کپڑا اور اس کی مثل کوئی شے دھونے کے ساتھ پاک نہ ہو۔اسی وجہ سے سابقہ شریعتوں میں کپڑے کو نجاست کی جگہ سے کاٹ دیا جاتا تھا۔تو جب دھونے کے سبب طہارت کا حاصل ہونا ہی شریعت سے خلاف قیاس ثابت ہے تو پھر پانی پر دیگر مائعات کو قیاس کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ: ہمارے نزدیک جس طرح پانی میں نجاست گر جائے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے اسی طرح اگر نجاست پر پانی گرے تب بھی پانی نجس ہو جاتا ہے۔کیونکہ اس میں نجس ہونے کا سبب پانی کے ساتھ نجاست کا ملنا ہے۔اس اعتبار سے مذکورہ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں۔علامہ ابن جوزی نے حضرت امام احمدؒ کا یہ مذہب ذکر کیا ہے کہ نجاست کا دھون (غسالہ) جب محل کے پاک ہونے کے بعد

جدا ہوا اور وہ غیر متغیر ہو۔ تو وہ پاک ہوتا ہے۔ اسی طرح زمین پر جب پیشاب یا اسی کی مثل کی کوئی نجاست ہو تو جب اسے کثیر پانی کے ساتھ بہا دیا جائے اور پانی میں تغیر رونما نہ ہو تو پھر پانی اور جگہ دونوں کی طہارت کا حکم لگایا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ یہی قول امام مالک اور شافعی کا ہے۔ اور اس پر استدلال حضرت انس بن مالکؓ کی حدیث سے کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اچانک ایک اعرابی آیا اور اس نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام میں سے ایک کو فرمایا اٹھو، پانی کا ڈول لاؤ اور اس پر بہا دو (1)۔ اسے امام احمد اور بخاری اور مسلم نے صحیحین میں روایت کیا ہے۔ اور امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ حدیث قیاس صحیح کے مخالف ہے۔ لہٰذا اسے اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جگہ سے مٹی منتقل کرنے کے بعد اس پر پانی انڈیلنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اس حدیث کی روایت صحابہ، تابعین وغیرھم میں مشہور ہے اور کئی وجوہ سے اسے روایت کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک وہ روایت ہے جسے دار قطنی نے عبد الجبار عن ابن عیینہ عن یحییٰ بن سعید عن انسؓ کی سند سے ذکر کی ہے کہ ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کیا تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اس کی جگہ کو کھود ڈالو پھر اس پر پانی کے ڈول انڈیل دو (2)۔ حافظ نے کہا ہے کہ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ دار قطنی نے کہا کہ عبد الجبار کو ابن عیینہ کے بارے وہم ہوا ہے۔ کیونکہ ابن عیینہ کے اصحاب حفاظ ہیں جنہوں نے اس روایت کو آپ کے واسطہ سے یحییٰ بن سعید سے روایت کیا ہے اور انہوں نے زمین کھودنے کا ذکر نہیں کیا۔ تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ عبد الجبار ثقہ راوی ہے اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے۔ اس کی مثل ایک روایت دار قطنی نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کی ہے اور اس کی سند ضعیف ہے لیکن اس کے رواۃ میں سے کوئی بھی جھوٹ سے متہم نہیں ہے۔ ایک روایت کو دار قطنی اور ابو داؤد نے عبد اللہ بن مغفل بن مقرن المزنی سے نقل کیا ہے۔ دار قطنی نے کہا کہ عبد اللہ بن مغفل تابعی ہیں۔ اور ان کے رواۃ ثقہ ہیں۔ سوائے جریر بن حازم کے۔ اس کے بارے امام ذہبیؒ نے کہا ہے کہ یہ ثقہ اور امام تھا، موت سے پہلے اس میں تغیر رونما ہوا تو اس کے بیٹے وہب نے اسے چھپا لیا۔ پھر اس نے کوئی حدیث بیان نہیں کی یہاں تک کہ مر گیا۔ ابن معین نے کہا ہے کہ وہ قتادہ کے درجہ میں ضعیف ہے۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث قتادہ سے مروی ہی نہیں بلکہ یہ عبد الملک بن عمیر سے مروی ہے۔ اور عبد الملک ثقہ ہے اور اس کی روایات صحیحین میں ہیں۔ اور اگر یہ اعتراض ہو کہ امام احمدؒ نے کہا یہ حدیث منکر ہے۔ تو میں کہوں گا یہ مجمل جرح ہے جو مقبول نہیں۔ اور امام احمدؒ نے مشہور روایت میں کھدائی کے واقع ہونے کے بارے جو کہا ہے وہ جرح نہیں ہے کیونکہ ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے۔ ان روایات میں سے ایک وہ ہے جسے امام طحاویؒ نے ابن عیینہ عن عمرو بن دینار عن طاؤس کی سند سے ذکر کیا ہے۔ اور اسی طرح سعید بن منصور نے ابن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اس کی جگہ کو کھود ڈالو" یہ روایت بھی مرسل ہے اور مرسل روایت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مسند سے اقویٰ ہوتی ہے۔ اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اس سے کم ہوتی ہے۔ لیکن مرسل روایت مطلقاً حجت ہوتی ہے۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک پانچ امور میں سے کسی ایک کے پائے جانے کے ساتھ مقبول ہوتی ہے۔ (1) اس راوی کے علاوہ کوئی اور اسے مسند ذکر کرے۔ (2) یا مرسل ذکر کرے اور یہ معلوم ہو کہ ان دونوں کے شیوخ مختلف ہیں۔ (3) صحابی کا قول اس کے لیے باعث تقویت ہو۔ (4) اکثر اہل علم کا قول اس کی قوت میں اضافہ کر رہا ہو۔ (5) اس کی حالت سے یہ معلوم ہو کہ وہ ہمیشہ عادل راوی سے ہی اپنی حدیث کو مرسل بناتا ہے۔ تو یہاں

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1 صفحہ 180 (الفکر)
2۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 8 (وزارت تعلیم)

طاؤس کی مرسل روایت صحیح ہے۔عبداللہ بن مغفل کی مرسل حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔اور وہ حسن ہے۔اور حضرت انسؓ کی مسند روایت صحیح ہے یا حسن ہے۔اور حضرت ابن مسعودؓ کی مسند روایت ضعیف ہے۔اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت انسؓ کی وہ حدیث جو صحیحین میں ہے وہ ان تمام روایات سے زیادہ قوی اور راجح ہے۔تو اس کے بارے ہمارا پہلا قول تو یہ ہے کہ صحیحین کی حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے اور معنی کے اعتبار سے ضعیف ہے۔کیونکہ اس کا تعارض ان احادیث کے ساتھ ہے جو اس معنی پر دلالت کرنے میں متواتر کے درجہ کے قریب ہیں کہ پانی نجاست کے ساتھ ملنے کے سبب نجس ہو جاتا ہے۔اور دوسری بات یہ ہے کہ ترجیح کا اعتبار تعارض کے وقت ہوتا ہے اور یہاں تعارض موجود ہی نہیں بلکہ جو احادیث ہم نے ذکر کی ہیں وہ مٹی کھودنے پر ناطق ہیں اور حدیث انس اس سے ساکت ہے۔لہٰذا ان میں سے کسی شے پر عمل ترک نہیں کیا جائے گا۔

مسئلہ: ۔ وہ پانی جو حدث کو زائل کرنے یا قربت حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے وہ جمہور کے نزدیک طاہر (پاک) ہوتا ہے۔امام حسن نے حضرت امام ابوحنیفہؒ سے یہ روایت کی ہے کہ مستعمل پانی نجس ہوتا ہے اور اس میں نجاست غلیظہ پائی جاتی ہے۔امام ابو یوسفؒ کی آپؒ سے روایت یہ ہے کہ محل اختلاف ہونے کے سبب وہ نجاست خفیفہ کے ساتھ نجس ہوتا ہے۔اور امام محمدؒ نے آپؒ سے جمہور کے قول کی مثل قول نقل کیا ہے۔اور یہی قول امام محمدؒ نے بھی کیا ہے۔احناف نے پانی کے نجس ہونے پر نص اور قیاس سے استدلال کیا ہے۔نص تو حضرت ابوہریرہؓ کی وہ حدیث ہے جو مسلمؒ نے روایت کی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' تم میں سے کسی کو جنبی حالت میں کھڑے پانی میں غسل نہیں کرنا چاہیے''(1)۔اور ابوداؤدؒ نے ان الفاظ کے ساتھ حدیث روایت کی ہے کہ تم میں سے کوئی بھی نہ تو کھڑے پانی میں پیشاب کرے اور نہ ہی حالت جنابت میں اس میں غسل کرے(2)۔اور حکم تحریم کے لیے یہ نہی پانی کے نجس ہونے پر دلالت کرتی ہے تو ہم یہ کہتے ہیں۔کہ یہاں نہی تحریم کے لیے نہیں بلکہ تنزیہ کے لیے ہے۔کیونکہ اس میں احتمال غالب ہوتا ہے کہ جنبی کا بدن منی سے ملوث ہو۔جیسا کہ نیند سے بیدار ہونے والے کو برتن میں ہاتھ داخل کرنے سے اسی لیے روکا گیا ہے کہ اس میں ہاتھ کے نجاست حقیقیہ کے ساتھ ملوث ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔جیسا کہ اس پر رسول اللہ ﷺ کا یہ قول دلالت کرتا ہے'' کیونکہ وہ نہیں جانتا اس کا ہاتھ رات کہاں کہاں لگتا رہا''اور قیاس یہ ہے کہ انہوں نے اسے ان چیزوں پر قیاس کیا ہے جو نجاست کی حالت میں اپنے جامع استعمال کے ساتھ نجاست حقیقیہ کو زائل کر دیتی ہیں۔ہم کہتے ہیں کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ نجاست حقیقیہ کو زائل کرنے کی صورت میں پانی کا استعمال اجزاء نجاست کے ساتھ پانی کے اختلاط کو ثابت کرتا ہے۔اور یہی اختلاط پانی کے نجس ہونے کا سبب ہے۔جبکہ نجاست حکمیہ کو زائل کرنے میں یہ اختلاط نہیں ہوتا۔کیونکہ حدث ایک امر حکمی ہے اور اس کا زوال اجزاء میں منقسم نہیں ہوتا۔لہٰذا ہر وہ پانی جو اعضاء میں سے کسی عضو میں استعمال کیا جائے اس سے حدث دور نہیں ہوگا بلکہ حدث کو زائل کرنے کے لیے یہ شرط ہے کہ جنبی اپنے تمام بدن میں اور محدث مکمل چار اعضاء میں پانی استعمال کرے۔اس کے بعد حدث زائل ہوگا۔پس وضو کے پانی کے اجزاء میں سے ہر جزء پاک ہے۔اسی طرح وہ تمام اجزاء بھی پاک ہیں کیونکہ وہ شے جو نجس نہ ہو اس کا ایسی شے سے ملنا جو نجس نہیں، بالاجماع نجس ہونے کو ثابت نہیں کرتا۔

انہوں نے قربت کے لیے استعمال ہونے کے سبب پانی کے نجس ہونے پر استدلال حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے کیا

ہے۔'' کہ وہ آدمی جو خوب اچھی طرح وضو کرتا ہے تو اس کی خطائیں اس کے جسم سے خارج ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتی ہے''(1) متفق علیہ۔ امام مسلمؒ نے اسے حضرت عثمان اور حضرت ابو ہریرہؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ پانی کے ساتھ اس کے بدن سے خطائیں نکل جاتی ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خطائیں نجس چیزیں ہی تو ہوتی ہیں۔ لہٰذا پانی ان کے ساتھ ملنے کے سبب اسی طرح نجس ہو جاتا ہے جیسے دیگر تمام نجاستوں کے ساتھ ملنے کے سبب نجس ہو جاتا ہے۔

یہ استدلال کوئی شے نہیں کیونکہ خطائیں نہ تو اجسام ہیں اور نہ ہی اعراض ہیں کہ وہ پانی کے ساتھ قائم ہوتی ہوں۔ اور وہ کسی بھی اعتبار سے نجاست حقیقیہ کی مثل نہیں اور نہ ہی ان کا بدن سے نکلنا نجاست حقیقیہ کے نکلنے کی مثل ہے۔ تا کہ اس سے پانی کا نجس ہونا لازم آئے۔ بلکہ اس خروج کا مفہوم تو عفو اور مغفرت ہے کیونکہ اگر خطائیں نجاست ہوں تو پھر گنہگار مومنین کی نماز جائز ہی نہ ہو۔ حالانکہ یہ بالاجماع جائز ہے۔ بلکہ یہ خطاؤں کو مٹانے والی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ'' پانچ نمازیں، ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک اپنے درمیان سے تمام گناہوں کو مٹا دیتے ہیں بشرطیکہ آدمی کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرے'' اسے مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے(2)۔ اور حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کا بوسہ لیا۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ کو اس کی خبر دی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ الایہ'' (اور دن کی دونوں طرفوں میں نماز قائم کرو)۔ اسے بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے۔(3)

ہمارے پاس مستعمل پانی کے پاک ہونے پر دلالت کرنے والی متعدد احادیث ہیں۔

(1) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں بیمار تھا اور بیہوش پڑا تھا۔ پس آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور اپنے وضو کا پانی مجھ پر انڈیل دیا تو میں ہوش میں آ گیا۔ اور میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ ''کلالۃ'' میرا وارث ہو گا۔ تو اس وقت آیت میراث نازل ہوئی۔ متفق علیہ۔(4)

(2) حضرت سائب بن یزید روایت کرتے ہیں کہ میری خالہ مجھے لے کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ! یہ میرا بھانجا بیمار ہے تو آپ ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی پھر وضو کیا، تو میں نے آپ کے وضو کا بچا ہوا پانی پی لیا۔ اور آپ کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت کو حجلہ کی گھنڈی کی مثل دیکھا۔ متفق علیہ(5)۔

(3) حضرت مسور بن مخرمہ کی حدیث ہے انہوں نے صلح حدیبیہ کے بیان میں ذکر کی ہے، کہتے ہیں قسم بخدا! رسول اللہ ﷺ نے نخامہ (فضلہ ناک) بھی نہیں پھینکا مگر وہ بھی صحابہ کرام میں سے کسی کی ہتھیلی پر جا گرتا اور پھر وہ اسے اپنے چہرے اور سینے پر مل لیتے تھے۔ اور جب آپ وضو کرتے، تو وہ آپ کے وضو کا پانی حاصل کرنے کے لیے (ایک دوسرے سے) لڑنے کے قریب ہو جاتے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(6)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 125 (قدیمی)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 122 (قدیمی)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 678 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 32 (وزارت تعلیم)
5۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 31 (وزارت تعلیم)
6۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 379 (وزارت تعلیم)

مسئلہ: ۔ حدث کوزائل کرنے یا قربت کو حاصل کرنے کی صورت میں ماء مستعمل کے ساتھ نجاست حقیقیہ کوزائل کرنا بالاتفاق جائز ہے مگر ان کے نزدیک جائز نہیں جواس کے نجس ہونے کے قائل ہیں ۔ کیا اس کے ساتھ غسل یا وضو کرنا بھی جائز ہوتا ہے؟ تو اس میں ائمہ کا اختلاف ہے ۔ حضرت امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ قربت کے حصول کے لیے مستعمل پانی کے ساتھ وضو کرنا اور غسل کرنا جائز نہیں ہوتا ۔ کیونکہ یہ طاہر (پاک) تو ہے مگر مطہر (پاک کرنے والا) نہیں ۔ امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کا قول ہے کہ حدث کوزائل کرنے کی صورت میں مستعمل پانی طاہر ہوتا ہے مطہر نہیں ہوتا ۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ ہر وہ پانی جو حدث کو دور کرنے یا قربت حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے اس سے وضو اور غسل کرنا جائز نہیں ہوتا ۔ وہ پانی طاہر ہوتا ہے مطہر نہیں ہوتا ۔ انہوں نے اس کے غیر مطہر ہونے پر نص اور قیاس سے استدلال کیا ہے ۔ نص تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی کو کھڑے پانی میں غسل نہیں کرنا چاہئے ۔ تو انہوں نے کہا یہ نہی ہے اور دوامروں میں سے ایک کا تقاضا کرتی ہے ۔ ایک استعمال کے سبب پانی کا نجس ہو جانا دوم اس سے طہوریت (پاکیزگی) کا سلب ہو جانا ۔ لیکن ان دونوں میں سے پہلی صورت کا تصور تو نہیں کیا جا سکتا ۔ لہٰذا دوسری متعین ہوگئی ۔

ہم کہتے ہیں کہ معاملہ اس طرح نہیں بلکہ یہ نہی تنزیہ کے لیے ہے اور نجاست حقیقیہ کے سبب نجاست کے احتمال کا تقاضا کرتی ہے ۔ اور نجاست کا احتمال نجس ہونے کو ثابت نہیں کرتا ۔ کیونکہ طہارتِ یقینیہ شک کے ساتھ زائل نہیں ہوتی ۔ اور یہ بھی ہے کہ پانی کے لیے مطہر ہونے کا وصف ماء مطلق (خالص پانی) کے لیے لازم ہے ۔ (اور مستعمل پانی مطلق نہیں اس لیے وہ مطہر نہیں ہوسکتا) اور قیاس یہ ہے کہ اقامتِ قربت اور اسقاط فرض کو جمع کرتے ہوئے اسے مال زکوٰۃ پر قیاس کیا ہے ۔ اُس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ بات تو معلوم ہے کہ اسقاط فرض اور اقامتِ قربت آلہ میں میل کچیل ہونے کو ثابت کرتے ہیں جو کہ تنجس (نجس ہونے) تک نہیں پہنچتی ۔ جیسا کہ مال زکوٰۃ میں ہے تب ہی اسے ہاشمی پر حرام قرار دیا گیا ہے حالانکہ وہ نجس نہیں ۔ لہٰذا اسی طرح قربت کے لیے استعمال ہونا یا فرض کو ساقط کرنے کے لیے استعمال ہونا تدنس (میل کچیل ہونے) کو ثابت کرتا ہے جس کے سبب اس سے پاک کرنے کا وصف (وصف تطہیر) سلب ہو جاتا ہے اور وہ تنجس تک نہیں پہنچتا ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ قربت کو حاصل کرنا یا فرض کو ساقط کرنا مطلقاً تدنس کو ثابت کرتا ہے اور ہاشمی پر مال زکوٰۃ کا حرام ہونا امر تعبدی ہے ۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جسم اور کپڑا دونوں کے ساتھ نماز ادا ہو جاتی ہے، فرض ساقط ہو جاتا ہے اور قربت قائم ہو جاتی ہے ۔ اور ان میں سے کوئی شے بھی میلی کچیلی نہیں ہوتی ۔ اسی طرح قربانی سے واجب ساقط ہو جاتا ہے اور اس سے گوشت میلا کچیلا نہیں ہوتا اس اعتبار سے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے خود تناول فرمایا ۔ اور یہ دلیل بھی ہے کہ پانی کے لیے مطہر ہونا پاک مطلق پانی کے لیے وصف لازم ہے ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا (پس تم پانی نہ پاؤ تو تیمم کرلو) تو اس میں اللہ تعالیٰ نے تیمم کو مطلق پانی کے مفقود ہونے پر معلق کیا ہے ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مستعمل پانی مطلق پانی ہے ۔ لہٰذا اس کے موجود ہوتے وقت تیمم جائز نہیں ۔ تو پھر لامحالہ اس سے وضو کرنا واجب ہوگا ۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ وہ مطلق پانی نہیں کیونکہ مطلق پانی وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ خبث یا کوئی بھی ایسی چیز قائم نہ ہو جس کے ہوتے ہوئے اس سے نماز کے لیے وضو کرنا ممنوع ہو ۔ لہٰذا ماء مقید، ماء متنجس اور ماء مستعمل مطلق پانی کی تعریف سے خارج ہیں ۔؟ تو

اس کے بارے ہمارا پہلا قول تو یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ ماء مستعمل کے ساتھ کوئی ایسا معنی قائم ہوتا ہے جو وضو کرنے کے جواز کے مانع ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ہی تو بالاصرار مطلوب ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ماء مطلق وہ ہوتا ہے جس پر لغوی طور پر بغیر کسی قید اور شک کے لفظ ماء کا اطلاق کیا جاتا ہو۔ بیشک لغوی طور پر لفظ ماء کے اطلاق میں پاک پانی، وہ نجس پانی جس کے اوصاف میں سے کوئی بھی تبدیلی نہ ہوا ہو، وہ پانی جو قربت کے لیے استعمال کیا گیا ہو اور وہ پانی جو ٹھنڈک کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے، ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اسی وجہ سے زہری نے کہا ہے کہ جب کتا تم میں سے کسی کے برتن میں منہ داخل کر لے اور اس کے پاس وضو کے لیے اس کے بغیر کوئی دوسرا برتن نہ ہو تو وہ اسی میں پانی ڈال کر وضو کرے۔ اور سفیان نے کہا ہے کہ بعینہ یہی مفہوم رب کریم بیان فرماتا ہے: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا اور هذا ماء کے بارے امام بخاریؒ نے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ جب شارع نے نجاستوں کے استعمال سے منع کر دیا ہے۔ اور ہمیں ان سے اس طرح اجتناب کرنے کا حکم فرمایا ہے وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ اور آیت وضو میں فرمایا وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا'' جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ داخل کر لے تو اسے چاہیے کہ وہ اس پر مٹی ملے اور پھر سات مرتبہ اسے پانی کے ساتھ دھو ڈالے'' (1)۔ اسے مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جس کو ان ناپسندیدہ چیزوں میں سے کسی شے کے ساتھ آزمایا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے (قائم کردہ) پردے کے ساتھ ڈھانپ لے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (وہ تمہارے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو تم پر حرام کرتا ہے)۔ پس جو نجس پانی پر قادر ہو تو وہ حکماً پانی کو پانے والا نہیں کیونکہ شرعاً اس کا استعمال اس کے لیے ممنوع ہے۔ لہٰذا وہ اس آدمی کی مثل ہے جو کنویں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا ہو اور اس کے پاس ڈول نہ ہو۔ کیونکہ اس کے لیے طبعاً پانی کا استعمال ممنوع ہے۔ کیونکہ طبیعت کنویں میں گرنے سے اسے روکتی ہے۔ اسی طرح وہ مریض جو پانی تو پاتا ہو لیکن طبعاً اور شرعاً اس کا استعمال اس کے لیے ممنوع ہو کیونکہ وہ پانی جس کا استعمال شرعاً ممنوع ہے وہ اسی کی مثل ہے۔ جو طبعاً ممنوع ہے۔ لیکن مستعمل پانی سے اجتناب شرعاً واجب نہیں اس لیے کہ وہ طاہر (پاک) ہے۔ لہٰذا اسے پانے والا حقیقۃً اور حکماً پانی کو پانے والا ہوگا۔ پس اس کے لیے تیمم جائز نہیں ہوگا اور اس پر وضو کرنا واجب ہوگا۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ پانی کا مطہر ہونا اس کے طاہر ہونے کو لازم ہے۔

مسئلہ: جب پانی میں کوئی پاک شے گر جائے پس اگر اس کے سبب اس کا کوئی وصف تبدیل نہ ہوا اور پانی پر اجزاء کا اضافہ بھی نہ ہو تو اس کے ساتھ وضو کرنا بالاجماع جائز ہے۔ اور اگر پانی کے اوصاف میں سے ایک یا زیادہ تبدیل ہو جائیں۔ تو اگر اس سے بچنا متعذر ہو مثلاً مٹی اور موسم خزاں میں درختوں کے پتے وغیرہ۔ تو اس سے بھی بالاجماع وضو کرنا جائز ہے جب تک کہ وہ اسے اپنی رقت سے نہ نکال دے جیسا کہ زیادہ دیر ٹھہرے رہنے کے سبب پانی متغیر ہو جائے۔ اور اگر اس سے بچنا متعذر نہ ہو مثلاً سرکہ، زعفران اور اشنان وغیرہ۔ تو اگر اس کے سبب پانی کے اوصاف میں سے کوئی ایک تبدیل ہو جائے تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس سے وضو کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ پانی مقید ہو جاتا ہے اور مطلق پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم کرنا واجب ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس سے وضو کرنا جائز ہے۔ مگر جب پانی میں کوئی جامد چیز مل جائے وہ اس کی نرمی کو زائل کر دے یا اس کے اکثر اوصاف کو تبدیل کر دے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 137 (قدیمی)

اوصاف سے مراد ذائقہ، رنگ اور بو ہے۔ مثلاً نبیذین وغیرہ مل جائیں۔ یا پھر کوئی مائع چیز پانی میں مل جائے اور وہ اس پر اجزاء کے سبب غالب آجائے یا اس کے اوصاف میں سے اکثر کو تبدیل کردے یا پانی میں کوئی اور چیز پکائی تو اس نے اسے تبدیل کر دیا جیسے شوربہ اور لوبیہ کا پانی وغیرہ مگر وہ چیزیں جن سے پانی کی صفائی کا ارادہ کیا جائے مثلاً راس، بیری کے پتے اور اشنان وغیرہ، اگرچہ پانی پاک چیز کے ملنے سے تھوڑا سا تبدیل ہی ہو جائے۔ کیونکہ ابن خزیمہ اور نسائی نے ام ہانی رضی اللہ عنہا کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا نے ایک ٹب میں غسل کیا اور اس میں گوندھے ہوئے آٹے کے اثرات تھے۔(1)

امام بخاریؒ نے حضرت ام عطیہ انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، جبکہ آپ ﷺ کی صاحبزادی کا وصال ہوا اور فرمایا اسے تین بار یا پانچ بار یا اس سے بھی زیادہ بار۔ اگر تمہاری رائے ہو تو بیری کے پتے ملے پانی کے ساتھ غسل دینا اور آخر میں کافور یا کافور کی مثل کوئی شئی لگانا(2)۔ بزار نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ ثمامہ بن اثال اسلام لایا تو حضور نبی کریم ﷺ نے اسے بیری کے پتے ملے پانی کے ساتھ غسل کرنے کا حکم ارشاد فرمایا(3)۔ اور قیس بن عاصم کی حدیث ہے کہ جب اس نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے بیری کے پتے ملے پانی کے ساتھ غسل کرنے کا حکم فرمایا۔(4)

لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّ نُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَاۤ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِیَّ كَثِیْرًا ﴿۴۹﴾

”تاکہ ہم زندہ کر دیں اس پانی سے کسی غیر آباد شہر کو اور ہم پلائیں یہ پانی ۱؎ اپنی مخلوق سے کثیر التعداد مویشیوں اور انسانوں کو ۲؎“

۱؎ تاکہ ہم اس پانی کے ساتھ غیر آباد جگہ کو زندہ کر دیں۔ یہاں مَیْتًا مذکر مذکور ہے اس لیے کہ بلدۃً بمعنی بلد ہے۔ یا پھر اس لیے کہ یہ مکان کی تاویل میں ہے (یعنی مکاناً میتاً) یا اس لیے کہ یہ مونث غیر حقیقی ہے، یا پھر اسی لیے کہ یہ مبالغہ کے تمام اوزان کی طرح فعل پر جاری نہیں۔ لہٰذا یہ جامد کے قائم مقام ہے۔ اور نُسْقِیَهٗ میں سَقٰی اور اَسْقٰی دونوں لغتیں ایک ہی معنی میں ہیں۔

۲؎ یعنی ان جنگلوں میں رہنے والوں کو جو بارش کے ساتھ ہی زندگی گزارتے ہیں۔ اسی لیے انعام اور اناسی کو نکرہ ذکر کیا۔ اور ان کی تخصیص اس لیے ہے کیونکہ شہروں اور دیہاتوں میں رہنے والے نہروں، کنوؤں اور چشموں کے قریب رہتے ہیں لہٰذا وہ اپنی ذاتوں اور مویشیوں کے لیے بارش کے پانی سے مستغنی ہوتے ہیں۔ اور کیونکہ آیت کا سیاق انسان پر نعمتیں متعدد ہونے کے بارے ہے اور ان کے عام منافع اور ان کے غالب طرز حیات کا انحصار مویشیوں پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مویشیوں کو سیراب کرنے کا ذکر انسانوں کے ذکر پر مقدم کیا ہے۔ اسی طرح جانوروں پر زمین کو زندہ کرنے کا ذکر مقدم کیا کیونکہ یہ ان کی حیات اور تعیش کا سبب ہے۔ اناسیَّ یہ انسیّ کی جمع ہے یا انسان کی جمع ہے۔ جیسا کہ ظرابی ظربان کی جمع ہے۔ کیونکہ یہ اصل میں اَنَاسِین ہے جیسا کہ بساتین بستان کی جمع ہے۔ اس میں نون کو یاء سے بدلا گیا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَیْنَهُمْ لِیَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰۤی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾

1۔ سنن نسائی، جلد 1 صفحہ 47 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 167 (وزارت تعلیم)
3۔ مجمع الزوائد، جلد 1 صفحہ 629 (الفکر) 4۔ طبقات کبریٰ از ابن سعد، جلد 7 صفحہ 36 (صادر)

"اور ہم بانٹتے رہتے ہیں بارش کو لوگوں کے درمیان تاکہ وہ غور وفکر کریں 1۔ پس انکار کر دیا اکثر لوگوں نے مگر یہ کہ وہ ناشکر گزار بنیں گے 2۔"

1۔ اور ہم بارش لوگوں کے درمیان بانٹتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک شہر اور کبھی دوسرے شہر۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا "کوئی سال بھی کسی سال سے زیادہ بارش برسانے والا نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اسے زمین میں تقسیم کرتا رہتا ہے۔ اور پھر یہ آیت پڑھی۔ اور مرفوع روایت ہے کہ شب وروز میں سے کوئی بھی ساعت نہیں مگر آسمان اس میں بارش برساتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے (1)۔ ابن اسحاق، ابن جریج اور مقاتل نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا کوئی سال دوسرے سال کی نسبت زیادہ بارش برسانے والا نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس رزق کو تقسیم کیا ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ رزق آسمان دنیا میں اس بارش میں رکھ دیا ہے۔ لہٰذا وہ ہر سال اس سے معین اور معلوم کیل اور وزن کے ساتھ اتارتا ہے۔ اور جب کوئی قوم گناہ کا عمل کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دوسروں کی طرف پھیر دیتا ہے۔ اور جب سارے لوگ گناہ کرنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ اسے جنگلوں اور سمندروں کی طرف پھیر دے گا۔ (2)

اور یہ بھی کہا گیا ہے تصریف المطر (بارش کو تقسیم کرنے) سے مراد اسے موسلا دھار، ہلکی بارش، پھوہار اور ان ہی جیسی کیفیتوں میں تقسیم کرنا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد نہروں یا چشموں میں بانٹنا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ تصریف قول کی طرف راجع ہے۔ یعنی ہم نے اس قول کو لوگوں کے درمیان قرآن اور دیگر تمام کتابوں کے ذریعہ تقسیم کر دیا ہے۔ تاکہ وہ غور وفکر کریں اور کمال قدرت اور اس میں نعمت کے حق کو پہچانیں اور پھر اس کا شکر بجالائیں۔ یا معنی یہ ہے تاکہ وہ (بارش کے کبھی) اپنے سے (دوسروں کی طرف) اور کبھی اپنی جانب پھرنے سے عبرت حاصل کریں۔

2۔ پس اکثر لوگوں نے انکار کر دیا مگر یہ کہ وہ کفران نعمت کرتے ہیں۔ جب ان پر بارش برسائی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں فلاں ستارے کی وجہ سے ہم پر بارش برسائی گئی۔

حضرت زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر ہمیں بارش کے ان نشانات میں صبح کی نماز پڑھائی جو رات کے وقت ہوئی تھی۔ تو جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے تو فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ تمہارے رب نے کہا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندوں میں سے بعض نے میرے ساتھ ایمان لاتے ہوئے صبح کی ہے اور بعض نے میرے ساتھ کفر کرتے ہوئے۔ پس جنہوں نے یہ کہا کہ ہمیں اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش عطا کی گئی تو وہ میرے ساتھ ایمان لانے والے ہیں اور ستاروں کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں (یعنی ستاروں کی قدرت کا انکار کرنے والے ہیں)۔ اور جنہوں نے یہ کہا کہ ہمیں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش دی گئی تو وہ میرے ساتھ کفر کرنے والے ہیں اور ستاروں کے ساتھ ایمان لانے والے ہیں۔ متفق علیہ۔ (3)

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيرًا ﴿٥١﴾

"اور اگر ہم چاہتے تو بھیجتے ہر گاؤں میں ایک ڈرانے والا 1۔"

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 141 (وزارت تعلیم)

۱؎ اور اگر ہم ہر گاؤں میں ایک رسول بھیجنا چاہتے تو ہم ہر گاؤں میں ایک نبی بھیج دیتے جو وہاں کے رہنے والوں کو ڈراتا تو آپ پر تبلیغ کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ لیکن ہم نے آپ کی بزرگی، عظمت شان اور تمام رسولوں پر آپ کی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے آپ کو تمام لوگوں کی طرف بھیجا۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾

''پس کافروں کی پیروی نہ کرو اور خوب ڈٹ کر مقابلہ کرو ان کا قرآن (کی دلیلوں سے) ۱؎''

۱؎ پس آپ کافروں کی پیروی نہ کریں ان امور میں جن میں وہ اپنی فریب کاری کے ساتھ آپ کو اپنی موافقت کی دعوت دیتے ہیں۔ بلکہ ہم نے آپ پر رسالت عامہ کا جو انعام فرمایا اس پر شکر بجالایئے اور آپ اپنی دعوت اور اظہار حق میں ثابت قدم رہیے۔ اور ان کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیجئے اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی توفیق سے یا قرآن کی دلیلوں سے یا پھر ان کی اس اطاعت کو چھوڑ کر جس پر ''فَلَا تُطِعْ'' دلالت کرتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ بے شک وہ حق کو باطل قرار دینے کے لیے سر توڑ کوششیں کرتے ہیں۔ پس آپ حق کو ثابت کرنے اور ان کی مخالفت میں خوب جدوجہد کر کے ان کا مقابلہ کیجئے۔ ''جِهَادًا كَبِيْرًا'' سے مراد بہت سخت کوشش ہے جو دل، زبان، تلوار اور تیروں سے ہو۔

وَ هُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَ جَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾

''اور اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے ملا دیا ہے دو دریاؤں کو، یہ (ایک) بہت شیریں ہے اور یہ (دوسرا) سخت کھاری ۱؎ اور بنا دی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان کے درمیان آڑ اور مضبوط رکاوٹ ۲؎''

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے دو دریاؤں کو اس طرح چلا دیا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے جوار میں ہونے کے سبب آپس میں ملنے والے ہیں۔ کہا جاتا ہے ''مَرَجْتُ الدَّابَّةَ وَ اَمْرَجْتُهَا'' یہ جملہ بولا جاتا ہے کہ جب تو کسی چوپائے کو چراگاہ میں لے آئے اور اسے چھوڑ دے کہ وہ جہاں چاہے چلا جائے۔ (بتلانا یہ مقصود ہے کہ آیت طیبہ میں مرج بمعنی خلا (چھوڑ دینا) ہے۔ مترجم) اس آیت کریمہ کا عطف ''وَهُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ الرِّيَاحَ'' پر ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان تمام جملے معترضے ہیں (یہ (ایک) بہت شیریں ہے) اپنی حد درجہ شیرینی اور مٹھاس کے سبب پیاس کو ختم کرنے والا ہے۔ اور یہ (دوسرا) کڑوا اور سخت کھاری ہے۔ یہ ''تَاَجَّجُ النار'' سے ہے یعنی جب آگ خوب بھڑک جائے اور شعلے مارنے لگے اور یہ پیاس میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ دونوں جملے قول مقدر کے ساتھ اَلْبَحْرَيْنِ سے حال ہیں۔ یا پھر اس کی صفت ہیں اس طریقہ پر ''وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ'' یا پھر ان سے قبل موصول صلہ سمیت حذف ہو کر اس کی صفت ہے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے ''مَرَجَ البَحرينِ الَّذَيْنِ يُقَالُ فِيْ شَانِهِمَا هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ''۔

۲؎ اس کا عطف مَرَجَ پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان اپنی قدرت سے بنا دی۔ ایک آڑ، رکاوٹ جو ان کے آپس میں ملنے کے مانع ہے۔ یعنی مکمل پردہ نہ تو وہ حد سے تجاوز کر سکتے ہیں اور نہ ہی کھاری پن مٹھاس اور شیرینی کو خراب کر سکتا ہے۔ علامہ

بیضاویؒ نے فرمایا ہے کہ یہ دخیل کی طرح ہے جو سمندر میں داخل ہو رہی ہے اور وہ سمندر کو چیر دیتی ہے اور یہ کئی فرسخ تک اس کے اندر چلی جاتی ہے اور اس کا ذائقہ متغیر نہیں ہوتا۔ اور کہا گیا ہے البحر العذب سے مراد نہر عظیم (بڑا دریا) ہے جیسا کہ دریائے نیل وغیرہ اور البحر الملح سے مراد بحر کبیر (بڑا سمندر) ہے۔ اور برزخ سے مراد ان دونوں کے درمیان حائل ہونے والی زمین ہے۔ اور یہ انہیں جدا جدا اور مختلف صفات پر رکھنے کی قدرت رکھتی ہے۔ باوجودیکہ تمام عناصر کے اجزاء کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ وہ باہم ملے ہوئے ہوں، ایک دوسرے سے ملاصق ہوں اور کیفیت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ﴿٥٤﴾

''اور وہ وہی ہے جس نے پیدا فرمایا انسان کو پانی (کی بوند) سے اور بنا دیا اسے خاندان والا اور سسرال والا[1] اور آپ کا رب بڑی قدرت والا ہے[2]''

[1] اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے نطفہ سے پیدا کیا ہے انسان کو اور اسے دو قسموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک ذی نسب یعنی مذکر بنایا۔ جن کی طرف انسان کی نسبت کی جاتی ہے۔ اور دوسرا ذات مہر بنایا یعنی مونث کہ ان کے سبب سسرال بنائے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ ارشاد اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہی ہے: فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "جَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا" کا معنی ہے ذانسب۔ یعنی یہ آباء کی طرف منسوب ہے، چاہے وہ مذکر ہوں یا مونث اور ذاصِهر اس اعتبار سے ہے کہ وہ شادی کرتا ہے، چاہے وہ مذکر ہو یا مونث ہو۔

[2] یعنی وہ جس پر چاہتا ہے قدرت رکھتا ہے اس حیثیت سے کہ اس نے ایک مادہ سے انسان کو پیدا کیا۔ جبکہ اس کے اعضاء مختلف ہیں اور طبائع اور مزاج بھی باہم متفرق ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی دو قسموں میں بنایا جو باہم ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ اور بسا اوقات وہ ایک ہی نطفہ سے دو جڑواں بچوں کو (ایک کو مذکر اور ایک کو مونث) پیدا کر دیتا ہے۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۗ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَبِّهِ ظَهِيرًا ﴿٥٥﴾

''اور وہ پوجتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان بتوں کو جو نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں انہیں اور نہ نقصان[1] اور کافر اپنے رب کے مقابلے میں (ہمیشہ شیطان کا) مددگار رہتا ہے[2]''

[1] اور وہ پوجتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان بتوں کو جو انہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتے اگر وہ ان کی عبادت کرتے رہیں۔ اس کا عطف سابقہ جملے پر ہے۔ یا یہ مبتدا مقدر کے ساتھ حال ہے۔ یعنی "وَهُمْ يَعْبُدُونَ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ" اور وہ انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے اگر وہ ان کی عبادت چھوڑ دیں۔

[2] اور کافر گناہ کرنے کے سبب اپنے رب کے خلاف شیطان کا معاون و مددگار رہتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ کافر اپنے رب کے مقابلہ میں رسوا اور ذلیل ہے۔ کہا جاتا ہے "جعلنی ظهیرا ای ذلیلا" (اس نے مجھے ذلیل کر دیا) یہ ظہرت الشیء سے ہے۔ اس کا معنی ہے کہ جب تو کسی شے کو اپنی پشت کے پیچھے رکھ دے اور اس کی طرف توجہ نہ کرے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٥٦﴾

''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر بشارت دینے والا اور ڈرانے والا [1]''

[1] اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر مومنین کو جنت کی بشارت دینے والا اور کافروں کو جہنم کی آگ سے ڈرانے والا۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝

''فرما دیجئے کہ میں نہیں مانگتا تم سے اس (خیر خواہی) پر کچھ اجرت [1] مگر میری اجرت یہ ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرے [2]''

[1] میں تم سے رسالت کی تبلیغ پر کچھ نہیں مانگتا جس پر اللہ تعالیٰ کا قول مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا دلالت کرتا ہے۔ یعنی کوئی اجرت۔ کہ اس تاوان کا خوف تم پر میری اتباع مشکل بنا دے۔ یہ جملہ مستأنفہ ہے۔

[2] مگر یہ عمل کہ جس کا جی چاہے وہ اللہ تعالیٰ کا قرب اختیار کرے اور اس کے نزدیک ہونے کی کوشش کرے گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے اوامر کی پیروی اور اپنی نواہی سے اجتناب کرنے میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنے کو رسالت کا اجر قرار دیا اس اعتبار سے کہ یہی رسالت کا مقصود ہے۔ اور حرص اور لالچ کے شبہ کو جڑ سے اکھیڑنے اور حد درجہ شفقت کے اظہار کے لیے تبلیغ رسالت کو اس اجر سے مستثنیٰ قرار دیا ہے جس کے سوال کی نفی کی گئی ہے۔ اور ایسی چیز کو اجرت بنایا جو فی نفسہ ان کے لیے بھی نفع بخش تھی اور یہ آپ کی رضا اور مقصود کو پورا کرنے والی بھی تھی اور یہ انداز بیان احساس دلاتا ہے کہ ان کی اطاعت کے سبب آپ ﷺ کو بھی ثواب ملے گا۔ جیسا کہ اس پر رسول اللہ ﷺ کا اپنا ارشاد دلالت کرتا ہے الدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كفاعِله''(1) کہ بھلائی کی راہنمائی کرنے والا اسے کرنے والے کی طرح ہے۔ اسے بزار نے ابن مسعود سے اور طبرانی نے سہل بن سعد اور ابو مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔ اور امام احمد، اصحاب کتب ستہ اور الضیاء نے اس زیادتی کے ساتھ اسے بریدہ سے روایت کیا ہے ''وَاللّٰهُ يُحِبُّ اِغَاثَةَ اللَّهْفَان'' (اور اللہ تعالیٰ مظلوموں کی مدد کرنا پسند کرتا ہے) اور ابن ابی الدنیا نے قضاء الحوائج میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''مَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ اَجْرُهَا وَ اَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ اَنْ يَنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ'' (جس کسی نے اسلام میں اچھا طریقہ رائج کیا تو اس کے لیے اس کا اجر بھی ہے اور اس کا اجر بھی جس نے اس کے مطابق عمل کیا۔ مگر اس طرح ان کے اجروں میں سے کوئی شئی کم نہیں کی جائے گی) اسے مسلم نے ایک طویل حدیث میں جریر سے نقل کیا ہے۔ (2)

یہ قول بھی ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے۔ ''ولكن من شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا بِالْاِنْفَاقِ مِنْ مَالِهٖ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَلْيَتَّخِذْ'' لیکن جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنا مال خرچ کر کے کوئی اجر بنانا چاہے تو وہ بنا لے۔ یعنی میں اپنی ذات کے لیے تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا لیکن اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے، اس کی رضا طلب کرنے اور اس کی جنت کی طرف راستہ بنانے سے منع نہیں کرتا۔ شاید اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اور دیگر صدقات کی ادائیگی کے امر میں اجرت کے سوال کی تہمت کو دور کرنے کے لیے ہی اپنے نبی ﷺ اور آپ کی اہل بیت پر صدقات کو حرام قرار دیا ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اطاعت کی اجرت لینا جائز نہیں مثلاً قرآن کریم کی تعلیم، اذان اور امامت وغیرہ کی

اجرت۔ قول باری تعالیٰ "اِلٰی رَبِّهٖ" یعنی اِلٰی ثَوابِ رَبِّهٖ یہ سَبِیْلًا سے حال ہے اور سبیلاً یتخذ کا مفعول ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۭ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرَا ۝ ۵۸

"اور (اے مصطفیٰ ﷺ) آپ بھروسہ کیجئے ہمیشہ زندہ رہنے والے پر جسے کبھی موت نہیں آئے گی [1] اور اس کی حمد کے ساتھ پاکی بیان کیجئے اور اس کا اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر ہونا کافی ہے [2]۔"

[1] ان کے شر کا دفاع کرنے میں اور ان کی اجرت سے استغناء کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے۔ کیونکہ فی الحقیقت اسی کی شان ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے نہ کہ ان زندوں پر جو مر جاتے ہیں۔ کیونکہ جو ان پر بھروسہ کرتے ہیں وہ ضائع اور ہلاک ہو جاتے ہیں جب وہ مر جاتے ہیں۔ اس کا عطف قل لااسئلکم پر ہے۔

[2] صفات نقصان سے اس کی پاکی بیان کیجئے اور مزید انعام طلب کرتے ہوئے صفات کمال کے ساتھ اس کی تعریف بیان کیجئے۔ اور کہیے سبحان اللّٰه و بحمده۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرتے ہوئے اس کی تعریف کیجئے۔ اور اللہ تعالیٰ (اپنے بندوں کے گناہوں کو) جاننے والا ہے۔ اور وہی ان کے بدلے جزاء دے گا۔ اور جملہ کفی بہ الحیّ سے حال ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۝ ۵۹

"جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں۔ پھر وہ متمکن ہوا عرش پر (جیسے اس کی شان ہے) وہ رحمٰن ہے [1] سو پوچھ اس کے بارے میں کسی واقف حال سے [2]۔"

[1] شاید اس کا ذکر (استحکام) تقریر کی زیادتی کے لیے ہے۔ کیونکہ حقیقۃً اس کی شان ہے کہ اس پر توکل کیا جائے اس حیثیت سے کہ وہ ہر شے کا خالق ہے اور اس میں تصرف کرنے والا ہے۔ اس میں تمام امور میں ثبات اور استحکام اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل قدرت اور ہر مراد میں اپنا حکم فوراً نافذ کرنے کا اختیار ہونے کے باوجود تمام اشیاء کو بالتدریج اور آہستہ آہستہ پیدا کیا ہے۔ ترکیب کلام میں اسم موصول مبتداء ہے اور اس کی خبر "اَلرَّحْمٰنُ" ہے یا موصول الحیّ کی صفت ہے یا منصوب علی المدح ہے یعنی اس سے پہلے اَعْنِیْ یا اَمْدَحُ فعل محذوف ہے۔ اور الرَّحْمٰنُ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی هُوَ الرَّحْمٰنُ یا پھر یہ استوٰی کے فاعل سے بدل ہے۔

[2] جو کچھ خلق اور استوٰی میں سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں کسی جاننے والے سے پوچھ جو تمہیں اس کی حقیقت کے بارے خبر دے (1)۔ اسی طرح کلبی نے کہا ہے۔ خبیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس، جبرئیل امین علیہ السلام یا پھر سابقہ کتب کا عالم ہے تا کہ وہ آپ کی اس بارے میں تصدیق کرے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ضمیر الرَّحْمٰن کی طرف راجع ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر اس کے اطلاق کا انکار کریں تو پھر اہل کتاب کے علماء سے اس کے بارے پوچھئے تا کہ یہ ان کی کتابوں میں اس کا ہم معنی لفظ آنے کو پہچان لیں۔ اور اس بناء پر جائز ہے کہ وہ مبتدا ہو اور اس کا مابعد خبر ہو۔ اور سوال جس طرح صلہ عن سے متعدی ہوتا ہے۔ اسی

1۔ تفسیر بیضاوی زیر آیت ہذا

طرح صلہ باء سے بھی متعدی ہوتا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے سو پوچھ اے انسان! رحمٰن کے بارے میں کسی واقف حال سے جو تجھے اس کی صفات کے بارے خبر دے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿٦٠﴾

''اور جب کہا جاتا ہے انہیں [1] کہ رحمٰن (کے حضور) سجدہ کرو۔ وہ پوچھتے ہیں رحمٰن کون ہے [2] کیا ہم سجدہ کریں اس کو جس کے متعلق تم ہمیں حکم دیتے ہو [3] اور وہ زیادہ نفرت کرنے لگتے ہیں [4]''

[1] اس کا عطف اس قول پر ہے الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ کے جملہ پر ہے۔

[2] کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ پر رحمٰن کا اطلاق نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے ہم تو یمامہ کے رحمٰن کے سوا کوئی رحمٰن نہیں پہچانتے۔ اس سے ان کی مراد مسیلمہ کذاب تھا وہ اسے رحمٰن الیمامہ کے نام سے پکارتے تھے۔

[3] کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کے متعلق اے محمد (ﷺ) تم ہمیں حکم دیتے ہو۔ جمہور نے اسے صیغہ خطاب کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہے اور حمزہ اور کسائی نے صیغہ غائب کے ساتھ لِمَا يَاْمُرُنَا پڑھا ہے۔ اور وہ لِمَا يَاْمُرُنَا سے مراد حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی لیتے تھے۔

[4] اس کا عطف قَالُوْا پر ہے۔ یعنی رحمٰن کو سجدہ کرنے کے حکم نے ان کی ایمان سے نفرت میں اضافہ کر دیا۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾

''بڑی (خیرو) برکت والا ہے جس نے بنائے ہیں آسمان میں برج، اور بنایا ہے اس میں چراغ (آفتاب) اور چاند چمکتا ہوا [1]''

[1] حسن، مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے کہ بروج سے مراد بڑے ستارے ہیں، ان کے ظاہر اور واضح ہونے کی وجہ سے ان کا نام بروج رکھا گیا ہے۔

عطیہ عوفی نے کہا ہے کہ بروج سے مراد وہ محلات ہیں جن میں پہرے دار رہتے ہیں (1)۔ اور سراج سے مراد سورج ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا'' حمزہ اور کسائی نے اسے جمع کی صورت سُرُجًا پڑھا ہے۔ اور اس سے مراد سورج اور تمام ستارے لیے ہیں سوائے چاند کے۔ کیونکہ چاند سراج نہیں ہے اس لیے کہ سراج وہ ہوتا ہے جو بذات خود روشن ہوتا ہے جبکہ چاند کا نور سورج سے مستفاد ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورج کے مقابل آنے کی مقدار کے مطابق اس کا گھٹنا اور بڑھنا اس پر دلالت کرتا ہے۔ اور وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا کے قول کے ساتھ اس پر عطف بھی اسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾

''اور وہ وہی ہے جس نے بنایا ہے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا [1] اس کے لیے جو یہ چاہتا ہے کہ وہ نصیحت قبول کرے [2] یا چاہتا ہے کہ شکر گزار رہے [3]''

لے یعنی ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے پیچھے ہوتا ہے۔ اس طرح کہ ان میں سے ایک دوسرے کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ پس جس کا کوئی عمل ان میں سے ایک میں فوت ہو جائے تو وہ اسے دوسرے میں قضا کر لے (۱) (یعنی دن کا عمل رات کے وقت اور رات کا عمل دن کے وقت قضا کر لے۔ مترجم)۔

امام بغویؒ نے کہا ہے کہ ایک آدمی امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور عرض کی میری رات کی نماز فوت ہوگئی ہے۔ تو آپؓ نے فرمایا "اَدْرِکْ مَا فَاتَکَ مِنْ لَیْلِکَ فِیْ نَھَارِکَ" (یعنی جو کچھ تیرا رات کے عمل میں سے فوت ہوا ہے اسے اپنے دن میں ادا کر لے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّھَارَ خِلْفَۃً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ اور مجاہد نے کہا ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے مخالف ہے اس طرح کہ ایک ان میں سے سیاہ (تاریک) ہے اور دوسرا سفید (روشن) ہے۔ (1)

سے یہ جَعَلَ کے متعلق ہے اور "اَنْ یَّذَّکَّرَ" کو حمزہ اور کسائی نے ذال اور کاف کی تخفیف اور کاف کے ضمہ اور ذال کے سکون کے ساتھ مجرد پڑھا ہے۔ یعنی وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ذکر کرے۔ اور باقی قراء نے اسے ذال اور کاف کی تشدید اور دونوں کے فتحہ کے ساتھ باب تفعل سے پڑھا ہے کہ اس میں تاء کو ذال میں ادغام کیا گیا ہے۔ یعنی اس کے لیے جو یہ ارادہ کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرے اور اس کی صنعت و کاریگری میں غور و فکر کرے۔ تو وہ یہ جان لے گا کہ اس کے لیے حکیم و دانا صانع کا ہونا ضروری ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے واجب الوجود ہو اور بندوں پر انتہائی رحم کرنے والا ہو۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ جو اعمال خیر میں سے اس عمل کو یاد کرنے کا ارادہ کرے ان دو وقتوں میں سے کسی ایک میں فوت ہو جائے تو پھر وہ اسے دوسرے وقت میں قضا کر لے۔

سے یا وہ اس پر اپنے رب کی نعمت کا شکر ادا کرے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کو پیدا فرمایا اور ان میں سے رات کو تاریک بنا دیا اور دن کو روشن اور ان میں اتنے منافع رکھے ہیں تاکہ نصیحت حاصل کرنے والے ان میں نصیحت حاصل کریں اور اس کی نعمتوں پر شکر بجا لانے والے اس کا شکر ادا کریں۔ لہٰذا جس نے ذکر، شکر، نصیحت اور غور و فکر کے بغیر اپنا وقت گزار دیا تحقیق اس نے اپنا وقت ضائع کر دیا اور اس کا راس المال ہلاک ہو گیا۔

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾

"اور رحمٰن کے بندے لے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر آہستہ آہستہ سے اور جب گفتگو کرتے ہیں ان سے جاہل تو وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ تم سلامت رہو سے"

لے یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَۃَ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے شرف اور ان کی فضیلت کے اظہار کے لیے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(۱) حسن سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چاشت کی نماز طویل کر دی۔ تو آپ سے کہا گیا کہ آج آپ نے وہ کام کیا ہے جو آپ نے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا۔ تو آپ نے فرمایا میرے رات کے وظائف میں سے کچھ باقی رہ گیا تھا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اسے مکمل کر لوں یا فرمایا میں اسے پورا کرتا رہا اور پھر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ خِلْفَۃً الآیہ

ان کی نسبت (اضافت) اپنی طرف کی ہے۔ یا اس لیے کہ وہ اس کی عبادت میں راسخ ہیں۔ اس صورت میں عباد عابد کی جمع ہے جیسے تجار تاجر کی جمع ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے رحمٰن کا اسم یہ احساس دلانے کے لیے ذکر کیا گیا ہے کہ بے شک وہ لوگ مخلوق پر کمال رحمت کا سلوک کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کمال رحمت کا وعدہ فرما رکھا ہے۔

۲؎ اس میں هَوْناً یا تو هینین کے معنی میں ہے (یعنی ضمیر مرفوع سے یہ حال ہے۔ مترجم) یا یہ مشیاً هیناً ہے۔ یعنی مصدر کی صفت اس کے ساتھ لگائی گئی ہے۔ اور معنی یہ ہے بے شک وہ زمین پر سکون اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں تواضع کرتے ہوئے نہ کہ اکڑتے ہوئے اور تکبر کرتے ہوئے۔ (۱) لغت میں ھون کا معنی نرمی اور لین ہے اور قاموس میں ہے کہ ھون کا معنی وقار ہے (1)۔ اسی سے حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "اَلْمُؤْمِنُ هَيِّنٌ لَيِّنٌ حَتّٰى تَخَالُهُ مِنَ اللِّيْنِ اَحْمَقَ" (2) (کہ مومن پر وقار اور نرم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ تم اسے نرمی کی وجہ سے احمق خیال کرنے لگتے ہو۔ اسے بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۳؎ اس کا عطف یمشون پر ہے۔ یعنی جب احمق لوگ ان سے ایسی چیزوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جنہیں وہ ناپسند کرتے ہیں۔ مجاہد نے کہا یعنی وہ ایسی درست بات کرتے ہیں کہ وہ ایذاء اور گناہ دونوں سے بچ جاتے ہیں۔ اسی طرح مقاتل اور ابن حبان نے کہا ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ اگر کوئی جاہل ان سے جہالت کا سلوک کرے تو وہ اسے برداشت کرتے ہیں اور وہ جاہلانہ رویہ نہیں اپناتے۔ اور حسن سے یہ معنی بھی مروی ہے کہ وہ انہیں سلام کہہ دیتے ہیں (یعنی تم سلامت رہو) اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (3)

کلبی اور ابو العالیہ نے کہا ہے کہ یہ انداز قتال کے حکم سے پہلے کا ہے۔ پھر آیت قتال نے اسے منسوخ کر دیا ہے (4)۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے اور منسوخ نہیں۔ کیونکہ قتال کا حکم تو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اور وہ لا الٰہ الاّ اللہ کہنے یا جزیہ دینے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ یہ کہیں لا الٰہ الاّ اللّٰہ وانّ محمداً رسول اللّٰہ۔ الحدیث متفق علیہ (5)۔ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ الی قولہ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۔ اور یہ سفہاء کے مقابلہ میں مومنین کی حالت کا بیان ہے اور اس میں اپنی ذاتوں کے لیے ان سے انتقام لینے سے اعراض کرنے اور ان سے مؤاخذہ نہ کرنے کی تعلیم ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میرے قرابت دار ہیں، میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ قطع تعلقی کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہوں اور وہ میرے ساتھ برا رویہ اختیار کرتے ہیں اور میں ان سے بردباری کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ جاہلانہ

1۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1629 (التراث العربی)　2۔ شعب الایمان، جلد 6 صفحہ 272 (العلمیہ)　3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
4۔ ایضاً　5۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 8 (وزارت تعلیم)

(۱) حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ اکڑ کر چل رہا ہے۔ تو آپ نے اسے فرمایا اکڑ کر چلنا ناپسندیدہ چال ہے۔ مگر دوران جہاد (پسندیدہ ہے) اور اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کی تعریف فرمائی ہے۔ اور ارشاد فرمایا ہے وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا۔ لہٰذا تو اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر

برتاؤ کرتے ہیں۔ تو یہ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تو ایسے ہی ہے جیسے تو نے کہا ہے تو پھر تو انہیں خاک چٹواتا ہے اور جب تک تو اس پر قائم رہے گا اللہ تعالیٰ کی مدد تیرے ساتھ رہے گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔(1)

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب انہوں نے یہ آیت پڑھی تو فرمایا یہ تو ان کے دن کی حالت ہے۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ﴿۶۴﴾

''اور جو رات بسر کرتے ہیں اپنے رب کے حضور سجدہ کرتے ہوئے اور کھڑے ہوئے لے''

لے تو فرمایا یہ ان کی رات کا وصف ہے(2)۔ اس میں رات کی عبادت کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ رات کی عبادت مشقت آمیز اور ریاء سے بہت دور ہوتی ہے۔ اور قلب (دل) کو زبان کے موافق کرنے والی ہوتی ہے۔ اور اس لیے بھی کہ دن کو عبادت کی دوسری قسم کے لیے خاص کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ اور وہ تعلیم وتعلم اور ارشاد واسترشاد کے لیے نیک لوگوں کی سنگت اختیار کرتے ہیں۔

اس میں لِرَبِّهِمْ کا قول سُجَّدًا کے متعلق ہے۔ اور یہ ساجد کی جمع ہے اور قِیَام قائم کی جمع ہے۔ یا قیام مصدر ہے جو فاعل کے قائم مقام ذکر کیا گیا ہے۔ اور قیام کو مؤخر کرنے کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اَشْرَافُ اُمَّتِیْ حَمَلَةُ الْقُرْآنِ وَاَصْحَابُ اللَّیْلِ'' (میری امت کے اشراف قرآن اٹھانے والے (یعنی قرآن پر عمل کرنے والے) اور رات کو عبادت کرنے والے ہیں)۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔(3)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا کہ فرض نماز کے بعد افضل ترین نماز وہ ہے جو رات کے وقت ادا کی جائے۔ اسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے(4)۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر رات کا قیام لازم ہے بے شک یہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ ہے۔ یہ تمہیں اپنے رب کے قریب کرنے کا ذریعہ ہے۔ برائیوں کو مٹانے والا ہے اور گناہ سے روکنے والا ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔(5)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین آدمی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ (اپنی شان کے مطابق) مسکراتا ہے ایک وہ آدمی جو رات کو اٹھ کر عبادت کرتا ہے۔ دوم وہ قوم جب نماز کے لیے صفیں بناتی ہیں اور سوم وہ قوم جو دشمن کے ساتھ قتال کرنے کے لیے صف آرا ہوتی ہے۔'' اسے بغویؒ نے شرح السنہ میں روایت کیا ہے۔(6)

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جس نے عشاء کے بعد آخر میں دو یا دو سے زیادہ رکعتیں پڑھیں تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ اور قیام کرتے ہوئے رات بسر کی۔ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی تو (اس کا اجر) نصف رات قیام کرنے کی مثل ہے۔ اور جس نے صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی وہ مکمل رات قیام کرنے والے کی طرح ہے۔ اسے احمد اور مسلم نے صحیح میں نقل کیا ہے۔(7)

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 315 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ شعب الایمان، جلد 2 صفحہ 556 (العلمیہ)
4۔ مسند امام احمد، جلد 2 صفحہ 303 (صادر) 5۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 194 (وزارت تعلیم)
6۔ مصابیح السنۃ، جلد 1 صفحہ 153 (العلمیہ) 7۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 232 (قدیمی)

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿٦٥﴾

''اور جو (بارگاہ الٰہی میں) عرض کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! دور فرما دے ہم سے عذاب جہنم [1] بے شک اس کا عذاب بڑا مہلک ہے [2]''

[1] یعنی وہ مخلوق کے ساتھ حسن معاشرت اور عبادتِ حق میں اپنی جدوجہد کے باوجود اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور وہ اپنے سے عذاب کو پھیرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کرتے ہیں وہ اپنے اعمال کو حجت نہیں بناتے اور نہ اپنے حال پر اعتماد کرتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک نبی کی طرف وحی کی کہ وہ اپنی امت میں سے میری اطاعت کرنے والوں کو کہہ دے کہ وہ اپنے اعمال پر توکل نہ کریں بے شک میں قیامت کے دن حساب کے وقت جس بندے کو کھڑا کروں گا اگر میں اسے عذاب دینا چاہوں گا تو اسے عذاب دے دوں گا اور اپنی امت میں سے میری نافرمانی کرنے والوں کو کہہ دے کہ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں (یعنی مایوس نہ ہو جائیں) بے شک میں بڑے بڑے گناہ بخش دیتا ہوں اور کوئی پرواہ نہیں کرتا (1)۔ اسے ابونعیم نے روایت کیا۔

[2] بے شک اس کا عذاب لازم ہے۔ اسی سے غریم ملازمت کے معنی میں ہے۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ غرام کا معنی اشد الازم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہلاک کرنے والا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ غرام سے مراد وہ تکلیف اور مصیبت ہے جو انسان کو پہنچتی ہے۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے کہا لیکن انہوں نے شکر ادا نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس تکلیف میں مبتلا کر دیا کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ حسن نے کہا ہے ہر غریم اپنے غریم سے جدا ہو جائے گا مگر جہنم کا غریم اس سے جدا نہیں ہوگا۔(2)

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿٦٦﴾

''بے شک وہ بہت برا ٹھکانہ اور بہت بری جگہ ہے [1]''

[1] اس میں سَآءَتْ فعل ذم ہے اور بئست کے معنی میں ہے۔ اور اس میں ایک ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر (ماقبل) ضمیر کر رہی ہے۔ اور مخصوص بالذم (ہی) ضمیر محذوف ہے۔ اسی کے سبب اس کا ربط اِنَّ کے اسم کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ اور مُسْتَقَرًّا حال ہے یا تمیز۔ اور جملہ پہلے جملے کی علت بیان کرنے کے لیے ہے۔ یا پھر یہ جملہ دوسری تعلیل ہے۔ اور دونوں جملے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایت اور ابتدا کا احتمال رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ سَآءَتْ افعال متصرفہ میں سے ہو یعنی ساء یسوء سوءً ا ومساءۃً یہ حسنت کی ضد ہے۔ اس معنی کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہوتی ہے جو اہل جنت کے وصف میں ہے۔ ''حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا'' اس معنی کی بناء پر سَآءَتْ میں ضمیر مستتر اِنَّ کے اسم کی طرف راجع ہے۔ اور مُسْتَقَرًّا حال ہے یا نسبت سے تمیز اور معنی یہ ہے کہ جہنم کو ٹھکانا بنانا اور اس میں اقامت اختیار کرنا برا ہے۔

1۔ مجمع الزوائد جلد 10 صفحہ 52-551 (الفکر)   2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾

''اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کنجوسی ۔1 (بلکہ) ان کا خرچ کرنا اسراف اور بخل کے بین بین اعتدال سے ہوتا ہے ۔2 ''

1۔ اس کو ابن کثیر اور اہل بصرہ نے یاء کے فتحہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ ''يَقْتِرُوْا'' پڑھا ہے ۔ اہل مدینہ اور ابن عامر نے یاء کے ضمہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے ۔ اور ان کے علاوہ دوسروں نے یاء کے فتحہ اور تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے ۔ اور یہ تمام کی تمام لغتیں ہیں ۔ کہا جاتا ہے اِقْتَرَ يُقْتِرُ اور قَتَّرَ یہ وزن متعدد ہیں ۔ اور قَتَرَ يَقْتُرُ اور يَقْتِرُ یہ ينصُر اور يضرب کے وزن پر ہیں ۔

اسراف کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی معصیت میں خرچ کرنا اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو ۔ اور اقتار کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے حق کو روکنا ۔ یہ قول حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور ابن جریج کا ہے ۔ اور حسن نے بھی اس آیت میں یہی کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مال خرچ نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے فرائض سے روکتے نہیں ۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے کہ اسراف کا معنی خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنا ہے یہاں تک کہ وہ فضول خرچی کی حد میں داخل ہو جائے ۔ اور اقتار کا معنی ہے وہاں خرچ کرنے سے کنجوسی کرنا جو شے اس کے لیے ضروری ہو ۔ ابراہیم کے قول کا یہی معنی ہے نہ تو وہ انہیں بھوکا رکھتا ہے، نہ ننگا رکھتا ہے اور نہ وہ اتنا خرچ کرتا ہے کہ لوگ کہنے لگیں اس نے اسراف کیا ہے(1) ۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ قول پہلے قول کی طرف راجع ہے بلکہ اس سے بھی اخص ہے ۔ کیونکہ مباح اخراجات میں حد شرعی سے اتنا تجاوز کرنا کہ فضول خرچی میں داخل ہو جائے یہ حرام اور معصیت ہے ۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا نافرمان ہے) اور ان پر اتنا مال خرچ کرنا جن کا خرچہ اس کے ذمہ واجب ہے کہ نہ انہیں بھوکا رکھے اور نہ ننگا یہ فرض ہے ۔ اور ان پر مال خرچ کرنے سے روک لینا یہ اللہ تعالیٰ کے فریضہ سے رکنا ہے ۔

2۔ فضول خرچی اور کنجوسی کے بین بین خرچ کرنا یہ میانہ روی ہے اور دو برائیوں کے درمیان نیکی ہے (1) ۔ دونوں طرفوں کے سیدھا (مستقیم) ہونے کی وجہ سے وسط (درمیانی صورت) کو قوام کہا گیا ہے ۔ جیسا کہ ان دونوں کے مساوی ہونے کی وجہ سے وسط کو سواکا نام دیا جاتا ہے ۔ ترکیب میں یہ دوسری خبر ہے یا حال مؤکدہ ہے ۔ اور کان کی خبر بنانا بھی جائز ہے ۔ اور ان کے درمیان ظرف لغو ہے ۔ یا یہ کہا جائے گا کہ یہ کَانَ کا اسم ہے اور غیر متمکن کی طرف اضافت کے سبب مبنی ہے ۔ لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ قوام کے معنی میں ہے ۔ تو یہ کسی شے کے اپنی ہی ذات کے بارے خبر دینے کی طرح ہو جاتا ہے ۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کونسا گناہ سب سے بڑا ہے ۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا اللہ تعالیٰ کے لیے کسی کو شریک بنانا حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے ۔ میں نے عرض کی پھر کونسا ؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا اپنے بیٹے کو اس

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(1) ابن زید بن حبیب نے کہا ہے کہ اس آیت کا مصداق حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ہیں ۔ وہ فقط راحت اور لذت کے حصول کے لیے نہیں کھاتے تھے اور نہ ہی زیب و آرائش کے لیے لباس پہنتے تھے بلکہ کھانے سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ بھوک دور ہو جائے اور عبادت الٰہی کے لیے انہیں تقویت حاصل ہو جائے اور لباس اس لیے پہنتے تھے کہ وہ ان کی شرمگاہ کو ڈھانپے میں کام دے اور انہیں سردی اور گرمی سے محفوظ رکھے ۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا اسراف کے لیے فقط اتنا ہی کافی ہے کہ آدمی جس چیز کی خواہش کرے اسے ہی خرید لے اور اسے کھالے ۔

خوف سے قتل کر دینا کہ وہ تیرے ساتھ کھانا کھائے گا۔ میں نے عرض کی پھر کون سا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾

''اور جو نہیں پوجتے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور خدا کو اور نہیں قتل کرتے اس نفس کو جس کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے مگر حق کے ساتھ اور نہ بدکاری کرتے ہیں، اور جو یہ کام کرے گا تو وہ پائے گا (اس کی) سزا[1]''

[1] فعل محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی لا یقتلون قتلاً الا قتلاً بالحق۔ یا یہ لا یقتلون کے متعلق ہے یعنی لا یقتلون بسبب الا بالحق۔ (وہ انہیں قتل نہیں کرتے کسی سبب سے مگر حق کے ساتھ۔ جیسے قصاص رجم یا اسی جیسا کوئی اور سبب۔) (عباد الرحمٰن) کے لیے اصول الطاعات ثابت کرنے کے بعد ان سے امہات المعاصی کی نفی کی گئی ہے۔ ان کے کمال ایمان کو ظاہر کرنے کے لیے اور یہ احساس دلانے کے لیے کہ اجر اسے ہی عطا ہوتا ہے جو ان تمام کا جامع ہو۔ اور اس میں کفار کے لیے تعریض ہے کہ وہ ان کی اضداد سے متصف ہیں۔ گویا کہ یہ فرمایا ''وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان گناہوں اور برائیوں سے پاک فرمایا جن پر تم ہو'' (وَالَّذِيْنَ طَهَّرَهُمُ اللّٰهُ عَمَّا اَنْتُمْ عَلَيْهِ مِنَ الشُّرُوْرِ وَالسَّيِّئَاتِ)۔ اسی لیے اس کے بعد انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے وعید ذکر کی اور فرمایا ''وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا'' اور جو ان امور میں سے کوئی فعل کرے گا۔ تو وہ اس گناہ کی سزا پائے گا۔ حضرت ابن عباسؓ نے اسی طرح کہا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے اثام کا معنی سزا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے کہ اثام جہنم میں ایک وادی کا نام ہے(2)۔ امام بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے یہی مروی ہے۔ اور حدیث میں مروی ہے کہ غی اور اثام دو کنویں ہیں۔ ان میں اہل نار کی پیپ بہتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عمرؓ سے اس آیت میں یہ نقل کیا ہے کہ یہ (اثام) جہنم میں ایک وادی ہے(3)۔ ہناد نے سفیان سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور ابن جریر، طبرانی اور بیہقی نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر دس اوقیہ وزن کا پتھر جہنم کے کنارے سے پھینکا جائے تو وہ ستر سال تک غی اور اثام کی انتہا تک پہنچے گا(4)۔ میں نے کہا غی اور اثام کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ جہنم کے نچلے حصے میں دو نہریں ہیں جن میں اہل نار کی پیپ بہتی ہے۔ اور انہی دو کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ''فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا''۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا۔

يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾

''دوگنا کر دیا جائے گا اس کے لیے عذاب روز قیامت[1] اور ہمیشہ رہے گا اس میں[2] ذلیل و خوار ہو کر[3]''

[1] یضاعف کو ابن کثیر اور ابن عامر نے یُضَعَّفُ باب تفعیل سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب مفاعلہ سے۔ کفر کے ساتھ معصیت ملنے کے سبب قیامت کے دن ان کے لیے عذاب دوگنا کر دیا جائے گا۔

[2] ابن عامر اور ابو بکر نے یُضَاعَفُ اور یَخْلُدُ کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ جملہ مستانفہ ہے یا حال ہے اور بقیہ نے ان

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 701 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
3۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 144 (العلمیۃ)
4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

دونوں کو یلق سے بدل ہونے کے سبب جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ابن کثیر نے اسے اپنے اصل پر ہی رکھا ہے۔اور حفص نے یہاں وعید میں مبالغہ کے لیے ضمیر مجرور کے صلہ کے ساتھ خاص کیا ہے۔اور باقی قراء نے ضمیر مجرور کے اس اصول کی بناء پر پڑھا کہ جب اس کا ماقبل ساکن ہو تو اس کے کسرہ کو (اختلاس) پر کیے بغیر پڑھتے ہیں۔

۳؎ مھانا ترکیب کلام میں حال ہے۔شیخین نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ مشرکین میں سے لوگ کثرت سے قتال کرتے تھے اور کثرت سے زنا کا ارتکاب کرتے تھے۔پھر وہ حضور نبی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں اور جس کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ اچھا ہے بشرطیکہ آپ ہمیں ہمارے عمل کا کفارہ بتائیں۔تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی وَ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۙ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا (1)۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

"مگر وہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے ۱؎ تو یہ وہ لوگ ہیں بدل دے گا اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے ۲؎ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۳؎"

۱؎ مگر جس نے شرک سے توبہ کی (اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے) یہ آیت غَفُوْرًا رَّحِيْمًا تک نازل ہوئی۔اور یہ آیت بھی نازل ہوئی: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ الآیہ۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مگر جس نے اپنے گناہ سے توبہ کی، اپنے رب پر ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو یہ معاملہ اس بندے اور اس کے رب کے درمیان ہے(2) امام بخاری وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا جب قرآن کریم میں یہ آیت نازل کی گئی۔وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ الآیہ تو مشرکین مکہ نے کہا ہم نے بغیر حق کے لوگوں کو قتل کیا، ہم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے الہ کو بھی پکارا اور فواحش (زنا) کا ارتکاب بھی کیا۔(ہمارا انجام کیا ہوگا؟) تو پھر یہ آیت نازل ہوئی اِلَّا مَنْ تَابَ۔(3)

امام بغویؒ نے کہا ہے کہ ہمیں حضرت ابن عباسؓ کی طرف سے روایت پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دو سال تک یہ آیت پڑھتے رہے: وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ الآیہ" پھر یہ نازل ہوئی:"اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ" تو میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو کبھی بھی اتنا خوش نہیں دیکھا۔جتنا آپ نے اس نزول اور پھر اس آیت کے نزول پر اظہار مسرت فرمایا اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ۔

اگر یہ کہا جائے کہ استثناء منفصل جائز نہیں ہوتا تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت دو سال بعد نازل ہوئی۔؟ تو ہم کہیں گے کہ پہلی مرتبہ یہ آیت بغیر استثناء کے نازل ہوئی۔اور پھر یہ آیات استثناء کے ساتھ نازل ہوئیں۔پس یہ آیت مستثنیٰ کی مقدار میں پہلی کے لیے ناسخ ہے۔اور اگر کہا جائے کہ اصول میں یہ بات ثابت ہے۔کہ محل نسخ احکام ہیں اخبار نہیں۔لیکن یہ آیت تو اخبار میں سے ہے تو پھر اس کا نسخ کیسے ممکن ہے؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ اخبار میں نسخ جائز نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ ان میں خبر کے خلاف کا احتمال نہیں ہوتا تا کہ کذب لازم نہ

1۔صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 11-710 (وزارت تعلیم)　　2۔تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
3۔صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 701 (وزارت تعلیم)

آ ئے۔اور آیت وعید میں نسخ جائز ہے کیونکہ یہ وعید کے لیے انشاء ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تفضل اور مغفرت کی صورت میں وعید کے خلاف کا احتمال رکھتی ہے۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اثبات سے استثناء نفی ہوتی ہے اور اس کا برعکس (یعنی نفی سے استثناء اثبات ہوتا ہے) جیسا کہ اس پر استثناء مفرغ دلالت کرتا ہے۔اور ایسا نہیں جیسے انہوں نے کہا ہے کہ مستثنیٰ مسکوت عنہ کے حکم میں ہوتا ہے اور استثناء استثناء کے بعد ماقبی سے کلام کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اس طرح ہوتا تو پھر منطوق کا نسخ مسکوت سے لازم آئے گا اور یہ جائز نہیں۔اور عملاً صالحاً کا قول مفعول یا مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

۲۔ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کے سبب ان کی سابقہ معصیتوں کو مٹادے گا اور ان کی جگہ ان سے بعد میں ہونے والی نیکیوں کو نامہ اعمال میں ثبت کردے گا۔یا دنیا میں اللہ تعالیٰ ان کے گناہ کے ملکہ کو اطاعت اور نیکی کے ملکہ کے ساتھ تبدیل کردیتا ہے اور ان سے جو گناہ اس سے قبل سرزد ہوئے اللہ تعالیٰ انہیں ان کے برعکس نیکی کی توفیق عطا فرماتا ہے۔اور اس قول کا بھی یہی معنی ہے جو حضرت ابن عباس، حسن، سعید بن جبیر، مجاہد، ضحاک اور سدیؒ نے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے حالت شرک میں کیے جانے والے اعمال کی برائیوں کو اسلام کے اعمال کے حسن کے ساتھ بدل دیتا ہے۔اور ان کے شرک کو توحید کے ساتھ، مومنین کے قتل کو جنگ کرنے والے مشرکین کے قتل کے ساتھ اور زنا کو عفت و پاکدامنی کے ساتھ بدل دیتا ہے۔(1)

ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ان گناہوں کو جو انہوں نے حالت اسلام میں کیے قیامت کے دن از روئے فضل کے نیکیوں سے تبدیل کردے گا۔ یہ قول سعید بن مسیب، مکحول، عائشہ، ابوہریرہ اور سلمانؓ کا ہے (2)۔اور حضرت ابوذرؓ کی حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے۔فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا اور کہا جائے گا اس کے صغیرہ گناہوں کو پیش کرو چنانچہ اس پر صغیرہ گناہ پیش کیے جائیں گے اور اس کے کبیرہ گناہ چھپا لیے جائیں گے تو اس سے کہا جائے گا۔ کیا تو نے یہ یہ اعمال کیے ہیں؟ وہ ان کا اقرار کرے گا اور قطعاً انکار نہیں کرے گا درآنحالانکہ وہ کبائر سے ڈر رہا ہوگا۔تو پھر کہا جائے گا اسے ہر گناہ کے بدلے نیکی عطا کردو۔تو اس وقت وہ کہے گا کہ بیشک میرے تو اور بھی گناہ ہیں جنہیں میں یہاں نہیں دیکھ رہا۔تحقیق میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے دندان مبارک ظاہر ہو گئے۔اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)

ابن ابی حاتم نے حضرت سلمانؓ سے روایت نقل کی ہے کہ قیامت کے دن ایک آدمی کو صحیفہ دیا جائے گا تو وہ اس کے اوپر کی جانب پڑھے گا تو اس میں اس کے گناہوں کا ذکر ہوگا پھر وہ اس کے نیچے کی جانب دیکھے گا تو اس میں اس کی نیکیاں ہوں گی پھر وہ اوپر کی جانب نظر اٹھائے گا تو اتنے میں اس کی بدیاں نیکیوں میں بدل چکی ہوں گی۔(4)

حضرت ابوہریرہؓ سے یہ بھی روایت ہے انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کچھ لوگوں کو لائے گا اور وہ یہ پسند کریں گے کہ کاش ان کے گناہ زیادہ ہوتے۔ پوچھا گیا یہ کون لوگ ہیں؟ تو فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا۔(5)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس معنی کی بناء پر برائی کو نیکی سے بدلنے کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے اور برائی پر ثواب کیسے دیا جا سکتا ہے جبکہ برائی ایک ناپسندیدہ اور مکروہ عمل ہے جس پر اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوتا۔تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کے کفر اور گناہوں کے سبب راضی نہیں ہوتا۔تو میں یہ کہوں گا کہ اس کی میرے نزدیک دو توجیہیں ہیں

1۔تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ایضاً 3۔صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 106 (قدیمی)

4۔الدر المنثور زیر آیت ہذا 5۔ایضاً

ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں سے وہ غلطی صادر ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے مقدر میں لکھی ہوتی ہے تو وہ اس پر حد درجہ نادم ہوتے ہیں، وہ اپنے آپ کو انتہائی حقیر خیال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کمال عجز و انکساری کے ساتھ التجاء کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اس کے ساتھ ہی مغفرت کی امید کے ساتھ اس سے مغفرت طلب کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کمال رحمت کا مہبط بن جاتے ہیں اس طرح کہ اگر وہ یہ گناہ نہ کرتے تو وہ اس اجر و ثواب کو حاصل نہ کر سکتے۔ پس اس طرح ان کا وہ گناہ جو عقاب و سزا کا سبب تھا وہ ثواب کا سبب بن جاتا ہے، اگر چہ یہ ندامت اور توبہ کے توسط سے ہوا ہے۔ اسی مقام پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ختم کر دیتا اور تمہاری جگہ ایسے لوگ لے آتا جو گناہ کرتے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے اور اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما دیتا۔'' اسے مسلم نے ابو ہریرہؓ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ (1)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' ماعز بن مالک کی طرح استغفار کرو، تحقیق اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے پوری امت پر تقسیم کیا جائے تو وہ تمام کے لیے کافی ہو'' (2)۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو فرمایا جبکہ انہوں نے غامدیہ نامی عورت کو برا بھلا کہا، ٹھہر جا خالد! قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے۔ تحقیق اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر محصول، چنگی وصول کرنے والا بھی وہ توبہ کرے تو اسے بخش دیا جائے (3)۔ مسلم نے اسے ماعز اور غامدیہ کے قصہ میں حضرت بریدہؓ سے نقل کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسی معصیت جس کی ابتدا غفلت ہو اور اس کے آخر میں ندامت ہو تو وہ اس نیکی سے بہتر ہے جس کی ابتدا میں تکبر ہو اور آخر میں ریا کاری ہو۔ اور دوسری توجیہ یہ ہے۔ بحر محبت میں غواصی کرنے والوں سے کبھی ایسے امور صادر ہوتے ہیں جن کا وزن میزان شرع کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ (یعنی وہ معیار شریعت پر پورا نہیں اترتے) جیسا کہ کلمات شطح (غیر شرعی کلمات)، سماع، وجد اور رہبانیت جسے انہوں نے ایجاد کیا۔ اللہ تعالیٰ ان سے صادر ہونے والے ان تمام امور کو نیکیاں بنا دے گا کیونکہ ان سے ان کا صدور خالص محبت کے تحت ہوا ہے۔ اسی وجہ سے عارف رومی نے مثنوی میں کہا ہے۔

ہرچہ گیرد علتی علت شود	کفر گیرد کاملے ملت شود
کار پاکاں راقیاس ازخود مگیر	گرچہ ماند در نوشتن شیر شیر
نیک بندوں کے معاملات کو اپنے پر قیاس نہ کر	کیونکہ شیر لکھنے میں شیر (دودھ) جیسا ہے
اوبدل گشت وبدل شدکاراو	لطف گشت ونور شدھرنا راو
بندے کا معاملہ ونیت بدلی تو اس کا سارا معاملہ ہی بدل گیا	مہربانی ہوگئی اور اس کے لیے اس کی آگ ہی نور بن گئی

اور حضرت ابوذرؓ کی حدیث میں جو وارد ہے کہ کہا جائے گا کہ اس کے صغیرہ گناہ پیش کرو۔ پس اس پر صغیرہ پیش کیے جائیں گے اور کبائر کو اس سے چھپالیا جائے گا تو یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ وہ امور ہیں جو کاملین سے غلبہ محبت کے سبب صادر ہوتے ہیں اور یہ میزان شرع کے مطابق صغیرہ گناہ ہیں نہ کہ کبیرہ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ انہیں نیکیاں بنا دے گا کیونکہ محبت کے چشموں سے پھوٹنے والے ہیں۔ اور وہ کبیرہ گناہ جن کا صدور ان سے شاذ و نادر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا ان سے صادر ہونا لکھا ہی نہیں۔ لہٰذا وہ ان سے چھپا لے گا، مغفرت فرما دے گا اور ان پر پردہ ڈال کر ان کا بالکل ذکر ہی نہیں کرے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے اس جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 355 (قدیمی) 2۔ ایضاً، جلد 2 صفحہ 68 3۔ ایضاً، جلد 2 صفحہ 68

سے یعنی اللہ تعالیٰ تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہ توبہ کے ساتھ اور بغیر توبہ کے بخش دے گا۔ میں کہتا ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَ الَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ " میں فناء القلب کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ بندہ اپنے دل کے فناء کے بعد اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی شے کا قصد نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے کسی بھی شے کی امید نہیں رکھتا، اور نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے ڈرتا ہے۔ اور ہر وہ جو تیرا مقصود ہے پس وہی تیرا معبود ہے۔

بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو وجود اصلی کے ساتھ موجود ہی نہیں دیکھتا اور صرف اللہ ہی وجود اصلی کے ساتھ موجود ہے کیونکہ اس کی ذات اس کے وجود کا تقاضا کرتی ہے کہ عام مؤمنین فناء سے قبل یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ اس وجود کے ساتھ موجود ہے جس کا تقاضا اس کی ذات کرتی ہے اور اس کے سوا کوئی بھی اس طرح نہیں۔ میں کہتا ہوں کیوں نہیں، وہ اس کا اعتقاد رکھتے ہیں لیکن استدلال کے ساتھ، نہ کہ رؤیت اور شہود کے ساتھ۔ اور اس پر وجدان بدیہی اور مخلوق سے ان کا خوف اور طمع شاہد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد " وَ لَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ فناء النفس کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ برائی کی طرف ابھارنے والا نفس امارہ جب فنا ہو جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے تو وہ گناہوں کی دعوت دینے سے دور ہٹ جاتا ہے اور اس اشارہ پر دلیل یہ ہے کہ پہلے " وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ الآیہ" کے قول سے ان کی صفات کمال بیان کیں اور پھر ان صفات مذکورہ سے ان کا وصف بیان کیا اور اگر اس سے مراد توحید مجازی اور تقویٰ ظاہری ہوتا تو پھر اسے مذکورہ صفات پر مقدم کیا جاتا۔

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَی اللّٰهِ مَتَابًا ۝

" اور جس نے توبہ کی اور نیک کام کیے تو اس نے رجوع کیا اللہ تعالیٰ کی طرف جیسے رجوع کا حق ہے۔ لے "

لے اور جس نے توبہ کی شرک اور گناہوں سے انہیں چھوڑتے ہوئے اور ان پر ندامت کا اظہار کیا اور استغفار کیا اور نیک عمل کیے اپنی کمزوری اور غفلت کی تلافی کرتے ہوئے یا شرک اور گناہوں نے سے نکل کر اطاعت وفرمانبرداری میں داخل ہو گیا تو بیشک اس نے رجوع کیا (اللہ کی طرف جیسے رجوع کا حق ہے) نہ کہ کسی غیر کی طرف۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے کہ وہ اسے ثواب عطا کرے اور اس کی برائیوں کو نیکیوں سے تبدیل کر دے۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور سابقہ جملہ معترضہ پر معطوف ہے۔ اور وہ جملہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا اور یہ دونوں جملے ان موصولات کے درمیان واقع ہیں جو عباد الرحمٰن کی صفات مادح ہیں۔ ان دونوں میں سے پہلا ان گنہگاروں کی سزا کے بیان میں ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس قول سے مفہوم ہوتے ہیں وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ الٰی اخرہ" اور ان میں سے دوسرا توبہ کرنے والوں کے انجام کے بیان میں ہے جو استثناء میں مذکور ہیں۔ کہا گیا ہے کہ مَتَابًا پر تنوین تنکیر تعظیم اور توبہ کی ترغیب کے لیے ہے۔ تاکہ شرط متحد نہ ہو۔ یعنی "اِنَّهٗ یَتُوْبُ اللّٰه مَتَابًا مَرْضِیًّا عِنْدَاللّٰه مَاحِیًا لِّلْعِقَابِ مُحَصِّلًا لِّلثَّوَابِ" (اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف ایسا رجوع کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے، سزا کو ختم کرنے والا ہے اور ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے بیشک اس نے اللہ تعالیٰ کے ثواب کی طرف انتہائی اچھا رجوع کیا۔ اور یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ یہ آیت ایسی توبہ کے بارے میں ہے جو پہلی آیت میں مذکور قتل اور زنا کی توبہ کے سوا ہے۔ یعنی جس نے توبہ کی، شرک سے رجوع کیا اور فرائض کو ادا کیا اور نہ اس نے قتل کیا اور نہ زنا۔ تو اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ

میں توبہ کی۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف موت کے بعد انتہائی اچھی طرح لوٹے گا اور اسے اس پر فضیلت دی جائے گی جس نے قتل کیا اور زنا کیا اور پھر توبہ کی۔ تو پس پہلی توبہ شرط ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ قول وَمَنْ تَابَ اس کا معنی ہے جس نے شرک سے رجوع کیا۔ اور دوسری توبہ جزاء ہے یعنی یہ قول فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا اس کا معنی ہے۔ اس نے جزاء اور بدلے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔ پس اس طرح دونوں جدا جدا ہو گئے۔

بعض نے کہا ہے۔ کہ یہ آیت تمام گناہوں سے توبہ کرنے کے بیان میں ہے اور اس کا معنی ہے جو توبہ کا ارادہ کرے اور اس پر عزم مصمم کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہی توبہ کرے۔ پس قول باری تعالیٰ "يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا" خبر بمعنی امر ہے۔ یعنی لِيَتُبْ اِلَى اللّٰهِ (چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ پس اسے جاننا چاہیے کہ اس کی توبہ اور اس کے رجوع کا محل (انجام) اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس تقدیر پر اللہ تعالیٰ کے قول "يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ" سے مراد وہ توبہ کرنے والے ہیں جن سے بعض ایسے امور صادر ہوئے جو ان پر غلبہ سکر اور محبت کے سبب میزان شرع پر پورے نہیں اترتے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی محبت کے سبب ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس آیت میں توبہ کرنے والوں سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ نیک بندے ہوں جن سے غیر شرعی امور میں سے کوئی شے بھی صادر نہیں ہوئی۔ یعنی جس نے رجوع کر لیا ہر اس شے سے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو اور ان میں سے کسی بھی شے پر عمل نہ کیا اگر چہ وہ محبت اور سکر کے غلبہ کی وجہ سے ہی ہو۔ تو اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی طرف پہلوں (اصحاب سکر) سے احسن انداز میں رجوع کرنے والے ہوں گے۔ اور ان سے مراد اولیاء اللہ میں سے اصحاب الصحو ہیں جیسا کہ اولیاء نقشبندیہ ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اتباع سنت میں اصحاب رسول ﷺ کا نمونہ پیش کرتے ہیں، واللہ اعلم۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝

"اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے [1] اور جب گزرتے ہیں کسی لغو چیز کے پاس سے تو بڑے باوقار ہو کر گزر جاتے ہیں [2]"

[1] علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ ضحاک اور اکثر مفسرین نے کہا ہے زُوْر سے مراد شرک ہے کیونکہ وہ بھی جھوٹی گواہی ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے تو تکرار لازم آتا ہے۔ کیونکہ اس کا ذکر پہلے وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ کے قول میں گزر چکا ہے۔ اور علی بن طلحہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے (وہ لوگوں کے خلاف جھوٹی گواہی نہیں دیتے)(1)

مسئلہ: امام بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے فرمایا جھوٹی شہادت دینے والے کو چالیس درے لگائے جائیں گے۔ اس کے چہرے کو سیاہ کیا جائے گا اور اسے بازار میں پھرایا جائے گا۔ ابن ابی شیبہ نے ابو خالد عن حجاج عن مکحول عن الولید عن عمرؓ کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے شام میں اپنے عمال کی طرف جھوٹی شہادت دینے والے کے بارے لکھا کہ اسے چالیس کوڑے لگائیں جائیں، اس کا منہ سیاہ کیا جائے، اس کا سر مونڈ دیا جائے اور اسے طویل وقت تک قید میں رکھا جائے (2)۔ عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں مکحول سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے جھوٹی شہادت دینے والے کو چالیس درے لگائے (3)۔ اور کہا کہ یحییٰ بن علا نے ہمیں خبر دی اور احوص بن حکیم نے اپنے باپ سے مجھے خبر دی کہ حضرت عمرؓ نے جھوٹی شہادت دینے والے کے بارے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا — 2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 5 صفحہ 532 (الزمان)
3۔ مصنف عبد الرزاق، جلد 8 صفحہ 327 (المکتب الاسلامی)

حکم دیا کہ اس کا منہ سیاہ کیا جائے۔ اس کی پگڑی اس کے گلے میں ڈالی جائے اور اسے قبائل میں پھرایا جائے(1)۔ اسی وجہ سے امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے کہا ہے کہ جھوٹی شہادت دینے والے کو تعزیراً مارا جائے گا اور اسے اپنی قوم میں ٹھہرایا جائے گا یہاں تک کہ وہ پہچان کر لیں کہ یہ جھوٹا شاہد ہے۔ اور امام مالکؒ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ اسے جامع مسجد اور بازاروں میں لایا جائے۔ ان تمام نے یہ کہا ہے کہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے ایک ہے جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حدیث انسؓ میں اس کی تصریح کی ہے۔ اس حدیث کو شیخین نے صحیحین میں نقل کیا ہے۔ اور امام بخاریؒ کی روایت اس طرح ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑے گناہ کے بارے خبر نہ دوں۔ تو صحابہ کرام نے عرض کی کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا (پہلے آپ ﷺ تکیہ لگائے ہوئے تھے پھر آپ ﷺ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا) خبردار اور جھوٹا قول اور جھوٹی شہادت۔ آپ ﷺ اس کا مسلسل تکرار کرتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کہا کاش کہ اب آپ ﷺ خاموش ہو جائیں(2)۔ اور اللہ تعالیٰ نے جھوٹی شہادت کو شرک کے ساتھ ملا کر ارشاد فرمایا فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۔ جب یہ ایک کبیرہ گناہ ہے اور اس کے بارے شرعاً کوئی حد مقرر نہیں تو پھر اس میں تعزیر ہی ہوگی۔

اور امام اعظم ابو حنیفہؒ نے کہا ہے کہ اس کی تعزیر میں صرف تشہیر پر ہی اکتفا کیا جائے گا، نہ اسے مارا جائے گا اور نہ اسے قید کیا جائے گا۔ کیونکہ مقصود ڈانٹ پلانا اور جھڑکنا ہے۔ اور یہ تشہیر سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اور مارنا اور دیگر اسی نوع کے امور اس ڈانٹ میں مبالغہ ہے۔ کیونکہ یہ (شہادت) سے رجوع کے مانع ہوتا ہے۔ اور شہادت کا جھوٹا ہونا اقرار اور رجوع سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سبب کی طرف دیکھنے کے اعتبار سے تخفیف ضروری ہے۔ اور حضرت عمرؓ کے اثر کو سیاست پر محمول کیا جائے گا۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی طرح ہی قول قاضی شریح سے بھی مروی ہے۔ محمد بن حسن نے کتاب الآثار میں امام ابو حنیفہؒ کی سند سے ابو الہیثم سے اور انہوں نے اس سے جس نے اسے شریح سے نقل کیا ہے یہ ذکر کیا ہے کہ جب وہ کسی جھوٹے شاہد کو پکڑتے اگر وہ بازاری ہوتا تو وہ اپنے قاصد کو کہتے کہ تم اہل سوق کو کہہ دو کہ شریح تمہیں سلام کہتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اس جھوٹے گواہ کو پایا ہے لہٰذا تم اس سے بچو۔ اور اگر وہ عرب میں سے ہوتا تو اسے اس کی قوم کی مسجد میں بھیج دیتے اور وہاں تمام لوگوں کو جمع کرتے اور وہاں بھی قاصد کو وہی کچھ کہنے کو کہتے۔ اسی طرح ابن ابی شیبہ نے شریح سے نقل کیا ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے کہ شہادت زور سے مراد مطلق جھوٹ ہے(3)۔ اور کہا گیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ جھوٹ کی مجالس میں حاضر نہیں ہوتے۔ کیونکہ باطل کا مشاہدہ اس میں شریک ہونے کے مترادف ہوتا ہے۔ اور ایسے قصے سننا جس میں لغویات اور جھوٹ ہوں یا ایسی مجلس میں شعر کہے جا رہے ہوں وہاں جانا جائز نہیں۔ اسی طرح مجاہد نے بھی کہا ہے کہ وہ مشرکین کی عیدوں (میلوں) میں حاضر نہیں ہوتے(4)۔ اور یہ بھی ہے کہ اس سے مراد نوحہ کی مجلس ہے۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ وہ اہل باطل کی ان کے باطل نظریات پر مدد نہیں کرتے۔ اور محمد بن حنفیہؒ نے کہا ہے کہ وہ لغو اور گانے بجانے کی مجالس میں حاضر نہیں ہوتے۔ ابن مسعود نے کہا ہے کہ غناء (گانا) دل میں نفاق پیدا کرتا ہے جیسا کہ پانی کھیتی اگاتا ہے(5)۔ بغویؒ نے کہا ہے کہ زور کا اصلی معنی ہے کسی شے کو خوبصورت بنانا اور

1۔ ایضاً 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 362 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

اسے اپنے وصف خاص کے خلاف پر رکھنا۔ گویا اس کا معنی ہے باطل کو اس طرح ملمع سازی کے ساتھ پیش کرنا کہ وہ سچ ہونے کا وہم دلانے لگے میں کہتا ہوں کہ لغت میں زور کا معنی رات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ اور کذب میں حق سے باطل کی طرف میلان ہوتا ہے۔ اور اسی طرح ہر لغویات میں ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے کہ الزور کا معنی کذب، شرک کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ، پھر دو نصاریٰ کی عیدیں، رئیس، گانے بجانے کی مجلس، ہر وہ شے جس کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جائے اور قوت ہے(1)۔ اور یہ آیت رئیس اور قوت کے علاوہ دیگر تمام معانی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ہے اس کا عطف "لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ" پر ہے۔ اور یہ دونوں ایک موصول کے دو جملے ہیں۔ اور ان دونوں میں وجہ اشتراک ظاہر ہے کہ زور سے مراد تمام گناہ ہیں۔ شہود سے مراد حضور (حاضر ہونا) ہے اور لغو سے مراد بھی تمام قسم کے گناہ ہیں۔ جیسا کہ حسن اور کلبی نے کہا ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ گناہوں کی مجالس میں اپنے اختیار اور پسند کے ساتھ حاضر نہیں ہوتے اور جب وہاں سے اتفاقاً گزرتے ہیں تو بڑے وقار کے ساتھ، تیزی رفتاری کے ساتھ، اعراض کرتے ہوئے اور مجلس کی طرف توجہ کیے بغیر گزر جاتے ہیں۔(2) کہا جاتا ہے "كَرُمَ فُلَانٌ عَمَّا يُشِيْنُهٗ اِذَا تَنَزَّهَ وَاَكْرَمَ نَفْسَهٗ عَنْهُ" (فلاں ان چیزوں سے مبرہ ہے جو اس کے لیے عیب کا سبب ہیں جب کہ وہ ان سے منزہ ہو اور وہ اپنے آپ کو عیب سے محفوظ کر لے)۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ جب وہ کفار سے سب وشتم اور اذیت ناک باتیں سنتے ہیں تو وہ ان سے اعراض کرتے اور درگزر کرتے ہیں(3)۔ اسی کی مثل ایک روایت جریج نے مجاہد سے نقل کی ہے۔ اور وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ سدی نے کہا ہے کہ یہ آیت آیت قتال سے منسوخ ہے۔(4)

میں کہتا ہوں کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ قتال جزیہ دینے سے ختم ہو جاتا ہے اور سب وشتم اور اذیت پہنچانے کے سبب قتال جائز نہیں ہوتا۔

وَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا ۝

"اور وہ جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے ان کے رب کی آیات سے تو نہیں گر پڑتے ان پر بہرے اور اندھے ہو کر [1]"

[1] اور جب انہیں وعظ ونصیحت اور آیات قرآن کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے یا ایسی آیات کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور تنزیہ پر دلالت کرتی ہیں۔ تو وہ اس طرح نہیں رہتے کہ انہیں سننے والے نہ ہوں اور نہ انہیں دیکھنے والے ہوں، یعنی ان کی آنکھیں ان آیات طیبات سے غافل ہوں۔ گویا کہ وہ بہرے ہیں۔ انہوں نے انہیں سنا ہی نہیں اور وہ اندھے ہیں انہوں نے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ بلکہ وہ تو سنتے ہیں ان آیات طیبات کو جن کے ساتھ انہیں نصیحت کی جاتی ہے وہ اسے توجہ سے سنتے بھی ہیں اور قبول بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی وہ حق کو دیکھتے بھی ہیں اور اس کی پیروی بھی کرتے ہیں۔ تو اس میں مراد حال کی نفی ہے فعل کی نہیں۔ جیسا کہ یہ قول ہے "لَا يَلْقَانِيْ زَيْدٌ رَاكِبًا" (زید سوار ہونے کی حالت میں مجھے نہیں ملا) اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ آیت طیبہ میں ھا ضمیر معاصی کے لیے ہے جن پر لفظ "اللغو" دلالت کر رہا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ۝

"اور وہ جو عرض کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! مرحمت فرما ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی

1۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 567 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ٹھنڈک ۱؎ اور بنا ہمیں پرہیزگاروں کے لیے پیشوا ۲؎ ''

۱؎ وَذُرِّیّٰتِنَا کو ابو عمرو، حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے بغیر الف کے وَذُرِّیَّتِنَا پڑھا ہے اور باقی قراء نے الف کے ساتھ جمع کی صورت پر پڑھا ہے۔ اور ''قُرَّةَ اَعْيُنٍ'' میں اَعْيُنٍ کو نکرہ ذکر کر قُرَّةُ کے نکرہ ہونے کی وجہ سے تعظیم کے لیے ہے۔ اور اعین کو جمع قلت کے صیغہ کے ساتھ اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد متقین کی آنکھیں ہیں اور یہ دوسروں کی آنکھوں کی نسبت قلیل ہی ہیں۔ اس میں ''مِنْ'' ابتدائیہ ہے یعنی ''هَبْ لَنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ كَائِنَةً مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا'' (ہمیں آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما درآنحالیکہ وہ ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے ہو) یعنی تو انہیں صالح بنادے تو ان کے سبب ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ علامہ قرطبی نے فرمایا کہ بندہ مومن کی آنکھوں کو اس سے بڑھ کر ٹھنڈک پہنچانے والی کوئی شے نہیں کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار دیکھے (1)۔ حسن نے کہا ہے کہ قُرَّةٌ واحد ہے اس لیے کہ یہ مصدر ہے اور اس کا اصل معنی ٹھنڈک ہے۔ کیونکہ عرب گرمی سے اذیت محسوس کرتے تھے اور ٹھنڈک سے راحت، خوشی اور سرور کے وقت قرة العين اور غم وحزن کے وقت سَخُنَةُ الْاَعْيُنِ ذکر کیا جاتا ہے (2)۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آنکھ کا آنسو سرور کے وقت ٹھنڈا اور غم کے وقت گرم ہوتا ہے۔ اور ازہری نے کہا ہے کہ قرة العين کا معنی یہ ہے کہ اس کا دل اپنے محبوب کو حاصل کرلے، پالے اور آنکھ اس کے سوا کسی اور کو دیکھ کر ٹھنڈی نہ ہو بلکہ اسے ہی دیکھ کر ٹھنڈ ملے۔ (3)

۲؎ یہ سابقہ جملے کی تاکید ہے۔ کیونکہ جب ان کی ازواج اور ان کی اولاد متقی ہوگی اور وہ اپنی ازواج اور اولاد کے ائمہ ہیں تو اس طرح وہ متقین کے امام ہوگئے۔ اور اِمَامًا کو جنس پر دلالت کرنے اور عدم التباس کی وجہ سے واحد ذکر فرمایا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ میں طفلًا اور عدوٌ مفرد الفاظ جماعت کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ امام مصدر ہے جیسا کہ قیام اور صیام۔ لہٰذا کہا جاتا ہے اَمَّ اِمَامًا جیسے کہا جاتا ہے قَامَ قِيَامًا اور صَامَ صِيَامًا۔ یا پھر اس لیے ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو متقین کا امام بنادے ''اِجْعَلْ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنَّا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا'' جیسا کہ یہ مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے۔ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یا پھر اس لیے کہ وہ تمام کے تمام اپنے طریقہ کے متحد ہونے اور اپنے کلام کے متفق ہونے کی وجہ سے ایک نفس کی مثل ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ اٰمٌّ کی جمع ہے۔ جیسا کہ صَائِم کی جمع صِيَام ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ تو ہمیں متقین کا قصد کرنے والا اور ان کے راستے پر چلنے والا بنادے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۝

'' یہی وہ خوش نصیب ہیں جن کو بدلہ ملے گا (جنت کا) بالا خانہ ۱؎ ان کے صبر کرنے کے باعث ۲؎ اور ان کا استقبال کیا جائے گا ۳؎ وہاں دعا اور سلام سے ۴؎ ''

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ نیک بندے جو ان صفات سے متصف ہیں انہیں جنت کے اعلیٰ مقامات (بطور جزاء) دیے جائیں گے۔ شیخین نے صحیحین میں، امام احمدؒ نے ابوسعید خدریؓ سے اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنت میں رہنے والے اپنے سے اوپر بالا خانہ میں رہنے والوں کی طرف ایسے دیکھیں گے جیسا کہ تم افق مشرق یا مغرب میں سے دور آسمان پر ستاروں کو دیکھتے ہو (اور یہ تفاوت) ان کے درمیان باہم تفاضل کی بناء پر ہوگا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ وہ تو

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

انبیاء کے مراتب ہیں، کوئی ان کے سوا تو وہاں نہیں پہنچ سکے گا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لائے اور انہوں نے رسولوں کی تصدیق کی (1)۔ اسی کی مثل سہل بن سعد سے بھی مروی ہے۔ امام احمدؒ، حاکمؒ اور بیہقیؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے، اور اسے حاکم نے صحیح کہا ہے، ترمذی اور بیہقی نے حضرت علیؓ سے اور امام احمدؒ نے ابو مالک اشعری سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک جنت میں ایسے بالا خانے ہوں گے جس کے ظاہر کو ان کے باطن سے شفاف ظاہر کی طرح دیکھا جا سکے گا۔ صحابہ نے عرض کی وہ کن کے لیے ہوں گے یا رسول اللہ! ﷺ؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جنہوں نے کلام اچھا کیا (خوش گفتار)، کھانا کھلایا (بھوکوں کو)، اور رات عبادت کرتے ہوئے گزاری درآنحالیکہ لوگ سوئے رہے (2)۔ ابن عمرؓ کی حدیث میں اسی طرح ہے۔ اور حضرت علیؓ کی حدیث میں ہے ''جنہوں نے کلام اچھا کیا، سلام پھیلایا، کھانا کھلایا، رات کو عبادت کرتے رہے درآنحالانکہ لوگ سوئے رہے'' (3)۔ اور ابو مالکؓ کی حدیث میں ہے '' جنہوں نے کھانا کھلایا، کلام نرم کیا، مسلسل روزے رکھے اور راتوں کو عبادت کی درانحالانکہ لوگ سوئے رہے'' (4)۔ ابونعیم اور بیہقی نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا میں تمہیں جنت کے بالا خانوں کے بارے مطلع نہ کروں؟ ہم نے کہا کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک جنت میں جواہرات کے بنے ہوئے بالا خانے ہیں جن کا ظاہر ان کے باطن (اندر) سے ظاہر کی مثل ہی دکھائی دیتا ہے۔ ان میں (اللہ تعالیٰ کی جانب سے) ایسی ایسی نعمتیں، لذات اور شرف ہیں کہ ان کے متعلق نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا ہے۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ وہ بالا خانے کن کے لیے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا ان کے لیے جو سلام کو عام کرتے ہیں، کھانا کھلاتے ہیں، ہمیشہ روزے رکھتے ہیں اور رات کو عبادت کرتے ہیں جب کہ لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس کی طاقت کون رکھتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا میری امت اس کی طاقت رکھتی ہے۔ میں تمہیں اس کی خبر دوں گا۔ فرمایا وہ آدمی جو اپنے بھائی سے ملا، اس پر سلام کیا اور اسے سلام کا جواب دیا گیا۔ گویا تو اس نے سلام کو عام کیا، جس نے اپنے اہل وعیال کو اتنا کھانا کھلایا یہاں تک کہ اس نے انہیں خوب سیر ہو کر دیا، تو تحقیق اس نے انہیں کھانا کھلا دیا، جس نے رمضان المبارک کے روزے رکھے اور پھر ہر مہینے تین روزے رکھے تو گویا اس نے ہمیشہ روزے رکھے اور جس نے عشاء اور صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی تو تحقیق اس نے ساری رات عبادت کی اور لوگ سوئے رہے (5) یعنی یہود، نصاریٰ اور مجوسی، اس کی اسناد قوی نہیں ہیں۔

ابن عدی اور بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک جنت میں بالا خانے ہیں کہ ان میں رہنے والوں پر وہ چیزیں مخفی نہیں ہوں گی جو ان سے باہر ہیں اور جب تک وہ ان سے باہر ہوں گے تو ان پر وہ چیزیں مخفی نہیں ہوں گی جو ان کے اندر ہیں۔ تو عرض کی گئی وہ کن کے لیے ہیں یا رسول اللہ ﷺ! تو آپ ﷺ نے فرمایا ان کے لیے جنہوں نے کلام اچھا کیا، مسلسل روزے رکھے، کھانا کھلایا، سلام عام کیا اور رات کو عبادت کی درآنحالیکہ لوگ سوئے رہتے تھے۔ عرض کی گئی خوبصورت اور اچھا کلام کون سا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ'' کیونکہ جب وہ قیامت کے دن آئے گا تو یہ کلام آگے آگے ہوگا، نجات دلانے والا ہوگا اور پیچھے پیچھے آئے گا۔ پھر عرض کی گئی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 461 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 75 (وزارت تعلیم)
3۔ شعب الایمان، جلد 3 صفحہ 216 (العلمیہ) 4۔ مسند امام احمد، جلد 5 صفحہ 243 (صادر) 5۔ الترغیب والترہیب، جلد 4 صفحہ 251 (الفکر)

وصال الصوم کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے رمضان المبارک کے مکمل مہینے کے روزے رکھے تو گویا اس نے مسلسل روزے رکھے۔ پھر عرض کی گئی کھانا کھلانے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا اپنے اہل وعیال کو خوراک مہیا کرنا۔ پھر عرض کی گئی سلام عام کرنے کا معنی کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنے بھائی کی مصاحبت اختیار کرنا اور سلام کہنا۔ پھر کہا گیا کہ اس سے کیا مراد ہے کہ رات کو نماز پڑھی اور لوگ سوئے رہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا عشاء کی نماز ادا کرنا۔

حکیم ترمذی نے سہل بن سعد سے اس آیت کے تحت مرفوعاً نقل کیا ہے کہ یہ بالا خانے سرخ یاقوت، سبز زبرجد اور سفید موتیوں کے بنے ہوئے ہوں گے نہ تو ان میں سے کوئی ٹوٹا ہوگا اور نہ کسی میں کوئی عیب ہوگا۔(1)

2۔ یہ ان کے اس صبر کا بدلہ ہے جو انہوں نے اطاعت و پیروی اختیار کرنے، شہوات چھوڑنے، مجاہدات کرنے اور مشرکین کی طرف سے اذیتیں پہنچائے جانے کی تکالیف اور مشقت کے دوران کیا۔ ابونعیم نے ابوجعفر سے نقل کیا ہے کہ یہ ان کے اس صبر کا بدلہ ہے جو انہوں نے دار دنیا میں فقر وافلاس پر کیا۔(2)

3۔ "وَيَلْقَوْنَ" اس کو حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے یاء کے فتحہ، لام کے سکون اور قاف کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی "يَلْقَوْنَ" اور باقی تمام قراء نے یاء کے ضمہ، لام کے فتحہ، اور قاف کو مشدد پڑھا ہے۔

4۔ یعنی ملائکہ ان کے لیے دعا کریں گے اور ان پر سلام بھیجیں گے۔ یعنی وہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں گے اور انہیں باقی رہنے اور ہر آفت سے محفوظ رہنے کی بشارت دیں گے۔ کلبی نے کہا ہے کہ ان میں سے بعض بعض کو سلام کریں گے اور رب کریم ان پر سلام فرمائے گا۔(3)

امام احمد، بزار اور ابن حبان نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے جو سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ وہ مہاجرین فقراء ہیں جن کے ساتھ سرحدیں آباد ہیں، ان کے سبب تکلیفیں اور مشقتیں آسان ہوگئیں اور ان میں سے کوئی فوت نہیں ہوا مگر اس کی اپنی حاجت (وخواہش) اس کے سینے میں ہی رہی اور اس نے اسے پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھی۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے جنہیں چاہے گا فرمائے گا تم ان کے پاس جاؤ اور انہیں سلام کہو۔ تو ملائکہ کہیں گے اے ہمارے رب! ہم تیرے آسمان کے باسی ہیں اور تیری بہترین مخلوق میں سے ہیں تو تو ہمیں حکم فرمارہا ہے کہ ہم ان کے پاس جائیں اور ان پر سلام پیش کریں۔ تو رب کریم فرمائے گا بے شک وہ میری عبادت کرتے تھے وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے، ان کے سبب سرحدیں آباد رہیں (یعنی جہاد جاری رہا) ان کے سبب مشقتوں سے حفاظت رہی، ان میں ہر ایک مرتا رہا اور اس کی حاجت اس کے سینے میں رہی اور اسے پورا کرنے کی اس نے طاقت نہ رکھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت ملائکہ ان کے پاس آئیں گے۔ پس وہ ان پر ہر دروازے سے داخل ہوں گے (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو ان کے بدلے جن پر تم نے صبر کیا۔ پس یہ آخرت کا گھر کتنا اچھا ہے(4)۔ اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ وہ ان کے لیے دعا کریں گے ہمیشہ باقی رہنے اور آفات سے سلامت رہنے کی۔

1۔ نوادر الاصول صفحہ 473 (صادر)
2۔ تفسیر قرطبی، جلد 7 صفحہ 83 (الازہریہ)
3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
4۔ مسند امام احمد، جلد 2 صفحہ 68 (صادر)

خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ حَسُنَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ﴿۷۶﴾

''وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اس میں بہت عمدہ ٹھکانہ اور قیام گاہ ہے ۱؎ ''

۱؎ یعنی ان کے قرار اور اقامت کی جگہ بہت عمدہ ہے۔ امام مسلمؒ نے حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نداد ینے والا ندا دے گا کہ بے شک اب تمہارے لیے صحت ہے تم کبھی بیمار نہیں ہو گے، تمہارے لیے اب ایسی حیات ہے کہ تم کبھی نہیں مرو گے، تمہارے لیے اب ایسی جوانی ہے کہ تم کبھی بوڑھے نہیں ہو گے اور تمہارے لیے اب ایسی نعمتیں ہیں کہ تم کبھی محروم نہیں ہو گے۔(1)

قُلۡ مَا یَعۡبَؤُا بِکُمۡ رَبِّیۡ لَوۡ لَا دُعَآؤُکُمۡ ۚ فَقَدۡ کَذَّبۡتُمۡ فَسَوۡفَ یَکُوۡنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾

''آپ فرمایئے کیا پرواہ ہے تمہاری میرے رب کو اگر تم اس کی عبادت نہ کرو ۱؎ اور تم نے (تو الٹا) جھٹلانا شروع کر دیا ۲؎ تو یہ جھٹلانا تمہارے گلے کا ہار بنا رہے گا ۳؎ ''

۱؎ آپ فرما دیجئے اے محمد ﷺ میرے رب کو تمہاری کیا پرواہ ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور یَعۡبَؤُ ''عَبَات الجیش عبوا'' سے ہے یعنی میں نے لشکر کو ترتیب دیا اور اسے تیار کیا۔ اسی طرح نہایہ میں ہے(2) یعنی کونسی چیز تمہیں جنت میں داخل ہونے کے لیے تیار کرے گی۔ اگر تم اس سے استغفار نہ کرو۔ یہ معنی بھی کیے گئے ہیں اگر تم اس کی عبادت نہ کرو یا اگر تم ایمان نہ لاؤ، یا اگر وہ تمہیں اسلام کی طرف دعوت نہ دے۔ پس جب تم ایمان لاؤ گے تو وہ تمہیں جنت میں داخل ہونے کے لیے تیار کرے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مایَعۡبَؤُا عَبَأ بمعنی ثقل سے بنا ہے۔ یعنی تمہارا رب تمہیں کوئی وزن اور قدر نہیں دیتا اور نہ اسے تمہاری کوئی پرواہ ہے اگر تم اس کی عبادت اور اطاعت نہ کرو۔ کیونکہ انسان کا شرف اور کرامت معرفت اور اطاعت کے باعث ہے۔ ورنہ وہ چوپاؤں کی مثل ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ اگر وہ تمہیں اسلام کی طرف دعوت نہ دیتا۔ پس اب جب تم ایمان لے آئے تو تمہاری قدر و منزلت ظاہر ہوگی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے کہ اسے تمہاری کیا پرواہ ہوتی کہ اس نے تمہیں پیدا فرمایا اگر تم اس کی عبادت و اطاعت نہ کرو۔ یعنی اس نے تو تمہیں پیدا ہی اپنی عبادت کے لیے کیا ہے۔ جیسا کہ رب کریم نے فرمایا وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ(3) علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ قول ابن عباس اور مجاہد کا ہے۔ یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ اسے تمہاری کیا پرواہ ہے۔ یہ معنی ثقل، وزن اور قدر سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ ثقیل شے جو ذی قدر اور ذی وزن ہو اس کی پرواہ کی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا معنی یہ کیا گیا ہے کہ میرے رب کو تمہاری مغفرت کی کیا پرواہ ہے اگر تم اس کے ساتھ اور خداؤں کو نہ پکارو اور کیا ہے اسے کہ وہ تمہیں عذاب دے اگر تم کسی کو شریک نہ بناؤ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''مَا یَفۡعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِکُمۡ اِنۡ شَکَرۡتُمۡ وَ اٰمَنۡتُمۡ'' (اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب نہیں دے گا اگر تم شکر بجا لائے اور ایمان لائے اور کہا گیا ہے کہ اس کا یہ معنی ہے کہ اسے تمہیں عذاب دینے سے کیا پرواہ ہے اگر تم اسے سختیوں اور مصیبتوں میں نہ پکارو۔ جیسا کہ اس معنی پر یہ قول باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے: فَاِذَا رَکِبُوۡا فِی الۡفُلۡکِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ۔

اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں پیدا نہیں کیا درآنحالیکہ اسے تم سے کوئی حاجت ہو اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 380 (قدیمی) 2۔ النہایۃ فی غریب الحدیث، جلد 3 صفحہ 169 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

میں تمہاری کوئی قدر ہے مگر یہ کہ تم اس سے مانگو گے تو وہ تمہیں عطا کرے گا۔ اور اگر تم اس سے استغفار کرو گے تو وہ تمہیں بخش دے گا۔
اس معنی کی بناء پر "مَا" نافیہ ہے۔ اور اگر تم اسے استفہامیہ بناؤ تو مصدریہ ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ گویا کہ یہ کہا گیا ہے مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ۔

۲؎ یہ خطاب کفار مکہ کو ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے رسول (ﷺ) کے ذریعے اپنی توحید اور عبادت کی طرف بلایا ہے۔ لیکن تم نے تو رسول معظم ﷺ کو جھٹلا دیا اور تم نے دعوت کو قبول نہیں کیا۔ تو وہ تمہیں جنت میں داخل ہونے کے لیے تیار کیسے کرے گا؟ تمہارا اس کی بارگاہ میں وزن اور قدر کیسے بنے گی یا پھر اسے تمہارے عذاب کی پرواہ کیسے ہو گی یا پھر وہ کیسے تمہاری مغفرت کی پرواہ نہیں کرے گا۔

۳؎ پس تمہارا جھٹلانا تمہارے لیے لازم ہو جائے گا۔ پس تمہیں توبہ کی توفیق نہیں دی جائے گی یہاں تک کہ تمہارے اعمال پر جزاء مرتب ہو جائے گی۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ تمہارے جھٹلانے کی سزا تمہارے لیے لازم ہے بالیقین وہ تمہیں محیط ہو گی۔ یا اس کا اثر تمہارے لیے لازم ہے یہاں تک کہ وہ تمہیں جہنم میں گرا دے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا لزاما کا معنی موت ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا اس کا معنی ہلاک ہونا ہے ابن زید نے کہا اس کا معنی قتال ہے اور ابن جریر نے کہا ہے اس کا معنی ہے۔ ایسا عذاب جو دائمی اور لازمی ہو، ہلاک کرنے والا اور فنا کرنے والا ہو اور اس میں تم میں سے بعض بعض سے ملے ہوں گے (1)۔ امام بغویؒ نے کہا ہے کہ مفسرین کا اس میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد غزوۂ بدر میں قتل ہونے والے ستر افراد ہیں۔ یہ قول حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی بن کعب اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم کا ہے (2)۔ یعنی وہ بدر کے دن مقتول ہوئے اور آخرت کا عذاب ان کے ساتھ لازماً متصل ہو گیا۔

حضرت امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ پانچ چیزیں ہیں جو پوری ہو چکی ہیں دخان (دھواں)، چاند کا شق ہونا، روم کا فتح ہونا، بطشۃ (سخت گرفت) اور لِزَام (3)۔ اور کہا گیا ہے کہ لزام سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ واللہ اعلم۔

الحمد للّٰه رب العالمین و صلی اللّٰه تعالٰی علٰی خیر خلقه محمد و اٰله و اصحابه اجمعین۔

سورۃ الشعراء

سورۃ الشعراء مکی ہے، اس میں گیارہ رکوع اور دو سو ستائیس آیات ہیں۔

سورۃ الشعراء آخری چار آیتوں کے سوا مکی ہے، یعنی وَ الشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ سے لے کر تا آخر۔ اس کی 227 آیتیں اور 11 رکوع ہیں۔'' حاکم نے مستدرک میں معقل بن یسار سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ طٰہٰ، طواسین اور حوامیم مجھے الواح موسیٰ میں سے عطا کی گئی ہیں۔''(1)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾

''طا۔سین۔میم [1]''

[1] ''طٰسٓمّٓ'' حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے یہاں، سورۂ قصص اور سورۂ نمل میں طاء کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ نے بین بین اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوجعفر اور حمزہ نے یہاں اور سورۂ قصص میں نون کو میم سے ظاہر کیا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے ادغام کے ساتھ پڑھا ہے۔ بغویؒ نے کہا کہ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا علماء طٰسٓمّٓ کی تفسیر سے عاجز ہیں۔ اور علی بن طلحہ الوالبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ قسم ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ یہ اسمائے قرآن میں سے ہے، مجاہد نے کہا یہ اس سورت کا نام ہے۔ اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی قدرت اور عظمت و بزرگی کی قسم کھائی ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مابین راز ہے۔(2)

تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ﴿۲﴾

''یہ [1] آیتیں ہیں روشن کتاب کی [2]''

[1] اس کا اشارہ اس سورت یا قرآن کریم کی طرف ہے۔

[2] یعنی اس کا اعجاز اور اس کا صحیح ہونا ظاہر ہے۔ یا یہ احکام اور ہدایت کے راستوں کو ظاہر کرنے والی ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۳﴾

''(اے جان عالم) [1] شاید آپ ہلاک کر دیں گے اپنے آپ کو اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لا رہے [2]''

[1] کہا جاتا ہے ''بَخَعَ نَفْسَهٗ'' یہ باب مَنَعَ سے ہے۔ اس کا معنی ہے اس نے غم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا، البخع کا

1۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 757 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اصل یہ ہے کہ ذبح کے وقت بَخاع تک پہنچنا۔ اور بَخاع صُلب (پشت) میں ایک رگ ہے۔ جو گردن سے ہو کر آتی ہے۔ اور یہی ذبح کی حد ہے۔ اور یہ نُخاع کے علاوہ ہے۔ جیسا کہ زمخشری نے خیال کیا ہے۔ پھر اظہار مبالغہ کے لیے اسے ہر ایک کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جبکہ اہل مکہ نے آپ ﷺ کو جھٹلایا اور یہ آپ ﷺ پر بہت شاق گزرا کیونکہ آپ ان کے ایمان کے بہت حریص تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کا ان کے ایمان نہ لانے پر شدید غمگین ہونے کا سبب اللہ تعالیٰ کا یہ خوف ہو کہ وہ آپ کو اپنی قوم کا انکار کی وجہ سے سزا دے گا۔ پس یہ آیت آپ ﷺ کے لیے تسلی کا باعث ہے۔ لَعَل کا لفظ ترجی کے لیے آتا ہے اور یہاں اشفاق کے لیے ہے۔ یعنی اپنے آپ پر شفقت کیجئے اور غم نہ کیجئے۔ کیونکہ اگر تم غم کرتے رہے تو اپنے نفس کو غم کے سبب ہلاک کر دو گے۔ بیشک ہم نے ان کے ایمان کو چاہا ہی نہیں۔

إِنْ نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۝

''اگر ہم چاہیں ۱؎ تو اتاریں ان پر آسمان سے کوئی نشانی پس ہو جائیں ۲؎ ان کی گردنیں اس کے آگے جھکی ہوئی۔ ۳؎''

۱؎ کیونکہ اگر ہم ان کا ایمان چاہیں تو ہم ان پر آسمان سے نشانی اتاریں، جو ایمان کی پناہ لینے پر دلالت کرتی ہو یا وہ ایسی آزمائش ہو جو ایمان کی طرف لوٹانے والی ہو۔

۲؎ فَظَلَّتْ کا عطف ننزل پر ہے۔ اور اس کا معنی فَتَظَلُّ ہے۔

۳؎ پس ان کی گردنیں اس کے لیے جھکنے والی ہو جائیں۔ قتادہ نے کہا اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان پر کوئی نشانی نازل فرما دیتا جس کے سبب وہ رام ہو جاتے اور اس کے بعد کوئی بھی معصیت کی طرف نہ مڑتا۔ لیکن ایسی کوئی نشانی ان پر نازل نہیں ہوئی۔ ابن جریج نے کہا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے لیے اپنے امور میں سے کوئی ایسا امر نازل فرما دیتا کہ اس کے بعد ان میں سے کوئی بھی معصیت کا عمل نہ کرتا (1)۔ یہاں خاضعۃً کی جگہ خَاضِعِیْنَ ذکر کیا گیا ہے (یعنی مونث کی جگہ مذکر ذکر کیا گیا ہے اس لیے تاکہ آیات کے آخری الفاظ ایک جیسے رہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اصل کلام اس طرح ہے: ''فَظَلُّوْا لَهَا خَاضِعِیْنَ'' پس اس میں محل خضوع کے بیان کے لیے اَعْنَاق بطور تمیم زیادہ کیا گیا اور خبر کو اپنے اصل پر باقی رہنے دیا گیا ہے۔ (تمیم سے مراد یہ ہے کہ کسی کلمہ کو مضاف اور مضاف الیہ جیسے دو متلازم کے درمیان داخل کر دینا، مترجم)۔ یہ قول بھی ہے کہ اصل عبارت یہ ہے: '' ظَلَّتْ اَصْحَابُ الْاَعْنَاقِ لَهَا خَاضِعِیْنَ'' پھر اس سے ''اصحاب'' کو حذف کر دیا گیا اور ''اعناق'' کو ان کے قائم مقام رکھ دیا گیا۔ کیونکہ گردنیں جب جھکتی ہیں تو ان کے ارباب (گردنوں والے) بذات خود جھک جاتے ہیں۔ پس پہلے فعل اعناق کے لیے (مونث) لایا گیا ہے۔ پھر خاضعین (مذکر) مردوں کے لیے ذکر کیا ہے۔

اخفش نے کہا ہے کہ خضوع کا تعلق اسی مضمر کے ساتھ ہے جس کی طرف اعناق کی اضافت ہے (2)۔ اور یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ اعناق کو خضوع کی صفت سے متصف کیا گیا ہے حالانکہ یہ عقلاء کی صفات میں سے ہے اس لیے کہ انہیں (اعناق کو) ان کے (عقلاء کے) قائم مقام رکھا گیا ہے۔ اور ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ صفت کو مذکر ذکر کرنا مذکر کی مجاورت کے سبب ہے۔ کیونکہ یہ عربوں

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا [illegible] 2۔ ایضاً

کی عام عادت ہے کہ وہ صفت مونث کو مذکر ذکر کرتے ہیں جبکہ وہ مونث کو مذکر کی طرف مضاف کریں اور مذکر کو مونث ذکر کرتے ہیں جبکہ وہ اسے مونث کی طرف مضاف کریں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "عنق" سے مراد مکمل بدن ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ اور معنی ہے "فظلّوا خاضعین" (پس وہ جھکنے والے ہو جائیں)(1) مجاہد نے کہا ہے کہ اعناق سے مراد رؤساء اور کبراء (سردار) ہیں اور معنی ہے "فَظَلَّتْ كُبَرَاؤُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ" (بڑے بڑے سردار اس کے لیے جھکنے والے ہو جائیں) اور یہ قول بھی ہے کہ اعناق سے مراد جماعتیں ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے "جَآءَ الْقَوْمُ عُنُقًا عُنُقًا" ای جَمَاعَاتٍ وَّطَوَائِفَ (قوم آئی جماعتوں اور گروہوں کی صورت میں)۔

وَمَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ⑤

"اور نہیں آیا کرتی ان کے پاس [1] کوئی تازہ نصیحت الرحمٰن کی جانب [2] سے مگر یہ کہ وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں [3]"

[1] اس کا عطف سابقہ جملے کے مضمون پر ہے۔ یا یہ حال ہے۔ مِنْ ذِكْرٍ سے مراد کوئی نصیحت یا قرآن کریم کا کوئی طائفہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہے اس میں "مِنْ" زائدہ ہے اور "ذِكْرٍ" محل رفع میں ہے۔

[2] من الرحمٰن میں مِن ابتدائیہ ہے اور یہ ذِكْر کی صفت ہے۔ یعنی وہ نصیحت جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے نبی مکرم ﷺ پر تازہ نازل کی گئی۔ اگرچہ وہ وجود کے اعتبار سے تو قدیم ہے۔

[3] استثناء مفرغ ہے اور يَأْتِيْهِمْ کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔ یا مرفوع ضمیر سے حال ہے۔ یعنی کسی حال میں بھی ان کے پاس نصیحت نہیں آتی مگر اس حال میں کہ وہ اس پر ایمان لانے سے اعراض کرتے ہیں۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَأْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑥

"تو بے شک انہوں نے تکذیب [1] کی سو جلد آ جائے گی انہیں اطلاع اس امر کی جس کے ساتھ وہ استہزا کیا کرتے تھے [2]"

[1] تحقیق انہوں نے اعراض کر کے نصیحت کو جھٹلا دیا۔ اور انہوں نے اس حد تک تکذیب کی کہ وہ اس سے استہزاء کرنے لگے۔ استہزاء کا ضمناً ذکر اس ارشاد میں کیا گیا ہے۔ فَسَيَأْتِيْهِمْ جب یوم بدر کو ان پر عذاب نازل ہوگا یا قیامت کے دن جب عذاب نازل ہوگا۔

[2] (سو جلد آ جائے گی انہیں اطلاع) اس امر کی جس کے ساتھ وہ استہزاء کرتے تھے کہ آیا وہ حق تھا یا باطل۔ کیا حقیقت ہے کہ اس کی تصدیق کی جائے اور اس کی قدر و عظمت کو پہچانا جائے۔ یا اسے جھٹلایا جائے اور اس کے امر کو حقیر سمجھ کر اس سے استہزاء کیا جائے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ⑦

"کیا انہوں نے نہیں دیکھا زمین کی طرف [1] کہ کتنی کثرت سے ہم نے اگائے ہیں اس [2] میں ہر طرح کے مفید پودے [3]"

[1] یہ استفہام انکار کے لیے ہے اور واؤ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "اَيَطْلُبُوْنَ اٰيَةً عَلٰى مَا يَدْعِيْهِ مُحَمَّدٌ ﷺ مِنَ التَّوْحِيْدِ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَ لَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى الْاَرْضِ" یعنی انہیں ایسی نشانی کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ وہ زمین کی طرف دیکھیں، یہی نشانی ہے۔ کیونکہ نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے۔

1۔ ایضاً

۲؎ یہ "اَلْاَرْض" سے بدل اشتمال ہے اور کَمْ خبریہ ہے۔ یعنی کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے زمین میں نباتات کی مختلف اقسام کثرت سے اگائی ہیں۔

۳؎ جو حسین بھی ہیں اور قابل تعریف بھی اور لوگوں یا چوپاؤں کی غذا اور دوا کے لیے انتہائی نفع بخش اور مفید بھی ہیں۔ ان سے یہ فائدہ انفرادی طور پر حاصل ہوتا ہے اور کبھی دوسروں کے ساتھ مل کر۔ اور یہ بھی ہے کہ زمین کی نباتات میں سے مختلف قسموں کو اگانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ خالق ان کی ایجاد پر بھی قادر ہے اور انہیں ختم کرنے کے بعد انہیں دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے۔ اور ساتھ ہی اس کی توحید اور صفات کمال پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اس میں لفظ "کُلّ" افراد کے احاطہ کے لیے ہے اور کم ان کی کثرت کو ظاہر کرنے کے لیے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝

" بے شک اس میں ۱؎ (ان کے لیے قدرت الٰہی کی) نشانی ہے۔ اور ان سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے ۲؎ "

۱؎ یعنی ان تمام اقسام کو اگانے میں یا ان میں سے کسی ایک میں "لَاٰیَةً" (نشانی ہے) حوالہ ہے اس فاعل کا جو واجب لذاتہ ہے اور تام القدرۃ و الحکمۃ ہے۔ اور نعمت و رحمت کے اعتبار سے انتہائی وسیع ہے۔

۲؎ اور یہ اللہ تعالیٰ کے علم اور قضاء میں ہے کہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے۔ اسی لیے ان عظیم الشان نشانیوں نے انہیں کوئی نفع نہیں دیا۔ سیبویہ نے کہا ہے کہ یہاں کَانَ زائدہ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ان نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد ایمان لانے والے نہیں۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝

" اور بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب (اور) ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۱؎ "

۱؎ عزیز کا معنی غالب ہے جو کہ کافروں سے انتقام لینے پر قدرت رکھتا ہو اور "الرَّحِیْمُ" سے مراد ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے اس اعتبار سے کہ اس نے انہیں مہلت دی۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ انتقام کی قدرت رکھتا ہے اس سے جو کفر کرے اور اس پر رحم کرنے والا ہے جو توبہ کرے اور ایمان لائے۔

وَ اِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

" اور یاد کرو جب ندا دی آپ کے رب نے موسیٰ علیہ السلام کو ۱؎ (اور فرمایا) کہ جاؤ ۲؎ ظالم لوگوں کے پاس ۳؎ "

۱؎ اور یاد کرو جس وقت انہوں نے درخت اور آگ کو دیکھا۔ اس کا عطف اس قول کے مضمون پر ہے "لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ" کیونکہ تقدیر عبارت یہ ہے "لَا تَحْزَنْ عَلٰی کُفْرِ قَوْمِکَ وَلَا تَبْخَعْ نَفْسَکَ وَاذْکُرْ وَقْتَ نِدَاءِ رَبِّکَ مُوْسٰی" اور اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ کلام مستانفہ ہو اور ظرف قول باری تعالیٰ "قَالَ رَبِّ" کے متعلق ہو۔

۲؎ اس میں "اَنْ" نَادٰی کی تفسیر کے لیے ہے۔ یا اَنْ مصدریہ ہے۔ یعنی اِئْتِ یا بِاَنْ ائْتِ۔

۳؎ ان لوگوں کے پاس جو کفر کے سبب ظلم کرنے والے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے ظالم ہونے کا سبب ان کا بنی اسرائیل کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا اور ان سے ناروا مشقت لینا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تکلیف دہ امر یہ کہ ان کے بچوں کو ذبح کرنے کا حکم جاری کیا۔

قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ⑪

''یعنی قوم فرعون کے پاس ۱؎ کیا وہ (قہر الٰہی سے) نہیں ڈرتے ۲؎''

۱؎ ''اَلْقَوْمَ'' سے بدل ہے یا اس کے لیے عطف بیان ہے۔ اور صرف قوم پر اقتصار اس کے معروف و معلوم کرنے کی بناء پر کیا گیا ہے۔ کیونکہ فرعون تو ان تمام سے بڑھ کر آگے آگے تھا۔

۲؎ یہ استفہام انکار اور توبیخ کے لیے ہے۔ اور اس کا معنی امر کی صورت میں ہے۔ یعنی ''لِيَتَّقُوْا اَنْفُسَهُمْ عَنْ عَذَابِ اللّٰهِ بِطَاعَتِهٖ'' (چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے سبب اس کے عذاب سے بچائیں) اور یہ احتمال بھی ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو: ''اَلَا يَا قَوْمِ اتَّقُوْنِ'' تو اس صورت میں یہ قول کی تقدیر کے ساتھ ایت کے فاعل سے حال ہوگا یعنی ''اِيْتِ قَائِلًا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ اَلَا يَاقَوْمِ اتَّقُوْنِ'' اسی کی مثل یہ آیت بھی ہے اَلَّا يَسْجُدُوْا یعنی اَلَا يَا قَوْمِ اسْجُدُوْا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ⑫

''آپ نے عرض کی ۱؎ میرے رب! ۲؎ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے ۳؎''

۱؎ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔

۲؎ اے میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے اِنِّیْ کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ۔

۳؎ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ کو جمہور نے اَخَافُ پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ اور یعقوب نے یکذبون پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ اور یہی اختلاف اس قول میں بھی ہے۔

وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ⑬

''اور گھٹتا ہے میرا سینہ اور روانی سے نہیں چلتی میری زبان ۱؎ سو (از راہ کرم) وحی بھیج ۲؎ ہارون کی طرف ۳؎''

۱؎ اور میری زبان روانی سے نہیں چلتی اس لیے کہ اس میں لکنت ہے۔ اور سینہ گھٹتا ہے اس لیے کہ ان کی تکذیب کا دفاع کرتے ہوئے حجت قائم کرنے میں مدعی اور مقصد کو بیان کرنے کے لیے زبان معاون و مددگار نہیں ہوتی۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے ان کے جھٹلانے سے میرا سینہ گھٹتا ہے۔

۲؎ سو وحی بھیجئے یا جبرائیل امین کو وحی کے ساتھ بھیجئے۔

۳؎ ہارون کی طرف فَاَرْسِلْ میں فاء سببیہ ہے۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملانے اور انہیں اپنے معاملات میں شریک کرنے کی استدعا کو تین امور پر مرتب کیا ہے، یعنی تکذیب کا خوف، تکذیب کا اثر قبول کرتے ہوئے دل کا تنگ ہونا اور زبان میں لکنت کا بڑھ جانا اس طرح کہ جب دل گھٹنے کے وقت روح باطن قلب کی طرف منقبض ہوتی ہے تو

زبان چلتی ہی نہیں۔ کیونکہ جب یہ امور جمع ہو جائیں تو ایسے مددگار اور معاون کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے دل کو تقویت پہنچائے اور اس کی نیابت کے فرائض سرانجام دے جب اس کی زبان بولنے میں ساتھ نہ دے حتیٰ کہ اسے دعا پر محمول نہیں کیا جائے گا اور نہ یہ دعوت کی ٹال مٹول تھی اور نہ ہی حکم کی پیروی میں حیلہ بہانہ تھا۔ بلکہ یہ حکم کی پیروی میں ان کے لیے معاون و مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ﴿۱۴﴾

''اور (تو جانتا ہے) کہ ان کا میرے ذمے ایک جرم بھی ہے [1]۔ اسی لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے [2]۔''

[1] یہاں مضاف محذوف ہے۔ یعنی تبعة ذنب یادعوی ذنب۔ اور اس سے مراد قبطی کا قتل ہے۔ اسے ذنب اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کے گمان کے مطابق یہ گناہ تھا حالانکہ قبطی اپنے کفر کے سبب مباح الدم اور غیر معصوم تھا۔ (یعنی اسے قتل کرنا مباح تھا) یہ اس قصہ کی طرف اشارہ ہے جسے دوسرے مقام پر شرح وسیط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

[2] پس مجھے اس کا خوف ہے کہ وہ مجھے رسالت کے فرائض ادا کرنے سے قبل ہی قتل کر دیں گے۔ تو یہ بھی قتل کے خوف کے سبب حکم تبلیغ کی عدم پیروی اور اس کی علت کا بیان نہیں بلکہ اس متوقع آزمائش سے بچاؤ کی استدعا ہے جو تبلیغ سے مانع ہے۔

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِآيَاتِنَا ۖ إِنَّا مَعَكُمْ مُسْتَمِعُونَ ﴿۱۵﴾

''اللہ نے فرمایا [1] ایسا نہیں ہو سکتا پس تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ [2] ہم تمہارے ساتھ ہیں [3] اور (ہر بات) سننے والے ہیں [4]۔''

[1] اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

[2] تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ اس وعدہ کے ساتھ قبول کرتے ہوئے کہ ان سے خوف کو دور کرنا اس کے ذمہ لازم ہے اور ساتھ ہی ان کے بھائی کو فرائض رسالت میں ان کے ساتھ ملا دیا ہے۔ " فاذھبا" میں صیغہ خطاب حاضر کی تغلیب کے لیے ہے۔ اور یہ اس فعل پر معطوف ہے جس پر کلّا دلالت کرتا ہے۔ گویا کہ یہ فرمایا "قَالَ ارْتَدِعْ يَا مُوسٰى عَنْ تَوَهُّمِ قَتْلِكَ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَمَنْ طَلَبْتَ ضَمَّهُ اِلَيْكَ" (فرمایا اپنے قتل کے وہم سے باز رہ سو تو جائے اور وہ جس کا تو نے مطالبہ کیا، اسے اپنے ساتھ ملا لے)

[3] یعنی ہماری مدد موسیٰ، ہارون علیہما السلام اور ان کے متبعین کے ساتھ ہے۔ یا اس کا معنی ہے کہ ہم تم دونوں اور جو تمہارے ساتھ عداوت رکھتے ہیں انہیں جانتے ہیں۔

[4] اور جو کلام تمہارے درمیان ہو گی اسے سننے والے ہیں۔ پس تم دونوں کو ان پر غلبہ دیں گے یہ دوسری خبر ہے۔ یا پھر یہ اکیلے خبر ہے اور مَعَكُمْ ظرف لغو ہے۔

فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُولَا إِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶﴾

''سو دونوں جاؤ فرعون کے پاس اور اسے کہو ہم فرستادے ہیں رب العالمین کے [1]۔''

[1] اس میں رسول مفرد ہے اس لیے کہ یہ رسالة کے معنی میں ہے اور یہ مرسل اور رسالة کے مابین مشترک ہے۔ قاموس میں ہے کہ اسم رسالت بالکسر بھی ہے۔ اور بالفتحہ بھی۔ اور اسی طرح صبور، امیر اور رسول اس کا اطلاق مرسل پر بھی ہے(1)۔ علامہ بیضاوی نے

1۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1330 (التراث العربی)

کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کبھی تثنیہ ذکر کیا جاتا ہے۔ اور کبھی مفرد یعنی جب اس سے مراد مرسل ہوتو اسے تثنیہ ذکر کیا جاتا ہے۔ اور جب اس سے مراد رسالۃ ہوتو مفرد۔ اور یہاں معنی یہ ہے کہ ہم رب العالمین کا پیغام لانے والے ہیں۔ یا پھر مفرد ذکر کرنے کی علت یہ ہے کہ فعول کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے قاموس میں ہے۔ کہ اِنَّا رُسُلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ نہیں کہا کیونکہ مفعول اور فعیل میں مذکر، مؤنث، واحد اور جمع برابر ہوتے ہیں(1)۔ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ الرسول کا تثنیہ اور جمع کے معنی میں ہونا جائز ہے۔ کیونکہ عرب کہتے ہیں "ھٰذَا رَسُوْلِیْ وَوَکِیْلِیْ،ھٰذٰانِ رَسُوْلِیْ وَوَکِیْلِیْ" جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَھُمْ لَکُمْ عَدُوٌّ(2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مفرد اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ دونوں اخوت میں متحد تھے یا پھر اس لیے کہ مرسل بہ (پیغام) ایک تھا۔ یا مراد یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک رب العالمین کا رسول ہے۔ "اَنْ" مفسرہ ہے کیونکہ رسول ارسال کے معنی متضمن ہے۔ اور ارسال قول کے معنی کو متضمن ہے۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۷﴾

"(ہم تمہیں کہتے ہیں) کہ بھیج دے ہمارے ساتھ (ہماری قوم) بنی اسرائیل کو[1]"

[1] ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیجئے۔ کہ وہ شام کی طرف چلے جائیں اور تو انہیں غلامی سے آزاد کر دے۔ علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ فرعون نے انہیں چار سو سال تک غلام بنائے رکھا اور اس وقت ان کی تعداد چھ سو اسی ہزار تھی (چھ لاکھ اسی ہزار)۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام مصر کی طرف چلے گئے اور ہارون علیہ السلام نے وہاں پہنچ کر انہیں خبر دی۔ اور ایک واقعہ اس طرح ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر واپس تشریف لے گئے اس حال میں کہ آپ اون کا جبہ زیب تن کیے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں عصا مبارک تھا اور اس کے ایک سرے پر کھجور سے بنا ہوا ایک ٹوکرا معلق تھا جس میں آپ کا زادِ راہ تھا۔ وہاں داخل ہو کر اپنے آپ کو چھپا لیا اور ہارون علیہ السلام نے آپ کو مطلع کیا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے فرعون کی طرف بھیجا ہے اور آپ کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم فرعون کو دعوت حق دیں۔ چنانچہ ان کی والدہ چیختی چلاتی باہر نکلی اور کہنے لگی فرعون تجھے قتل کرنے کے لیے تلاش کر رہا ہے۔ اگر تم دونوں اس کی طرف گئے تو وہ دونوں کو قتل کر دے گا۔ لیکن آپ والدہ کے کہنے پر نہ رکے اور دونوں رات کے وقت فرعون کے دروازے پر چلے گئے۔ دروازے پر دستک دی تو دربان گھبرا گئے۔ اور کہا دروازے پر کون ہے؟ ایک روایت اس طرح ہے کہ دربان ان دونوں سے آگاہ ہو گیا تو اس نے پوچھا تم کون ہو؟ تو جواباً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" (بے شک ہم میں سے ہر ایک رب العالمین کا فرستادہ ہے)۔ چنانچہ دربان فرعون کے پاس گیا اور کہا۔ ایک مجنوں دروازے پر ہے۔ اور کہتا ہے کہ وہ رب العالمین کا فرستادہ ہے۔ پس اس نے کوئی توجہ نہ دی حتیٰ کہ صبح ہو گئی پھر اس نے دونوں کو بلایا۔

ایک روایت میں ہے کہ وہ دونوں مل کر فرعون کی طرف گئے۔ لیکن اس نے انہیں ایک سال تک تو اندر آنے کی اجازت ہی نہ دی۔ پھر ایک دن دربان فرعون کے پاس گیا اور کہا کہ ایک آدمی ہے جو اپنے بارے میں یہ گمان رکھتا ہے کہ وہ رب العالمین کا فرستادہ ہے۔ تو یہ سن کر فرعون نے اسے کہا کہ اسے اندر آنے کی اجازت دے دو تاکہ ہم اس سے محظوظ ہو سکیں۔ چنانچہ یہ دونوں اس کے پاس تشریف لے گئے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو پہچان لیا کیونکہ آپ اسی کے گھر پروان چڑھے تھے۔

1۔ ایضاً 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِیْنَا وَلِیْدًا وَّلَبِثْتَ فِیْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِیْنَ ﴿۱۸﴾

"(فرعون نے (یہ سن کر) کہا موسیٰ! کیا ہم نے تجھے پالا نہیں تھا اپنے یہاں ؎۱ جبکہ تو بچہ تھا ؎۲ اور بسر کیے تو نے ہمارے پاس اپنی عمر کے کئی سال ؎۳"

؎۱ اور کہا کیا ہم نے تجھے اپنے گھروں میں پالا نہیں تھا۔

؎۲ جبکہ تو بچہ تھا۔ ولادت کے قرب کے باعث آپ کو ولید کہا گیا۔

؎۳ کہا گیا ہے کہ آپؑ ان کے پاس تیس سال تک ٹھہرے پھر آپ مدین کی طرف چلے گئے اور دس سال وہاں رہے۔ پھر ان کی طرف واپس آئے اور انہیں تیس سال تک اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی پھر ان کے غرق ہونے کے بعد پچاس سال تک آپ زندہ رہے۔

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾

"اور تو نے ارتکاب کیا اس فعل کا جس کا تو نے ارتکاب کیا ؎۱ اور تو بڑا احسان فراموش ہے ؎۲"

؎۱ یعنی تو نے قبطی کو قتل کیا۔

؎۲ تو میرے احسان اور حق تربیت کا انکار کرنے والوں میں سے ہے۔ یہاں تک کہ تو نے میرے خواص تک کو قتل کرنے کا قصد کر لیا۔ اسی طرح عوفی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے(1)۔ اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور کہا کہ بے شک فرعون یہ نہیں جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا ہے؟ حسن اور سدی نے کہا ہے کہ اس نے یہ ارادہ کیا کہ بے شک تو تو اپنے اس الٰہ کا انکار کرنے والا تھا جس کی طرف اب تو دعوت دے رہا ہے۔ اور جس کی تو عبادت کرتا ہے حالانکہ تو ہمارے ساتھ ہمارے دین پر تھا(2)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ دو تاؤں میں سے ایک سے حال ہے۔ اور اس کا حکم مبتدا علیہ ہونا بھی جائز ہے کہ وہ (فرعون) اپنی الوہیت کے دعویٰ اور احسان جتلانے کے سبب کافروں میں سے ہے جب سے آپ اس کی طرف مخالفت کرتے ہوئے مراجعت فرما ہوئے یا وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے دین میں کفر کرتے تھے۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۲۰﴾

"آپ نے جواب دیا میں نے ارتکاب کیا تھا اس کا اس وقت جبکہ میں ناواقف تھا ؎۱"

؎۱ یہ جملہ فعلتُ کی تاء سے حال ہے۔ یعنی "فعلتُ ما فعلتُ وَاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ" جب میں نے وہ عمل کیا تو اس وقت میں ناواقف تھا اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی شے میری پاس نہیں آئی تھی۔ یا معنی یہ ہے کہ میں اس انجام سے ناواقف تھا کہ میرے اس عمل سے وہ مقتول ہو جائے گا کیونکہ میں نے تو اس سے تادیب کا ارادہ کیا تھا نہ کہ قتل کرنے کا۔ اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ میں خطا کرنے والوں میں سے تھا یعنی بغیر ارادے کے سیدھے راستے سے ہٹنے والا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ میں ان لوگوں کی مثل فعل کرنے والا تھا جو جاہل اور احمق ہوتے ہیں۔ اور ضالین کا معنی بھولنے والا بھی کیا گیا ہے۔ اور یہ معنی اس ارشاد سے لیا گیا ہے اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

2۔ ایضاً

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَّ جَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٢١﴾

''تو میں بھاگ گیا تھا تمہارے ہاں سے [1] جبکہ میں تم سے ڈرا پس بخش دیا مجھے میرے رب نے حکم [2] اور بنا دیا مجھے رسولوں سے [3]۔''

[1] تو میں تمہارے ہاں سے مدین کی طرف بھاگ گیا تھا۔

[2] جب میں تم سے ڈرا تو میرے رب نے مجھے حکمت اور علم عطا فرما دیا۔

[3] اور اس نے مجھے رسولوں میں سے بنا دیا۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ﴿٢٢﴾

''اور یہ [1] نعمت ہے [2] جس کا تو مجھ پر احسان جتلاتا ہے [3] حالانکہ تو نے غلام بنا رکھا ہے بنی اسرائیل کو [4]۔''

[1] مبتدا ہے اور اس کا اشارہ بچپن کی تربیت کی طرف ہے۔

[2] اور یہ اسم شارہ سے بدل ہے یا اس سے خبر ہے۔

[3] ''تَمُنُّهَا عَلَيَّ'' نعمۃ کی صفت ہے۔

[4] ''اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ'' یہ محل رفع میں ہے اس لیے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو کہ ھِیَ ہے۔ یا اس لیے کہ یہ نعمۃ سے بدل ہے۔ یا پھر باء مضمرہ کے سبب مجرور ہے۔ اور وہ مبتدا کی خبر ہے، یعنی بِمُقَابَلَةِ جَفَائِكَ اَوْ بِسَبَبِ جَفَائِكَ۔ اور وہ ہے ''ھی اَن عبدتَّ'' یا باء کے حذف کے سبب محل نصب میں ہے۔ یا ظرف کی بناء پر اس صورت میں الوقت مقدر ہے۔ یا حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ انتہائی ظالمانہ خصلت کی طرف اشارہ ہے اور اَنْ عَبَّدْتَّ اس کا عطف بیان ہے۔ اور عَبَّدْتَّ کا معنی ہے کہ تو نے انہیں اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے عَبَّدْتُ فلاناً وَاَعْبَدْتُهٗ وَاسْتَعْبَدْتُهٗ وَتَعَبَّدْتُهٗ۔ ان تمام کا معنی ہے میں نے اسے غلام بنایا ہے۔ مفسرین نے اس آیت کی تاویل میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اس شے کا اقرار ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اسے اپنے اوپر اس کی طرف سے نعمت شمار کیا ہے کہ اس نے آپ کی تربیت کی اور آپ کو قتل نہیں کیا جیسے اس نے بنی اسرائیل کے دیگر تمام بچوں کو قتل کرایا گویا کہ یہ کہا ''بَلٰی وَتِلْکَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیٓ اِسْرَآئِیْلَ وتَرَکْتَنِیْ وَلَمْ تَسْتَعْبِدْنِیْ'' (کیوں نہیں یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان جتلاتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا اور مجھے چھوڑ دیا اور مجھے غلام نہ بنایا) اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ظاہراً اقرار ہے اور معنیً انکار ہے کہ اولاً موسیٰ علیہ السلام نے اس کا رد کیا جس کے سبب اس نے آپ کی نبوت پر اعتراض کیا تھا اور پھر اسے دہرایا جسے اس نے نعمت شمار کیا تھا۔ اور صراحۃً اس کا انکار نہیں کیا کیونکہ وہ اپنے دعویٰ میں سچا تھا۔ بلکہ اس پر متنبہ کیا کہ وہ حقیقت میں نعمت تھی کیونکہ وہ جفا کے مقابلے میں تھی یا اس کا مسبب تھی۔ پس کہا ''وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ'' وہ نعمت تھی جفا کے مقابلہ میں یا جفا کے سبب۔ کیونکہ یہ تیرے بنی اسرائیل کو غلام بنانے اور ان کے بچوں کو قتل کرنے کے سبب ہوا کہ مجھے تیری طرف اٹھا کر لایا گیا یہاں تک کہ تو نے میری تربیت کی اور میری کفالت کی اور اگر تو انہیں غلام نہ بناتا تو پھر میری تربیت میرے گھر والے کرتے اور وہ مجھے دریا میں نہ پھینکتے۔ پس یہ اقرار انکار کو متضمن ہے۔

یہ قول بھی ہے۔ کہ یہ انکار ہے اور اس میں استفہام انکاری کا ہمزہ مقدر ہے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے ''اَتِلْکَ التَّرْبِیَةُ نِعْمَةٌ

لَکَ عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ "یعنی کیا تیرے بنی اسرائیل کو غلام بنانے کے وقت میری تربیت کرنا نعمت ہے؟ یا "اَلْحَالُ اَنَّکَ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ" (کیا تیرا میری تربیت کرنا نعمت ہے اس حال میں کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے؟) پس تیرے میری قوم بنی اسرائیل کو غلام بنانے نے اس احسان کو ختم کر دیا جو تو نے مجھ پر کیا۔ "تَمُنُّھَا" میں خطاب واحد ہے اور اس سے ماقبل میں جمع ہے۔ یہ اس لیے ہے کیونکہ یہ احسان اکیلے اس کی طرف سے تھا جبکہ خوف اور فرار آپ کی طرف سے اور آپ کی قوم کی طرف سے تھا جب فرعون نے اس طعن کا جواب سنا جو اس نے موسیٰ علیہ السلام پر کیا اور دیکھا کہ وہ تو پھر دعوت دینے لگے ہیں تو اس نے آپ کے دعویٰ پر اعتراضات شروع کر دیئے اور مرسِل کی حقیقت کے بارے استفسار کرنے لگا اور کہا۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۳﴾

"فرعون نے پوچھا کیا حقیقت ہے رب العالمین کی [1]"

[1] چونکہ اللہ تعالیٰ جو واجب الوجود ہے اس کی حقیقت کا بیان کرنا محال ہے۔ اس لیے کہ اس کی ذات میں ترکیب محال ہے اور اجزاء کی تعریف و پہچان ممتنع ہے۔ ہاں اس کی پہچان خواص اور افعال کے ذکر سے ہوتی ہے۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے اس کے اظہر ترین خواص و آثار کا ذکر کیا۔

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا ۭ اِنْ کُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ ﴿۲۴﴾

"آپ نے فرمایا رب العالمین وہ ہے جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے [1] اگر ہو تم یقین کرنے والے [2]"

[1] یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی "رَبُّ الْعَالَمِیْنَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا مِنَ الْکَائِنَاتِ" (رب العالمین آسمان، زمین اور ان کے درمیان کائنات میں سے ہر شے کا مالک ہے)

[2] اگر تم حقائق اشیاء کے ثبوت پر یقین کرنے والے ہو تو پھر ان سے ان کے خالق پر استدلال کرو۔ کیونکہ یہ وہ اجسام محسوسہ ہیں جنہیں مرکب کرنا، شمار کرنا اور ان کے احوال میں تغیر و تبدل کا ہونا ممکن ہے۔ پس ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بنیاد اور اصل واجب لذاتہ ہو اور اس اصل کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام ممکنات کی اصل ہو۔ ان کے لیے بھی جنہیں محسوس کرنا ممکن ہے اور ان کے لیے بھی جنہیں محسوس کرنا ممکن نہیں۔ اگر اس طرح نہ ہو تو پھر یا تو واجب کا متعدد ہونا لازم آئے گا یا پھر بعض ممکنات کا اس سے استغناء لازم آئے گا۔ اور یہ دونوں محال ہیں۔ تعدد اس لیے کہ وہ ایسی دو چیزوں کی ترکیب کو مستلزم ہے جن میں اشتراک پایا جاتا ہے اور ایسی چیزوں کو جن میں سے ہر ایک کو دوسری سے ممتاز کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اور مرکب حدوث کی دلیل ہے جو کہ وجوب کے منافی ہے۔ اور استغناء اس لیے محال ہے کہ یہ امکان کے منافی ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کی تعریف ممکن نہیں مگر خارجی لوازم کے ساتھ، کیونکہ اس کی ذات میں ترکیب محال ہونے کی وجہ سے جو کچھ اس میں داخل ہیں ان سے اور بنفسہ اس کی ذات کی پہچان ممتنع ہے۔ اور یہ ایسی شرط ہے جو گذشتہ کلام کے سبب جزاء سے مستغنی ہے۔ چونکہ فرعون غبی (کند ذہن) تھا وہ اس جواب کے حسن کو نہ پہچان سکا۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾

"فرعون نے اپنے اردگرد بیٹھنے والوں سے کہا[1] کیا تم سن نہیں رہے [2]"

[1] تو اس نے تعجب کرتے ہوئے اپنے اردگرد بیٹھنے والوں سے کہا

[2] کیا تم اس کا جواب سن نہیں رہے۔ یعنی میں نے اس سے رب کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا ہے اور یہ اس کے افعال کا ذکر کر رہا ہے۔ یا وہ یہ گمان کرتا تھا کہ آسمانوں کا رب ہے۔ اور یہ قدیم ہیں اور اپنی ذاتوں کے اعتبار سے واجب ہیں۔ جیسا کہ دہریوں کا مذہب ہے۔ یا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ بھی کسی مؤثر کے محتاج ہیں۔

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۲۶﴾

"آپ نے فرمایا وہ جو تمہارا بھی مالک ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی [1]"

[1] یہ ان چیزوں کی طرف عدول ہے جنہیں قدیم اور واجب گمان کرنا ممکن نہیں اور ان کے کسی مصور حکیم کا محتاج ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور یہ انداز نظر وفکر کرنے والے کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اور غور وفکر کرتے وقت زیادہ واضح ہوتا ہے۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْۤ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾

"فرعون بولا[1] بلاشبہ تمہارا یہ رسول جو بھیجا گیا ہے تمہاری طرف یہ تو دیوانہ ہے [2]"

[1] فرعون نے کہا

[2] کہ میں اس سے کسی شئی کی حقیقت کے بارے پوچھتا ہوں اور یہ مجھے جواب اور طرح دیتا ہے۔ تو اس نے آپ کو از روئے طنز و استخفاف رسول کہا۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾

"آپ نے (معاً) فرمایا جو مشرق ومغرب کا رب ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے[1] اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو [2]"

[1] آپ نے فرمایا کہ تم ہر روز مشاہدہ کرتے ہو (کہ میرا رب) سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے اور اسے پہلے دن کے مدار کے سوا دوسرے مدار میں چلاتا ہے حتیٰ کہ اسے مغرب تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بہت سے منافع وابستہ ہیں اور وہ امور کائنات کا انتظام کرتا ہے۔

[2] اگر تمہارے پاس ایسی عقل ہے جس سے تم ادراک کر سکو تو اس سے بڑھ کر تمہارے لیے کوئی جواب نہیں۔ پہلے آپ نے ان سے نرم انداز اپنایا پھر جب آپ نے ان کی شدت اور سختی کو ملاحظہ کیا تو آپ نے بھی درشت رویہ اپنایا اور ان کے کلام کے مثل ہی آپ نے بھی ان سے کلام کیا۔

قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ ﴿۲۹﴾

"اس نے[1] (رعب جماتے) ہوئے کہا (یاد رکھو!) اگر تم نے میرے سوا کسی کو خدا بنایا[2] تو میں تمہیں ضرور قیدیوں میں داخل کر دوں گا[3]"

[1] حجت میں لاجواب ہونے کے بعد فرعون نے جاہلانہ انداز اپناتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ کر کے کہا۔

۲؎ یہ مخذوف قسم کا جواب ہے۔

۳؎ اگر تو نے میرے سوا کسی کو الٰہ بنایا تو میں ضرور تجھے قید میں ڈال دوں گا۔ الْمَسْجُوْنِیْنَ میں لام عہدی ہے۔ یعنی تو پہچانتا ہے ان لوگوں کے حال کو جو میری قید میں ہیں۔ کلبی نے کہا ہے کہ اس کی قید قتل سے زیادہ سخت تھی کیونکہ وہ آدمی کو پکڑ کر تنہا اکیلے مکان میں پھینک دیتا تھا اس میں نہ وہ کوئی آواز سن سکتا اور نہ کسی چیز کو دیکھ سکتا تھا بس اس طرح وہ زمین پر پڑا رہتا تھا(1)۔ تو فرعون نے اس طرح اپنے عذاب دینے کے اختیارات سے اپنی الوہیت کے اثبات اور صانع (حقیقی) کے انکار پر استدلال کیا۔ اور اس کا قول اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ اپنے سوا کسی اور کی طرف ربوبیت کی نسبت کرنے پر تعجب کرتے ہوئے اس نے کہا۔ شاید وہ دہریہ تھا اور یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ اس کا ملک زمین کا حصہ ہے اور وہ اپنی قوت سے اس کے امور کا والی ہے۔ لہٰذا وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے باسی اس کی عبادت کریں۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۰﴾

''فرمایا۱؎ اگرچہ میں لے آؤں تیرے پاس ایک روشن چیز ۲؎''

۱؎ اس کی جھڑک کا جواب دیتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

۲؎ اس میں ہمزہ استفہام زجر و توبیخ اور انکار کے لیے ہے۔ اور حذف فعل کے بعد واؤ حال کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ''أَتَجْعَلُنِیْ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ وَلَوْ جِئْتُکَ بِشَیْءٍ مُبِیْنٍ'' یہ اس حال میں برائی کرنے پر زجر و توبیخ ہے۔ جو وہ آپ کی صداقت پر واضح دلیل آ جانے کی صورت میں کر رہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واؤ مخذوف شرط پر عطف کے لیے ہے۔ اور پھر دونوں شرطیں فعل مخذوف کے فاعل سے حال ہیں۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے ''اَتَجْعَلُنِیْ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ لَوْلَمْ اُجِبْکَ عَلٰی دَعْوَائِیْ بِحُجَّۃٍ وَّلَوْ جِئْتُکَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ حُجَّۃً'' (کیا تو مجھے قید میں ڈال دے گا اگرچہ میں تجھے اپنے ایسے دعویٰ کی بنا پر قبول نہیں کرتا جو حجت سے ثابت ہے اور اگرچہ میں تیرے پاس بطور حجت ایک واضح اور روشن چیز لے آؤں) تو اس میں دونوں تفسیروں کا نتیجہ ایک ہی ہے۔

قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾

''اس نے کہا۱؎ پھر پیش کرو۲؎ اسے اگر تم سچے ہو۳؎''

۱؎ تو فرعون نے کہا

۲؎ وہ روشن چیز لے آؤ۔

۳؎ اگر واقعی وہ دلیل واضح ہے یا اگر تو اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ کیونکہ مدعی نبوت کے لیے حجت کا ہونا ضروری ہے۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ﴿۳۲﴾

''پس آپ نے۱؎ ڈالا اپنا عصا تو اسی وقت وہ صاف اژدھا بن گیا۲؎''

۱؎ تو موسیٰ علیہ السلام نے

۲؎ اپنا عصا ڈالا تو اس میں اژدھا کے اوصاف ظاہر ہو گئے۔ یا مبین کا معنی ہے کہ وہ ان کے دعویٰ کی صداقت کو ظاہر کرنے لگا۔ اس کا

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

عطف قَالَ پر ہے۔

وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾

''اور آپ نے باہر نکالا [1] اپنا ہاتھ [2] تو یکلخت وہ سفید ہو گیا دیکھنے والوں کے لیے [3]''

[1] اور موسیٰ علیہ السلام نے

[2] اپنا ہاتھ نکالا جبکہ فرعون نے کہا کیا اس کے علاوہ بھی کوئی شے ہے؟

[3] تو آپ کا ہاتھ اتنا سفید تھا کہ اس سے روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں اور وہ آنکھوں کو خیرہ اور افق کو ڈھانپنے لگیں۔ فرعون یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس سے کوئی بھی جواب نہ بن پڑا۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

''(یہ دیکھ کر) فرعون نے اپنے آس پاس بیٹھنے والے درباریوں سے کہا [1] واقعی یہ [2] ماہر جادوگر ہے [3]''

[1] فرعون نے ان درباریوں سے کہا جو اس کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے حولہ ظرف ہے جو حال کی جگہ واقع ہے۔

[2] کہ یہ موسیٰ (علیہ السلام)

[3] جادو کے علم میں مہارت رکھتا ہے۔

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

''یہ چاہتا ہے کہ نکال دے تمہیں اپنے ملک سے اپنے جادو (کے زور) سے (اب بتاؤ) تمہاری کیا رائے ہے؟ [1]''

[1] یعنی جب اس پر معجزہ کے ذریعے حضرت موسیٰ علیہ السلام غالب آئے تو آپ نے اسے دعویٰ ربوبیت بھلا کر قوم سے مشاورت کی طرف جھکا دیا۔ اور وہ ان سے اپنے بارے میں اور موسیٰ علیہ السلام سے نفرت کرنے کے بارے رائے طلب کرنے لگا۔ اور ساتھ ہی وہ آپ کے غالب آنے اور اپنے ملک پر ان کے قبضہ کرنے کے خوف کا اظہار کرنے لگا۔

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾

''بولے مہلت دو اسے اور اس کے بھائی کو [1] اور بھیج دو شہروں میں ہرکارے [2]''

[1] تو انہوں نے کہا ان دونوں کے معاملہ کو مؤخر کر دو۔

[2] اور شہروں کی طرف ایسے لوگ بھیج دے جو وہاں سے ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے لے آئیں۔

يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾

''تا کہ وہ لے آئیں تیرے پاس [1] (ملک کے کونہ کونہ سے) تمام ماہر جادوگر [2]''

[1] جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے۔

[2] جو آپ پر سحر میں فوقیت رکھتے ہوں۔ ابن عامر، ابوعمرو اور کسائی نے سَحَّار میں امالہ کیا ہے۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾

"الغرض جمع کر لیے گئے سارے جادوگر مقررہ وقت پر ایک خاص دن لہ"

لہ اس کا عطف جملہ محذوفہ پر ہے۔ تقدیرِ عبارت یہ ہے "فَبَعَثَ حَاشِرِيْنَ فَذَهَبُوْا فَحَشَرُوا السَّحَرَةَ لِمَا وُقِّتَ بِهٖ مِنْ سَاعَاتِ يَوْمٍ مُّعَيَّنٍ" (یعنی اس نے ہرکاروں کو بھیجا پس وہ گئے اور انہوں نے جادوگروں کو معین دن کی معین ساعتوں کے لیے جمع کیا) اور اس معین ساعت سے مراد یوم الزینۃ کا وقت چاشت ہے۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ سال کے دنوں میں سے پہلے ہفتے کا دن تھا یعنی یوم نیروز۔

وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾

"اور کہہ دیا گیا لوگوں سے کیا تم (مقابلہ دیکھنے کے لیے) اکٹھے ہو گے؟ لہ"

لہ "هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ" میں استفہام بمعنی امر ہے۔ اور اس میں ان کی اجتماعی سستی کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس کے ذریعے انہیں سستی نہ کرنے اور (معین جگہ کی طرف) جلدی آنے پر برانگیختہ کرنا ہے۔

لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾

"شاید ہم پیروی کرنے رہیں جادوگروں کی لہ اگر وہ (مقابلہ میں) غالب آ جائیں ٢ے"

لہ "لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ" سے ان کی مراد موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور ان کی قوم تھی۔ یعنی شاید ہم ان کے دین کی پیروی کرتے رہیں۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہاں وہ جادوگر مراد لینا بھی جائز ہے جنہیں اس نے طلب کیا تھا، یعنی شاید ہم موسیٰ علیہ السلام کے امر کو باطل کرنے کے لیے ان جادوگروں کی پیروی کرتے رہیں۔

٢ے ترجی دوسری تاویل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ البتہ پہلی تاویل کے مطابق ترجی اس غلبے کی بناء پر ہے جو اتباع کا تقاضا کرتا ہے۔ اور ان کا مقصودِ اصلی یہ ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے امر کی اتباع نہیں کریں گے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾

"جب حاضر ہوئے جادوگر تو انہوں نے فرعون سے پوچھا کیا ہمیں کوئی انعام بھی ملے گا لہ اگر ہم (موسیٰ علیہ السلام پر) غالب آ جائیں ٢ے"

لہ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اس میں استفہام تقریر کے لیے ہے۔

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾

"اس نے کہا ہاں ضرور ملے گا اور تم اس وقت لہ میرے مقربوں میں شامل کر لیے جاؤ گے ٢ے"

لہ "وَقَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ" یہ عطف نعم کے مضمون پر ہے۔ یعنی اِنَّ لَكُمْ اَجْرًا و اِنَّكُمْ "اِذًا" اس کا تعلق مابعد سے ہے جب تمہیں غلبہ حاصل ہوگا۔

٢ے تو پھر بالضرور مقربین میں سے ہو جاؤ گے۔ اور یہ فرعون کی جانب سے اس اجر سے زیادہ عطا ہے جس کا انہوں نے غلبہ حاصل ہونے کی صورت میں مطالبہ کیا تھا۔ پھر جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا "اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ

الْمُلْقِیْنَ" (تم ڈالو جادو یا پھر ہم ڈالتے ہیں) جیسا کہ اس کا ذکر اعراف میں گزر چکا ہے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ ﴿٤٣﴾

"موسیٰ نے انہیں فرمایا پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو ۱؎"

۱؎ تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو۔ تو آپ نے اس امر سے سحر کا ارادہ نہیں فرمایا بلکہ اس سے مراد اس عمل میں پہل کرنے کی اجازت ہے جو وہ کرنے والے تھے بالیقین یہ اس کے اظہار کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ قطعاً آپ پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ آپ نے معصیت کا حکم دے کر حرام کے ارتکاب کا حکم دیا۔ (کیونکہ جادو تو حرام تھا) یا پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ امر تحقیر کے لیے ہے، یعنی معجزہ کے مقابلہ میں ان کے سحر کی حقارت بیان کرنے کے لیے ہے لہٰذا یہ کسی شے کے طلب کے باب سے ہے ہی نہیں۔

فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ ﴿٤٤﴾

"تو انہوں نے پھینک دیں ۱؎ اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں (میدان میں) اور (بڑے وثوق سے) کہا ناموس فرعون کی قسم! ہم ہی یقیناً غالب آئیں گے ۲؎"

۱؎ پس جادوگروں نے پھینک دیں اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں۔

۲؎ انہوں نے اپنے فرط اعتقاد کے سبب عزت فرعون سے برکت حاصل کی کہ بے شک وہ سعادت مندوں میں سے ہیں۔ یا پھر انہوں نے عزت فرعون کی قسم کھائی کہ وہ اپنے جادو کا آخری حربہ بھی استعمال کریں گے جسے لانا ان کے لیے ممکن ہوا۔

فَأَلْقَىٰ مُوسَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴿٤٥﴾

"پھر پھینکا موسیٰ نے اپنا سونٹا تو وہ یکا یک نگلنے لگ گیا ۱؎ جو فریب انہوں نے بنا رکھا تھا ۲؎"

۱؎ تو پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو وہ انہیں نگلنے لگا۔ حفص نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تشدید کے ساتھ۔

۲؎ مَا يَأْفِكُونَ یہ ما موصولہ ہے۔ یعنی جن کے ظاہر کو انہوں نے اپنے جھوٹ اور فریب کے سبب تبدیل کر رکھا تھا اور یہ خیال کیا جانے لگا تھا کہ ان کی رسیاں اور ڈنڈے سانپ ہیں اور دوڑ رہے ہیں۔ یا پھر یہ ما مصدریہ ہے۔ یعنی یہ ان کے فریب کو نگلنے لگا تو اس میں وہ چیز جس سے فریب دیا گیا اسے مبالغہ کے لیے فریب کا نام دے دیا گیا ہے۔

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ ﴿٤٦﴾

"پس (یہ معجزہ دیکھ کر) گر پڑے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے ۱؎"

۱؎ تو جب انہوں نے ایسا ہوتے دیکھا تو وہ اپنے آپ کو اس یقین سے نہ روک سکے کہ بے شک جادو کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ اپنے چہروں کے بل گر پڑے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں گرا کر توبہ کی توفیق عطا کر دی۔ لہٰذا اس میں اس امر پر دلیل موجود ہے کہ سحر کی انتہاء یہ ہے کہ جھوٹ اور فریب کو آراستہ کیا جاتا ہے اور چیز کو ایسا خیال کیا جاتا ہے جبکہ وہ حقیقۃً ایسی نہیں ہوتی۔

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

"انہوں نے (برملا) کہہ دیا ہم ایمان لائے رب العالمین پر ۱؎"

۱؎ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یہ اُلْقِیَ سے بدل اشتمال ہے یا پھر حال ہے اور اس سے پہلے "قَدْ" مضمر ہے۔

رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝

"جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا ۱؎"

۱؎ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ یہ بھی بدل ہے جو اس امر کی وضاحت، کسی قسم کے وہم کا ازالہ اور اس بات کا شعور دلانے کے لیے ہے کہ بے شک ان کے ایمان کا سبب وہ معجزہ تھا جو ان دونوں کے ہاتھوں پر ظاہر ہوا تھا۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬ؕ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

"فرعون نے ۱؎ (خفت مٹانے کے لیے) کہا تم تو ایمان لا چکے تھے اس پر ۲؎ اس سے پہلے کہ میں تمہیں مقابلہ کی اجازت دیتا یہ تو تمہارا بڑا (گرو) ہے جس نے تمہیں سحر کا فن سکھایا ہے ۳؎ ابھی (سازش کا انجام) تمہیں معلوم ہو جائے گا میں ضرور کاٹ دوں گا تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں مخالف طرفوں سے اور میں تم سب کو سولی چڑھا دوں گا ۴؎"

۱؎ فرعون نے اپنی قوم پر حقیقت چھپاتے ہوئے بطور تلبیس کہا تا کہ وہ یہ اعتقاد نہ رکھ لیں کہ وہ بصیرت اور حق کے ظاہر ہونے کے سبب ایمان لائے

۲؎ اٰمَنْتُمْ لَهٗ کہ تم تو اس پر ایمان لا چکے تھے اس سے پہلے کہ تمہیں اس کے مقابلہ کی اجازت دیتا یہ تو تمہارا بڑا گرو ہے۔ حمزہ، کسائی، ابوبکر اور روح نے ءَ اٰمَنْتُمْ دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور استفہام انکاری کے ہمزہ کو حذف کر دیا ہے۔

۳؎ پس اسی نے تمہیں کچھ چیزیں سکھلائیں۔ اسی لیے وہ تم پر غالب آ گیا۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ بے شک اس نے تمہارے ساتھ اس بارے میں مصالحت کر لی اور تم نے اس پر اتفاق کر لیا ابھی اس سازش کا انجام تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

۴؎ یہ اجمالاً ڈانٹ اور جھڑک ہے۔ پھر اس قول سے اس کی تفصیل بیان کی۔

قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۫ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝

"انہوں نے جواب دیا ہمیں اس کی ذرا پرواہ نہیں ۱؎ ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹنے والے ہیں ۲؎"

۱؎ اس میں ہمارے لیے کوئی نقصان نہیں کیونکہ یہ شہادت اور اس عظیم اجر کو مستلزم ہے جس کے مقابلہ میں دنیوی مصائب لاشیء (معدوم ہونا) ہوتے ہیں۔

۲؎ بے شک ہم تو اس وعید کے سبب جس سے تو ہمیں ڈرا رہا ہے یا موت کے اسباب میں سے کسی دوسرے سبب کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اور تیرا قتل کرنا تو زیادہ نفع بخش ہے۔ اور ضیر (نقصان) کی نفی کی علت بیان کرتے ہوئے امید

ظاہر کی۔

اِنَّا نَطۡمَعُ اَنۡ يَّغۡفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَاۤ اَنۡ كُنَّاۤ اَوَّلَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۵۱﴾

''ہمیں یہ امید ہے کہ بخش دے گا ہمارے لیے ہمارا رب ہماری خطائیں [1] کیونکہ ہم (تیری قوم میں سے) پہلے ایمان لانے والے ہیں [2]''

[1] کہ ہمیں یہ امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے لیے ہماری خطائیں بخش دے گا۔

[2] کیونکہ ہم ہی فرعون کے متبعین میں سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ یا حاضرین میں سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہی ہے کہ بے شک ہم پہلے ایمان لانے والے ہیں اور اول المؤمنین وہ ہوتے ہیں جن کی دوسرے اقتدا کرتے ہیں۔ یہ جملہ ضیر کی نفی کی دوسری علت ہے یا پہلی علت کی تعلیل ہے یا اس سے بدل اشتمال ہے۔

وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِىۡۤ اِنَّكُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ ﴿۵۲﴾

''اور ہم نے وحی کی موسیٰ کی طرف [1] کہ راتوں رات (یہاں سے) میرے بندوں کو لے جاؤ [2] یقیناً تمہارا تعاقب کیا جائے گا [3]''

[1] اس کے بعد کہ آپ کئی سال ان کے درمیان مقیم رہے۔ انہیں حق کی طرف بلاتے رہے اور واضح نشانیاں دکھاتے رہے لیکن ان میں ہٹ دھرمی اور فساد کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا تو ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ راتوں رات یہاں سے میرے بندوں کو لے جاؤ۔

[2] ''بِعِبَادِیۡ'' کو نافع نے یاء مفتوحہ سے پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے یا ساکن کے ساتھ۔

[3] یقیناً فرعون اور اس کی قوم تمہارا پیچھا کریں گے تا کہ وہ تمہارے اور مصر سے نکلنے کے درمیان حائل ہو جائیں۔ یہ اسراء (رات کو نکالنے) کی علت ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ بنی اسرائیل میں سے ہر چار گھروں میں رہنے والوں کو ایک گھر میں جمع کریں۔ پھر وہ بھیڑوں کے بچے ذبح کریں اور ان کا خون اپنے دروازوں پر لگا دیں۔ پس میں ملائکہ کو حکم دوں گا کہ وہ اس گھر میں داخل نہ ہوں گے جس کے دروازے پر خون ہوگا۔ اور پھر میں انہیں یہ حکم دوں گا کہ آل فرعون میں سے ہر ایک کے بچوں کو جان سے مار دیا جائے اور انہیں مالی نقصان بھی دیا جائے۔ پھر تم تازہ روٹی پکالو، بے شک وہ تمہارے لیے تازی رہے گی۔ پھر میرے بندوں کو راتوں رات لے جاؤ یہاں تک کہ سمندر تک پہنچ جاؤ۔ پھر میرا نیا حکم آ جائے گا۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ پس جب صبح ہوئی تو انہوں نے فرعون کو کہا یہ موسیٰ اور ان کے متبعین کا عمل ہے کہ انہوں نے ہمارے بچوں کو جان سے مار دیا ہے۔ چنانچہ اس نے آپ کے تعاقب میں کئی ہزار کا لشکر بھیجا۔ ان میں پانچ لاکھ سالار اور ہر سالار کے ساتھ ایک ہزار سپاہی تھے۔ اور فرعون بذات خود ایک بہت بڑے تخت پر نکلا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کے لشکر کی اتنی تعداد بعید از عقل ہے اور کوئی ایسی روایت بھی منقول نہیں جس سے اس کا علم ہوتا ہو۔

فَاَرۡسَلَ فِرۡعَوۡنُ فِى الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِيۡنَ ﴿۵۳﴾

''پس بھیجے فرعون نے [1] سارے شہر میں ہرکارے [2]''

۱؎ اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے۔"فَاَسْرٰی مُوْسٰی قَوْمَهٗ فَبَلَغَ الْخَبَرُ فِرْعَوْنَ وَاَرَادَاَنْ یَّتْبَعَهُمْ فَاَرْسَلَ" (کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو راتوں رات نکال لے گئے۔پس جب یہ خبر فرعون کے پاس پہنچی تو اس نے ان کا تعاقب کرنے کا ارادہ کیا اور اس نے سارے شہروں میں آدمی بھیجے۔)

۲؎ کہ وہ لشکر جمع کریں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ شاید اس نے لوگوں کو اس لیے بھیجا تا کہ وہ مصر سے متصل شہروں میں رہنے والوں کو جمع کریں کیونکہ اس رات میں صبح تک ان کا اجتماع ممکن تھا۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾

"(تا کہ لوگوں کو بتائیں) ۱؎ یہ لوگ ایک چھوٹی سی جماعت ہیں ۲؎"

۱؎ اور لوگوں کو بتائیں کہ بے شک یہ بنی اسرائیل

۲؎ لوگوں کی چھوٹی سی جماعت ہے۔شرذمۃ کا تلفظ شین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔جیسا کہ قاموس میں ہے(1)۔پھر اسے اپنے اس قول سے مؤکد کیا۔ یہ انتہائی قلیل مقدار سے آگاہ کرنے کے لیے ہے۔ پس یہ آیت اس روایت کے باطل ہونے پر دلالت کرتی ہے جس میں ان کی تعداد چھ سو ستر ہزار بیان کی گئی ہے۔اور بے شک ان کی یہ قلت فرعون کے لشکر کے مقابلہ میں تھی کیونکہ اس کے لشکر کے مقدمہ میں سات سو ہزار (سات لاکھ) سپاہی تھے اور اس کے ساقہ، میمنہ، میسرہ اور قلب میں بھی اسی کے مطابق تعداد تھی۔لیکن اگر ملوک الارض، بالخصوص شاہ مصر کی حیثیت میں غور وفکر کی جائے تو عقل اتنی تعداد کو جائز قرار نہیں دیتی۔میرا خیال ہے کہ شاید لَشِرْذِمَةٌ کا ذکر فرعون کے لشکر کے مقابلہ میں ان کی قلت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔اور قَلِيْلُوْنَ کا ذکر اس وضاحت کے لیے ہے کہ درحقیقت ان کی تعداد قلیل تھی۔

وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾

"اور انہوں نے ہمیں سخت برافروختہ کر دیا ہے ۱؎"

۱؎ لنا، غائظون کے متعلق ہے۔اور معنی یہ ہے کہ بے شک وہ ہمارے لیے غیظ وعداوت رکھنے والے لوگ ہیں۔یعنی وہ ہم سے دشمنی رکھنے والے ہیں۔یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ بے شک وہ ہمارے ساتھ ایسا عمل کرنے والے ہیں جو ہمیں برافروختہ کرتا ہے۔

وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾

"(تاہم فکر نہ کرو) ہم سب (ان کے متعلق بہت) محتاط ہیں ۱؎"

۱؎ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ میں اہل حجاز اور اہل بصرہ نے حَذِرُوْنَ اور فَرِهِيْنَ بغیر الف کے پڑھا ہے۔ہشام نے حَذِرُوْنَ میں ان سے موافقت کی ہے اور باقی قراء نے حَاذِرُوْنَ اور فَارِهِيْنَ دونوں کو الف کے ساتھ پڑھا ہے،ان میں سے پہلا ثبات اور دوسرا تجدد کے لیے ہے۔اور یہی معنی ہے اس کا جو فراء نے کہا ہے کہ حاذر وہ ہے جو اب (زمانہ حال میں) تجھے ڈرا رہا ہو اور حَذِر مطلق ڈرانے والے کو کہتے ہیں۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حاذرون سے مراد صاحب رائے اور قوت ہیں،یعنی جو مکمل اسلحہ سمیت مستعد ہوں۔زجاج نے یہی کہا ہے(2)۔اور حذرون کا معنی ہے ڈرنے والے بیدار رہنے والے یعنی جو محتاط ہوں،غافل نہ ہوں۔

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾

''سو ہم نے نکالا انہیں ۱؎ (سرسبز) باغوں ۲؎ اور (بہتے ہوئے) چشموں سے ۳؎''

۱؎ فَاَخْرَجْنٰهُمْ میں تقدیر عبارت یہ ہے "فَاجْتَمَعُوْا عَلَى الْاِتِّبَاعِ فَاَخْرَجْنَا هُمْ" پس وہ جمع ہوئے اور انہوں نے پیچھا کرنے پر اتفاق کیا تو ہم نے انہیں نکالا، یعنی وہ ہماری تقدیر اور مشیت کے ساتھ نکلے۔

۲؎ (سرسبز) باغات سے،

۳؎ اور (بہتے ہوئے) چشموں (اور نہروں) سے،

وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾

''اور (بھرپور) خزانوں ۱؎ اور شاندار محلات سے ۲؎''

۱؎ اور سونے اور چاندی کے مالوں (خزانوں) سے،

۲؎ اور خوبصورت گھروں اور پر رونق مجالس سے، یعنی امراء اور رؤساء کی مجالس سے جنہیں خدام اور متبعین گھیرے ہوتے تھے۔

كَذٰلِكَ ؕ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾

''ہم نے ایسا ہی کیا ۱؎ اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان تمام چیزوں کا وارث بنا دیا ۲؎''

۱؎ معاملہ اسی طرح ہوا۔

۲؎ اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان باغات، چشموں، خزانوں اور محلات کا وارث بنا دیا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو مصر کی طرف واپس لوٹایا اور وہ سب کچھ انہیں عطا کر دیا جن اموال اور محلات کے فرعون اور اس کی قوم مالک تھے۔

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾

''پس وہ ان کے تعاقب میں نکلے اشراق کے وقت ۱؎''

۱؎ پس انہوں نے ان کا اشراق کے وقت تعاقب کیا۔

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾

''پس جب ایک دوسرے کو دیکھ لیا ۱؎ دونوں گروہوں نے ۲؎ تو موسیٰ کے ساتھی کہنے لگے (ہائے) ہم تو یقیناً پکڑ لیے گئے ۳؎''

۱؎ فَلَمَّا تَرَآءَ میں حمزہ نے راء کے فتحہ کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ سو جب وقف کیا تو اس کے پیچھے ہمزہ کو ذکر کیا۔ پس اسے اپنے اصل کے مطابق بین بین بناتے ہوئے اس میں امالہ کیا۔ تو اس طرح یہ ان دو الفوں کے درمیان ہو جائے گا جن میں امالہ کیا گیا ہو۔ ان میں سے پہلی الف وہ ہے جسے راء کے فتحہ کے امالہ کے سبب مائل کیا گیا ہے اور دوسری وہ ہے جس میں ہمزہ کے فتحہ کے سبب امالہ کیا گیا ہے۔ اور یہ مشابہت کے حکم کے مطابق ہے مگر ان کے مذہب کے مطابق یہی اس کی حقیقت ہے۔ اور باقی قراء حالت وصل میں

خالص راء کا فتحہ اور ہمزہ پڑھتے ہیں۔ لیکن وقف کی صورت میں کسائی ہمزہ کے فتحہ کو امالہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ سو اس امالہ کے سبب اس کے بعد کا الف یاء سے بدل جاتا ہے اور ورش اسے ذوات الیاء میں اپنے اصل پر رکھتے ہوئے بین بین کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور باقی قراء فتحہ کے ساتھ وقف کرتے ہیں۔

۲۔ یعنی وہ دونوں فریق اس طرح ایک دوسرے کے قریب ہوئے کہ قوم موسیٰ اور قوم فرعون میں سے ہر فریق دوسرے کو دیکھنے لگا۔ تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کہنے لگے۔

۳۔ کہ قوم فرعون ہمیں پالے گی اور ان کا مقابلہ کرنے کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔

قَالَ كَلَّا ۚ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٦٢﴾

"آپ نے فرمایا ۱ ہرگز نہیں ۲ بلاشبہ ۳ میرے ساتھ میرا رب ہے ۴ وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا ۵"

۱۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد کرتے ہوئے فرمایا

۲۔ وہ ہرگز ہمیں نہیں پاسکیں گے۔

۳۔ اِنَّ مَعِيَ کو حفص نے یاء مفتوح اور باقی قراء نے یاء ساکن کے ساتھ قرأت کی ہے۔

۴۔ میرے رب کی مدد اور حفاظت میرے ساتھ ہے۔

۵۔ وہ ضرور راہ نجات کی طرف میری راہنمائی فرمائے گا۔

فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ﴿٦٣﴾

"سو ہم نے وحی بھیجی موسیٰ کی طرف ۱ کہ ضرب لگاؤ اپنے عصا سے سمندر کو تو سمندر پھٹ گیا ۲ اور ہو گیا پانی کا ہر حصہ ۳ بڑے پہاڑ کی مانند ۴"

۱۔ چونکہ اوحینا میں قول کا معنی ہے۔ لہٰذا اَنْ اس کی تفسیر ہے۔

۲۔ فَانْفَلَقَ کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "فَضَرَبَ مُوْسٰى عَصَاهُ عَلَى الْبَحْرِ فَانْفَلَقَ الْبَحْرُ اَيِ النِّيْلُ" پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا سمندر پر مارا تو سمندر نیل پھٹ گیا۔

۳۔ اور پانی کا ہر حصہ اپنی جگہ پر ثابت رہنے والے بہت بڑے پہاڑ کی طرح ہو گیا۔ پس جماعت کا ہر حصہ اس کے راستوں میں سے ایک ایک راستے میں داخل ہو گیا۔

وَأَزْلَفْنَا ثَمَّ الْآخَرِينَ ﴿٦٤﴾

"اور ہم نے قریب کر دیا وہاں ۱ دوسرے فریق کو ۲"

۱۔ اور ہم نے اسی جگہ میں

۲۔ دوسرے فریق کو یعنی قوم فرعون کو قریب کر دیا۔

وَاَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَمَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۶۵﴾

''اور ہم نے بچالیا (ان تند موجوں سے) موسیٰ اور اس کے سب ہمراہیوں کو۔[1]''

[1] اور ہم نے سمندر کو چلنے سے روک کر موسیٰ علیہ السلام اور ان کے تمام ساتھیوں کو بچالیا یہاں تک کہ انہوں نے اسے عبور کر لیا۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۶۶﴾

''پھر ہم نے غرق کر دیا دوسرے فریق کو۔[1]''

[1] پھر ہم نے فرعون کی قوم کو غرق کر دیا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ۚ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۶۷﴾

''اس واقعہ میں [1] (بڑی واضح) نشانی ہے [2] اور ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں [3]''

[1] بے شک موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بچانے اور فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کرنے میں

[2] موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر واضح دلیل ہے۔ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ اور فرعون کے پیروکاروں میں اکثر۔

[3] ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ کہا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر آل فرعون میں سے ایمان نہیں لائے مگر صرف فرعون کی بیوی آسیہ، حزئیل جو کہ اپنے ایمان کو چھپاتا تھا اور اس کی بیوی اور وہ مریم بنت ناموسیا جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر پر مطلع کیا۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۶۸﴾

''اور بے شک (اے حبیب!) آپ کا رب ہی سب پر غالب، [1] ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے [2]''

[1] اور بے شک آپ کا رب ہی اپنے دشمنوں سے انتقام لینے میں سب پر غالب ہے۔

[2] اور اپنے اولیاء (دوستوں) پر ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ﴿۶۹﴾

''اور آپ بیان فرمایئے ان کے سامنے ابراہیم کا قصہ [1]''

[1] اور آپ اہل مکہ کے سامنے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کیجیے۔ اس کا عطف اس قول پر ہے ''اِذْنَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰی'' کیونکہ وہاں ''اُذْكُرْ'' مقدر ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾

''جب آپ نے [1] اپنے باپ سے [2] اور قوم سے کہا کہ تم کس کی پرستش کرتے ہو [3]''

[1] جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا۔ یہ اُذْكُرْ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی ''اُذْكُرْ اِذْقَالَ'' اور یہ اُتْلُ عَلَیْهِمْ سے بدل ہے۔

[2] تو اللہ تعالیٰ نے آزر کو باپ کا نام اس لیے دیا کیونکہ وہ آپ علیہ السلام کا چچا اور آپ کا مربی تھا۔

[3] آپ نے اپنی قوم سے سوال کیا کہ تم کس کی پرستش کرتے ہو؟ تاکہ آپ انہیں مطلع کریں کہ جن کی وہ عبادت کرتے ہیں وہ عبادت

کے مستحق نہیں۔

قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾

"انہوں نے کہا ہم تو پوجتے ہیں بتوں کو اور ہم انہی کی پوجا میں ہر وقت منہمک رہتے ہیں ۱؎"

۱؎ تو انہوں نے اس پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اور فخر کرتے ہوئے جواب طویل کر دیا۔ اور یہاں نَظَلُّ نَدُوْمُ کے معنی میں ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ وہ دن کے وقت ان کی عبادت کرتے تھے رات کے وقت نہیں۔

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾

"آپ نے پوچھا ۱؎ (بھلا یہ بتاؤ) کیا وہ سنتے ہیں ۲؎ تمہاری آواز جب تم انہیں پکارتے ہو ۳؎"

۱؎ ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔

۲؎ کیا وہ تمہاری پکار کو سنتے ہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس کا معنی ہے کیا وہ تمہارے لیے سنتے ہیں۔(1)

۳؎ جب تم انہیں پکارتے ہو۔ تو اس میں حالت ماضیہ کی حکایت کے لیے مضارع کا صیغہ اِذْ کے ساتھ لایا گیا ہے۔

اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾

"یا وہ تمہیں (کچھ) نفع پہنچا سکتے ہیں ۱؎ یا ضرر پہنچا سکتے ہیں ۲؎"

۱؎ یا وہ تمہیں کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں اس بناء پر کہ تم ان کی عبادت کرو۔

2۔ یا اسے ضرر پہنچا سکتے ہیں جس نے اس سے اعراض کیا۔

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

"انہوں نے (لاجواب ہو کر) کہا بلکہ ہم نے تو پایا اپنے باپوں کو کہ وہ یونہی کیا کرتے تھے ۱؎"

۱؎ یعنی انہوں نے یہ کہا کہ بے شک یہ نہ تو کوئی آواز سنتے ہیں، نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی ضرر کو دور کر سکتے ہیں بلکہ ہم تو صرف اپنے آباؤ اجداد کی اقتداء کرتے ہیں۔ اس میں يَفْعَلُوْنَ وَجَدْنَا کا دوسرا مفعول ہے۔ اور كَذٰلِكَ، يَفْعَلُوْنَ کے محذوف مصدر کی صفت ہے۔ یعنی "بَلْ وَجَدْنَا اٰبَآءَ نَا يَفْعَلُوْنَ فِعْلًا كَذَالِكَ الْفِعْلِ اَیْ كَفِعْلِنَا ذٰلِكَ"۔

قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾

"آپ نے فرمایا کیا تم نے دیکھ لیا ان (کی بے بسی) کو جن کی تم پرستش کرتے ہو"

اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾

"اور تم اور تمہارے گزشتہ آباؤ اجداد ۱؎"

۱؎ یہ ہمزہ استفہام تقریری کے لیے ہے۔ یعنی مخاطب کو اقرار پر برانگیختہ کرنے کے لیے۔ اور فاء محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ اور مَا بھی استفہامیہ ہے۔ اور جملہ استفہامیہ رایتم کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ یا پھر مَا موصولہ ہے اور یہ اپنے صلہ سے مل کر رایتم کا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

مفعول اول ہے اور مفعول ثانی مقدر ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے "اَفَاَمَّلْتُمْ فَرَاَیْتُمْ اَیَّ شَیْءٍ تَعْبُدُوْنَ" یعنی تم ان کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ لہٰذا تمہارے آباؤ اجداد کی یہ تقلید عبث ہے۔ یا پھر تقدیر عبارت اس طرح ہے "اَفَاَمَّلْتُمْ فَرَاَیْتُمُ الَّذِیْ تَعْبُدُوْنَهٗ شَیْءٍ لَّا یَنْفَعُکُمْ وَلَا یَضُرُّکُمْ کیا تم نے غور و فکر کیا اور اسے دیکھ لیا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ وہ ایسی شے ہے کہ نہ تمہیں نفع پہنچا سکتی ہے اور نہ ضرر۔ اور آباء کا وصف تقدم بیان کرنے میں یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ تقدم صحت پر دلالت نہیں کرتا اور نہ ہی اس سے باطل حق میں تبدیل ہوتا ہے۔

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۷﴾

"پس وہ سب میرے دشمن ہیں[1] سوائے رب العالمین کے [2]"

[1] عَدُوٌّ لِّیْٓ میں نافع، ابو عمرو اور روش نے یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ یعنی اگر تم نے ان کی عبادت کی تو وہ سب میرے دشمن ہیں۔ تو اس میں آپ نے ان کی عداوت کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے تعریض کرنے کے لیے اور یہ شعور دلانے کے لیے کہ بے شک وہ تمہارے دشمن ہیں اس اعتبار سے کہ وہ ان کی عبادت کے سبب اس سے کہیں زیادہ نقصان اٹھا رہے ہیں جتنا نقصان کوئی آدمی اپنے دشمن سے اٹھاتا ہے۔ تو یہ ایک کریم ناصح کا انداز ہے کہ وہ ابتداً اپنی ذات سے کرتا ہے۔ اور کنایہ تصریح کی نسبت زیادہ نفع بخش ہوتا ہے۔ اور اسی کی مثل یہ قول باری تعالیٰ ہے وَمَالِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ "مَالَکُمْ لَا تَعْبُدُوْنَ" تمہیں کیا ہے کہ تم اس کی عبادت نہیں کرتے۔ عداوت کا اطلاق جمادات پر کرنا مجازاً ہے یا تو اس لیے کہ ان کی جہت سے نقصان پہنچتا ہے۔ یا اس اعتبار سے کہ قیامت کے دن امر کی تاویل ان کی طرف ہوگی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وہ دشمن بن جائیں گے۔ سَیَکْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَیَکُوْنُوْنَ عَلَیْهِمْ ضِدًّا اور عَدُوٌّ کو مفرد اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ در حقیقت فعول کے وزن پر مصدر ہے جیسا کہ قَبُوْلٌ۔ یا پھر اس لیے کہ معنی یہ ہے "اِنَّ کُلَّ مَعْبُوْدٍ لَّکُمْ فَهُوَ عَدُوٌّ لِّیْ" کہ تمہارا ہر معبود میرا دشمن ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ عدو اور صدیق کا اطلاق واحد اور جمع پر کرنا جائز ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر وہ صفت جو فعول یا فعیل کے وزن پر ہو وہ اسی طرح استعمال ہوتی ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے رجلٌ عدوٌ اور قَوْمٌ عدوٌ۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَاِنْ کَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّکُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ اور مزید ارشاد فرمایا وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔

[2] یہ استثناء منقطع ہے۔ گویا کہ یہ کہا "فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْ لٰکِنَّ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ وَلِیِّیْ" (بے شک وہ میرے دشمن ہیں لیکن رب العالمین میرا دوست ہے) اور یہ قول بھی ہے کہ بے شک وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ بتوں کی بھی پرستش کرتے تھے تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ ہر وہ جس کی تم عبادت کرتے ہو وہ میرا دشمن ہے سوائے رب العالمین کے۔ یا کہا جائے گا کہ ان کے آباء میں سے وہ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۸﴾

"جس نے مجھے پیدا فرمایا پھر (ہر قدم پر) وہ میری رہنمائی کرتا ہے [1]"

[1] کیونکہ وہ ہر مخلوق کی اس شے کی طرف راہنمائی کرتا ہے جسے اس کے لیے دنیا و آخرت کے امور میں سے پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی اور جس نے ہر شے کا اندازہ مقرر کیا اور اس کی طرف وہ کامل راہنمائی فرمائی جو ایجاد کی ابتدا سے لے کر

اس کی مدت کی انتہاء تک درج ہے وہ اس کے سبب نفع پہنچانے اور ضرر کو دور کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ انسان کی طرف نسبت کے اعتبار سے اس کی ابتداء یہ ہے کہ وہ جنین کی ناف کے ذریعے خون حیض کو چوسنے کی راہنمائی کرتا ہے اور انتہاء جنت کا راستہ اور اس کی لذتیں ہیں۔ اس میں اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر رب العالمین کی صفت ہے یا پھر مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی اصل عبارت ہے "ھو الذی خلقنی" یا یہ مدح کی بناء پر منصوب ہے۔ (یعنی اس سے پہلے اَمدحُ فعل محذوف ہے) اور فاء عاطفہ ہے۔ اور عبارت کا اختلاف خلقت کے مقدم ہونے اور ہدایت کے مسلسل جاری رہنے کی وجہ سے ہے۔ اور تینوں موصولات اس پر معطوف ہیں یا پھر موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہے اور فھو یھدین اس کی خبر ہے۔ اس صورت میں فاء سببیہ ہے۔

وَالَّذِیۡ هُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَیَسۡقِیۡنِ ﴿۷۹﴾

"اور وہ جو مجھے کھلاتا بھی ہے اور مجھے پلاتا بھی ہے [1]"

[1] یہ اس بناء پر مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ کیونکہ اس کا ماقبل کلام اس پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح اس کے بعد آنے والے دونوں اسم موصول بھی ہیں۔ اور ترکیب کی تمام وجوہ کی بناء پر موصول کو اس پر دلالت کرنے کے لیے مکرر لایا گیا ہے کہ اقتضائے حکم کے مطابق ہر صلہ مستقل ہے۔

وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ یَشۡفِیۡنِ ﴿۸۰﴾

"اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے صحت بخشتا ہے [1]"

[1] اس کا عطف "یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ" پر ہے۔ کیونکہ یہ ان کے بعد ہی لاحق ہونے والی ہے۔ کیونکہ صحت اور بیماری اکثر کھانے پینے کے تابع ہوتی ہیں۔ اس میں مرض کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا گیا اس کے باوجود کہ بیماری اور شفاء دونوں ہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ تو ایسا حسن ادب کی رعایت کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔ جیسا کہ خضر نے کہا فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا اور کہا "فَاَرَادَ رَبُّکَ اَنْ یَّبْلُغَا اَشُدَّهُمَا" توڑنے اور دیکھنے کی نسبت اپنی طرف کی کیونکہ انسان کو جو مصیبت پہنچتی ہے وہ اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے۔ اور اس لیے کہ یہاں مقصود نعمتوں کو شمار کرنا ہے اور موت کی نسبت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف کی۔ کیونکہ موت اس اعتبار سے کہ اسے محسوس نہیں کیا جاتا اس میں کوئی ضرر نہیں ہے۔ بے شک ضرر اور تکلیف اس کے مقدمات میں سے ہے۔ اور وہ بیماری ہے کیونکہ موت اہل کمال کے لیے مختلف قسموں کے امتحانوں سے نجات ہوتی ہے۔ اور ان نعمتوں کے حصول تک پہنچاتا ہے جن کے مقابلہ میں وہ دنیوی حیات کو حقیر سمجھتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے "اَلْمَوْتُ جَسْرٌ یُّوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ" (کہ موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست تک پہنچا دیتا ہے) اور حدیث طیبہ میں ہے "مَوْتُ الْفَجَاءَةِ رَاحَةٌ لِّلْمُؤْمِنِ وَاَخْذَةُ الْاَسَفِ لِلْفَاجِرِ" (1) اسے احمد اور بیہقی نے سند حسن کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مرفوع روایت کیا ہے۔ (اچانک موت مومن کے لیے راحت ہوتی ہے اور فاجر کے لیے اس کی گرفت غم اور تکلیف ہوتی ہے۔) اور حدیث میں ہے "اَلْمَوْتُ کَفَّارَةٌ لِّکُلِّ مُسْلِمٍ" (کہ موت ہر مسلم کے لیے کفارہ ہے) اسے ابونعیم نے حلیہ میں اور بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ اور اس لیے کہ اکثر مرض انسان کے کھانے پینے میں غفلت برتنے کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ حقیقۃً بھی اخلاط مزاجوں (سودا، صفرا، بلغم، خون) اور ارکان

1۔ شعب الایمان، جلد 7 صفحہ 255 (العلمیہ)

(عناصر اربعہ) کے درمیان منافاۃ اور منافرت پائی جاتی ہے۔ اور صحت ان دونوں کی اجتماعی حفاظت اور اعتدال پر ہونے کے سبب ہوتی ہے۔ اور یہ اعتدال جبراً عزیز وحکیم کی قدرت کے سبب ہی ہوتا ہے۔

وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ﴿۸۱﴾

"اور وہ جو مجھے مارے گا پھر مجھے زندہ کرے گا"

وَالَّذِیْۤ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴿۸۲﴾

"اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ وہ بخش دے گا میرے لیے میری خطا کو روز جزاء کو لے"

لے یہ یا تو اپنی ذات کے لیے بطور کسر نفسی ذکر کیا یا اپنی امت کی تعلیم کے لیے تاکہ وہ گناہوں سے اجتناب کریں اور ان سے ڈرتے رہیں۔ اور جب ان سے گناہ صادر ہو جائے تو مغفرت طلب کریں یا یہ ترک عزیمت کے عمل سے استغفار ہے اور آپ نے اپنی امت پر شفقت کرتے ہوئے رخصت پر عمل کیا تاکہ اس پر بوجھ اٹھانا مشکل نہ ہو جائے۔ اور خطیئہ ان تین کلمات پر محمول ہے۔ ایک ان کا قول اِنِّیْ سَقِیْمٌ دوسرا بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ اور تیسرا حضرت سارہ کے لیے آپ کا یہ قول "هٰذِهٖ اُخْتِیْ" مجاہد نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حسن نے ان تین سے زائد یہ بھی کہا ہے کہ ستارے کے بارے آپ کا قول هٰذَا رَبِّیْ بھی اس میں شامل ہے(1)۔ لیکن یہ ضعیف ہے۔ کیونکہ یہ تمام کنائے ہیں خطائیں نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔ امام بغویؒ نے مسروق کی سند سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ابن جدعان دور جاہلیت میں صلہ رحمی کرتا تھا اور مساکین کو کھانا کھلاتا تھا۔ کیا وہ اسے نفع دے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ اسے نفع نہیں دے گا اگر اس نے کسی دن بھی یہ نہ کہا ہوگا "رَبِّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ" یہ تمام کے تمام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنی قوم کے خلاف دلائل ہیں اور انہیں یہ احساس دلانا ہے کہ جو ایسا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ الٰہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

رَبِّ هَبْ لِیْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۳﴾

"اے میرے رب! عطا فرما مجھے علم و عمل (میں کمال) لے اور ملا دے مجھے نیک بندوں کے ساتھ ۲ے"

لے اے میرے رب! مجھے علم و عمل میں اس طرح کمال عطا فرما کہ وہ حق کی خلافت اور مخلوق کی خدمت و بھلائی کے لیے کافی ہو۔

۲ے اور مجھے عمل میں کمال عطا فرما یہاں تک کہ میں ان صالحین کے گروہ میں شامل ہو جاؤں جن کے ساتھ فساد کی آمیزش کا امکان نہیں اور وہ انبیاء ہیں جو کہ معصوم ہیں۔

وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۸۴﴾

"اور بنا دے میرے لیے سچی ناموری آئندہ آنے والوں میں لے"

لے اور میرے لیے آئندہ آنے والوں میں ایسی حسین تعریف اور ذکر جمیل بنا دے جو واقع کے مطابق ہو اور ان امتوں میں قبول عام عطا فرما جو میرے بعد آئیں گی۔ اور معنی یہ ہے کہ بعد میں آنے والوں کی زبانیں میری تعریف میں سچ بولنے والی ہوں۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

وَ اجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ ﴿۸۵﴾

''اور بنادے مجھے ان لوگوں سے جو نعمت والی جنت کے وارث ہیں ۱؎ ''

۱؎ اور مجھے ان لوگوں میں سے کردے جو نعمت بھری جنت کے وارث ہیں۔

وَ اغْفِرْ لِاَبِیْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۸۶﴾

''اور بخش دے میرے باپ کو ۱؎ وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے ۲؎ ''

۱؎ ''لِاَبِیْ'' کو نافع، ابو عمرو اور ورش نے یاء مفتوح کے ساتھ باقی قراء نے یاء ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ایمان کی توفیق اور ہدایت عطا فرما کر میرے باپ کی مغفرت فرما۔

۲؎ بے شک وہ راہ حق سے بھٹکنے والوں میں سے ہے۔ آپ کی یہ دعا اس حالت کے ظاہر ہونے سے پہلے کی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے اور ایمان و ہدایت اس کا مقدر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت صرف اس وعدہ کی وجہ سے کی تھی جو آپ نے باپ سے کرلیا تھا لیکن جب ابراہیم پر واضح ہوگیا کہ آپ کا باپ اللہ کا دشمن ہے تو آپ اس سے بیزار ہو گئے۔ یا پھر اس لیے کہ کفار کے لیے استغفار کرنا ممنوع نہیں تھا۔

وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾

''اور نہ شرمسار کرنا مجھے ۱؎ جس روز لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے ۲؎ ''

۱؎ میری کسی لغزش پر سزا دے کر مجھے رسوا نہ کرنا کہ میرا مرتبہ صالحین کے مرتبہ سے کم ہو جائے۔ یہ یا تو اَلْخِزْیُ سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے ذلت و رسوائی یا خَزَایَةٌ سے مشتق ہے اس کا معنی ہے شرم و حیا۔

۲؎ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ میں ضمیر کا مرجع عباد (بندے) ہیں اور وہ پہلے ہی معلوم ہیں۔ یا اس کا مرجع الضالین ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ان سے پوچھا گیا تم نے رسول اللہ ﷺ سے نجویٰ (سرگوشی) کے بارے کیا سنا ہے تو انہوں نے کہا آپ فرماتے تھے تم میں سے کوئی شخص اپنے رب کے اتنا قریب ہوگا یہاں تک کہ اس پر اس کا سایہ لطف و رحمت پڑنے لگے گا تو رب کریم اسے فرمائے گا۔ کیا تو نے فلاں فلاں عمل کیا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا جی ہاں۔ پھر وہ یہی فرمائے گا اور اس کی جانب سے یہی جواب ہوگا۔ پھر رب کریم فرمائے گا بے شک میں نے دنیا میں تیرے لیے اس پر پردہ ڈالے رکھا ہے اور آج کے دن میں اسے تیرے لیے بخش دوں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے نیکیوں کی کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں عطا کرے گا۔ لیکن کافر اور منافق کے بارے یہ اعلان کیا جائے گا هٰۤؤُلَآءِ الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا۔ خبردار آگاہ رہو! ان ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔ (1)

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾

''جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے''

إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٨٩﴾

”مگر وہ شخص جو لے آیا اللہ تعالیٰ کے حضور قلب سلیم ۱؎ “

۱؎ یعنی جو ایسا دل لے کر آیا جو شرک اور شک سے محفوظ ہو۔ کیونکہ گناہ سے تو کوئی بھی محفوظ نہیں ہوتا۔ علامہ بغویؒ نے کہا یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ حضرت سعید بن جبیرؓ نے کہا قلب سلیم مومن کا دل ہوتا ہے اور کافر و منافق کا دل مریض ہوتا ہے۔ ابوعثمان نیشاپوری نے کہا ہے قلب سلیم سے مراد وہ دل ہے جو بدعت سے خالی ہو اور سنت کے ساتھ مطمئن ہو(1) یعنی اهل السنة و الجماعة۔ معنی یہ ہوگا کہ مال اور بیٹے سوائے مؤمن کے کسی کو نفع نہیں دیں گے۔ لہٰذا اس صورت میں مستثنیٰ مفرغ محل نصب میں ہوگا۔ یا معنی یہ ہوگا کہ مال اور اولاد نفع نہیں دیں گے مگر مومن کا مال اور اولاد نفع دیں گے۔ تو اس صورت میں مستثنیٰ بدل ہونے کی صورت میں محل رفع میں ہوگا۔ نتیجہ کلام یہ ہے کہ کافر اگرچہ صلہ رحمی اور مساکین کو کھانا کھلانے میں اپنا مال خرچ کرتا بھی رہے تب بھی وہ اس کے لیے اسلام قبول نہ کرنے کے سبب نفع بخش نہیں ہوگا۔ یہی کیفیت بیٹوں اولاد کی بھی ہے۔ کہ اگر چہ وہ صلحا اور انبیاء ہی کیوں نہ ہو وہ شفاعت اور استغفار کے سبب اپنے آباء کو نفع نہیں پہنچا سکیں گے۔ اس لیے رب کریم نے مشرکین کے لیے استغفار کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ نبی علیہ السلام اور مومنین کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکوں کے لیے دعائے مغفرت کریں خواہ وہ ان کے قرابت دار ہی ہوں۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے باپ آزر کو ملیں گے اس حال میں کہ اس کا چہرہ گرد و غبار سے اٹا ہوگا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اسے فرمائیں گے کیا میں نے تجھے یہ نہیں کہا تھا کہ تو میری نافرمانی نہ کر۔ تو وہ آپ علیہ السلام سے کہے گا آج کے دن میں تمہاری نافرمانی نہیں کروں گا۔ تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام رب کریم کے حضور التجا کریں گے اے میرے رب! بے شک تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو مجھے شرمسار نہیں کرے گا جس دن لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ تو میرے اس باپ کی رسوائی سے بڑھ کر اور کون سی بات میرے لیے باعث شرم ہوسکتی ہے۔ مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ بے شک میں نے کافروں پر جنت کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر کہا جائے گا اے ابراہیم! اس شے کی جانب دیکھیے جو آپ کے پاؤں کے نیچے ہے۔ پس آپ دیکھیں گے تو اچانک (ذیخ متلطخ) گندگی میں لتھڑا ہوا ایک جانور (بجو یا گوہ) پائیں گے پس اسے ٹانگوں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا(2) اور وہ اس دن اس سے بری ہو جائیں گے۔ انتہی۔ لیکن مومن کا وہ مال اسے نفع دے گا جو اس نے اطاعت (نیکی کے کاموں) میں خرچ کیا اور اس کی اولاد شفاعت و استغفار کے سبب اسے نفع پہنچائے گی اور یہ قول بھی ہے۔ کہ استثناء منقطع ہے۔ اور معنی یہ ہوگا لیکن اس کی سلامتی جو قلب سلیم لے کر آیا اسے نفع پہنچائے گی۔

وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٩٠﴾

”اور قریب کر دی جائے گی جنت پرہیز گاروں کے لیے ۱؎ “

۱؎ اور جنت متقی لوگوں کے قریب کر دی جائے گی اس اعتبار سے کہ وہ اسے موقف سے ہی دیکھ لیں گے۔ پس وہ اپنے اٹھائے جانے پر خوشی اور مسرت کا اظہار کریں گے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　　2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 473 (وزارت تعلیم)

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۱﴾

"اور ظاہر کر دی جائے گی دوزخ بہکنے والوں کے لیے ۱؎"

۱؎ اور بہکنے والوں کے لیے جہنم ظاہر کر دی جائے گی اور وہ اسے بالکل ظاہر دیکھ لیں گے۔ اور وہ یہ جان لیں گے کہ انہیں اس کی طرف ہانک کر لایا جائے گا۔ علامہ بیضاویؒ نے فرمایا کہ دونوں قولوں میں لفظ کا اختلاف جانب وعدہ کی ترجیح کے لیے ہے۔

وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾

"اور کہا جائے گا انہیں ۱؎ کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم پوجا کرتے تھے ۲؎"

۱؎ اور ان بہکنے والوں کو کہا جائے گا۔

۲؎ کہاں ہیں جن کی تم عبادت کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی شفاعت کی امید رکھتے تھے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾

"اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ۱؎ کیا وہ تمہاری (کچھ) مدد کر سکتے ہیں ۲؎ یا انتقام لے سکتے ہیں ۳؎"

۱؎ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ضمیر منصوب سے حال ہے۔

۲؎ یہ استفہام انکار اور توبیخ کے لیے ہے۔ یعنی کیا وہ تمہیں عذاب سے بچا لیں گے۔

۳؎ یا وہ عذاب کو اپنے نفسوں سے دور کر سکیں گے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ اور جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے ہیں وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔

فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾

"پس اوندھے پھینک دیے جائیں گے ۱؎ اس میں وہ ۲؎ اور دوسرے گمراہ ۳؎"

۱؎ علامہ بغویؒ نے فرمایا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس کا معنی ہے انہیں اس میں جمع کیا جائے گا۔ مجاہد نے کہا انہیں دوزخ کے گڑھے میں پھینکا جائے گا۔ مقاتل نے کہا انہیں ڈالا جائے گا، زجاج نے کہا ان میں سے بعض کو بعض پر پھینکا جائے گا۔ اور قتیبی نے کہا ہے کہ انہیں سروں کے بل اس میں ڈالا جائے گا(1)۔ قاموس میں ہے کہ کَبَّہٗ کا معنی ہے قَلَّبہٗ و صَرَّعَہٗ جیسے اکبّہ و کبکبہ فاکب اور یہ لازم ہے(2) یعنی کبّ اور کبکب ایک ہی معنی میں ہیں۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا کہ کبکب کا لفظ معنی کے تکرار کے لیے آتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جنہیں دوزخ میں ڈالا جائے گا وہ باری باری گرتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ اس کی اتھاہ گہرائی میں پہنچ جائیں گے۔

۲؎ یعنی معبودان باطلہ۔

۳؎ اور ان کی عبادت کرنے والے۔

وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۵﴾

1۔ تفسیر [illegible] 2۔ [illegible] جلد 1 صفحہ 218 [illegible]

''اور ابلیس کی ۱؎ ساری فوجیں ۲؎ ''

۱؎ اور جن وانس میں سے جو نافرمان شیطان کے متبعین ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد شیطان کی ذریت (اولاد) ہے۔
۲؎ اَجْمَعُوْنَ یہ جنود کی تاکید کے لیے ہے۔ اگر اسے مبتدا بنا کر اس کے مابعد کو خبر بنایا جائے۔ یا یہ کبکبوا کی ضمیر مرفوع کے لیے تاکید ہے جب کہ اسے اس پر معطوف کیا جائے۔

قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾

''وہ کہیں گے ۱؎ اس حال میں کہ وہ دوزخ میں باہم جھگڑ رہے ہوں گے ۲؎ ''

۱؎ یعنی شیاطین کی پوجا کرنے والے اور معبودان باطلہ کہیں گے
۲؎ قَالُوْا کی ضمیر فاعل سے حال ہے اور ضمیر مرفوع منفصل پوجا کرنے والوں اور ان کے معبودوں تمام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ بتوں کو قوت گویائی عطا فرمائے گا پس وہ اپنی پوجا کرنے والوں سے جھگڑا کریں گے۔

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾

''خدا کی قسم! ہم کھلی گمراہی میں گرفتار تھے ۱؎ ''

۱؎ اس میں ''اِنْ'' مخففه عن المثقله ہے اور لام اِنْ نافیہ اور اِنْ مخففه کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے۔ اور جملہ قَالُوْا کا مقولہ ہے۔

اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾

''جب ہم تمہیں ۱؎ رب العالمین کے برابر بنائے ہوئے تھے ۲؎ ''

۱؎ اے معبودو! جب ہم تمہیں استحقاق عبادت میں رب العالمین کے برابر بنائے ہوئے تھے۔
۲؎ اس میں اِذْ نُسَوِّيْكُمْ ظرف ''كُنَّا'' کے متعلق ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر منفصل اور جس کی طرف وہ لوٹ رہی ہے وہ پوجا کرنے والوں کی طرف راجع ہو۔ پس بتوں میں جھگڑنے کی صلاحیت نہ ہونے کی بناء پر یہ کہنا کافی ہے۔ اور بتوں کو خطاب کرنے کا مدعیٰ اور فائدہ حسرت اور ندامت میں مبالغہ کا اظہار ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ بے شک وہ ضلالت وگمراہی میں اپنے انہماک کے سبب ہی مبداضلالت میں جھگڑ رہے ہیں پس وہ اس پر بہت زیادہ افسوس کریں گے۔

وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۹۹﴾

''اور نہیں گمراہ کیا ہمیں مگر (ان نامی) مجرموں نے ۱؎ ''

۱؎ مقاتل نے کہا ہے کہ مجرموں سے مراد شیاطین ہیں۔ اور کلبی نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پہلے لوگ ہیں جن کی انہوں نے اقتدا کی۔ (1)

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

''تو (آج) نہیں ہے ہمارا کوئی سفارشی ۱؎ ''

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

۱؎ آج ہمارے لیے کوئی سفارش کرنے والا نہیں ہے جیسا کہ مؤمنین کے لیے سفارش کرنے والے انبیاءؑ، ملائکہ اور ان کے صالحین بھائی ہیں۔

وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ ﴿۱۰۱﴾

''اور نہ کوئی غم خوار ۱؎ دوست ۲؎ ''

۱؎ اور نہ کوئی دوست ہے۔ صدیق کا معنی ہے جو محبت و مودت میں سچا ہو۔ پھر اس میں شافع کی جمع ذکر کی گئی ہے اور صدیق کو واحد۔ تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عادۃً سفارش کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور دوستوں کی کم۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک دوست اس سے کہیں زیادہ کوشش کرتا ہے جتنی بہت سے سفارش کرنے والے کرتے ہیں۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ لفظ صدیق جمع پر صادق آنے میں عدد کی مثل ہے۔ جیسا کہ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ فعولٌ اور فَعِيلٌ کے وزن کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل میں مصدر ہے۔ جیسا کہ جنین اور صہیل وغیرہ۔

۲؎ حَمِيمٍ کا معنی ہے قَرِيبٌ (قرب رکھنے والا غم خوار) قاموس میں ہے کہ حمیم امیر کی طرح ہے۔ اور اس کا معنی ''القریب'' ہے۔ اس کی جمع ''احماء'' آتی ہے۔ اور کبھی حمیم ہی جمع اور مؤنث کے لیے استعمال ہوتا ہے(1)۔ ان کا اس سے مقصود یہ ہے کہ بے شک ہمارے لیے نہ کوئی دوست ہے اور نہ قریبی جو ہماری سفارش کرے۔ کیونکہ اس دن متقین کے سوا تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ۔ علامہ بغویؒ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ بے شک جنت میں ایک آدمی کہے گا میرے فلاں دوست سے کیا کیا گیا درآنحالیکہ اس کا دوست جہنم میں ہوگا تو اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس کے لیے اس کے دوست کو جنت میں داخل کر دو۔ تو جو وہاں باقی رہ جائیں گے وہ کہیں گے ''فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ'' اصل عربی الفاظ اس طرح ہیں (عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَقُوْلُ فِي الْجَنَّةِ مَافَعَلَ صَدِيْقِيْ فُلَانٌ وَصَدِيْقُهٗ فِي الْجَحِيْمِ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَخْرِجُوْا لَهٗ صَدِيْقَهٗ اِلَى الْجَنَّةِ فَيَقُوْلُ مَنْ بَقِيَ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ)(2) حسن نے کہا ہے کہ مؤمنین میں سے کثرت سے دوست بناؤ کیونکہ ان کے لیے قیامت کے دن شفاعت کرنے کا اختیار ہوگا۔

فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

''پس اگر ہمارے اختیار میں ہوتا ۱؎ (دنیا میں) واپس جانا تو ہم اہل ایمان سے ہوتے ۲؎ ''

۱؎ اس میں دنیا کی طرف واپس لوٹنے کی تمنا اور آرزو کا تذکرہ ہے۔ اس میں لَوْ لَيْتَ کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ کیونکہ وہ دونوں تقدیر معنی میں مشترک ہیں۔ یا پھر لَوْ شرطیہ ہے اور اس کا جواب شرط محذوف ہے۔ اور وہ ہے ''لَكَانَ خَيْرًا''

۲؎ فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ تمنی کا جواب ہے یا پھر کرۃ پر معطوف ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

1۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1446 (التراث العربی)　　2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

"بے شک اس واقعہ میں لے (عبرت کی) نشانی ہے ۲ اور نہیں تھے ان میں اکثر لوگ ایمان لانے والے"

لے بے شک جو کچھ ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں بیان کیا گیا ہے۔

۲ اس میں اس کے لیے واضح حجت موجود ہے جو اس سے بصیرت اور عبرت حاصل کرنا چاہے کیونکہ اسے انتہائی موزوں ترتیب اور حسین انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس میں غور وفکر کرنے والا اپنے علم کی قوت کے ساتھ اسے سمجھ سکتا ہے کیونکہ اس میں علوم دینیہ کے اصول کی طرف اشارہ بھی ہے اور اس کے دلائل پر آگاہی بھی، قوم کو آپ کی دعوت دینے کے حسین انداز کا تذکرہ بھی ہے اور آپ کی ان کے ساتھ حسن مخالفت کا ذکر بھی، آپ کی ان پر کمال شفقت کا ذکر بھی ہے اور امر واقعہ کی تصویر بھی اور وعدے اور وعید کا اطلاق علی سبیل الحکایہ اس طرف اشارہ کرنے اور اس پر آگاہ کرنے کے لیے ہے تاکہ وہ ان کو سننے اور قبول کرنے کی طرف زیادہ دعوت دے۔ اور اس میں حضور نبی کریم ﷺ کے دعویٰ کی صداقت پر بھی واضح دلیل ہے۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٤﴾

"اور (اے حبیب!) بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب لے ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۲"

لے تاکہ وہ اس کے ساتھ ایمان لائیں یا ان کی اولاد میں سے کوئی۔ اور مومنین پر انعام فرمانے والا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٠٥﴾

"جھٹلایا قوم نوح نے (اللہ کے) رسولوں کو لے"

لے لفظ القوم مؤنث ہے۔ اسی لیے اس کی تصغیر قُوَيْمَةٌ آتی ہے۔ اَلْمُرْسَلِيْنَ صیغہ جمع ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مراد جنس ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ يَرْكَبُ فُلَانٌ الْخَيْلَ۔ اگرچہ اس کے پاس صرف ایک گھوڑا ہو۔ یا پھر اس لیے جمع لایا گیا ہے کیونکہ وہ رسولوں کی بعثت کا انکار کرتے تھے۔ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ بے شک انہیں کہا گیا اے ابوسعید! اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے تمہاری کیا رائے ہے: "كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِيْنَ، كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِيْنَ، كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ" جبکہ ان کی طرف ایک رسول بھیجا گیا؟ تو انہوں نے کہا کہ بے شک دوسرا رسول وہی لے کر آیا جو پہلا رسول لایا تھا تو جب انہوں نے ایک کو جھٹلا دیا تو یہ ایسا ہی ہے گویا کہ انہوں نے تمام رسل کو جھٹلا دیا۔(1)

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٠٦﴾

"جب کہا انہیں ان کے بھائی نوح لے نے کیا تم ڈرتے نہیں ہو ۲"

لے جب ان کے بھائی نوح نے انہیں کہا۔ جو ان کے نسبی بھائی تھے نہ کہ دینی "نُوْحٌ" اخوہم سے عطف بیان ہے۔

۲ کیا تم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے ہو کہ تم اس کے سوا غیر کی عبادت چھوڑ دو۔

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٠٧﴾

"بے شک میں تمہارے لیے لے رسول ۲ امین ہوں ۳"

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

۱؎ بے شک میں اسی شے کی طرف تمہاری راہنمائی کرنے والا ہوں جو تمہارے لیے بہتر ہے۔
۲؎ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہوں۔
۳؎ اس کی وحی کا امین ہوں اور تمہارے درمیان صدق وامانت کے اعتبار سے مشہور ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٠٨﴾

''پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو ۱؎ اور میری فرمانبرداری کرو ۲؎۔''

۱؎ پس اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچو۔
۲؎ اور ان امور میں میری پیروی کرو جن کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں، یعنی توحید اور اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کی عبادت وغیرہ۔

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٩﴾

''اور میں نہیں طلب کرتا تم سے ۱؎ اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت ۲؎ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے ۳؎''

۱؎ اور میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے اور نصیحت کرنے کے عوض تم سے کوئی اجرت طلب نہیں کرتا۔
۲؎ کہ تم مجھے اس تبلیغ میں کسی طمع یا لالچ کے ساتھ متہم کرو۔ ''اِنْ اَجْرِيَ'' کو نافع، ابن عامر، ابو عمرو اور حفص نے یاء مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یاء ساکن کے ساتھ۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١١٠﴾

''پس تم ڈرو اللہ سے اور میری پیروی کرو ۱؎''

۱؎ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ کو مکرر ذکر فرمایا تاکید کے لیے اور اس پر مطلع کرنے کے لیے ہے کہ ان کی امانت اور عدم طمع (لالچ نہ ہونا) میں سے ہر ایک ان امور میں ان کی اطاعت واجب ہونے پر مستقلاً دلالت کرتا ہے جن کی طرف وہ انہیں دعوت دیتے ہیں تو جب یہ دونوں وصف جمع ہو جائیں تو پھر مرتبہ کیسا ہوگا؟

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿١١١﴾

''انہوں نے کہا ۱؎ کیا ہم (قوم کے رئیس) ایمان لائیں تجھ پر ۲؎ حالانکہ تمہاری پیروی صرف گھٹیا لوگ کر رہے ہیں ۳؎''

۱؎ تو اس پر آپ کی قوم نے انکار کرتے ہوئے کہا کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں حالانکہ صرف گھٹیا لوگ تمہاری پیروی کر رہے ہیں۔
۲؎ وَاتَّبَعَكَ ترکیب کلام میں حال ہے اور اس سے قبل قَدْ مقدر ہے۔ یعقوب نے اَتْبَاعُكَ پڑھا ہے جو کہ تابع کی جمع ہے۔ جیسے شاهِدٌ اور اَشْهَادٌ ہے۔ یا پھر یہ تبع کی جمع ہے جیسے بطل کی جمع ابطال ہے۔
۳؎ الْاَرْذَلُوْنَ ارذل کی جمع سالم ہے۔ اور ارذل اعور کے وزن پر ہے۔ قاموس میں ہے کہ اس کا معنی ہے انتہائی گھٹیا اور خسیس۔ (1) علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جو جاہ ومرتبہ اور مال ومنال میں انتہائی کمزور ہو۔ بغوی نے کہا انتہائی نچلے درجے کا آدمی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ کہ اس کا معنی ہے زرگری کا پیشہ اپنانے والا۔ عکرمہ نے کہا ہے کپڑا بننے اور موچی کا پیشہ اپنانے والا (2) اور یہ دنیوی ساز وسامان کے بارے ان کی انتہائی کم عقلی اور کمزور رائے ہے کہ انہوں نے کم ساز وسامان رکھنے والوں کی اتباع

کو اپنی اتباع اور اس کے ساتھ اپنے ایمان کے مانع قرار دیا جس کی طرف وہ انہیں بلاتے تھے۔ اور اس کے بطلان پر دلیل بنایا۔ اور اس طرف اشارہ کیا کہ ان کے متبعین اہل نظر و بصیرت نہیں۔ کیونکہ وہ مال و منال اور بلندی مرتبہ کی توقع رکھتے ہیں۔

قَالَ وَمَا عِلْمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١١٢﴾

''آپ نے فرمایا[1] مجھے کیا خبر کہ وہ کس نیت سے ایمان لائے ہیں[2]''

[1] حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا

[2] میں یہ نہیں جانتا کہ وہ یہ اتباع کیوں کرتے ہیں کیا خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے یا دنیا میں رفعت و بلندی حاصل کرنے کے لیے؟ میں تو صرف ظاہر کا اعتبار کرتا ہوں۔

إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّي ۖ لَوْ تَشْعُرُونَ ﴿١١٣﴾

''ان کا حساب[1] تو میرے رب کے ذمہ ہے[2] اگر تمہیں (حقیقت کا) شعور ہے[3]''

[1] ان کے باطن کا حساب۔

[2] اس پر صرف میرا رب مطلع ہے۔

[3] اگر تم اس کے ادراک کا شعور رکھتے ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حق کا ادراک کرنے سے تمہاری عقلوں کو بانجھ اور تمہاری آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اگر تم جانتے ہوتے تو تم ان کے پیشوں کی وجہ سے انہیں ذلیل نہ سمجھتے۔ زجاج نے کہا ہے دین کے لیے پیشے ضرر رساں نہیں ہوتے۔(1)

وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٤﴾

''اور نہیں ہوں میں دور بھگانے والا (غریب و مسکین) مومنوں کو[1]''

[1] اور میں مومنوں کو دور بھگانے والا نہیں ہوں۔ "وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ" ان کے قول سے مومنین کو بھگانے کی استدعاء کا جو وہم ہوتا ہے اس کا جواب ہے۔

إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿١١٥﴾

''نہیں ہوں میں مگر (عذاب سے) صاف صاف ڈرانے والا[1]''

[1] إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ یہ نہ بھگانے کی علت ہے۔ یعنی میں تو صرف لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے، انہیں کفر و معصیت سے روکنے اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کے لیے بھیجا گیا ہوں چاہے وہ شرفاء ہوں یا گھٹیا قسم کے لوگ ہوں۔ میرے لیے یہ کیسے جائز ہے کہ میں اغنیاء کی اتباع حاصل کرنے کے لیے فقراء کو بھگا دوں۔ کیونکہ میرے ذمہ تو صرف تمہیں ڈرانا ہے۔ ضحاک نے کہا ہے کہ ایسا ڈرانا جو واضح دلیل کے ساتھ ہو۔ لہٰذا میں تمہاری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہیں بھگا نہیں سکتا۔(2)

قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ﴿١١٦﴾

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔ 2۔ تفسیر بیضاوی زیر آیت ہذا

"ان (مغروروں) نے کہا اے نوح ۱؎ اگر تم باز نہ آئے (تو یاد رکھو) تمہیں ضرور سنگسار کر دیا جائے گا ۲؎"

۱؎ انہوں نے کہا اے نوح! اگر تم باز نہ آئے اس سے جو ہم کہتے ہیں۔

۲؎ تو تمہیں ضرور اسی طرح برا بھلا کہا جائے گا (یعنی گالی گلوچ دی جائیں گی)۔ضحاک نے کہا ہے اس کا معنی ہے تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔ مقاتل اور کلبی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔(1)

قَالَ رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ﴿١١٧﴾

"آپ نے عرض کی میرے مالک! میری قوم نے تو مجھے جھٹلا دیا ہے ۱؎"

۱؎ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ اس شے کا اظہار ہے جس کے سبب آپ نے ان کے خلاف بددعا کی۔ اور وہ ہے ان کا حق کو جھٹلانا نہ کہ ان کا آپ کو خوفزدہ کرنا اور آپ کو حقیر سمجھنا۔

فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَنَجِّنِي وَمَن مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٨﴾

"پس تو فیصلہ فرما دے میرے اور ان کے درمیان ۱؎ جو قطعی ہو اور (اپنے عذاب سے) نجات دے مجھے اور جو میرے ساتھ ہیں ۲؎ اہل ایمان سے ۳؎"

۱؎ فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا یہ فتاحۃ سے ماخوذ ہے۔(تو میرے اور ان کے درمیان قطعی فیصلہ فرما دے)

۲؎ وَنَجِّنِي وَمَن مَّعِيَ کو ورش اور حفص نے یاء مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء ساکن کے ساتھ۔

۳؎ اور تو مجھے نجات عطا فرما اور میرے ان ساتھیوں کو جو ایمان لانے والے ہیں اپنے ارادے سے یا اپنے پیشے کے ادنیٰ ہونے کے سبب۔

فَأَنجَيْنَاهُ وَمَن مَّعَهُ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿١١٩﴾

"پس ہم نے نجات دی انہیں اور جو آپ کے ہمراہ اس کشتی میں تھے جو کھچا کھچ بھری ہوئی تھی ۱؎"

۱؎ ہم نے آپ کو اور آپ کے ہمراہ کشتی میں سوار لوگوں کو نجات دی جن سے کشتی بھری ہوئی تھی۔

ثُمَّ أَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبَاقِينَ ﴿١٢٠﴾

"پھر ہم نے غرق کر دیا اس کے بعد ۱؎ پیچھے رہ جانے والوں کو ۲؎"

۱؎ پھر آپ کو اور مومنین کو نجات دینے کے بعد ہم نے۔

۲؎ آپ کی قوم کے پیچھے رہ جانے والے افراد کو غرق کر دیا جو کہ کافر تھے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٢١﴾

"یقیناً اس واقعہ میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے ۱؎"

۱؎ بے شک اس واقعہ میں بھی ایک نشانی ہے جو عام ہے اور متواتر ہے۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٢﴾

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

''اور بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

كَذَّبَتْ عَادُ ࣙالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

''جھٹلایا عاد نے (اپنے) رسولوں کو ۱''

۱۔ یہاں عاد قبیلہ کے اعتبار سے فعل مؤنث ذکر کیا گیا ہے اور عاد دراصل ان کے جد اعلیٰ کا نام ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

''جب فرمایا انہیں اُن کے بھائی ہود (علیہ السلام) ۱ نے کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے ۲''

۱۔ جب انہیں ان کے بھائی نے کہا۔ جو ان کے نسبی بھائی تھے نہ کہ دینی۔

۲۔ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ (یعنی ہود علیہ السلام) نے انہیں فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں ڈرتے کہ تم اس سے بچنے کے لیے توحید قبول کر لو اور شرک چھوڑ دو۔

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۲۵﴾

''بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں ۱''

۱۔ بے شک میں رسالت کا امین ہوں۔ کلبی نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ میں رسالت سے قبل تمہارے درمیان امین تھا(1)، یعنی تم جب اس سے پہلے مجھے متہم نہیں کرتے تھے تو آج تم کیوں متہم کرتے ہو؟

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾

''پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ۱''

وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

''اور میں نہیں طلب کرتا تم سے اس (خدمت) کا کوئی صلہ ۱ میرا اجر تو اس پر ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے ۲''

۱۔ نافع، ابن عامر، ابو عمرو اور حفص نے اَجْرِیَ کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ۔

۲۔ کیونکہ فرائض رسالت کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔ لہٰذا اس کا اجر بھی اسی کے ذمہ ہے (میں تم سے اس خدمت کا کوئی صلہ طلب نہیں کرتا)۔

مسئلہ: اطاعت و فرمانبرداری پر اجرت لینا جائز نہیں ورنہ وہ اطاعت اطاعت الٰہی نہیں ہوگی اور نہ وہ اللہ تعالیٰ سے اجر کا مستحق ہوگا۔

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

''کیا تم تعمیر کرتے ہو ہر اونچے مقام پر ۱ ایک یادگار ۲ بے فائدہ ۳''

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

۱؎ یہ استفہام توبیخ یا تقریر کے لیے ہے۔ اور کل رِیْع میں استغراق غیر حقیقی ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ کثیر ہے جس میں کثرت حقیقی ہو نہ کہ کثرت اضافی۔ والبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ کل ریع سے مراد ہر بلند جگہ ہے۔ اور رِیْعُ الْاَرض سے مراد زمین کا بلند مقام ہے۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر راستہ ہے۔ عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی معنی روایت کیا ہے۔ اور مجاہد سے منقول ہے کہ اس سے مراد دو پہاڑوں کے درمیان سے گزرنے والا راستہ ہے۔ اور ان سے یہ بھی روایت ہے کہ اس سے مراد منظر ہے(1)۔ اور قاموس میں ہے۔ اَلرِّیْعُ راء کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ اس کا معنی ہے زمین کی بلند جگہ، یا پہاڑ میں کھلا راستہ یا بلند پہاڑ یا ہر بلند مقام سے وادی کے بہنے کی جگہ۔ اور اگر بالکسر ہو تو اس کا معنی گرجا اور کبوتروں کا برج ہے۔(2)

۲؎ "اٰیَۃً" سے مراد ایسی علامت اور نشانی ہے جو یادگار رہو

۳؎ اور "تَعْبَثُوْنَ" اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم ایسے کام کر رہے ہو جو آخرت میں تمہارے لیے فائدہ مند نہیں بلکہ دنیا میں بھی مفید نہیں۔ یا آیۃ کا معنی ہے جو گزرنے والے مسافروں کے لیے علامت ہو۔ تو تمہارا انہیں تعمیر کرنا بے فائدہ ہے کیونکہ مسافر تو اپنے سفروں کے دوران ستاروں سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ ان کے محتاج نہیں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بلند جگہوں پر عمارتیں بناتے تھے تاکہ وہ راستے سے گزرنے والے مسافروں اور جماعتوں پر اوپر سے جھانکیں۔ پھر وہ ان سے تمسخر کرتے تھے اور ان سے لایعنی حرکات کا ارتکاب کرتے تھے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد کبوتروں کے برج ہیں۔ تو حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں یہ بنانے سے منع کیا۔ اس معنی کی دلیل تعبثون ہے۔ اس کا معنی "تَلْعَبُوْنَ" کیونکہ وہ کبوتروں سے کھیلتے تھے(3)۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہی ہے کہ وہ محلات، بروج اور قلعے تعمیر کرتے تھے جو کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ سطح زمین پر باقی رہتے تھے۔ تو یہ بنانے والے کے لیے یادگار علامت ہوتی تھی۔ جیسا کہ اہل دنیا کا طریقہ ہے۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی دلالت کرتا ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ اور یہ سب کچھ بے فائدہ تھا تو حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں اس سے منع کیا۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس طرح اس سے منع فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی ذلت و شر کا ارادہ فرماتا ہے۔ تو وہ اسے اینٹوں اور گارے میں محصور کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ عمارتیں بناتا رہتا ہے(4)۔ اسے طبرانی نے سند جید کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور الاوسط میں ابوالبشر انصاری کی حدیث سے اس طرح روایت کیا ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے بارے ذلت و رسوائی کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کا مال عمارتوں میں خرچ کرا دیتا ہے۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا ہر عمارت اپنے مالک کے لیے وبال ہے مگر وہ جو اس طرح ہو اور آپ نے ہتھیلی کے ساتھ اس کا اشارہ کیا۔ اسے طبرانی نے سند حسن کے ساتھ واثلہ بن اسقع سے روایت کیا ہے۔(5)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور ہم بھی آپ کے ساتھ تھے تو آپ نے ایک بلند و بالا قبہ دیکھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ کس کا ہے؟ تو صحابہ کرام نے عرض کی یہ فلاں انصاری کا ہے۔ یہ سن کر آپ خاموش ہو گئے اور اپنے ہی دل میں اسے برداشت کر لیا۔ حتیٰ کہ جب اس کا مالک رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور لوگوں کے درمیان آپ ﷺ پر سلام عرض کیا۔ تو آپ ﷺ نے اس سے اعراض کر لیا۔ جب بار بار آپ ﷺ نے ایسا کیا۔ تو وہ آدمی

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　　2۔ القاموس المحیط، جلد 2972 (التراث العربی)

آپ ﷺ کے غصہ اور اعراض کو جان گیا۔ تو اس نے اس کا اظہار آپ ﷺ کے صحابہ کرام سے کیا اور کہا قسم بخدا رسول اللہ ﷺ ناراض ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ تو انہوں نے اسے بتایا کہ آپ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور تیری قبہ نما عمارت کو دیکھا۔ چنانچہ وہ آدمی اپنے قبہ کی طرف واپس لوٹا اور اسے مکمل طور پر گرا کر زمین کے ساتھ برابر کر دیا۔ پھر ایک دن رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے تو آپ نے اسے نہ دیکھا، تو فرمایا قبہ کو کیا ہوا ہے؟ صحابہ نے عرض کی اس کے مالک نے ہمیں بتایا کہ آپ نے اس سے اعراض برتا ہے۔ تو پھر ہم نے اسے اس کے بارے آگاہ کر دیا۔ چنانچہ اس نے اسے گرا دیا۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا بے شک ہر عمارت اپنے مالک پر وبال ہوگی مگر جو ضروری ہو مگر جو ضروری ہو۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔(1)

امام احمدؒ اور ابن ماجہؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک قیامت کے دن ہر عمارت اپنے مالک پر وبال ہوگی مگر وہ جو مسجد ہو یا رہائشی گھر ہو۔ اور جو کچھ میں نے ذکر کیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے۔

وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

''اور اپنی رہائش کے لیے بناتے ہو مضبوط محلات [1] اس امید پر کہ تم ہمیشہ رہو گے [2]''

[1] وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ اس میں مَصَانِعَ سے مراد پانی کے تالاب، پختہ محلات اور مضبوط قلعے ہیں۔ اس کا عطف تَبْنُوْنَ پر ہے۔

[2] گویا کہ تم امید رکھتے ہو کہ تم اس میں ہمیشہ باقی رہو گے۔ لہٰذا تم ان کی عمارتیں پختہ بناتے ہو۔

مسئلہ:۔ لمبی آرزو مکروہ ہوتی ہے اور چھوٹی آرزو مستحب ہوتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے جسم کو پکڑا اور فرمایا تو دنیا میں اس طرح رہ گویا کہ تو غریب الوطن ہے یا راہ چلنے والا مسافر ہے اور اپنے آپ کو اصحاب قبور میں سے شمار کر۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس سے گزرے تو میں اور میری ماں کسی شے کو مٹی کا لیپ کر رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا اے عبداللہ! یہ کیا ہے۔ تو میں نے عرض کی اس شے کی اصلاح کر رہے ہیں (یعنی اس کی مرمت کر کے اسے سنوار رہے ہیں)۔ تو یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا حکم اس سے کہیں زیادہ تیز ہے(3) (یعنی موت اس سے بھی قریب ہے۔ مترجم)۔ اسے احمدؒ اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔ اور کہا یہ حدیث غریب ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بچا ہوا پانی بہا دیا کرتے تھے اور بعد از اں سفر میں مٹی سے تیمم کرتے تھے۔ میں عرض کرتا یا رسول اللہ ﷺ! بیشک پانی تو آپ کے قریب ہے تو آپ ﷺ فرماتے میں نہیں جانتا۔ شاید میں اس تک نہ پہنچ پاؤں(4)۔ اسے علامہ بغوی نے شرح السنہ میں اور علامہ ابن جوزی نے کتاب الوفاء میں نقل کیا ہے۔

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

''اور جب تم کسی پر گرفت کرتے ہو تو بڑے ظالم و بیدرد بن کر گرفت کرتے ہو [1]''

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 355 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 949 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 354 (وزارت تعلیم)
4۔ مصابیح السنۃ، جلد 2 صفحہ 313 (العلمیہ)

1 جب تم پکڑتے ہو تو انتہائی سخت عذاب دینے کے لیے۔ یہ ظرف بطشتم کے متعلق ہے۔ اور "بَطَشْتُمْ" تَبْنُوْنَ پر معطوف ہے۔ "جَبَّارِیْنَ" کا معنی ہے بغیر کسی نرمی کے بغیر حق کے قتل کرنے والے۔ اور قاموس میں ہے کہ جبار کا معنی ہے تکبر کرنے والا، ایسا دل جس میں رحمت و نرمی نہ ہو، اور بغیر حق کے قتل کرنے والا۔ (1)

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۳۱﴾

"پس (اب تو) اللہ سے ڈرو 1 اور میری اطاعت کرو 2"

1 پس ان اشیاء کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

2 اور ان امور میں میری پیروی کرو جن کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کیونکہ وہ تمہارے لیے نفع بخش ہے۔

وَاتَّقُوا الَّذِیْۤ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

"اور ڈرو اس ذات سے جس نے مدد کی ہے تمہاری ان چیزوں سے جن کو تم جانتے ہو 1"

1 تقویٰ کا امر مکرر ذکر کیا گیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسی چیزوں کے ساتھ ان کی امداد کرنے پر مرتب ہے۔ جنہیں وہ طرح طرح کی نعمتوں کے طور پر پہچانتے تھے اور یہ تقویٰ ہی اس کی عطا کی علت اور یہ تنبیہ بھی کہ اگر تقویٰ قائم رکھو گے تو امداد مسلسل جاری رہے گی۔ اور ساتھ ہی اسے ترک کرنے کی صورت میں نعمتوں کے انقطاع کی وعید بھی ہے۔ اور بِمَا تَعْلَمُوْنَ میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مجمل اظہار تھا جیسا کہ اَلَا تتقون میں کافروں کے جرم پر اجمالی دلالت تھی۔ اس کے بعد نصیحت اندوزی میں مبالغہ کرتے ہوئے اور تقویٰ پر ابھارتے ہوئے بعض نعمتوں کی تفصیل بیان کر دی۔

اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِیْنَ ﴿۱۳۳﴾

"یعنی اس نے مدد فرمائی ہے تمہاری مویشیوں اور فرزندوں سے 1"

1 "اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِیْنَ وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ" یہ پہلے اَمَدَّكُمْ سے بدل ہے پھر انہیں دھمکایا اور فرمایا

وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾

"اور باغات اور چشموں سے 1"

1 اِنِّیْ کو حرمیان (ابو جعفر اور ابو محمد) اور ابو عمرو نے یاء مفتوح کے ساتھ اور باقیوں نے یاء ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔

اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۳۵﴾

"میں ڈرتا ہوں کہ تم پر 1 بڑے دن کا عذاب نہ آجائے 2"

1 اگر تم میری اسی طرح نافرمانی کرتے رہے تو میں ڈرتا ہوں کہ۔

2 تم پر بڑے دن کا عذاب نہ آجائے۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے (2)۔ دنیا میں یا آخرت میں۔ کیونکہ جو نعمتیں عطا کرنے پر قادر ہے وہ انتقام کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ یہ جملہ مقام تعلیل میں ہے۔ (یعنی علت بیان کرنے کے محل میں ہے)

1۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 514 (الرسالۃ العربی) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

''انہوں نے کہا[1] یکساں ہے ہمارے لیے[2] خواہ آپ نصیحت کریں یا نہ ہوں آپ نصیحت کرنے والوں سے[3]''

[1] قوم ہود نے اس کے جواب میں کہا۔

[2] سَوَآءٌ عَلَيْنَآ یہ مصدر بمعنی مفعول ہے۔ مگر اس قول کی وجہ سے مقدم ہے۔

[3] اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ وہ مصدر کی تاویل کے ساتھ مبتدا ہے، یعنی آپ کا ہمیں وعظ کرنا اور نہ کرنا ہمارے نزدیک برابر ہے۔ آپ کے وعظ ونصیحت کے ساتھ ہم اپنے معمولات کو چھوڑیں گے نہیں۔ وعظ سے مراد وہ کلام ہے جو وعد و وعید کے ذکر سے دل کو نرم کر دیتا ہے۔ نفی کی طرف کو اس سے تبدیل کر دیا ہے جس کا تقاضا اس کا مقابل کرتا ہے۔ اسی طرح کہ یہ نہیں فرمایا ''اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَعِظْ'' تو اس سے اس میں مبالغہ مقصود ہے کہ وہ آپ کے وعظ ونصیحت کو قبول کرنے والے نہیں تھے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

''نہیں ہے یہ (محلات کا شوق) مگر ہمارے اسلاف کا دستور[1]''

[1] اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ اس میں ابوجعفر، ابوعمرو، کسائی اور یعقوب نے خاء کو مفتوح اور لام کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی یہ جو نصیحت (ڈراوا) لے کر آپ ہمارے پاس آئے ہیں یہ پہلے لوگوں کے جھوٹ اور ان کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔ جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں ہے ''و تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا'' تم خود جھوٹ گھڑتے ہو۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ ہمیں بھی پہلے لوگوں کی طرح ہی پیدا کیا گیا ہے۔ ہم زندگی گزاریں گے اور پھر انہی کی مثل مر جائیں گے نہ کوئی دوبارہ اٹھنا ہے اور نہ ہی حساب و کتاب ہے۔

نافع، ابن عامر، عاصم، حمزہ اور ابن کثیر نے خاء اور لام دونوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ہمیں خوفزدہ کرنے کے لیے یہ جو نصیحت آپ ہمارے پاس لائے ہیں یہ پہلے لوگوں کی عادت تھی۔ وہ بھی اس کی مثل جھوٹ بولتے رہتے تھے۔ یا معنی یہ ہے کہ جس دین اور عادات کو ہم اپنائے ہوئے ہیں وہ پہلے لوگوں کا وطیرہ اور ان کی عادت ہے اور ہم ان کی اقتدا کرنے والے ہیں۔ یا پھر موت وحیات کے بارے میں جس نظریہ پر ہم ہیں وہ ایک پرانی عادت ہے جس پر لوگ ہمیشہ رہے۔

وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

''(آپ فکر نہ کریں) ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا[1]''

[1] جس طریقہ پر ہم ہیں اس کے سبب ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

''پس انہوں نے آپ کو جھٹلایا[1] اس لیے ہم نے انہیں ہلاک کر دیا[2] بے شک اس میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے[3]''

[1] فَكَذَّبُوْهُ پس انہوں نے آپ کو جھٹلایا یہ قول باری تعالیٰ ''اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ'' کی بعض تاویلات کی بناء پر تاکید و تقریر ہے۔

۲؎ تو ہم نے انہیں ان کے جھٹلانے کے سبب تند و تیز ہوا سے ہلاک کر دیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ذکر کیا گیا ہے۔

۳؎ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر ان میں سے اکثر یا نصف ایمان لے آتے تو انہیں عذاب کے ساتھ نہ پکڑا جاتا۔ بے شک قریش بھی اس قسم کے عذاب سے ان لوگوں کی برکت سے محفوظ رہے جو ان میں سے ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ الی قولہ لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا اگر مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں تو ہم ان کافروں کو دردناک عذاب دیتے۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾

"اور بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۱؎"

۱؎ اور بلاشبہ آپ کا رب ہی غالب اور بڑا مہربان ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

"جھٹلایا قوم ثمود نے رسولوں کو"

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾

"جب کہا انہیں ان کے بھائی صالح نے کیا تم (قہر الٰہی سے) نہیں ڈرتے"

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۴۳﴾

"میں تمہارے لیے رسول امین ہوں"

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾

"سو ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری پیروی کرو"

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

"اور میں نہیں طلب کرتا اس پر تم سے کوئی معاوضہ میرا معاوضہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے ۱؎"

۱؎ اِنْ اَجْرِيَ میں نافع، ابن عامر، ابوعمرو اور حفص سے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقیوں نے یاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

"کیا تمہیں رہنے دیا جائے گا اس (عیش و طرب) میں ۱؎ جس میں تم یہاں ہو امن سے ۲؎"

۱؎ اس میں ان نعمتوں پر انہیں باقی رکھنے کا انکار ہے جو انہیں دنیا میں عطا کی گئی ہیں یا ان نعمتوں کی یاد دلانا مقصود ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسباب تنعم میں سے انہیں عطا کیے تھے۔

۲؎ کہ تمہیں عذاب کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ پھر ماھٰھُنَا کی تفسیر اپنے اس قول سے فرمائی۔

فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾

"ان باغات میں اور چشموں میں ۱؎"

۱؎ یہ اپنے معطوفات سمیت مَاھٰھُنَا کے قول سے بدل ہے۔

وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۝۱۴۸

''اور (شاداب) کھیتوں میں اور کھجور کے درختوں میں جن کے شگوفے ۱؎ بڑے نرم و نازک ہیں ۲؎ ''

۱؎ طَلْعُهَا سے مراد ان کا پھل ہے۔

۲؎ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا معنی لطیف اور نرم و نازک ہونا ہے۔ اسی سے ھضیم الکشح ہے (پہلو کا نرم ہونا) جب کہ وہ نرم ہو۔ عطیہ نے آپؓ سے یہ روایت کی ہے کہ اس کا معنی ہے نفع دینے والا پکا ہوا۔ عکرمہ نے کہا کہ اس سے مراد نرم و ملائم ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے ''الرخو'' (خوشگوار ہونا) اور مجاہد نے کہا ہے کہ جب خوشۂ کھجور خشک ہو جائے اور وہ ٹوٹ سکتا ہو اور چبایا جا سکتا ہو۔ یعنی جب تک تر رہے تو وہ ہضیم ہے۔ اور جب خشک ہو جائے وہ ہشیم ہے۔ (1)

ضحاک اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے بعض کا بعض سے ملا ہونا یعنی بہت زیادہ ہوگا۔ اہل لغت نے کہا ہے ایسا گچھا جو ظاہر ہونے سے پہلے اندر ہی اندر اس کا بعض بعض سے ملا ہوا ہے۔ ازہری نے کہا ہے وہ جس کا بعض بعض میں داخل ہوا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہضیم بمعنی ہاضم ہے جو کھانے کو ہضم کرتا ہے۔ لطافت کا مفہوم ان تمام معانی میں پایا جاتا ہے۔ (2)

وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۝۱۴۹

''اور تراشتے رہو گے پہاڑوں میں گھر ۱؎ (ماہر) سنگتراش بنتے ہوئے ۲؎ ''

۱؎ اس کا عطف اٰمِنِيْنَ کے قول پر ہے۔ کیونکہ وہ فعل کے معنی کو متضمن ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَ جَعَلَ الَّيْلَ اور تقدیر کلام یہ ہے۔ ''تَاْمَنُوْنَ وَ تَنْحِتُوْنَ'' یا یہ اٰمِنِيْنَ کی ضمیر سے حال ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے وَ اَنْتُمْ تَنْحِتُوْنَ

۲؎ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے فَرِهِيْنَ پڑھا ہے۔ اور یہ زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ یہ صفت مشبہ ہے جو دوام پر دلالت کرتی ہے۔ اور باقیوں نے فٰرِهِيْنَ پڑھا ہے۔ یعنی سنگتراشی میں مہارت کا اظہار کرتے ہوئے۔ یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے فَرِهَ الرَّجُلُ فَرَاهَةً فَهُوَ فَارِهٌ۔ عکرمہ نے کہا اس کا معنی ہے ''نَاعِمِيْنَ'' عمدہ اور خوبصورت بنانے والے۔ قتادہ نے کہا تم اپنی کاریگری سے تعجب میں ڈال دینے والے ہو۔ سدی نے کہا ''متحیرین'' حیرت میں ڈال دینے والے۔ اخفش نے کہا خوش کرنے والے اور عرب حاء اور ہاء کو ایک دوسرے کی جگہ لاتے رہتے ہیں مثلاً مدحته اور مدهته اور کہا اس کا معنی شَرِهِيْن بہت زیادہ حرص رکھنے والے۔ الشره کا معنی ہے غلبة الحرص بہت زیادہ حریص ہونا۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے تکبر اور غرور کے ساتھ ناز سے چلنے والے کیونکہ وہ نعمتوں کے سبب سرکش ہو چکے تھے اور تکبر کے سبب وہ حق کو قبول نہیں کرتے تھے۔ (3)

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝۱۵۰

''پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اتباع کرو''

وَ لَا تُطِيْعُوْۤا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۱۵۱

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

"اور نہ پیروی کرو حد سے بڑھنے والوں کے حکم کی ۱؎"

۱؎ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا مسرفین سے مراد مشرکین ہیں۔ اور مقاتل نے کہا ہے اس سے مراد وہ نو افراد ہیں جنہوں نے ناقہ (اونٹنی) کی کونچیں کاٹ ڈالی تھیں۔(1)

الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝۱۵۲

"جو فساد برپا کرتے رہتے ہیں زمین میں ۱؎ اور اصلاح (کی کوشش) نہیں کرتے ۲؎"

۱؎ اور تم ان کی پیروی نہ کرو جو معاصی کے سبب زمین میں فساد برپا کرتے رہتے ہیں۔

۲؎ اور وہ اس امر میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتے جس کا اس نے انہیں حکم دیا ہے۔

قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝۱۵۳

"جواب ملا ۱؎ (اے صالح!) تم تو ان لوگوں میں سے ہو جن پر جادو کر دیا گیا ہے ۲؎"

۱؎ قوم ثمود نے کہا۔

۲؎ بے شک تم پر تو جادو کر دیا گیا ہے اور تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ اسی طرح مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے۔ کلبی نے ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ مسحرین سے مراد وہ مخلوق ہے جسے بار بار کھلایا پلایا جائے۔ کہا جاتا ہے "سَحَرَهٗ اَیْ عَلَّلَه بِالطَّعَامِ وَالشَّرَابِ۔" اس نے اسے بار بار کھلایا پلایا۔ یعنی بے شک تم کھاتے پیتے ہو اور فرشتے نہیں ہو۔(2)

مَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚۖ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱۵۴

"نہیں ہو تم مگر ایک انسان ہماری مانند ۱؎ ورنہ لاؤ کوئی معجزہ ۲؎ اگر تم راست بازوں میں سے ہو ۳؎"

۱؎ آپ تو ہماری طرح ہی انسان ہیں۔ لہٰذا تم نبی نہیں ہو۔ یا معنی یہ ہے کہ آپ تو ذو سحر ہیں، یعنی آپ کے پاس تو نعمتوں کی فراوانی ہے اور یہ انسان کا خاصہ ہے۔ لہٰذا اس معنی کے اعتبار سے مَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا اس کی تاکید کے لیے ہے۔

۲؎ اپنے قول کے صحیح ہونے پر کوئی دلیل لاؤ۔

۳؎ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو۔ تو اس وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کی دعا سے چٹان سے اونٹنی پیدا فرما دی۔ کیونکہ انہوں نے آپ کی صداقت پر معجزے کا مطالبہ کیا تھا۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝۱۵۵

"فرمایا ۱؎ یہ ایک اونٹنی ہے ۲؎ ایک دن اس کے پانی پینے کی باری ہے ۳؎ اور ایک مقرر دن تمہاری باری ہے ۴؎"

۱؎ صالح علیہ السلام نے فرمایا یہ اونٹنی

۲؎ میری سچائی کی دلیل ہے۔

1 ایضاً 2۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

۳؎ پانی میں اس ناقہ کا حصہ ہے (یعنی ایک دن یہ پانی پیئے گی)۔ ترکیب میں لھا شرب، ناقۃ کی صفت ہے۔

۴؎ (اور ایک مقررہ دن تمہارے پینے کی باری ہے) پس تم اپنی باری پر اکتفاء کرو اور اس کی باری میں تم مزاحم نہ ہو۔ اور یہ جملہ لَهَا شِرْبٌ کی ضمیر مستکن سے حال ہے۔ پس اونٹنی اپنی باری کے دن تمام پانی پی جاتی تھی۔ اور وہ اپنی باری کے دن نہیں پی سکتے تھے۔ اور یہ مھایاۃ کے جواز پر دلیل ہے۔ (مھایاۃ کا معنی ہوتا ہے اپنے اپنے حصے سے نفع اٹھانا)۔

وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾

"اور نہ پہنچانا اسے کوئی اذیت ۱؎ ورنہ آلے گا تمہیں بڑے دن کا عذاب ۲؎"

۱؎ اور تم اسے مارنے اور کونچیں کاٹنے کے سبب اذیت نہ پہنچانا۔ اس جملے کا عطف "هٰذِهٖ نَاقَةٌ" پر ہے۔

۲؎ ورنہ تمہیں بڑے دن کا عذاب آلے گا۔ یعنی وہ دن جس کا عذاب بہت بڑا ہوگا۔ اور یہ عبارت تعظیم العذاب سے زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ وقت جب اس کے سبب سے عظیم ہے تو پھر واقعۃً اس کی عظمت بہت شدید ہوگی۔

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

"ان (بدبختوں) نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں ۱؎ پھر ہو گئے ندامت (وافسوس) کرنے والے ۲؎"

۱؎ فَعَقَرُوْهَا اس کا عطف قَالَ پر ہے۔ کونچیں کاٹنے کی نسبت تمام کی طرف کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ عمل تو بعض نے کیا تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بعض نے یہ عمل ان تمام کے مشورے اور رضامندی سے کیا تھا۔ اسی لیے وہ تمام کے تمام عذاب میں گرفتار ہوئے۔

۲؎ تو پھر وہ ناقہ کی کونچیں کاٹنے پر افسوس کرنے لگے لیکن ان کا یہ افسوس عذاب نازل ہونے کے خوف سے تھا نہ کہ توبہ کے سبب سے یا وہ عذاب کو دیکھ کر اپنے کیے پر نادم ہوئے تو اس وقت اس ندامت نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾

"پس آلیا انہیں عذاب نے بے شک اس واقعہ میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے ۱؎"

۱؎ تو وہ عذاب جس سے انہیں ڈرایا گیا تھا اس نے انہیں آلیا۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾

"اور بے شک آپ کا رب ہی عزیز رحیم ہے"

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

"جھٹلایا قوم لوط نے اپنے رسولوں کو"

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۴﴾

جب کہا ان سے ان کے بھائی لوط نے کیا تم (قہر الٰہی سے) نہیں ڈرتے۔ بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔

پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اطاعت کرو۔ اور میں نہیں مانگتا تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجر میرا اجر تو اس کے ذمے ہے جو رب العالمین ہے ۱؎ "

۱؎ اِنْ اَجْرِیَ کو نافع، ابو عمرو، ابن عامر اور حفص نے یاء مفتوح کے ساتھ اور بقیہ نے اسے یاء ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۵﴾

" کیا تم بدفعلی کے لیے جاتے ہو مردوں کے پاس ساری مخلوق سے ۱؎ "

۱؎ اَتَاْتُوْنَ کا جملہ قول باری تعالیٰ اَلَا تَتَّقُوْنَ کا بیان یا اس سے بدل ہے۔ یعنی کیا تم مخلوق میں سے اپنے سوا دوسرے مردوں کے پاس جاتے ہو تا کہ تم ان سے بدفعلی کرو۔ حالانکہ تمہارے سوا دوسری مخلوق اس عمل بد میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہے۔ یا معنی یہ ہے کیا تم ہی مخلوق میں سے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جماع کے لیے جاتے ہو اس کے باوجود کہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے مردوں کی تعداد کثیر ہے اور عورتیں بھی ان میں کثرت سے ہیں۔ پہلی تفسیر کے مطابق عالمین سے مراد ہر وطی کرنے والی مخلوق ہے اور دوسری کے مطابق اس سے مراد لوگ ہیں۔

وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

" اور چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لیے تمہارے رب نے ۱؎ تمہاری بیویاں ۲؎ بلکہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو ۳؎ "

۱؎ اور تم انہیں چھوڑ دیتے ہو جنہیں تمہارے رب نے تمہارے استمتاع (لطف اندوز ہونے) کے لیے پیدا کیا ہے۔

۲؎ اگر مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ سے مراد جنس عورت لی جائے تو پھر مِنْ بیانیہ ہے۔ اور اگر اس سے مراد عورتوں کا عضو مباح لیا جائے تو پھر مِنْ بعضیّت کے لیے ہے۔ کیونکہ وہ اپنی عورتوں کے ساتھ اسی طرح کرتے تھے جیسے روافض کرتے ہیں۔ اور اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ بیویوں اور لونڈیوں کی دبروں میں وطی کرنا حرام ہے۔

۳؎ بلکہ تم تو شہوت کو پورا کرنے کے لیے حلال کی حد سے حرام کی طرف تجاوز کرنے والے ہو اور تم قضائے شہوت میں تمام لوگوں سے بلکہ حیوانوں سے بھی بڑھ گئے ہو۔ یا معنی ہے۔ تم معاصی میں افراط کرنے والے ہو۔ (یعنی بہت زیادہ گناہ کرنے والے ہو) اور یہ فعل من جملہ انہی میں سے ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ تم اس کے مستحق ہو کہ تمہیں عدوان کی صفت سے متصف کیا جائے کیونکہ تم اس کمینے اور فعل بد کا ارتکاب کرتے ہو۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِیْنَ ﴿۱۶۷﴾

" وہ (غصے سے) کہنے لگے (خاموش!) ۱؎ اے لوط ۲؎ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو تمہیں ضرور ملک بدر کر دیا جائے گا ۳؎ "

۱؎ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔

۲؎ اے لوط! اگر تم اس سے باز نہ آئے جس کی تم دعوت دیتے ہو یا اس سے کہ ہمارے فعل کے قبیح ہونے کے سبب ہمیں روکتے ہو۔

۳؎ تو تمہیں ضرور ہمارے گاؤں سے نکال دیا جائے گا۔

قَالَ اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ ﴿۱۶۸﴾

"آپ نے فرمایا (سن لو) میں تمہارے اس (گندے) فعل سے بیزار ہوں 1"

1 آپ نے فرمایا بے شک میں تمہارے فعل بد سے بیزار ہونے والوں میں سے ہوں۔ پس مجھے اتنی نفرت ہے کہ نکال دیئے جانے کی کوئی پرواہ نہیں۔ اور یہ قول اس قول کی نسبت زیادہ بلیغ ہے "اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ قَالٍ" کیونکہ وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بے شک آپ کا شماران کے گروہ میں ہے اور یہ مشہور ہے کہ آپ من جملہ ان میں سے ہیں۔ اسی طرح "بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُوْنَ تَعْدُوْنَ" کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔

پھر جب لوط علیہ السلام پر یہ واضح ہو گیا کہ ان کی دعوت کا ان پر کوئی اثر نہیں تو آپ نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ وہ آپ کو ان کی مصاحبت سے نجات دے اور انہیں اس عذاب سے عافیت عطا فرمائے جو انہیں لاحق ہوگا۔ تو آپ نے عرض کی۔

رَبِّ نَجِّنِیْ وَ اَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

"میرے مالک! نجات دے مجھے اور میرے اہل و عیال کو اس (کی شامت) سے جو وہ کرتے ہیں 1"

1 ان کے عمل کی شامت اور اس کے عذاب سے۔

فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۷۰﴾

"سو ہم نے نجات دے دی اسے 1 اور اس کے سب اہل کو 2"

1 اس کا عطف قَالَ پر ہے جو "رَبِّ نَجِّنِیْ" کے قول سے پہلے مقدر ہے۔

2 یعنی آپ کے اہل بیت کو اور دین میں آپ کی اتباع کرنے والوں کو اس طرح نجات دی کہ انہیں ان کے درمیان سے نکال دیا اور آپ کے بعد ان پر عذاب مسلط کر دیا۔

اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ﴿۱۷۱﴾

"سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں تھی 1"

1 مگر عذاب اور ہلاکت کے دوران باقی رہنے والوں میں ایک بڑھیا تھی اسے راستے میں ایک پتھر لگا تو اس نے اسے ہلاک کر دیا۔ کیونکہ وہ بھی اپنی قوم کی طرف مائل تھی اور ان کے فعل پر راضی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے بڑھیا ان میں سے تھی جو شہر میں باقی رہ گئے اور وہ لوط علیہ السلام کے ساتھ نہ نکلے۔

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۱۷۲﴾

"پھر ہم نے نام و نشان مٹا دیا دوسروں کا 1"

1 پھر ہم نے ہلاک کر دیا۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ ﴿۱۷۳﴾

"اور ہم نے برسائی ان پر (پتھروں کی) بارش 1 پس بڑی تباہ کن تھی وہ بارش جو برسی ان پر جنہیں ڈرایا گیا 2"

لے وہب بن منبہ نے کہا کہ ان پر گندھک اور آگ برسی۔(1)

۲ے اس میں لام جنس کے لیے ہے۔حتیٰ کہ مضاف الیہ کا اسآء کا فاعل بننا صحیح ہے۔اور مخصوص بالذم محذوف ہے۔اور وہ مطرھم ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةًؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۴﴾

"(اور وہ باز نہ آئے) بے شک اس میں (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے"

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۷۵﴾

"اور بلاشبہ (اے محبوب) آپ کا پروردگار ہی عزیز رحیم ہے"

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـٴَـیْكَةِ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۷۶﴾ۚۖ

"جھٹلایا اہل اَیکہ نے بھی (اپنے) رسولوں کو لے"

لے ابوعمرو، عاصم، حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورۂ صٓ میں الْاَیْكَةِ کو ہمزہ، لام ساکن اور تاء مکسور کے ساتھ پڑھا ہے۔حرمیان (ابوجعفر اور ابومحمد) اور ابن عامر نے لَیْكَةَ لام اور تاء کے فتحہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔اور یہ شہر کا نام ہے غیر منصرف ہے۔سورۂ حجر اور قٓ میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔دونوں گروہوں نے لام ساکن اور تاء مکسور کے ساتھ مہموز پڑھا ہے۔مگر ورش وہاں ہمزہ کی حرکت قانون کے مطابق لام کو دیتے ہیں۔اور الایکۃ سے مراد گھنے درختوں کا جنگل ہے۔مدین کے قریب یہ جنگل تھا جہاں لوگوں کا ایک گروہ رہائش پذیر تھا۔تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف بھی حضرت شعیب علیہ السلام کو مبعوث فرمایا جیسا کہ انہیں مدین کی طرف بھیجا تھا۔چونکہ شعیب علیہ السلام اہل مدین میں سے تھے،اصحاب الایکۃ میں سے نہیں تھے۔اسی لیے رب کریم نے یہاں یہ ارشاد فرمایا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَیْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ۚ

"جب فرمایا انہیں شعیب (علیہ السلام) نے کیا لے تم (قہر الٰہی) سے نہیں ڈرتے"

لے اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَیْبٌ۔اَخُوْهُمْ شُعَیْبٌ نہیں فرمایا۔جبکہ مدین کے ذکر میں اَخَاهُمْ شُعَیْبًا فرمایا کیونکہ یہ نسباً ان ہی میں سے تھے۔

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۷۸﴾ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ۚ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۸۰﴾ؕ

"بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری پیروی کرو۔اور میں نہیں طلب کرتا تم سے اس پر کوئی اجر میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جو سارے جہانوں کو پالنے والا ہے لے"

لے نافع، ابوعمرو، ابن عامر اور حفص نے یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یہ ان تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت تھی۔اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ہی صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔وہ تمام کے تمام تقویٰ اور اطاعت کا حکم دینے،عبادت میں اخلاص اختیار کرنے اور رسالت کی دعوت وتبلیغ پر اجرت کا مطالبہ نہ کرنے پر متفق تھے۔اسی وجہ سے رب کریم نے ارشاد فرمایا اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ كَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖۚ اور مزید فرمایا" اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَ لَا

1۔تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

تَتَقَرَّقُوْا فِیْهِ۔

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾

''اور پورا کیا کرو ناپ ۱؎ اور نہ ہو جائے کم ناپنے والوں سے ۲؎ ''

۱؎ یعنی تم اپنا ناپ مکمل کرو۔ یہ جملہ اپنے معطوفات سمیت تقویٰ کا بیان ہے۔

۲؎ اور ناپ میں کمی کرنے کے سبب لوگوں کے حقوق کو نقصان پہنچانے والے نہ ہو جاؤ۔

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾

''اور وزن کیا کرو ۱؎ صحیح ترازو سے ۲؎ ''

۱؎ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ حمزہ اور کسائی نے قاف کے کسرہ کے ساتھ اور باقیوں نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور قِسْطَاس سے مراد میزان ہے۔ اگر یہ عربی ہو تو پس قسط سے بمعنی عدل ہوگا تو فعلاع کے وزن پر ہوگا، یعنی اس میں عین کلمہ مکرر ہوگا۔ بصورت دیگر یہ فِعْلَالٌ کے وزن پر ابواب رباعی سے ہوگا۔

۲؎ الْمُسْتَقِيْمِ اس سے مراد ایسا صحیح ترازو ہے جس میں کمی نہ ہو۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

''اور نہ کم دیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں ۱؎، اور نہ پھرا کرو زمین میں ۲؎ فساد برپا کرتے ہوئے ۳؎ ''

۱؎ اور تم لوگوں کے حقوق میں سے کوئی شے بھی کم نہ کرو۔

۲؎ اور فساد برپا نہ کرو زمین میں قتل وغارت، ڈاکہ زنی اور مال چھیننے وغیرہ کے ذریعے۔

۳؎ پس جس سے فساد کی کوئی نوع اصلاح کی نیت سے صادر ہوئی مثلاً کسی نے کافر کو نشانہ بنایا (جبکہ وہ مسلمان قیدی کو بطور ڈھال سامنے کھڑا کیے ہوئے ہو) تو جب اس نے کافر کی نیت سے تیر پھینکا اور وہ مسلمان قیدی کو جا کر لگا۔ تو گویا اس نے تو اس کا ارادہ نہیں کیا (اس لیے وہ مفسد نہیں ہوگا)۔ اور وہ آدمی جس سے خطأً بغیر قصد کے فساد برپا ہو گیا، تو وہ بھی مفسد نہیں ہوگا۔

وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾

''اور ڈرو اس سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور (تم سے) پہلی مخلوق کو ۱؎ ''

۱؎ یعنی وہ لوگ جو مخلوق میں سے ان سے پہلے پیدا ہوئے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾

''انہوں نے (جھلا کر کہا) تم تو ان لوگوں میں سے ہو جن پر جادو کر دیا گیا ہے''

وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾

''اور نہیں ہو تم مگر ایک بشر ہماری مانند ۱؎ اور ہم تو تمہارے متعلق یہ خیال کر رہے ہیں ۲؎ کہ تم تو جھوٹوں میں سے ہو ۳؎ ''

۱؎ میں واؤ عاطفہ ہے کیونکہ یہ دو باہم متنافی وصفوں کو جمع کرنے کے لیے ہے اور آپ کی تکذیب میں مبالغے کا ذریعہ ہے۔ اور یہ بھی جائز

ہے کہ یہ ماقبل کلام سے حال ہو۔

۲؎ اور ہم تو تمہارے بارے یہ خیال کر رہے ہیں

۳؎ کہ تم اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہو۔

فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾

"(ہم تمہاری بات نہیں مانتے) لو اب گرا دو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا اگر تم راست بازوں میں سے ہو ۱؎"

۱؎ حفص نے یہاں اور سورۂ سباء میں کِسَفًا سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور اس کا معنی ہے قطعہ، ٹکڑا۔

قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

"آپ نے فرمایا ۱؎ میرا رب خوب جانتا ہے جو تم کر رہے ہو ۲؎"

۱؎ تو حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا

۲؎ کیل اور وزن کو کم کرتے اور ان جیسے دیگر اعمال جو تم کر رہے ہو، میرا رب انہیں خوب جانتا ہے۔ اگر اس نے چاہا تو وہی تمہیں ان کا بدلہ دے گا۔ عذاب لانا میرے اختیار میں نہیں بلکہ میرے ذمہ تو صرف دعوت حق دینا ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾

"سو انہوں نے جھٹلایا شعیب کو تو پکڑ لیا انہیں چھتری والے دن کے عذاب نے ۱؎ بے شک یہ بڑے دن کا عذاب تھا ۲؎"

۱؎ اسے یَوْمِ الظُّلَّہ اس لیے کہا گیا ہے کہ بے شک شدید گرمی نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور وہ تہ خانوں میں داخل ہو گئے تھے۔ لیکن جب وہ ان میں داخل ہوئے تو انہوں نے ان کو اور سخت گرم پایا تو پھر بادل نے ان پر سایہ کر دیا۔ اور یہی وہ سایہ تھا جہاں وہ جمع ہو گئے۔ تو ان پر آگ برسائی گئی جس کے سبب وہ جل کر راکھ ہو گئے۔ سورۂ ہود میں یہ قصہ مذکور ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾

"بے شک اس میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے۔ اور یقیناً آپ کا رب ہی سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۱؎"

۱؎ یہ ان سات واقعات میں سے آخری واقعہ تھا جنہیں رسول اللہ ﷺ کی تسلی اور آپ کے منکرین کو ڈرانے کے لیے انتہائی اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾

"اور بلاشبہ یہ کتاب ۱؎ رب العالمین کی اتاری ہوئی ہے ۲؎"

۱؎ اور بے شک قرآن کریم

۲؎ تنزیل مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی قرآن کریم رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اس کا عطف اس قول پر ہے۔ تِلْكَ

ایٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ﴿۱۹۳﴾

''اترا ہے اسے لے کر روح الامین (یعنی جبرائیل علیہ السلام) 1''

1 یہ حال ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔ یا یہ سابقہ کلام کے لیے تاکید ہے۔ یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیے جانے کی علت ہے۔ اہل حجاز، ابو عمرو اور حفص نے نَزَلَ کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ یعنی روح الامین (جبرائیل علیہ السلام) قرآن لے کر نازل ہوئے۔ اور وہی انبیاء کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی لانے کے امین ہیں۔ ابن عامر، ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے زاء کو مشدد پڑھا ہے اور الرُّوْحَ الْاَمِیْنَ کو مفعول ہونے کی بناء پر منصوب۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جبرائیل امین کو قرآن کے ساتھ اتارا۔

عَلٰی قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ﴿۱۹۴﴾

''آپ کے قلب (منیر) پر 1 تاکہ بن جائیں آپ (لوگوں کو) ڈرانے والوں سے 2''

1 اے محمد ﷺ! آپ کے دل پر، یہاں تک کہ آپ نے اسے یاد کر لیا۔ قلب سے مراد صنوبر کے پھل کی مثل مخروطی شکل کا دل ہے۔ اس سے مراد وہ لطیفہ ربانیہ امکانیہ نہیں جس کی اصل عرش سے اوپر ہے اور اس کا (پرتو) ظہور قلب صنوبری میں ہے۔ کیونکہ وہ عالم امر میں سے ہے اور وہ وحی اور نبوت کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتا بلکہ اسے اٹھانے والا وہ قلب صنوبری ہے جو عناصر اور نفس کا جامع ہے اور وہ عالم امر کا پرتو ہے۔ اسی وجہ سے وحی کا نزول بدن کے مکمل ہونے اور مضبوط و توانا ہونے پر ہوتا ہے۔ یہ عمل عموماً چالیس سال کی عمر میں ہوا۔

2 تاکہ آپ ایسے کاموں سے ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں جن کا کرنا یا چھوڑنا عذاب تک پہنچا دیتا ہے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ﴿۱۹۵﴾

''یہ ایسی عربی زبان میں ہے جو بالکل واضح ہے 1''

1 یہ ایسی عربی زبان میں ہے جس کے معانی بالکل واضح ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا یعنی قریش کی زبان پر، تاکہ ان کے لیے یہ عذر باقی نہ رہے کہ جو کچھ ہماری طرف وحی کیا گیا ہے ہم تو اسے سمجھے ہی نہیں۔ یہ نَزَلَ یا منذرین کے متعلق ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ عربی زبان میں قرآن لے کر آپ کے قلب پر نازل ہوئے۔ اگر وہ غیر عربی ہوتا تو پھر آپ کے کانوں پر نازل ہوتا نہ کہ دل پر، کیونکہ اس وقت آپ ایسی آواز سنتے تو آپ اس کے معنی کو نہ سمجھ سکتے۔ کبھی آدمی متعدد زبانوں کو جانتا ہوتا ہے جب کوئی اس سے اس زبان میں گفتگو کرے جو اس کی مادری زبان ہے تو فوراً سنتے ہی اس کا دل کلام کے معانی کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اور اگر کوئی دوسری زبان میں اس سے گفتگو کرے تو دل پہلے اس کے الفاظ کی طرف متوجہ ہوتا ہے پھر اس کے معانی کی طرف۔ پس بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ، نَزَلَ عَلٰی قَلْبِکَ کی تقریر ہے۔ (1)

وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۹۶﴾

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

''اور اس کا (ذکر خیر)[1] پہلے لوگوں کی کتابوں میں بھی ہے[2] ''

[1] وَ اِنَّهٗ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ ہُ ضمیر سے مراد قرآن کریم کو نازل کرنے کا ذکر ہے۔ مقاتل نے کہا ہے اس سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر ہے۔ اور یہ قول بھی ہے، کہ اس سے مراد قرآن ہے۔

[2] اس سے مراد پہلے لوگوں کی کتابیں ہیں۔ یہ جملہ سابقہ کلام پر معطوف ہے یا اس سے حال ہے۔ دوسری تاویل کی بناء پر بعض حنفیہ نے کہا ہے کہ قرآن صرف معانی کا نام ہے۔ کیونکہ قرآن کریم اپنے ان عربی الفاظ کے ساتھ سابقہ کتابوں میں قطعاً نہیں تھا۔ اسی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے نماز کے دوران غیر عربی زبان میں قرأت کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن یہ قول مردود ہے۔ بلکہ قرآن الفاظ اور معانی کے مجموعہ کا نام ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''قرآنا عربیاً'' تو اس میں عربی الفاظ کی صفت ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن معجز (عاجز کر دینے والا) ہے اور یہ اعجاز الفاظ کے خواص میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنبی آدمی کے لیے غیر عربی زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھنا جائز ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے نماز کے جائز ہونے کے لیے غیر عربی زبان میں قرأت کو اس لیے جائز قرار دیا ہے کہ آپ نے خضوع وخشوع کی رعایت کرتے ہوئے نماز میں الفاظ کو ایسا رکن قرار دیا ہے جو لازم نہیں۔ تحقیق امام اعظم ابوحنیفہؒ نے پھر اپنے اس قول سے رجوع کر لیا۔ اور غیر عربی زبان میں قرأت جائز نہ ہونے کا قول کیا۔ جیسا کہ صاحبین اور اکثر ائمہ نے کہا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

اَوَلَمۡ یَكُنۡ لَّهُمۡ اٰیَةً اَنۡ یَّعۡلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۱۹۷﴾

''کیا نہیں تھی ان (مشرکین مکہ) کے لیے آپ کی سچائی کی یہ دلیل[1] کہ جانتے ہیں آپ کو[2] بنی اسرائیل کے علماء[3] ''

[1] ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ''اَلَمۡ یَعۡرِفُوۡا رَسُوۡلَهُمۡ وَلَمۡ یَكُنۡ لَّهُمۡ اٰیَةً عَلٰی رِسَالَتِهٖ'' ابن عامر نے اسے تاء کے ساتھ اَوَلَمۡ تَكُنۡ پڑھا ہے۔ اور اٰیَةٌ کو مرفوع پڑھا ہے اس لیے کہ یہ کان کا اسم ہے اور لَهُمۡ اس کی خبر ہے۔ اور اَنۡ یَّعۡلَمَهٗ اٰیَةٌ سے بدل ہے یا پھر مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ لَمۡ تَكُنۡ تامہ ہو، اٰیَةٌ اس کا فاعل ہو اور لهم اس سے حال ہو۔ اور اَنۡ یَّعۡلَمَهٗ فاعل سے بدل ہو یا مبتدا محذوف کی خبر ہو یا پھر لَمۡ تَكُنۡ میں ضمیر قصہ ہو، اَنۡ یَّعۡلَمَهٗ مبتدا ہو، اٰیَةٌ اس کی خبر مقدم ہو اور لَهُمۡ اٰیَةٌ سے حال ہو۔ اور عامل ثابت شبہ فعل ہو جو اس جمل سے مستفاد ہوتا ہے۔ اور پھر مکمل جملہ کان کی خبر ہو۔ باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ لم یکن پڑھا ہے۔ اور اٰیَةً کو خبر ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ اور اس کا اسم اَنۡ یَّعۡلَمَهٗ ہے۔ اور لَهُمۡ اٰیَةً سے حال ہے۔

[2] یعنی محمد ﷺ کو ان اوصاف کے ساتھ جانتے ہیں جو تورات میں مذکور ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ قرآن کے بارے جانتے ہیں کہ بے شک وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

[3] عطیہ نے کہا ہے کہ وہ پانچ علماء تھے عبداللہ بن سلام، ابن یامین، ثعلبہ، اسد اور اسید۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اہل مکہ نے یہود مدینہ کی طرف قاصد بھیجا اور ان سے حضور نبی رحمت ﷺ کے بارے پوچھا۔ تو انہوں نے کہا بے شک یہ آپ ہی کا زمانہ ہے اور ہم تورات میں آپ کی مدح وستائش اور اوصاف کو پاتے ہیں۔ (1)

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ ﴿۱۹۸﴾

''اور اگر ہم اتارتے قرآن کو ۱؎ کسی غیر عربی پر ۲؎ ''

۱؎ اور اگر ہم اتارتے قرآن۔

۲؎ الْاَعْجَمِیْنَ اعجم کی جمع ہے۔ اور اس سے مراد وہ آدمی ہے جس کی زبان فصیح نہ ہو اور عربی زبان اچھی طرح نہ بول سکتا ہو اگر چہ وہ نسباً عربی ہو۔ اور عجمی وہ ہوتا ہے جو عجم کی طرف منسوب ہو اگر چہ وہ عربی زبان جاننے اور بولنے میں فصیح و بلیغ ہو۔ آیت کا معنی یہ ہے اور اگر ہم قرآن کریم ایسے آدمی پر اتارتے جو عربی زبان میں فصیح و بلیغ نہ ہوتا۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ اَعْجَمِیٌّ کی جمع ہے۔ اسی وجہ سے اس کی جمع سالم بنائی گئی ہے۔ یعنی اگر یہ اعجم کی جمع ہوتی تو پھر اس کی جمع سالم جائز نہ ہوتی۔ کیونکہ اس کی مؤنث عجماء آتی ہے اور افعل فعلاء کی جمع سالم نہیں بنائی جا سکتی۔ اسی طرح اشعرون اشعری مخففہ کی جمع ہے اصل میں اشعریون ہے۔ اور معنی یہ ہے اور اگر ہم قرآن کریم عربی زبان میں جیسا کہ وہ ہے کسی غیر عربی پر نازل کرتے اس کے اعجاز میں زیادتی کرتے ہوئے یا پھر غیر عربی زبان میں نازل کرتے۔

فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹۹﴾

''پھر وہ ان کو پڑھ کر سناتا ۱؎ تب بھی وہ ایمان لانے والے نہیں تھے ۲؎ ''

۱؎ اور وہ غیر عربی اسے پڑھتا اہل مکہ پر

۲؎ تو یہ ان کے عناد اور تکبر میں اور اضافہ کر دیتا اور وہ اس غیر عربی کی پیروی کرنے سے انکار کر دیتے۔ یا وہ نہ سمجھنے کے سبب کہہ دیتے جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِیًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۲۰۰﴾

''یونہی ۱؎ ہم نے داخل کر دی ہے ۲؎ انکار کی عادت مجرموں کے دلوں میں ۳؎ ''

۱؎ یہ محل نصب میں ہے۔ اس فعل مضمر کے سبب جس کی تفسیر اس کا مابعد فعل کر رہا ہے۔

۲؎ اس کی ضمیر اس شرک اور تکذیب کی طرف لوٹ رہی ہے جس پر اس قول سے دلالت ہوتی ہے۔ ''مَا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ'' حضرت ابن عباس، حسن اور مجاہد نے اسی طرح کہا ہے۔ یعنی ہم نے شرک اور تکذیب کو داخل کر دیا ہے۔ (1)

۳؎ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ پس آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ شرک بھی اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ یعنی ہم نے قرآن ان کے دلوں میں داخل کر دیا، پس انہوں نے اس کے معانی اور اعجاز کو پہچان لیا، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے عناد کے سبب اس کے ساتھ ایمان نہ لائے۔

لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۲۰۱﴾

''وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس پر ۱؎ جب تک دیکھ نہ لیں دردناک عذاب کو ۲؎ ''

۱؎ وہ قرآن کے ساتھ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ ''كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ'' کا بیان ہے، یا حال ہے یا سابقہ کلام پر دلیل ہے۔ آیت میں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

ان کے حال کی خبر دی گئی ہے جن کی موت اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق شرک پر ہوگی۔

۲۔ (یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب دیکھ لیں) تو وہ ایمان کی طرف پناہ لیں گے اور یہ ایسا موت کے بعد قبور میں ہوگا۔

فَيَأْتِيَهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٠٢﴾

"سو وہ آئے گا ان پر ۱۔ اچانک اور انہیں اس (کی آمد) کا احساس ہی نہ ہوگا ۲۔"

۱۔ پس عذاب ان پر آئے گا

۲۔ اچانک اور انہیں اس کی آمد کا احساس ہی نہ ہوگا۔

فَيَقُولُوا هَلْ نَحْنُ مُنظَرُونَ ﴿٢٠٣﴾

"تب (بصد حسرت) کہیں گے ۱۔ کیا ہمیں مزید مہلت ملے گی ۲۔"

۱۔ تو اس وقت وہ حسرت اور افسوس کے ساتھ کہیں گے۔

۲۔ یہ استفہام تمنی کے لیے ہے۔ پس لوٹنے اور غور وفکر کرنے کی آرزو کریں گے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی زبانی عذاب کی وعید سنائی تو انہوں نے کہا کب تک تم ہمیں اس عذاب سے ڈراتے رہو گے اور وہ عذاب کب آئے گا۔ (1)

أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿٢٠٤﴾

"کیا وہ اب ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں ۱۔"

۱۔ ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "اَبِوَعِيْدِنَا لَا يَسْتَيْقِنُوْنَ فَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ" کیا وہ ہماری وعید کے ساتھ یقین نہیں رکھتے کہ وہ اب ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ عذاب آنے کے وقت مہلت اور مزید غور وفکر کا مطالبہ کریں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان کے اس قول سے کنایہ ہے فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ اور ان کے اس قول "فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا" اور جب ان کی طرف سے عذاب کی جلدی آنے کے مطالبے کی بناء ان کے اس اعتقاد پر ہے کہ وہ نہیں آئے گا اور وہ طویل عمر تک امن وسلامتی سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس تیزی کے مطالبے کا انکار کر دیا۔

أَفَرَءَيْتَ إِن مَّتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ ﴿٢٠٥﴾

"کیا تم نے کچھ غور کیا ۱۔ اگر ہم لطف اندوز ہوتے دیں انہیں چند سال ۲۔"

۱۔ اَفَرَءَيْتَ یہ استفہام تقریر کے لیے ہے اور فاء محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اتفکرت فرایت یعنی فَعَلِمْتَ۔ کیا تو نے غور وفکر کر لیا اور دیکھ لیا یعنی تو نے یقین کر لیا۔

۲۔ اگر ہم انہیں کثیر سال اور طویل دنیوی زندگی تک لطف اندوز ہونے دیں۔

ثُمَّ جَاءَهُم مَّا كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿٢٠٦﴾ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ﴿٢٠٧﴾

''پھر (یہ عرصہ گذرنے کے بعد) آئے ان پر وہ عذاب جس سے انہیں ڈرایا جاتا تھا۔ تو کیا نفع دیں انہیں (اس وقت) وہ (ساز وسامان) جن سے وہ لطف اندوز ہوتے رہتے تھے ۱ ''

۱ معنی یہ ہے کہ جب وہ دردناک عذاب دیکھیں گے جبکہ وہ ان پر اچانک آ جائے گا تو کہیں گے کیا ہمیں مہلت دی جائے گی؟ لیکن انہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔ اور اگر ہم انہیں مہلت دے بھی دیں تو پھر بھی اگر آپ غور وفکر کریں تو آپ یقین کر لیں گے کہ اگر ہم انہیں کئی سال تک بھی لطف اندوز ہونے دیں۔ پھر ان کے پاس وہ عذاب آ جائے جس سے انہیں ڈرایا جاتا تھا تو دنیوی ساز وسامان سے لطف اندوز ہونا اور ان کے لیے طویل مہلت کا ہونا ان سے عذاب کو روکنے اور اسے ہلکا کرنے میں قطعاً مفید نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ تمتع اس طرح نسیاً منسیاً ہو جائے گا گویا کہ وہ کبھی بھی نعمت اور عیش میں تھے ہی نہیں۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾

''اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر ۱ اس کے لیے ڈرانے والے (بھیجے گئے تھے) ۲ ''

۱ اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر ایسی بستی کو

۲ جس میں ایسے رسول آئے جنہوں نے اس کے رہنے والوں کو ڈرایا، لیکن وہ باز نہ آئے۔

ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾

''یاد دہانی کے لیے۔ اور ہم ظالم نہیں تھے ۱ ''

۱ ذِکْرٰی کا معنی ہے نصیحت کے لیے اور یاد دہانی کے لیے۔ یہ علت یا مصدر ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ کیونکہ یہ انذار کے معنی میں ہے۔ یا پھر یہ محل رفع میں ہے اس لیے کہ یہ منذرون کی صفت ہے اور اس سے پہلے ذو مضمر ہے۔ یا یہ کہ انہوں نے ذکری کو مبالغہ بنایا ہے کیونکہ رسولوں نے نصیحت اور یاد دہانی میں خوب کوشش کی۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور جملہ معترضہ ہے۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾

''اور نہیں اترے اس قرآن کو لے کر شیاطین ۱ ''

۱ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ اور وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ اس کا عطف نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ پر ہے۔ یعنی ایسا نہیں جیسا کہ مشرکین نے گمان کیا ہے کہ شیاطین محمد ﷺ پر قرآن القاء کرتے ہیں۔

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾

''اور نہ یہ ان کے لیے مناسب ہے ۱ اور نہ ہی وہ اس کی طاقت رکھتے ہیں ۲ ''

۱ اور نہ شیاطین کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ محمد ﷺ پر قرآن اتاریں کیونکہ قرآن سراپا ہدایت ہے اور شیاطین تو گمراہی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

۲ اور وہ ایسی غیب کی خبریں القاء کرنے کی طاقت نہیں رکھتے جو قرآن میں مذکور ہیں۔

اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾

"انہیں (شیطانوں کو)۱؎ تو اس کے سننے سے ۲؎ بھی محروم کر دیا گیا ہے ۳؎"

۱؎ اِنَّهُمْ بے شک شیاطین۔

۲؎ عَنِ السَّمْعِ آسمان سے ملائکہ کا کلام سننے سے۔

۳؎ لَمَعْزُوْلُوْنَ روک دیئے گئے ہیں انہیں انگارہ نما پتھروں کے ذریعے بھگا دیا جاتا ہے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾

"پس نہ پکارا کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور خدا کو ورنہ تو ہو جائے گا ان لوگوں میں سے جنہیں عذاب دیا گیا ہے ۱؎"

۱؎ اس میں اخلاص کو زیادہ کرنے کے لیے برانگیختہ کرنا ہے اور تمام مکلفین کے لیے ایک خاص لطف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ دوسرے کو ڈراتے ہوئے کہتا ہے تو میرے نزدیک تمام مخلوق سے زیادہ عزت والا ہے۔ اگر تو نے میرے سوا کسی کو الٰہ بنایا تو میں تجھے عذاب میں ڈال دوں گا۔(1)

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾

"اور آپ ڈرایا کریں اپنے قریبی رشتہ داروں کو ۱؎"

۱؎ جو ان میں سے زیادہ قریبی ہیں پھر جو ان کے بعد قریبی ہیں کیونکہ وہ یا تو اپنے مہتم بالشان ہونے کی وجہ سے اس کے زیادہ مستحق ہیں یا پھر اس لیے یہ حکم ہے کہ آپ پر کسی قسم کی تہمت عائد نہ ہو سکے۔ کیونکہ انسان اپنے قرابتداروں سے نرمی برتتا ہے۔ یا پھر اس لیے کہ وہ جان لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کسی شے کو ان سے دور نہیں کر سکیں گے اور نجات کا انحصار اتباع اور پیروی میں ہی ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا کہ محمد بن اسحاق نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس کے واسطہ سے حضرت علی بن ابی طالبؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا جب رسول اللہ ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی، تو آپ ﷺ نے مجھے بلایا، اور فرمایا۔ اے علی! اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم ارشاد فرمایا ہے کہ میں اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤں۔ گو میں اس کی قدرت نہیں رکھتا اور میں یہ جانتا ہوں کہ جب میں انہیں ڈراؤں گا اور اس کام کے لیے انہیں بلاؤں گا تو بالیقین مجھے اس سے ناپسندیدہ حرکات وسکنات دیکھنا پڑیں گی۔ لہٰذا میں خاموش رہا حتیٰ کہ جبرائیل امین پھر تشریف لائے اور کہا اے محمد! ﷺ اگر آپ نے وہ نہ کیا جس کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے۔ تو آپ کا رب آپ کو عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ اس لیے اب تم ہمارے لیے ایک صاع گندم لو اور کھانا تیار کرو، اس کے ساتھ بکری کی ایک ٹانگ بطور سالن رکھ دو اور ہمارے لیے دودھ کا ایک (بڑا پیالہ) بھر دو پھر بنی عبدالمطلب کو جمع کرو حتیٰ کہ میں انہیں وہ پیغام پہنچاؤں جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ پس میں نے حکم کے مطابق کھانے کا انتظام کیا اور پھر انہیں دعوت دی۔ اس دن دعوت میں کم وبیش چالیس افراد تھے۔ ان افراد میں آپ ﷺ کے چچوں میں سے ابوطالب، حمزہ، عباس اور ابولہب شامل تھے۔ جب وہ تمام جمع ہو چکے تو آپ ﷺ نے وہ کھانا طلب کیا جو میں نے تیار کیا تھا۔ چنانچہ میں وہ لے آیا۔ جب میں وہ رکھ چکا تو رسول اللہ ﷺ نے گوشت کا ایک ٹکڑا تناول فرمایا۔ اور اسے اپنے دانتوں کے ساتھ کاٹا اور پھر دسترخوان کی ایک طرف رکھ دیا۔ پھر ارشاد فرمایا "خُذُوْا بِاسْمِ اللّٰهِ" (اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ہاتھ بڑھاؤ) پس تمام لوگوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا یہاں تک کہ انہیں کوئی حاجت باقی نہ رہی۔ قسم بخدا (کھانے کی مقدار صرف اتنی

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

تھی) کہ ان میں سے صرف ایک آدمی وہ کھا سکتا تھا جتنا میں نے ان تمام کو پیش کیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ قوم کو سیراب کرو پس میں وہ پیالہ اٹھا لایا۔ انہوں نے اتنا دودھ پیا کہ وہ تمام کے تمام سیراب ہو گئے۔ قسم بخدا (اس کی مقدار صرف اتنی تھی) کہ ان میں سے صرف ایک آدمی پی سکتا تھا۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے گفتگو کرنے کا ارادہ فرمایا تو ابولہب نے پہلے ہی کہہ دیا تمہارے ساتھی نے تم پر جادو کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ سن کر وہ لوگ بکھر گئے۔ اور رسول اللہ ﷺ ان سے کوئی بات نہ کر سکے۔ تو آپ ﷺ نے دوسرے دن پھر فرمایا اے علی! بے شک وہ آدمی مجھ سے سبقت لے گیا ہے کہ جب میں نے کلام کا ارادہ کیا تو میری گفتگو سے پہلے ہی لوگ منتشر ہو گئے۔ لہٰذا اسی قسم کی ایک اور دعوت کا اہتمام کرو۔ اور انہیں پھر جمع کرو۔ پس میں نے ویسے ہی کیا، پھر انہیں اکٹھا کیا۔ پھر آپ ﷺ نے مجھے کھانا لانے کو فرمایا، تو میں نے آپ کو پیش کیا پھر آپ ﷺ نے گذشتہ دن کے عمل کی طرح کیا۔ پھر ان تمام نے کھایا اور پیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے گفتگو فرمائی اے بنی عبدالمطلب! بے شک میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں، تحقیق اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ پس تم میں سے کون میرے اس معاملے میں میری مدد کرے گا اور میرا بھائی، میری وصی اور میرا نائب ہوگا؟ پس تمام کے تمام لوگوں پر خاموشی چھا گئی اور کوئی بھی نہ بول سکا۔ تو میں نے کہا اے نبی اللہ! بے شک میں ان تمام میں کم عمر ہوں لیکن اس معاملے میں میں آپ کا مددگار رہوں گا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے مجھے گردن سے پکڑا اور فرمایا اِنَّ هٰذَا اَخِيْ وَوَصِيِّيْ وَخَلِيْفَتِيْ فِيْكُمْ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِيْعُوْا (بے شک تم میں یہ میرا بھائی، وصی اور نائب ہے اس کی بات سنو اور اطاعت کرو) لوگ استہزاء ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ یہ ہمیں علی کی بات سننے اور اس کی پیروی کا حکم دے رہے ہیں۔(1)

صحیحین میں سعید بن جبیر کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ تو حضور نبی کریم ﷺ صفا پر تشریف لے گئے۔ اور ندا دینے لگے اے بنی فہر، اے بنی عدی باری باری قریش کے تمام قبائل کو بلایا یہاں تک کہ وہ سارے جمع ہو گئے۔ اور جو آدمی خود نہ آ سکا اس نے اپنا نائب بھیج دیا تا کہ وہ بات کو سن کر اس تک پہنچائے۔ پس جب ابولہب اور قریش آ چکے تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس وادی میں دشمن کا ایک دستہ تم پر شب خون مارنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ تو ان تمام نے کہا جی ہاں، اس لیے کہ ہم نے آپ سے ہمیشہ سچ ہی سنا ہے۔ تو پھر آپ نے فرمایا "فَاِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّكُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ" (بے شک میں تمہیں عذاب شدید سے پہلے متنبہ کر رہا ہوں کہ کفر و شرک سے باز آ جاؤ) تو یہ سن کر ابولہب بولا تمہیں سارا دن خرابی ہو تو نے ہمیں کیا اس لیے جمع کیا ہے؟ تو اس وقت یہ مکمل سورت نازل ہوئی تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَاۤ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ الی آخر السورۃ"(2)

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ" تو رسول اللہ ﷺ اٹھے اور فرمانے لگے اے گروہ قریش! یا اسی کی مثل اور کوئی کلمہ فرمایا اپنے نفسوں کو بیچ دو اے بنی عبد مناف! میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کسی شے کو تم سے دور نہیں کر سکوں گا۔ اے عباس بن عبدالمطلب میں تمہیں کسی شے کا فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا۔ اے صفیہ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی۔ میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی کسی گرفت سے نہیں بچا سکوں گا اے فاطمہ بنت محمد ﷺ میرے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 702 (وزارت تعلیم)

مال کے بارے میں جو چاہو مجھ سے پوچھو، میں تجھ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کسی شے کو دور نہیں کر سکوں گا۔(1)۔علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث اس طرح ذکر کی ہے کہ جب وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور صفا پر چڑھے اور آواز لگائی "یا صباحاہ" (اے صبح کرنے والو!) تو انہوں نے کہا یہ کون ہے چنانچہ وہ آپ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ ایک لشکر پہاڑ کے پیچھے سے آ رہا ہے۔کیا تم میری بات مانو گے؟ تو انہوں نے کہا کیوں نہیں ہم نے تو کبھی بھی آپ سے جھوٹ نہیں سنا۔تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا "اِنِّیۡ نَذِيۡرٌ لَّكُمۡ بَيۡنَ يَدَیۡ عَذَابٍ شَدِيۡدٍ" ابولہب بولا "تَبًّا لَّکَ مَا جَمَعۡتَنَا اِلَّا لِهٰذَا" تیری خرابی ہو تو نے ہمیں صرف اس لیے جمع کیا ہے؟ پھر آپ خاموش کھڑے رہے تو اس وقت یہ سورت نازل ہوئی۔تَبَّتۡ يَدَاۤ اَبِیۡ لَهَبٍ وَّ تَبَّ۔اعمش نے اسی طرح قرأت کی ہے۔علامہ بغویؒ عبداللہ بن حمار المجاشعیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں تمہیں تعلیم دوں اور اللہ تعالیٰ نے آج کے دن جو مجھے بتایا ہے اس سے تم ناواقف ہو۔اس نے فرمایا وہ تمام مال جو میں نے اپنے بندوں کو دیا وہ ان کے لیے حلال ہے اور میں نے اپنے تمام بندوں کو دین حنیف پر پیدا کیا ہے۔پھر شیاطین ان کے پاس آئے اور انہوں نے انہیں دین سے پھیر دیا اور ان پر وہ چیزیں حرام قرار دیں جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں۔اور میں نے انہیں حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔میں نے کسی کو یہ قوت نہیں دی۔اور اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف دیکھا۔اور اہل کتاب میں سے (دین پر) باقی رہنے والوں کے سوا تمام عرب و عجم کو ناپسند کیا۔اور اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں قریش کو ڈراؤں۔تو میں نے عرض کی اے میرے پروردگار! وہ تو میرا سر کچل دیں گے اور اسے روٹی بنا چھوڑیں گے۔تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے تمہیں مبعوث فرمایا تا کہ میں تجھے آزماؤں اور تیرے سبب دوسروں کو آزماؤں تحقیق میں نے تجھ پر کتاب نازل کی ہے جسے پانی دھو نہیں سکتا، تم اسے سوتے جاگتے پڑھو، جو تجھ سے لڑے تم ان سے لڑو، تم خرچ کرو تو تم پر خرچ کیا جائے گا۔اپنے دشمنوں کے خلاف ایک لشکر بھیجو ہم پانچ گنا لشکر تمہاری مدد کے لیے بھیجیں گے۔اور اپنے اطاعت شعاروں کے ساتھ مل کر نافرمانوں کے خلاف جنگ کرو۔پھر فرمایا۔اہل جنت تین ہیں۔عادل حکمران، رشتہ داروں اور تمام مسلمانوں سے نرمی کرنے والا رحم کرنے والا آدمی، اور ایسا آدمی جو غنی ہو، پاک دامن بننے کی کوشش کرتا ہو اور صدقہ کرتا ہو۔اور پانچ قسم کے آدمی اہل نار میں سے ہیں۔

(1) ایسا ضعیف اور کمزور آدمی جس کی عقل نہ ہو۔اور وہ ایسے لوگوں کے تابع ہو جنہیں نہ اہل کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ مال کی۔(2) ایسا آدمی جو صبح کے وقت تیرے پاس آئے اور تیرے اہل اور مال کے ساتھ دھوکہ کرے۔(3) حریص اور لالچی آدمی (4) بداخلاق بخیل اور (5) جھوٹ بولنے والا۔واللہ اعلم۔ابن جریر نے ابن جریج سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ تو آپ ﷺ نے اپنے گھر سے آغاز کیا تو مسلمانوں پر یہ شاق گزرا(2) تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۱۵﴾

"اور آپ نیچے کیا کیجئے اپنے پروں کو ان لوگوں کے لیے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں اہل ایمان سے"

1۔صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 702 (وزارت تعلیم) 2۔تفسیر طبری زیر آیت ہذا

لہ اپنے پہلو کو نرم کیجئے۔

لے یہ خفض الطائر جناحہٗ سے استعارہ ہے۔ کیونکہ جب پرندہ نیچے بیٹھنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اپنے پروں کو جھکا لیتا ہے۔

سے مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ یہ لِمَنِ اتَّبَعَکَ کا بیان ہے کیونکہ مَنِ اتَّبَعَ کا لفظ انہیں بھی شامل ہے جنہوں نے دین میں آپ کی اتباع کی اور نہیں بھی جنہوں نے اس کے علاوہ میں اتباع کی۔ یا یہ مِنْ تبعیض کے لیے ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے مکمل طور پر آپ کی اتباع کی اور مؤمنین کی کا لفظ انہیں بھی شامل ہے اور ایسے مومنین کو بھی جو گنہگار رہیں جیسا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلالت کرتا ہے۔

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

”پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں لہ تو آپ فرما دیں میں بری الذمہ ہوں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو ۲ ۔“

لہ اور اگر وہ بعض امور میں آپ کی نافرمانی کریں۔

۲ یعنی میں ان اعمال سے بری ہوں جو نافرمانی اور گناہ کے اعمال تم کرتے ہو۔ اس میں ان کی ذاتوں سے برأت مراد نہیں۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ﴿۲۱۷﴾

”اور بھروسہ کیجئے لہ سب سے غالب ہمیشہ ۲ رحم کرنے والے پر ۳“

لہ ”وَتَوَكَّلْ“ اہل مدینہ اور شام نے اس فَتَوَكَّلْ پڑھا ہے۔ اور ان کے مصاحف میں یہ اسی طرح ہے۔ اس بناء پر یہ ”فَقُلْ اِنِّی بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ“ سے بدل ہے۔ اور باقیوں نے اسے وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ پر عطف کرتے ہوئے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور توکل کا معنی اپنا کام کسی دوسرے کے سپرد کرنا ہے۔ اور یہ عقلاً اور شرعاً جائز نہیں ہوتا مگر اسی کے جو نفع دینے کی قدرت رکھتا ہو، اس سے ضرر کو دور کر سکتا ہو، اس کے اقوال کو سننے والا ہو، احوال کو دیکھنے والا ہو، اس کام کے انجام سے واقف ہو اور اس پر نگران بھی ہو۔ اسی وجہ سے فرمایا

۲ وہ جو غالب ہے وہ اپنے دشمنوں کی تباہی پر بھی قدرت رکھتا ہے اور اپنے دوستوں کی مدد کرنے پر بھی قادر ہے۔

۳ جو تجھ پر اور تیرے متبعین پر رحم فرمانے والا ہے۔

الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾

”جو آپ کو دیکھتا رہتا ہے جب آپ کھڑے ہوتے ہیں لہ“

لہ جو آپ کو دیکھتا رہتا ہے جب آپ لوگوں کو توحید کی طرف بلانے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے کے لیے۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی طرح مفسرین نے کہا ہے۔

وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ ﴿۲۱۹﴾

”(اور دیکھتا رہتا ہے جب) آپ چکر لگاتے ہیں سجدہ کرنے والوں (کے گھروں کا) لہ“

لہ اس کا عطف یَرٰىكَ کی ضمیر منصوب پر ہے۔ یعنی وہ آپ کی نماز کی مختلف حالتوں کو دیکھتا رہتا ہے کہ کبھی آپ حالت قیام میں ہیں، کبھی رکوع میں، کبھی سجود میں اور کبھی قعدے میں۔ یا اس کا عطف تَقُوْمُ کے محل پر ہے۔ یعنی وہ آپ کو دیکھتا ہے جس وقت آپ کھڑے

ہوتے ہیں اور جس وقت آپ رخ تبدیل کرتے ہیں۔عطیہ اور عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ فِی السّٰجِدِیْنَ سے مراد فِی الْمُصَلِّیْنَ ہے (نماز پڑھنے والے) اور مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ دیکھتا ہے نمازیوں میں آپ کے نگاہ پھرانے کو۔ کیونکہ آپ ﷺ اپنے پیچھے سے اسی طرح دیکھتے تھے جیسے وہ اپنے سامنے سے دیکھتے تھے(1)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وَهَلْ تَرَوْنَ قِبْلَتِي هٰهُنَا فَوَ اللّٰهِ لَا يَخْفٰى عَلَيَّ خُضُوْعُكُمْ اِنِّيْ لَاَرَاكُمْ مِنْ وَّرَاءِ ظَهْرِيْ" (کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جب میں قبلہ رو کھڑا ہوتا ہوں تو میں تمہاری حرکات وسکنات سے بے خبر ہوتا ہوں قسم بخدا تمہارے خشوع وخضوع مجھ پر مخفی نہیں ہیں بے شک میں تمہیں اپنی پشت کی جانب سے بھی دیکھتا ہوں) حسن نے کہا تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کا اپنے مومنین اصحاب کے گھروں میں آتے جاتے ہوئے چکر لگانا ہے۔سعید بن جبیر نے کہا ہے اس کا مطلب ہے آپ کا اپنے مختلف احوال میں تصرف کرنا جیسا کہ آپ سے قبل انبیاء کرتے تھے(2)۔اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی آپ کا تہجد پڑھنے والوں کے احوال کو معلوم کرنے کے لیے گھومنا پھرنا۔علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ روایت ہے کہ جب نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی تو آپ نے اس رات اپنے اصحاب کے گھروں کا چکر لگایا تا کہ آپ دیکھیں جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس لیے کہ آپ ان کے بہت زیادہ اطاعت شعار ہونے کے حریص تھے۔ یوں تو آپ ﷺ نے انہیں بھڑوں کے گھروں کی مثل پایا۔ کیونکہ آپ نے ان سے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور تلاوت کی بھنبھناہٹ سنی۔تو اللہ تعالیٰ نے ان سجدہ کرنے والوں کے احوال معلوم کرنے کے لیے آپ کے چکر لگانے کا ذکر کیا۔کیونکہ یہ اس رحمت کے اسباب میں سے ہے جو اس ذات پر توکل کا تقاضا کرتی ہے جو اس سے متصف ہو۔حضرت عطاء نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تقلّبک سے آپ کے اپنے آباء کی صلبوں میں منتقل ہونے کا ارادہ فرمایا ہے یعنی آپ کے نور کا ایک نبی سے دوسرے نبی کی پشت میں منتقل ہو کر آنا(3)۔لیکن اس تاویل میں کمال مدح نہیں کیونکہ اس میں قریش بھی شریک ہیں بلکہ تمام لوگ اس میں مشترک ہیں۔ بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے کہ اس سے مراد آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے والوں کی پاک اصلاب سے پاک اور سجدہ کرنے والیوں کی رحموں کی طرف منتقل ہونا ہے۔اور پاک سجدہ کرنے والیوں کی رحموں سے پاک صلبوں کی طرف آنا ہے۔یعنی آپ ﷺ کے نسب میں تمام مرد اور عورتیں توحید کے پرستار تھے۔اور حضور نبی کریم ﷺ کے آباء میں سے تمام کے تمام مومن تھے۔جیسا کہ امام سیوطیؒ نے کہا ہے۔اور حافظ شمس الدین بن ناصر الدین دمشقی نے کہا ہے۔

وَيُنْقَلُ اَحَدُ نُوْرًا عَظِيْمًا تَلَأْلَأَ فِيْ وُجُوْهِ السّٰجِدِيْنَ

اور ہر ایک عظمت وشان والے نور کو منتقل کرتا رہا جو سجدہ کرنے والوں کی پیشانیوں میں چمکتا ہے۔

تَقَلَّبَ فِيْهِمْ قَرْنًا فَقَرْنًا اِلٰى اَنْ جَاءَ خَيْرُ الْمُرْسَلِيْنَ

پس وہ نور ان میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ تمام رسولوں سے عظمت وشان والا رسول تشریف فرما ہوا۔

اس تاویل کی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُوْنِ بَنِيْ اٰدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا حَتّٰى بُعِثْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِيْ كُنْتُ فِيْهِ"(4) (مجھے بنی آدم کے زمانوں میں سے قرناً بعد قرن بہتر زمانے سے

مبعوث کیا گیا حتی کہ مجھے اس زمانے سے مبعوث کیا گیا جس میں میں ہوں)۔ مسلم شریف میں واثلہ بن اسقعؓ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کو چنا، اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بنی کنانہ کو چنا، بنی کنانہ میں سے قریش کو منتخب فرمایا، قریش میں سے بنی ہاشم کا انتخاب کیا اور بنی ہاشم میں سے مجھے چن لیا" (1)۔ امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت انسؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ لوگ دو فرقوں میں تقسیم نہیں ہوئے مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان میں سے افضل و بہتر میں سے بنایا۔ پس مجھے اپنے والدین کے ذریعے پیدا کیا گیا اور زمانہ جاہلیت کی کسی شے نے مجھے مس نہیں کیا۔ میں آدم علیہ السلام کے زمانہ سے نکاح کے ذریعہ پیدا ہوا نہ کہ زنا سے۔ یہاں تک کہ میرے باپ اور ماں پر میری انتہاء ہوگئی۔ میں اپنی ذات کے اعتبار سے بھی تم سے بہتر ہوں اور اپنے آباء کے اعتبار سے بھی تم سے افضل ہوں" (2)۔ امام سیوطیؒ نے آپ ﷺ کے آباء کے ایمان کے اثبات میں اجمالاً اور تفصیلاً ایک کتاب تحریر کی ہے۔ اور اس میں اس کے بارے مفصل بحث اور اس پر ہونے والے اعتراضات و جوابات کا ذکر بھی کیا ہے۔ میں نے اس سے ایک رسالہ تلخیص کیا ہے۔ لہٰذا اس کی طرف رجوع کیا جائے۔

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٢٢٠﴾

"بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے [1]"

[1] بے شک وہ آپ کے اقوال کو سننے والا ہے اور آپ کے افعال، نیات اور آپ کے امور کے انجام کو جاننے والا ہے۔ پس فی الحقیقت اسی پر توکل کیا جا سکتا ہے۔

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ﴿٢٢١﴾

"کیا میں بتاؤں تمہیں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں [1]"

[1] یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيَاطِينُ اور یہ ان کے اس قول کا جواب ہے تَنَزَّلَ عَلَيْهِ شَيْطَانٌ۔

تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ﴿٢٢٢﴾

"وہ اترتے ہیں [1] ہر جھوٹ گھڑنے والے [2] بدکار پر [3]"

[1] تَنَزَّلُ دونوں مقامات پر یہ باب تفعل سے فعل مضارع کا صیغہ ہے۔ اور اس سے ایک تاء ساقط ہے۔

[2] اَثِیْم کا معنی ہے بہت زیادہ جھوٹ بولنے والا ہے۔

[3] اَفَّاك بہت زیادہ گناہ کرنے والا۔ جو اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار نہ ہو۔ تو اس میں اس کی وضاحت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ آپ پر شیطان نازل ہوتا ہے اس کی دو وجہیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ شریر، کذاب اور بہت زیادہ گناہ کرنے والے پر اترتا ہے۔ کیونکہ فیض دینے والے اور فیض پانے والے کے درمیان مناسبت کا ہونا شرط ہے۔ اور حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء تو اس طرح نہیں۔ اور دوسری وجہ یہ قول ہے۔

يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ﴿٢٢٣﴾

1۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 1 صفحہ 174 (العلمیۃ)

2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 857 (وزارت تعلیم)

”یہ اپنے کان (شیطانوں کی طرف) لگائے رکھتے ہیں [1] اور ان میں سے اکثر نرے جھوٹے ہیں [2]“

[1] وہ اپنے کان شیطانوں کی طرف لگائے رکھتے ہیں۔ پس ان سے کچھ اشیاء لے لیتے ہیں اور پھر اپنے خیالات کے مطابق بہت سی چیزیں ان کے ساتھ ملا لیتے ہیں جو ان میں سے اکثر واقعہ کے مطابق نہیں ہوتیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا

[2] (اور ان میں سے اکثر نرے جھوٹے ہیں) اور محمد ﷺ تو اس طرح نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ تو اتنے کثیر مغیبات کی خبریں دیتے ہیں جو شمار نہیں کیے جا سکتے اور وہ جب بھی کسی شے کی خبر دیتے ہیں وہ بالیقین واقعہ کے مطابق ہوتی ہے۔ ترکیب میں یہ جملہ یا تو اثیم کی صفت ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کاہنوں کے بارے پوچھا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا وہ کوئی شے نہیں۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کبھی کبھی وہ ایسی شے کے بارے گفتگو کرتے ہیں جو بالکل حق ہوتی ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جنات حق کے کلمات اچک لیتے ہیں اور پھر اسے اپنے کاہن دوست کے کان میں مرغی کی آواز کی مثل آواز سے ڈال دیتے ہیں۔ پھر وہ اپنی طرف سے اس میں سو سے زائد جھوٹ ملا لیتے ہیں۔ متفق علیہ (1)۔ آپ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا بے شک ملائکہ بادل میں اترتے ہیں اور وہ آسمان میں ہونے والے فیصلے کا ذکر کرتے ہیں۔ پس شیاطین اسے چرانے کے لیے اس کی طرف کان لگائے رکھتے ہیں اور اس میں سے کچھ سن لیتے ہیں۔ پھر وہ کاہنوں کو آکر بتاتے ہیں اور پھر وہ اپنی طرف سے سینکڑوں جھوٹ اس کے ساتھ ملا کر آگے بیان کرتے ہیں۔ رواہ البخاری (2)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی حکم کا فیصلہ فرماتا ہے تو فرشتے عاجزی و انکساری کرتے ہوئے اپنے پر مارتے ہیں ایسی آواز میں جیسے کہ یہ ایک زنجیر ہے جو چکنی چٹان پر لگے اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو وہ آپس میں کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا کہا ہے؟ وہ کہتے ہیں قسم ہے اس ذات کی۔ اس نے حق کہا ہے اور وہ بڑی شان والا عظمتوں والا ہے)۔ پس کلام کو چرانے والے اسے سنتے ہیں اور اسی طرح بعض جو ایک دوسرے سے بترتیب نیچے ہیں وہ کلام چرا لیتے ہیں۔ (اور سفیان نے اس کا وصف بیان کیا ہے کہ وہ اسے روک لیتا ہے پھر اس میں تبدیلی کرتا ہے اور اپنی انگلیوں کے درمیان جلدی سے لے لیتا ہے)۔ پس اوپر والا کلام سنتا ہے اور وہ اسے اپنے سے نیچے والے کی طرف القاء کرتا ہے۔ پھر وہ اپنے سے نیچے والے کی طرف۔ حتیٰ کہ اسی طرح کرتے کرتے وہ اسے ساحر اور کاہن کی زبان پر القاء کر دیتے ہیں۔ بسا اوقات شہاب ثاقب القاء سے پہلے اسے آلیتے ہیں اور کبھی کبھار ان کے پہنچنے سے پہلے وہ القاء کر دیتا ہے۔ پھر وہ سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے اس کے ساتھ ملا کر جھوٹ بولتا ہے۔ پھر کہہ دیا جاتا ہے کیا اسی طرح نہیں ہوا جو اس نے فلاں دن ہمیں اس اس طرح کہا اور فلاں دن اس اس طرح کہا۔ پس آسمان سے سنے گئے کلمہ کے سبب اسے سچا مان لیا جاتا ہے۔ رواہ البخاری۔ (3)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما انصار میں سے ایک آدمی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ہم ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک ستارہ ٹوٹا اور اس سے خوب روشنی ظاہر ہوئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اس کی مثل ستارہ ٹوٹتا تو اس کے بارے تم زمانہ جاہلیت میں کیا کہتے تھے؟ انہوں نے کہا حقیقت تو اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے ہم تو یہ کہتے تھے کہ آج

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 853 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 456 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 699 (وزارت تعلیم)

کی رات عظیم آدمی پیدا ہوا ہے تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ستارے کسی کی موت یا کسی کی پیدائش کے سبب نہیں ٹوٹتے۔ بلکہ جب ہمارا رب جب کسی کام کا فیصلہ فرماتا ہے تو حاملین عرش اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ پھر اس آسمان کے باسی اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں جو اس کے ساتھ متصل ہے حتیٰ کہ وہ تسبیح اس آسمان دنیا کے باسیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر حاملین عرش کے ساتھ ملنے والے ان سے کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ تو وہ انہیں اس کے بارے خبر دیتے ہیں۔ پھر تمام آسمانوں میں رہنے والے ایک دوسرے کو خبر دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ خبر آسمان دنیا تک پہنچ جاتی ہے۔ پس جنات کان لگا کر اسے اچک لیتے ہیں اور اسے اپنے دوستوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور پھر وہ آگے بیان کر دیتے ہیں۔ پس جو کچھ وہ بعینہٖ لاتے ہیں وہ تو حق ہوتا ہے لیکن وہ اس میں بہت اضافہ کر کے اسے آگے بیان کرتے ہیں۔ رواہ مسلم واللہ اعلم۔(1)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دو آدمیوں نے ایک دوسرے کی ہجو بیان کی۔ ان میں سے ایک انصار میں سے تھا اور دوسرا دوسری قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنی اپنی قوم کے بیوقوف لوگ تھے(2)۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۟ؕ

''اور جو شعراء ہیں تو ان کی پیروی حق سے بھٹکے ہوئے لوگ ہی کرتے ہیں [1]۔''

[1] علامہ بغویؒ نے ضحاک سے اسی طرح ذکر کیا ہے اور انہوں نے کہا عطیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کی ہے۔ اور ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اکثر مفسرین نے یہ کہا ہے کہ شعراء سے مراد وہ کفار ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی ہجو کیا کرتے تھے۔ اور مقاتل نے ان کے یہ اسماء ذکر کیے ہیں عبداللہ بن زبیر سہمی، ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی، شافع بن عبد مناف، ابوعزہ عبداللہ بن عمر جمحی اور امیہ بن ابی الصلت ثقفی۔ یہ انتہائی جھوٹ اور باطل گفتگو کرتے تھے۔ اور کہتے تھے ہم محمد (ﷺ) کے قول کی مثل ہی کلام کرتے ہیں۔ وہ اشعار کہتے اور ان کی قوم کے احمق اور بے وقوف لوگ ان کے پاس جمع ہو جاتے اور ان سے وہ اشعار سنتے۔ جن میں اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی ہجو ہوتی۔ اور وہ انہیں ان سے آگے بیان کرتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ان سے مراد وہ رواۃ ہیں جو رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی ہجو روایت کرتے ہیں۔

قتادہ اور مجاہد نے کہا ہے کہ غَاوٗنَ سے مراد شیاطین ہیں(3)۔ یہ جملہ مستانفہ ہے کیونکہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کے شاعر ہونے کی نفی کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسے مزید پختہ کرتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۟ۙ

''کیا تم نہیں دیکھتے [1] کہ شعراء ہر وادی میں [2] سرگرداں پھرتے رہتے ہیں [3]۔''

[1] ''اَلَمْ تَرَ'' اے مخاطب! کیا تو نہیں دیکھتا بے شک شعراء۔

[2] کلام کی وادیوں میں سے ہر وادی میں (گھومتے ہیں) مثلاً مدح، ذم، افتخار اور محبت و بغض وغیرہ کا بیان کرتے ہیں۔ اور وادی سے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 233 (قدیمی) 2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 185 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

مراد کلام کی انواع میں سے ایک نوع ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے انا فی وادٍ وانت فی وادٍ اخر۔ (میں ایک وادی (کلام کی نوع) میں ہوں اور تو دوسری وادی میں ہے)

۲؎ یہ سابقہ کلام کی علت بیان کرتا ہے۔ اَلْهَائِمُ سے مراد وہ سیدھا جانے والا ہے جو کسی حد پر نہ ٹھہرتا ہو۔ یعنی وہ کلام میں حد درجہ مبالغہ کرتے تھے اور جھوٹ کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اور ان کے اکثر مقدمات اس طرح خیالی ہوتے کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ قتادہ کہتے ہیں کہ وہ جھوٹ کے ساتھ ہی مدح کرتے تھے اور جھوٹ کے ساتھ ہی ہجو کرتے تھے۔ اور فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حروف تہجی میں سے ہر حرف پر قافیے بناتے تھے۔ (1)

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾

''اور وہ کیا کرتے ہیں ایسی باتیں جن پر وہ خود عمل نہیں کرتے ۱؎''۔

۱؎ یعنی وہ اپنے اشعار میں بہت زیادہ جھوٹ بولتے تھے۔ چونکہ قرآن کریم کا اعجاز الفاظ اور معنی دونوں کے اعتبار سے ہے اس لیے وہ معنی پر اس طرح اعتراض کرتے تھے کہ یہ وہ ہے جو شیاطین لے کر اترتے ہیں اور الفاظ میں عیب و نقص اس طرح بیان کرتے کہ یہ شعر کی جنس میں سے ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی کیفیت اور کاہنوں اور شعراء کی حالت کے درمیان تضاد اور تباین بیان کرتے ہوئے ان کے قول کا رد فرما دیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ پیٹ کا پیپ سے بھر کر فاسد ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھر جائے (2)۔ اسے بخاری، مسلم، احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عرج نامی پہاڑ کے پاس چل رہے تھے کہ اچانک ایک شاعر شعر کہتے ہوئے سامنے آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شیطان کو پکڑ لو یا فرمایا شیطان کو روک لو کیونکہ کسی آدمی کے پیٹ کا پیپ سے بھر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھر جائے (3)۔ حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ کلام میں غلو کرنے والے ہلاک ہو گئے۔ آپ ﷺ نے یہ ارشاد تین بار فرمایا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (4)۔ ابو ثعلبہ خشنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے مجھے زیادہ محبوب اور قیامت کے دن مجھ سے زیادہ قریب وہ ہو گا جو تم میں سے اچھے اخلاق والا ہو گا اور میرے نزدیک مبغوض اور مجھ سے زیادہ دور وہ ہو گا جو برے اخلاق والا ہو گا اور وہ ثرثارون، متشدقون اور متفیھقون ہیں۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے (5)۔ نہایہ میں ہے کہ ثرثارون سے مراد وہ لوگ ہیں جو تکلف کے ساتھ کثرت سے کلام کرتے ہیں اور حق سے نکل جاتے ہیں اور متشدقون وہ ہیں جو بغیر احتیاط اور پرہیز کے وسیع کلام کرتے ہیں (6)۔ میں کہتا ہوں یہ دونوں شعراء کی صفات ہیں۔ امام ترمذیؒ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت نقل کی ہے۔ اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہم ثرثارون اور متشدقون کا مفہوم تو جانتے ہیں متفیھقون سے مراد کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس سے مراد تکبر کرنے والے لوگ ہیں۔ (7)

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا — 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 909 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 240 (قدیمی) — 4۔ ایضاً، جلد 2 صفحہ 339 — 5۔ شعب الایمان، جلد 4 صفحہ 51-250 (العلمیۃ)
6۔ النہایۃ فی غریب الحدیث، جلد 1 صفحہ 209 (العلمیۃ) — 7۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 22 (وزارت تعلیم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں شب معراج ایک قوم کے پاس سے گزرا جن کے ہونٹوں کو آگ کی قینچیوں کے ساتھ کاٹا جار ہا تھا۔ تو میں نے کہا اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں تو اس نے کہا یہ آپ کی امت کے وہ خطباء ہیں جو وہ کچھ کہتے ہیں جو کرتے نہیں (1)۔ اسے ترمذیؒ نے روایت کیا اور کہا یہ حدیث غریب ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن ابی حاتم نے عروہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی "وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ الی قوله مَالَا یَفْعَلُوْنَ" تو حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا تحقیق یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ میں ان میں سے ہوں۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے آخر سورۃ تک یہ ارشاد نازل فرمایا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (2)۔ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور حاکم نے ابوالحسن البراد سے روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی "وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ" تو حضرت عبداللہ بن رواحہ، کعب بن مالک اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم آئے اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ قسم بخدا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ ہم شعراء ہیں ہم تو ہلاک ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی۔ (3)

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

"بجز ان شعراء کے جو ایمان لے آئے 1؎ اور انہوں نے نیک عمل کیے اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں 2؎ اور انتقام لیتے ہیں اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا 3؎ اور عنقریب جان لیں گے جنہوں نے ظلم وستم کیے 4؎ کہ وہ کس (بھیانک) جگہ 5؎ لوٹ کر آرہے ہیں 6؎"

1؎ تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں بلا بھیجا اور ان کے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

2؎ یعنی شعر کہنے نے انہیں کثرت ذکر سے غافل نہیں کیا۔ اور ان کے اکثر اشعار اللہ تعالیٰ کے ذکر، توحید، حمد وثناء اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری پر برانگیختہ کرنے والے ہوں۔ ابو یزید نے کہا ہے کہ ذکر کثیر سے مراد کثرت بالعدد نہیں بلکہ حضور قلب ہے۔ (4)

3؎ اور اگر ان کے کلام میں کسی کی ہجو ہوتی تو وہ اس سے ان کے خلاف مدد کا ارادہ کرتے جو ان کی ہجو کرتے اور اسے مسلمانوں کی ہجو کا دفاع مقصود ہوتا۔

علامہ بغویؒ نے شرح السنہ اور معالم میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے شعر کے بارے جو کچھ نازل کیا۔ سو نازل کیا حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بے شک مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی۔ اور قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے گویا کہ تم شعر کے ذریعے ان پر تیر اندازی کرتے ہو۔ اور ابن عبدالبر نے "استیعاب" میں کہا ہے کہ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ﷺ شعر کے بارے آپ کی کیا رائے ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک بندہ مومن اپنی تلوار اور زبان سے جہاد کرتا ہے (5)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ عمرہ قضاء کے وقت مکہ میں داخل ہوئے تو ابن رواحہ رسول اللہ ﷺ کے آگے آگے چل

1۔ مسند احمد، جلد 3 صفحہ 120 (صادر) 2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 185 (العلمیۃ) 3۔ ایضاً
4۔ تفسیر روح البیان، جلد 6 صفحہ 316 (مکتبہ اسلامیہ ریاض) 5۔ تفسیر کشاف، جلد 3 صفحہ 345 (دار الکتب العربیہ)

رہے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حرم پاک میں شعر کہہ رہے تھے۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے عمر! اسے چھوڑ دو۔ کمان کے تیر کی نسبت یہ زیادہ اثر کرنے والے ہیں۔

صحیحین میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے غزوۂ بنی قریظہ کے دن حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کہا مشرکین کی ہجو بیان کرو، بے شک جبرائیل آپ کے ساتھ ہیں (1)۔ رسول اللہ ﷺ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو فرمایا کرتے تھے میری طرف سے انہیں جواب دو اے اللہ! روح القدس کے ذریعے اس کی امداد فرما۔(2)

مسلم نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قریش کی ہجو کرو بے شک یہ ان کے لیے تیر لگنے کی نسبت زیادہ تکلیف دہ ہے (3)۔ اور آپؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ روح القدس تیری تائید کرتا رہے گا۔ جب تک تو اللہ اور اس کے رسول کا دفاع کرتا رہے گا۔ آپؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے بھی سنا ہے کہ حسان نے ان کی ہجو کی۔ پس اس نے شفا دی اور شفا دینے والی چیز بیان کر دی۔(4)

امام بخاریؒ نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لیے مسجد میں منبر بچھایا کرتے تھے اور وہ اس پر کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کے مفاخر بیان کرتے۔ یا پھر آپ ﷺ کی مدافعت میں کلام پڑھا کرتے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے روح القدس حسان کی مدد کرتا رہا جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کے مفاخر اور عظمت و شان کا ذکر کرتے رہے یا آپ ﷺ کا دفاع کرتے رہے (5)۔ علامہ بغویؒ نے آپ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم قریش کی ہجو بیان کرو کیونکہ یہ ان کے لیے تیر لگنے کی نسبت زیادہ تکلیف دہ ہے۔ پس آپ نے ابن رواحہ کی طرف پیغام بھیجا۔ اور فرمایا تو ان کی ہجو بیان کر تو انہوں نے ان کی ہجو کہی لیکن آپ ﷺ اس سے مطمئن نہ ہوئے پھر کعب کی طرف اور بعد ازاں حضرت حسان کی طرف پیغام بھیجا پس جب حسان بن ثابت آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "قَدْاٰنَ لَکُمْ اَنْ تُرْسِلُوْا اِلٰی ھٰذَا الْاَسَدِ الضَّارِبِ بِذَنْبِهٖ" (تحقیق اب تمہارے لیے وقت آگیا ہے کہ تم اس شیر کو تیر بھیجو جو اپنی دم زمین پر پٹخ رہا ہے حملہ کے لیے)۔ پھر انہوں نے جوش سے اپنی زبان کو حرکت دیتے ہوئے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں اپنی اس زبان کے ساتھ انہیں انتہائی بری طرح پھاڑ ڈالوں گا۔ تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جلدی نہ کیجئے، بے شک ابوبکر صدیق قریش کے نسبوں کے ماہر ہیں۔ میں بھی ان ہی ان کے نسب میں سے ہوں۔ پس وہ تمہیں ان میں میرے نسب کے متعلق بتائیں گے۔ پھر حسان حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، پھر واپس لوٹے اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ انہوں نے آپ کے نسب کے متعلق مجھے بتا دیا ہے پس قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں آپ کو ان سے بالیقین اس طرح نکال لوں گا جیسے آٹے سے بال کھینچ لیا جاتا ہے۔ پھر حسان نے یہ کہا۔

هَجَوْتَ مُحَمَّداً فَاَجَبْتُ عَنْهُ وَعِنْدَ اللّٰهِ فِيْ ذَاكَ الْجَزَاءُ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 591 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، جلد 2 صفحہ 909 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 300 (قدیمی)

(اے ابوسفیان!) تو نے میرے محبوب محمد ﷺ کے بارے ناز یبا باتیں کی ہیں اور میں اس ہجو کا تمہیں جواب دے رہا ہوں اور میں پرامید ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مجھے جزاء خیر ملے گی۔

هَجَوْتَ مُحَمَّدًا بَرًّا حَنِيفًا رَسُولَ اللّٰهِ شِيمَتُهُ الْوَفَاءُ

تو نے میرے اس محبوب کی ہجو کی ہے جو نیک سیرت اور پاکدامن ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے اور اس کی خصلت وفاشعاری ہے۔

فَإِنَّ أَبِي وَوَالِدَتِي وَ عِرْضِي لِعِرضِ مُحَمَّدٍ مِّنْكُمْ وِقَاءُ

سنو! میں تم سے اپنے محبوب محمد ﷺ کی عزت کو بچانے کے لیے اپنے باپ، اپنی ماں اور اپنی بیوی تک کو قربان کر دوں گا۔

اَمَنْ يَّهْجُو رَسُولَ اللّٰهِ مِنْكُمْ وَ يَمْدَحُهُ وَ يَنْصُرُهُ سَوَاءُ

تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرنے والا اور آپ ﷺ کی مدح اور مدد کرنے والا برابر ہوں گے؟

وَ جِبْرِيْلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ فِيْنَا وَرُوْحُ الْقُدُسِ لَيْسَ لَهُ كِفَاءُ

اور اللہ تعالیٰ کے پیامبر جبریل امین علیہ السلام ہمارے ساتھ ہیں اور روح القدس کا تو کوئی ہمسر ہے ہی نہیں۔(1)

ابن سیرین سے مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو فرمایا ہجو کا جواب دیجیے تو انہوں نے اشعار کہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ ان پر تیر لگنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔(2)

فائدہ:۔ ان احادیث سے ثابت ہوا کہ شعر کہنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس میں جھوٹ اور اس کے مشابہ محرمات سے اجتناب کیا جائے۔ دارقطنی نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس شعر کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ ایک کلام ہے، اگر یہ حسین ہو تو اچھا ہے اور اگر قبیح ہو تو برا ہے(3)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے سچا کلام جو کسی شاعر نے کہا وہ لبید کا کلام ہے "اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ" (خبردار! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے باطل ہے) متفق علیہ(4)۔ عمرو بن الشرید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کا ردیف تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تیرے پاس امیہ بن صلت کے اشعار میں سے کوئی شے ہے؟ تو میں نے کہا جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا سناؤ چنانچہ میں نے اس کا ایک شعر پڑھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اور سناؤ۔ میں نے ایک شعر اور پڑھا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا اور سناؤ حتیٰ کہ میں نے آپ ﷺ کو سو اشعار سنا دیئے۔ رواہ مسلم(5)۔ حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ایک جنگ میں تھے کہ آپ ﷺ کی انگلی سے خون بہنے لگا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔

هَلْ اَنْتَ اِلَّا اِصْبَعٌ دُمِيْتِ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا لَقِيْتِ

(تو صرف ایک انگلی ہے جو خون آلود ہوئی ہے جو تو نے دکھ پایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں پایا۔ متفق علیہ)(6)

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر کشاف، جلد 3 صفحہ 345 (دار الکتب العربی بیروت)
3۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 155 (المحاسن)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 240 (قدیمی)
5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 240 (قدیمی)
6۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 393 (وزارت تعلیم)

حضرت شعبی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ شعر کہتے تھے۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شعر کہا کرتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تینوں میں سب سے زیادہ شعر کہنے والے تھے۔(1)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ مسجد میں شعر کہتے بھی تھے اور سنتے بھی تھے۔ پس یہ روایت ہے کہ آپؓ نے عمرو بن ربیعہ کو بلایا اور اسے وہ قصیدہ سنانے کو کہا جس کا پہلا شعر یہ تھا۔

اَمِنْ اٰلِ نُعْمٰی اَنْتَ غَادٍ وَّ مُبَکِّرٌ غَدَاةَ غَدَامِ رَائِحٌ فَمُهْجِرٌ

کیا تو آل نعمی کے پاس سے کل صبح تڑکے تڑکے جانے والا ہے یا شام کو جلدی سے جانے والا ہے۔

پس ابن ابی ربیعہ نے یہ قصیدہ آخر تک سنایا اور یہ تقریباً 70 ستر اشعار پر مشتمل تھا۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مکمل قصیدہ دوبارہ پڑھایا کیونکہ آپ ایک ہی بار سن کر قصیدہ یاد کرلیا کرتے تھے۔(2)

فائدہ:۔ شعر اطاعت ہے اگر اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو یا یہ علوم دین میں سے ایک علم ہے یا یہ مسلمانوں کے لیے وعظ و نصیحت ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک شعر میں حکمت و دانائی ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔(3) صخر بن عبد اللہ بن بریدہ نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ بے شک کبھی بیان میں جادو ہوتا ہے، کبھی علم میں جہالت ہوتی ہے، کبھی شعر میں حکمت ہوتی ہے اور کبھی قول میں اف کہنا محتاجی ہوتی ہے(4)۔ ابوداؤد نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بے شک بیان میں سحر ہے اور شعر میں حکمت ہے(5)۔ اسے ابوداؤد اور احمد نے روایت کیا ہے اور حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ بے شک مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور اپنی زبان سے بھی۔ ابوداؤد، نسائی اور دارمی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مشرکین کے ساتھ اپنے مالوں، جانوں اور زبانوں کے ساتھ جہاد کرو(6)۔ اللہ تعالیٰ نے مشرک اور مسلمان شعراء کا ذکر کرنے کے بعد مشرکین شعراء کو ڈراتے ہوئے فرمایا۔

؁ یعنی عنقریب وہ جان لیں گے جنہوں نے شرک کیا یا رسول اللہ ﷺ کی ہجو کی۔

؎ "مُنْقَلَبٍ" یہ مصدر ہے یا اپنے مابعد کے سبب ظرف منصوب ہے۔ اسے مقدم اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ استفہام صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ جملہ استفہامیہ سَیَعْلَمُ کے دومفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اور یہ استفہام تہدید کے لیے ہے۔

؁ یعنی لوٹنا کون سی لوٹنے کی جگہ پر ہے جس کی طرف وہ موت کے بعد لوٹیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جہنم اور دوزخ کی طرف۔(7)

علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ سخت ترین ڈراوا ہے کیونکہ سَیَعْلَمُ میں وعید بلیغ ہے۔ اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا میں اطلاق اور تعمیم ہے۔ اور اَیَّ مُنْقَلَبٍ میں ابہام اور تہویل ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ ظلم کرنے والے عذاب سے لوٹ آنے کا طمع رکھتے ہیں اور وہ عنقریب جان

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 908 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 328 (وزارت تعلیم) 5۔ ایضاً 6۔ سنن الدارمی، جلد 2 صفحہ 132 (المحاسن)
7۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

لیں گے کہ ان کے لیے اس سے بچ نکلنے کا کوئی سبب نہیں۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ میرے والد محترم نے وصیت میں دو سطریں لکھیں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ یہ وصیت ہے جو ابوبکر بن ابی قحافہ نے دنیا سے جاتے ہوئے اس وقت کی جب کافر مومن ہو جاتا ہے، فاجر متقی بن جاتا ہے اور کاذب صادق بن جاتا ہے۔ بے شک میں نے تم پر عمر بن خطاب کو خلیفہ مقرر کیا ہے، میری امید اور خیال کے مطابق وہ عدل کریں گے اور اگر وہ زیادتی کریں اور کوئی تبدیلی کر دیں تو میں غیب نہیں جانتا وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (1)

الحمد لله رب العالمين و صلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد وآله و اصحابه اجمعين

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 189 (العلمیہ)

اٰیاتھا ۹۳ سُوْرَۃُ النَّمْلِ مَکِّیَّۃٌ ۲۷ رکوعاتھا ۷

سورۃ النمل مکی ہے اور اس کی ترانوے آیتیں اور سات رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱﴾

''طا۔سین یہ آیتیں ہیں قرآن (حکیم) اور روشن کتاب کی لے''

لے تِلْكَ کا اشارہ سورت کی آیات کی طرف ہے۔ اور کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے اور اس کے مبین ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس میں وہ سب کچھ لکھ دیا گیا ہے جو ہونے والا ہے۔ پس اس میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے تنبیہ ہے۔ یہاں کتاب کا ذکر مؤخر ہے جبکہ سورۂ حجر میں مقدم ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اس کے ساتھ ہمارے علم کے تعلق کی بناء پر اسے مؤخر ذکر کیا جبکہ وہاں قرآن پر کتابت کے مقدم ہونے کے اعتبار سے اسے مقدم کیا۔ یا اس سے مراد وہ قرآن جو حلال وحرام اور دیگر احکام کی وضاحت بیان کرتا ہے۔ اور اپنے معجز ہونے کے سبب اپنی صحت کو بیان کرتا ہے۔ اور قرآن پر اس کے عطف کی حیثیت یہ ہے جیسے دو صفتوں میں سے ایک صفت دوسری پر معطوف ہو۔ اور اس کی تنکیر تعظیم کے لیے ہے۔ یہاں کتاب کو نکرہ ذکر کیا اور سورۂ حجر میں معرفہ اور قرآن کو وہاں نکرہ ذکر کیا اور یہاں معرفہ ذکر کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اور کتاب دونوں علم ہیں اس (وحی) کا جو حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی۔ اور یہ دونوں اس کا وصف بھی ہیں کیونکہ اسے پڑھا بھی جاتا ہے اور لکھا بھی۔ لہٰذا جہاں معرفہ مذکور ہیں وہاں ان سے مراد علم ہے اور جہاں نکرہ مذکور ہیں وہاں ان سے مراد وصف لیا گیا ہے۔

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾

''یہ سراپا ہدایت ہے اور خوشخبری ہے اہل ایمان کے لیے لے''

لے هُدًى وَّبُشْرٰى دونوں منصوب ہیں اور قرآن سے حال ہیں اور ان دونوں میں عامل معنی الاشارۃ ہے۔ یا دونوں مجرور ہیں اور اس سے بدل ہیں یا دونوں مرفوع ہیں اور تِلْكَ کی دوسری دو خبریں ہیں یا مبتداء محذوف کی خبریں ہیں یعنی هِيَ هُدًى وَّبُشْرٰى اور لِلْمُؤْمِنِيْنَ تنازع الفعلین کے طریقے پر ھدیٰ اور بشریٰ کے متعلق ہے۔ یا صرف بُشْرٰى کے متعلق ہے یعنی یہ تمام مخلوق کے لیے ہدایت ہے لیکن جس نے ہدایت حاصل نہ کی تو یہ اس کی اپنی بری سوچ اور پسند کا نتیجہ ہے۔ اور یہ بشارت اور خوشخبری صرف مؤمنین کے لیے ہے۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۳﴾

''جو صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز ۱؎ اور دیا کرتے ہیں زکوٰۃ اور وہ جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں ۲؎ ''

۱؎ جو نماز کے فرائض، سنن اور اس کے آداب کی حفاظت کرتے ہیں (یعنی نماز کو پورے آداب اور پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں)۔

۲؎ یہ صلہ کے تتمہ میں سے ہے اور یہ واؤ حالیہ ہے یا عاطفہ۔ یہاں مسند الیہ کو فعل پر مقدم کر کے سیاق کلام میں تبدیلی اس لیے کی گئی ہے کہ یہ ان کی قوت یقین اور ان کے ثبات پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس سے حصر مقصود ہے۔ یعنی وہ آخرت پر اس طرح یقین نہیں رکھتے جیسے حق ہے مگر وہی لوگ جن میں ایمان اور اعمال صالحہ دونوں جمع ہوں۔ کیونکہ اعمال میں ان کا جدو جہد کرنا یہ ان کے ایقان پر دلیل ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی جائز ہے کہ یہ کلام صلہ سے خارج ہو اور یہ جملہ مستانفہ ہو جیسا کہ اس پر کلام کی تبدیلی دلالت کرتی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اس طرح یقین رکھتے ہیں نہ کہ کوئی اور۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

''بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے خوبصورت بنا دیے ان (کی نظروں) میں ان کے اعمال (بد) پس وہ سرگرداں پھر رہے ہیں ۱؎ ''

۱؎ بے شک وہ لوگ جو ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے قبیح اعمال ان کے لیے اس طرح خوبصورت بنا دیے ہیں کہ انہیں نفس پر مسلط کر دیا ہے اور نفس انہیں چاہنے لگا ہے۔ وہ ان کے انجام کو نہیں پہچانتے۔ زَيَّنَّا کا جملہ اِنَّ کی خبر ہے۔ اور فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ اس پر معطوف ہے۔ یا یہ ان کی خبر ہے اور فاء موصول کو متضمن ہے جو شرط کے معنی میں ہے۔ اور زَيَّنَّا لَا يُؤْمِنُوْنَ کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے قَدْ مقدر ہے۔ اور اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ جملہ معترضہ ہے اور یہ ان کی حالت بیان کرنے کے لیے ہے جن سے مذکورین کو ڈرایا جا رہا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝

''یہ وہی لوگ ہیں جن کے لیے بدترین عذاب ہے اور یہی آخرت میں سب سے زیادہ گھاٹے میں ہوں گے ۱؎ ''

۱؎ یہ وہی لوگ ہیں جن کے لیے دنیا میں بدترین عذاب ہے۔ اس میں ان کی اس ذلت آمیز شکست کی خبر ہے جس سے وہ جنگ بدر کے دن قتل، قید اور ذلت و رسوائی میں سے دوچار ہوئے۔ اور وہ دوسروں کی نسبت آخرت میں زیادہ گھاٹے میں ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے درمیان انہیں یہ اعزاز بخشا کہ ان ہی میں سے ان میں رسول مبعوث فرمایا اور اس سے انہیں پاک کرنے، ان کا تزکیہ کرنے اور انہیں دنیا اور آخرت میں اعزاز و اکرام دینے کا ارادہ فرمایا۔ لیکن انہوں نے اس کے مقابلہ میں دنیا میں قتل اور قید اور آخرت میں بھڑکنے اور جلانے والی آگ کو پسند کیا۔ اولئک سے لے کر آخر تک مکمل جملہ اپنے معطوف سمیت مستانفہ ہے اور یہ ان کے انجام کو بیان کرنے کے لیے ہے۔

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝

''اور بے شک آپ کو سکھایا جاتا ہے قرآن حکیم بڑے دانا، سب کچھ جاننے والے کی جانب سے ۱؎ ''

۱؎ اس جملے کا عطف اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ پر ہے۔ اس میں حکیم اور علیم کی تنکیر تعظیم کے لیے ہے۔ یعنی اس حکیم اور علیم کی طرف سے جس کی

کنہ علم اور حکمت کو کوئی نہیں پہچان سکتا۔ یہاں دو وصفوں کو جمع کیا گیا ہے حالانکہ علم حکمت میں داخل ہے، ایک تو اس لیے کہ علم عام ہے اور حکمت فعل کی پختگی پر دلالت کرتی ہے اور دوسرا یہ احساس دلانے کے لیے کہ علوم میں سے بعض علوم حکمت ہیں مثلاً عقائد اور احکام شریعت اور بعض وہ ہیں جو اس طرح نہیں مثلاً قصص اور مغیبات کی خبریں یہ قصص کو ذکر کرنے کی تمہید ہے۔

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ۞

"(یاد فرماؤ) جب کہا موسیٰ نے اپنی زوجہ سے [1] کہ میں نے دیکھی ہے آگ۔ ابھی لے آتا ہوں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر [2] یا لے آؤں گا تمہارے پاس (اس آگ سے) کوئی شعلہ سلگا کر [3] تاکہ تم اسے تاپو [4]"

[1] جب موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے مصر کی طرف سفر کرتے ہوئے اپنی زوجہ سے کہا۔ یہ ظرف اُذکر فعل کے متعلق ہے۔ اور علیم کے متعلق کرنا بھی جائز ہے۔

[2] "اِنِّیْ" کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء مفتوح کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ تم اپنی جگہ پر ٹھہرو میں ابھی وہاں سے راستے کی کوئی خبر لے آتا ہوں کیونکہ وہ راستہ بھول گئے تھے اور سین بہت زیادہ مسافت سے لانے کے وعدے پر دلالت کرنے کے لیے ہے، اگرچہ دیر ہی ہو جائے۔ یہاں سَآتِیْکُمْ یقین پر دلالت کرنے کے لیے ذکر کیا گیا ہے اور سورۂ قصص میں لَعَلِّیْٓ اٰتِیْکُمْ حرف ترجی کے ساتھ مذکور ہے۔ کیونکہ امید دلانے والا اپنی امید کے حصول کی تقدیر پر بالیقین اسے لانے کا وعدہ کرتا ہے اور یہ اس شے کے عزم و جزم کا احساس دلاتا ہے جس کا وہ وعدہ کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ روایت بالمعنی جائز ہے اور نکاح لفظ نکاح اور تزویج کے بغیر ان الفاظ کے ساتھ جائز ہے جو اس کا معنی ادا کر سکتے ہیں۔

[3] کوفیوں نے بِشِهَابٍ تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس لیے کہ "قَبَسٍ" اس سے بدل ہے یا اس کی صفت ہے۔ کیونکہ شہاب سے مراد بھڑکنے والی آگ کا شعلہ ہے۔ اور قبس سے مراد آگ کا وہ شعلہ ہے جو بڑی آگ سے حاصل کیا جاتا ہے(1)۔ جیسا کہ قاموس میں ہے۔ اور باقیوں نے بغیر تنوین کے شہاب کو قبس کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے۔ اور یہ اضافت بیانیہ ہے کیونکہ شہاب پر قبس کا اطلاق کرنا جائز ہے۔

علامہ بغوی نے کہا ہے کہ شہاب اور قبس دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں کیونکہ قبس سے مراد وہ لکڑی ہے جس کی ایک طرف آگ لگی ہوئی ہو اور اس کی دوسری طرف میں آگ نہ ہو۔

[4] "تَصْطَلُوْنَ" الصلی سے باب افتعال ہے اور اس کا معنی ہے سخت سردی کے موسم میں ٹھنڈک کے وقت حرارت و گرمائش حاصل کرنے کے لیے آگ جلانا۔

فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ أَن بُورِكَ مَن فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۞

1۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 773 (التراث العربی)

”پھر جب اس کے پاس پہنچے [1] تو ندا کی گئی کہ بابرکت ہو [2] جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے آس پاس ہے [3] اور ہر (تشبیہ و تمثیل سے) پاک ہے اللہ جو رب العالمین ہے [4]“

[1] یعنی جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے قریب ہوئے جو انہوں نے دیکھی تھی۔ جب کوئی منزل کے قریب ہو جائے اگرچہ بعد میں وہ اس تک نہ پہنچے تو کہا جاتا ہے ”بَلَغَ فُلَانٌ الْمَنْزِلَ“ (کہ فلاں منزل تک پہنچ گیا)

[2] ”نُوْدِیَ اَنْ م بُوْرِکَ“ میں اَنْ مفسرہ ہے کیونکہ نداء میں قول کا معنی ہے۔ یا پھر تقدیر عبارت یہ ہے بِاَنْ بُوْرِکَ۔ تو اس صورت میں اَنْ مصدریہ ہے یا مخففہ عن المثقلہ ہے۔ تخفیف اگرچہ لا، قد، سین یا سوف کے ساتھ تعویض کا تقاضا کرتی ہے لیکن یہ ایسا دعویٰ ہے جو بہت سے احکام میں دوسروں کے مخالف ہوتا ہے۔

[3] حضرات ابن عباس، سعید بن جبیر اور حسن رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے کہ پاک ہے اور بابرکت ہے وہ جو آگ میں ہے اور وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات گرامی ہے اس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ندا دی اور انہیں اپنا کلام سنایا(1)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نور تھا جسے موسیٰ علیہ السلام نے آگ گمان کیا۔ اسی لیے آپ نے لفظ نار (آگ) ذکر کیا۔ امام مسلمؒ نے ابوموسیٰؓ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے ہمیں پانچ باتیں ارشاد فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نہیں سوتا اور نہ ہی اسے سونا چاہیے۔ وہ میزان عدل جھکاتا ہے اور وہ اس کے ذریعہ رات کے عمل دن کے اعمال سے پہلے اور دن کے عمل رات کے اعمال سے پہلے اپنی طرف اٹھالیتا ہے۔ اس کا حجاب نور ہے اگر اسے دور کر دیا جائے تو اس کے چہرہ قدرت کی شعائیں حد نگاہ تک اپنی مخلوق کو جلا کر خاکستر بنادیں(2)۔ اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ وہ بعینہٖ آگ تھی اور یہ اللہ تعالیٰ کے حجابوں میں سے ایک ہے۔ جیسا کہ بعض روایات میں یہ مذکور ہے کہ اس کا حجاب آگ ہے اور اگر وہ اسے ہٹادے تو اس کے چہرہ قدرت کی نورانی شعائیں حد نگاہ تک مخلوق کو جلا کر رکھ دیں(3)۔ چنانچہ اس تاویل کی بنا پر یہ آیت آیات متشابہات میں سے ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ، وہ صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ غمام کے سائبانوں میں ان کے پاس آئے گا۔ چونکہ اس کلام میں محل اور تشبیہ کا وہم ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے اور وہ ہر عیب اور برائی سے بھی منزہ ہے اس لیے فرمایا وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

[4] مجاہد نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا آگ میں برکت رکھ دی گئی۔ حضرت سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ میں نے اُبیؓ کو یہ کہتے سنا کہ آگ اور اس کے اردگرد والوں میں برکت رکھ دی گئی(4)۔ اس معنی کی بناء پر لفظ مَنْ زائدہ ہے اور بورک النار اور بورک فی النار دونوں کا معنی ایک ہے۔ کیونکہ عرب ایک ہی معنی میں یہ کہتے رہتے ہیں بارک اللہ، بارک فیہ اور بارک علیہ۔ اور معنی یہ ہے کہ آگ میں برکت رکھ دی گئی اور ان میں جو اس کے اردگرد ہیں۔ اور وہ ملائکہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔ اور آگ کو مبارک اسی طرح کہا گیا ہے جیسے اس قول باری تعالیٰ میں بقعہ کو مبارکہ کہا گیا ہے ”فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ“ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے بابرکت ہے وہ جو آگ کی تلاش میں ہے یا جو آگ کی جگہ میں ہے۔ اس صورت میں مضاف محذوف ہے۔ یعنی اصل عبارت یہ ہے ”بُوْرِکَ مَنْ فِيْ طَلَبِ النَّارِ اَوْ مَنْ فِيْ مَكَانِ النَّارِ“ اور وہ حضرت موسیٰ علیہ

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا　2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 99 (قدیمی)　3۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا　4۔ ایضاً

السلام ہیں۔ اور من حولھا سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو آگ کے اردگرد وہاں حاضر تھے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے برکت کا سلام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملائکہ کے ذریعے سلام پہنچایا جبکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے۔ تو انہوں نے کہا" رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ "

اور یہ قول بھی ہے کہ مَنْ فِي النَّارِ سے مراد ملائکہ ہیں۔ اس لیے کہ وہ نور جو موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا اس میں ملائکہ تھے۔ ان میں تسبیح وتحمید اور پاکیزگی بیان کرنے والا آدمی تھا اور من حولھا سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ آپ ان کے قریب تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مَنْ حَوْلَهَا عام ہے اور ان تمام کو شامل ہے جو اس وادی میں تھے یا اس کے اردگرد شام کی اس سرزمین پر تھے جسے برکات سے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ وہ سرزمین انبیاء کے مبعوث ہونے کا مقام ہے۔ اور اس کا خطاب صرف آپ کو کرنا یہ اس کی بشارت ہے کہ آپ کے لیے ایسے امر عظیم کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کی برکت شام کی اطراف واکناف میں پھیل جائے گی۔ مذکورہ تمام تاویلات کی بناء پر اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اس تشبیہ کے وہم کو ختم کرنے کے لیے ہے جو کلام سننے سے پیدا ہوتا ہے اور اس امر کی عظمت پر تعجب کا اظہار کرنے کے لیے ہے۔

يٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۹﴾

"اے موسیٰ! وہ میں اللہ ہی ہوں عزت والا، دانا [1]"

[1] اس میں ضمیر شان اِنَّ کا اسم ہے اور اَنَا اللّٰهُ اس کی خبر ہے۔ یا ضمیر منادی کے لیے اس کا اسم ہے اَنَا اس کی خبر ہے اور لفظ اللہ اس کے لیے عطف بیان ہے اور الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ دونوں اس کی صفات ہیں جنہیں بطور تمہید ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ اظہار فرمایا کہ میں قوت والا ہوں اور میں وہ کچھ کرنے کی قدرت رکھتا ہوں جو وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا۔ جیسے عصا کو سانپ سے تبدیل کر دینا اور میں ہر کام حکمت اور تدبیر کے ساتھ کرنے والا ہوں۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۰﴾

"اور ذرا زمین پر ڈال دو اپنے سونٹے کو [1]، اب جو اسے دیکھا تو وہ (اس طرح) لہرا رہا تھا جیسے سانپ ہو، آپ پیٹھ پھیر کر وہاں سے چل دیئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا [2] (فرمایا) موسیٰ! ڈرو نہیں [3] میرے حضور ڈرا نہیں کرتے جنہیں رسول بنایا جاتا ہے [4]"

[1] اس کا عطف بُوْرِكَ پر ہے اور یہ اَنْ مفسرہ کے محل میں داخل ہے۔ اور اس پر ایک اور مقام میں یہ قول دلالت کرتا ہے کہ وہاں اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ اس قول کے بعد ہے "اَنْ يّٰمُوْسٰۤى اِنِّيْۤ اَنَا اللّٰهُ" تو اس میں اَنْ مکرر مذکور ہے۔ لہٰذا مفہوم یہی ہوگا کہ اس قول کے ساتھ بھی آپ کو ندا دی گئی اور اس قول کے ساتھ بھی۔ پس یہ مفرد کا عطف مفرد پر کرنے کے قبیلے سے ہے۔ نہ کہ انشاء کا عطف خبر پر ہے۔

[2] پس جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا دیکھا تو وہ حالت اضطراب میں لہرا رہا تھا گویا کہ وہ اپنے تیز دوڑنے اور کثرۃ اضطراب کے سبب خفیف سانپ ہے۔ تو موسیٰ علیہ السلام خوف کے سبب پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے اور واپس نہ لوٹے۔ لَمْ يُعَقِّبْ، عَقَّبَ الْمُقَاتِلُ

سے مشتق ہے۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب وہ بھاگنے کے بعد واپس لوٹ آئے۔

۳؎ جملہ نداء اور اس کا مابعد محل نصب میں ہے کیونکہ اس سے پہلے قول مقدر ہے۔ یعنی ہم نے کہا اے موسیٰ! اس سانپ سے خوف نہ کھایئے۔

۴؎ یعنی میرے ساتھ ان کے قرب کی وجہ سے اور میرے حضور ان کے استقرار کی وجہ سے ان کے لیے کوئی خوف نہیں۔ یہ جملہ خوف نہ ہونے کی علت بیان کرنے کے مقام میں ہے۔ یعنی وہ لوگ جو میرے پیغامات پہنچاتے ہیں وہ صرف مجھ ہی سے ڈرا کرتے ہیں، وہ میرے سوا کسی سے بھی نہیں ڈرتے۔ اس آیت کریمہ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کے درمیان کوئی منافاۃ اور تضاد نہیں۔ اَنَا اَخْشَاکُمْ بِاللّٰہِ(1)۔ (میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں)۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ استغراق کی زیادتی کے سبب نزول وحی کے وقت مطلقاً نہیں ڈرتے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ بے شک ان کا انجام بد نہیں ہوگا کہ وہ ڈرتے رہیں۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱﴾

"مگر وہ شخص جو زیادتی کرے (وہ ڈرے) پھر (وہ ظالم بھی اگر) نیکی کرنے لگے برائی کرنے کے بعد ۱؎ تو میں بے شک غفور رحیم ہوں ۲؎"

۱؎ کہا گیا ہے کہ یہ استثناء متصل ہے۔ اور اس کا اشارہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے کیونکہ انہوں نے قبطی کو مار ڈالا تھا۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو اپنے سوا کسی سے خوفزدہ نہیں کرتا مگر ایسے گناہ سے جو ان میں سے کسی سے سرزد ہو جائے۔ یہاں ظلم سے مراد گناہ صغیرہ یا ترک افضل ہے۔ اسی بناء پر آگے ارشاد یہ ہے۔ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ یعنی گناہ کے بعد توبہ کر لی۔ اس کا عطف ظلم پر ہے اور صلہ میں داخل ہے۔ اس کے لیے یہ قید اس لیے ذکر کی گئی ہے کہ انبیاء سے گناہ کا صادر ہونا جائز نہیں ہوتا اگر چہ وہ گناہ صغیرہ ہو یا نبوت سے پہلے ہو مگر اس کے بعد وہ توبہ کر لیتے ہیں۔

۲؎ اس کا عطف بدّل پر ہے اور تقدیر کلام یہ ہے "فَاِنِّیْ اَغْفِرُلَہٗ وَاَرْحَمُہٗ" کہ میں اسے بخش دیتا ہوں اور اس پر رحم فرما دیتا ہوں۔ یہ قول بھی ہے کہ ثُمَّ بَدَّلَ آخر تک نیا کلام ہے اور یہ محذوف پر معطوف ہے اور یہ تمام لوگوں میں سے ظلم کرنے والوں کا حال بیان کرنے کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "فَمَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ"۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے کیونکہ رسولوں کے لیے ظلم جائز ہی نہیں ہوتا۔ اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی لٰکِنْ مَنْ ظَلَمَ مِنَ النَّاسِ وَھُمْ غَیْرُ الْمُرْسَلِیْنَ فَاِنَّھُمْ یَخَافُوْنَ غَیْرَ اللّٰہِ تَعَالٰی۔ (لیکن لوگوں میں سے جنہوں نے ظلم کیا درآنحالیکہ وہ رسول نہیں بے شک وہ غیر اللہ سے ڈرتے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس خدشے کا استدراک ہے جو تمام سے خوف کی نفی کے بارے سینے میں کھٹک جاتا ہے اس کے باوجود کہ ان میں ایسے بھی ہیں جن سے صغیرہ سرزد ہوئے۔ لہٰذا تقدیر عبارت یہ ہوگی لٰکِنَّ مَنْ صَدَرَمِنْہُ صَغِیْرَۃٌ مِنْھُمْ۔ (لیکن ان میں سے وہ جن سے صغیرہ صادر ہوئے) کیونکہ اگر چہ ان سے صغیرہ صادر ہوئے لیکن اس کے بعد انہوں نے ایسا عمل کیا، جس نے صغیرہ کو مٹا ڈالا اور اس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت اور رحمت کے مستحق بن گئے۔ چنانچہ وہ بھی غیر اللہ سے نہیں ڈرتے۔

لیکن مذکورہ دونوں تاویلیں یہ تقاضا کرتی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام سانپ سے نہیں ڈرے اور یہ امر واقعہ کے مطابق نہیں۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے فَلَمَّا رَاٰھَا۔ "وَلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ" اور یہ ارشاد بھی ہے فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی مگر یہ کہ اس سے مراد

انبیاء سے مطلق خوف کی نفی ہو کیونکہ یہ فرمادیا گیا ہے کہ ان کا انجام برا نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ لیکن سیاق کلام اس سے موافقت نہیں کرتا کیونکہ جو منہی عنہ موجود ہے وہ سانپ سے خوف کھانا ہے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے کہ یہاں اِلَّا معنی وَلَا ہے۔ یعنی" لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ وَلَا الْمُذْنِبُوْنَ التَّائِبُوْنَ"(میرے حضور ڈرا نہیں کرتے جنہیں رسول بنایا جاتا ہے اور نہ توبہ کرنے والے گنہگار ڈرتے ہیں)۔ اس سے مراد مؤمنین صلحاء ہیں کیونکہ وہ معصوم عن الخطا نہیں اور نہ ہی گناہ سے مبرہ ہیں لیکن جس نے توبہ کے ساتھ اپنے گناہ کو زائل کر دیا وہ اسی کی مثل ہو گیا جس سے گناہ صادر نہیں ہوتا۔ یہ تاویل بھی سابقہ دونوں تاویلوں کے طرح مطلق خوف کی نفی سے مناسبت رکھتی ہے نہ کہ صرف غیر اللہ کے خوف سے۔

وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۱۲﴾

''اور ذرا ڈالو اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں [1] وہ نکلے گا سفید چمکتا ہوا [2] بغیر کسی تکلیف کے [3] (یہ دو معجزے) ان نو معجزات سے ہیں جن کے ساتھ آپ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا [4] بے شک وہ بڑے سرکش لوگ ہیں [5]''

[1] اس کا عطف اَلْقِ عَصَاکَ پر ہے۔ یعنی اور ذرا ڈالو اپنا ہاتھ اپنی قمیص کے گریبان میں۔ اور اس سے مراد قمیص کی طرف ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے (1)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ جَیْب سے مراد قمیص ہے کیونکہ اسے کاٹا جاتا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اہل تفسیر نے کہا ہے۔ کہ آپ اون کا بنا ہوا ایسا جبہ پہنے ہوئے تھے جس کی نہ کوئی آستین تھی اور نہ اس کے بٹن تھے۔

[2] تَخْرُجْ جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے "اِنْ تُدْخِلْ يَدَكَ تَخْرُجْ"(اگر تو اپنا ہاتھ ڈالے گا تو وہ) سفید چمکتا ہوا نکلے گا۔ جس کا نور سورج کے نور پر بھی غالب آجائے گا۔ ترکیب میں بیضاء تَخْرُجْ کی ضمیر مستتر سے حال ہے۔

[3] مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اس سے مراد ہے "كَائِنًا مِّنْ غَيْرِ بَرَصٍ" وہ بغیر برص (کی بیماری) کے اس طرح ہوگا۔ ترکیب کلام میں یہ بیضاء کی صفت ہے۔ یا اس کے لیے حال مترادف ہے۔ یا پھر بیضاء کی ضمیر سے حال ہے۔

[4] یعنی آپ کے یہ دو معجزے من جملہ ان نو معجزات میں سے ہیں۔ یا ان کے ساتھ مزید نو ہیں۔ اور وہ یہ ہیں سمندر میں شگاف ہونا، طوفان آنا، مکڑی کا آنا، جوؤں کا زیادہ ہونا، مینڈکوں کی کثرت، خون کا ظاہر ہونا، ان کے جنگلوں کا خشک ہو جانا۔ جنہوں نے عصاء اور ہاتھ کے معجزہ کو ان نو میں شمار کیا ہے انہوں نے آخری دونوں کو ایک شمار کیا ہے۔ اور فلق بحر کو ان میں شامل نہیں کیا ہے کیونکہ اس معجزہ کے ساتھ آپ کو فرعون کی طرف نہیں بھیجا گیا۔ یا پھر تقدیر عبارت یہ ہے "اِذْهَبْ فِيْ تِسْعِ اٰيَاتٍ"(نو معجزات لے کر جاؤ) یہ اس بناء پر ہے کہ ارسال کے ساتھ جملہ مستانفہ ہے۔ اور یہ قول اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ اس کے متعلق ہے۔ اور پہلی دونوں تاویلوں کے مطابق یہاں مبعوثا یا مرسلا مقدر ہے اور یہ اَلْقِ اور اَدْخِلْ کے فاعل سے تنازع الفعلین کے اصول کے مطابق حال ہے۔

[5] یہ جملہ ارسال کے لیے علت بن رہا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾

''پس جب آئیں ان کے پاس ہماری نشانیاں بصیرت افروز بن کر [1] تو انہوں نے کہا یہ تو جادو ہے کھلا ہوا [2]''

1۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 144 (التراث العربی)

ا۔ یعنی جب موسیٰ علیہ السلام وہ لے کر ان کے پاس آئے۔ درآنحالیکہ وہ بین اور واضح تھیں۔ مُبْصِرَۃً صیغہ اسم فاعل بمعنی اسم مفعول ہے۔ اور یہ اس چیز کی علامت ہے کہ وہ دیکھنے والوں کے لیے اتنی زیادہ واضح تھیں کہ قریب تھا کہ وہ خود دیکھنے لگتیں۔ اگر وہ ان چیزوں میں سے ہوتیں جو دیکھ سکتی ہیں۔ یا اگر وہ ایسی آنکھ والی ہوتیں جس سے دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ تو فرعون اور اس کی قوم نے کہا اس کی جادوگری واضح ہے۔ اور لَمَّا جَآءَتْهُمْ کا جملہ ایک محذوف جملہ پر معطوف ہے۔ اور وہ نُوْدِیَ پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "نُوْدِیَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ وَاَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ اذْهَبْ فِیْ تِسْعِ اٰیَاتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ" یا یہ "مَبْعُوْثًا اِلَیْهِمْ اذْهَبْ اِلَیْهِمْ فَاَ لْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ وَاَدْخَلَ یَدَهٗ فِیْ جَیْبِهٖ ثُمَّ اذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ"

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۚ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۱۴﴾

" اور انہوں نے انکار کر دیا ان کا حالانکہ یقین کر لیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے ا۔ (ان کا انکار) محض ظلم اور تکبر کے باعث تھا ۲۔ پس آپ ملاحظہ فرمائیے کیا (ہولناک انجام ہوا فساد برپا کرنے والوں کا) ۳۔"

ا۔ یعنی انہوں نے ہماری علامات کا انکار کر دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اس کا عطف قَالُوْا پر ہے اور وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ اصل میں ہے "وَقَدِ اسْتَیْقَنَتْهَا" کیونکہ یہ واؤ حالیہ ہے۔ اور استیقان ایقان کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔

۲۔ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا یہ دونوں مفعول لہٗ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ یا جَحَدُوْا کے فاعل سے حال ہیں۔ یعنی ظلم اور تکبر کی وجہ سے انہوں نے انکار کیا۔ یا اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہوئے انہوں نے دائمی آگ اجرت پر لے لی اور جو کچھ موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے اس پر ایمان لانے سے تکبر کرتے ہوئے انہوں نے ایسا کیا۔ پس اے مخاطب! نگاہ بصیرت سے دیکھ۔

۳۔ اس میں كَیْفَ كَانَ کی خبر مقدم ہے۔ اور اسے مقدم اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہ صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ جملہ اُنْظُرْ کا مفعول ہے۔ یعنی آپ ان کے انجام کی کیفیت تو دیکھئے کس طرح انہیں دنیا میں غرق کر دیا گیا۔ اور موت کے بعد وہ آگ میں داخل کر دیئے گئے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۵﴾

" (اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا داؤد اور سلیمان کو علم ا۔ اور انہوں نے کہا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے برگزیدہ کیا ہمیں ۲۔ اپنے بہت سے مومن بندوں پر ۳۔"

ا۔ اور یقیناً ہم نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو ان کی طاقت بشریہ کے مطابق اپنی ذات وصفات اور احکام کا علم، دنیا اور آخرت کے احوال کا علم۔ پرندوں اور چوپاؤں کی بولیوں کا علم، پہاڑوں کی تسبیح اور لوہے کو نرم کرنے کا علم عطا فرمایا۔

۲۔ اور انہوں نے اس نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہمیں نبوت، کتاب اور دیگر

چیزوں کے ساتھ فضیلت عطا فرمائی۔

۳؎ وَقَالَا میں واؤ کے ساتھ اس کا عطف یہ شعور دلاتا ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا وہ اس نعمت کے مقابلے میں بعض ہے جو انہیں عطا کی گئی۔ اور یہ محذوف عبارت پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے " فَعَمِلاَ عَلٰی حَسْبِ مَا عَلِمَا وَعَرَفَا حَقَّ النِّعْمَةِ وَقَالَا هٰذَا الْقَوْلَ " (یعنی علم کے مطابق عمل کرتے ہوئے اور نعمت کا حق پہچانتے ہوئے انہوں نے یہ قول کہا) اور اگر محذوف مقدر نہ ہوتا تو واؤ کی جگہ فاء مناسب ہوتی۔ جیسا کہ تیرے اس قول میں ہے " اَعْطَيْتُهُ فَشَكَرَ " آیت طیبہ میں علم کے شرف وعظمت پر دلیل موجود ہے اور یہ کہ یہ موجب فضل ہے اور علماء کو دیگر افراد پر مقدم کرنے کا سبب ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "فَضْلُ العالِمِ عَلَى العابدِ كَفَضْلِ القَمَرِ لَيْلَةَ البَدْرِ عَلَى سَائِرِ الكَوَاكِبِ وَاِنَّ العُلَمَاءَ وَرَثَةُ الاَنْبِيَاءِ وَاِنَّ الاَنْبِيَاءَ لَم يُوَرِّثُوا دِيْنَارًا وَلَا دِرْهَمًا اِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ اَخَذَهُ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ "(1) رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ من حدیث کثیر بن قیس وسماہ الترمذی قیس بن کثیر۔ (عالم کی فضیلت عابد پر اس طرح ہے جیسے چودھویں رات کے بدر منیر کو دیگر تمام ستاروں پر فضیلت حاصل ہے۔ اور بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ اور انبیاء درہم ودینار کا وارث نہیں بناتے بلکہ وہ علم کا وارث بناتے ہیں۔ پس جس نے اسے حاصل کر لیا اس نے حظ وافر حاصل کر لیا) اور آقائے دو جہاں ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا" فَضْلُ العالِمِ عَلَى العَابِدِ كَفَضْلِي عَلٰى اَدْنَاكُم "(2) (عالم کو عابد پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جیسے مجھے تم میں سے ادنی پر) اسے امام ترمذیؒ نے ابوامامہ باہلیؓ سے نقل کیا ہے۔ اور اس میں نعمت علم پر شکر ادا کرنے پر برانگیختہ کرنا ہے اور تواضع اختیار کرنے اور یہ اعتقاد رکھنے پر ابھارنا ہے کہ بہت سے افراد پر اسے فضیلت حاصل ہے اور بہت سے افراد کو اس پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (ہر صاحب علم سے اوپر بھی علم والا ہے)

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

"اور جانشین بنے سلیمان داؤد کے ۱؎ اور فرمایا اے لوگو! ہمیں سکھائی گئی ہے پرندوں کی بولی ۲؎ اور ہمیں عطا کی گئی ہیں ہر قسم کی چیزیں ۳؎ بے شک یہی وہ نمایاں بزرگی ہے (جو ہمیں مرحمت ہوئی) ۴؎"

۱؎ اور سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت، ملک اور علم کے وارث ہوئے۔ عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے اسی طرح نقل کیا ہے(3)۔ اس آیت سے روافض نے یہ استدلال کیا ہے کہ بے شک انبیاء بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنے وارث بناتے ہیں۔ حالانکہ یہ آیت ان کے خلاف حجت ہے ان کے حق میں نہیں۔ کیونکہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کے وارث صرف حضرت سلیمان علیہ السلام بنے نہ کہ آپ کی تمام اولاد۔ حالانکہ داؤد علیہ السلام کے انیس بیٹے تھے۔ اور ارث کا معنی یہ ہے کہ کسی شے کا ایک دوسرے کی طرف منتقل ہو جانا اس طرح کہ ان کے درمیان عقد قائم نہ ہو اور نہ ہی کوئی ایسی صورت قائم ہو جو عقد کے قائم مقام ہو چاہے ان دونوں کے درمیان کوئی قرابت ہو یا نہ ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد "لانورث" کا معنی یہ ہے کہ لوگوں میں سے کوئی بھی نبی کے وصال کے بعد

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 93 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً 3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

اس کے مال کا مالک نہیں ہوگا بلکہ وہ مال اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں موقوف ومحبوس ہو جاتا ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ جو کچھ داؤد علیہ السلام کو دیا گیا تھا سلیمان علیہ السلام کو وہ بھی دیا گیا اور ہوا اور شیاطین کی تسخیر کا اضافہ کیا گیا۔ اور مزید کہا کہ مقاتل نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا ملک داؤد علیہ السلام سے بڑا تھا اور سلیمان علیہ السلام اور ان سے زیادہ بہتر فیصلے فرمانے والے تھے اور داؤد علیہ السلام سلیمان علیہ السلام کی نسبت زیادہ عبادت گزار تھے اور سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے (1)۔ میں کہتا ہوں کہ داؤد علیہ السلام بھی اسی طرح تھے۔

۲۔ اور سلیمان علیہ السلام نے کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمت پر شکر کرنے کا ذکر ہے اور لوگوں کو معجزہ ذکر کر کے تصدیق کے لیے بلانے کا ذکر ہے۔ نطق اور منطق سے مراد وہ الفاظ ہیں جن سے مافی الضمیر کو بیان کیا جائے، چاہے وہ مفرد ہوں یا مرکب۔ قاموس میں ہے نطق ینطق نطقاً و منطقاً و نطوقاً ایسے حروف اور آواز کے ساتھ کلام کرنا جس سے معانی کو پہچانا جا سکتا ہو (2)۔ تو جب لوگوں کے لیے معانی کی پہچان ان الفاظ میں منحصر ہے جن سے انسان گفتگو کرتے ہیں تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ یہ انسان کے خواص میں سے ہے اور جب سلیمان علیہ السلام پرندوں کی آواز سے ان کا مافی الضمیر اس طرح سمجھنے لگے جیسے انسان کی کلام سے سمجھتے تھے تو ان کا نام منطق رکھا۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت کعب سے روایت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جنگلی کبوتر آ کر چلایا۔ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے لِدُوْا لِلْمَوْتِ وَابْنُوْا لِلْخَرَابِ (تم موت کے لیے جنم لو اور بربادی کے لیے عمارتیں بناؤ) فاختہ آ کر چیخی تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیا کہہ رہی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کاش یہ مخلوق پیدا نہ کی جاتی۔ مور آ کر بولنے لگا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے "كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ" (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) ہدہد چیخنے لگا تو آپ نے کہا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا وہ کہہ رہا ہے "مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ" (جو رحم نہیں کرے گا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا) صرد (ایک چھوٹا سا پرندہ) چیخا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو وہ کیا کہہ رہا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا وہ کہہ رہا ہے "اِسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ يَا مُذْنِبُوْنَ" (اے گنہگارو! اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو) طیطوی (کونج کی قسم کا ایک پرندہ) بولا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے "كُلُّ حَيٍّ مَيِّتٌ وَكُلُّ جَدِيْدٍ بَالٍ" (ہر زندہ مرنے والا ہے اور ہر نئی چیز پرانی ہونے والی ہے) خطاف بولا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے "قَدِّمُوْا خَيْرًا تَجِدُوْهُ" (تم نیکی اور بھلائی آگے بھیجو اسے پالو گے) کبوتری چلانے لگی تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ یہ کہہ رہی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ کہہ رہی ہے "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى مِلْأَ سَمَائِهٖ وَاَرْضِهٖ" (میری عظمت وشان والے رب پاک نے پاکی سے اپنے آسمانوں اور زمین کو بھرا ہوا ہے) قمری چلائی تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا یہ کہہ رہی ہے "سبحان ربی الا علی" آپ نے فرمایا کوا چنگی لینے والوں کو لیے بددعا کرتا ہے اور چیل کہتی ہے اللہ تعالیٰ کے

1۔ تفسیر بغوی [illegible] 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1226 (التراث العربی)

سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔قسطاۃ کہتی ہے جو خاموش رہا وہ سلامت رہا۔اور طوطا کہتا ہے اس کے لیے ہلاکت ہے جس کا مقصد ومدعٰی دنیا ہے۔مینڈک کہتا ہے " سُبْحَانَ رَبِّيَ الْقُدُّوسِ "اور باز کہتا ہے سُبْحَانَ رَبِّيْ وَبِحَمْدِهٖ۔اور مینڈک ہرزبان کے ساتھ رب کریم کی سبوحیت کا اظہار کرتا ہے۔

حضرت مکحول سے روایت ہے کہ حضرت سلیمان کے پاس آ کر دراج (تیتر) چلایا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے۔انہوں نے کہا نہیں۔تو آپ نے فرمایا بے شک یہ کہہ رہا ہے" الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" فرقد سبخی سے مروی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام درخت کے اوپر بیٹھے ہوئے بلبل کے پاس سے گزرے جو اپنا سر ہلا رہا تھا اور دم جھکائے ہوئے تھا۔تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا اللہ اور اس کا نبی ہی بہتر جانتے ہیں تو آپ نے فرمایا بے شک یہ کہہ رہا ہے اَكَلْتُ وَنِصْفَ تَمْرَةٍ فَعَلَى الدُّنْيَا الْعَفَا(1)۔یہود کی ایک جماعت سے مروی ہے انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کو کہا کہ ہم سات چیزوں کے بارے میں سوال کریں گے اگر آپ نے ہمیں بتا دیا تو ہم ایمان لے آئیں گے اور ہم تصدیق کرلیں گے۔تو آپؓ نے فرمایا تفقہ کے ارادہ سے پوچھو، نہ کہ تلبیس اور اذیت دینے کے لیے۔تو پھر انہوں نے کہا ہمیں بتاؤ قنبر (چنڈول) اپنی آواز میں کیا کہتا ہے؟ مرغ اپنی چیخ، مینڈک اپنی آواز میں، گدھا اپنی ہینگ میں اور گھوڑا اپنے ہنہنانے میں کیا کہتا ہے۔اسی طرح زرزور اور دراج کیا کہتے ہیں۔؟ تو آپ نے فرمایا ہاں سنو۔قنبر کہتا ہے "اَللّٰهُمَّ الْعَنْ مُبْغِضِي مُحَمَّدٍ وَّمُبْغِضِيْ اٰلِ مُحَمَّدٍ" (اے اللہ! محمد اور آل محمد کے ساتھ بغض رکھنے والے پر لعنت بھیج۔) مرغ کہتا ہے "اُذْكُرُو االلّٰهَ يَا غَافِلُوْنَ" (اے غافلو! اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) مینڈک کہتا ہے "سُبْحَانَ الْمَعْبُوْدِ فِيْ لُجَجِ الْبِحَارِ" (پاک ہے وہ ذات جس کی عبادت سمندروں کی گہرائی میں کی جاتی ہے۔) گدھا کہتا ہے۔"اَللّٰهُمَّ الْعَنْ الْعِشَارَ" (اے اللہ! چنگی وصول کرنے والوں پر لعنت بھیج) جب معرکہ کارزار میں صفیں بالمقابل ہوتی ہیں تو گھوڑا کہتا ہے "سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ" رب کریم کی پاکیزگی اور حمد کرتا ہے۔زرزور کہتا ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْئَلُكَ قُوْتَ يَوْمٍ بِيَوْمٍ" (اے اللہ! میں تجھ سے ایک ایک دن کی خوراک کا مطالبہ کرتا ہوں) اور دراج کہتا ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى پس یہ سن کر یہود اسلام لے آئے اور اپنے اسلام کو خوب اچھا بنایا(2)۔حضرت امام جعفر بن محمد صادقؓ اپنے باپ اور دادا کے واسطہ سے حضرت امام حسینؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپؓ نے فرمایا جب گدھ چیختی ہے تو کہتی ہے اے ابن آدم! جتنا چاہے کسی چیز کو پسند کرلے بالآخر اسے بھی موت ہے۔جب عقاب چلاتا ہے تو وہ کہتا ہے لوگوں سے دور رہنے میں سلامتی ہے۔جب قنبر آواز نکالتا ہے تو وہ کہتا ہے اے اللہ! آل محمد ﷺ کے ساتھ بغض رکھنے والے پر لعنت بھیج۔جب خطاف چیختا ہے تو کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور پھر الضَّآلِّيْنَ کو قاری کی طرح مد کے ساتھ پڑھتا ہے(3)۔میں کہتا ہوں کہ پرندوں کی آوازوں کی جو شرح حضرت کعب نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے نقل کی ہے اور اسی طرح جو مکحول اور فرقد کے واسطہ سے آپ علیہ السلام سے مروی ہے یہ اس کا احتمال رکھتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ایک واقعہ پر محمول کیا جائے۔یہ مذکورہ کلمات میں ان کی بولی کے محصور ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔اللہ تعالیٰ نے اس سورۂ پاک میں چیونٹی اور ہدہد کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ صراحۃً اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ہر اس امر کے بارے گفتگو کرتے ہیں جو انہیں پیش آئے۔لیکن یہود کے سوالات اور حضرت ابن عباسؓ کی طرف سے ان کے جوابات اس پر دلالت کرتے

1۔تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ایضاً 3۔ایضاً

ہیں کہ ان کی گفتگو ان ہی کلمات میں محصور ہے جو ذکر کیے گئے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ روایت صحیح ہے تو پھر اس کی تاویل لازم ہے۔ واللہ اعلم۔
ی۔ اس سے مراد اس شے کی کثرت ہے جو انہیں عطا کی گئی۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "فُلَانٌ یَقْصِدُ کُلَّ اَحَدٍ وَّیَعْلَمُ کُلَّ شَیْءٍ" (فلاں ہر ایک کا قصد کرتا ہے اور ہر شے جانتا ہے۔) اور اسی کی مثل یہ بھی ہے وَاُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ (اور ہر چیز عطا کی گئی)۔ علّمنا اور اُوتینا میں ضمیر حضرت سلیمان اور آپ کے والد محترم حضرت داؤد علیہم السلام کے لیے ہے۔ یا یہ آپ کے لیے اور آپ کے متبعین کے لیے ہے۔ کیونکہ آپ علیہ السلام کے متبعین آپ سے وہ کچھ اخذ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم عطا فرمایا۔ یا یہ ضمیر صرف آپ کے لیے ہے اور یہ قواعد سیاست کی رعایت کرتے ہوئے ملوک کی عادت کے مطابق تعظیم کے لیے ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد دنیا اور آخرت کے امور میں سے ہر شے ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے یعنی نبوت، ملک اور ہوا اور شیاطین کی تسخیر۔(1)
ی۔ بے شک یہ عطا ہمارا استحقاق نہیں یا یہ ہمارے اعمال کی جزاء نہیں بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ اس میں ہمارے سوا دیگر لوگوں کی نسبت زیادتی بالکل ظاہر ہے۔ اور یہ قول بطور شکران نعمت وارد ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے "اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ وَمَنْ دُوْنَهٗ تَحْتَ لِوَائِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ"(2) (میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں۔ آدم علیہ السلام اور آپ کے سوا تمام لوگ قیامت کے دن میرے جھنڈ کے نیچے ہوں گے) اس میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کی پیروی کی ہے وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ یہ روایت بھی ہے کہ حضرت سلیمان علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام زمین کے مشارق و مغارب کے مالک تھے اور آپ نے ساڑھے سات سو سال تک تمام اہل دنیا، جن و انس، پرند، چرند اور درندوں پر حکومت کی اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کو ہر شے کی زبان (بولی) کا علم بھی عطا فرمایا گیا تھا۔ اور آپ کے زمانہ میں عجیب وغریب صنعت و کاریگری کا اظہار ہوا۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

"اور فراہم کیے گئے سلیمان علیہ السلام کے لیے لشکر جنوں، انسانوں اور پرندوں سے، پس وہ نظم وضبط کے پابند ہیں لے"

لے آپ کے لیے سفر میں جنوں، انسانوں اور پرندوں میں سے لشکر جمع کیے گئے۔ پس وہ رک جاتے ہیں اور ٹھہر جاتے ہیں یعنی ان کا اول حصہ آخری حصہ کو ساتھ ملنے سے روک لیتا ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنی کثرت کے باوجود دور نہیں رہتے۔ قاموس میں ہے وزعه ای كففته۔ اور اسی سے الوزعة جو وازع کی جمع ہے۔ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو محارم، کتے، اور جھگڑا فساد سے روکنے والے ہیں(3) توزیع کا معنی تقسیم اور تفریق ہے۔ اسی طرح ایزاع اور توزع میں یہ معنی پایا جاتا ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ یُوْزَعُوْنَ کا معنی ہے یُسَاقُوْنَ۔ (انہیں چلایا جا رہا ہے) سدی نے کہا ہے اس کا معنی ہے "یُوْقَفُوْنَ" (ان سے نظم وضبط کی پابندی کرائی جاتی ہے)۔ محمد بن کعب نے کہا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر کی چھاؤنی سو فرسخ میں تھی۔ ان میں سے پچیس فرسخ جنوں کے لیے تھے، پچیس انسانوں کے لیے، پچیس پرندوں کے لیے اور پچیس فرسخ دیگر جانوروں کے لیے تھے۔ آپ کے لیے لکڑی کے تخت پر سو گھر تھے جن میں آپ کی باندیاں رہائش پذیر تھیں ان میں سے تین سو منکوحہ تھیں اور سات سو لونڈیاں تھیں۔ آپ تیز ہوا کو

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 202 (وزارت تعلیم)

حکم دیتے تھے تو وہ آپ کو اوپر اٹھالیتی تھی اور آپ اسے خوشگوار رہنے کا حکم فرماتے تھے۔ چنانچہ وہ آپ کو لے کر چلتی رہتی تھی۔ پس ایک دن وہ زمین و آسمان کے درمیان چل رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے آپ کی حکومت میں اضافہ کر دیا ہے، وہ اس طرح کہ مخلوق سے جو بھی کہیں بات کرے گا ہوا اسے آپ کے پاس لے آئے گی اور آپ کو اس سے آگاہ کر دے گی۔(1)

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾

”یہاں تک کہ جب وہ گزرے چیونٹیوں کی وادی سے 1؎ تو ایک چیونٹی کہنے لگی 2؎ اے چیونٹیو! گھس جاؤ اپنی بلوں میں 3؎ کہیں کچل کر نہ رکھ دیں تمہیں سلیمان اور ان کے لشکر 4؎ اور انہیں معلوم ہی نہ ہو (کہ تم پر کیا گزر گئی) 5؎“

1؎ وَادِ میں کسائی نے یاء کے ساتھ وقف کیا ہے اور پڑھا ہے وَادِیْ، جبکہ باقیوں نے بغیر یاء کے پڑھا ہے۔ اس میں اِتْیَان کو علٰی کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے یا تو اس لیے کہ ان کا آنا اوپر کی جانب سے تھا یا پھر اس لیے کہ اس سے مراد ہے آپ نے اسے عبور کیا۔ یہ اس قول سے ماخوذ ہے اتی علی الشیء۔ جب کوئی اسے عبور کرے اور اس کے آخر تک پہنچ جائے۔ وہب بن منبہ حضرت کعب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب سوار ہوتے تو آپ اپنے ساتھ اپنے اہل وعیال، خدام اور ملازمین کو بھی سوار کر لیتے اور اس تخت پر ایسے باورچی خانے بنا لیتے جن میں روٹی کے لیے بڑے بڑے لوہے کے تنور ہوتے اور اتنی بڑی نو دیگیں ہوتیں جن میں سے ایک دیگ میں دس اونٹ پکائے جانے کی گنجائش ہوتی۔ اور اسی پر چوپاؤں وغیرہ کے لیے میدان بھی بنا لیتے۔ چنانچہ آپ کے سامنے ہی طباخ ہانڈیاں تیار کرتے اور نان بائی روٹیاں پکاتے اور زمین و آسمان کے درمیان چوپائے میدانوں میں دوڑتے۔ اور ہوا چلتی رہتی۔ پس ایک دفعہ آپ نے اصطخر سے یمن کی طرف سفر کیا۔ اور مدینۃ الرسول ﷺ سے آپ کا گزر ہوا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا ”هٰذَا دَارُ هِجْرَةِ النَّبِیِّ آخِرِ الزَّمَانِ طُوْبٰى لِمَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَطُوْبٰى لِمَنِ اتَّبَعَهٗ“ (یہ آخر الزمان نبی ﷺ کا مقام ہجرت ہے، خوش نصیب ہیں وہ جو آپ کے ساتھ ایمان لائیں گے اور مبارکباد کے لائق ہیں وہ جو آپ ﷺ کی اتباع کریں گے) آپ علیہ السلام نے کعبہ کے اردگرد بتوں کو دیکھا جن کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جاتی تھی۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کعبہ شریف سے آگے تجاوز فرما ہوئے تو وہ رونے لگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی طرف وحی فرمائی کون سی چیز تجھے رلا رہی ہے؟ تو اس نے عرض کی اے میرے رب! مجھے اس چیز نے رلایا ہے کہ بے شک تیرے انبیاء علیہم السلام میں سے یہ نبی اور اولیاء کی پوری جماعت میرے پاس سے گزری لیکن انہوں نے میرے پاس نماز ادا نہیں کی حالانکہ تجھے چھوڑ کر میرے اردگرد بتوں کی عبادت کی جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی فرمائی تو نہ رو۔ بے شک میں تجھے کچھ وقت کے بعد سجدہ کرنے والے چہروں سے بھر دوں گا اور میں تجھ میں نیا قرآن نازل کروں گا۔ اور تجھ میں اپنا وہ نبی آخر الزمان مبعوث کروں گا جو مجھے تمام انبیاء میں سے محبوب تر ہے۔ اور میں تجھ میں اپنی مخلوق میں سے وہ آباد کروں گا جو میری عبادت کرے گی۔ اور میں اپنے بندوں پر ایک فریضہ (حج) فرض کر دوں گا۔ اور وہ تیرے اس طرح قریب ہوں گے جیسے گدھا اپنے گھونسلے کے قریب ہوتی ہے۔ اونٹنی اپنے بچوں کے لیے مشتاق ہوتی ہے۔ اور کبوتری اپنے انڈوں کے لیے مضطرب ہوتی ہے۔ اور میں تجھے بتوں اور شیاطین کی عبادت کرنے والوں سے پاک کر دوں گا۔ پھر

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

آپ چلے گئے یہاں تک کہ آپ کا گزر طائف کی وادیوں میں سے وادی سدیر سے ہوا تو اس طرح آپ وادی النمل میں پہنچے (1)۔ کعب نے کہا ہے کہ یہ طائف کی ایک وادی ہے۔ مقاتل اور قتادہ نے کہا ہے کہ یہ شام کی سرزمین میں ہے (2)۔ یہ قول بھی ہے یہ ایک وادی ہے جس میں جن رہا کرتے تھے اور ان چونٹیوں پر وہ سواری کیا کرتے تھے۔ فرق الحمیری نے کہا ہے کہ اس وادی کی چونٹیاں مکھیوں کی مثل تھیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بختاتی اونٹ کے برابر تھیں۔ اور مشہور یہ ہے کہ یہ قول کرنے والی چیونٹی چھوٹی تھی۔ (3)

۲۔ امام شعبیؒ نے کہا ہے کہ وہ چیونٹی دو پروں والی تھی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ لنگڑی تھی۔ ضحاک نے کہا ہے کہ اس کا نام طاحیہ تھا۔ اور مقاتل نے کہا ہے اس کا نام جذمی تھا۔ (4)

۳۔ یہاں اس نے ''اُدْخُلْنَ'' نہیں کہا کیونکہ انسان جب گفتگو کرتا ہے تو وہ اپنے سوا تمام حیوانات کو غیر عاقل بیان کرتا ہے۔ لہٰذا وہ ان کے لیے جمادات کی ضمیریں استعمال کرتا ہے۔ جیسا کہ وہ عورتوں کے لیے ان کی ضمیریں استعمال کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ انہیں بھی ناقصات العقل ہونے کی وجہ سے غیر ذوی العقول کے ساتھ ملا دیتا ہے۔ لیکن حیوانات جب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کلام کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو ذوی العقول گمان کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ عقلاء ہی مثل خطاب کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے چیونٹی کا قول اسی طرح بیان فرما دیا جیسے اس نے کہا تھا۔

۴۔ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ کے ذریعے ان کو کچلنے سے روکنا ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ چیونٹیوں کو ٹھہرنے اور ظاہر ہونے سے روکنا ہے تا کہ لشکر کے انہیں کچلنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ جیسا کہ عربوں کا یہ قول ہے ''لا ارینک ھٰھنا'' یعنی ''لَا تقف ھھنا'' (میں تجھے یہاں نہ دیکھوں۔ اس کا معنی ہوتا ہے تو یہاں نہ ٹھہر) ترکیب کلام میں یہ جملہ مستانفہ ہے یا امر سے بدل ہے اس کا جواب نہیں۔ کیونکہ نون جواب امر ہونے کے مانع ہے۔

۵۔ بے شک وہ تمہیں کچل دیں گے اور اگر انہیں معلوم ہوا تو وہ ایسا نہیں کریں گے۔ گویا کہ چیونٹی کو بھی یہ علم تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور آپ کے ساتھی جان بوجھ کر کسی کو اذیت نہیں دیتے۔ لہٰذا ہلاکت اور بربادی ہے ان روافض کے لیے جنہیں اس چیونٹی کی مثل بھی شعور نہیں کہ انہوں نے حضور سید الانبیاء ﷺ کے اصحاب کی طرف ظلم و ستم کی نسبت کر دی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کی جانب سے کچل دینے کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے جب کہ ہوا آپ کو اپنے لشکر سمیت زمین و آسمان کے مابین ایک تخت پر اٹھائے ہوئے تھی۔؟ تو اس کے بارے ایک قول تو یہ ہے کہ آپ کے لشکر کا کچھ حصہ سوار تھا اور کچھ حصہ زمین پر پیدل چل رہا تھا جن کے لیے زمین کو لپیٹ دیا جاتا تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کے مسخر کرنے سے پہلے کا ہو۔ اور بعض اہل عرفان نے یہ کہا ہے کہ اس کا معنی ہے تمہارا حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر اور ملک کو دیکھنے میں مصروف ہونا اور ان کو دیکھنے میں مشغول ہونا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیوی زندگی کی رونقیں عطا فرمائی تھیں کہ یہ نظارہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کر دے اور پھر وہ تمہیں ہلاک کر دے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کا یہ قول تین میل کی مسافت سے سنا۔ مقاتل نے اسی طرح کہا ہے (5)۔ اور یہ اس طرح تھا کہ مخلوق میں سے جب بھی کوئی کلام کرتا تھا تو ہوا اسے اٹھا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے کانوں میں ڈال دیتی تھی۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً　5۔ ایضاً

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

"تو سلیمان ہنستے ہوئے مسکرا دیئے[1] اس کی اس بات سے[2] اور عرض کرنے لگے میرے مالک! مجھے توفیق دے[3] تا کہ میں شکر ادا کروں تیری نعمت (عظمیٰ) کا جو تو نے مجھ پر فرمائی اور میرے والدین پر[4] نیز (مجھے توفیق دے کہ) میں وہ نیک کام کروں جسے تو پسند فرمائے اور شامل کر لے مجھے اپنی رحمت کے باعث اپنے نیک بندوں میں[5]"

[1] اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اس کا قول سنا اور اس کا معنی سمجھا تو آپ نے جو سنا اس سے آپ خوش ہوئے اور آپ نے اس کا ادراک کیا جسے آپ کے سوا نہ کوئی سن سکتا تھا اور نہ اس کا ادراک کر سکتا تھا۔ اور آپ نے اس پر مسرت کا اظہار فرمایا کہ چیونٹی نے آپ کو اور آپ کے لشکر کو عدل کے وصف سے متصف کیا یا پھر آپ نے اس چیونٹی کے ڈرنے اور ڈرانے اور اپنے مصالح کی طرف راہنمائی کرنے پر تعجب کا اظہار کیا تو آپ فرحت وانبساط کا اظہار کرتے ہوئے یا تعجب کناں ہوتے ہوئے مسکرا دیئے اور "ضَاحِكًا" یہ تَبَسَّمَ کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی آپ نے اتنا زیادہ تبسم فرمایا کہ وہ ضحک (ہنسے) تک پہنچ گیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر ہو یعنی آپ نے اتنا شدید تبسم فرمایا گویا کہ آپ ہنسنے لگے۔ اور یہ قحت قائمًا کے طریقہ پر ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا زیادہ سے زیادہ ہنسنا تبسم ہی ہے(1)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ آپ کے مسکرانے کی ابتداء تبسم اور اس کی انتہاء ضحک تھا۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے آپؓ فرماتی ہیں کہ میں نے کبھی بھی رسول اللہ ﷺ کو اس طرح کھل کر ہنستے نہیں دیکھا کہ میں نے آپ کے حلق کے کوے کو دیکھ لیا ہو۔ آپ ﷺ صرف تبسم فرمایا کرتے تھے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت عبداللہ بن حارث بن جزء سے روایت ہے کہ میں نے کسی کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ تبسم کرنے والا نہیں دیکھا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔(3)

[2] یعنی آپ چیونٹی کے قول کے سبب مسکرائے۔ چنانچہ آپ نے اپنے لشکر کو روک لیا یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنی بلوں میں داخل ہو گئیں۔

[3] اپنی طرف سے ادائے شکر کا حق ادا کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے شکر پر مدد طلب کرتے ہوئے آپ نے التجاء کی ورش اور بزی نے اَوْزِعْنِيْٓ کو یاء مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور معنی یہ ہے اے میرے رب مجھے توفیق عطا فرما۔ کہا گیا ہے کہ یہ بھی اس کا اسی طرح حقیقی معنی ہے جیسے اس کا معنی قید کرنا اور روکنا ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے(4)۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ تو مجھے اس طرح کر دے کہ میں تیری نعمت کو شکر کے سبب اپنے پاس روک سکوں اور اسے اس طرح مربوط کر دوں کہ کہیں بھی نہ وہ مجھ سے جدا ہو اور نہ میں اس سے علیحدہ ہوں۔ اور بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ اس کا معنی ہے کہ تو مجھے اس طرح بنا دے کہ میں اپنے آپ کو کفران نعمت سے روک سکوں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مجھے اپنے سوا ہر شے سے روک لے۔

[4] تا کہ میں تیری نعمت عظمیٰ کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائی کیونکہ والدین پر تو انعام ہے ہی لیکن لوگوں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 900 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 205 (وزارت تعلیم)
4۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1031 (التراث العربی)

میں سے کسی کا صالح اور نیک بیٹا ہونا اس بیٹے پر بھی انعام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ۔

۵ اور میں اپنی بقیہ عمر میں وہ نیک کام کروں جسے تو پسند فرمائے۔ اور مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے نیک بندوں کے گروہ میں داخل کر دے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آپ کی اس سے مراد حضرات ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کی معیت ہے۔ (1)

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ۝

"اور آپ نے (ایک روز) پرندوں کا جائزہ لیا، تو فرمانے لگے کیا وجہ ہے کہ مجھے (آج) ہد ہد نظر نہیں آ رہا، یا وہ ہے ہی غیر حاضر ؟"

لہ آپ نے پرندوں کو طلب کیا اور ان کا جائزہ لیا۔ التفقد کا معنی ہے گمشدہ چیز کو تلاش کرنا۔ تو آپ نے ان میں ہد ہد کو نہ پایا اور اسے طلب کرنے کا سبب یہ ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب کسی منزل پر اترتے تو پرندوں کا لشکر آپ کو سورج کی دھوپ سے سایہ مہیا کرتا تھا۔ پس ہد ہد زمین کے نیچے پانی کی جگہ اس طرح پالیتا تھا جیسا کہ وہ شیشے میں دیکھ رہا ہو اور وہ پانی کے قریب یا دور ہونے کو پہچان لیتا تھا پھر وہ اس جگہ سے زمین کو کریدتا تھا پھر جنات آ جاتے، وہ اسے کھودتے اور وہاں سے پانی نکال لیتے تھے (2)۔ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور حاکم نے اسی طرح بیان کیا ہے۔ اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ آپ ہی سے حضرت سعید بن جبیر نے کہا کہ جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ ذکر کیا تو نافع بن ازرق نے انہیں کہا اے بیان کرنے والے! دیکھ کیا کہہ رہا ہے بے شک ایک بچہ جال بچھاتا ہے اور اس پر مٹی بکھیر لیتا ہے اتنے میں ہد ہد آتا ہے اور وہ جال کو نہیں دیکھ سکتا یہاں تک کہ وہ اپنی گردن میں داخل کر لیتا ہے۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے کہا تیری ہلاکت ہو بے شک جب تقدیر آ جاتی ہے تو دکھائی نہیں دیتا۔ اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب قضا وقدر آ جاتی ہے تو بینائی جاتی رہتی ہے اور آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ پس حضرت سلیمان علیہ السلام ایک منزل پر اترے پانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لوگوں نے پانی تلاش کیا لیکن نہ پایا۔ چنانچہ ہد ہد کو طلب فرمایا تاکہ وہ پانی پر راہنمائی کرے (3) لیکن آپ نے اسے نہ پایا اور گمان یہ ہوا کہ وہ حاضر ہے لیکن وہ کسی پردے یا اور وجہ سے دکھائی نہیں دیا۔

۲ یہ جملہ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ پر معطوف ہے اور وہ محذوف پر معطوف ہے جو اس پر معطوف ہے "وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ" تقدیر کلام یہ ہے کہ آپ نے پرندوں کو سایہ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پس دھوپ آپ کے تخت پر پڑی تو آپ نے دیکھا اور پرندوں کو طلب کیا (اَمَرَ الطُّيُوْرَ بِالْاَظْلَالِ فَوَقَعَ الشَّمْسُ عَلٰى سَرِيْرِهٖ فَنَظَرَ وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ) یا پھر اس طرح کہا جائے گا کہ سلیمان علیہ السلام اور آپ کے لشکر کو اٹھایا گیا پس آپ ایک منزل پر اترے تو آپ نے پانی نہیں پایا پھر آپ نے ہد ہد کو تلاش کیا اور پرندوں کو طلب کیا تو ارشاد فرمایا "مَالِيَ لَا اَرَى الْهُدْ هُدَ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِيْنَ" مَالِي کو عاصم، ابن کثیر، کسائی اور ہشام نے یاء مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء، ساکن کے ساتھ۔ اور اس میں استفہام تعجب کے لیے ہے۔ اور جملہ لَا اَرٰى ضمیر متکلم سے حال ہے اور اس میں عامل

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ حاشیہ صاوی علی الجلالین، جلد 4 صفحہ 256 (العلمیۃ)
3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

معنی تعجب ہے۔ پس جب آپ نے اسے تلاش کرنے کے بعد نہیں دیکھا اور یہ معلوم ہو گیا کہ وہ غائب ہے تو آپ نے اس کے بارے پوچھا اور جو صورت حال سامنے آئی تھی اس کے صحیح ہونے کے بارے میں سوال کیا اور فرمایا۔ "اَمْ کَانَ" یہ اَمْ منقطعہ ہے اور بَلْ کے معنی میں ہے۔ یعنی بَلْ اَکَانَ الْھُدْ ھُدُ "مِنَ الْغَائِبِیْنَ" اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ غائب ہے تو فرمایا۔

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۱﴾

"(اگر وہ غیر حاضر ہے) تو میں ضرور اسے سخت سزا دوں گا[1] یا اسے ذبح ہی کر ڈالوں گا یا اسے لانا پڑے گی[2] میرے پاس کوئی روشن سند[3]"

[1] میں اُسے سخت سزا دوں گا تا کہ اس سے اس کی جنس کے دیگر افراد (ہد ہد) عبرت حاصل کریں۔ پھر عذاب شدید کے بارے مختلف اقوال ہیں مثلاً ایک قول یہ ہے کہ عذاب شدید سے مراد یہ ہے کہ اس کے پر اور دم نوچ ڈالی جائے گی اور اسے بالوں سے ننگا دھوپ میں ڈال دیا جائے گا اس طرح کہ وہ چیونٹیوں اور زمینی کیڑے مکوڑوں سے اپنی حفاظت نہیں کر سکے گا۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے میں اس پر تارکول کا طلاء کرا کر اسے دھوپ میں ڈلوا دوں گا(1)۔ ایک قول ہے کہ میں اسے پنجرے میں بند کر دوں گا۔ ایک قول ہے کہ میں اسے اپنی مادہ سے جدا کر دوں گا۔ ایک قول ہے کہ میں اسے اس کے مخالف کے ساتھ قید کر دوں گا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ میں اسے اس کے ساتھیوں کی خدمت پر مامور کر دوں گا۔ اور یہ قبیح کا عذاب دینا حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جائز تھا۔

[2] لَيَاْتِيَنِّيْ کو ابن کثیر نے دو نونوں کے ساتھ پڑھا ہے ان میں سے پہلی نون مشدد مفتوح ہے اور دوسری نون وقایہ ہے۔ اور باقی قراء نے ایک نون مشدد مکسور کے ساتھ پڑھا ہے۔

[3] بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ کا معنی ہے کہ وہ اپنے غائب ہونے کے بارے میں کوئی واضح دلیل اور ظاہر عذر میرے پاس لے آئے۔ حلف فی الحقیقت دو میں سے ایک پر ہوتا ہے جبکہ تیسرا نہ ہو۔ لیکن جب تینوں میں سے ایک کے وقوع کا تقاضا ہو تو پھر محلوف علیہ تیسرا ہوتا ہے اور اس کا عطف پہلے دو پر ہوتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ میں اَوْ بمعنی اِلَّا ہو۔ جیسا کہ اس قول میں ہے لا لزمنک او تعطینی حقی یعنی الّا ان تعطینی حقی۔ (میں بضرور تجھے لازم پکڑے رکھوں گا مگر جب تو میرا حق ادا کر دے)

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَ جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾

"پس کچھ زیادہ دیر نہ گزری (کہ وہ آ گیا)[1] اور کہنے لگا میں ایک ایسی اطلاع لے کر آیا ہوں۔ جس کی آپ کو خبر نہ تھی [2] اور (وہ یہ کہ) میں لے آیا ہوں آپ کے پاس ملک سبا سے[3] ایک یقینی خبر[4]"

[1] عاصم اور یعقوب نے مَكَثَ کو کاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے ضمہ کے ساتھ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کا مفہوم ہے کہ اس کا ٹھہرنا طویل نہیں تھا یا اس کے غائب رہنے کا زمانہ زیادہ لمبا نہیں تھا۔ اس سے مراد اس معنی پر دلالت کرنا ہے کہ وہ فوراً واپس لوٹ آیا کیونکہ اسے اپنی ذات پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا خوف تھا۔

علماء نے ہد ہد کے غیب ہونے کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو آپ نے سرزمین حرم کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا اور پھر وہاں جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا آپ مقیم رہے۔ آپ مکہ مکرمہ میں اپنے طویل قیام

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کے دوران ہر روز پانچ ہزار اونٹ (نحر) قربان کرتے تھے۔ اور پانچ ہزار بیل اور بیس ہزار مینڈھے ذبح کیا کرتے تھے۔ آپ کی قوم کے اشراف میں سے جو بھی آپ کے پاس حاضر ہوتا آپ اسے فرماتے یہ وہ جگہ ہے جہاں سے عربی نبی (ﷺ) کا ظہور ہوگا اس کے اوصاف یہ ہوں گے کہ مخالفین کے مقابلے میں وہ فتح مند ہوں گے۔ ایک ماہ کی مسافت سے اس کا رعب چھا جائے گا۔ اس کے نزدیک دور و نزدیک (رہنے والے) برابر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی لومۃ لائم کی اسے پرواہ نہیں ہوگی۔ حاضرین نے عرض کی اے اللہ تعالیٰ کے نبی! وہ کون سا دین لے کر آئے گا تو آپ نے فرمایا وہ دین حنیف لے کر تشریف فرما ہوگا۔ پس خوش بخت ہیں وہ جو ان کا زمانہ پائیں گے اور ان پر ایمان لائیں گے۔ پھر حاضرین نے عرض کی ہمارے اور ان کے ظہور کے درمیان کتنا عرصہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا ایک ہزار سال۔ پس تم میں سے جو حاضر ہیں وہ ان تک یہ پہنچا دیں جو حاضر نہیں۔ بے شک وہ سید الانبیاء ہیں اور تمام رسولوں کے خاتم ہیں۔

علماء نے فرمایا کہ آپ مکہ میں مقیم رہے یہاں تک کہ اپنے قربانی کے جانور ختم کر دیئے۔ پھر آپ مکہ سے نکلے اور صبح صبح یمن کی طرف چلے اور زوال کے وقت صنعاء پہنچ گئے اور یہ ایک ماہ کی مسافت پر تھا آپ نے اس کی حسین وجمیل زمین دیکھی جس پر سبزہ لہلہا رہا تھا اور وہ انتہائی پر رونق تھی تو آپ نے وہاں اترنا پسند فرمایا کہ یہاں نماز پڑھیں گے اور کھانا تناول فرمائیں گے۔ لہٰذا جب آپ اتر گئے تو ہدہد نے کہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تو اترنے میں مصروف ہیں میں کیوں نہ آسمان کی طرف چڑھ جاؤں اور دنیا کے طول و عرض کا نظارہ کرلوں۔ تو اس نے ایسا ہی کیا۔ پس اس نے دائیں بائیں دیکھا تو اس کی نظر بلقیس کے باغ پر پڑی۔ چنانچہ وہ اس کی شادابی کی طرف مائل ہوا۔ اور اس میں اتر گیا۔ وہاں بھی ایک ہدہد تھا۔ یہ اس کے پاس اترا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہدہد کا نام یعفور تھا اور یمن کے ہدہد کا نام عنفیر تھا۔ پس عنفیر یمن نے یعفور سلیمان سے پوچھا تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں کا ارادہ رکھتا ہے؟ تو اس نے جواباً کہا میں اپنے مالک سلیمان بن داؤد کے ساتھ شام سے آیا ہوں۔ اس نے پوچھا سلیمان کون ہیں؟ تو اس نے کہا وہ جن و انس، شیاطین، طیور و وحوش اور ہواؤں کے شہنشاہ ہیں۔ پھر اس نے پوچھا تو کہاں کا رہنے والا ہے؟ اس نے کہا میں انہی شہروں میں رہنے والا ہوں۔ اس نے پوچھا یہاں کا بادشاہ کون ہے؟ اس نے کہا ایک عورت جسے بلقیس کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ تمہارا مالک بھی بہت بڑا بادشاہ ہے لیکن بلقیس کی بادشاہی بھی اس سے کم نہیں۔ وہ سارے یمن کی ملکہ ہے اس کے ماتحت بارہ ہزار قائد ہیں اور ہر قائد کے ماتحت ایک لاکھ جنگجو آدمی ہے۔ کیا تو میرے ساتھ چلتا ہے کہ تو خود اس کی حکومت کا نظارہ کرے؟ اس نے جواباً کہا مجھے یہ خوف ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نماز کے وقت مجھے طلب فرمائیں گے جب انہیں پانی کی ضرورت ہوگی۔ تو یمنی ہدہد نے کہا کہ تیرا مالک خوش ہو جائے گا جب تو اس ملکہ کی خبر اسے پہنچائے گا۔ چنانچہ یہ اس کے ساتھ چل پڑا اور بلقیس اور اس کے ملک کا نظارہ کیا۔ اور یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس عصر کے وقت واپس لوٹا۔ فرماتے ہیں کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے نزول فرمایا اور نماز کا وقت داخل ہوا۔ چونکہ آپ کا یہ پڑاؤ ایسی جگہ تھا جہاں پانی نہیں تھا۔ پھر آپ نے جن و انس اور شیاطین سے پانی کے بارے میں پوچھا۔ لیکن انہوں نے کہیں نہ پایا۔ تو پھر آپ نے ہدہد کو طلب فرمایا لیکن ہدہد بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ چنانچہ آپ نے پرندوں کے قائد کو بلایا۔ اور وہ گدھ تھی اور اس سے ہدہد کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا اللہ تعالیٰ بادشاہ کے ملک کو سلامت رکھے میں نہیں جانتا وہ کہاں ہے؟ اور میں نے اسے کہیں بھی نہیں بھیجا۔ تو اس وقت آپ غصے ہوئے اور فرمایا "لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِیْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗ اَوْ لَیَاْتِیَنِّیْ

بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ" پھر آپ نے پرندوں کے سردار عقاب کو بلایا اور فرمایا اسی وقت میرے پاس ہدہد کو حاضر کرو۔ پس عقاب آسمان کے قریب تک بلند ہو گیا یہاں تک کہ وہ ہوا کے ساتھ چمٹ گیا۔ اور اس نے دنیا کی طرف اس طرح دیکھا جیسا کہ تمہارے سامنے ایک پیالہ ہو۔ پھر اس نے دائیں بائیں توجہ ڈالی تو اچانک دیکھا کہ ہدہد یمن کی طرف سے آ رہا ہے۔ پس عقاب بھی اس کے ارادے سے اس کی طرف چل پڑا۔ جب ہدہد نے اسے دیکھا تو جان گیا کہ عقاب غلط ارادے سے ہی اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔ تو اس نے کہا قسم ہے اس اللہ تعالیٰ کی جس نے تجھے مجھ پر قوت دی اور قدرت عطا فرمائی، خبردار! تو میرے ساتھ رحم کا سلوک کر اور میرے ساتھ برائی سے پیش نہ آ۔ تو اس کے سبب عقاب نے اس سے پیٹھ پھیر لی اور اسے کہا تیری ہلاکت ہو، تیری ماں تجھے روئے، بے شک اللہ تعالیٰ کے نبی نے قسم کھائی ہے کہ وہ تجھے ضرور سزا دیں گے یا تجھے ذبح کر دیں گے۔ پھر دونوں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر اڑنے لگے۔ جب وہ لشکر کے پاس پہنچے تو گدھ اور دوسرے پرندوں نے اسے جھپٹ لیا اور اسے کہا تیری ہلاکت ہو آج کے دن تو کہاں غائب رہا؟ اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ السلام تجھے سزا دیں گے۔ اور جو کچھ آپ نے فرمایا تھا اس کے بارے اسے مطلع کیا۔ ہدہد نے یہ سن کر کہا کیا رسول اللہ علیہ السلام نے کوئی استثناء نہیں کی؟ تو انہوں نے کہا کیوں نہیں۔ بلکہ آپ نے فرمایا اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ۔ تو یہ سن کر ہدہد نے کہا تب میں نجات پا جاؤں گا۔ پھر عقاب اور ہدہد دونوں اڑے یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہو گئے۔ درآنحالیکہ آپ اپنی کرسی پر تشریف فرما تھے۔ تو عقاب نے عرض کی اے اللہ تعالیٰ کے نبی! میں نے اسے آپ کے پاس حاضر کر دیا ہے۔ جب ہدہد نے آپ کو دیکھا تو اس نے اپنا سر بلند کیا اور اپنی دم اور پروں کو جھکا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی بارگاہ میں تواضع اور عاجزی کے اظہار کے لیے انہیں زمین پر گھسیٹنے لگا۔ جب وہ آپ کے قریب ہوا، تو آپ نے اسے سر سے پکڑا اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور فرمایا تو کہاں تھا میں تجھے ضرور سخت ترین سزا دوں گا۔ تو ہدہد نے عرض کی کہ آپ اللہ کی بارگاہ میں اپنے کھڑے ہونے کو یاد رکھیں۔ پس جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ سنا تو آپ کانپ اٹھے اور اسے معاف کر دیا۔ پھر آپ نے اس سے پوچھا کون سی وہ چیز ہے جس نے تجھے مجھ سے پیچھے چھوڑ دیا۔

۲۔ اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے تقدیر عبارت یہ ہے فاتی فقال۔ الاحاطة سے مراد کسی چیز کو اس کی تمام جہتوں سے جاننا ہے اور اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے علم کے سوا ہر شے میں ہوتا ہے یا بطریق مجاز یا پھر اظہار مبالغہ کے لیے۔ لہٰذا معنی یہ ہے کہ میں اس شے کا یقینی علم لے کر آیا ہوں جسے آپ نہیں جانتے۔ اور آپ کے لیے اس کے اس خطاب میں یہ تنبیہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کی ادنیٰ مخلوق میں ایسا فرد ہے جو اس چیز کے بارے میں یقینی علم رکھتا ہے جس پر حضرت سلیمان علیہ السلام مطلع نہیں۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو عاجز اور حقیر جانیں اور اپنے علم کو انتہائی قلیل سمجھیں۔ اس میں روافض کے اس قول کے بطلان پر دلیل موجود ہے کہ امام پر کوئی شے مخفی نہیں ہوتی اور اس کے زمانہ میں اس سے بڑھ کر اور کوئی عالم نہیں ہوتا۔

۳۔ سبا یمن کے ایک شہر کا نام ہے۔ صنعا اور اس کے درمیان تین دن کی مسافت ہے۔ ابو عمرو اور بزی نے مِنْ سَبَاَ اور سورۂ سبا میں بسبا پڑھا ہے، یعنی ہمزہ مفتوح بغیر تنوین کے غیر منصرف پڑھا ہے اور یہ بلدہ یا مدینہ ہونے کی تاویل کی بناء پر ہے۔ قنبل نے وقف کے ارادے سے ہمزہ کو ساکن پڑھا ہے اور باقیوں نے ہمزہ کو مکسور اور تنوین کے ساتھ منصرف صورت میں پڑھا ہے۔ اس لیے کہ یہ اصل میں آدمی کا نام ہے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ حدیث طیبہ میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے سبا کے بارے میں پوچھا گیا تو

آپ ﷺ نے فرمایا وہ ایک آدمی تھا۔ اس کے دس بیٹے تھے ان میں سے چھ یمن میں رہائش پذیر تھے اور بقیہ چار نے شام کو اپنا وطن بنایا تھا۔

۲؎ کہ میں ملک سبا سے ایک یقینی خبر آپ کے پاس لایا ہوں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا وہ کیا ہے؟ تو اس نے عرض کی:

إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ﴿۲۳﴾

''میں نے پایا ایک عورت کو جو ان کی حکمران ہے ۱؎ اور اسے دی گئی ہے ہر قسم کی چیز سے ۲؎ اور اس کا ایک عظیم (الشان) تخت ہے ۳؎''

۱؎ تَمْلِكُهُمْ امْرَأَةً کی صفت ہے۔ اس عورت کا نام بلقیس بنت شراحیل تھا۔ وہ یعرب بن قحطان کی نسل سے تھی۔ اس کا باپ بہت بڑی عظمت وشان کا مالک بادشاہ تھا۔ اس کے آباء واجداد میں چالیس بادشاہ ہوئے تھے اور یہ ان تمام میں سے آخری تھا۔ وہ پورے یمن کی سرزمین پر حکومت کرتا تھا۔ اور اطراف واکناف کے بادشاہوں کو کہا کرتا تھا کہ تم میں سے کوئی بھی میری کفو نہیں۔ لہٰذا اس نے ان میں سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ تو انہوں نے اس کی شادی جنوں میں سے ایک عورت کے ساتھ کر دی جسے ریحانہ بنت السکن کہا جاتا تھا۔ اس سے بلقیس پیدا ہوئی اور اس کے سوا اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ حدیث طیبہ میں موجود ہے کہ بلقیس کے والدین میں سے ایک جنات میں سے تھا۔ جب بلقیس کا باپ فوت ہوا۔ تو اس نے حکمرانی کی خواہش کی اور اپنی قوم سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی بیعت کریں۔ تو ایک گروہ نے اس کی اطاعت کر لی اور دوسروں نے اس کی اطاعت قبول نہ کرتے ہوئے ایک مرد کو اپنا حکمران بنا لیا۔ تو اس طرح وہ لوگ دو فرقوں گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہر گروہ نے یمن کے ایک ایک حصے پر حکومت قائم کر لی۔ پھر وہ آدمی جسے انہوں نے حکمران چنا تھا اس نے اپنی مملکت کے باسیوں میں انتہائی برا کردار پیش کیا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی رعیت کی حرم میں ہاتھ ڈالنے لگا اور عورتوں کے ساتھ زنا کرنے لگا۔ قوم نے اس سے خلعت شاہی اتار پھینکنے کا ارادہ کیا لیکن وہ اس پر قادر نہ ہو سکے۔ جب بلقیس نے اس صورت حال کو دیکھا تو اس میں غیرت کے جذبات ابھرے۔ چنانچہ اس نے اس کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ اپنے آپ کو اس کے لیے پیش کرتی ہے (یعنی وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے) بادشاہ نے اسے قبول کر لیا اور کہا کہ مجھے تیری طرف سے پہلے پیغام نکاح بھیجنے میں صرف یہ چیز مانع تھی کہ کہیں تو انکار نہ کر دے۔ تو اس نے جواب دیا کہ میں تجھ سے اعراض نہیں برتوں گی تو اچھا ہمسر ہے۔ لہٰذا تو میری قوم کے افراد جمع کر اور ان کی طرف مجھ سے شادی کرنے کا پیغام بھیج۔ چنانچہ اس نے ان سے شادی کی بات کی۔ تو انہوں نے اسے یہ کہا کہ ہم تو یہ خیال نہیں کرتے کہ وہ ایسا کرے گی۔ اس بادشاہ نے ان سے کہا۔ چونکہ اس نے ابتدا کی ہے اس لیے میں یہ پسند کرتا ہوں کہ تم اس کی بات سنو۔ پس وہ بلقیس کے پاس آئے اور اس سے اس کا تذکرہ کیا۔ تو اس نے انہیں کہا۔ ہاں میں اولاد پسند کرتی ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اس کی شادی کر دی۔ جب شب زفاف کے لیے یہ اس کی طرف گئی تو اپنے لشکر کے بہت سے افراد کے ساتھ نکلی۔ پس جب یہ اس کے پاس پہنچی تو اس نے اسے شراب پلا دی یہاں تک کہ وہ نشے میں ہو گیا۔ پھر اس نے اس کا سر کاٹ لیا۔ اور رات کے وقت ہی وہاں سے اپنے گھر کی طرف واپس لوٹ آئی۔ جب صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ بادشاہ قتل ہو چکا ہے اور اس کا سر اس کے دروازے پر لٹکا ہوا ہے۔ تو تب انہیں معلوم ہوا کہ یہ نکاح صرف مکر اور دھوکہ تھا۔ پس وہ تمام کے تمام بلقیس کے پاس جمع ہوئے اور کہا کسی اور کی نسبت تو اس ملک پر حکومت کا زیادہ حق رکھتی ہے۔

حدیث:۔ امام احمدؒ، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں، ترمذی اور نسائی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ خبری پہنچی کہ اہل فارس نے اپنے اوپر کسریٰ کی بیٹی کو حکمران مقرر کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے عورت کو اپنا حکمران مقرر کیا۔ لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَّلَّوْا اَمْرَهُمُ امْرَاَةً (1)

۲؎ **تملکھم** کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔ اور اسے ہر قسم کی چیز دی گئی ہے یعنی جن چیزوں کی آلات اور تعداد وغیرہ میں سے بادشاہوں کو ضرورت ہوتی ہے اور یہاں اس سے مراد مقدار کی کثرت ہے۔

۳؎ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ حال کے بعد ایک اور حال ہے۔ یعنی اس کا بہت بڑا تخت تھا جو سونے سے بنایا گیا تھا اس میں موتی، سرخ یاقوت اور سبز زبرجد جڑھا ہوا تھا۔ اس کے پائے یاقوت اور زمرد کے تھے اور اس پر سات کمرے تھے اور ہر کمرے کا ایسا دروازہ تھا جو بند کیا جا سکتا تھا۔ ابن ابی حاتم نے زہیر بن محمد سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ سونے کا تھا اور اس کے دونوں پہلوؤں پر یاقوت اور زبرجد لگا ہوا تھا۔ اس کا طول اسی گز اور عرض چالیس گز تھا(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بلقیس کا تخت تیس گز لمبا اور تیس گز چوڑا تھا اور اس کی بلندی بھی تیس گز تھی۔ اور مقاتل نے کہا کہ اس کا طول اسی گز تھا اور اس کی بلندی تیس گز تھی۔ (3)

وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾

"میں نے پایا ہے اسے اور اس کی قوم کو، کہ وہ سب سجدہ کرتے ہیں سورج کو سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور آراستہ کر دیئے ہیں ان کے لیے شیطان نے ان کے (یہ مشرکانہ) اعمال ۱؎ پس اس نے روک دیا ہے انہیں (سیدھے) راستہ سے پس وہ ہدایت قبول نہیں کرتے ۲؎"

۱؎ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ ظرف **یسجدون** کے متعلق ہے اور وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ کا معنی ہے کہ شیطان نے ان کے لیے ان کے برے اعمال کو آراستہ کر دیا ہے، یعنی سورج کی عبادت اور دیگر ایسے اعمال۔ ترکیب کلام میں وَزَيَّنَ کا جملہ اپنے معطوف علیہ سمیت **یسجدون** کے فاعل سے حال ہے۔ اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔

۲؎ پس اس نے انہیں سیدھے راستے سے روک رکھا ہے۔ لہٰذا وہ اس کی طرف سے راہنمائی نہیں پاتے۔ اس جملے کا عطف **یسجدون** پر ہے۔

اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾

"وہ کیوں نہ سجدہ کریں ۱؎ اللہ تعالیٰ کو، جو نکالتا ہے پوشیدہ چیزوں کو، آسمانوں اور زمین سے ۲؎ اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو ۳؎"

۱؎ اَلَّا يَسْجُدُوْا اس کو ابو جعفر اور کسائی نے تخفیف کے ساتھ اَلَا پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ حرف تنبیہ ہے۔ اور یا حرف ندا اور اس کا منادیٰ محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے "اَلَا يَا هٰؤُلَآءِ اسْجُدُوْا" ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیا امر

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 637 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

ہے(1)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے اپنے حاضرین کو حکم ہو۔ اسی بناء پر درج کلام میں ہمزہ وصل حذف کر دیا گیا ہے۔ اور حرف نداء سے الف کو اجتماع ساکنین کی وجہ سے بولنے میں حذف کر دیا گیا ہے اور لکھنے میں دونوں کو ثابت رکھا گیا ہے۔ اور وقف کی صورت میں وقف یا تو اَلَا پر ہے یا حرف نداء یا پر۔ اور ابتدائے کلام اُسْجُدُوْا کے قول سے ہے۔ باقی قراء نے اَلَّا یَسْجُدُوْا مشدد پڑھا ہے اس لیے کہ اس میں اَنْ مصدریہ کا نون فعل مضارع پر داخل ہونے والے حرف نفی لام میں مدغم ہے۔ اور اَنْ اپنے صلہ کے ساتھ بتقدیر حرف جر زَیَّنَ لَهُمْ یا صَدَّهُمْ کے متعلق ہے۔ اور معنی یہ ہے "زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطَانُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ لِئَلَّا یَسْجُدُوْا لِلّٰهِ" (شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے آراستہ کر دیا پس اس نے انہیں روک دیا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہ کریں) یا پھر یہ کہا جائے گا کہ اَنْ یَسْجُدُوْا اَعْمَالَهُمْ سے بدل ہے۔ یعنی شیطان نے ان کے لیے ان کے سجدہ نہ کرنے کو آراستہ کر دیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ لَا زائد ہو اور اَنْ اپنے صلہ کے ساتھ لَا یَهْتَدُوْنَ کے متعلق ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فَهُمْ لَا یَهْتَدُوْنَ اَنْ یَّسْجُدُوْا (پس وہ سجدہ کرنے کی ہدایت قبول نہیں کرتے)

۲؎ اس آیت میں الخبء بمعنی المخبوء ہے اس سے مراد وہ شے ہے جو دوسرے پر مخفی ہو۔ اور اس کے اخراج سے مراد اسے ظاہر کرنا ہے۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ خبء السّمٰوٰت سے مراد بارش ہے اور خبء الارض سے مراد نباتات ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد زمین و آسمان کا علم غیب ہے۔ اور یہ لفظ ستاروں کو روشن کرنے، بارش نازل کرنے، نباتات کو اگانے، کسی بھی شے کو قوت سے فعل کی طرف نکالنے، چیزوں کو امکان سے وجوب کی طرف اور عدم سے وجود کی طرف ظاہر کرنے اور ان کا علم جو واجب لذاتہ کے ساتھ مختص ہیں ان تمام کو شامل ہے۔ لہٰذا وہی یہ استحقاق رکھتا ہے کہ اسے سجدہ کیا جائے کوئی اور اس کا مستحق نہیں۔

۳؎ اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم اپنے رازوں میں چھپاتے ہو۔ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ عبادت میں کسی غیر کو سرًّا اور علانیۃً اس کا شریک بنانے سے بچو۔ کسائی اور حفص نے دونوں صیغوں کو تاء کے ساتھ اور باقیوں نے غیب کے صیغے قرار دیتے ہوئے یاء کے ساتھ قرأت کی ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۩ ﴿۲۶﴾

"اللہ تعالیٰ نہیں ہے کوئی معبود بجز اس کے، وہ مالک ہے عرش عظیم کا ۱؎"

۱؎ یہ یا تو ضمیر سے بدل ہے۔ یعنی رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ یا یہ لفظ اللہ کی دو خبریں ہیں۔ اور مکمل جملہ اسجدوا کی علت بیان کرتا ہے یعنی وہ سجود کا مستحق ہے کوئی اور نہیں۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾

"آپ نے فرمایا ہم پوری تحقیق کریں گے اس بات کی کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو بھی غلط بیانی کرنے والوں سے ہے ۱؎"

۱؎ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کو فرمایا۔ ہم غور و فکر کریں گے۔ سَنَنْظُرُ النظر سے مشتق ہے۔ اور اس کا معنی ہے غور و فکر کرنا، تحقیق کرنا کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو بھی غلط بیانی کرنے والوں سے ہے۔ مبالغہ کے لیے انداز کلام کو تبدیل کیا اور یہ نہیں کہا اَمْ کَذَبْتَ (بلکہ اسے کاذبین میں شمار کرتے ہوئے ان کے ساتھ منسلک کیا اور اس سے بالیقین اس کا جھوٹا ہونا لازم آتا ہے) اور انداز کلام تبدیل

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کرنے کی دوسری وجہ فواصل کی رعایت ہے۔ پھر ہد ہد نے پانی پر ان کی راہنمائی کی۔ پھر انہوں نے گڑھے کھودے اور ان سے لوگوں اور چوپاؤں تمام نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک خط تحریر کیا "مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ سُلَیْمَانَ بْنِ دَاوٗدَ اِلٰی بِلْقِیْسَ مَلِکَۃِ سَبَا۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی اَمَّا بَعْدُ فَلَا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ" (یہ اللہ تعالیٰ کے بندے سلیمان بن داؤد کی جانب سے ملکہ سبا بلقیس کے نام ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اس پر سلام ہو جس نے ہدایت کو قبول کیا اور اس کی پیروی کی امابعد! پس تم مجھ پر فخر اور برتری کا اظہار نہ کرو اور اطاعت گزار بنتے ہوئے میرے پاس آجاؤ)۔ ابن جریج نے کہا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط میں اتنا ہی لکھا جتنا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا یہ انبیاء علیہم السلام اسی طرح اختصار کے ساتھ لکھتے ہیں نہ وہ اسے طول دیتے ہیں اور نہ اس میں کثرت کرتے ہیں۔ پس جب آپ خط لکھ چکے تو اسے کستوری کے ساتھ بند کیا اور اوپر اپنی مہر چسپاں کر دی۔ اور پھر ہد ہد کو فرمایا۔(1)

اِذْهَبْ بِّكِتٰبِیْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَیْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

"لے جا میرا یہ مکتوب اور پہنچا دے ان کی طرف لے پھر ہٹ کر کھڑا ہو جا ان سے اور دیکھ وہ ایک دوسرے سے کیا گفتگو کرتے ہیں ۲؎"

لے فَاَلْقِهْ میں ابوعمرو، عاصم اور حمزہ سے ھاء کو ساکن پڑھا ہے۔ ابوجعفر اور یعقوب نے اسے سادہ کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اشباع کسرہ کے ساتھ۔ یعنی کسرہ کو لمبا کر کے پڑھا ہے۔

۲؎ پھر ان سے قریبی جگہ کی طرف دور ہو جا۔ اور دیکھ کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کیا گفتگو کرتے ہیں۔ پس ہد ہد نے خط لیا اور بلقیس کے پاس لے آیا۔ وہ اس وقت صنعاء سے تین دنوں کی مسافت پر مارب کے مقام پر تھی۔ پس اس نے وہ خط اس کے محل میں پہنچا دیا حالانکہ دروازے بند تھے اور بلقیس نے چابیاں اپنے سر کے نیچے رکھی ہوئی تھیں۔ ہد ہد اس کے پاس آیا اور وہ اپنی گدی کے بل چت سوئی ہوئی تھی تو اس نے خط اس کے سینے پر پھینک دیا۔ عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ ہد ہد نے خط اپنی چونچ میں اٹھایا۔ یہاں تک کہ عورت کے سر پر جا ٹھہرا حالانکہ اس کے اردگرد محافظ اور لشکر سپاہی موجود تھے۔ پس یہ تھوڑی دیر پھڑ پھڑایا اور لوگ اس کی طرف دیکھتے رہے حتیٰ کہ عورت نے اپنا سر اٹھایا اور اس نے خط اس کی گود میں ڈال دیا۔

ابن منبہ اور ابن زید نے کہا ہے کہ سورج طلوع ہونے کی سمت ایک روشندان تھا جس سے سورج طلوع ہونے کے وقت روشنی اندر آتی تھی اور جب یہ سورج کو دیکھتی تو یہ اسے سجدہ کرتی۔ ہد ہد اسی روشندان کی طرف آیا، اسے اپنے دونوں پروں کے ساتھ بند کر دیا۔ پس سورج بلند ہوا، لیکن اسے علم نہ ہوا۔ جب سورج طلوع ہوئے کافی دیر ہو گئی تو وہ اٹھی اور ادھر دیکھنے لگی۔ اس حالت میں ہد ہد نے اس کی طرف خط پھینک دیا۔ بلقیس نے خط اٹھایا اور اسے پڑھنے لگی۔ جب اس کی نظر مہر پر پڑی تو کانپ گئی اور جھک گئی۔ کیونکہ اس کی مہر میں ملک سلیمان لکھا تھا۔ لہٰذا وہ جان گئی کہ جس نے یہ خط ارسال کیا ہے یقیناً وہ اس سے بڑا بادشاہ ہے۔ اس نے خط پڑھا اور ہد ہد اس سے تھوڑا دور پیچھے رہا۔ پھر وہ آئی اور اپنے شاہی تخت پر بیٹھ گئی اور اپنی قوم کے سرداروں کو جمع کیا۔ اور وہ بارہ ہزار قائد

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

تھے اور ہر قائد کے ساتھ ایک لاکھ سپاہی تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بلقیس کے ساتھ ایک لاکھ قیل تھے اور ہر قیل کے ساتھ ایک لاکھ افراد تھے۔ اور قیل سے مراد وہ حکمران ہے جو ملک اعظم سے مرتبہ میں کم ہوتا ہے۔ قتادہ اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس کی مجلس شوریٰ کے ممبر تین سو تیرہ افراد تھے اور پھر ان میں سے ہر آدمی کے ساتھ دس افراد تھے۔ لہٰذا وہ تمام کے تمام آئے اور انہوں نے مجلس مشاورت قائم کی۔(1)

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ۝۲۹

''(خط پڑھ کر) ملکہ نے کہا اے سرداران قوم![1] پہنچایا گیا ہے میری طرف[2] ایک عزت والا خط[3]''

[1] بلقیس نے انہیں کہا۔ جو لوگ اپنی قوم میں سے اشراف اور سردار تھے۔

[2] اِنِّيْۤ اُلْقِيَ میں نافع نے یاء کو فتحہ کے ساتھ اور باقیوں نے اس کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

[3] عطاء اور ضحاک نے کہا ہے کہ اس نے خط کو کریم (عزت والا) اس لیے کہا ہے کیونکہ اس پر مہر لگی ہوئی تھی (2) جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا خط کی عزت وتکریم اس کی مہر کے ساتھ ہے (3)۔ اسے طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور ابن مردویہ نے اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد مختوم ہے، یعنی ایسا خط جس پر مہر لگی ہو (4)۔ اور ابن جریج سے مروی ہے کہ کریم سے مراد حسن ہے یعنی خوبصورت خط۔ زجاج نے بھی اسے ہی پسند کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے۔ کہ کریم بمعنی شریف ہے۔ اس لیے کہ اسے لکھنے والا صاحب عزت وشرف تھا (5)۔ یہ قول بھی ہے کہ اس نے خط کو کریم اس کی غرابت شان کی وجہ سے کہا ہے۔ کیونکہ وہ ایسے بیت میں چت لیٹ کر سو رہی تھی جس کے تمام دروازے مقفل تھے۔ تو ہد ہد روشندان سے اندر داخل ہوا اور اس نے یہ خط اس کے سینے پر ایسے پھینک دیا کہ اسے احساس بھی نہ ہوا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے کریم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے کی گئی۔ اس کے بعد اس نے ان کا ذکر کیا جن کی طرف سے وہ خط تھا اور کہا۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۳۰ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝۳۱

''یہ سلیمان کی طرف سے ہے اور وہ یہ ہے، اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ تم لوگ غرور وتکبر نہ کرو میرے مقابلہ میں[1] اور چلے آؤ میرے پاس فرمانبردار بن کر[2]''

[1] بے شک یہ خط یا یہ مضمون سلیمان کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد اس میں جو مضمون تھا اسے بیان کرتے ہوئے کہا۔ بے شک اس میں یہ لکھا ہوا ہے یا اس کا مضمون یہ ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ اس میں اَنْ مفسرہ ہے یا یہ مصدریہ ہے۔ اور یہ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر مبتدا محذوف کی خبر ہے اور وہ ھُوَ ہے۔ یا اس سے مقصود ان لا تعلوا ہے۔ یا کتاب سے بدل ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ تم تکبر نہ کرو اور تم اسے قبول کرنے سے انکار نہ کرو کیونکہ قبولیت سے انکار کرنا یہ فخر اور تکبر ہے۔

[2] اور چلے آؤ میرے پاس ایمان لاتے ہوئے یا فرمانبرداری کرتے ہوئے۔ یہ کلام انتہائی مختصر ہونے کے باوجود مکمل طور پر اپنے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ کنز العمال، جلد 10 صفحہ 243 (التراث الاسلامی)

مقصود پر دلالت کرتا ہے اس طرح کہ یہ بسم اللہ پر مشتمل ہے اور اس اعتبار سے یہ صانع (اللہ تعالیٰ) کی ذات وصفات پر صراحۃً اور التزاماً دلالت کرتا ہے۔ اور اس میں اس تکبر اور فخر سے نہی بھی موجود ہے جو تمام رذائل کی اصل ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں اسلام کا وہ حکم موجود ہے جو تمام بنیادی فضائل کو جامع ہے۔ اور اس میں اپنی رسالت پر حجت قائم کرنے سے پہلے اطاعت وفرمانبرداری کا حکم موجود نہیں کہ یہ محض تقلید کی دعوت ہو۔ کیونکہ اس کی طرف اس حالت میں خط پھینکنا بذات خود بہت بڑی دلیل ہے۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾

''ملکہ نے کہا اے سرداران قوم! مجھے مشورہ دو میرے اس معاملہ میں [1]، میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا کرتی جب تک تم موجود نہ ہو [2]''

[1] یعنی جو کچھ مجھے پیش آیا ہے اس کے بارے مجھے مشورہ دو۔ اور مجھے اس کے بارے جواب دو جس کے بارے میں تم سے مشورہ لے رہی ہوں۔ الفتیا اور الفتویٰ سے مراد احکام میں پیدا ہونے والے اشکال کا جواب ہوتا ہے۔

[2] میں ایسے حکم قطعی کے ساتھ کسی امر کا فیصلہ نہیں کرتی کہ اس سے محکوم علیہ کے اختیارات ختم ہو جائیں۔ یہاں تک کہ تم میرے پاس حاضر ہوتے ہو اور مجھے مشورہ دیتے ہو۔ یا معنی یہ ہے یہاں تک کہ تم اس کے درست ہونے کی شہادت دے دو۔ ترکیب کلام میں قَالَتْ کا جملہ اپنی اس تمام عبارت سمیت جو اس کے محل میں ہے سابقہ قَالَتْ سے بدل اشتمال ہے۔

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ۬ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾

''وہ کہنے لگے ہم بڑے طاقتور اور سخت جنگجو ہیں [1] اور فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ غور کرلیں کہ آپ کیا حکم دینا چاہتی ہیں [2]''

[1] انہوں نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا ہم تو قتال میں بڑے طاقتور ہیں اور جنگ کے وقت سخت جنگجو ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے کہ انہوں نے قوت سے مراد کثرت تعداد اور بأس سے مراد بہت زیادہ شجاعت وبہادری لی ہے (1) کیونکہ اس کے بارے مشاورت کا انحصار صلح اور جنگ پر ہے۔ (یعنی مشورہ لینے کا مقصود ہی یہ ہے کہ آیا ایسے حالات میں ہمیں صلح کی راہ اپنانی چاہئے یا جنگ کا راستہ اختیار کرنا چاہئے) تو چونکہ ان دونوں امور میں سے قتال کا راستہ مشکل تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے جنگ کے بارے میں یہ جواب دیا جو کہ یہودیوں کے اس جواب کے بالکل برعکس تھا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ اور ان کا یہ جواب اس پر دلالت کرتا ہے کہ صلح کے معاملہ میں وہ اس کے حکم کی پیروی بطریق اولیٰ کریں گے۔ اسی لیے انہوں نے اسے دونوں امروں میں اختیار دیتے ہوئے کہا۔

[2] کہ صلح اور قتال کے بارے میں اور ہر اس شے کے بارے میں جو آپ کو تفویض کی گئی ہے فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ یعنی جنگ اور صلح میں سے جو چاہیں حکم دیں۔ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ میں مَا استفہامیہ ہے۔ اور جملہ بتاویل مفرد ہو کر اُنْظُرِيْ کا مفعول ہے۔ معنی یہ ہے کہ تو خوب غور وفکر کرلے یہاں تک کہ تیرے لیے وہ امر متعین ہو جائے جو تیرے لیے نفع بخش ہو تو ہم تیری اطاعت کریں گے اور تیرے فیصلے کی پیروی کریں گے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾

’’ملکہ نے کہا اس میں شک نہیں کہ بادشاہ جب داخل ہوتے ہیں کسی بستی میں تو اسے برباد کر دیتے ہیں۔اور بنا دیتے ہیں وہاں کے معزز شہریوں کو ذلیل۔اور یہی ان کا دستور ہے (اس لیے جنگ کرنا قرین دانشمندی نہیں)۱؎‘‘

۱؎ اس نے کہا کہ بے شک بادشاہ جب کسی بستی میں جبراً اور جنگ کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔تو وہ اسے برباد کر دیتے ہیں اور اس کے معزز شہریوں کو ان کے اموال چھین کر اور ان کے گھروں کو تباہ و برباد کر کے ذلیل کر دیتے ہیں۔پس اس سے ان کے لیے ملکہ کا فیصلہ واضح ہو گیا۔اس میں اس نے انہیں سلیمان علیہ السلام کے قہراً داخل ہونے سے ڈرایا۔پھر اس ڈرانے کی تصریح کرتے ہوئے کہا۔کہ سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر اسی طرح کریں گے۔کہا گیا ہے کہ جو بادشاہوں کی حالت بیان کی گئی ہے یہ اس کی تاکید اور تقریر ہے کیونکہ یہ ان کی مسلسل جاری رہنے والی ثابت شدہ عادت ہے۔یا پھر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے قول کی تصدیق ہے۔ اور اس کلام میں یہ احساس دلایا گیا ہے کہ وہ یہ رائے رکھتی تھی کہ صلح زیادہ بہتر اور نفع بخش ہے۔

وَاِنِّىْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

’’اور میں بھیجتی ہوں ان کی طرف ایک تحفہ ۱؎ پھر دیکھوں گی کہ قاصد کیا جواب لے کر لوٹتے ہیں ۲؎‘‘

۱؎ اس سے قبل مصالحت کی جو رائے قائم ہو رہی ہے یہ اس کا بیان ہے اور معنی یہ ہے کہ میں ان کی طرف تحفہ دے کر قاصد بھیجتی ہوں اور میں انہیں یہ تحفہ اپنے ملک کی طرف سے دوں گی۔ہدیہ ہر اس شے کا نام ہے جو بطور تحفہ دی جاتی ہے۔جیسا کہ عطیہ اس کا نام ہے جو عطا کی جاتی ہے۔علامہ بغویؒ نے فرمایا کہ بلقیس کے تحفہ بھیجنے کا مقصود یہ تھا تاکہ وہ سلیمان علیہ السلام کو پہچان لے۔آیا آپ بادشاہ ہیں یا نبی؟ یعنی اگر آپ بادشاہ ہوئے تو ہدیہ قبول کر لیں گے اور واپس چلے جائیں گے۔اور اگر نبی ہوئے تو راضی نہیں ہوں گے مگر صرف اس صورت میں کہ ان کے دین کی پیروی کی جائے۔

۲؎ پس اس نے آپ کی طرف کچھ غلام اور باندیاں بطور تحفہ بھیجے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس نے ان تمام کو ایک ہی قسم کا لباس پہنا دیا تاکہ لڑکے اور لڑکی کی پہچان نہ ہو سکے۔مجاہد اور مقاتل نے کہا ہے کہ غلاموں کو باندیوں کا لباس اور باندیوں کو غلاموں کا لباس پہنایا گیا تھا(1)۔اور ان کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ سو غلام اور سو باندیاں تھیں۔مجاہد نے کہا ہے کہ ان کی تعداد دو سو غلام اور دو سو باندیاں تھی۔حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ اس نے آپ کی طرف ریشم اور دیباج میں اینٹیں بھیجیں تھیں۔ثابت بنانی کا قول ہے کہ اس نے آپ کی طرف ریشمی غلافوں میں سونے کے پیالے بطور ہدیہ روانہ کیے تھے(2)۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سونے کی چار اینٹیں تھیں۔اور وہب وغیرہ نے یہ بھی کہا ہے کہ بلقیس نے پانچ سو غلاموں اور پانچ سو لڑکیوں کو اپنے پاس بلایا۔اور اس نے لڑکیوں کو لڑکوں کا لباس شیروانی اور کمر بند وغیرہ پہنا دیئے۔اور لڑکوں کو لڑکیوں کا لباس پہنا دیا ان کی کلائیوں پر سونے کے کنگن پہنا دیئے، گردنوں میں سونے کے ہار ڈال دیئے، کانوں میں بالیاں یا حسن و جمال کی مختلف قسموں سے مرصع زیور پہنا دیئے اور لڑکیوں کو پانچ سو گھوڑیوں اور لڑکوں کو پانچ سو تر کی گھوڑوں پر سوار کر دیا، ہر گھوڑے پر سونے کی لگام تھی جو

1۔تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ایضاً

جواہرات سے مرصع تھی اوران کی یہ چادریں مختلف رنگوں کے دیباج کی تھیں۔اس نے آپ کی طرف پانچ سو چاندی کی اینٹیں اور ایک تاج جس پر موتی اور عالیشان یاقوت جڑے ہوئے تھے دے بھیجا۔علاوہ ازیں کستوری،عنبر اور عود بخور ارسال کی۔اور پھر ایک ڈبیہ میں ایک قیمتی موتی رکھا جس میں سوراخ نہیں تھا اور گھونگھا رکھا جس میں ٹیڑھا سوراخ کیا ہوا تھا۔یہ سب کچھ تیار کرنے کے بعد اپنی قوم کے اشراف میں سے منذر بن عمرو کو بلایا اور اس کے ساتھ اپنی قوم کے کئی اصحاب عقل و دانش ملا دیئے۔اور ایک خط لکھ کر اسے دیا جس میں تمام تر ہدایا کی تفصیل اور فہرست تھی۔اور ساتھ لکھا کہ اگر آپ نبی ہیں تو پھر لڑکوں اور لڑکیوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیجئے۔اور جو کچھ ڈبیہ میں ہے اسے کھولنے سے پہلے اس کے بارے میں بتایئے؟ موتی میں ایسا سوراخ کر دیجئے جو دونوں طرفوں سے برابر ہو اور جن وانس کی مدد کے بغیر گھونگھے میں دھاگہ ڈال دیجئے۔بلقیس نے بچوں کو حکم دیا کہ جب سلیمان تم سے بات کریں،تو تم لڑکیوں کی مثل ان سے کلام کرنا اور ایسی باریک آواز میں گفتگو کرنا جو عورتوں کی کلام سے مشابہت رکھتی ہو۔اور اس نے لڑکیوں کو حکم دیا کہ وہ ان سے بھاری آواز میں گفتگو کریں جو مردوں سے مشابہت رکھتی ہو۔پھر اس نے قاصد کو کہا کہ اس آدمی کی طرف غور سے دیکھنا۔اگر اس نے تمہاری طرف غضب کی نگاہ سے دیکھا تو پھر جان لینا کہ وہ بادشاہ ہے اور اس کا دیکھنا تجھے قطعاً خوفزدہ نہ کرے کیونکہ ہم اس سے زیادہ عزت وشان والے ہیں۔اور اگر تو اسے خوش وخرم اور لطیف ونرم دیکھے تو پھر یقین کر لینا کہ وہ نبی مرسل ہے۔لہٰذا ان کی بات توجہ سے سمجھنا اور ادب و احترام کے ساتھ جواب دینا۔قاصد ھدایا لے کر چل پڑے لیکن ہدہد ان سے پہلے تیزی کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچا اور آپ کو ساری خبر پہنچا دی۔چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات کو سونے اور چاندی کی اینٹیں بنانے کا حکم فرمایا تو انہوں نے فوراً وہ بنا ڈالیں۔پھر آپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ انہیں وہاں ساری جگہ پر پھیلا دیں۔چنانچہ انہوں نے نو فرسخ،تک ایک وسیع میدان میں سونے اور چاندی کی اینٹیں لگا دیں اور ساتھ ہی آپ نے فرمایا کہ اس میدان کے اردگرد سونے اور چاندی کی ایک بلند دیوار کھڑی کر دیں۔پس انہوں نے یہ سب کچھ کر دیا۔پھر آپ نے فرمایا کون سا وہ سب سے خوبصورت جانور ہے جو تم نے بحر و بر میں دیکھا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی اے اللہ تعالیٰ کے نبی! بے شک ہم نے فلاں سمندر میں اس طرح کا ایک جانور دیکھا ہے۔اس میں مختلف خوبصورت رنگ ہیں،اس کے پر بازو ہیں،سر پر خوبصورت کلغیاں اور حسین وجمیل ماتھے بالوں والے ہیں۔آپ نے فرمایا اسی وقت اسے لے آؤ۔پس وہ اسے لے آئے۔آپ نے فرمایا اسے سونے چاندی کی اینٹوں پر میدان کے دائیں بائیں باندھ دو۔اور اس کا چارہ اس کے آگے ڈال دو۔پھر آپ نے جنوں کو فرمایا تم اپنے بچوں کو لے آؤ۔چنانچہ آپ کے پاس خلق کثیر جمع ہو گئی۔آپ نے انہیں میدان کے دائیں بائیں کھڑا کر دیا۔پھر حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی مجلس میں اپنے تخت پر جلوہ افروز ہوئے اور چار ہزار کرسیاں آپ کی دائیں طرف اور اتنی ہی بائیں طرف رکھ دی گئیں۔پھر آپ نے شیاطین کو حکم دیا کہ وہ کئی فراسخ تک آپ کے دائیں بائیں کھڑے ہو جائیں۔پس جب بلقیس کی طرف سے آنے والی قوم قریب پہنچی اور ان کی نظر ملک سلیمان پر پڑی اور ایسے ایسے جانور دیکھے جن کی مثل کبھی بھی ان کی آنکھوں نے نہیں دیکھے تھے کہ وہ سونے اور چاندی کی اینٹوں پر گوبر کرتے ہیں تو وہ بذات خود اپنے آپ کو حقیر جاننے لگے نتیجۃً انہوں نے وہ تمام تحائف اور ھدایا پھینک دیئے جو ساتھ لا رہے تھے۔

بعض روایات میں اس طرح ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے سونے چاندی کی اینٹوں کا فرش بچھانے کا حکم دیا اور ساتھ فرمایا کہ ان لوگوں کے راستے میں اتنی اینٹوں کی مقدار راستے سے جگہ چھوڑ دیں جتنی وہ ساتھ لا رہے ہیں۔پس جب ان قاصدوں نے ان اینٹوں

سے وہ جگہ خالی دیکھی حالانکہ وہ تمام زمین پر لگی ہوئی تھیں تو انہیں خوف لاحق ہوا کہ کہیں ان پر اینٹیں چرانے کا الزام عائد نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے پاس سے تمام اینٹیں وہاں پھینک دیں۔ پھر جب انہوں نے شیاطین کو دیکھا تو انہیں ایک عجیب منظر نظر آیا۔ لہٰذا وہ گھبرا گئے لیکن شیاطین نے انہیں کہا تم آگے چلتے جاؤ تم پر کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ وہ جن وانس، طیور و وحوش اور درندوں کے دستوں میں سے گزرتے گئے یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے جا ٹھہرے۔ تو آپ نے ان کی طرف انتہائی خندہ روئی سے بنظر تحسین دیکھا اور فرمایا تمہارے پاس کیا ہے؟ تو قافلے کے سردار نے ان چیزوں کے بارے آپ کو بتایا جو وہ لائے تھے۔ اور آپ کو ملکہ کا خط بھی دیا۔ آپ نے اسے پڑھا تو فرمایا ڈبیہ کہاں ہے؟ وہ پیش کی گئی تو آپ نے اسے حرکت دی۔ اتنے میں حضرت جبرائیل امین علیہ السلام آ گئے اور جو کچھ ڈبیہ میں تھا اس کے بارے میں آپ کو مطلع کر دیا۔ پس آپ نے فرمایا اس میں ایک قیمتی موتی ہے جس میں سوراخ نہیں۔ اور ایک سوراخ دار گھونگھا ہے جس میں سوراخ ٹیڑھا ہے۔ یہ سن کر قاصد نے کہا آپ نے سچ فرمایا ہے، اب آپ موتی میں سوراخ کر دیجئے اور گھونگھے میں دھاگہ ڈال دیجئے۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کون میرے لیے اس میں سوراخ کرے گا؟ آپ نے انسانوں سے پوچھا پھر جنات سے۔ لیکن ان میں سے کسی کے پاس یہ علم نہیں تھا۔ پھر آپ نے شیاطین سے پوچھا۔ تو انہوں نے عرض کی آپ یہ لکڑی کے کیڑے (دیمک) کے حوالے کیجئے۔ چنانچہ اس نے بال اپنے منہ میں لیا اور اسے لے کر موتی میں داخل ہو گیا یہاں تک کہ دوسری جانب سے نکل گیا۔ تو آپ نے اس کیڑے سے کہا۔ تیری کیا حاجت ہے مانگ؟ تو اس نے عرض کی میرا رزق درختوں میں (لکڑی میں) رکھ دیجئے تو آپ نے فرمایا تیرے لیے ایسا ہی ہوگا۔ اور ایک روایت اس طرح ہے کہ آپ کے پاس درختوں کا کیڑا حاضر ہوا اور عرض کی سوراخ میں دھاگہ میں ڈال دوں گا اس شرط پر کہ میرا رزق درختوں میں رکھ دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے اس کے لیے ایسا ہی کر دیا۔ تو اس نے دھاگہ اپنے منہ میں پکڑا اور سوراخ میں داخل ہو گیا اور دوسری جانب سے پار نکل گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا تیری کیا حاجت ہے؟ اس نے عرض کی میرا رزق پھلوں میں رکھ دیا جائے۔ تو آپ نے فرمایا تیرے لیے ایسا کر دیا۔ پھر آپ نے لڑکیوں اور لڑکوں کو علیحدہ علیحدہ کیا۔ اس طرح کہ آپ نے انہیں ہاتھ منہ دھونے کا حکم فرمایا۔ پس لڑکیاں برتن سے ایک ہاتھ کے ساتھ پانی لیتی تھیں پھر اسے دوسرے ہاتھ پر ڈالتیں اور پھر وہ اپنے منہ پر مارتی تھیں۔ جبکہ لڑکے جیسے ہی برتن سے پانی لیتے تھے اپنے منہ پر مار دیتے تھے۔ لڑکیاں اپنی کلائیوں کے باطن پر پانی انڈیلتی تھیں اور لڑکے کلائیوں کے ظاہر پر۔ لڑکیاں انتہائی سکون کے ساتھ پانی انڈیلتی تھیں اور لڑکے بڑی تیزی سے اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالتے تھے۔ پس اس طرح تو آپ نے انہیں علیحدہ علیحدہ کر لیا۔ پھر آپ نے وہ تحائف واپس لوٹا دیے جیسا کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا ہے۔ یہ سب علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے۔ اور مختلف روایات سے ماخوذ ہے۔ ان میں سے بعض ابن ابی حاتم نے سدی سے اور بعض نے ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے یزید بن رومان سے نقل کی ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾

''سو جب قاصد آپ کے پاس (ہدیہ لے کر) آیا تو آپ نے فرمایا کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟

رہے (گویا کوئی بڑی نادر چیز لائے ہو) ۳؎۔"

۱؎ سو جب سلیمان علیہ السلام کے پاس قاصد آیا یا وہ شے پہنچی جو اس نے آپ کی طرف ہدیہ بھیجی۔ حمزہ اور یعقوب نے تَمِدُّوْنَنِ کو تُمِدُّوْنِّیْ ایک نون مشددہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور دونوں حالتوں میں یاء متکلم کو ثابت رکھا ہے۔ اور باقیوں نے دو خفیف نونوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے دولتوں حالتوں میں یاء متکلم ثابت رکھا ہے۔ اور نافع اور ابوعمرو نے صرف حالت وصل میں اسے ثابت رکھا ہے، جبکہ باقی قراء اسے دونوں حالتوں میں حذف کر دیتے ہیں۔ اور مَالِ کی تنوین تحقیر کے لیے ہے۔ اور یہ خطاب قاصد اور اس کے ساتھیوں کو ہے۔ یا یہ خطاب قاصد اور اسے بھیجنے والے کو ہے۔ اور اس میں مخاطب کو غائب پر غلبہ دیتے ہوئے یہ صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور استفہام انکار کے لیے ہے یعنی مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ تم میری امداد ہدیہ کے ساتھ کرو اور اس کی میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔

۲؎ پس اللہ تعالیٰ نے دین، نبوت، حکمت اور جو ملک مجھے عطا فرمایا ہے یہ اس سے زائد نہیں۔ قالون، حفص اور ابوعمرو نے ان کے برخلاف حالت وصل میں یاء مفتوحہ کے اثبات کے ساتھ اور حالت وقف میں یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ ورش نے حالت وصل میں یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور حالت وقف میں اسے حذف کر دیا ہے اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کر دیا ہے۔

۳؎ یعنی وہ اس سے افضل ہے۔ جو اس نے تمہیں دیا ہے۔ اس میں مذکورہ انکار ہی طویل ہو رہا ہے۔ کیونکہ تم حیات دنیا میں سے صرف ظاہر کو ہی جانتے ہو لہٰذا تم مال کی بہت زیادہ محبت کے سبب اس مال پر فرحت و مسرت کا اظہار کر رہے ہو جو تم بطور ہدیہ لے کر آئے۔ یا تم اپنے ہم منصب لوگوں پر فخر کا اظہار کرنے کے لیے کسی غیر کو تحفہ دینے میں خوشی محسوس کرتے ہو۔ اور یہ سابقہ انکار کے مفہوم سے اضراب ہے، یعنی لَا اَفْرَحُ بَلْ اَنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ۔ میں خوش نہیں ہوا بلکہ تم خوش ہو رہے ہو۔ اور یہ بیان ہے اس امر کا جس نے انہیں ایسا کرنے پر برانگیختہ کیا۔ اور اس سے مراد دنیوی ہمت و طاقت کی کمی بیشی میں آپ کے حال کو اپنے حال پر قیاس کرنا ہے۔ پھر آپ نے منذر بن عمرو کو فرمایا۔

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

"تو واپس چلا جا ان کے پاس اور ہم آ رہے ہیں ان کی طرف ۱؎ ایسے لشکر لے کر جن کے مقابلہ کی ان میں تاب نہیں ۲؎ اور ہم یقیناً نکال دیں گے انہیں اس شہر سے ذلیل کر کے اور وہ خوار اور رسوا ہو چکے ہوں گے ۳؎۔"

۱؎ یعنی تو بلقیس اور اس کی قوم کی طرف واپس چلا جا فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور فاء سببیہ ہے۔

۲؎ ایسے لشکر کے ساتھ ہم ان کی طرف آ رہے ہیں جس کے مقابلہ کی ان میں طاقت نہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ جنود کی صفت ہے۔

۳؎ اور ہم یقیناً انہیں ان کی زمین سے نکال دیں گے۔ اور وہ ذلیل و رسوا ہوں گے۔ صٰغِرُوْنَ اَذِلَّةً کی تاکید کے لیے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اذلة اعزة کی ضد ہے۔ اذلة سے مراد ان کی عزت اور ملک کا چلا جانا ہے اور صغار سے مراد ان کا قید میں واقع ہونا ہے۔ یعنی ہم انہیں یقیناً ان کی زمین سے نکال دیں گے اگر وہ اطاعت گزار بن کر میرے پاس نہ آئے۔ وہب وغیرہ نے کہا ہے کہ جب بلقیس کے قاصد حضرت سلیمان علیہ السلام سے ہو کر واپس پہنچے تو اس نے کہا قسم بخدا میں نے پہچان لیا ہے کہ وہ بادشاہ نہیں اور

ہم اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ اس نے آپ کی طرف یہ پیغام بھیجا کہ میں اپنی قوم کے سرداروں کے ساتھ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو رہی ہوں۔ اور میں آپ میں اور آپ کے اس دین میں جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دیں گے غور و فکر کروں گی۔ پھر اس نے اپنے تخت کے بارے حکم دیا کہ اسے ان سات کمروں میں سے آخری میں رکھ دیا جائے جو ایک دوسرے کے اندر بنے ہوئے ہیں۔ یا یہ کہ اس کے سات محلات میں سے ایک محل میں رکھ دیا جائے۔ اور پھر اس کے دروازے بند کر دیئے اور اس کی حفاظت کے لیے چوکیدار مقرر کر دیئے۔ پھر جسے اپنی سلطنت کا خلیفہ بنایا اسے کہا کہ میرے شاہی تخت اور جو چیز تجھے سپرد کی گئی ہے اس کی حفاظت کرنا اور میرے آنے تک کوئی تخت تک نہ پہنچے اور نہ اسے خراب کرے۔ پھر منادی کو حکم دیا کہ وہ ہمارے سفر کے بارے تمام اہل مملکت میں اعلان کر دے اور انہیں اس سے آگاہ کر دے اور پھر وہ مملکت یمن کے بارہ ہزار سرداروں کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب چلی(1) اور ہر سردار کے ماتحت کئی ہزار افراد تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام انتہائی بارعب آدمی تھے کوئی بھی کسی چیز کے بارے میں سوال کی ابتدا نہیں کر سکتا تھا حتیٰ کہ وہی کلام کرتا جس سے آپ بات پوچھا کرتے تھے۔ پس آپ ایک دن باہر تشریف لائے اور اپنے تخت شاہی پر تشریف فرما ہوئے تو آپ نے قریب ہی غبار اڑتے دیکھا اور فرمایا یہ کیا ہے؟ تو آپ کے اصحاب نے عرض کی۔ اس جگہ بلقیس اتری ہوئی ہے۔ وہ جگہ آپ سے ایک فرسخ کے فاصلے پر تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا حیرہ اور کوفہ کے درمیان ایک فرسخ کی مقدار فاصلہ تھا۔ تو اس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے لشکر کی طرف متوجہ ہوئے۔(2)

قَالَ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَیُّكُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ﴿۳۸﴾

”آپ نے فرمایا اے (میرے) درباریو! کون تم سے لے آئے گا میرے پاس اس کے تخت کو اس سے پہلے کہ وہ آجائیں میری خدمت میں فرمانبردار بن کر۔“

1۔ آپ کی اس سے مراد یہ تھی کہ آپ ایک معجزہ کے ذریعے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی سلطانی کی عظمت دکھائیں کہ وہ اس کے ساتھ اس کا تخت بھی لے آئیں اور اس کی عقل کی آزمائش کریں اس طرح کہ وہ اپنے تخت کا انکار کر دے گی۔ پس آپ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آیا وہ اسے پہچانتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ جب وہ فرمانبردار بن کر آ جائے گی تو پھر اس کی رضامندی کے بغیر اسے اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔

قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَ اِنِّیْ عَلَیْهِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ ﴿۳۹﴾

”عرض کی عفریت نے جنات میں سے 1 (حکم ہو تو) میں لے آتا ہوں آپ کے پاس اسے پیش ازیں کہ آپ کھڑے ہوں اپنی جگہ سے 2 اور بے شک میں اس کو اٹھا لانے کی طاقت بھی رکھتا ہوں (اور) امین بھی ہوں 3۔“

1۔ ضحاک نے کہا کہ عفریت ایک خبیث جن تھا۔ فراء نے کہا ہے وہ بہت زیادہ قوت والا تھا۔ ابن قتیبہ نے کہا عفریت سے مراد وہ ہے جسے بہت طاقتور پیدا کیا گیا۔ یہ العفر سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی مٹی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے(3) عَافَرَهٗ اِذَا صَارَعَهٗ فَاَلْقَاهُ عَلَی

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

الْعَافِرِ اَيِ التُّرَابِ (جب کوئی کسی کو پچھاڑ دے تو کہتے ہیں عافرہ۔ یعنی اس نے اسے مٹی پر پھینک دیا)۔ وہب نے کہا اس کا نام کوذی تھا(1) علاوہ ازیں اذ کمان اور صخر الجنی بھی نام ذکر کیے گئے ہیں یہ پہاڑ کی مثل تھا اور اپنی حد نگاہ پر قدم رکھتا تھا۔

؎ عفریت نے کہا میں اسے آپ کے پاس لے آتا ہوں آپ کی اس مجلس سے پہلے جس میں آپ فیصلے فرماتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آپ ہر روز نصف النہار تک مجلس قضا منعقد کرتے تھے۔(2)

؎ اور بے شک میں اسے اٹھانے کی قوت رکھتا ہوں اور ان تمام ہیرے جواہرات پر امین بھی ہوں جو اس میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ جملہ اٰتِیْکَ کے فاعل سے حال ہے۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا میں اس سے بھی پہلے یہاں موجود دیکھنا چاہتا ہوں۔

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۫ لِیَبْلُوَنِیْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَ مَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ ۞

''عرض کی اس نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا ؎ (اجازت ہو تو) میں لے آتا ہوں اسے آپ کے پاس اس سے پہلے کہ آپ کی آنکھ جھپکے ؎ پھر جب آپ نے اسے دیکھا کہ وہ رکھا ہوا ہے آپ کے نزدیک تو فرمانے لگے کہ یہ میرے رب کا فضل (وکرم) ہے ؎ تاکہ وہ آزمائے مجھے کہ آیا میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری ؎ اور جس نے شکر کیا تو وہ شکر کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے ؎ اور جو ناشکری کرتا ہے (وہ اپنا نقصان کرتا ہے) بلاشبہ میرا رب غنی بھی ہے (اور) کریم بھی ؎ ''

؎ ابن ابی حاتم نے ابن لہیعہ سے نقل کیا ہے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے(3)۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ تھا جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سلیمان علیہ السلام کی مدد فرمائی۔ اور اکثر مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ حضرت آصف بن برخیا تھے اور یہ صدیق تھے اللہ تعالیٰ کا وہ اسم اعظم جانتے تھے کہ جب بھی اس کے ساتھ دعا کی جائے تو وہ قبول ہوتی ہے اور جب اس کے ساتھ کوئی سوال کیا جاتا ہے تو وہ عطا کر دیا جاتا ہے۔

حضرت جریر اور مقاتل ضحاک سے اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آصف نے نماز کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا کہ وہ اپنی آنکھوں کھول کر دیکھیں۔ جہاں تک دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے یمن کی طرف دیکھا اور ادھر آصف نے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو بھیجا تو انہوں نے تخت کو اٹھایا اور زمین کے نیچے سے زمین چیرتے ہوئے لیتے آئے حتیٰ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے سے تخت کے سبب زمین پھٹ گئی۔ کلبی نے کہا ہے کہ آصف سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کے وسیلہ سے دعا مانگی تو اس کا تخت زمین کے نیچے چلا گیا یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی کے پاس سے ظاہر ہو گیا(4)۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دو مہینے کی مسافت پر تھا۔

وہ دعا جو حضرت آصف نے مانگی تھی اس میں اختلاف ہے۔ مجاہد اور مقاتل کہتے ہیں کہ وہ یا ذاالجلال و الاکرام ہے۔ کلبی نے کہا وہ اسم یا حی یا قیوم تھا(5)۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیق رضی اللہ عنہا سے یہی مروی ہے۔ زہری نے کہا ہے کتاب کا علم

1۔ تفسیر خازن زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
5۔ ایضاً

رکھنے والے کی دعا یہ تھی "یَااِلٰهُنَا وَاِلٰهُ کُلِّ شَیْءٍ اِلٰهاً وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اِیْتِنِیْ بِعَرْشِهَا" (1) اسم اعظم کے بارے میں مفصل بحث سورۂ آل عمران کے شروع میں گزر چکی ہے۔ زہری کا قول میرے نزدیک ترجیح یافتہ ہے۔ محمد بن منکدر نے کہا ہے کہ وہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا وہ بذات خود حضرت سلیمان علیہ السلام تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وفہم عطا فرمایا تھا(2) اور اسے اس طرح بیان اس لیے کیا ہے تاکہ علم کی عظمت وشرف پر دلیل ہو جائے کیونکہ آپ کی یہ کرامت وعزت اس علم کے سبب ہی تھی۔

ع۔ اس آیت میں آپ کا خطاب عفریت کے لیے ہے۔ گویا کہ آپ نے معجزہ کے اظہار کا ارادہ فرمایا تو پہلے انہیں چیلنج کیا۔ پس جب عفریت نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ تو آپ نے اس رفتار کو بہت آہستہ اور سست سمجھا اور اسے اس طرح خطاب کیا۔ اور اس سے ارادہ یہ فرمایا کہ وہ اسے اتنا جلدی لے آئیں گے کہ عفاریت بھی اس کی قدرت وطاقت نہیں رکھتے، چہ جائیکہ کوئی اور ایسا کر سکے۔ الکتاب سے مراد جنس الکتاب ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ تمام کتب داخل ہیں۔ یا اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔ اور اٰتِیْکَ دونوں مقامات پر فعل اور اسم بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ طرف سے مراد دیکھنے کے لیے پلکوں کو حرکت دینا ہے۔ اور جب دیکھنے والے کو یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے کسی چیز کی طرف توجہ کے لیے پلکوں کو کھولا تو پھر اس کا مقابل رَدُّالطرف ہوگا، یعنی اس نے نظر کو واپس لوٹانے کے لیے پلکوں کو بند کر دیا۔ گویا معنی یہ ہوگا کہ آپ کسی شے کی طرف توجہ کرنے کے لیے پلکوں کو حرکت دے کر کھولیں گے تو اس سے قبل کہ آپ انہیں بند کریں میں اس کا تخت حاضر کر دوں گا۔ اس طرح حد درجہ سرعت رفتار کو بیان کرنا مقصود ہے۔

س۔ پس جب سلیمان علیہ السلام نے دیکھا۔ اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے "فَاَمَرَهُ سُلَیْمَانُ بِالسَّرِیْرِ فَدَعَا بِاسْمِ اللّٰهِ الْاَعْظَمِ فَمَالَ عَرْشُهَا تَحْتَ الْاَرْضِ فَنَبَعَ عِنْدَسَرِیْرِ سُلَیْمَانَ فَلَمَّا رَاٰهُ" (یعنی سلیمان علیہ السلام نے اسے تخت لانے کا حکم ارشاد فرمایا تو اس نے اسم اعظم کے وسیلہ سے دعا مانگی۔ پس اس کا تخت زمین کے نیچے سے ہوتا ہوا سلیمان علیہ السلام کے تخت کے پاس ظاہر ہوا۔ تو جب آپ نے اسے اپنے نزدیک رکھا ہوا دیکھا تو اس نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا جیسا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کا طریقہ ہے۔ "هٰذَا" کہ ان کا بذات خود یا کسی اور کا دو ماہ کی مسافت سے آنکھ جھپکنے کی دیر میں تخت کو حاضر کرنے کی یہ قدرت میرے رب کا فضل ہے۔ اور یہ ان بہت سے فضلوں میں سے ایک ہے جو اس نے مجھ پر فرمائے ہیں۔

ہ۔ لِیَبْلُوَنِیْ کو نافع نے یاء مفتوح کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے آزمانے کے لیے مجھ پر فضل فرمایا ہے۔ کہ آیا میں نعمت کا شکر ادا کرتا ہوں اور اسے محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل دیکھتا ہوں کیونکہ مجھ میں نہ اس کی طاقت ہے اور نہ قوت۔ اور پھر اس کا حق ادا کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں اس طرح کہ میں اپنے آپ میں اس کی اہلیت ہونے کا گمان کرتا ہوں یا پھر اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہوں۔ ترکیب کلام میں یہ دونوں لِیَبْلُوَنِیْ کی ضمیر منصوب سے بدل ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہیں۔

ھ۔ کیونکہ شکر کے سبب نعمت کو دوام اور اس میں اضافہ حاصل ہوتا ہے۔ فَاِنَّ الشُّکْرَ قَیْدُ النِّعْمَةِ الْمَوْجُوْدَةِ وَصَیْدُ النِّعْمَةِ الْمَفْقُوْدَةِ۔ (کیونکہ شکر موجود نعمت کے لیے قید ہوتا ہے اور مفقود (گم شدہ) نعمت کے لیے شکار)۔ اس کے سبب بندہ اپنے واجب کی ذمہ داری سے فارغ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے درجات بلند ہو جاتے ہیں۔ اور دار الجزاء میں وہ اجر کا مستحق بن جاتا

1۔ تفسیر [illegible] 2۔ ایضاً

ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "اَلطَّاعِمُ الشَّاكِرُ بِمَنْزِلَةِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ" (1) شکر ادا کرتے ہوئے کھانے والا صبر کرنے والے روزہ دار کی مثل ہے۔ اسے امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور امام احمد اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ سنان بن سنہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں "اَلطَّاعِمُ الشَّاكِرُ لَهُ مِثْلُ اَجْرِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ" (2) (شکر ادا کرتے ہوئے کھانے والے کا اجر صبر کرنے والے روزے دار کے اجر کی مثل ہے۔)

لے اور جو ناشکری کرتا ہے تو بلاشبہ میرا رب اس کے شکر سے غنی ہے وہ تو شکر کرنے والے اور ناشکری کرنے والے کو نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ اس میں جواب شرط محذوف ہے۔ اور اس کی دلیل کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَضُرُّ رَبِّيَ لِاَنَّهٗ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ" (اور جو ناشکری کرتا ہے وہ میرے رب کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا کیونکہ وہ تو غنی بھی ہے اور کریم بھی۔)

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾

"آپ نے حکم دیا شکل بدل دو اس کے لیے اس کے تخت کی لے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ حقیقت پر آگاہ ہوتی ہے یا ہو جاتی ہے ان لوگوں میں سے جو حقیقت کو نہیں پہچانتے ۲ے"

لے سلیمان علیہ السلام نے فرمایا بدل دو بلقیس کے لیے اس کا تخت یعنی اسے اس طرح بنا دو کہ جب وہ دیکھے تو اسے نہ پہچان سکے۔ روایت یہ ہے کہ اس کے نیچے والے حصہ کو اوپر اور اوپر والے حصہ کو نیچے کر دیا گیا اور سرخ جواہر کی جگہ سبز اور سبز جواہر کی جگہ سرخ لگا دیئے گئے۔

۲ے نَنْظُرْ جواب امر ہونے کی بناء پر مجزوم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کیا وہ اس کی پہچان یا صحیح جواب کے لیے راہنمائی پاتی ہے۔ حضرت کعب اور وہب وغیرہما کی روایت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسا کرنے پر اس چیز نے برانگیختہ کیا کہ شیاطین کو خوف لاحق ہوا کہ آپ اس سے شادی کر لیں گے اور وہ آپ کے سامنے جنات کے اسرار و رموز ظاہر کر دے گی کیونکہ اس کی ماں پری تھی اور جب اس کے ہاں اولاد ہو گی تو پھر ہمیشہ آپ کے بعد آپ کی اولاد اور ذریت کے تابع رہنا پڑے گا۔ لہٰذا انہوں نے اس کی مذمت بیان کرنا شروع کر دی تاکہ وہ آپ کو نفرت دلا کر اس سے دور کر سکیں۔ لہٰذا انہوں نے کہا بے شک اس کی عقل کم ہے، اس کے پاؤں گدھے کے کھروں کی مثل ہیں۔ اور اس کی پنڈلیوں پر بال ہیں۔ پس یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے ارادہ فرمایا کہ اس کے تخت کو بدل کر اس کی عقل کو آزمائیں اور ایک بلوریں محل بنا کر اس کے قدموں کو دیکھ لیں۔

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَ كُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾

"سو جب وہ آئی تو اس سے پوچھا گیا کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے لے کہنے لگی یہ تو ہو بہو وہی ہے۔ اور ہمیں اطلاع مل گئی تھی اس واقعہ کی اس سے پہلے ۲ے اور ہم تو فرمانبردار بن کر حاضر ہوئے ہیں ۳ے"

لے کا عطف اس قول پر ہے "فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ" اور ان کے درمیان جملے معترضے ہیں۔ اسے کہا گیا کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے۔ اس کی عقل کے امتحان اور آزمائش میں شدت اور سختی کرتے ہوئے اس پر معاملہ مشتبہ بنا دیا گیا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 369 (العلمیۃ) 2۔ ایضاً

۲؎ مقاتل نے کہا ہے کہ اس نے اسے پہچان لیا لیکن اس نے انہیں اسی طرح شبہ میں ڈال دیا جیسے انہوں نے اسے شبہ میں ڈالا تھا۔(1) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس پر صورت حال مشتبہ ہو گئی اسی لیے اس نے جواب میں نَعَمْ (جی ہاں) نہیں کہا اور نہ ہی اس نے جھوٹ کے خوف سے لَا (نہیں) کہا۔ پس اس سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی عقل کو پہچان لیا کہ نہ اس نے اقرار کیا اور نہ ہی انکار۔ اور پھر اسے کہا گیا کہ بے شک یہ تیرا ہی تخت ہے۔ پس دروازوں کے بند کرنے اور پہرے داروں کے کھڑے کرنے نے تجھے کوئی نفع نہیں دیا۔ تو اس نے کہا ہمیں اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور سلیمان کی نبوت کے صحیح ہونے کا علم دے دیا گیا ہے۔

ان دیگر علامات کے سبب جو اس تخت کی علامت سے پہلے تھیں۔ مثلاً ھد ھد کا خط پہنچانا اور ہدیہ اور قاصدوں کا معاملہ وغیرہ۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور آپ کی قوم کا کلام ہے۔ اس کا عطف اس کے جواب پر ہے کیونکہ اس میں اس پر دلالت موجود ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آئی۔ تب اسے خیال آیا کہ غالب گمان کے مطابق یہ تخت اسی کا ہو اور اسے یہاں حاضر کرنا ان معجزات میں سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا۔ اور ان کا ظہور صرف انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔ اور معنی یہ ہے وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ بِاللّٰهِ تَعَالٰى وَقُدْرَتِهٖ وَصِحَةِ مَا جَاءَ مِنْ عِنْدِهٖ قَبْلَهَا (کہ ہمیں اس سے قبل ہی اللہ تعالیٰ، اس کی قدرت اور اس کی جانب سے آنے والے کے صحیح ہونے کا علم دے دیا گیا)

۳؎ اور ہم تو اس کے حکم کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اور ہمیشہ اس کے دین پر رہیں گے۔ اور اس سے ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو بیان کرنا اور اس کا شکر ادا کرنا ہے جو اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے ان پر فرمائی تھی۔ اور اس کا معنی اس طرح بھی کیا گیا ہے کہ ہمیں اس کے اسلام لانے اور اس کے فرمانبردار بن کر آنے کا علم اس کے آنے سے پہلے ہی عطا کر دیا گیا۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے والے ہیں۔

وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾

''اور روک رکھا تھا اسے (ایمان لانے سے) ان بتوں نے جن کی وہ عبادت کیا کرتی تھی اللہ تعالیٰ کے سوا ۱؎ بے شک وہ قوم کفار سے تھی ۲؎''

۱؎ اور سلیمان علیہ السلام نے اسے سورج کی عبادت کرنے سے روکا۔ اس آیت میں ما محل نصب میں ہے اس لیے کہ اس سے پہلے حرف جر محذوف ہے اور فعل کا تعلق بلاواسطہ اس سے ہو چکا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ما محل رفع میں ہے۔ اور معنی یہ ہے اسے توحید سے ان بتوں نے روک رکھا تھا جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتی تھی۔ نہ کہ اس کی عقل کے ناقص ہونے نے۔ جیسا کہ جنوں نے کہا کہ اس کی عقل کمزور ہے۔

۲؎ جملہ مستانفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ بے شک یہ اس قوم میں سے تھی جو سورج کی عبادت کرتی تھی۔ چونکہ یہ ان ہی میں پیدا ہوئی۔ لہٰذا یہ سورج کی عبادت کے سوا اور کچھ نہیں جانتی تھی۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے پاؤں اور پنڈلیاں دیکھنے کا ارادہ کیا مگر اس طرح کہ اسے ان کو ننگا کرنے کا حکم دینے کی ضرورت نہ پڑے کیونکہ شیاطین نے کہا تھا کہ اس کے پاؤں گدھے کے کھروں کی مثل ہیں۔ اور اس کی پنڈلیوں پر بال ہیں۔ تو اس مقصد کے لیے آپ نے شیاطین کو شیشے کا محل تعمیر کرنے کا حکم فرمایا اور کہا گیا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

ہے کہ ایسا شیشے کا کمرہ تیار کرو جو سفیدی میں پانی کی مثل ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الصرح سے مراد گھر کا صحن ہے اور یعنی صحن شیشے کا بنا کر اس کے نیچے پانی جمع کر دیا اور اس میں ہر قسم کے سمندری جانور پھینک دیئے مثلاً مچھلیاں، مینڈک وغیرہ۔ پھر اس کے سامنے آپ نے اپنا تخت بچھا دیا۔ اور اس پر تشریف فرما ہوئے۔ اور آپ کے دونوں طرف پرندے، انسان اور جنات کھڑے ہو گئے یہ قول بھی ہے کہ آپ نے بلور سے صحن بنایا اور اس کے نیچے مچھلیوں اور مینڈکوں کی تصویریں بنا دیں اس طرح کہ جب اسے کوئی دیکھے تو وہ اسے پانی گمان کرے۔ تب جب آپ تخت پر متمکن ہوئے تو آپ نے بلقیس کو بلایا۔ جب وہ آئی تو اسے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو جاؤ۔

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۭ۬ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾

"اسے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو جاؤ۔ پس جب اس نے دیکھا اس (کے بلوریں فرش) کو تو اس نے خیال کیا کہ یہ گہرا پانی ہے اور اس نے اٹھالیا کپڑا اپنی دونوں پنڈلیوں سے [1]۔ آپ نے فرمایا یہ (پانی نہیں) چمکدار محل ہے بلور کا بنا ہوا ہے (اس کی آنکھیں کھل گئیں) کہنے لگی اے میرے رب! میں (آج تک) ظلم ڈھاتی رہی اپنی جان پر اور اب ایمان لائی ہوں سلیمان کے ساتھ اللہ پر جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے [2]۔"

[1] اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے فَدَخَلَتْهُ يَعْنِي مِنَ الْبَابِ وَرَاَتْهُ اَيِ الصَّرْحَ بِلَاحِجَابٍ قَبْلَ وُرُوْدِهَا فَلَمَّا رَاَتْهُ سو وہ دروازے سے داخل ہوئی اور اپنے ورود سے پہلے صحن کو بلا حجاب دیکھا تو جونہی اس پر نظر پڑی تو اسے گہرا پانی گمان کیا اور اس نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھالیا تا کہ وہ اس میں داخل ہو۔ قنبل نے یہاں عن سَاقَيْهَا، سورۂ صٓ میں بِالسُّوْقِ اور سورۃ الفتح میں عَلٰى سُوْقِه تینوں مقامات پر ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے بغیر ہمزہ کے قرأت کی ہے۔ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ایک طویل حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے آنے سے پہلے ایک محل بنانے کا حکم فرمایا اس کا صحن سفید شیشے کا تھا۔ اس کے نیچے پانی جاری کر دیا اور اس میں سمندری حیوانات ڈال دیئے۔ اور اس کے سامنے اپنا تخت بچھا کر اس پر جلوہ افروز ہو گئے۔ پس جب بلقیس نے اسے دیکھا تو اسے ٹھہرا ہوا پانی گمان کیا اور اس میں داخل ہونے کے لیے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا دیا(1)۔ اور وہ سلیمان علیہ السلام تک پہنچ گئی۔ پس سلیمان علیہ السلام نے دیکھ لیا کہ وہ پنڈلی اور قدم کے اعتبار سے لوگوں سے زیادہ حسین ہے۔ مگر اس کی پنڈلیوں پر بال ہیں۔ پس جب آپ نے یہ دیکھ لیا، تو اس سے اپنی نظر پھیر لی۔ اسی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شادی کی غرض سے پیغام سے قبل اجنبی عورت کو دیکھ لینا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اِذَا خَطَبَ اَحَدُكُمُ الْمَرْاَةَ فَاِنِ اسْتَطَاعَ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى مَا يَدْعُوْهُ اِلٰى نِكَاحِهَا فَلْيَفْعَلْ (جب تم میں سے کوئی کسی عورت کو پیغام نکاح دے تو اگر وہ اس جزو بدن (یعنی چہرہ ہاتھ پاؤں) کی طرف دیکھنے کا موقع پالے جو اسے اس سے نکاح کی دعوت دیتا ہے تو چاہیے کہ وہ ایسا کر لے) اسے ابوداؤد نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے۔(2)

امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے ایک عورت کو پیغام نکاح دیا، تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا کیا تو نے اسے دیکھا ہے۔ میں نے عرض کی نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کی طرف

1۔ تفسیر بیضاوی زیر آیت ہذا 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 284 (وزارت تعلیم)

دیکھ لے کیونکہ یہ تم دونوں کے درمیان محبت قائم کرنے کے لیے زیادہ مناسب ہے۔(1)

ع آپ نے فرمایا بے شک یہ محل ہے جسے شیشے سے چمکدار اور ملائم بنایا گیا ہے۔ امرد بھی اسی سے ہے یعنی وہ لڑکا جس کی ڈاڑھی ابھی نہ نکلی ہو۔ جس وقت اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ دیکھا تو کہا۔ اے میرے رب! بے شک میں کفر اور سورج کی عبادت کے سبب اپنے نفس پر ظلم کرتی رہی۔ پس اب میں اس سے توبہ کرتی ہوں یعنی میں اللہ تعالیٰ کے لیے خالص توحید پر ایمان لے آئی۔ کہا گیا ہے کہ جب وہ اس محل میں پہنچی اور اسے وہاں گہرے پانی کا گمان ہوا تو وہ اپنے دل میں کہنے لگی کہ بے شک سلیمان اسے غرق کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں حالانکہ اس کی نسبت قتل زیادہ آسان تھا۔ تو اس لیے اس نے کہا کہ بے شک میں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں اس گمان کے سبب اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔ لہٰذا میں اس سے توبہ کرتی ہوں اور ان کے ساتھ ایمان لاتی ہوں۔ اس کے اسلام لانے کے بعد اس کے معاملہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ لہٰذا عون بن عبداللہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی نے عبداللہ بن عیینہ سے سوال کیا کیا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے شادی کی تھی؟ تو انہوں نے کہا کہ اس کا معاملہ اس کے اس قول پر ختم ہو جاتا ہے۔ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ یعنی اس کے سوا ہم اس کے بارے کچھ نہیں جانتے(2)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ آپ نے اس سے شادی کی تھی۔ اسے ابن عساکر نے عکرمہ سے نقل کیا ہے(3)۔ اور جب آپ نے اس سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تو آپ کو اس وقت سخت کراہت ہوئی جب آپ نے اس کی پنڈلیوں پر کثرت سے بال دیکھے۔ چنانچہ آپ نے انسانوں سے پوچھا یہ کیسے دور کیے جا سکتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا استرے سے۔ تو اس پر بلقیس نے کہا لوہے نے کبھی بھی مجھے مس نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرت سلیمان نے بھی استرے کے استعمال کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا یہ تو کاٹ سکتا ہے۔ پھر آپ نے جنات سے پوچھا۔ تو انہوں نے کہا ہم تو نہیں جانتے۔ پھر شیاطین سے پوچھا۔ تو انہوں نے جواب دیا بے شک ہم آپ کو ایسا حیلہ بتاتے ہیں کہ جلد سفید چاندی کی طرح ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے نورہ (بال صفا چونہ) اور حمام بتایا۔ پس اس دن سے نورہ اور حماموں کا استعمال شروع ہوا۔ پس جب سلیمان علیہ السلام نے اس سے شادی کر لی تو آپ نے اس سے انتہائی گہری محبت کا اظہار فرمایا اور اسے اپنے ملک پر حکمران برقرار رکھا اور جنوں کو حکم فرمایا کہ وہ اس کے لیے سرزمین یمن پر تین قلعے تعمیر کر دیں۔ پس انہوں نے ایسے قلعے بنا دیئے کہ لوگوں نے ان کی مثل بلند اور حسین وجمیل قلعے دیکھے تک نہیں تھے۔ ان قلعوں کے نام یہ تھے سلحون، سنون اور عمدان۔ پھر اس کے اپنے ملک واپس لوٹ جانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام ہر مہینے ایک مرتبہ اس کی ملاقات کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور اس کے پاس تین دن تک قیام فرماتے تھے۔ آپ صبح سویرے شام سے یمن کی طرف جاتے تھے اور صبح سویرے ہی یمن سے شام کی طرف واپس لوٹتے تھے۔ اور اس سے آپ کی اولاد بھی ہوئی۔

وہب سے روایت ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بلقیس نے جب اسلام قبول کر لیا تو سلیمان علیہ السلام نے اسے کہا تو اپنی قوم میں سے کسی آدمی کو پسند کر لے، میں اس سے تیری شادی کیے دیتا ہوں۔ اس نے کہا اے نبی اللہ! کیا میری مثل عورت مردوں سے نکاح کرے گی۔ حالانکہ میری اپنی قوم میں ایسے ایسے سردار اور سلطان بھی تھے تو آپ نے فرمایا جی ہاں۔ اسلام میں ایسا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا تجھے نہیں چاہیے کہ تو اپنے لیے اس شئی کو حرام قرار دے جسے اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے حلال کیا ہے۔ تو پھر اس نے کہا اگر یہ ضروری

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 29-128 (وزارت تعلیم)　2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　3۔ تفسیر قرطبی زیر آیت ہذا

ہے تو پھر میری شادی شاہ ہمدان ذی تبع سے کر دیجیے۔ چنانچہ آپ نے اس کا نکاح اس سے کر دیا پھر اسے یمن کی طرف واپس لوٹا دیا اور یمن پر اس کے خاوند ذی تبع کو حکمران بنا دیا۔ اور یمن میں جنات کے امیر زوبعہ کو بلا کر فرمایا کہ ذی تبع تجھ سے جو کام بھی لے اسے ضرور سرانجام دینا۔ چنانچہ اس کی حکومت برقرار رہی اور اس نے جو بھی ارادہ کیا وہ اس کے لیے کام کرتا رہا یہاں تک کہ سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو گیا۔ پس جب ایک سال گزر گیا اور جنات کو آپ کی موت کا یقین ہو گیا تو ان میں سے ایک جن تہامہ کے راستہ سے آیا اور وسط یمن میں پہنچ کر بلند آواز سے چیخ کر کہا اے جنات کے گروہ! بے شک شہنشاہ سلیمان فوت ہو چکے ہیں۔ لہٰذا تم اپنے اپنے کاموں سے ہاتھ اٹھا لو۔ تو انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھا لیے اور بکھر گئے۔ بس اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی بلقیس اور ذی تبع کی حکومتیں بھی ختم ہو گئیں۔ میں کہتا ہوں کہ سلیمان علیہ السلام کا بلقیس کی پنڈلیوں کو دیکھنا ان علماء کے قول کی تائید کرتا ہے جنہوں نے یہ کہا کہ آپ نے اس سے نکاح کیا تھا۔ اور ان کے قول کی تائید نہیں کرتا جنہوں نے کہا کہ آپ نے اس کا نکاح ذی تبع سے کر دیا۔ واللہ اعلم۔ کہا گیا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکومت ملی تو اس وقت آپ کی عمر تیرہ سال تھی اور جب آپ کا وصال ہوا تو آپ کی عمر ترپن برس تھی۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَنْ لَا زَوَالَ لِمُلْكِهٖ۔ شعر

لَا مُلْكَ سُلَيْمَانَ وَلَا بِلْقِيْس   لَا اٰدَمُ فِي الْكَوْنِ وَلَا اِبْلِيْس

نہ سلیمان علیہ السلام کی حکومت رہی نہ بلقیس   (اس) کائنات میں نہ حضرت آدم رہے اور نہ ابلیس

وَ الْكُلُّ فَصُوْرَةٌ وَاَنْتَ الْمَعْنٰى   يَا مَنْ هُوَ لِلْقُلُوْبِ مَقْنَاطِيْسُ۔ واللہ اعلم

اور یہ تمام کائنات تو صورت ہے معنی اور حقیقت تو صرف تو ہے جو دلوں کو مقناطیس کی طرح کھینچ رہا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

"اور بے شک ہم نے رسول بنا کر بھیجا ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی[1]۔ تو وہ دو گروہ بن گئے (اور آپس میں) جھگڑنے لگے[2]"

[1] یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور یہ جملہ اس قول باری تعالیٰ پر معطوف ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اور صالحا کا قول اَخَاهُمْ سے بدل ہے۔ "اَنْ" یا تو اَرْسَلْنَا کے لیے مفسرہ ہے یا یہ مصدریہ ہے اور اس سے پہلے باء مقدر ہے۔ یعنی بِاَنْ ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو رسول بنا کو بھیجا کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی جو وحدہ لاشریک ہے۔

[2] فَاِذَا هُمْ یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر مابعد کلام "فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ" ہے۔ يَخْتَصِمُوْنَ، فَرِيْقٰنِ کے لیے صفت ہے۔ تو اچانک وہ متفرق ہوتے ہوئے اور جھگڑتے ہوئے دو گروہ بن گئے۔ پس ایک فریق ایمان لے آیا اور ایک نے کفر کیا۔ يَخْتَصِمُوْنَ میں واؤ جمع دونوں فریقوں کے مجموعہ کے لیے ہے۔ ان کے جھگڑے کا ذکر سورۂ اعراف میں کیا گیا ہے۔ اس قول میں قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا سے اس قول تک اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ

قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

''صالح نے فرمایا اے میری قوم! کیوں تیزی کرتے ہو برائی کرنے میں نیک کام کرنے سے پہلے تم کیوں نہیں بخشش طلب کرتے اللہ تعالیٰ سے شاید تم پر رحم کر دیا جائے۔[1]''

[1] صالح علیہ السلام نے انہیں کہا۔ اے میری قوم! تم عذاب کیوں جلدی طلب کرتے ہو کہ تم یہ کہہ رہے ہو یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ توبہ سے پہلے، اس طرح کہ تم اسے نزول عذاب تک مؤخر کرتے جا رہے ہو۔ یا استفہام انکار اور توبیخ کے لیے ہے۔ تم عذاب نازل ہونے سے پہلے اپنے کفر سے توبہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے بخشش کیوں نہیں طلب کرتے۔ تاکہ اسے قبول کرتے ہوئے تم پر رحم کیا جائے۔ کیونکہ جب تم عذاب دیکھ لوگے تو پھر توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾

''کہنے لگے ہم تو براشگون سمجھتے ہیں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو[1] آپ نے فرمایا تمہارا براشگون تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے[2] بلکہ تم ایسی قوم ہو جو فتنہ میں مبتلا کر دی گئی ہے[3]''

[1] ہم تمہیں منحوس گمان کرتے ہیں کیونکہ اس وقت سے ہمارے درمیان افتراق پیدا ہوا ہے جب سے تم نے نیا دین ایجاد کیا ہے۔ ہم پر مسلسل مصیبتیں آ رہی ہیں اور بارش کو ہم سے روک دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ تمام نقصانات اور تکلیفیں تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی نحوست کے سبب ہیں۔

[2] یعنی تمہاری نحوست کا سبب جس کی وجہ سے شر اور تکلیف آئی وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ یا تمہارے وہ اعمال ہیں جو اس کے پاس لکھے ہوئے ہیں۔ قضاء کو طائر اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ انسان پر بہت تیزی سے نازل ہوتی ہے۔ کیونکہ قضاء قطعی سے زیادہ تیز اور کوئی چیز نہیں۔ یہاں عمل کو تیزی سے آسمان کی طرف چڑھنے کے سبب طائر کا نام دیا گیا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے کہا طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ کا معنی ہے تمہارے کفر کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے تم پر نحوست آئی ہے(1)۔ اور کہا گیا ہے شوم (نحوست) کو طائر اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اہل جاہلیت پرندے کی آواز اور اس کے اس مخصوص انداز پر گزرنے سے جو ان کے نزدیک معروف تھا بدشگونی خیال کرتے تھے جب کہ وہ سفر پر جاتے تھے۔ اسی عرف کی بناء پر لفظ طائر نحوست اور بدشگونی کے لیے استعارۃً استعمال ہوتا ہے۔

[3] یہ سابقہ کلام کے مفہوم سے اضراب ہے۔ یعنی تمہارا براشگون میری اور میرے ساتھیوں کی جانب سے نہیں بلکہ تمہیں تو اپنے کفر کے سبب اس طرح عذاب دیا جا رہا ہے۔ محمد بن کعب نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تم خیر اور شر کے ساتھ آزمائے جا رہے ہو۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً(2)

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾

''اور اس شہر میں نو شخص تھے جو فتنہ و فساد برپا کیا کرتے تھے اس علاقہ میں[1] اور اصلاح کی کوشش نہ کرتے[2]''

[1] یعنی ثمود کے شہر میں نو آدمیوں کا گروہ تھا اور وہ شہر حجر تھا۔ اس میں رَهْطٌ معنی کے اعتبار سے تِسْعَةٌ کی تمییز ہے۔ کیونکہ اس کا معنی ہے ایسی جماعت جس میں تین یا سات سے لے کر دس تک افراد ہوں جیسا کہ نفر تین سے لے کر نو تک کی جماعت ہوتی ہے۔ اور ''يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ'' كَانَ کی خبر ہے اور اس کا اسم تِسْعَةُ رَهْطٍ ہے۔ اور فِي الْمَدِيْنَةِ اسے حال ہے یا ظرف ہے۔

۲؎ یعنی ان کی شان یہ تھی کہ وہ ایسا فتنہ وفساد برپا کرتے جس میں ذرا بھر بھی اصلاح کی آمیزش نہ ہوتی۔ اور یہ ان کے ان سرداروں کے بیٹے تھے جنہوں نے ناقہ کی کونچیں کاٹنے پر اتفاق کیا تھا اور وہ صالح علیہ السلام کی قوم کے گمراہ اور بدبخت لوگ تھے۔ اور ان میں سب سے زیادہ شقی قزار بن سالف تھا جس نے اونٹنی کی کونچوں کو کاٹ ڈالا تھا۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَیِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

"انہوں نے کہا آؤ اللہ کی قسم کھا کر عہد کر لیں کہ شب خون مار کر صالح اور اس کے اہل خانہ کو ہلاک کر دیں گے ۱؎ پھر کہہ دیں گے اس کے وارث سے کہ ہم تو (سرے سے) موجود ہی نہ تھے ۲؎ جب انہیں ہلاک کیا گیا ۳؎ اور (یقین کرو) ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں ۴؎"

۱؎ یہ جملہ مستانفہ ہے یا حال ہے اور اس سے پہلے قَدْ مقدر ہے۔ یعنی ان میں سے بعض نے بعض کو کہا۔ تم اللہ کی قسم کھاؤ اس میں تَقَاسَمُوْا امر قَالُوْا کا مقولہ ہے۔ یا پھر تَقَاسَمُوْا فعل ماضی ہے اور قَالُوْا سے بدل واقع ہو رہا ہے۔ یا پھر قَالُوْا کے فاعل سے حال ہے۔ اور اس سے پہلے قَدْ مضمر ہے۔ کہ ہم صالح (علیہ السلام) کو رات کے وقت ضرور قتل کر دیں گے اور ان کی اس قوم کو جو ان پر ایمان لائی۔

۲؎ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ کو اعمش، حمزہ اور کسائی نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ لَنُبَیِّتَنَّهٗ لَنَقُوْلَنَّ یہ ان کے درمیان خطاب کی وجہ سے ہے۔ پہلے صیغہ میں دوسری تاء مفہوم ہے اور دوسرے صیغہ میں لام مضموم ہے تاکہ یہ واحد جمع محذوفہ پر دلالت کر لے۔ اور بقیہ قراء نے نون متکلم اور تاء اور لام کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ پھر ان کے خون کے وارث کو کہہ دیں گے۔ ہم تو حاضر نہیں تھے جب انہیں ہلاک کیا گیا۔

۳؎ مَهْلِكَ اَهْلِهٖ میں جمہور نے میم کو مضموم اور لام کو مفتوح پڑھا ہے اور یہ اِهْلَاكٌ سے ماخوذ ہے۔ یہ مصدر، ظرف زمان اور ظرف مکان ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ اور حفص کی قرأت کے مطابق میم مفتوح اور لام مکسور ہے۔ اور یہ هِلَاكٌ سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ مَفْعِلٌ کے وزن پر کبھی مصدر ہوتا ہے جیسے مَرْجِعٌ اور ابوبکر نے تو لام کو مفتوح پڑھا ہے اور اس صورت میں یہ مصدر ہی ہوگا۔

۴؎ اور ہم قسم اٹھا دیں گے کہ ہم سچ کہہ رہے ہیں۔ یا حال یہ ہے کہ جو کچھ ذکر ہوا ہے ہم اس میں سچ بول رہے ہیں کیونکہ کسی شے کا شاہد عرفاً اسے کرنے والا نہیں ہوتا۔ یا مطلب یہ ہے کہ ہم صرف آپ کے ساتھیوں کے ہلاک ہونے کی جگہ یا وقت حاضر نہ تھے بلکہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کی ہلاکت کے وقت بھی وہاں حاضر نہ تھے۔ یہ اس قول کی طرح ہے مَا رَاَیْتُ رَجُلًا بَلْ رَجُلَیْنِ (میں نے صرف ایک آدمی کو نہیں دیکھا بلکہ دونوں کو نہیں دیکھا۔)

وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

"اور انہوں نے بھی خفیہ سازش کی اور ہم نے بھی خفیہ تدبیر کی اور وہ سمجھ ہی نہ سکے (ہماری تدبیر کو) ۱؎"

۱؎ یعنی انہوں نے سخت دھوکہ کیا اس طرح کہ انہوں نے رات کے وقت حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ اور ہم نے بھی سخت خفیہ تدبیر کی اس طرح کہ اسے ہی ان کو ہلاک کرنے کا سبب بنا دیا۔ درآنحالیکہ وہ ہماری تدبیر کو سمجھ ہی نہ سکے۔ ترکیب کلام

میں یہ جملہ مَكْرُنَا کے فاعل سے حال ہے۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ أَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِيْنَ ﴿٥١﴾

”تم (خود ہی) دیکھ لو کیا (ہولناک) انجام ہوا ان کے مکر کا۔ لے ہم نے برباد کر کے رکھ دیا انہیں اور ان کی ساری قوم کو۔ ۲ے“

لے اس میں عَاقِبَةُ كَانَ کا اسم ہے اور كَيْفَ اس کی خبر ہے۔ اور اس کے لیے صدر کلام لازمی ہونے کی وجہ سے اسے مقدم کیا ہے۔ اور یہ استفہام تعجب کے لیے ہے۔ اور پھر مکمل جملہ استفہامیہ بتاویل مفرد ہو کر اُنظر کا مفعول ہے۔

۲ے أَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ میں اہل کوفہ اور یعقوب نے اَنَّا کے ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے اس لیے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یا پھر یہ كَانَ کے اسم سے بدل ہے یا یہ كَانَ کی خبر ہے اور كَيْفَ حال ہے۔ یا تقدیر کلام یہ ہے لِاَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ۔ باقی قراء نے جملہ مستانفہ ہونے کی بناء پر ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے۔ اس بناء پر اگر كَانَ ناقصہ ہے تو اس کی خبر كَيْفَ ہے۔ اور اگر كَانَ تامہ ہے تو كَيْفَ حال ہے۔ اور اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ کو ضمیر عائد نہ ہونے کی وجہ سے كَانَ کی خبر بنانا جائز نہیں۔ انہیں ہلاک کرنے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس رات ملائکہ کو حضرت صالح علیہ السلام کے گھر کی طرف بھیجا تا کہ وہ آپ کی حفاظت کریں۔ چنانچہ جب وہ آدمی اپنی تلواریں سونتے ہوئے آپ کے گھر کی طرف آئے تو فرشتوں نے ان پر اس طرح پتھر برسائے کہ وہ پتھر تو دیکھتے تھے لیکن ملائکہ کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لہٰذا اس طرح وہ تمام کے تمام قتل ہو گئے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ حضرت صالح علیہ السلام کے گھر کی طرف جانے کے لیے دامن کوہ میں بیٹھے اپنے بعض ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے کہ اتنے میں ان پر پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑا۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا (1)۔ عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے۔ کہ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ تدبیر فرمائی کہ ان پر ایک چٹان پھینکی جس نے ان تمام کو تباہ کر دیا (2) کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام قوم کو ایک جھٹکے کے سبب ہلاک کر دیا۔

فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ۗ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٥٢﴾

”پس یہ ان کے گھر ہیں جو اجڑے پڑے ہیں ان کے ظلم کے باعث۔ لے بے شک اس میں عبرت ہے اس قوم کے لیے جو (کچھ) جانتی ہے ۲ے“

لے یہ ان کے گھر ہیں جو خالی پڑے ہیں خَاوِيَةً خوی البطن سے ماخوذ ہے۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب پیٹ خالی ہو جائے۔ یا معنی ہے یہ ان کے گھر ہیں جو گر چکے ہیں اور منہدم ہو چکے ہیں۔ اس صورت میں یہ خوی النجم سے ماخوذ ہے۔ یہ تب بولا جاتا ہے جب ستارہ گر جائے۔ ترکیب کلام میں خاویۃ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور اس میں عامل معنی اشارۃ ہے۔

۲ے یعنی یہ گھر ان کے کفر اور ظلم کے سبب اجڑے پڑے ہیں۔ اور جو کچھ ثمودیوں کے ساتھ کیا گیا ہے اس میں ہماری کمال قدرت اور انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر واضح نشانی ہے۔ پس چاہیے کہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

وَأَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٣﴾

”اور ہم نے بچا لیا انہیں جو ایمان لائے تھے اور (اپنے رب سے) ڈرتے رہتے تھے لے“

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا 2۔ الدر المنثور، زیر آیت ہذا

۱؎ اور ہم نے بچالیا انہیں جو ایمان لائے تھے اور کفر اور گناہوں سے بچتے رہتے تھے۔ اور وہ لوگ حضرت صالح علیہ السلام اور آپ کے ساتھی تھے ان کی تعداد چار ہزار تھی۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾

''اور یاد کرو لوط علیہ السلام ۱؎ کو جب آپ نے اپنی قوم کو فرمایا ۲؎ کیا تم ارتکاب کرتے ہو بے حیائی کا ۳؎ حالانکہ تم دیکھ رہے ہوتے ہو ۴؎''

۱؎ یہ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے۔ جس پر یہ قول دلالت کرتا ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی ثَمُوْدَ۔ تقدیر کلام ہے وَاَرْسَلْنَا لُوْطًا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اُذْکُرْ فعل محذوف کے سبب منصوب ہو۔

۲؎ یہ فعل مقدر کی ظرف ہے جو کہ اُذْکُرْ ہے۔ یا یہ اَرْسَلْنَا کے متعلق ہے۔ اس بناء پر کہ یہ لُوْطًا میں عامل ہو۔ یا یہ لوط سے بدل ہو اس بناء پر کہ یہ فعل محذوف اُذْکُرْ کے سبب منصوب ہے۔

۳؎ الْفَاحِشَةَ سے مراد ایسا فعل ہے جو انتہائی قبیح اور برا ہو۔ یہ استفہام انکار اور توبیخ کے لیے ہے۔ اسی طرح دوسرا استفہام بھی اسی معنی کے لیے ہے۔

۴؎ حالانکہ تم اس فعل کی برائی کو جانتے ہو۔ ایسا آدمی جو قبائح کا ارتکاب کرتا ہے اس کے باوجود کہ وہ ان کی قبح کو جانتا ہو تو ایسا کرنا اور زیادہ قبیح ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے تم میں سے بعض بعض کو دکھا کر یہ عمل کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ اس برائی کا ارتکاب اعلانیہ کرتے تھے۔ اور لوگوں کی موجودگی میں ایسا کرتے رہتے تھے۔ تو اس طرح یہ عمل اور زیادہ فحش ترین تھا۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ تم برائی کا ارتکاب کرتے ہو حالانکہ تم سابقہ قوموں کے گنہگاروں کے حالات اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کے آثار کو دیکھ رہے ہو۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

''کیا تم جاتے ہو مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے (اپنی) بیویوں کو چھوڑ کر ۱؎ بلکہ تم تو بڑے نادان لوگ ہو ۲؎''

۱؎ کیا تم مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے جاتے ہو اپنی بیویوں کو چھوڑ کر جنہیں اسی لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تو یہ ان کے برائی کا ارتکاب کرنے کے عمل کی وضاحت ہے۔ اس میں شَهْوَةً مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ کیونکہ یہ عمل کے قبح پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہاں یہ تنبیہ بھی ہے کہ عمل جماع کی حکمت اور مقصد طلب نسل ہے فقط شہوت کو پورا کرنا اس کا مقصود نہیں۔

۲؎ تم تو ایسے لوگوں کی طرح یہ فعل کرتے ہو جو اس کی برائی اور قبح سے ناواقف اور جاہل ہوتے ہیں۔ یا معنی ہے کہ تم تو ایسی احمق قوم ہو کہ حسن و قبح کے درمیان تمیز ہی نہیں کرتے۔ یا معنی ہے کہ تم اس کے انجام سے ناواقف ہو۔ تَجْهَلُوْنَ کے صیغہ میں تاء خطاب کی ہے یعنی جو اس وصف سے متصف ہیں وہ مخاطب کے معنی میں ہیں۔ کہا گیا ہے کہ یہاں اَنْتُمْ کے قول کے ساتھ خطاب اور قَوْمٌ کے قول کے ساتھ غائب دونوں جمع ہیں۔ لہٰذا پھر خطاب کو غیب پر ترجیح دی گئی ہے۔ یہ آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ افعال کا حسن و قبح شریعت کے ورود سے قبل فی نفسہ ان کی ذاتوں میں ثابت ہے اگرچہ ان میں سے بعض کی پہچان شریعت پر بھی موقوف ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ

اُنَاسٌ یَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾

"پس نہیں تھا آپ کی قوم کا جواب بجز اس کے کہ انہوں نے کہا نکال دو آل لوط کو اپنی بستی سے، یہ لوگ تو بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں ۱؎"

۱؎ پس آپ کی قوم کا جواب یہ تھا کہ آل لوط کو اپنی بستی سے نکال دو وہ بڑے پاک بنے پھرتے ہیں ہمارے افعال سے یا گندگی سے۔ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ کا جملہ انہیں نکالنے کی علت کو بیان کرنے کے محل میں ہے۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ٘ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِیْنَ ﴿۵۷﴾

"سو ہم نے بچالیا لوط علیہ السلام کو اور ان کے اہل خانہ کو سوائے ان کی بیوی کے، ہم نے فیصلہ کر دیا اس کے متعلق کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں ہوگی ۱؎"

۱؎ سو ہم نے لوط اور ان کے اہل خانہ کو بچالیا اور ہم نے آپ کی بیوی کے بارے فیصلہ کر دیا کہ وہ عذاب میں مبتلا ہونے والوں میں باقی رہے گی۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ ﴿۵۸﴾

"اور ہم نے ان پر خوب پتھر برسائے پس تباہ کن پتھراؤ تھا (بارہا) ڈرائے جانے والوں پر"

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾

"فرمایئے سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور سلام اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے چن لیا ہے ۱؎ (بتاؤ) کیا اللہ بہتر ہے یا جنہیں وہ شریک بناتے ہیں ۲؎"

۱؎ اللہ تعالیٰ نے وہ قصص بیان کرنے کے بعد جو اس کی کمال قدرت اور عظمت شان پر دلالت کرتے ہیں اور ان معجزات اور اعزازات کے بیان کے بعد جو اس نے اپنے رسولوں کو عطا فرمائے۔ حضور نبی رحمت ﷺ کو حکم فرمایا کہ کفار کو ہلاک کرنے پر، ان تمام نعمتوں پر جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائیں اور ان احوال سے آگاہ کرنے پر جنہیں آپ نہیں جانتے تھے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ان بندوں پر سلام بھیجیں جن کی فضیلت، حق تقدم اور دین کے معاملے میں ان کی مساعی اور کاوش کا اعتراف کرتے ہوئے اس نے انہیں چن لیا۔ قول باری تعالیٰ الَّذِیْنَ اصْطَفٰى کے بارے مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد انبیاء اور مرسلین ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۸۱﴾ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ان سے مراد حضور نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ یہ امام مالکؒ کی روایت میں ہے(1)۔ حضرت سفیان ثوریؒ سے مروی ہے کہ یہ آیت حضور نبی کریم ﷺ کے اصحاب کے بارے نازل ہوئی ہے(2)۔ کلبیؒ نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی امت ہے(3)۔ اور اس کی دلیل یہ قول باری تعالیٰ ہے ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ الایہ یہ قول بھی ہے کہ ان سے مراد سابقین ولاحقین تمام مؤمنین ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ کی تکمیل ہے اور قول مقدر کے ساتھ یہ خطاب

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

حضرت لوط علیہ السلام کو ہے۔ یعنی قُلْنَا لَهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الخ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا کہ وہ اپنی قوم کے کفار کے ہلاک ہونے پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کریں اور ان لوگوں کو سلام بھیجیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فواحش سے بچنے اور ہلاکت وتباہی سے نجات پانے کے سبب منتخب کرلیا۔ یا محمد ﷺ اور آپ کی امت پر سلام بھیجو کیونکہ سابقہ تمام انبیاء اور ان کی امتوں کو جو اعزازات عطا ہوئے اور جن آزمائشوں اور تکالیف سے وہ محفوظ رہے۔ یہ سب آپ ﷺ کے نور کی برکت سے تھا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کُنْتُ اَوَّلَ النَّاسِ فِي الْخَلْقِ وَاٰخِرَهُمْ فِي الْبَعْثِ(1) (میں خلق میں تمام لوگوں سے اول ہوں اور مبعوث ہونے میں تمام انبیاء سے آخر ہوں) اسے ابوسعد نے حضرت قتادہؓ سے مرسل روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: کُنْتُ نَبِيًّا وَاٰدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ (2) (میں (اس وقت) نبی تھا درآنحالیکہ آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے مابین تھے)۔ اسے ابن سعد نے صحیح سند کے ساتھ میسرہ بن سعد عن ابی الجدعاء سے روایت کیا ہے۔ اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔

ؔ اس کا تعلق ابتدائے سورت کی اس آیت سے ہے اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ الی قوله هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ اس میں درحقیقت انہیں الزام دینے، ان کی نادانی اور ان کی رائے کی حماقت کا اظہار ہے۔ ان واقعات اور قصص کے بیان کرنے کے بعد جو اللہ تعالیٰ کے اپنے صالحین بندوں کو اعزاز واکرام سے نوازنے پر کامل قدرت رکھنے پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کو تباہ وبرباد کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ یعنی وہ اپنی اس شان کے سبب اس کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، اس سے خوف کھایا جائے اور اسی سے اپنی امیدیں وابستہ کی جائیں وہ اپنے سوا ہر شے سے بہتر ہے۔ کیا وہ بت وغیرہ جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے ہیں، جو نفع اور نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے بلکہ ان کا نقصان وضرر نفع کی نسبت زیادہ قریب ہے، اس اللہ تعالیٰ سے بہتر ہوسکتے ہیں جو قادر بھی ہے اور غالب بھی اور قابل عبادت بھی ہے۔ ابوعمرو، عاصم اور یعقوب نے يُشْرِكُوْنَ یاء کے ساتھ صیغہ غائب پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے اہل مکہ کو خطاب ہونے کی بناء پر تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ؕ﴿۶۰﴾

”بھلا وہ کون ہے جس نے بنایا آسمانوں کو اور زمین کو ؔ اور جس نے اتارا تمہارے لیے آسمان سے پانی۔ پھر ہم نے اگائے اس پانی سے خوش منظر باغات ؔ تمہاری طاقت نہ تھی کہ تم اگا سکتے ان کے درخت ؔ کیا کوئی دوسرا خدا ہے اللہ کے ساتھ ؔ؟ بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو راہ راست سے پرے ہٹ رہے ہیں ؔ“

ؔ یہ اَمْ متصلہ ہے اور جس پر یہ معطوف ہے۔ وہ معطوف علیہ محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ءَ اٰلِهَتُكُمُ الَّتِيْ لَمْ يَخْلُقُوْا شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُوْنَ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ خَلَقَ۔ یعنی کیا تمہارے وہ الہ جنہوں نے کسی شے کو پیدا نہیں کیا حالانکہ وہ خود بنائے گئے ہیں وہ بہتر ہیں یا وہ جس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ ام منقطعہ ہے اور بَلْ کے معنی میں ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ ہمزہ سابقہ استفہام سے اضراب (اعراض) کے لیے ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر خیر کے لیے مبدا ہونا بدیہی ہے۔ اور ان میں قطعاً خیر موجود نہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ہے۔ پس ان کے درمیان موازنہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ اور اس کے بارے سوال کیسے ممکن ہے۔

1۔ کنز العمال، جلد 11 صفحہ 409 (التراث الاسلامی)　　2۔ الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 7 صفحہ 60 (صادر)

یہاں ہمزہ استفہام تقریر کے لیے ہے۔ یعنی مخاطب کو اس اقرار پر برانگیختہ کرنے کے لیے کہ بہتر اور افضل وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ اور وانزل لکم میں لام انتفاع کے لیے ہے۔

۲ حَدَائِقَ حدیقہ کی جمع ہے۔ فرآء نے کہا ہے حدیقہ سے مراد وہ باغ ہے جس کے اردگرد دیوار بنائی جائے۔ لہٰذا اگر اس کے اردگرد دیوار نہ ہو تو وہ حدیقہ نہیں ہوگا (1)۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ احداق سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے احاطہ کرنا۔ اور "ذَاتَ بَهْجَةٍ" اس سے مراد ایسا حسین منظر ہے جس سے خوشی اور مسرت ہوتی ہے۔ ترکیب کلام میں یہ حدائق کی صفت ہے۔ بھجۃ مفرد اس لیے ہے کہ حدائق مجموعہ حدائق کی تاویل میں ہے (یعنی باغات میں سے ہر باغ پررونق اور باعث فرحت ومسرت ہے)۔ اس کلام میں غیب سے متکلم کی طرف التفات کیا گیا ہے ایک تو اس تاکید کے لیے کہ یہ فعل اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ اور دوسرا اس پر متنبہ کرنے کے لیے ہے کہ ایک ہی قسم کے مواد سے مختلف الانواع اور متباعد الطبائع پررونق اور دلآویز باغات پیدا کرنے پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور قدرت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ اس نے اپنے اس قول کے ساتھ تصریح فرمائی۔

۳ کہ تمہارے لیے ممکن نہیں کہ ان کے درختوں میں سے کوئی درخت اگاؤ۔ شَجَرَهَا میں اضافت جنس کے لیے ہے۔ اور مَا كَانَ لَكُمْ الخ کا جملہ حَدَائِقَ کی صفت ہے۔

۴ کیا کوئی اور الٰہ ہے اللہ کے ساتھ؟ جو اس پر اس کی معاونت کرے۔ یہ استفہام انکار کے لیے ہے یعنی کوئی ایک نہیں جو اس پر اس کی معاونت کرے۔ اور اس کے سوا کوئی دوسرا اس کے ساتھ عبادت کا مستحق نہیں کیونکہ وہ پیدا کرنے میں منفرد ہے۔

۵ بلکہ کفار مکہ وہ لوگ ہیں جو انہیں جو کچھ بھی پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں جو سب کچھ پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو حق سے پرے ہٹ رہے ہیں یعنی توحید سے۔ اس کلام میں خطاب سے غیب کی طرف التفات ہے۔

أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَارًا وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۗ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦١﴾

"بھلا کس نے بنایا ہے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور جاری کر دیں اس کے درمیان نہریں ۱ اور بنا دیئے زمین کے لیے (پہاڑوں کے) لنگر اور بنادی دو سمندروں کے درمیان آڑ ۲ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ؟ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ بے علم ہیں ۳"

۱ یہ کلام اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ الخ سے بدل ہے۔ اس مقام پر اور اس کے مابعد مقام پر آنے والے اَمْ کے بارے بحث ویسے ہی ہے جیسے پہلے گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔ اس کے بعض حصہ کو پانی سے ظاہر کیا اور اسے ممکنہ طریقے سے ہموار کر دیا۔ اور اس کے درمیان جاری نہریں بنائیں۔ ترکیب کلام میں یہ ظرف مستقر ہے اور جعل کے دوسرے مفعول کی جگہ واقع ہے۔ بعد میں آنے والے دو جملوں میں بھی اسی طرح ہے۔

۲ اور زمین کے لیے ایسے ثابت رہنے والے پہاڑ بنائے جو زمین کو حرکت سے روکتے ہیں۔ اور پھر ان پہاڑوں سے دریا نکال دیئے۔

اور میٹھے اور نمکین دوسمندروں کے درمیان آڑ بنادی۔ جوان کے باہم ملنے سے مانع ہے۔

۳؎ ایسا نہیں بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں۔ اور نہ ہی وہ قطعی دلائل ہونے کے باوجود صحیح غور وفکر کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی جہالت کے سبب دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور بعض یہ جانتے تو ہیں لیکن وہ اپنی نخوت اور عناد کی وجہ سے اس کا انکار کر دیتے ہیں۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾

"بھلا کون قبول کرتا ہے ایک بے قرار کی فریاد جب وہ اسے پکارتا ہے اور (کون) دور کرتا ہے تکلیف کو۱؎ اور (کس) نے بنایا تمہیں (اگلوں) کا خلیفہ ۲؎ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ؟ ۳؎ تم بہت کم غور وفکر کرتے ہو ۴؎"

۱؎ اَلْمُضْطَرَّ یہ اسم فاعل ہے اور اضطرار سے ماخوذ ہے۔ اور یہ الضر سے باب افتعال ہے یعنی جو کسی ضرر اور تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی شدت اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے ساتھ اس کی فریاد کو قبول کرتا ہے۔ جب وہ اسے پکارتا ہے اگر وہ چاہے۔ کیونکہ المضطر پر لام جنس کے لیے ہے استغراق کے لیے نہیں۔ لہٰذا اس سے ہر بے قرار کی فریاد کو قبول کرنا لازم نہیں آتا۔ اور وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے جس نے اسے پکارنے پر مجبور کیا۔

۲؎ اس کا عطف یُجِیْبُ پر ہے۔ اور کس نے تمہیں ان کا خلیفہ بنایا ہے۔ جو زمین میں تم سے پہلے تھے اس طرح کہ اس نے تمہیں ان کی رہائش گاہوں اور ان میں تصرف کرنے کا وارث بنادیا۔ یا اس نے تمہیں ان کی سلطنتوں کا وارث بنا دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کون ہے وہ جس نے تمہیں زمین میں جنوں کا خلیفہ بنا دیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اس کا معنی ہو۔ کون ہے وہ جس نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کا خلیفہ بنادیا۔ اور اس کی دلیل یہ قول باری تعالیٰ ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔

۳؎ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے جس نے تمہیں ان خاص اور عام نعمتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے؟ یعنی ایسا نہیں۔ مگر اللہ وہ ہے جو ان تمام نعمتوں کے ساتھ پیدا فرماتا ہے۔

۴؎ قَلِیْلًا مَا میں مَا زائدہ ہے اور قلیلاً یَتَذَكَّرُوْنَ کے سبب مصدریت یا ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے۔ (یعنی یا مفعول مطلق ہے مصدر محذوف کی صفت ہونے کی بناء پر یا پھر مفعول فیہ ہے)۔ یہاں قِلَّة سے مراد عدم (بالکل نہ ہونا) ہے۔ یعنی تم بالکل ہی غور وفکر نہیں کرتے۔ یا اس قِلَّت سے مراد ایسی حقارت ہے جو فائدے کو ختم کر دیتی ہے۔ یہاں ابوعمرو اور ہشام نے یَذَّكَّرُوْنَ صیغہ غائب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تاء یعنی صیغہ خطاب کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ، کسائی اور حفص نے ذال کو مخفف اور باقیوں نے اسے مشدد پڑھا ہے۔

اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾

"بھلا کون راہ دکھاتا تمہیں بر و بحر کے اندھیروں میں اور کون بھیجتا ہے ہواؤں کو خوشخبری دینے کے لیے اپنی (باران)

رحمت سے پہلے ۱؎ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ؟ برتر ہے اللہ تعالیٰ ان سے جنہیں وہ شریک بناتے ہیں ۲؎۔''

۱؎ بھلا کون تمہیں راہ دکھاتا ہے ستاروں اور زمین کی علامات کے ساتھ بر و بحر کی تاریکیوں میں جبکہ تم راتوں کے وقت سفر کرتے ہو۔ بحر و بر کی طرف ظلمات کی اضافت ملابست کے لیے ہے۔ اور اپنی باران رحمت سے پہلے کون ہواؤں کو خوشخبری دینے کے لیے بھیجتا ہے؟

۲؎ کیا کوئی اور خدا ہے جو اس کی مثل قدرت رکھتا ہو۔ برتر ہے وہ اللہ جو قادر بھی ہے اور خالق بھی ان سے جنہیں وہ عاجز مخلوق میں سے شریک بناتے ہیں۔

أَمَّنْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٦٤﴾

'' بھلا کون ہے جو آغاز کرتا ہے آفرینش کا پھر دوبارہ پیدا کرے گا اسے اور کون ہے جو رزق دیتا ہے تمہیں آسمان سے اور زمین سے ۱؎ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ؟ فرمائیے (اے مشرکو!) پیش کرو اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو ۲؎۔''

۱؎ بھلا کون ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے پھر مارنے کے بعد دوبارہ پیدا کرے گا۔ کفار نے اگرچہ دوبارہ پیدا کیے جانے کا انکار کیا ہے لیکن ان کے خلاف ایسے نقلی دلائل قائم کیے گئے ہیں جو اعادہ پر دلالت کرتے ہیں اور ان کی صداقت وحقانیت پر معجزات کے ذریعے شہادت دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عقلاً بھی اعادہ ممکنات میں سے ہے۔ اور کون ہے جو تمہیں اسباب سماویہ اور اسباب ارضیہ سے رزق دیتا ہے۔

۲؎ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو اس پر قدرت رکھتا ہو۔ فرمائیے (اے مشرکو!) اس پر اپنی کوئی دلیل پیش کرو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا ہے جو ان چیزوں پر قدرت رکھتا ہے۔ اگر تم شریک ٹھہرانے میں سچے ہو۔ کیونکہ کمال قدرت الوہیت کے لوازمات میں سے ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ جب مشرکین نے حضور نبی رحمت ﷺ سے قیامت قائم ہونے کے وقت کے بارے میں سوال کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿٦٥﴾

'' آپ فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے ۱؎ اور وہ (یہ بھی) نہیں سمجھتے کہ انہیں کب اٹھایا جائے گا ۲؎۔''

۱؎ اے محمد ﷺ ان کے جواب میں فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو ملائکہ آسمانوں میں ہیں اور جو جن وانس زمین میں ہیں۔ اور ان میں سے انبیاء علیہم السلام بھی ہیں۔ اس میں مَنْ موصولہ ہے یا موصوفہ۔ وہ شے جو ان کے حواس سے غائب ہو اور اس پر کوئی عقلی دلیل قائم نہ ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے جو ان سے غائب ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا مگر اللہ تعالیٰ کے بتانے اور مطلع کرنے کے ساتھ۔ یہ استثناء منقطع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ زمین وآسمان میں استقرار سے منزہ اور مبرہ ہے (لہٰذا یہ مستثنیٰ منہ میں داخل نہیں ہوگا) اور لفظ اللہ کا رفع بنی تمیم کی لغت کے مطابق ہے، ان کے نزدیک نصب دینا بھی جائز ہے۔ اور مستثنیٰ منقطع میں بدل ایسے ہی ہوتا

ہے جیسے مستثنیٰ متصل میں۔اس پر بطور دلیل شاعر کا یہ شعر ہے۔

وَبَلْدَةٍ لَيْسَ بِهَا اَنِيْسٌ إِلَّا الْيَعَافِيْرُ وَاِلَّا الْعِيْسُ

یہ شہر ہے جہاں کوئی صدیق غم خوار نہیں سوائے گدھوں اور بھورے اونٹوں کے

بعض نے کہا ہے کہ یہ استثناء متصل ہے اور محال فرض کرنے کے طریقے پر مستثنیٰ مستثنیٰ منہ میں داخل ہے۔اور محال کو فرض کرنا محال نہیں ہوتا۔اور البحر المواج میں ہے کہ مستثنیٰ منہ محذوف ہے اور کلام میں حذف ہے۔تقدیر عبارت یہ ہے لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ لَا يَعْلَمُهُ اَحَدٌ اِلَّا اللّٰهُ۔پس یہ جملہ نفی علم کی علت بیان کرتا ہے۔میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ بِشَيْءٍ اِلَّا بِاللّٰهِ اى بِتَعْلِيْمِهٖ (زمین وآسمان میں رہنے والا کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے مطلع کیے بغیر غیب میں سے کوئی شے نہیں جانتا)

۲؎ وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ انہیں کب اٹھایا جائے گا یعنی انہیں اٹھائے جانے کا وقت ان چیزوں میں سے ہے جن کا ادراک حواس کے ذریعے نہیں کیا جاسکتا۔لہٰذا یہ ایسا غیب ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ کے بتلائے بغیر جاننا اور اس پر اطلاع پانا ممکن نہیں۔اور اللہ تعالیٰ نے اس پر کسی کو بھی مطلع نہیں کیا۔بلکہ اس نے اس کے علم کو اپنے لیے خاص کیا ہے۔لہٰذا اس کے بارے میں ان کے جاننے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔یہ کلام تخصیص بعد التعمیم کے قبیلے سے ہے اور یہ تاکید کا فائدہ دے رہی ہے۔اور دوسرا جواب کو سوال کے مطابق بنانے اور تخصیص کے احتمال کے یقینی ہونے کا فائدہ دے رہی ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ۔یہ قول ان کے علم غیب کی نفی کا فائدہ دیتا ہے اور ان چیزوں کا علم جو انہیں رسولوں کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ کے بتانے سے حاصل ہوا وہ اس سے مخصوص ہے۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

''بلکہ گم ہو گیا ۱؎ ان کا علم آخرت کے متعلق ۲؎ بلکہ وہ تو اس کے بارے میں شک میں ہیں ۳؎ بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں ۴؎''

۱؎ ابوجعفر، ابن کثیر اور ابوعمرو نے اِدّٰرَكَ کو باب افعال سے اَكْرَمَ کے وزن پر ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ عِلْمُهُمْ ادراک کا فاعل ہے اور فِي الْاٰخِرَةِ اَدْرَكَ کی ظرف ہے۔اور مفعول محذوف ہے۔اور اس پر سابقہ کلام دلالت کرتی ہے۔معنی یہ ہے کہ بے شک وہ دنیا میں قیامت قائم ہونے کے وقت کا بالکل ادراک نہیں کر سکتے بلکہ ان کا علم آخرت میں اس تک پہنچے گا جب وہ اسے آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔یا پھر معنی یہ ہے بلکہ آج (دنیا میں) آخرت کے بارے رسول اللہ ﷺ کے انہیں بتانے کے ساتھ ان کا علم اس کا ادراک کر سکتا ہے کہ بے شک قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں لیکن وہ اس کے آنے کا وقت نہیں جانتے۔باقی قراء نے اسے بل ادرك پڑھا ہے۔اس کی اصل تدارك ہے۔یعنی ان کا علم کامل ہو گیا اور پختہ ہو گیا اور انہیں یہ آخرت کے احوال کے بارے رسول اللہ ﷺ کے مطلع کرنے سے حاصل ہوا یا ان کو اس کا علم حاصل ہو گا جب وہ اس کا آنکھوں سے معائنہ کریں گے۔جیسا کہ کہا جاتا ہے تدارك الفاكهة یہ تب کہا جاتا ہے جب پھل مکمل طور پر پک جائے۔مؤمنین کے لیے دنیا میں علم قطعی کا حصول بالکل ظاہر ہے۔اور کافروں کے لیے اس اعتبار سے ہے کہ قطعیت کو ثابت کرنے والی ادلہ اس علم کے قائم مقام ہیں۔

سے یعنی کفار مکہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے ایسی اخبار پائے جانے کے باوجود جوقطعیت کو ثابت کرتی ہیں قیامت قائم ہونے کے بارے میں شک کرتے ہیں حالانکہ آپ کی تائید معجزات سے کی گئی ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ بَلِ ادّٰرَکَ استفہام کے طریقہ پر ہے۔اس کا معنی ہے کیا آخرت کے بارے میں ان کا علم مکمل اور مضبوط ہوگیا ہے؟ یعنی وہ مکمل نہیں ہوا اور آخرت کے بارے میں ان کا علم گم اور غائب ہوگیا ہے۔ پس نہ وہ اس تک پہنچے ہیں اور نہ انہیں اس کا ادراک ہوا ہے۔ کیونکہ استفہام میں انکار کی ایک قسم بیان کی گئی ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت اس تاویل پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے اسے بَلٰی پڑھا ہے۔یعنی یاء کی صورت میں لکھ کر آخرت میں الف کو ثابت رکھا گیا ہے۔اور ادرک پڑھا ہے یعنی ہمزہ استفہام کو مفتوح پڑھا ہے اور ہمزہ وصل کو گرا دیا ہے۔اور یہ لَمْ یُدْرِکْ کے معنی میں ہے۔اور حضرت اُبیؓ کی قرأت میں اَمْ تَدَارَکَ عِلْمُهُمْ ہے۔اور عرب اَمْ کی جگہ بَلْ اور بَلْ کی جگہ اَمْ استعمال کرتے رہتے ہیں۔علی بن عیسیٰ اور اسحاق نے کہا ہے کہ بَلِ ادّٰرَکَ میں بَلْ لَوْ کے معنی میں ہے۔معنی یہ ہے کہ اگر دنیا میں انہیں آخرت کے بارے میں وہ علم حاصل ہوجاتا جو انہیں آخرت میں ہوتا ہے تو وہ شک نہ کرتے لیکن آج تو وہ قیامت کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔

ہے بلکہ وہ قیامت کے بارے میں اندھے ہوچکے ہیں۔عَمُوْنَ عمی کی جمع ہے اور اس سے مراد دل کا اندھا ہونا ہے۔اللہ تعالیٰ نے پہلے تو ان سے علم غیب کی نفی کردی پھر ان سے ان کے انجام کے شعور کی نفی کرکے اسے مزید مؤکد کیا جو ان کے لیے بالیقین ہوتا ہے۔پھر اس میں مبالغہ کیا اس طرح کہ اس سے اعراض کرتے ہوئے تصریح فرمائی کہ ان کا منتہائے علم اور دلائل وآیات میں سے وہ اسباب علم جو کامل ہوئے وہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ قیامت بالیقین قائم ہوگی۔لیکن وہ اس کے بارے ایسا نہیں جانتے جیسے جاننا چاہئے (یعنی اس کا وقت کیا ہے وہ کب قائم ہوگی وغیرہ) پھر اس سے اعراض کیا اور کہا بَلْ هُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْهَا کہ اولہ مکمل ہونے کے بعد بھی وہ اس کے بارے شک میں ہیں اس آدمی کی طرح جو کسی کام کے بارے سرگرداں اور متحیر ہو اور وہ اس پر کوئی دلیل نہ پاتا ہو۔پس یہ اپنے شک کو زائل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔پھر اس سے اعراض کیا اور کہا بلکہ یہ تو اس سے بھی برے حال میں ہیں کہ یہ اندھے ہوچکے ہیں۔یہ اپنی بصیرت مختل ہونے کی وجہ سے دلائل کا ادراک ہی نہیں کرسکتے۔یہ کیفیات مشرکین کے ساتھ مختص ہیں لیکن ان کی نسبت زمین وآسمان کے تمام باسیوں کی طرف اسی طرح کردی گئی ہے جیسے بعض کے فعل کو کل کی طرف منسوب کردیا جاتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پہلا اضراب وقت قیامت کے شعور کی نفی کے لیے ہے، یعنی استہزاءً کہا کہ آخرت کے امور کے بارے میں تو ان کا علم انتہائی مستحکم ہے یہ قول بھی ہے۔ کہ یہاں ادّٰرَکَ انتھٰی کے معنی میں ہے، یعنی وہ اپنی انتہا کو پہنچا اور نیست ونابود ہوگیا جیسا کہ عربوں کا قول ہے ادرک الشھر۔ وہ اپنی شہرت کی انتہا کو پہنچ گیا۔ کیونکہ وہی اس کی وہ غایت ہوتی ہے جس کے پاس پہنچ کر وہ معدوم ہوجاتا ہے۔اور اس کے بعد امور آخرت کے بارے ان کے علم سے اضراب ہے، ایک تو ان سے اس کے علم کی نفی میں مبالغہ کے اظہار کے لیے اور دوسرا اس پر دلالت کرنے کے لیے کہ قیامت کے بارے ان کا شعور یہ ہے کہ وہ اس کے بارے شک کررہے ہیں اور پھر اس سے بھی اعراض کرتے ہوئے فرمایا هُمْ منها عَمُوْنَ کہ وہ تو اس سے اندھے ہوچکے ہیں اور ان میں قیامت کے بارے جاننے کی بالکل صلاحیت ہی نہیں ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾

''اور کفار کہنے لگے [1] کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے باپ دادا بھی [2] تو کیا ہمیں (پھر) نکالا جائے گا [3]''

[1] اس کا عطف اس قول بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ کے مضمون پر ہے۔ اور یہ اس کے بیان اور وضاحت کی مثل ہے۔ یہاں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے۔ اور قَالُوْا نہیں کہا۔ اس لیے کہ اس سے قبل کافروں کا ذکر مجمل ہے۔

[2] نافع نے اِذَا کو ہمزہ استفہام کے بغیر صیغہ خبر کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور اس پر ہمزہ استفہام مقدر ہے۔ اور باقیوں نے سوالیہ صورت میں دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر اور کسائی نے اِنَّنَا کی دو نونوں کے ساتھ قرأت کی ہے ان میں سے ایک نون وقایہ ہے۔ اور ایک ہمزہ کے ساتھ خبر صیغہ کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور ہمزہ استفہام کو مقدر کیا ہے۔ اور باقیوں نے استفہام کی صورت پر ایک نون اور دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اٰبَآؤُنَا کی ضمیر کفار کی طرف اور ان کے آباء کی طرف راجع ہے۔ اس میں غائب پر حکایۃ بیان کرنے کو غلبہ دیا گیا ہے۔

[3] مفہوم یہ ہے کیا ہمیں قبور سے زندہ نکالا جائے گا اور موت کی حالت سے حیات کی طرف نکالا جائے گا۔ یہی ان کے اندھے پن کا بیان اور وضاحت ہے۔ اِذَا کا عامل محذوف ہے جس پر مخرجون دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَنُخْرَجُ اِذَا كُنَّا تُرَابًا اَنَحْنُ مُخْرَجُوْنَ حِيْنَئِذٍ۔ کیا جب ہم مٹی ہو چکے ہوں گے تو اس وقت ہمیں نکالا جائے گا؟۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ دوسرا جملہ استفہامیہ پہلے جملے کے لیے تاکید ہے۔ مبالغہ کے اظہار کے لیے دوبارہ اسے انکار کے لیے لایا گیا ہے۔ اور اِذَا میں مُخْرَجُوْنَ کو عامل بنانا جائز نہیں، کیونکہ ہمزہ اِنَّ اور لام اپنے ماقبل میں عمل کرنے سے مانع ہوتے ہیں۔

لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾

''بے شک قیامت کے آنے کا وعدہ ہم سے بھی کیا گیا اور ہمارے باپ دادا سے بھی اس سے پہلے [1] نہیں ہے یہ وعدہ مگر پہلے لوگوں کے من گھڑت افسانے [2]''

[1] تحقیق قیامت کا وعدہ ہم سے بھی کیا گیا ہے۔ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی زبان مبارک سے ہمارے ساتھ اور آپ کے علاوہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی زبانوں سے ہمارے آباء کے ساتھ بھی اس سے قبل یہ وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کلام میں هٰذَا کو نَحْنُ پر مقدم اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہاں اس سے مقصود قیامت کا ذکر ہے اور جہاں اسے مؤخر کیا گیا ہے وہاں مقصود وہ ہے جسے اٹھایا جائے گا۔

[2] یہ وعدہ نہیں ہے مگر پہلے لوگوں کی باتیں اور ان کے وہ من گھڑت افسانے جو انہوں نے لکھے ہیں۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾

''آپ فرمائیے سیر و سیاحت کرو زمین میں۔ پھر اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ کیسا ہولناک انجام ہوا مجرموں کا [1]''

[1] اے محمد ﷺ! آپ فرمائیے زمین میں سیر و سیاحت کرو پھر اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ مجرموں کا کیسا ہولناک انجام ہوا۔ یہ ان کے جھٹلانے کے سبب ان کے لیے جھڑک ہے اور انہیں اس طرح خوفزدہ کرنا ہے کہ ان پر اسی طرح عذاب نازل ہوگا جیسے ان سے پہلے جھٹلانے والوں پر نازل ہوا۔ اور انہیں مُجْرِمِيْنَ سے تعبیر اس لیے کیا گیا ہے تاکہ مؤمنین پر جرائم ترک کرنے کی وجہ سے لطف و عنایت ہو۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۞

''(اے محبوب) آپ غمزدہ نہ ہوں ان کے رویے پر اور تنگ دل نہ ہوا کریں ان کے مکروفریب سے ۱؎''

۱؎ اے محمد! ﷺ ان کے جھٹلانے اور اعراض کرنے کے سبب آپ غم زدہ نہ ہوں اور ان کے مکروفریب کے سبب آپ تنگ دل نہ ہوں۔ضیق میں ابن کثیر نے ضاد کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔اور باقیوں نے ضاد کو فتحہ کے ساتھ اور یہ دو لغتیں ہیں۔اور ''مِمَّا يَمْكُرُوْنَ'' میں مِن سبب بیان کرنے کے لیے ہے اور مَا مصدریہ ہے۔علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت مکہ کے ان سرداروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو استہزاء کرتے تھے،یعنی مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے معاملے کو کمال تک پہنچائے گا۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۞

''اور وہ پوچھتے ہیں کب (پورا ہوگا) یہ وعدہ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو ۱؎''

۱؎ اس کا عطف قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا پر ہے اور ان کے درمیان جملے معترضے ہیں۔یعنی عذاب کا جو وعدہ کیا گیا ہے وہ کب پورا ہوگا۔ اگر تم اس میں سچے ہو کہ عذاب نازل ہونے والا ہے۔

قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ رَدِفَ لَكُم بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ ۞

''آپ فرمائیے قریب ہے کہ تمہارے پیچھے آ لگا ہو ۱؎ اس عذاب کا کچھ حصہ جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو ۲؎''

۱؎ لَكُمْ میں لام زائدہ تاکید کے لیے ہے اصل میں لفظ رَدِفَكُمْ ہے۔یعنی قریب ہے کہ وہ تمہارے پیچھے ہو اور بغیر کسی مہلت کے تم سے آملا ہو۔

۲؎ بَعْضُ میں دو فعلوں کا تنازع ہے۔اور وہ یکون اور ردف ہیں ان دونوں میں سے ایک اس میں عمل کرتا ہے اور دوسرے میں ضمیر موجود ہے،یعنی قریب ہے کہ تمہارے پیچھے ہو اور بغیر کسی مہلت کے تم سے آملا ہو اس عذاب کا بعض حصہ جس کے آنے کی تم جلدی مچا رہے ہو۔اور اس سے مراد غزوۂ بدر کی صورت میں ان پر آنے والا عذاب ہے۔حضرت علامہ بیضاویؒ نے فرمایا سلاطین کے وعدوں میں عسی ،لعل اور سوف کے الفاظ یقین کے معنی میں ہوتے ہیں وہ ان کا استعمال اپنے وقار کے اظہار کے لیے کرتے ہیں اور ان کے ذریعے یہ احساس دلاتے ہیں کہ ان کا اشارہ دوسروں کے صریح کلام کی مثل ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور وعیدوں میں بھی ان الفاظ کا استعمال اسی معنی میں ہے۔اور جنہوں نے یہ قول کیا ہے عَسٰى وَلَعَلَّ فِيْ كَلَامِ اللّٰهِ وَاجِبَةُ الْوُقُوْعِ اس کا یہی معنی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام میں عسی اور لعل کے الفاظ بالیقین واقعہ ہونے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔لیکن وعید کی صورت میں ایمان لانے کی شرط کے ساتھ معافی جائز ہوتی ہے۔مگر کافر عفو کا مستحق نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى اس باب میں نہیں ہے۔اسی وجہ سے فرعون کی جانب سے نہ کسی نصیحت کو قبول کرنے کا اثر ظاہر ہوا اور نہ اس کے دل میں خوف الٰہی پایا گیا۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ۞

''اور بے شک آپ کا رب فضل (وکرم) فرمانے والا ہے لوگوں پر۔لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں ۱؎''

۱؎ یعنی اگر وہ چاہے تو مومن کی مغفرت فرما دیتا ہے اور کافر کو جلدی عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔اسی طرح اس نے اہل مکہ پر بھی عذاب

لانے میں جلدی نہیں کی۔ مقاتل نے اسی طرح کہا ہے(1)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر نعمت کے حق کو نہیں پہچانتے لہٰذا وہ عذاب جہنم جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۴﴾

''اور یقیناً آپ کا رب خوب جانتا ہے جو کچھ چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں 1۔''

1۔ اور بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے اسے جسے لوگوں کے سینوں نے چھپا رکھا ہوتا ہے اور جو کچھ وہ لوگوں کے سامنے آپ کی عداوت و دشمنی ظاہر کرتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزا ضرور دے گا۔ ان سے عذاب کا مؤخر ہونا اس وجہ سے نہیں کہ ان کا حال مخفی اور پوشیدہ ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ عَسٰی پر معطوف ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں عسٰی تحقق اور ثبوت کے لیے ہے۔

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۵﴾

''اور نہیں کوئی پوشیدہ چیز 1 آسمان اور زمین میں مگر اس کا بیان کتاب مبین میں موجود ہے 2۔''

1۔ غائبۃ مَا کا اسم ہے اور مِنْ زائدہ ہے، یعنی ما من شیءٍ غائبٍ عَنْ اَبْصَارِ النَّاسِ۔ لوگوں کی آنکھوں سے کوئی شے بھی غائب نہیں۔ یہ صفات غالبہ میں سے ہے جیسا کہ خافیۃ اور دونوں میں تاء مبالغہ کے لیے ہے۔ جیسا کہ روایۃ میں ہے۔ یا یہ دونوں اس شے کا اسم ہیں جو غائب ہوتی ہے اور چھپ جاتی ہے۔ اس صورت میں اس کے آخر میں تاء افیۃ اور عاقبۃ کی تاء کی مثل ہی ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے یہ محذوف کی صفت ہے۔ یعنی جملۃ غائبۃ یعنی پوشیدہ راز، مخفی امر اور غائب شے۔

2۔ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ظرف لغو ہے جو غائبۃ کے متعلق ہے اور اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ مستثنیٰ مفرغ ہے اور مَا کی خبر ہے۔ یعنی کھلی ہوئی اور واضح کتاب یا اس کے لیے اپنے اندر چھپے ہوئے اسرار و رموز کو بیان کرنے والی جو اس کا مطالعہ کرے۔ اور اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾

''یہ قرآن بیان کرتا ہے بنی اسرائیل کے سامنے اکثر ان امور (کی حقیقت) کو جن میں وہ جھگڑتے رہتے ہیں 1۔''

1۔ بے شک یہ قرآن پاک بنی اسرائیل کے لیے اکثر ایسے دینی امور بیان کرتا ہے۔ جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ کلبی نے کہا ہے کہ بے شک اہل کتاب آپس میں اختلاف کرتے کرتے گروہوں میں بٹ گئے اور ایک دوسرے کو طعنے دینے لگے۔ پھر قرآن کریم ان چیزوں کی وضاحت اور بیان میں نازل ہوا جن کے بارے وہ آپس میں اختلاف رکھتے تھے(2)۔ یہ جملہ اپنے معطوف سمیت اس ارشاد سے متصل ہے۔ وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ اور یہ اس کے مقام تعلیل میں واقع ہے۔ اور جو جملے ان کے درمیان ہیں وہ معترضے ہیں۔

وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾

''اور بلاشبہ یہ قرآن سراپا ہدایت اور مجسم رحمت ہے مومنین کے لیے 1۔''

1۔ اور بے شک قرآن کریم مومنین کے لیے سراپا ہدایت اور مجسم رحمت ہے کیونکہ وہی اس قرآن سے نفع اٹھاتے ہیں نہ کہ وہ کفار جو اہل

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کتاب سے ہوں یا دوسرے ہوں، ان کے لیے یہ نفع بخش نہیں ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾

"یقیناً آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان ۱؎ اپنے حکم سے اور وہی ہے زبردست سب کچھ جاننے والا ۲؎"

۱؎ بے شک آپ کا رب دین کے امور میں اختلاف کرنے والوں کے درمیان قیامت کے دن اپنے حکم سے فیصلہ فرمائے گا۔

۲؎ بِحُكْمِهٖ يَقْضِيْ کے متعلق ہے، اگر کہا جائے کہ يَقْضِيْ کا معنی ہے وہ فیصلہ فرمائے گا تو پھر بِحُكْمِهٖ اس کے متعلق کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو اس جملے کی مثل ہو جاتا ہے يَنْصُرُهٗ بِنَصْرِهٖ (وہ اس کی مدد کرتا ہے اپنی مدد کے ساتھ) اور یہ جائز نہیں؟ تو اس کے بارے ہم کہیں گے کہ یہاں حکم بمعنی محکوم ہے اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس فیصلے کا حکم فرمائے گا جو اس نے قرآن کریم میں ان کے متعلق بیان کر دیا ہے۔ یا پھر یہ مراد ہے کہ وہ اپنی حکمت کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا۔ وہ اتنا غالب ہے کہ اس نے اپنے فیصلے کا ارادہ کیا ہے۔ اور وہ اس کی حقیقت اور حکمت کو خوب جانتا ہے۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾

"سو آپ بھروسہ کریں اللہ پر، ۱؎ بے شک آپ روشن حق پر ہیں ۲؎"

۱؎ اور آپ ان کی پرواہ نہ کریں جو آپ سے عداوت رکھتے ہیں۔ یہ قول باری تعالیٰ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ سے متصل ہے۔

۲؎ بے شک آپ روشن حق پر ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیّن حق پر ہونا توکل کی علت ہے۔ کیونکہ وہ ایسے واضح حق پر ہے جس میں خفا نہیں۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو حقیقتاً صاحب حق ہے اسے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا چاہیے تو اللہ تعالیٰ اس کا مددگار ہوگا۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾

"بے شک آپ نہیں سنا سکتے مردوں کو ۱؎ اور نہ آپ سنا سکتے ہیں بہروں کو اپنی پکار ۲؎ جب وہ بھاگے جا رہے ہوں پیٹھ پھیرے ہوئے ۳؎"

۱؎ بے شک آپ کفار کو نہیں سنا سکتے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو مردوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے اس میں کہ قرآن کریم کی جو آیات ان پر تلاوت کی جاتی ہیں ان کا سماع ان کے لیے نفع بخش نہیں ہوتا۔ (یعنی وہ اس سے کوئی نفع اور فائدہ حاصل نہیں کرتے کہ وہ کفر چھوڑ کر ایمان قبول کر لیں) جیسا کہ انہیں اس ارشاد باری تعالیٰ میں بہروں کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

۲؎ الدُّعَآءَ تنازع الفعلین کے طریقے پر دو فعلوں کا مفعول ہے ابن کثیر نے اسے لَا يَسْمَعُ یاء اور میم کے فتحہ کے ساتھ صیغہ غائب مجرد سے پڑھا ہے۔ اور فاعل ہونے کی بناء پر الصُّمُّ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اسی طرح سورۃ روم میں بھی کیا ہے۔ جب کہ باقی قراء نے مخاطب کا صیغہ ہونے کی بناء پر تاء کو ضمہ اور میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تُسْمِعُ یہ اسماع سے ماخوذ ہے۔ اور الصُّمَّ کو مفعول ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔

۳؎ اگر یہ کہا جائے کہ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ کی قید کا کیا مقصد ہے؟ جب کہ اصم ہوتا ہی وہ ہے جو نہیں سنتا چاہے وہ واپس پھرے یا نہیں۔ تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ تاکید اور مبالغہ کے لیے ہے۔ اور دوسرا جواب ہے۔ کہ بہرہ آدمی جب حاضر ہوتا ہے تو کبھی وہ بلند آواز کو سن لیتا ہے یا پھر اشارہ یا کنایت کے ساتھ سمجھ لیتا ہے۔ لیکن جب وہ واپس چلا گیا تو پھر وہ بالکل نہ سنتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ یعنی کفار کو

جس چیز کی طرف دعوت دی جاتی ہے وہ اس سے بہت زیادہ اعراض کرنے میں اس میت کی مثل ہو چکے ہیں جس کے لیے سننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اور اس بہرے کی مثل ہو چکے ہیں جو پیٹھ پھیر کر واپس مڑ جاتا ہے اور اسے سمجھانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ یہ قول بھی ہے کہ تنازع الفعلین کے طریقہ پر یہ ظرف دو فعلوں کے متعلق ہے۔

اعتراض:۔ یہاں اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ بہرے کی طرف تو واپس بھاگنے کی نسبت کرنا صحیح ہے لیکن مردوں کی طرف یہ نسبت جائز نہیں تو پھر تنازع کیسے تصور کیا جا سکتا ہے؟

جواب:۔ جواب یہ ہے کہ یہاں کافر کو استعارۃً مردہ اور بہرہ کہا گیا ہے۔ اور کافر پیٹھ پھیر کر بھاگنے والوں میں سے ہے (لہٰذا تنازع متصور ہو سکتا ہے) اس ستعارہ کا نام استعارہ مجردہ ہے اور یہ وہ ہوتا ہے جس میں مستعار کو ایسے وصف سے متصف کیا جاتا ہے جو مستعار لہٗ کے مناسب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

"اور نہیں آپ ہدایت دینے والے (دل کے) اندھوں کو ان کی گمراہی سے [1] نہیں سناتے آپ بجز ان کے جو ایمان لاتے ہیں ہماری آیتوں پر [2] پھر وہ فرمانبردار بن جاتے ہیں"

[1] اعمش اور حمزہ نے یہاں اور سورۂ روم میں هٰدِی کو صیغہ مضارع کی بناء پر تَهْدِیْ پڑھا ہے۔ یعنی تاء مفتوح اور ھاء ساکن کے ساتھ بغیر الف کے قرأت کی ہے۔ اور الْعُمْیَ نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جب وقف کرتے ہیں تو دونوں صورتوں میں تَهْدِی کی یاء کو ثابت رکھتے ہیں۔ اور باقی قراء نے یاء مکسورہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس طرح اسم فاعل کا صیغہ الْعُمْیِ کی طرف مضاف ہے اور وہ مجرور ہے۔ انہوں نے یہاں یاء کے ساتھ وقف کیا ہے اور سورۂ روم میں بغیر یاء کے۔ اور انہوں نے ایسا مصحف کی اتباع کرتے ہوئے کیا ہے۔ یعنی آپ انہیں ہدایت نہیں دے سکتے جن کے دل کو اللہ تعالیٰ نے ایمان قبول کرنے سے اندھا کر دیا ہے۔

[2] اور آپ نہیں سنا سکتے اور نہ ہی آپ کا قرآن سنانا کسی کو نفع دے سکتا ہے۔ مگر جن کے لیے ہم نے ایمان مقدر کر دیا ہے (وہی اس سے نفع حاصل کر سکتے ہیں)۔ پس وہی مخلص ہیں جو اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہوئے اپنا چہرہ اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر لیتے ہیں۔

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾

"اور جب ہماری بات کے ان پر پورا ہونے کا وقت آ جائے گا تو ہم نکالیں گے ان کے لیے ایک چوپایہ زمین سے [1] جو ان سے گفتگو کرے گا [2] کیونکہ لوگ ہماری آیتوں پر ایمان نہیں لاتے تھے [3]"

[1] جو بات انہیں کہی گئی ہے جب اس کا وقوع ان کے قریب ہو گا۔ یعنی جو انہیں دوبارہ اٹھائے جانے اور عذاب دیئے جانے کا وعدہ ان سے کیا گیا ہے۔ جب اس کا وقت قریب ہو گا تو ہم ان کے لیے ایک چوپایہ نکالیں گے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ اس میں چوپائے کی دم نہیں ہو گی لیکن اس کی ڈاڑھی ہو گی گویا کہ آپ اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ آدمی ہو گا۔ اور اکثر کا نظریہ یہ ہے کہ وہ چار ٹانگوں والا جانور ہو گا۔ عبد بن حمید نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ وہ چوپایہ اون

اور پروں والا ہوگا اور اس میں ہر قسم کے رنگ ہوں گے، اس کی چار ٹانگیں ہوں گی پھر وہ حاجیوں کے پیچھے سے ظاہر ہوگا(1)۔ جریج نے ابوالزبیر سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اس چوپایہ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کہا اس کا سر بیل کے سر کی طرح، آنکھیں خنزیر کی آنکھوں کی مثل، کان ہاتھی کے کانوں جیسے سینگ بارہ سنگھے کے سینگوں کی مثل، سینہ شیر کے سینے کی طرح، رنگ چیتے کے رنگ کی طرح، پہلو بلی کے پہلوؤں کی طرح، دم مینڈھے کی دم کی مثل اور اس کی ٹانگیں اونٹ کی ٹانگوں جیسی ہوں گی۔ اس کے ہر دو جوڑوں کے درمیان بارہ ذراع کا فاصلہ ہوگا۔ اس کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا عصاء اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی ہوگی۔ پس کوئی مومن باقی نہیں رہے گا مگر یہ چوپایہ اس کے سجدہ کرنے کے عضو یعنی پیشانی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصاء سے ایک سفید اور روشن نقطہ لگا دے گا جس کے سبب اس کا سارا چہرہ روشن ہو جائے گا۔ اور کوئی کافر باقی نہیں رہے گا مگر یہ اس کے چہرے پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی سے سیاہ نقطہ لگا دے گا جس کے سبب اس کا چہرہ مکمل طور پر سیاہ ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ لوگ بازاروں میں خرید و فروخت کرتے وقت کہیں گے اے مومن! یہ چیز کتنے کی ہے؟ اے کافر! یہ شے کتنے کی ہے؟ پھر وہ چوپایہ انہیں کہے گا اے فلاں تو اہل جنت میں سے ہے اے فلاں تو اہل نار میں سے ہے۔ یہی مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا ہے: وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ(2)۔ یہ مِنَ الْاَرْضِ، اَخْرَجْنَا کے متعلق ہے۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا وہ چوپایہ صفا پہاڑی کے ایک شگاف سے گھوڑے کی چال کی مثل دوڑتے ہوئے تین دنوں میں ظاہر ہوگا لیکن وہ تین بار نہیں نکلے گا۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حالت احرام میں اپنے عصاء کے ساتھ صفا پہاڑی کو کھٹکھٹایا اور کہا کہ چوپایہ میرے عصاء کی کھٹکھٹاہٹ کو سن رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ چوپایہ ایک گھاٹی سے نکلے گا اس کا سر بادلوں کو چھو رہا ہو گا اور اس کے پاؤں زمین میں ہوں گے، وہ ابھی اس سے نہیں نکلے ہوں گے کہ اس کا گزر ایک ایسے آدمی کے پاس سے ہوگا جو نماز پڑھ رہا ہوگا وہ اسے کہے گا نماز کی مجھے کیا حاجت ہے؟ پھر اس کی ناک پر ضرب لگا کر نشان بنا دے گا۔(3)

علامہ بغویؒ نے حضرت ابو شریحہ انصاریؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ چوپایہ تین مقامات سے ظاہر ہوگا۔ ایک بار تو وہ یمن سے نکلے گا تو اس کا ذکر صحراء میں پھیل جائے گا اور ساتھ ہی اس کا ذکر مکہ مکرمہ میں بھی ہونے لگے گا۔ پھر ایک دن لوگ مسجد حرام میں ہوں گے جو حرمت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام مساجد سے اعظم ہے اور سب سے زیادہ معزز ہے تو وہ مسجد کی اطراف میں موجود تمام لوگوں کو دیکھے گا۔ پھر وہ اسی طرح آہستہ آہستہ قریب ہوتا چلا آئے گا۔ عمر نے کہا ہے کہ وہ رکن اسود اور باب بنی مخزوم کے درمیان سے ظاہر ہوگا۔ پس لوگ اسے دیکھ کر بکھر جائیں گے اور ایک جماعت اس کے سامنے ثابت رہے گی وہ یہ یقین کرلیں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بچ نہیں سکتے۔ وہ ان کے پاس آئے گا اور اپنے سر سے مٹی جھاڑنے لگے گا یہاں تک کہ وہ ان کے پاس سے گزر جائے گا اور ان کے چہرے اس طرح چمکنے لگیں گے گویا کہ وہ روشن ستارے ہیں۔ وہ زمین میں چلنے لگے گا کوئی تلاش کرنے والا اسے پا نہیں سکے گا اور کوئی بھاگنے والا اس سے بھاگ نہیں سکے گا۔ یہاں تک کہ ایک آدمی کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہا ہوگا اور وہ اس کے پاس پیچھے کی جانب سے آکر کہے گا اے فلاں! اب تو نماز پڑھ رہا ہے پھر وہ سامنے سے اس کی طرف آئے گا اور اس کے منہ پر نشان لگا دے گا۔ لوگ اپنے گھروں میں داخل ہو جائیں گے، سفر میں ایک دوسرے کی مصاحبت اختیار کریں گے، مالوں میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوں گے اور مومنین میں سے کافروں کی پہچان کی جا سکے گی۔ لہٰذا مومن کو پکارا جائے گا اے مومن! اور کافر کو

کہا جائے گا اے کافر!(1)

حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دابۃ کا ذکر فرمایا میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ وہ کہاں سے نکلے گا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس مسجد سے جو اپنی حرمت کے اعتبار سے تمام مساجد کی نسبت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعظم و اکرم ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیت اللہ کا طواف کر رہے ہوں گے اور آپ کے ساتھ مسلمان بھی ہوں گے اچانک ان کے نیچے سے زمین مضطرب ہو جائے گی، قندیلیں حرکت کرنے لگیں گی اور مشرقی سمت سے صفا پھٹ جائے گا اور وہ چوپایہ صفا سے نکلے گا۔ سب سے پہلے اس سے اس کا سر ظاہر ہوگا اس کے لمبے لمبے بال ہوں گے اور پر ہوں گے۔ کوئی تلاش کرنے والا اسے پا نہیں سکے گا۔ اور کوئی بھاگنے والا اس سے بھاگ نہیں سکے گا اور وہ لوگوں پر مومن اور کافر ہونے کا نشان لگائے گا پس مومن کا چہرہ چمکتے ہوئے روشن ستارے کی مانند ہو جائے گا۔ اور وہ اس کی آنکھوں کے درمیان سفید چمکنے والا نکتہ لگائے گا کہ یہ مومن ہے۔ اور جو کافر ہوگا اس کی آنکھوں کے درمیان سیاہ نکتہ لگا دے گا کہ یہ کافر ہے۔ اسے بغویؒ نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابن جریر نے بھی نقل کیا ہے۔

علامہ بغویؒ نے سہل بن صالح عن ابیہ کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا شعب حناد بہت بڑی گھاٹی ہے آپ ﷺ نے یہ ارشاد دو یا تین بار فرمایا۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ ایسا کیوں ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہاں سے وہ دابۃ نکلے گا جو تین بار زور سے چیخ لگائے گا جسے مشرق و مغرب کے درمیان رہنے والے سن لیں گے۔ فرمایا اس کا چہرہ آدمی کے چہرے کی مثل ہوگا اور بقیہ اس کی ساری بناوٹ پرندے کی مثل ہوگی۔ پس جو اسے دیکھے گا وہ اسے خبر دے گا کہ بے شک اہل مکہ محمد ﷺ اور قرآن پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

2۔ تُكَلِّمُهُمْ دَآبَّۃ کی صفت ہے۔ یعنی چوپایہ لوگوں سے ہم کلام ہوگا۔ سدیؒ نے کہا ہے کہ وہ دین اسلام کے سوا باقی تمام ادیان کے باطل ہونے کی لوگوں سے گفتگو کرے گا۔(2) اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا کلام یہ ہوگا وہ ایک کو کہے گا یہ مومن ہے اور دوسرے کو کہے گا یہ کافر ہے۔ جیسا کہ احادیث میں گزر چکا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا کلام وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

3۔ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ مقاتل نے کہا ہے کہ وہ ان سے عربی زبان میں کلام کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے کہے گا اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ کہ لوگ ہماری آیتوں پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ اور لوگوں کو خبر دے گا کہ اہل مکہ قرآن کریم اور دوبارہ زندہ کیے جانے پر ایمان نہیں لائے(3)۔ کوفیوں نے دآبّہ کے قول کی حکایت کرتے ہوئے اِنَّ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یا اس لیے کہ اس سے پہلے باء حرف جار مقدر ہے۔ یعنی بِاَنَّ النَّاسَ الخ۔ یا اللہ تعالیٰ کے اس قول کی حکایت کرتے ہوئے جو اس بارے کہا گیا۔ اور اس کا وقوع قریب ہوا۔ یا کسی اور کے قول کے مطابق لام محذوفہ کے ساتھ اس کے خروج کی علت بیان کی گئی ہے۔ اسی لیے اَنَّ مفتوح ہے۔ باقی تمام نے اِنَّ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس اعتبار سے یہ جملہ مستانفہ ہے۔ یعنی بے شک لوگ اس کے خروج سے پہلے ہماری آیات کے ساتھ ایمان نہیں لاتے تھے۔ "اِنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ قَبْلَ خُرُوْجِهَا" یہ بھی کہا گیا ہے کہ اٰيٰتِنَا سے مراد چوپایہ کا زمین سے نکلنا اور قیامت کی تمام علامات اور اس کے احوال ہیں کیونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ ابن جریر، عاصم الجحدری اور ابو رجاء عطاردی نے تَكْلِمُهُمْ تاء کو فتحہ اور لام کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ الكَلْمُ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی الجرح (زخمی کرنا) ہے۔ ابن حوراء نے کہا ہے کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اس آیت کے بارے پوچھا کہ یہ تَکْلَمُهُمْ ہے یا تُكَلِّمُهُمْ ہے؟ تو آپ نے فرمایا وہ یہ سب کچھ کرے گا۔ وہ مومن سے کلام کرے گا اور کافر کو زخم لگائے گا۔(1)

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ دابۃ کے نکلنے کا وقت وہ ہے جب نیکی کا حکم نہیں دیا جائے گا اور برائی سے روکا نہیں جائے گا(2)۔ شیخ جلال الدین محلیؒ نے کہا کہ دابۃ کے نکلنے کے ساتھ ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر منقطع ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد کوئی کافر ایمان نہیں لائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ (کہ آپ کی قوم میں سے اب کوئی ایمان نہیں لائے گا سوائے ان کے جو ایمان لا چکے)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مفہوم احادیث و آثار سے مستنبط ہے۔

فصل:۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چھ چیزوں کے ظاہر ہونے سے پہلے اپنے اعمال تیزی سے کر لو (1) الدخان (دھواں کا ظاہر ہونا) (2) دجال کا ظاہر ہونا (3) دابۃ الارض (زمین سے چوپایہ کا نکلنا) (4) طلوع الشمس من مغربها (مغرب سے سورج کا طلوع ہونا)۔ (5) امر العامہ (6) خویصۃ احدکم۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ان علامات میں سے جو پہلے ظاہر ہوں گی وہ مغرب سے سورج کا طلوع ہونا ہے اور چاشت کے وقت لوگوں پر دابہ کا خروج ہے۔ ان میں سے جو بھی پہلے ظاہر ہو گی تو دوسری قریب ہی اس کے پیچھے آئے گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(4)۔ حضرت حذیفہ بن اسد غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے درآنحالیکہ ہم مذاکرہ کر رہے تھے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تم کس کے بارے گفتگو کر رہے ہو؟ انہوں نے عرض کی ہم قیامت کے بارے گفتگو کر رہے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک وہ قائم نہیں ہو گی یہاں تک کہ تم اس سے پہلے دس علامات دیکھ لو گے پھر آپ ﷺ نے ان کا ذکر فرمایا (1) دھواں اٹھنا (2) دجال کا آنا (3) چوپائے کا خروج (4) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا (5) حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول (6) یاجوج ماجوج کا آنا اور تین خسوف یعنی تین مقامات سے زمین کا دھنسایا جانا (7) ایک مشرق میں (8) ایک مغرب میں (9) اور ایک جزیرہ عرب میں۔ (10) اور سب سے آخر میں یمن سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو محشر کی جانب بھگا لے جائے گی(5)۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایک آگ قعر عدن سے نکلے گی جو لوگوں کو حشر کی جانب ہانک کر لے جائے گی(6)۔ اور ایک روایت میں دسویں علامت کی جگہ یہ مذکور ہے کہ ایک تیز ہوا چلے گی جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(7)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دابۃ زمین سے نکلے گا اس کے پاس حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بھی ہو گا پس وہ مومن کے چہرے کو عصا کے ساتھ روشن کر دے گا اور کافر کی ناک پر اس انگوٹھی کے ساتھ مہر لگا دے گا یہاں تک کہ اگر لوگ دستر خوان پر جمع ہوں گے تو ایک دوسرے سے کہے گا اے مومن اور دوسرا اسے کہے گا اے کافر!(8)۔ اسے احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا چوپایہ نکلے گا اور وہ لوگوں کی ناکوں پر نشان لگا دے گا پھر وہ لوگ تمہارے درمیان ہی آباد رہیں گے یہاں تک کہ ایک آدمی جانور خرید کر لائے گا تو اس سے کہا جائے گا تم نے یہ کس سے خریدا ہے؟ تو وہ کہے گا اس آدمی سے جس کی ناک پر مہر لگائی گئی ہے۔ اسے احمدؒ نے روایت کیا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 406 (قدیمی)

ہے(1)۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہے کہ دآبہ جمعہ کی رات (دسویں ذی الحجہ کی رات) ظاہر ہوگا درآنحالیکہ لوگ منیٰ کی طرف جا رہے ہوں گے۔(2)

ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حسن سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا کہ وہ انہیں دآبہ دکھائے۔ تو وہ تین دن اور تین راتیں نکلا وہ آسمان کی طرف جاتا اور اس کی دونوں طرفوں (کناروں) میں سے کوئی بھی دکھائی نہ دیتی۔ چنانچہ آپ نے انتہائی ڈراؤنا اور خوفناک منظر دیکھا۔ تو اپنے رب کی بارگاہ میں اسے واپس لوٹانے کی التجا کی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے واپس کر لیا(3)۔ میں کہتا ہوں کہ مذکورہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ دآبہ ان مؤمنین جو اپنے ایمان میں سچے ہیں اور ان منافقین کے درمیان امتیاز کرے گا جنہوں نے ایمان ظاہر کیا اور اپنے باطن میں کفر چھپائے رکھا۔ اور کفر سے مراد لیا تو اس مجازی اسلام کی ضد ہے جسے ماننے والوں کے دل اس دین کی تصدیق نہیں کرتے جو حضور نبی کریم ﷺ لے کر آئے (یعنی زبان سے اسلام کا اقرار تو کرتے ہیں مگر دل اس دین کی تصدیق نہیں کرتے)۔ یا پھر اس حقیقی اسلام کی ضد ہے جسے ماننے والوں کے دل تصدیق کرنے میں ان کی زبانوں کے اقرار کی منافقت کرتے ہیں لیکن ان کے نفوس نہ تو ایمان لائے اور نہ مطمئن ہوئے۔ پس اگر کافر سے مراد یہ معنی ہے تو دآبہ کے اس قول "اے فلاں تو تو اہل جہنم میں سے ہے" سے مراد یہ ہے کہ اسے جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ یہ معنی نہیں کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اور کفر سے اعلانیہ کفر کرنے والا کراد لینا جائز نہیں کیونکہ فتح مکہ کے بعد اعلانیہ کفر کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا اور اب بھی دآبہ کے خروج سے پہلے اعلانیہ کفر کرنے والے مسلمانوں سے علیحدہ ہی ہیں۔ لہٰذا دآبۃ کو انہیں مسلمانوں سے ممتاز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿٨٣﴾

"اور جس روز ہم اکٹھا کریں گے ہر امت سے ایک گروہ [1] جو جھٹلایا کرتا تھا ہماری آیتوں کو تو ان کو (اپنی اپنی جگہ پر) روک لیا جائے گا [2]"

[1] یعنی قیامت کے دن ہم اکٹھا کریں گے ہر قرن سے ایک گروہ۔ (امت سے مراد قرن ہے یعنی ہر پیغمبر کی امت جو اس کے زمانہ نبوت کی ہے) اس میں کلمہ مِنْ بعضیت کے لیے ہے۔ اور فَوْجًا نَحْشُرُ کا مفعول ہے۔ اور مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ اس سے حال ہے۔ میں کہتا ہوں یہ اس وقت ہوگا جب اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو فرمائے گا اپنی ذریت میں سے جہنم کے لیے حصہ بھیجو۔ یہ حدیث سورۂ حج کی ابتدا میں گزر چکی ہے۔

[2] مِّمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَوْجًا کی صفت ہے۔ اور یہاں مِنْ بیانیہ ہے یعنی فَوْجًا مکذبین (ہماری آیات کو جھٹلانے والا گروہ)۔ پس ان میں سے پہلے آنے والوں کو آخر میں آنے والوں کے لیے روک لیا جائے گا یہاں تک کہ وہ سب جمع ہو جائیں گے۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ان کی تعداد کی کثرت اور ان کی اطراف کا بہت دور دور تک ہونا ہے۔

حَتّٰى إِذَا جَاءُوا قَالَ أَكَذَّبْتُمْ بِآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٨٤﴾

"حتیٰ کہ جب وہ آجائیں گے اللہ فرمائے گا کیا تم نے جھٹلایا میری آیتوں کو [1] حالانکہ تم نے اچھی طرح انہیں جانا بھی نہ

1۔ مسند احمد، جلد 5 صفحہ 268 (صادر) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

تھا؟ یا اس کے علاوہ اور کیا تھا جو تم کیا کرتے تھے۔ ”

۱؎ یہ ابتدائے کلام میں جملہ شرطیہ پر داخل ہے۔ جب وہ آ جائیں گے میدان حشر میں تو اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا۔ یہ استفہام انہیں زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ (کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلایا ہے)

۲؎ وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا میں واؤ حالیہ ہے۔ یعنی کیا تم نے صرف عام رائے سے میری آیتوں کو جھٹلا دیا حالانکہ تم نے ان میں اس طرح غور و فکر بھی نہیں کیا تھا کہ تمہارا علم ان کی حقیقت و ماہیت کا احاطہ کر لیتا۔ اور تم حقیقۃً جان لیتے کہ آیا وہ تصدیق کے قابل ہیں یا تکذیب کے۔ یا پھر واؤ عاطفہ ہے یعنی کیا تم نے آیات کی تکذیب اور ان کی حقیقت میں غور و فکر نہ کرنے کو جمع کر دیا ہے (یعنی غور و فکر کیے بغیر تکذیب کر دی)۔

۳؎ اس میں عبارت مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَمْ لَمْ تُكَذِّبُوْا فَاِنْ لَمْ تُكَذِّبُوْا فَمَا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یا تم نے نہیں جھٹلایا پس اگر تم نے تکذیب نہیں کی تو پھر کیا تھا جو تم کرتے تھے۔ یعنی تکذیب کے علاوہ کونسا عمل ہے جو تم کرتے تھے۔ یہ کلام بھی زجر و توبیخ کے لیے ہے چونکہ جہالت کے سبب تکذیب کے بغیر انہوں نے کچھ نہیں کیا اس لیے وہ یہ کہنے کی قدرت نہیں رکھیں گے نہیں، بلکہ اقرار کریں گے کہ ہم نے تو یہ کیا۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾

”اور پوری ہوگئی (اللہ کی) بات ان پر بوجہ ان کے ظلم کے تو وہ (اس وقت) بولیں گے نہیں ۱؎۔ ”

۱؎ اس کا عطف قَالَ پر ہے جو شرط کی جزاء کے محل میں ہے۔ یعنی ان پر وہ عذاب ثابت ہو گیا جس کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا۔ ان کے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے کے سبب۔ تو وہ اس وقت عذر پیش کرنے کے لیے بولیں گے نہیں کیونکہ ان کا فی الحقیقت کوئی عذر ہے ہی نہیں۔ یا پھر اس لیے نہیں بولیں گے کہ انہیں عذر پیش کرنے کی اجازت ہی نہیں دی جائے گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اس لیے نہیں بولیں گے کہ ان کے مونہوں پر مہر لگی ہو گی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ عذاب میں مشغول ہونے کے سبب وہ بول نہیں سکیں گے۔ مذکورہ تمام اقوال میں پہلا قول ہی زیادہ واضح ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلالت کرتا ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾

”کیا انہوں نے غور نہ کیا کہ ہم نے بنایا رات کو اس لیے تاکہ وہ اس میں آرام کریں اور بنایا ہے دن کو بینا ۱؎ بے شک اس میں (ہماری قدرت کی) نشانیاں ہیں ۲؎ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ۳؎ ”

۱؎ یعنی ایمان کو ثابت کرنے والے دلائل اور علامات دیکھنے کے بعد وہ کفر پر کیسے عذر پیش کر سکیں گے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے، یعنی تحقیق انہوں نے دیکھا۔ بے شک ہم نے پیدا کیا ہے رات کو اس لیے تاکہ وہ اس میں نیند اور قرار کے سبب آرام کریں اور دن کو بنایا بینا اصل میں لِيُبْصِرُوْا فِيْهِ تھا تاکہ وہ اس میں دیکھیں (کیونکہ دن نہیں دیکھتا بلکہ اس میں لوگ دیکھتے ہیں)۔ پھر اس میں اظہار مبالغہ کرتے ہوئے ابصار کو ہی دن کے احوال میں سے بطور حال ذکر کیا کیونکہ یہ اس سے (یعنی ابصار نہار سے) جدا نہیں ہو سکتا۔ اور اِنَّا جَعَلْنَا کا جملہ اَلَمْ تَرَوْا کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ کیونکہ یہاں رؤیت بمعنی علم ہے۔ یعنی کیا وہ

نہیں جانتے کہ ایک مخصوص طریقہ پر نور و ظلم (دن اور رات) کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا نفع بخش ہے اور معاش و معاد (دینا و آخرت) کی مصالح کی علت و سبب ہے۔ تو یقیناً اس کا خالق حکیم، قادر اور غالب آنے والا ہے۔ اور وہ جو اس پر قدرت رکھتا ہے وہ یقیناً رسولوں کو بھیجنے پر بھی قادر ہے تا کہ وہ اس کی مخلوق کو اس کی عبادت کی طرف دعوت دیں، وہ یہ بھی قدرت رکھتا ہے کہ وہ اپنی اطاعت کرنے والوں کو انعام سے نوازے اور نہ فرمان کو سزا کا مستحق ٹھہرائے۔ اور وہ موت کو حیات کے ساتھ بدلنے پر اسی طرح قدرت رکھتا ہے جیسے وہ ظلمت کو نور سے اور بیداری کو نیند سے بدلنے پر قادر ہے۔ اور معجزات رسولوں اور ان کے لائے ہوئے دین کے سچا ہونے پر واضح دلیل ہیں۔

۲۔ بے شک ان امور میں "لَاٰیٰتٍ" واضح نشانیاں ہیں جو توحید اور رسول کی صداقت پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد تکذیب کرنے والے کے پاس کون سا عذر ہے کہ وہ پیش کرے۔ اور آیات کے ثبوت کو اپنے اس قول کے ساتھ مقید کیا ہے۔

۳۔ (ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں) کیونکہ وہی ان سے نفع حاصل کرتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اَلَمْ یَرَوْا کا جملہ آخر تک حشر کی دلیل ہے۔ کیونکہ نیند کے پیچھے بیداری کا آنا موت کے بعد حیات آنے کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾

"اور جس دن پھونکا جائے گا صور لے تو گھبرا جائے گا ہر کوئی جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے مگر جنہیں خدا نے چاہا (وہ نہیں گھبرائیں گے) ۲ اور سب حاضر ہوں گے اس کی بارگاہ میں عاجزی کرتے ہوئے ۳"

۱۔ اس کا عطف وَيَوْمَ نَحْشُرُ کے قول پر ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے صور کے بارے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا(1)۔ اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے حسن کہا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے اسے مسدد نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں کیسے راحت وسکون میں ہو سکتا ہوں جبکہ صور والا اسے منہ میں لیے ہوئے ہے، اپنی پیشانی جھکائے ہوئے ہے اور ہمہ تن گوش ہے کہ کب اسے اس میں پھونکنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پس جونہی آپ ﷺ کے صحابہ کرام نے یہ سنا۔ تو یہ ان پر شاق گزرا (اور انہیں پریشانی لاحق ہوگئی) تو پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہو "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" (اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور وہی اچھا کارساز ہے)(2)۔ امام احمد، حاکم، بیہقی اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے اسی طرح یہ روایت نقل کی ہے، ترمذی، حاکم اور بیہقی نے ابوسعید سے اور ابونعیم نے حضرت جابرؓ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔ سعید بن منصور اور بیہقی نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبرائیل علیہ السلام اس کی دائیں طرف، میکائیل علیہ السلام اس کی بائیں طرف ہیں اور وہی صاحب صور ہے(3)۔ یعنی حضرت اسرافیل علیہ السلام۔ علامہ قرطبیؒ نے کہا ہے کہ تمام امتوں کے علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام ہی صور میں پھونکیں گے۔

۲۔ پس گھبرا جائے گا جو کوئی آسمانوں میں ہے یعنی ملائکہ اور ارواح مؤمنین۔ اور جو زمین میں انسان ہیں۔ علماء کا اس نفخہ کے بارے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 65 (وزارت تعلیم) 2۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 309 (العلمیہ)
3۔ سنن سعید بن منصور، جلد 3 صفحہ 1121 (دارالصمیعی)

اختلاف ہے کہ آیا یہ نفخہ الصعق (ہلاک کرنے والا نفخہ) ہے یا کوئی اور؟ تو اس کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ نفخات تین ہیں (یعنی تین بار صور پھونکا جائے گا) ان میں پہلا نفخہ الفزع ہے یعنی اس سے مخلوق میں گھبراہٹ اور افراتفری پھیل جائے گی۔ دوسرا نفخہ الصعق ہے یعنی اس سے ساری مخلوق کی موت واقع ہو جائے گی اور تیسرا نفخہ البعث ہے (یعنی دوبارہ مخلوق زندہ اٹھ کھڑی ہوگی) لہٰذا یہ آیت نفخہ الفزع پر دلالت کرتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۖ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ نفخہ الصعق اور نفخہ البعث دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ یہ موقف علامہ ابن عربی کا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں تین نفخوں کی تصریح کی گئی ہے۔ ہم عنقریب اس کا ذکر کریں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نفخے صرف دو ہیں۔ ایک نفخہ الفزع اور یہی نفخہ الصعق ہے انہوں نے کہا ہے کہ یہ دونوں امر لازم وملزوم ہیں یعنی لوگ گھبرائیں گے اور پھر اسی گھبراہٹ کے سبب مرجائیں گے۔ اسے علامہ قرطبیؒ نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ نفخہ الفزع سے استثنٰی اسی طرح کی گئی ہے جیسے نفخہ الصعق سے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دونوں مقامات پر ارشاد فرمایا "اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ"۔ تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ دونوں سے مراد ایک ہی ہے۔ لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں سے اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ کے ساتھ استثناء دونوں نفخوں کے ایک ہونے پر دلالت نہیں کرتا اور نہ ہی دونوں میں مستثنٰی کے اتحاد پر دلالت کرتا ہے۔ اگرچہ دونوں کاموں میں مستثنٰی منہ ایک ہو۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اس استثناء میں اختلاف ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے اس ارشاد گرامی "اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ" کے بارے پوچھا گیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ شہداء کے بارے ہے کیونکہ وہ اپنے رب کی بارگاہ میں زندہ ہیں کوئی گھبراہٹ ان تک نہیں پہنچے گی(1)۔ پھر علامہ بغویؒ نے کلبی اور مقاتل کا قول ذکر کیا ہے اور وہ حدیث ذکر کی ہے جو ہم عنقریب ذکر کریں گے۔ لیکن علامہ بغویؒ کا اس آیت کے بارے اختلاف کا قول نفخہ الفزع اور نفخہ الصعق کے اتحاد پر مبنی ہے (یعنی ان دونوں سے مراد ایک نفخہ ہے) حالانکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اب ہم استثناء کے بارے وارد ہونے والی احادیث اور آثار ذکر کریں گے۔ ابو یعلیٰ، حاکمؒ اور بیہقیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث نقل کی ہے۔ اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نے جبرائیل امین علیہ السلام سے اس آیت کے بارے پوچھا وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ۔ مِنَ الَّذِيْنَ لَمْ يَشَاْ اللّٰهُ اَنْ يُّصْعِقَهُمْ یعنی کون وہ لوگ ہیں جن پر صعقہ مسلط کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ نہیں چاہے گا؟ تو انہوں نے کہا ان سے مراد شہداء ہیں جو اپنی تلواریں پہنے عرش الٰہی کے ارد گرد کھڑے ہیں(2)۔ محدثین نے فرمایا ہے کہ شہداء کی استثناء صحیح ہے کیونکہ وہ اپنے رب کی بارگاہ میں زندہ ہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ بعض آثار میں اس طرح ہے کہ شہداء وہ ہیں جن کی استثناء خود اللہ تعالیٰ نے فرمادی ہے۔ اسی طرح ہناد بن السری سے مروی ہے اور بیہقی اور نحاس نے معانی القرآن میں حضرت سعید بن جبیر سے اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ کے تحت نقل کیا ہے کہ یہ وہ شہداء ہیں جو عرش کے ارد گرد تلواریں پہنے کھڑے ہیں(3)۔ اور کلبی اور مقاتل نے کہا ہے یعنی حضرت جبرائیل، حضرت اسرافیل اور ملک الموت علیہم السلام(4)۔ اس لیے کہ فریابی نے اپنی تفسیر میں حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ مستدرک حاکم، جلد 2 صفحہ 277 (العلمیہ)

السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ تو صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کون ہیں وہ لوگ جن کی استثناء اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا جبرائیل، میکائیل، ملک الموت، اسرافیل اور حملۃ العرش۔ پس جب اللہ تعالیٰ مخلوق کی ارواح قبض فرمائے گا تو ملک الموت سے فرمائے گا کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا سُبۡحَانَکَ رَبِّیۡ تَبَارَکۡتَ تَبَارَکۡتَ وَتَعَالَیۡتَ ذَاالۡجَلَالِ وَالۡاِکۡرَامِ جبرنیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ تو رب کریم فرمائے گا اسرافیل کی جان لے لے۔ لہٰذا وہ اسرافیل کی جان قبض کر لے گا۔ پھر رب کریم فرمائے گا اے ملک الموت! اب کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کناں ہوگا سُبۡحَانَکَ رَبِّیۡ تَبَارَکۡتَ تَبَارَکۡتَ وَتَعَالَیۡتَ ذَاالۡجَلَالِ وَالۡاِکۡرَامِ جبرنیل، میکائیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ تو رب کریم اسے ارشاد فرمائے گا میکائیل کی جان لے لے۔ لہٰذا وہ میکائیل کی روح قبض کر لے گا۔ پس وہ بہت بڑے ٹیلے کی طرح گر جائے گا۔ پھر رب کریم فرمائے گا اے ملک الموت! کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا جبرئیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ پھر رب کریم فرمائے گا اے ملک الموت! تو بھی مر جا۔ چنانچہ وہ بھی مر جائے گا۔ پھر رب کریم فرمائے گا اے جبرئیل! اب کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا تیری ذات کریم، باقی اور ہمیشہ رہنے والی ہے اور جبرئیل فانی اور مرنے والا ہے۔ تو رب کریم فرمائے گا تیرے لیے بھی تو موت ضروری ہے۔ پس وہ سجدے میں گر جائے گا اور اپنے پر پھڑ پھڑانے لگے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک جبرائیل کی خلقت کو میکائیل کی خلقت پر ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے بہت بڑے ٹیلے کو ایک چھوٹے ٹیلے پر ہوتی ہے (1)۔ بیہقی نے حضرت انسؓ سے فَنُفِخَ فِی الصُّوۡرِ الآیہ کے بارے میں مرفوع روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا جن کی اللہ تعالیٰ نے استثناء فرمائی ہے وہ تین ہیں۔ جبرئیل، میکائیل اور ملک الموت علیہم السلام۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا حالانکہ وہ بہتر جانتا ہے اے ملک الموت! کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا تیری ذات باقی رہنے والی اور کریم ہے تیرا بندہ جبرئیل، میکائیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ تو رب کریم فرمائے گا تو میکائیل کی جان لے لے۔ پھر رب کریم فرمائے گا حالانکہ وہ بہتر جانتا ہے کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا تیری ذات باقی رہنے والی اور کریم ہے اور تیرا بندہ جبرائیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ تو رب کریم فرمائے گا تو جبرئیل کی جان لے لے۔ پھر رب کریم سب کچھ جاننے کے باوجود فرمائے گا اے ملک الموت! اب کون باقی ہے تو وہ عرض کرے گا ایک تیری ہمیشہ رہنے والی کریم ذات باقی ہے اور ایک تیرا بندہ ملک الموت اور وہ مرنے والا ہے۔ تو رب کریم اسے فرمائے گا تو مر جا۔ پھر رب کریم فرمائے گا میں نے ہی مخلوق کی ابتداء کی ہے پھر میں ہی اسے دوبارہ اٹھاؤں گا۔ کہاں ہیں وہ جبر کرنے والے اور تکبر کرنے والے؟ تو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو جواب نہیں دے گا۔ پھر وہ ندا دے گا آج کے دن کس کی بادشاہی ہے؟ تو کوئی بھی اسے جواب نہیں دے گا۔ تو پھر رب کریم فرمائے گا یقیناً اللہ ہی واحد اور قہار ہے۔ پھر دوسری دفعہ صور پھونکا جائے گا تو وہ اٹھ کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں گے۔ (2)

بیہقی نے زید بن اسلم سے روایت نقل کی ہے کہ اس آیت میں بارہ افراد کی استثناء ہے یعنی جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، ملک الموت اور آٹھ حاملین عرش علیہم السلام (3)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے یہ روایت بھی کی جاتی ہے کہ جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام کی روح قبض کی جائے گی پھر حاملین عرش کی۔ پھر حضرت اسرافیل علیہ السلام اور پھر آخر میں ملک الموت کی روح قبض کی جائے گی۔ بیہقی نے مقاتل بن سلیمان سے نقل کیا ہے کہ پہلے میکائیل علیہ السلام کی روح قبض کی جائے گی پھر جبرائیل علیہ السلام کی روح پھر اسرافیل علیہ

1۔ الدر المنثور، زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 310 (العلمیہ)

السلام کی پھر ملک الموت کو حکم ہوگا تو وہ مر جائے گا۔ ابوشیخ نے کتاب العظمۃ میں وہب سے روایت کی ہے کہ یہ چار یعنی جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت علیہم السلام وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیدا کیا ہے انہیں سب سے آخر میں موت دے گا اور پھر سب سے پہلے انہیں زندہ فرمائے گا۔ یہی مدبرات امر اور مقسمات امر ہیں۔ امام سیوطیؒ نے فرمایا کہ ان روایات کے مابین کوئی تعارض موجود نہیں۔ یعنی استثناء کی روایات کو جمع کرنا ممکن ہے کیونکہ یہ تمام مستثنیٰ کے متعلق ہیں۔

میں یہ کہتا ہوں مذکورہ بالا احادیث و آثار نفخۃ الصعق میں واقع ہونے والے استثناء کے بیان میں ہیں نفخۃ الفزع کے بارے نہیں۔ میرے نزدیک نفخۃ الفزع میں جن کی استثناء کی گئی ہے ان پر یہ قول باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا ۚ وَ هُمْ مِّنْ فَزَعٍ یَّوْمَىٕذٍ اٰمِنُوْنَ اور یہ ارشاد گرامی اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓىٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا ۚ وَ هُمْ فِیْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ کیونکہ یہ ان مؤمنین کے بارے نص ہے جنہیں جہنم میں داخل نہیں کیا جائے گا اور جنت میں داخل کیا جائے گا انہیں گھبراہٹ لاحق نہیں ہوگی۔ لیکن نفخۃ فزع کے وقت لوگوں میں سے صرف کفار ہی باقی ہوں گے۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلَی الْاَشْرَارِ (1) (قیامت صرف شریروں پر ہی قائم ہو گی)۔ اسے امام احمدؒ اور مسلمؒ نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ کا مزید ارشاد گرامی ہے: لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی لَا یُقَالَ فِی الْاَرْضِ اللّٰهُ اللّٰهُ (2) (قیامت قائم نہیں ہوگی حتیٰ کہ زمین میں اللہ اللہ نہیں کہا جائے گا (یعنی اللہ اللہ کہنے والا کوئی نہیں ہوگا)۔ اسے امام احمدؒ، مسلمؒ اور ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' قیامت قائم نہیں ہوگی مگر تب جبکہ بیت اللہ شریف کا حج نہیں کیا جائے گا'' (3)۔ اسے عبدالرزاق نے الجامع میں نقل کیا ہے۔ تو آپ ﷺ نے مزید فرمایا: لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یُرْفَعَ الرُّكْنُ وَالْقُرْاٰنُ (4) (''قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ رکن (کعبہ) اور قرآن اٹھا لیا جائے گا۔) اسے سنجری نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ اور اسی پر اور بھی بہت سی احادیث دلالت کرتی ہیں۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے مستثنیٰ کو ارواح شہداء پر محمول کیا ہے کیونکہ وہ اپنے رب کی بارگاہ میں زندہ ہیں۔ لیکن ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کی ارواح بھی اس مستثنیٰ میں داخل ہیں۔ اور انہیں بالیقین گھبراہٹ نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں، طبرانی نے مطولات میں، ابویعلی نے مسند میں، بیہقی نے البعث میں، ابوموسیٰ المدنی نے مطولات میں، علی بن معبد نے کتاب الطاعۃ والعصیان میں، عبد بن حمید اور ابوالشیخ نے کتاب العظمۃ میں حضرت ابوہریرہ ﷺ سے ایک طویل حدیث ذکر کی ہے۔ جس میں تین نفخات کا ذکر ہے۔ پہلا نفخۃ الفزع، دوسرا نفخۃ الصعق اور تیسرا رب العالمین کی بارگاہ میں قیام کا نفخہ۔ پس رب کریم حضرت اسرافیل علیہ السلام کو پہلے نفخہ کا حکم ارشاد فرمائے گا کہ گھبراہٹ طاری کرنے کے لیے اس میں پھونک مار، تو جونہی وہ پھونکے گا تو زمین و آسمان کے باسیوں پر گھبراہٹ طاری ہو جائے گی سوائے ان کے جنہیں اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھنا چاہے گا۔ حتیٰ کہ یہ فرمایا کہ دودھ پلانے والیوں کے دودھ گھبراہٹ کے سبب خشک ہو جائیں گے، حاملہ عورتیں اپنے حمل گرا دیں گی، بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور گھبراہٹ کے سبب شیاطین بھاگتے ہوئے اڑ جائیں گے، اور وہ زمین کے اطراف میں آ جائیں گے۔ وہاں فرشتے ان

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 406 (قدیمی) 2۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 84
3۔ کنز العمال، جلد 14 صفحہ 223 (التراث الاسلامی) 4۔ ایضاً

سے آملیں گے وہ ان کے مونہوں پر ماریں گے تو وہ واپس مڑ جائیں گے۔ اور لوگ ایک دوسرے کو بلاتے ہوئے پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ اور یہی وہ دن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے یوم التناد فرمایا ہے۔ یہاں تک راوی نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس دن مرنے والوں کو کسی چیز کا علم نہیں ہوگا۔ تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کون ہیں وہ لوگ جن کی استثناء اللہ تعالیٰ نے اپنے قول "اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ" میں فرمائی ہے؟۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ شہداء ہیں۔ بے شک گھبراہٹ زندوں کو لاحق ہوگی اور وہ تو اپنے رب کی بارگاہ میں زندہ ہیں اور رزق دیئے جاتے ہیں۔ "وَهُمْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ" اللہ تعالیٰ انہیں اس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ و مامون رکھے گا۔ کیونکہ وہ تو عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے شریر افراد پر مسلط کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ الایہ۔ لہٰذا جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا لوگ اسی حال پر رہیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسرافیل علیہ السلام کو نفخۃ الصعق کے بارے حکم فرمائے گا تو اس کے سبب تمام اہل زمین و آسمان گر جائیں گے مگر وہ محفوظ رہیں گے جن کے بارے اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ ملک الموت عرض کرے گا جن کے بارے تو نے چاہا ان کے سوا تمام زمین و آسمان کے باسی مر گئے ہیں۔ پھر رب کریم فرمائے گا حالانکہ وہ بہتر جانتا ہے کون باقی ہے؟ پھر اس میں بھی جبرئیل امین، میکائیل، حاملین عرش اور ملک الموت علیہ السلام کی موت کا ذکر ہے جیسا کہ اس سے قبل حضرت انسؓ کی حدیث میں گزر چکا ہے۔ پھر آگے طویل حدیث مذکور ہے جس میں اہل جنت کے جنت میں داخل ہونے اور اہل نار کے ہمیشہ دوزخ میں باقی رہنے تک کا ذکر ہے(1)۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ فزع (گھبراہٹ) صرف اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے شریروں پر یعنی جنوں اور انسانوں میں سے شیاطین پر طاری ہوگی۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی آسمان میں تو نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے اس قول "فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ" کا معنی کیا ہے؟ تو اس بارے میں کہتا ہوں کہ اس کا دارومدار فرض گمان کرنے پر ہے یعنی (اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ ان کا کوئی فرد آسمان میں ہوگا تو وہ اس سے محفوظ نہیں رہے گا) یا پھر یہ معنی ہوگا کہ چونکہ شیاطین کبھی کبھی چوری چھپے باتیں سننے کے لیے آسمان کی طرف چلے جاتے ہیں اس لیے یہ فرمایا۔ یا پھر السماء سے مراد بادل ہے۔ کیونکہ السمآء کا اطلاق ہر اس شے پر ہوتا ہے جو تیرے اوپر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ اسے چاہیے کہ وہ چھت تک رسی تان لے۔ تو اس میں السمآء سے مراد تیرے گھر کی چھت ہے۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ اہل آسمان کے گھبرانے والوں میں سے مراد بعض مؤمنین کی ارواح ہیں۔ اور سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى سے مراد انبیاء اور مقربین بارگاہ الٰہی ہیں۔ اور جن کی نفخۃ الصعق سے استثناء کی گئی ہے ان کے بارے صحیح قول وہی ہے جو صاحب المفہم التحقیق نے کہا ہے کہ صعق سے مراد وہ کیفیت ہے جو موت کی نسبت عام ہے۔ یعنی جو ابھی تک نہیں مرے ان کے لیے موت ہے اور جو مر چکے ہیں ان کے لیے غشی ہے۔ یہ عموم مجاز کے قبیلے سے ہے۔ اور یہ غشی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا دیگر انبیاء علیہم السلام پر بھی چھا جائے گی۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو غشی لاحق ہونے کے بارے تردد ہے۔

شیخین نے صحیحین میں، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت نقل کی ہے۔ اور یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ ایک یہودی نے مدینہ طیبہ کے بازار میں کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام لوگوں پر فضیلت دی ہے۔ تو اتنے میں انصار میں سے ایک آدمی نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور اسے طمانچہ دے مارا اور اسے کہا۔ کیا تو یہ قول کہتا ہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ ہمارے

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

درمیان موجود ہیں۔ پھر اس نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ۔ پس میں سب سے پہلے اپنا سر اٹھاؤں گا لیکن میں دیکھوں گا کہ اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام عرش کے پائے کو پکڑ کر کھڑے ہوں گے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ آیا وہ اپنا سر مجھ سے پہلے اٹھائیں گے یا وہ ان میں سے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے استثناء فرمادی ہے۔ تو جب صعق موت اور غشی دونوں معنوں کو شامل ہے اور انبیاء پر غشی طاری ہوگی تو پھر شہداء اور ملائکہ پر بطریق اولیٰ غشی طاری ہوگی۔ ملائکہ میں سے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، ملک الموت اور حاملین عرش مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان پر موت نفخہ کے سبب طاری نہیں ہوگی بلکہ وہ اس کے بعد فوت ہوں گے جیسا کہ حدیث میں گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

۳؎ یعنی زمین اور آسمان کے باسیوں میں سے ہر ایک نفخۃ البعث (دوبارہ اٹھائے جانے کے لیے نفخہ) کے بعد موقف (میدان حشر) میں ظاہر ہوگا۔ یا اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف رجوع کرے گا۔ جمہور نے اٰتُوْهُ کی قرأت صیغہ اسم فاعل ہونے کی بناء پر مد اور تاء کے ضمہ کے ساتھ کی ہے۔ یعنی اَتَوْهُ۔ حفص اور حمزہ نے صیغہ ماضی ہونے کی بناء پر الف کو مد کے اور تاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ مستقبل کے معنی میں ہے۔ لیکن اس کے بالیقین واقع ہونے کی وجہ سے اسے صیغہ ماضی کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا عطف فزع پر ہے۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۭ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾

"اور تو جب (اس روز) پہاڑوں کو دیکھے گا تو گمان کرے گا کہ یہ ٹھہرے ہوئے ہیں ۱؎ حالانکہ وہ چل رہے ہوں گے بادل کی سی چال ۲؎ یہ کاری گری ہے اللہ کی ۳؎ جس نے (اپنی حکمت سے) مضبوط بنایا ہر چیز کو بے شک وہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو ۴؎"

۱؎ اے دیکھنے والے! تو جب نفخہ فزع کے وقت پہاڑوں کی طرف دیکھے گا۔ اس کا عطف يَوْمَ يُنْفَخُ پر ہے یا يَوْمَ نَحْشُرُ پر کہ وہاں تَرٰی ما تَرٰی مقدر ہو۔ تو تو انہیں ایک جگہ ٹھہرا ہوا گمان کرے گا۔ یہ جملہ ترکیب کلام میں تَرٰی کے فاعل سے حال ہے۔ یا اس کے مفعول سے۔ یعنی تو انہیں گمان کرے گا کہ وہ ایک جگہ کھڑے ہیں غیر متحرک ہیں۔

۲؎ یہ جملہ تَحْسَبُهَا کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔ یعنی درآنحالیکہ پہاڑ بادلوں کی رفتار میں چل رہے ہوں گے یہاں تک کہ وہ زمین پر گر جائیں گے۔ اور ہموار ہو جائیں گے۔ اور یہ اس لیے ہوگا کیونکہ بڑے بڑے اجسام جب ایک ہی سمت میں حرکت کرتے ہیں تو ان کی حرکت ظاہر نہیں ہوتی۔

۳؎ یہ مصدر ہے اور سابقہ جملے کے مضمون کی تاکید کے لیے ہے۔ اس میں اس کے علاوہ اور کوئی احتمال نہیں۔ اس کا نام تاکید لنفسہ ہے اور یہ صَنَعَ اللّٰهُ صُنْعًا کے معنی میں ہے۔

۴؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو پختہ اور مضبوط بنایا۔ اور اسے اس طرز پر بنایا جیسے اسے ہونا چاہیے، ابن کثیر اور ابو عمرو نے صیغہ غائب کی بناء پر تفعلون کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے صیغہ خطاب کی بناء پر تاء سے۔ یعنی وہ ہر گنہگار اور فرمانبردار کو اس کے فعل و عمل کے مطابق جزاء دے گا۔ پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾

’’جو شخص نیک عمل لے کر آئے گا لہ تو اسے کہیں بہتر اجر ملے گا اس نیک عمل سے ۲ے اور یہ نیک بندے اس دن گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے ۳ے‘‘

لہ ابومعشر نے کہا ہے کہ ابراہیم بغیر استثناء کے قسم اٹھایا کرتے تھے کہ حسنہ سے مراد لا الہ الا اللہ ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد اخلاص ہے (1) اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد ہر نیکی ہے۔

۲ے کہا گیا ہے کہ مِنْهَا میں مِنْ سببیہ ہے۔ تفضیل کے لیے نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی ایسی شے نہیں جو لا الہ الا اللہ سے بہتر ہو۔ پس معنی یہ ہوگا۔ جو شخص نیک عمل لے کر آئے گا تو اس کو ثواب حاصل ہوگا۔ اور پھر نیک عمل کے سبب عذاب سے محفوظ و مامون رہے گا۔ محمد بن کعب اور عبدالرحمٰن بن زید نے کہا ہے کہ من تفضیلیہ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اس کے لیے اس کی مثل دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا تک اور پھر جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہے گا اسے ثواب ملے گا۔ گویا یہ اس ارشاد کی مثل ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔

۳ے جس دن صور میں پھونکا جائے گا۔ یہ نیک بندے گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے۔ کوفیوں نے فَزَعٍ کو تنوین کے ساتھ نکرہ پڑھا ہے۔ اور يَوْمَئِذٍ کو ظرف ہونے کی بناء پر منصوب۔ اور تنوین تنکیر استغراق کا فائدہ دیتی ہے۔ کیونکہ یہ جملہ نفی کی قوت میں ہے اس لیے کہ اٰمِنُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ وہ نہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ گھبراہٹ میں ہوں گے۔ اور نکرہ جب نفی کے محل میں ہو تو استغراق کا فائدہ دیتا ہے۔ جبکہ دوسروں نے فزع کو بغیر تنوین کے یومئذ کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے اور اضافت استغراق پر زیادہ دلالت کرتی ہے۔ یا پھر یہ اضافت عہد کے لیے ہے کیونکہ اس فزع کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ پس اکثر نے یومئذ کو اضافت کے سبب جر کے ساتھ پڑھا ہے لیکن نافع نے میم کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس لیے کہ یہ مبنی ہے۔ اور اسے یہ بناء اپنے مضاف الیہ کے سبب سے حاصل ہوئی ہے۔

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۭ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾

’’اور جو برائی لے کر آئے گا اس کو منہ کے بل اوندھا پھینک دیا جائے گا آگ میں لہ (اے بدکارو!) کیا تمہیں بدلہ ملے گا بجز اس کے جو تم عمل کرتے تھے ۲ے‘‘

لہ اور جو برائی یعنی شرک لے کر آئے گا فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ میں فا محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ یہ فاء جزائیہ نہیں کیونکہ وہ بغیر قد کے فعل ماضی پر داخل نہیں ہوتی۔ تقدیر کلام اس طرح ہے مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَهٗ جَزَاءُ السَّيِّئَةِ اَوِ اسْتَحَقَّ الْعَذَابَ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ‘‘ (جو برائی لے کر آئے گا تو اس کے لیے برائی کی جزاء ہوگی یا وہ عذاب کا مستحق ہوگا پس انہیں منہ کے بل اوندھا آگ میں پھینک دیا جائے گا)۔ یا پھر منہ سے مراد ان کے نفس اور جان ہے۔ (یعنی انہیں آگ میں پھینک دیا جائے گا)

۲ے یعنی اے بدکارو! تمہیں بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ مگر ان اعمال کا پورا پورا بدلہ جو تم نے کیے۔ کیونکہ شرک سب سے بڑا جرم ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی برائی نہیں اور جہنم سب سے شدید اور سخت بدلہ ہے۔ اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ لہٰذا تقدیر کلام یہ ہوگی کہ انہیں جہنم کا داروغہ کہے گا تمہیں بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر ان ہی اعمال کا جو تم کرتے تھے۔

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ۡ وَّ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

أُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٩١﴾

''مجھے تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں عبادت کروں اس (مقدس) شہر کے رب کی [1] جس نے عزت وحرمت والا بنایا ہے اس کو [2] اور اسی کی ہے ہر شے اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں شامل ہو جاؤں فرمانبرداروں کے زمرہ میں [3]''

[1] اس میں بلدۃ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس میں رب کی اضافت البلدۃ کی طرف کی گئی ہے ایک تو اس شہر کی عظمت وشرف کو ظاہر کرنے کے لیے اور دوسرا اس کا احساس دلانے کے لیے کہ اس میں وہ کعبہ معظمہ ہے جو رب کریم کی خصوصی تجلیات کا مرکز ہے۔

[2] ''الَّذِیْ حَرَّمَهَا'' ترکیب کلام میں رب کی صفت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے حرم اور امن والا بنا دیا اس میں نہ تو کسی کا خون بہایا جا سکتا ہے، نہ کسی پر ظلم کیا جا سکتا ہے، نہ اس کے شکار کو بھگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے درختوں اور گھاس وغیرہ کو کاٹا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ وصف ذکر کر کے قریش پر یہ احسان جتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مسکن ایسی جگہ کو بنایا ہے جو عرب میں ظاہر ہونے والے فتنوں سے امن دینے والی ہے۔

[3] اور اس شہر سمیت ہر شے اسی کی پیدا کی ہوئی ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔ ترکیب کلام میں وَلَهٗ كُلُّ شَیْءٍ کا یا تو حرّمھا پر عطف ہے یا یہ اس کی ضمیر مرفوع مستتر سے حال ہے۔ اس میں اَنْ سے پہلے باء مقدر ہے۔ یعنی مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے جھکنے والوں اور عاجزی کرنے والوں میں سے ہو جاؤں یا دین اسلام پر ثابت اور قائم رہنے والوں میں سے ہو جاؤں۔ اس کا عطف اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ پر ہے۔

وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿٩٢﴾

''نیز (یہ بھی کہ) میں تلاوت کیا کروں قرآن کی [1] پس جو ہدایت قبول کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے ہدایت قبول کرتا ہے [2] اور جو گمراہ ہوتا ہے (تو اس کی قسمت) فرماؤ میں تو صرف ڈرانے والوں سے ہوں [3]''

[1] اور یہ کہ میں ایمان کی طرف دعوت دینے کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کیا کروں۔ یا پھر یہ التلو سے مشتق ہے اس کا معنی اتباع کرنا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ میں قرآن کی اتباع کروں۔ اَنْ اَتْلُوَا القرآنَ کا عطف اَنْ اَكُوْنَ پر ہے۔ اور اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ کا جملہ اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔

علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے رسول معظم ﷺ کو حکم فرمایا کہ وہ ان کے لیے دنیا وآخرت اور قیامت کے احوال کی وضاحت کرنے کے بعد ان سے یہ کہیں۔ تاکہ انہیں یہ احساس ہو جائے کہ آپ نے دعوت کو مکمل کر لیا ہے۔ اور ان ذمہ داریوں کو ادا کر دیا ہے جو آپ پر لازم تھیں۔ لہٰذا اب آپ پر اس کے سوا کچھ باقی نہیں، کہ آپ اپنی شان کے مطابق اپنے رب کی یاد میں مصروف اور اس کی عبادت میں مستغرق رہیں۔ اُمِرْتُ سے پہلے لفظ قل مقدر ہے۔ یعنی آپ کہہ دیجئے کہ مجھے تو اس کا حکم دیا گیا ہے۔

[2] پس جس کسی نے آپ کی دعوت کے سبب ہدایت قبول کی اور اپنے وحدہ لاشریک رب کی عبادت کی جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ تو

اس کے منافع اور فوائد اسے ہی حاصل ہوں گے۔ لہٰذا اس کے لیے قطعاً درست نہیں کہ وہ آپ پر احسان جتلاتا رہے۔

۳؎ اور جو کوئی حق کے راستے سے بھٹک جائے گا اور وہ آپ کی طرف سے دعوت مکمل ہونے کے بعد بھی آپ سے پیچھے ہی رہتا ہے تو اس کو فرما دیجئے۔ میں تو صرف ڈرانے والوں میں سے ہوں۔ یعنی میں تم پر وکیل نہیں ہوں (یعنی میں تمہاری کارستانیوں کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اور نہ ہی تمہاری گمراہی اور ضلالت کا وبال مجھ پر ہوگا کیونکہ مجھ پر تو صرف تم تک پیغام حق پہنچانا اور اس کی تبلیغ کرنا ہے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

''اور آپ کہئے سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں ۱؎ وہ ابھی دکھائے گا تمہیں اپنی نشانیاں تو تم (انہیں) پہچان لو گے ۲؎ اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر ان کاموں سے جو (اے لوگو) تم کیا کرتے ہو ۳؎''

۱؎ اور آپ کہئے کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں کہ اس نے آپ کو نعمت نبوت عطا فرمائی اور فریضہ دعوت وتبلیغ مکمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔

۲؎ اے گمراہ ہونے والو! اللہ تعالیٰ ابھی تمہیں دکھائے گا اپنی نشانیاں جو دنیا میں اس کی حقیقت پر واضح دلالت کرتی ہیں جس کی طرف میں نے تمہیں دعوت دی ہے جیسا کہ غزوۂ بدر میں ہوا کہ ان کے افراد قتل ہوئے، قیدی بنا لئے گئے اور فرشتوں نے اتر کر ان کے چہروں اور پشتوں پر ضربیں لگائیں۔ اسی طرح انہوں نے چاند کو ٹکڑے ہوتا دیکھا اور کنکریوں کو تسبیح پڑھتے سنا۔ اور اسی نوع کی کئی دیگر علامات دیکھیں۔ ان ہی علامات میں سے یہ بھی ہے کہ دآبّۃ کا خروج ہوگا اور کئی دیگر نشانیاں ظاہر ہوں گی۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے سَاُورِيكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ۔ یا پھر معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ عنقریب آخرت میں تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے گا اور فرمایا کہ عنقریب وہ تمہیں آسمانوں، زمین اور تمہارے نفسوں میں اپنی نشانیاں دکھائے گا جیسا کہ یہ ارشاد ہے سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ تو تم پہچان لو گے کہ بے شک یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ لیکن اس وقت کی پہچان تمہیں کوئی نفع نہیں دے گی۔

۳؎ اے محمد! ﷺ نہیں ہے اپ کا رب بے خبر ان کاموں سے جو اے لوگو تم کرتے ہو۔ لہٰذا وہ وقت مقررہ پر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا۔

تمت بالخیر

بفضلہٖ تعالیٰ ترجمہ سورۂ نمل 4 رجب 1420ھ، 13 اکتوبر 1999

بروز بدھ رات سوا دس بجے اختتام پذیر ہوا۔

سورۃ القصص

ایاتھا ۸۸ | سورۃ القصص مکیۃ ۲۸ | رکوعاتھا ۹

سورۃ القصص مکی ہے اور اس کی اٹھاسی آیتیں اور نو رکوع ہیں

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ سے لے کر لَا نَبْتَغِی الْجٰھِلِیْنَ تک کی آیات کے علاوہ سورۃ القصص مکی ہے، اس کی اٹھاسی آیتیں اور نو رکوعات ہیں۔ اس میں اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ کی آیت مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

طٰسٓمّٓ ① تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ②

"طا۔ سین۔ میم۔ یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی[1]۔"

[1] مُبِیْنَ اَبَانَ باب افعال سے اسم فاعل ہے۔ یہ لازم بھی استعمال ہوتا ہے اور متعدی بھی لازم ہونے کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اس کتاب کا اپنے اعجاز کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ ہونا بالکل ظاہر ہے۔ اور متعدی ہونے کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ یہ کتاب اپنے احکام، وعدہ وعید اور اپنے میں موجود قصص کو کھول کر بیان کرنے والی ہے۔

نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ③

"ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو موسیٰ اور فرعون کا کچھ واقعہ ٹھیک ٹھیک ان لوگوں (کے فائدہ) کے لیے جو ایمان لاتے ہیں[1]۔"

[1] ہم اسے آپ پر جبرئیل کی زبان سے پڑھتے ہیں۔ نَتْلُوْا کو مجازاً تنزل کے معنی میں ہونا بھی جائز ہے۔ یعنی ہم اسے جبرئیل کے ذریعے آپ پر نازل کرتے ہیں۔ "مِنْ نَّبَاِ" میں مِنْ بعضیت کے لیے ہے۔ اور بِالْحَقِّ ظرف مستقر نَبَاِ سے حال ہے یعنی مقرونًا بالصدق۔ یعنی موسیٰ اور فرعون کا کچھ واقعے درآنحالیکہ وہ سچا ہے۔ یا پھر یہ ظرف نَتْلُوْا کے فاعل سے حال ہے اَیْ محقین۔ یعنی ہم ٹھیک ٹھیک موسیٰ اور فرعون کا کچھ واقعے آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں۔ یا پھر یہ ظرف لغو ہے اور نَتْلُوْا کے متعلق ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ کیونکہ وہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآىِٕفَةً مِّنْهُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ یَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ④

"بے شک فرعون متکبر (وسرکش) بن گیا سرزمین (مصر) میں اور اس نے بنا دیا وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ[1] وہ کمزور کرنا چاہتا تھا ایک گروہ کو ان میں سے ذبح کیا کرتا ان کے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑ دیتا ان کی عورتوں کو۔ بے شک وہ

فساد برپا کرنے والوں سے تھا ۲؎ ''

۱؎ بے شک فرعون متکبر اور سرکش ہو گیا اس نے سرزمین مصر میں اپنی عظمت اور بڑائی کا اظہار شروع کر دیا۔ یہ جملہ مستانفہ ہے جو اس بعض واقعہ کا بیان ہے۔ اور اس نے اس زمین کے باسیوں کو گروہ گروہ بنا دیا۔ یعنی جب وہ خدمت لینے کا ارادہ کرتا تو وہ گروہ گروہ ہو کر جاتے تھے۔ یا اس نے بعض گروہوں کو بعض کے تابع بنایا ہوا تھا یا اس نے ان کے گروہ بنا دیئے اور ان میں ایک یعنی قبطیوں کو عزت واحترام دے کر معزز بنا دیا اور دوسروں یعنی بنی اسرائیل کو تو ہین وتحقیر کے سبب ادنیٰ اور گھٹیا بنا دیا یا خدمت اور کام کے لیے اس نے مختلف گروہ بنا دیئے اور ہر گروہ سے علیحدہ علیحدہ کام لیتا۔ یا معنی یہ ہے کہ اس نے انہیں مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا اور انہیں آپس میں ایک دوسرے کی عداوت اور دشمنی پر برانگیختہ کیا تا کہ وہ اس کے خلاف متفق نہ ہو سکیں۔ اور قاموس میں ہے شیعة الرجل سے مراد آدمی کے متبعین اور مددگار ہیں اور علیحدہ فرقے ہیں۔(1)

۲؎ وہ ان میں سے ایک گروہ یعنی بنی اسرائیل کو کمزور کرنا چاہتا تھا۔ یَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً کا جملہ جَعَلَ فعل کے فاعل سے حال ہے۔ یا پھر یہ جملہ مستانفہ ہے۔ وہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیا کرتا۔ کیونکہ کسی کاہن نے اسے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل میں سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو تیرے ملک اور بادشاہی کو اپنے قبضے میں لے لے گا (یعنی اس کے سبب تیرا اقتدار اور بادشاہت ختم ہو جائے گی) عبدالرزاق، عبد بن حمید اور ابن منذر نے حضرت قتادہ سے اسی طرح نقل کیا ہے(2)۔ اور ان کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتا۔ ترکیب کلام میں یَسْتَحْیٖ یَسْتَضْعِفُ سے بدل ہے۔ بچیوں کے زندہ چھوڑنے کو استضعاف (کمزور کرنا) کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ وہ اپنے نفسوں کو اس کے ظلم وستم سے بچانے اور اس کا دفاع کرنے سے عاجز اور کمزور تھے۔ بے شک وہ فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اسی لیے اس نے ایک فاسد خیال کی بناء پر انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں سے بہت سی مخلوق کو قتل کرنے کی جرأت کی۔ جبکہ نومولود بچوں کا یہ قتل عام اسے کوئی نفع نہیں دے سکتا تھا، چاہے کاہن نے سچ کہا یا جھوٹ بولا۔

وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۙ۝

'' اور ہم نے چاہا کہ احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں کمزور بنا دیا گیا تھا ملک (مصر) میں ۱؎ اور بنا دیں انہیں پیشوا اور بنا دیں انہیں (فرعون کے تاج وتخت کا) وارث ۲؎ ''

۱؎ اور ہم نے چاہا کہ ہم احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں زمین میں کمزور بنا دیا گیا تھا۔ یعنی ہم نے انہیں اس کی قوت اور طاقت سے بچانا چاہا۔ یہ جملہ ماضی کی حالت کو بیان کر رہا ہے اور اس کا عطف اس حیثیت سے اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا پر ہے کہ یہ دونوں بناء کی تفسیر واقع ہو رہے ہیں۔ یا یہ جملہ یَسْتَضْعِفُ کے فاعل سے حال ہے اور تقدیر عبارت ہے وَنَحْنُ نُرِيْدُ۔ یا پھر اس کا عطف یَسْتَضْعِفُ پر ہے۔ اور اس میں موصوف کے ساتھ رابطہ کے لیے اسم ضمیر کی جگہ پر اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے جو کہ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا ہے۔ ارادہ کو استضعاف کے ساتھ ملانے سے مراد لہ کا ملانا لازم نہیں آتا کیونکہ اس وقت ارادے کا تعلق زمانہ مستقبل کے اعتبار سے تھا اس کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں نجات دلا کر احسان کرنے کا قرینہ موجود ہے تو پھر اسی کا مقارن کے قائم مقام ہونا جائز ہے۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 986 (التراث العربی) 2۔ تفسیر قرطبی زیر آیت ہذا

۲؎ ائمہ سے مراد وہ ہیں جن کی دینی امور میں اقتداء اور پیروی کی جاتی ہے اور بھلائی اور عمل خیر کی طرف دعوت دینے والے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ ائمہ سے مراد حکمران اور بادشاہ ہیں (1)۔ اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَ جَعَلَكُمْ مُلُوْكًا۔ '' اور ہم انہیں وارث بنادیں کیونکہ وہ فرعون کی ملکیت اور اس کی قوم میں سے ہے۔''

وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝۶

'' اور تسلط بخشیں انہیں سرزمین (مصر) میں ۱؎ اور ہم دکھائیں فرعون اور ہامان اور ان کی فوجوں کو ۲؎ ان کی جانب سے (وہی خطرہ) جس کا وہ اندیشہ کیا کرتے تھے ۳؎ ''

۱؎ اور ہم انہیں سرزمین مصر اور شام میں تسلط بخشیں۔ نمکن کا اصلی معنی یہ ہے کسی شے کے لیے ایسی جگہ بنانا جس میں وہ قرار اختیار کر سکے۔ پھر اسے مجازاً مسلط کرنے اور حکم نافذ کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

۲؎ اعمش، حمزہ اور کسائی نے نُرِيَ کو يَرىٰ پڑھا ہے۔ یعنی یاء کو مفتوح اور راء کے فتحہ کو امالہ کے ساتھ۔ اور تینوں اسماء یعنی فرعون، ھامٰن اور جنودھما کو فعل ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے نون مضموم، راء مکسور اور اس کے بعد یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔ اور تینوں اسماء کو مفعول ہونے کی وجہ سے نصب دی ہے۔

۳؎ الحذر کا معنی ہے ضرر اور نقصان سے بچنا۔ چونکہ انہیں یہ خبر دی جا چکی تھی کہ ان کی ہلاکت اور تباہی بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی کے سبب ہوگی اور اس کا خطرہ اور اندیشہ ہمہ وقت انہیں رہتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں وہی کچھ دکھایا جس سے بچاؤ کی وہ تدبیریں کرتے رہتے تھے۔

وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَ لَا تَخَافِيْ وَ لَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۷

'' اور ہم نے الہام کیا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف ۱؎ کہ اسے (بے خطر) دودھ پلاتی رہ ۲؎ پھر جب اس کے متعلق تمہیں اندیشہ لاحق ہو تو ڈال دینا اسے دریا میں اور نہ ہراساں ہونا اور نہ غمگین ہونا۔ یقیناً ہم لوٹا دیں گے اسے تیری طرف اور ہم بنانے والے ہیں اسے رسولوں میں سے ۳؎ ''

۱؎ اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف الہام کیا۔ آپ کی والدہ کا نام یوخابذ بنت لاوی بن یعقوب علیہ السلام تھا۔ جیسا کہ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے۔ اور اس پر اجماع ہے کہ آپ کی والدہ کے ذہن میں یہ بات وحی نبوت کے سبب القاء نہیں کی گئی کیونکہ نبی تو صرف مرد ہو سکتا ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں بات ڈالی (2) اصطلاح صوفیہ میں یہی الہام کہلاتا ہے۔ اور اسی کی جنس سے وہ سچے خواب بھی ہیں جو یقین اور اطمینان قلب کا موجب ہوتے ہیں۔ وہ بھی الہام کے قبیلے سے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ الہام بھی اسباب علم میں سے ہے، اگرچہ وہ علم ظنی ہوتا ہے اور ایسے نیک افراد کا الہام معتبر ہوتا ہے جن کے دل پاک ہوں اور نفس مطمئن ہو۔ اور وسوسہ اور الہام کے درمیان فرق یہ ہے کہ الہام سے یقین اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

جبکہ وسوسہ سے یہ حاصل نہیں ہوتا۔

۲؎ اَنْ اَرْضِعِیْهِ میں اَنْ مفسرہ ہے اَوْحَیْنَا کے لیے۔ کیونکہ اس میں قول کا معنی موجود ہے۔ یا پھر یہ اَنْ مصدریہ ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ تو موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلاتی رہ جتنا اسے چھپانا تیرے لیے ممکن ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ نے کتنی مدت دودھ پلایا۔ اس کے بارے ایک قول آٹھ ماہ ہے دوسرا چار ماہ اور تیسرا قول تین مہینے کا ہے کہ وہ آپ کو اپنی گود میں دودھ پلاتی تھیں اور آپ علیہ السلام نہ تو روتے تھے اور نہ ہی حرکت کرتے تھے۔

۳؎ پھر جب اس کے متعلق تمہیں اندیشہ لاحق ہو کہ اس کے بارے علم ہو جائے گا تو اسے دریا میں ڈال دینا۔ اور اس سے مراد دریائے نیل ہے۔ اور اس کے ضائع ہونے کا خوف نہ کرنا اور اس کے فراق میں غمزدہ نہ ہونا، یقیناً ہم عنقریب ہی اسے تیری طرف لوٹا دیں گے اس طرح کہ تو انہیں بالکل محفوظ پائے گی اور ہم اسے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں۔

حضرت عطاء اور ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب مصر میں بنی اسرائیل کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی، انہوں نے لوگوں پر ظلم وستم شروع کر دیا۔ ایسے اعمال میں مصروف ہو گئے جو معصیت اور گناہ تھے وہ نہ کسی کو نیکی کا حکم دیتے اور نہ برائی سے روکتے تو ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے ان پر قبطیوں کو مسلط کر دیا۔ پس وہ ان پر ایسے غالب آئے کہ انہیں انتہائی کمزور کر دیا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان کے تسلط سے نجات دلائی (1)۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لیے آپ کو جنم دینے کا وقت قریب آیا۔ تو آپ کی دائی بھی ان دائیوں میں سے تھی جنہیں فرعون نے بنی اسرائیل کی حاملہ عورتوں پر مقرر کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے آپ کی والدہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ جب انہیں دردزہ شروع ہوا۔ تو انہوں نے اسے بلا بھیجا۔ اور کہا بچے کی ولادت ہونے والی ہے اور اس کیفیت سے تو واقف ہے تیری میرے ساتھ جو دوستی ہے آج مجھے اس کا فائدہ ہونا چاہیے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپ کی دایہ نے آپ کا علاج کیا۔ پس جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر تشریف فرما ہوئے تو آپ کی دونوں آنکھوں کے درمیان سے ظاہر ہونے والے نور نے اسے مدہوش کر دیا، اس کا ہر ہر جوڑ کانپنے لگا اور اس کے ساتھ ہی موسیٰ علیہ السلام کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی۔ پھر اس نے کہا اے میری دوست! جب تیری دعوت پر میں تیرے پاس آئی تو میرے پیچھے تیرے بچے کو قتل کرنے والے موجود تھے۔ لیکن اب میں تیرے بچے کی اتنی محبت اپنے دل میں پا رہی ہوں کہ اس کی مثل کسی کی محبت میں نے نہیں پائی۔ لہٰذا تو اپنے بیٹے کی حفاظت کر۔ میں اسے دیکھ رہی ہوں کہ اس کی مدد کی گئی ہے۔ پس جب دایہ آپ کے گھر سے نکلی تو کسی جاسوس نے دیکھ لیا۔ تو وہ آپ کے دروازے پر آ گئے تا کہ وہ آپ کی والدہ کے پاس اندر داخل ہو جائیں۔ تو یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا اے اماں! یہ دروازے پر سپاہی کھڑے ہیں۔ چنانچہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو کپڑے میں لپیٹا اور جلتے تنور میں ڈال دیا اور اس دوران اس کی عقل ایسے گم ہو گئی کہ وہ سمجھ ہی نہ سکی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ پس اتنے میں سپاہی اندر داخل ہو گئے تنور جل رہا ہے اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو دیکھا کہ نہ تو ان کی رنگت تبدیل ہوئی ہے اور نہ ہی انہیں دودھ اترا ہے۔ انہوں نے آپ سے پوچھا وہ دایہ آپ کے پاس کیوں آئی تھی؟ تو آپ نے فرمایا وہ میری دوست ہے میری ملاقات کے لیے آئی تھی۔ پس یہ سن کر وہ چلے گئے اور اس کے ساتھ ہی آپ کی عقل بھی واپس لوٹ آئی۔ تو اس وقت آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے پوچھا بچہ کہاں ہے؟ اس نے کہا مجھے تو معلوم نہیں تو اتنے میں آپ نے تنور سے بچے کے

رونے کی آواز سنی۔ آپ دوڑی ہوئی اس کی طرف گئیں تو کیا دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر آگ کو اتنا ٹھنڈا کر دیا ہے جو سلامتی والی ہے۔ پس آپ نے اطمینان سے اپنے بچے کو اٹھالیا۔

راوی کہتے ہیں کہ پھر جب موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے دیکھا کہ فرعون بچوں کی تلاش میں بہت زیادہ کوشاں ہے تو انہیں اپنے لخت جگر کے بارے بھی خوف لاحق ہوا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ وہ بچے کے لیے ایک صندوق لے اور بچے کو اس میں بند کر کے پھر اسے دریائے نیل میں ڈال دے۔ چنانچہ آپ فرعون کی قوم کے ایک بڑھئی کے پاس گئیں اور اس سے چھوٹا سا صندوق خریدا۔ اس بڑھئی نے آپ سے پوچھا تو اس صندوق کو کیا کرے گی۔ تو آپ نے جھوٹ بولنا پسند نہ کیا اور اسے سچ سچ بتا دیا کہ میں اس میں اپنے لخت جگر کو چھپاؤں گی۔ اس نے پوچھا کیوں؟ تو آپ نے کہا میں اس کے بارے فرعون کے ظلم سے خوفزدہ ہوں۔ جب آپ صندوقچہ خرید کر واپس چلیں تو وہ بڑھئی ان سپاہیوں کی طرف چلا گیا جو بچوں کو قتل کرنے پر مامور تھے۔ تاکہ انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے واقعہ سے مطلع کرے۔ چنانچہ جب اس نے وہاں پہنچ کر کلام کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی اور وہ گفتگو نہ کر سکا وہ اپنے ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھانے لگا لیکن سپاہیوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جب اس نے انہیں خوب پریشان کیا تو ان کے سردار نے کہا اسے مار پیٹ کر یہاں سے نکال دو۔ ہوا یہ کہ جب بڑھئی اپنی جگہ واپس پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی قوت گویائی واپس کر دی اور وہ کلام کرنے لگ گیا۔ وہ دوبارہ چل پڑا تاکہ ان سپاہیوں کو اس واقعہ سے باخبر کرے اب کی بار اللہ تعالیٰ نے اس کی قوت گویائی کے ساتھ ساتھ قوت بصارت کو بھی سلب کر لیا۔ چنانچہ نہ تو وہ بول سکتا تھا اور نہ ہی کسی شے کو دیکھ سکتا تھا۔ نتیجہ وہی ہوا کہ انہوں نے اسے مارا پیٹا اور وہاں سے نکال دیا۔ اور وہ گرتا پڑتا ایک وادی میں جا پہنچا اور اس میں حیران و پریشان پھرتا رہا۔ اب اس نے پختہ ارادہ کیا کہ اگر اس کی زبان اور بصارت واپس لوٹا دی جائے تو وہ قطعاً آپ کے بارے کسی کو آگاہ نہیں کرے گا اور آپ جہاں بھی ہوں گے ساتھ ساتھ رہ کر آپ کی حفاظت کرے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صدق نیت کو پہچان کر اس کی بصارت اور قوت گویائی کو اس پر واپس لوٹا دیا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو گیا۔ اور عرض کی اے میرے پروردگار! تو اس صالح اور نیک بندے پر میری راہنمائی فرما۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی راہنمائی فرمائی۔ وہ وادی سے نکلا اور آپ پر ایمان لایا اور تصدیق بھی کی۔ اور یہ یقین کر لیا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوا۔(1)

حضرت ابن عباسؓ وغیرہ نے کہا کہ ان دنوں فروہب بن منبہ نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ آپ سے حاملہ ہوئیں تو آپ نے تمام لوگوں سے اس معاملہ کو چھپا کر رکھا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی بھی آپ کے حمل پر مطلع نہ ہو سکا۔ یہ وہ شے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے چھپایا، جب اس نے بنی اسرائیل پر احسان کرنے کا ارادہ فرمایا۔ جس سال میں آپ کی ولادت ہوئی یہ وہی سال ہے جس میں فرعون نے دائیوں کو بھیجا تاکہ وہ عورتوں کا جائزہ لیں۔ چنانچہ اس نے عورتوں کی ایسی تفتیش اور چھان بین کرائی جیسی اس سے قبل کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود کہ آپ کی والدہ حاملہ تھیں لیکن نہ تو ان کا پیٹ پھولا، نہ رنگ تبدیل ہوا اور نہ ہی انہیں دودھ اترا۔ نتیجۃً دائیاں ان سے کوئی تعرض نہ کر سکیں۔ جب وہ رات آئی جس میں آپ کی ولادت ہوئی۔ اس وقت نہ تو ان کے پاس کوئی محافظ تھا اور نہ ہی کوئی دایہ تھی۔ اور آپ کی بہن مریم کے سوا کوئی اس پر مطلع نہیں ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی کی اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ الآیۃ چنانچہ تین ماہ تک آپ کی والدہ نے آپ کو چھپائے رکھا اور اپنی گود میں ڈال کر دودھ پلاتی رہیں آپ نہ تو روتے تھے اور نہ حرکت کرتے تھے۔ جب ماں کو آپ کے بارے شدید خطرہ لاحق ہوا۔ تو تب انہوں نے آپ کے لیے ایک سر بند صندوقچہ لیا جس میں تارکول سے طلاء کیا گیا تھا انہوں نے اس میں آپ کے لیے بستر لگا کر آپ کو اس میں رکھ دیا۔ اور پھر بند کر کے رات کے وقت سمندر میں ڈال دیا۔(1)

عون کی صرف ایک بیٹی تھی اس کے سوا اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ لہٰذا وہ اس کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ محبوب اور پیاری تھی۔ ہر روز اس کی تین حاجات اور خواہشات ہوتیں جنہیں وہ فرعون کے پاس پیش کر کے پورا کراتی۔ اسے شدید برص کی بیماری تھی۔ فرعون نے اس کے علاج کے لیے سارے مصر سے اطباء اور جادوگروں کو اکٹھا کیا۔ جب انہوں اس کے معاملہ میں غور و فکر کی۔ تو اسے مخاطب ہو کر کہا اے ملکہ! تو صحت یاب نہیں ہو گی مگر دریا کی سمت سے۔ دریا میں انسان کی مثل کوئی چیز پائی جائے گی۔ اس کا لعاب لے لیا جائے گا اور وہ اس کے برص کے داغوں پر لگایا جائے گا تو یہ صحت یاب ہو جائے گی۔ اور یہ فلاں دن فلاں ساعت میں اس وقت ہو گا جب سورج نکل رہا ہو گا۔ پس دوسرے دن پیر کا دن تھا فرعون نے دریائے نیل کے کنارے اپنے بیٹھنے کی جگہ تیار کرائی اور وہاں جا کر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی اس کی بیوی آسیہ بنت مزاحم بھی تھی۔ فرعون کی بیٹی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ آئی اور دریا کنارے آ کر بیٹھ گئی۔ وہ آپس میں کھیلنے لگیں اور دریا کا پانی اپنے چلوؤں پر لے کر ایک دوسرے کے چہروں پر پھینکنے لگیں۔ اچانک دریا میں ایک صندوق آتا دکھائی دیا جسے دریا کی موجیں دھکیل رہی تھیں۔ فرعون نے دیکھ کر کہا یہ دریا میں کوئی شے ہے جو درخت سے متعلق ہے۔ اسے میرے پاس لے آؤ۔ ہر جانب سے کشتیوں نے اسے بڑی تیزی سے گھیر لیا یہاں تک کہ اسے لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے اسے کھولنے کی بہت زیادہ کوشش کی لیکن اس پر قادر نہ ہو سکے۔ پھر انہوں نے اسے توڑنے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ اتنے میں آسیہ قریب ہوئیں تو انہوں نے صندوق کے اندر سے ایسا نور دیکھا، جسے ان کے سوا کسی اور نے نہیں دیکھا۔ جب انہوں نے صندوق کھولنے کی کوشش کی تو وہ کھل گیا۔ تو کیا دیکھا کہ اس میں ایک چھوٹا سا بچہ اپنے بچھونے پر لیٹا ہوا ہے اور اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان میں ایک نور چمک رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی خوراک اس کے دونوں انگوٹھوں میں رکھی ہوئی ہے جن میں سے وہ دودھ چوس رہا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی محبت آسیہ کے دل میں ڈال دی۔ فرعون بھی آپ سے محبت کرنے لگا اور آپ پر مہربان ہو گیا۔ اور ساتھ ہی فرعون کی بیٹی بھی ادھر آ پہنچی۔ پس جونہی انہوں نے بچے کو صندوق سے باہر نکالا، تو فرعون کی بیٹی نے لپک کر آپ کے لعاب کو حاصل کیا اور اپنے برص کے نشانوں پر لگا دیا۔ وہ فوراً تندرست ہو گئی۔ تو وہ آپ کو بوسے دینے لگی اور اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ یہ دیکھ کر جادوگروں نے فرعون کو کہا اے بادشاہ ہمارا خیال یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا یہی وہ بچہ ہے، جس سے بچنے کی تو کوشش کر رہا ہے۔ اسے اس خوف کی وجہ سے دریا میں پھینک دیا گیا ہے کہ تو اسے قتل کر دے گا۔ چنانچہ فرعون نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر آسیہ نے کہا قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ۖ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا (یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے تم اسے قتل نہ کرو قریب ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنا لیں)۔ آسیہ کے پاس کوئی اولاد نہیں تھی چنانچہ انہوں نے فرعون سے موسیٰ علیہ السلام کو مانگ لیا۔ تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام انہیں ھبہ کر دیئے۔ اور ساتھ یہ فرعون نے کہا مجھے اپنی ذات کے لیے اس کی

کوئی ضرورت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر فرعون بھی اس دن کہہ دیتا کہ یہ اسی طرح میرے لیے بھی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے جیسے تیرے لیے ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی ایسے ہی ہدایت عطا فرما دیتا جیسے کہ اس نے آسیہ کو عطا فرمائی۔ پھر آسیہ کو کہا گیا اس بچے کا نام رکھ دیجئے تو اس نے کہا میں نے آپ کا نام موسیٰ رکھا۔ کیونکہ ہم نے اسے پانی اور درختوں کے درمیان سے پایا۔ پس "مو" سے مراد پانی اور "سا" سے مراد درخت ہے۔(1)

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ۞

"(پس دریا سے) نکال لیا اسے فرعون کے گھر والوں نے تا کہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور باعث رنج والم بنے ۱؎ بیشک فرعون، ھامان اور ان کے لشکری خطا کار تھے ۲؎"

۱؎ لِيَكُوْنَ میں لام عاقبت کے لیے ہے۔ اور کسی بھی کام کا انجام اور نتیجہ اس غرض کے مشابہ ہوتا ہے جو اس فعل کا باعث بنتی ہے تا کہ اس کا وقوع متحقق اور ثابت ہو جائے (تو معنی یہ ہوا کہ) فرعون کے گھر والوں نے اسے دریا سے نکال لیا تا کہ انجام کار وہ ان کے لیے دشمن ہو جائے جو ان کے مردوں کو قتل کر دے اور باعث رنج والم بن جائے، یعنی ان کی عورتوں کو باندیاں بنا لے۔ حمزہ اور کسائی نے اسے حاء کے ضمہ اور زاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے یعنی حُزْنًا۔ اور باقیوں نے دونوں حرفوں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور مصدر میں یہ دونوں لغتیں ہیں اور یہاں مصدر بمعنی فاعل ہے۔

۲؎ بے شک فرعون اس کا وزیر ہامان اور ان کے لشکری ہر شے میں خطا کار تھے۔ پس ان میں سے کسی کو چھوڑا نہیں گیا ان میں سے ہزاروں افراد موسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے قتل کیے گئے۔ پھر وہ آپ کو پکڑ کر آپ کی پرورش کرنے لگے تا کہ آپ بڑے ہو کر ان سے وہ کچھ کریں جس سے وہ بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ چونکہ وہ گنہگار تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ سزا دی کہ ان کے دشمن کی پرورش ان ہی کے ہاتھوں سے کرائی۔ یہ جملہ معترضہ ہے یا تو ان کی خطا کی تاکید کے لیے ہے یا پھر اس سبب کو بیان کرنے کے لیے جس کی وجہ سے انہیں اس آزمائش میں مبتلا کیا گیا۔

وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۞

"اور کہا فرعون کی بیوی نے (اے میرے سرتاج) ۱؎ یہ بچہ تو میری اور تیری آنکھوں کے لیے ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرنا ۲؎ شاید یہ ہمیں نفع دے یا ہم اسے اپنا فرزند بنا لیں ۳؎ اور وہ (اس تجویز کے انجام کو) نہ سمجھ سکے ۴؎"

۱؎ اس کا عطف فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ پر ہے۔ وھب بن منبہ نے کہا ہے کہ جب صندوق فرعون کے سامنے رکھا گیا اور انہوں نے اسے کھولا اور موسیٰ علیہ السلام کو اس میں پایا۔ تو جونہی فرعون نے آپ کی طرف دیکھا تو کہا یہ عبرانی ہے اور دشمنوں میں سے ہے۔ چنانچہ وہ آپ پر غصے ہونے لگا اور کہنے لگا یہ بچہ بچ کیسے گیا ہے؟ فرعون نے بنی اسرائیل کی ایک عورت سے نکاح کیا ہوا تھا جسے آسیہ بنت مزاحم کہا جاتا تھا وہ انتہائی شریف عورتوں میں سے تھی اور انبیاء علیہم السلام کی بیٹیوں میں سے تھی۔ وہ مساکین کے لیے تو ماں تھی ان سے حد

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

درجہ شفقت اور رحم کرتی تھی، ان پر صدقہ کرتی اور انہیں مال و منال عطا کرتی تھی۔ ان نے فرعون سے کہا اس حال میں کہ وہ اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی اس بچے کی عمر ایک سال سے زائد ہے اور تو نے تو اس سال پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا تو اسے چھوڑ دے یہ میرے لیے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔(1)

۲ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ "لَا تَقْتُلُوْهُ" میں صیغہ جمع کے ساتھ خطاب تعظیم کے لیے ہے۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ اس نے کہا یہ تو ہمارے پاس ایک دوسری سرزمین سے آیا ہے، یہ بنی اسرائیل میں سے نہیں۔

۳ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ قول باری تعالیٰ لَا تَقْتُلُوْهُ کی علت ہے کیونکہ اس میں یمن و برکت کی علامات اور نفع کے دلائل موجود ہیں۔ اور وہ یہ تھے کہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس بچے کی آنکھوں کے درمیان نور ہے۔ یہ اپنے ہاتھ کے انگوٹھوں سے دودھ چوستا ہے اور اس کا لعاب لگانے سے برص کے نشانات مٹ چکے ہیں۔ یا ہم اسے بیٹا بنالیں کیونکہ یہ اس اہل ہے۔ لہٰذا ان تمام نے اس کی بات تسلیم کر لی۔

۴ اس میں ان دریا سے نکالنے والوں کی حالت بیان کی جارہی ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ درآنحالیکہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی ہلاکت اور بربادی اسی کے ہاتھوں ہوگی۔ چنانچہ فرعون نے اسے زندہ چھوڑ دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں اس بچے کی محبت ڈال دی۔ ابن جریر نے محمد بن قیس سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ فرعون نے یہ کہا تھا یہ تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لیے نہیں۔ اور اگر وہ یہ کہتا کہ یہ میرے لیے ایسے ہی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے جیسے تیرے لیے۔ تو اللہ تعالیٰ اسے بھی ایسے ہی ہدایت عطا فرمادیتا جیسے اس کی بیوی کو عطا فرمائی(2)۔ اور ابن وہب نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا دشمن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے اسی طرح کہہ دیتا۔ جیسے آسیہ نے کہا تھا عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ (کہ امید ہے یہ ہمیں نفع دے) تو اللہ تعالیٰ ضرور اسے نفع دیتا۔ لیکن اس نے تو اس شقاوت اور بدبختی کی وجہ سے انکار کر دیا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے لکھ دی تھی۔(3)

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ۭ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰي قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ⑩

"اور موسیٰ کی ماں کا دل بے قرار ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ ظاہر کر دے اس راز کو۔ اگر ہم نے مضبوط نہ کر دیا ہوتا اس کے دل کو۔ تا کہ وہ بنی رہے اللہ کے وعدہ پر یقین کرنے والی۔"

۱ یہاں اَصْبَحَ صَارَ کے معنی میں ہے اور اس کا عطف قَالَتِ امْرَاَةُ فِرْعَوْنَ پر ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے سنا کہ وہ فرعون کے ہاتھوں میں آ گئے ہیں تو اس کا دل شدت خوف اور غم سے عقل سے خالی ہو گیا (یعنی بہت زیادہ بے قرار ہو گیا) جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ" یعنی ان کے دل خالی ہیں ان میں عقل باقی نہیں ہے۔ اور اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ ان کا دل موسیٰ علیہ السلام کی یاد اور آپ کی فکر کے سوا ہر شے سے خالی ہو گیا۔ اور حسن نے کہا ہے کہ فَارِغًا کا معنی ہے کہ وہ اس وحی کو بھول گئیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اس وقت فرمائی جب آپ کو دریا میں پھینکنے کا حکم ارشاد فرمایا(5)۔ کہ "وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ" (اور نہ ہراساں ہونا اور نہ غمگین ہونا یقیناً ہم لوٹا دیں گے اسے تیری طرف، اور ہم اسے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں) اتنے میں شیطان اس کے پاس آیا اور کہا یہ تو ناپسند کرتی ہے کہ فرعون تیرے بیٹے کو قتل کرے حالانکہ اس کا

قتل کرنا تیرے لیے باعث اجر وثواب ہوتا۔ اور اب تو نے خود اسے قتل کر دیا ہے کہ اسے دریا میں پھینک کر غرق کر دیا۔ پس جب ان کے پاس یہ خبر پہنچی کہ دریائے نیل میں سے فرعون نے بچے کو پالیا ہے تو کہنے لگی وہ تو اپنے دشمن کے ہاتھ آ گیا ہے۔ نتیجۃً اس بہت بڑی آزمائش نے اسے وہ وعدہ بھلا دیا جو اللہ تعالیٰ نے اس سے کیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ شاید اس کے غمگین ہونے کی علت یہ تھی کہ جو اسے الہام ہوا ہے وہ غلط ہے۔ کیونکہ اولیاء کا الہام دلیل ظنی ہوتا ہے۔ لہٰذا الہام میں خطا کے احتمال نے انہیں گھبرا دیا۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اس کا دل غم سے خالی ہو گیا کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی صداقت کا یقین تھا۔ لیکن قتیبی نے اس معنی کا انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے یہ معنی کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ آگے یہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ (1)

۲؎ اس میں اِنْ مخففه عن المثقله ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان ہے۔ اور لتبدی پر لام فارقہ ہے (یعنی اِن نافیہ اور اِن مخففہ کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے) معنی یہ ہے کہ قریب تھا کہ وہ شدت غم کی وجہ سے یہ اظہار کر دیتی کہ موسیٰ اس کا بیٹا ہے۔ جیسا کہ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ بے شک قریب تھا کہ وہ یہ کہہ دیتی ہائے میرے بیٹے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ جب اس نے صندوق کو دیکھا کہ دریا کی ایک موج اسے اوپر اٹھاتی ہے اور دوسری اسے نیچے لے جاتی ہے تو اسے ان کے غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تو قریب تھا کہ وہ اپنی محبت اور شفقت کی بناء پر چیخ اٹھتی اور حقیقت حال ظاہر ہو جاتی۔ اور کلبی نے کہا ہے کہ قریب تھا وہ یہ ظاہر کر دیتی کہ یہ اس کا بیٹا ہے اور یہ اس وقت ہوا جب اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جوان ہونے کے بعد لوگوں کو یہ کہتے سنا موسیٰ بن فرعون (یعنی موسیٰ فرعون کا بیٹا ہے) تو یہ بات ان پر اتنی شاق اور گراں گزری کہ قریب تھا وہ کہہ دیتیں یہ تو میرا بیٹا ہے (2)۔ آیت کا معنی اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے یہ سنا کہ فرعون نے انہیں اپنا بیٹا بنا لیا ہے تو اس کا دل غم اور پریشانی سے خالی ہو گیا۔ اور اس سے اسے اس حد تک فرحت و مسرت ہوئی کہ قریب تھا کہ وہ یہ اظہار کر دیتی کہ یہ اس کا بیٹا ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت نقل کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا کیا میں تمہاری راہنمائی کروں ایسے گھر والوں کی طرف جو تمہارے لیے اس کی پرورش کریں اور وہ اپنی ماں کو لے آئی۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کا دودھ پینا شروع کر دیا تو یہ قریب تھا کہ وہ کہہ دیتی یہ میرا بیٹا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے بچا لیا (3)۔ اور ابو عبیدہ نے آیت کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل خوف اور حزن سے خالی ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا تھا لَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ۔ اور اسے اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ پر اتنا پختہ یقین تھا کہ قریب تھا وہ یہ ظاہر کر دیتی یہ اس کا بیٹا ہے۔ یا یہ اظہار کر دیتی کہ بذریعہ الہام اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ اسے میری طرف واپس لوٹا دے گا اور اسے مرسلین میں سے بنائے گا۔

۳؎ عَلٰى قَلْبِهَا ظرف لغو رَبَطْنَا کے متعلق ہے اور یہ رَبَطْنَا بتاویل مصدر مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے لَوْلَا رَبْطُنَا عَلٰى قَلْبِهَا مَوْجُوْدٌ (یعنی اگر ہمارا تسلط اس کے دل پر موجود نہ ہوتا) یا پھر ظرف مستقر مبتدا کی خبر ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہو گی لَوْلَا رَبْطُنَا ثَابِتٌ عَلٰى قَلْبِهَا (اگر اس کے دل پر ہمارا تسلط ثابت نہ ہوتا) تو قریب تھا کہ وہ حقیقت حال ظاہر کر دیتی۔ یعنی اگر ہم اس کے دل کو گھبراہٹ اور پریشانی کے وقت صبر کرنے یا پہلی اور دوسری تاویل کے مطابق خوشی اور مسرت کو چھپانے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

کے لیے یا پھر ابوعبیدہ کی تاویل کے مطابق اسرار خداوندی کو مخفی رکھنے کے لیے پختہ اور مضبوط نہ کرتے تو قریب تھا وہ حقیقی معاملہ کا اظہار کر دیتی۔ یہاں لَوْلَا کا جواب محذوف بھی ہے اس کا ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی لا بدت به۔

۳ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ربطنا کے متعلق ہے۔ یعنی ہم نے اس کے دل کو حزن وملال صبر کرنے اور فرحت وانبساط کو چھپانے کے لیے مضبوط اور پختہ کر دیا تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ یا یہ اَصْبَحَ کے متعلق ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل خوف اور حزن سے خالی ہو گیا تا کہ وہ ان مومنین میں سے ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے ساتھ پختہ یقین رکھتے ہیں۔ اور جو وضاحت ہم نے ذکر کی ہے اس سے قتیبی کا اعتراض ختم ہو جاتا ہے جو اس نے ابوعبیدہ کی تاویل پر کیا تھا۔ اس صورت میں لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا جملہ معترضہ ہے۔

یوسف بن حسین نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو دو چیزوں کا حکم دیا گیا، دو چیزوں سے منع کیا گیا اور دو چیزوں کی بشارت دی گئی لیکن کسی بھی شے نے اسے نفع نہیں دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت فرمائی، اس کے دل کو مضبوط کیا اور شدۃ غم یا خوشی سے حاصل ہونے والے اضطراب کو سکون عطا کیا تا کہ وہ ان مومنین میں سے ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے ساتھ پختہ یقین اور اعتماد رکھتے ہیں نہ کہ وہ فرعون کے آپ کو بیٹا بنانے پر اعتماد کرے۔

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۡ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۙ﴿۱۱﴾

''اور اس نے کہا موسیٰ کی بہن سے کہ اس کے پیچھے پیچھے ہو لے ۱؎ پس وہ اسے دیکھتی رہی دور سے اور وہ اس (حقیقت کو) نہ سمجھتے تھے ۲؎''

۱؎ اس کا عطف اصبح پر ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے ان کی بہن مریم بنت عمران سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے ہو لے اور اس کی اطلاع رکھے۔

۲؎ فَبَصُرَتْ بِهٖ کا معطوف علیہ محذوف ہے تقدیر عبارت یہ ہے فقصت فبصرت له (پس اس نے ایسا ہی کیا اور اسے دور سے دیکھتی رہی)۔ ترکیب کلام میں یہ ضمیر مرفوع یا ضمیر مجرور میں سے کسی سے حال ہے۔ اس واقعہ میں یہ بھی ہے کہ بے شک وہ ایک طرف کچھ فاصلے پر چلتی بھی رہی اور نظر بچا کر دیکھتی بھی رہی اور محسوس یہ ہو رہا تھا کہ وہ نہیں دیکھ رہی۔ اور وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے کہ یہ اس کی بہن ہے اور یہ اس کی تاک میں ہے۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اور ہم نے حرام کر دیں اس پر ساری دودھ پلانے والیاں اس سے پہلے ۱؎ تو موسیٰ کی بہن نے کہا کیا میں پتہ دوں تمہیں ایسے گھر والوں کا جو اس کی پرورش کریں تمہاری خاطر ۲؎ اور وہ اس بچے کے خیر خواہ بھی ہوں گے ۳؎''

۱؎ اس کا عطف بَصُرَتْ پر ہے۔ اور یہاں تحریم سے مراد منع تکوینی ہے تکلیفی نہیں۔ اور مَرَاضِع یا تو مُرْضِع کی جمع ہے یعنی ہم نے اس سے ہر دودھ پلانے والی کا دودھ روک لیا۔ پس اس نے ان میں سے کسی کا دودھ نہیں پیا۔ یا یہ مَرْضِع بالفتح کی جمع ہے اس بناء

پر یہ مصدر میمی ہے اور اس کا معنی رضاع ہے یا یہ اسم ظرف ہے اور اس کا معنی پستان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ فرعون کی بیوی نے یہ قصد کیا کہ دنیا بھر سے اسے کوئی ایسی عورت ملے جو موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلا سکے۔ لہٰذا مسلسل کئی دودھ پلانے والی آئیں لیکن موسیٰ علیہ السلام نے کسی کے پستان پر منہ نہیں رکھا۔ یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے آپ کو اس حال میں دیکھ لیا۔ اور واقعہ میں یہ بھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ راتیں اسی طرح گزار دیں اور کسی کا دودھ نہیں پیا بلکہ چیختے رہے۔(1)

۲۔ فَقَالَتْ کا عطف حرّمنا پر ہے۔ تو آپ کی بہن نے کہا کیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کا پتہ دوں جو اس کی پرورش کریں تمہاری خاطر اس میں لکم لاجلکم کے معنی میں ہے جو اہل بیت کی صفت ہے۔

۳۔ اور وہ اس بچہ کے خیر خواہ بھی ہوں گے۔ یعنی وہ اسے دودھ پلانے اور اس کی تربیت کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ النصح۔ غش یعنی کھوٹ ملاوٹ کی ضد ہے۔ اس سے مراد ایسا عمل ہے جو فساد اور خرابی کی آمیزش سے صاف اور پاک ہو۔ ترکیب کلام میں یہ یکفلونہ کے فاعل سے حال ہے۔ ابن جریج اور سدی نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا وھم لہ ناصحون۔ تو انہوں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ تو اس بچے کے گھر والوں کو جانتی ہے تو ان کے بارے میں ہمیں بتا۔ اس نے جواباً کہا میں تو انہیں نہیں پہچانتی(2)۔ اور جو میں نے کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بادشاہ کے لیے بڑے خیر خواہ ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اس نے کہا میں نے تو بادشاہ کی خوشی اور اپنا اس کے ساتھ تعلق ظاہر کرنے کی رغبت میں یہ کہا ہے۔ یہ روایت بھی ہے کہ جب اس نے کہا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی بَیْتٍ۔ تو ان لوگوں نے کہا وہ کون ہیں تو اس نے جواباً کہا وہ میری ماں ہے۔ پھر انہوں نے کہا کیا تمہاری ماں کا بیٹا ہے تو اس نے کہا جی ہاں ہارون ہے (اور ہارون اس سال پیدا ہوئے تھے جس میں ابھی بچوں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا)۔ پھر انہوں نے کہا تو اسے ہمارے پاس لے آ۔ چنانچہ وہ اپنی ماں کے پاس گئی اور اسے بیٹے کے حال کے بارے میں مطلع کیا اور پھر اسے ان کے پاس لے آئی۔ پس جونہی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ماں کی خوشبو کو پایا تو اس کے پستان پر منہ رکھا اور اسے چوسنے لگے یہاں تک کہ آپ نے خوب سیر ہو کر پیا۔ سدی نے کہا ہے کہ وہ اسے ایک دینار یومیہ اجرت دیتے تھے(3)۔ اور روایت یہ ہے کہ آپ اسے اس لیے قبول کر لیتی تھیں کیونکہ وہ حربی کا مال تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ وَ لِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾

"تو (اس طرح) ہم نے لوٹا دیا اس کو اس کی ماں کی طرف ۱؎ تا کہ اسے دیکھ کر اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور (اس کے فراق میں) غمزدہ نہ ہو اور وہ یہ بھی جان لے کہ بلا شبہ اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے لیکن اکثر (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ۲؎"

۱؎ اس کا عطف محذوف جملوں پر ہے جو آپس میں ایک دوسرے پر معطوف ہیں۔ تقدیر کلام کا مفہوم یہ ہے پس موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا کیا میں تمہاری راہنمائی کروں۔ تو انہوں نے کہا تو ہمیں بتا، تو اس نے اپنی ماں کے بارے انہیں مطلع کیا، انہوں نے کہا اسے لے آ چنانچہ وہ گئی اور اسے لے آئی۔ پھر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اس کی گود میں رکھا، اس نے انہیں دودھ پلایا تو آپ نے دودھ پی لیا۔ چنانچہ انہوں نے دودھ پلانے کے لیے آپ کو اس کے حوالے کر دیا، تو اس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کی طرف لوٹا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا   2۔ ایضاً   3۔ ایضاً

دیا۔ عربی کلام یہ ہے (فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ تَقْدِيْرَهُ فَقَالُوْا دُلِّيْنِيْ فَدَلَّتْ عَلٰى اُمِّهَا فَقَالُوْا اُتِيَ بِهَا فَانْطَلَقَتْ فَاَتَتْ بِهَا فَوَضَعُوْهُ فِيْ حُجْرِهَا فَارْضَعَتْهُ فَرَضَعَهُ فَسَلَّمُوْهُ اِلَيْهَا لِلْاِرْضَاعِ فَرَدَدْنَاهُ اِلٰى اُمِّهٖ)

۲۔ تا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس کی طرف واپس لوٹنے سے اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو۔ اور وہ اس کے فراق میں غمزدہ نہ ہو۔ اس کا عطف تَقَرَّ پر ہے۔ اور تا کہ وہ جان لے بے شک اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق اور سچ ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو اس کی طرف لوٹا دے گا (اس کا عطف لَا تَحْزَنَ پر ہے) لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ اگر لوگ اس حقیقت کو جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب اور وعید کے خوف سے ان افعال کا ارتکاب نہ کریں۔ جن کے کرنے سے اس نے منع کیا ہے اور اس کے وعدہ کے طمع اور حرص میں اس کے اوامر کو قطعاً ترک نہ کریں۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر تعریض ہے جبکہ وہ بہت زیادہ گھبرا گئی اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا کا معنی یہ ہو کہ اس کا دل صبر سے خالی ہو گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے نہ تو وہ لوگ اس وعدہ کو جانتے تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ یہ اس کی بہن ہے اور یہ ماں یہاں تک کہ آپ دودھ چھڑانے کی مدت تک اپنی ماں کے پاس ٹھہرے رہے۔ پھر وہ آپ کو فرعون کے پاس لے آئی اور آپ اسی کے پاس پرورش پاتے رہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الشعراء میں حکایۃً بیان فرمایا ہے اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾

"اور جب پہنچ گئے موسیٰ اپنے شباب کو اور ان کی نشو و نما مکمل ہو گئی ۱؎ تو ہم نے انہیں حکم اور علم عطا فرمایا ۲؎ اور ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکو کاروں کو ۳؎"

۱؎ اور جب موسیٰ علیہ السلام پہنچ گئے اپنے شباب کو۔ اشدہ یہ شدۃ کی جمع ہے اس کا معنی قوت اور طاقت ہے جیسا کہ نعم نعمۃ کی جمع ہے۔ معنی یہ ہو گا کہ جب آپ اس حد کو پہنچ گئے جس سے آگے مزید نشو و نما نہیں ہوتی۔ کلبی نے کہا ہے کہ الاشد سے مراد اٹھارہ سال سے لے کر تیس سال تک کی درمیانی عمر ہے۔ اور مجاہد وغیرہ کا قول ہے کہ اس سے مراد تینتیس برس کی عمر ہے(1)۔ اور ان کی عقل مکمل ہو گئی یعنی وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچ گئے۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے(2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ استویٰ سے مراد یہ ہے کہ آپ کا شباب اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

۲؎ تو ہم نے انہیں حکم یعنی نبوت عطا فرمائی اور علم عطا فرمایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے احکام کی پہچان۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد نبوت عطا کرنا نہیں۔ کیونکہ وہ تو آپ کو ہجرت کے بعد مدین سے واپسی پر عطا ہوئی تھی۔ بلکہ اس سے مراد احکام شرعیہ کی فقاہت اور علم کا عطا کرنا ہے۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ یہاں حرف عطف واؤ مطلق جمع کے لیے ہے۔ اس میں ترتیب پر کوئی دلیل موجود نہیں۔ نبوت اگرچہ ہجرت کے بعد آپ کو عطا ہوئی۔ لیکن یہاں اس کے ذکر سے مقصود یہ ہے تا کہ اس وعدے کے بیان کی تکمیل ہو جائے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی والدہ سے کیا تھا اور فرمایا تھا: اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ

۳؎ وَكَذٰلِكَ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر عبارت ہے جَزَآءً كَذٰلِكَ۔ ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں جیسے ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو دیا۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

وَ دَخَلَ الْمَدِیْنَةَ عَلٰى حِیْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِیْهَا رَجُلَیْنِ یَقْتَتِلٰنِ ﱞ هٰذَا مِنْ شِیْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَى الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَیْهِ ﱞ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۵﴾

''وہ شہر میں داخل ہوئے اس وقت جب بے خبر سو رہے تھے اس کے باشندے ۱؎ پس آپ نے پایا وہاں دو آدمیوں کو آپس میں لڑتے ہوئے یہ ایک ان کی جماعت سے تھا اور یہ دوسرا ان کے دشمنوں سے ہے ۲؎ پس مدد کے لیے پکارا آپ کو اس نے جو آپ کی جماعت سے تھا اس کے مقابلہ میں جو آپ کے دشمن گروہ سے تھا تو سینہ میں گھونسا مارا موسیٰ نے اس کو اور اس کا کام تمام کر دیا ۳؎ آپ نے فرمایا یہ کام شیطان کی انگیخت سے ہوا ہے بے شک وہ کھلا دشمن ہے بہکا دینے والا ۴؎ ''

۱؎ اس کا عطف لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ پر ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ اس سے مراد شہر مدین ہے جو سرزمین مصر میں ہے(1)۔ مقاتل کا قول ہے کہ اس سے مراد وہ گاؤں ہے جسے خانین کہا جاتا تھا اور یہ مصر سے دو فرسخ کے فاصلے پر تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد عین الشمس کا شہر ہے(2)۔ اور محلی نے کہا ہے کہ اس سے مراد شہر منف ہے۔ آپ کافی مدت اس شہر سے غائب رہنے کے بعد اس میں اس وقت داخل ہوئے۔ جب اس کے باشندے بے خبر سو رہے تھے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور لوگ قیلولہ کر رہے تھے(3)۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے کہ آپ مغرب اور عشاء کے درمیان اس میں داخل ہوئے(4)۔ سدی نے کہا ہے کہ واقعہ یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا بیٹا کہا جاتا تھا آپ فرعون کی سواریوں کی مثل سواری پر سوار ہوتے تھے اور اسی کی طرح لباس بھی زیب تن کرتے تھے۔ ایک دن فرعون سوار ہوا اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام پاس موجود نہیں تھے۔ پس جب موسیٰ علیہ السلام آئے اور آپ کو بتایا گیا کہ فرعون تو جا چکا ہے۔ تو آپ بھی سوار ہو کر اس کے پیچھے چل پڑے۔ تو آپ جب سرزمین منف میں پہنچے تو دوپہر کا وقت ہو چکا تھا لہٰذا آپ دوپہر کے وقت اس شہر میں داخل ہوئے اور اس وقت اس کے راستوں میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔(5)

ابن اسحاق نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی ایک جماعت بنی اسرائیل میں سے تھی جو ان کا کلام سنتی تھی اور آپ کی اقتداء کرتی تھی۔ پس جب وہ حق ظاہر ہو گیا جس پر آپ تھے تو آپ نے فرعون اور اس کی قوم سے علیحدگی اختیار کی اور دین میں انہیں مخالف قرار دیا، یہاں تک کہ اس کا ذکر فرعون سے بھی کر دیا گیا۔ لوگوں نے آپ کو ڈرایا اور خوب خوفزدہ کیا۔ اس لیے آپ کسی گاؤں میں داخل نہیں ہوتے تھے مگر ڈرتے ہوئے اور خفیہ طور پر۔ نتیجۃً آپ اس شہر میں بھی ایسے وقت داخل ہوئے جب وہاں کے باسی بے خبر سو رہے تھے(6)۔ ابن زید نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی چھوٹی عمر میں فرعون کو عصاء سے مارا اور اس نے آپ کے قتل کا ارادہ کر لیا تو فرعون کی بیوی نے کہا یہ تو چھوٹا ہے۔ لہٰذا اس نے قتل کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے شہر سے انہیں نکال دینے کا حکم دے دیا لہٰذا پھر اس شہر میں تب ہی داخل ہوئے جب آپ بڑے ہو چکے تھے(7)۔ اور جب شباب کی عمر کو پہنچ گئے۔ لہٰذا آپ شہر میں اس وقت داخل ہوئے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ) 3۔ تفسیر جلالین صفحہ 327 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ) 7۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ)

جب اس کے باشندے غفلت میں سو رہے تھے یعنی وہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے بے خبر تھے کیونکہ وہ درمیان میں طویل مدت کا وقفہ گزرنے کی وجہ سے آپ کے بارے سب کچھ بھول چکے تھے۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت علیؓ نے قول باری تعالیٰ حِیْنَ غَفْلَةٍ مِنْ اَهْلِهَا کے بارے ارشاد فرمایا۔ کہ یہ ان لوگوں کی عید کا دن تھا اور وہ اپنے لہو ولعب میں مشغول تھے(1)۔ (اس لیے وہ آپ کی آمد سے بے خبر تھے)۔

2۔ یَقْتَتِلٰنِ رَجُلَیْنِ کی صفت ہے۔ یعنی دو آدمی آپس میں لڑ رہے تھے اور جھگڑ رہے تھے۔ ایک ان کی جماعت بنی اسرائیل میں سے تھا۔ اور دوسرا ان کے دشمنوں میں سے۔ یعنی وہ قبطی تھا۔ یہ جملہ اپنے معطوف سمیت رجلین سے حال ہے۔ واؤ حالیہ ذکر نہیں کی گئی اس لیے کہ اس جملہ سے قبل کلام محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہے فَوَجَدَ رَجُلَیْنِ یُقَالُ فِیْهِمَا هٰذَا مِنْ شِیْعَتِهٖ" اور یہ بھی جائز ہے کہ هٰذَا و هٰذَا کو رَجُلَیْنِ سے بدل بنا دیا جائے اور مِنْ شِیْعَتِهٖ اور مِنْ عَدُوِّهٖ مشارہ الیہ سے حال ہو اور اس میں عامل معنی اشارہ ہو۔

3۔ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ کا عطف وَجَدَ پر ہے۔ استغاثہ کا معنی ہے مدد طلب کرنا۔ یعنی اسرائیلی نے فرعونی کے خلاف مدد طلب کی۔ پس موسیٰ علیہ السلام غصے ہوئے اور آپ کا غصہ انتہائی شدید ہو گیا۔ فرعونی اسرائیلی کو پکڑے ہوئے تھا اور یہ جانتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور آپ ان کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور عام لوگ صرف یہ جانتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کے ساتھ تعلق صرف رضاعت کا ہے کہ ان میں سے ایک عورت نے آپ کو دودھ پلایا ہے۔ تو آپ نے فرعونی سے کہا اسے چھوڑ دے تو اس نے جواب دیا کہ میں نے تو اسے اس لیے پکڑ رکھا ہے کہ یہ لکڑیاں اٹھا کر تیرے باپ کے مطبخ تک پہنچا دے۔ یہ جواب سن کر آپ اس سے جھگڑ پڑے۔ فرعونی کہنے لگا اب تو میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ لکڑیاں تجھ پر لاد دوں۔ موسیٰ علیہ السلام کو بھاری بھر کم جسم بھی عطا کیا گیا تھا اور قوت و طاقت بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے اسے ایک گھونسا رسید کر دیا۔ ابن مسعود نے فَوَکَزَهٗ کو فَلَکَزَهٗ مُوْسٰی پڑھا ہے۔ دونوں لفظوں کا معنی ایک ہے۔ اور وہ ہے گھونسا مارنا۔ یہ قول بھی ہے کہ رَکَزَ کا معنی ہے سینے میں ضرب لگانا اور لکز کا معنی ہے پیٹھ میں مارنا۔ فراء نے کہا ہے دونوں کا معنی دھکا دینا ہے(2)۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ رکز کا معنی ہے انگلیوں کے کناروں سے دھکا دینا۔ اور بعض تفاسیر میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے تر اسی کا عقد بنا کر اس کے سینے میں ضرب لگا دی(3)۔ اور اس کا کام تمام کر دیا۔ یعنی اسے قتل کر دیا اور اسے ریت میں دفن کر دیا۔ محلی نے اسی طرح کہا ہے اور اس کا معنی ہے وہ اس کے معاملے سے فارغ ہو گئے۔ پس وہ شے جس سے تو فارغ ہو جائے اسی کے لیے کہا جائے گا قَضَیْتَهٗ و قَضَیْتَ عَلَیْهِ۔ یعنی تو نے اسے مکمل کر دیا۔ تو چونکہ موسیٰ علیہ السلام نے اسے دانستہ قتل نہیں کیا تھا لہٰذا آپ اس پر نادم ہوئے۔

4۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اور کہا یہ قتل شیطان کی انگیخت سے ہوا ہے۔ اور یہ آپ نے اس لیے کہا اس وقت تک آپ کو کفار کے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ یا اس لیے کہ آپ ان میں محفوظ و مامون تھے اور آپ کی جانب سے ان کے ساتھ ایسے عمل کا ہونا درست نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ آپ کی عصمت نبوت کے منافی نہیں۔ کیونکہ یہ قتل خطاءً ہوا تھا۔ آپ نے اسے شیطانی عمل قرار دیا اور اسے ظلم کا نام دیا اور اس سے استغفار بھی کیا۔ جیسا کہ مقربین کی عادت ہوتی ہے کہ اگر کوئی حقیر سی غلط بھی ان سے سرزد ہو جائے تو اسے بڑا سمجھ کر استغفار کرتے ہیں۔ بے شک شیطان کھلا دشمن اور بہکا دینے والا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ)

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ فَاغۡفِرۡ لِیۡ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۶﴾

''آپ نے عرض کی میرے پروردگار! میں نے ظلم کیا اپنے آپ پر پس بخش دے مجھے [1] تو اللہ تعالیٰ نے بخش دیا اسے بے شک وہی غفور رحیم ہے [2]''

[1] یہ جملہ مستأنفہ ہے۔ آپ نے عرض کی میرے پروردگار! بے شک میں نے تیرے حکم کے بغیر ایک نفس کو قتل کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ پس تو میری خطا بخش دے۔

[2] اس کا عطف قال پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنا حق معاف کر دیا۔ چونکہ قبطی معصوم الدم نہیں تھا اس لیے معافی اور بخشش کے لیے قصاص کا ہونا یا مقتول یا اس کے ورثاء کی جانب سے معافی کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ بے شک وہ ہی اپنے بندوں کے گناہ بخشنے والا ہے۔ اور ان کے ساتھ رحم فرمانے والا ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ فَلَنۡ اَکُوۡنَ ظَهِیۡرًا لِّلۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۱۷﴾

''عرض کرنے لگے میرے رب! مجھے ان انعامات کی قسم جو تو نے مجھ پر فرمائے اب میں ہرگز مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا [1]''

[1] یہ دوسرا جملہ مستأنفہ ہے۔ بِمَاۤ اَنۡعَمۡتَ میں باء قسم کے لیے ہے اور اس کا مابعد جواب قسم ہے۔ اور قول باری تعالیٰ فَلَنۡ اَکُوۡنَ محذوف عبارت پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اُقۡسِمُ بِاِنۡعَامِکَ عَلَیَّ بِالنُّبُوَّۃِ وَالۡمَغۡفِرَۃِ وَ غَیۡرِ ذَالِکَ تُبۡتُ فَلَنۡ اَکُوۡنَ مجھے تیرے ان انعامات کی قسم جو تو نے مجھ پر نبوت، مغفرت اور دوسری صورتوں میں فرمائے میں اس سے توبہ کرتا ہوں کہ میں ہرگز نہیں بنوں گا۔ یا یہ باء محذوف کلام کے متعلق ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے رَبِّ اعۡصِمۡنِیۡ مِنَ الزَّلَّاتِ بِحَقِّ اِنۡعَامِکَ عَلَیَّ اے میرے رب مجھے اپنے ان انعامات کے طفیل لغزشوں سے بچا جو تو نے مجھ پر فرمائے۔ اس ترکیب کی بناء پر قول باری تعالیٰ فلن اکون جواب دعا ہے۔ یعنی چاہیے کہ تو مجھے محفوظ رکھے تاکہ میں جرم کرنے والوں کے لیے مددگار نہ ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ مجرمین سے مراد کافرین ہیں۔ یہ روایت اگر صحیح ہے تو پھر یہ اس کی دلیل ہے کہ اسرائیلی کافر تھا (1)۔ یہی قول مقاتل کا بھی ہے۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے میں اس کے بعد خطا کے معاملہ میں ہرگز کسی کی مدد نہیں کروں گا (2)۔ اور یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے میں ہرگز ایسے شخص کی مدد نہیں کروں گا جس کی معاونت مجھے جرم تک پہنچا دے۔

فَاَصۡبَحَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسۡتَنۡصَرَهٗ بِالۡاَمۡسِ یَسۡتَصۡرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوۡسٰۤی اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۸﴾

''پھر آپ نے صبح کی اس شہر میں ڈرتے ہوئے۔ اس انتظار میں کہ کیا ہوتا ہے [1] تو اچانک وہی شخص جس نے کل ان سے مدد طلب کی تھی آج پھر انہیں مدد کے لیے پکارتا ہے۔ موسیٰ نے اسے فرمایا بے شک تو کھلا ہوا گمراہ ہے [2]''

[1] پس موسیٰ علیہ السلام نے اس شہر میں صبح کی جس میں آپ نے قبطی کو قتل کیا تھا۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف فَقَضٰی عَلَیۡهِ پر ہے۔ اپنے آپ پر ڈرتے ہوئے۔ اور مقتول کے ورثاء کی جانب سے انتقام کی انتظار کرتے ہوئے یا اپنے رب کی طرف سے مدد اور نصرت کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 139 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 139 (التجاریہ)

انتظار کرتے ہوئے۔ ترکیب کلام میں خائفًا اور یترقب دونوں اصبح کے فاعل سے حال ہیں۔

۲۔ فَإِذَا مفاجات کے لیے ہے۔ تو اچانک وہی شخص جس نے کل ان سے مدد طلب کی تھی آج پھر انہیں مدد کے لیے پکارتا ہے۔ یَسْتَصْرِخُہ الصراخ سے مشتق ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ لوگ فرعون کے پاس گئے اور اسے بتایا کہ بنی اسرائیل نے ہمارے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ لہذا آپ ہمیں ہمارا حق دلوایئے (یعنی انہوں نے قصاص کا مطالبہ کیا) تو اس نے انہیں کہا قاتل تلاش کرو اور ایسا شاہد پیش کرو جو اس کے خلاف شہادت دے کیونکہ بغیر گواہوں کے فیصلہ کرنا درست نہیں۔ وہ قاتل کو تلاش کرنے کے لیے ادھر ادھر گھومتے رہے لیکن وہ کوئی پختہ ثبوت نہ پا سکے۔ اچانک دوسرے روز موسیٰ علیہ السلام گزر رہے تھے کہ آپ کی نظر اسی اسرائیلی پر پڑ گئی۔ وہ آج پھر ایک فرعونی سے لڑ رہا ہے۔ چنانچہ اس نے دیکھ کر پھر فرعونی کے خلاف آپ کو مدد کے لیے پکارا۔ پس موسیٰ علیہ السلام اس سے ملے اس حال میں کہ آپ گزشتہ روز قبطی کو قتل کرنے پر بہت نادم اور پریشان تھے (1)۔ تو آپ نے اس اسرائیلی سے فرمایا بے شک تو تو کھلا گمراہ ہے۔ یعنی تیری گمراہی اس طرح واضح اور بین ہے کہ گذشتہ کل تو ایک آدمی کے قتل کا سبب بنا اور آج پھر تو دوسرے آدمی سے لڑ رہا ہے اور مجھے ہی مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ آپ نے یہ اس فرعونی کو کہا کہ بے شک تو اپنے ظلم کے سبب کھلا ہوا گمراہ ہے (انک لغوی مبین بظلمک)۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی کو اسرائیلی پر ظلم کرتے دیکھا تو آپ کے دل میں اسرائیلی کے لیے رقت اور نرمی پیدا ہوئی۔ پس آپ نے فرعونی کو پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝

''پس جب آپ نے ارادہ کیا کہ جھپٹ پڑیں اس پر جو ان دونوں کا دشمن تھا وہ کہنے لگا اے موسیٰ کیا تو چاہتا ہے کہ مجھے بھی قتل کر ڈالے جیسے کل تو نے ایک شخص کو قتل کیا تھا ۱۔ تو نہیں چاہتا بجز اس کے کہ تو ملک میں بڑا جابر بن جائے اور تو نہیں چاہتا کہ اصلاح کرنے والوں میں سے ہو ۲۔''

۱۔ پس جب موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ آپ اسے پکڑ لیں جو ان دونوں کا دشمن ہے۔ دونوں سے مراد موسیٰ علیہ السلام اور اسرائیلی ہے۔ کیونکہ فرعونی ان دونوں کے دین پر نہیں تھا۔ کیونکہ قبطی بنی اسرائیل سے عداوت رکھتے تھے۔ تو یہ دیکھ کر اسرائیلی کو یہ گمان ہوا کہ آپ مجھے پکڑنا چاہتے ہیں۔ تو جونہی اس نے آپ کو غصے میں دیکھا اور آپ سے اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ کا قول سنا تو وہ اسرائیلی کہنے لگا اے موسیٰ! کیا تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے جیسے کل تو نے ایک شخص کو قتل کیا۔ یا یہ قول اس قبطی نے کہا کیونکہ آپ کے کلام سے اسے بھی یہ وہم ہو چکا تھا کہ بے شک یہی وہ ہے جس نے اس اسرائیلی کی وجہ سے کل اس قبطی کو قتل کیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں سے پہلا قول زیادہ واضح ہے۔

۲۔ تو نہیں چاہتا مگر یہ کہ غضب کے سبب سرزمین مصر میں بہت زیادہ قتل کرنے والا بن جائے۔ اس طرح کہ تو لوگوں پر ظلم تو کرتا ہے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 139 (التجاریہ)

انجام پر نظر نہیں رکھتا۔ اور تو نہیں چاہتا کہ تو لوگوں کے درمیان صلح کرانے والوں میں سے ہو۔ اور ان کے آپس کے جھگڑوں کو احسن انداز سے ختم کرادے۔ پس جب قبطی نے اسرائیلی کا یہ کلام سنا اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ۔ تو اسے یقین ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہی کل قبطی کو قتل کیا ہے۔ لہٰذا وہ فوراً فرعون کے پاس چلا گیا اور اسے جا کر اس کی اطلاع دی۔ تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دینے کا حکم صادر کر دیا۔ یا یہ ہے کہ لوگوں نے ان کی گفتگو کو سنا اور یہ مشہور ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہی کل قبطی کو قتل کیا ہے۔ چنانچہ یہ بات فرعون اور اس کے سرداروں تک پہنچی، تو انہوں نے آپ کے قتل کا پروگرام بنایا۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ؗ قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝۲۰

''اور آیا ایک آدمی شہر کے آخری گوشہ سے دوڑتا ہوا اس نے (آکر) بتایا اے موسیٰ! سردار لوگ سازش کر رہے ہیں آپ کے بارے میں کہ آپ کو قتل کر ڈالیں [1] اس لیے نکل جائیے (یہاں سے) بے شک میں آپ کا خیر خواہ ہوں [2]''

[1] اس کا عطف قَالَ يَا مُوْسٰى پر ہے۔ اکثر اہل تاویل نے کہا ہے کہ اس آدمی کا نام حزقیل تھا جو آل فرعون میں سے مرد مومن تھا۔ بعض نے کہا اس کا نام شمعون تھا اور بعض نے سمعان نام ذکر کیا ہے۔ اور مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ ظرف مستقر رجل کی صفت ہے۔ جآء فعل کے متعلق نہیں۔ کیونکہ اس صفت کی تخصیص نے نکرہ کو معرفہ کے ساتھ ملحق کر دیا ہے۔ پس یہ صحیح ہے کہ قول ''يَسْعٰى'' اس نکرہ مخصوصہ سے حال ہو۔ یعنی شہر کے آخر گوشہ سے وہ آدمی آیا درآنحالیکہ وہ بہت تیز چل رہا تھا۔ اور اس نے قریبی راستہ اختیار کیا یہاں تک کہ وہ فوراً موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا اور صورت حال کی اطلاع دی اور آپ کو خطرات سے آگاہ کیا اور ڈرایا اور کہا اے موسیٰ! درباری لوگ آپس میں مشورہ کر رہے ہیں حالانکہ یہ معاملہ ابھی مخفی ہے کہ وہ آپ کو قتل کر دیں۔ یا وہ آپس میں ایک دوسرے کو آپ کے قتل کا حکم دے رہے ہیں۔ لِيَقْتُلُوْكَ میں لام زائدہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ وہ تمہارے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں۔ یہاں التشاور یعنی باہم مشورہ کرنے کو ایتمار کا نام دیا گیا ہے کیونکہ مشورہ کرنے والوں میں سے ہر ایک دوسرے کو حکم دے رہا ہے کہ وہ تجھے قتل کر دے۔

[2] پس آپ اس شہر سے نکل جائیے۔ اِنِّيْ لَكَ یہ محذوف شبہ فعل کے متعلق اور انّ کی خبر ہے۔ یعنی بے شک میں تمہارے نفع کے لیے آیا ہوں اور مِنَ النّٰصِحِيْنَ دوسری خبر ہے۔ اور لَکَ جار مجرور کو اس ناصحین کے متعلق کرنا جائز نہیں کیونکہ صلہ کا معمول موصول سے مقدم نہیں آسکتا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ ناصحین کے متعلق ہے۔ اور کلام کو تقدیم و تاخیر پر محمول کیا جائے گا (یعنی کلام کی ترتیب یہ ہے اِنِّيْ مِنَ النّٰصِحِيْنَ لَكَ) اور بعض نے یہ کہا ہے کہ لَکَ یہ مبہم کلام کا بیان ہے۔ گویا اصل اس طرح کہا اِنِّيْ مِنَ النَّاصِحِيْنَ پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا لَکَ یعنی میں تیرے لیے خیر خواہ ہوں۔ اور یہ لام فعل محذوف کے عمل کو تقویت دینے کے لیے ہے۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ؗ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۱

''پس آپ نکلے وہاں سے ڈرتے ہوئے (اپنی گرفتاری کا) انتظار کرتے ہوئے [1] عرض کی میرے رب! بچا لے مجھے

ظلم وستم کرنے والوں سے ۲؎۔''

۱؎ پس موسیٰ علیہ السلام اس شہر سے خوفزدہ ہو کر اور ڈرتے ہوئے نکلے۔ اپنے پیچھے سے تلاش کرنے والوں کا انتظار کرتے ہوئے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اپنے رب کی مدد کا انتظار کرتے ہوئے۔ اگر کہا جائے کہ یہ آیت تو اس پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا غیر اللہ سے ڈرنا جائز ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کے بارے میں یہ فرمایا ہے وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ہیں) تو پھر ان کے درمیان تطبیق کیسے ہوگی؟ تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ اپنے بارے میں خوفزدہ ہونا یہ فطرتی اور طبعی تقاضوں میں سے ہے۔ اور یہ نبوت کے منافی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر پر عمل پیرا ہونے اور اس کی مناھی سے رکنے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی جانب سے لاحق ہونے والے نقصان اور تکلیف کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کرتے بخلاف عام لوگوں کے۔ کیونکہ یہ تو عام لوگوں سے ایسے ہی ڈرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ سے بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگوں سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ اور جب انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں کوئی اذیت دی جاتی ہے تو وہ لوگوں کی طرف سے دی گئی اذیت کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مثل ہی جانتے ہیں۔

۲؎ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی۔ یہ یا تو جملہ مستانفہ ہے یا پھر خرج کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔ ظالمین سے مراد کافرین ہیں۔ یعنی اے میرے پروردگار! مجھے ان ظلم وستم کرنے والوں سے بچالے اور اس سے مجھے محفوظ رکھ کہ وہ مجھے پاسکیں۔ اس واقعہ میں یہ بھی ہے کہ جب فرعون کو یہ خبر موصول ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام یہاں سے چلے گئے ہیں تو اس نے آپ کو تلاش کرنے کے لیے اپنے آدمیوں کو بھیجا اور ان سے کہا کہ سوار ہو کر مختلف راستوں پر اسے تلاش کرو کیونکہ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ آپ کون سے راستے پر چلے ہیں۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾

''اور جب آپ روانہ ہوئے مدین کی جانب ۱؎ (تو دل میں) کہنے لگے امید ہے میرا رب میری راہنمائی فرمائے گا سیدھے راستہ کی طرف ۲؎''

۱؎ زجاج نے کہا کہ وہ اس راستے پر چلے جو مدین کی طرف جاتا تھا۔ یہ وہ گاؤں ہے جس کا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے کے نام پر مدین رکھا گیا تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام وہاں سے نکلے تو نہ آپ کے پاس سواری تھی اور نہ زاد راہ تھا۔ اور مصر سے مدین آٹھ دنوں کی مسافت پر تھا(1)۔ اور یہ فرعون کی سلطنت میں شامل نہیں تھا۔ اس میں لَمَّا ظرف ہے اس میں شرط کے معنی ہیں اور یہ قول باری تعالیٰ قَالَ کے متعلق ہے۔

۲؎ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اور اس پر یقین رکھتے ہوئے کہا۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے ربی کو فتحہ کے ساتھ اور باقیوں نے سکون کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔ اور اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ یہ جملہ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ پر معطوف ہے۔ اور سواء کی السبیل کی طرف اضافت میں صفت موصوف کی طرف مضاف ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ میری ایسے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی فرمائے گا جس میں کوئی زحمت اور تکلیف نہیں ہوگی۔ موسیٰ علیہ السلام اس گاؤں کی طرف جانے والا راستہ نہیں جانتے تھے۔ پس جب

آپ نے یہ الفاظ کہے تو آپ کے پاس ایک فرشتہ آ گیا جس کے ہاتھ میں نیزہ تھا تو آپ اس کے ساتھ چلتے رہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تو درختوں کے پتوں اور سبزیوں کے سوا آپ کو کوئی شے میسر نہ آئی یہاں تک کہ آپ پیٹ میں بھی سبزی کے نشانات دیکھنے لگے (اجابت سے مراد ہے) اور جب آپ مدین پہنچے تو آپ کے پاؤں پھٹ چکے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے موسیٰ علیہ السلام کی پہلی آزمائش تھی۔(1)

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۫ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿۲۳﴾

''اور جب آپ مدین کے پانی پر پہنچے تو دیکھا کہ وہاں پر لوگوں کا ایک انبوہ ہے جو (اپنے مویشیوں کو) پانی پلا رہا ہے۔ اور دیکھیں اس انبوہ سے الگ تھلگ دو عورتیں کہ اپنے ریوڑ کو روکے ہوئے ہیں [1] آپ نے پوچھا تم کیوں اس حال میں کھڑی ہو۔ ان دونوں نے کہا ہم نہیں پلا سکتیں [2] جب تک چرواہے اپنے مویشیوں کو لے کر واپس نہ چلے جائیں [3] اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں [4]''

[1] اور جب آپ مدین کے پانی پر پہنچے۔ یہاں مآء سے مراد وہ کنواں ہے جس سے وہ اپنے جانوروں کو پانی پلاتے تھے۔ تو آپ نے پانی پر یعنی کنوئیں کے کنارے پر ایک انبوہ کثیر پایا جو اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہا ہے۔ اور آپ نے ان کثیر لوگوں کے علاوہ نشیبی جگہ میں دو عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنے ریوڑ کو روکے ہوئے ہیں۔ تَذُوْدٰنِ امْرَاَتَيْنِ سے حال ہے یا ان دونوں کی صفت ہے۔ کہ وہ اپنی بکریوں کو پانی سے روکے کھڑی ہیں تا کہ وہ ان لوگوں کے ریوڑوں کے ساتھ نہ مل جائیں۔

[2] موسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں عورتوں کو کہا۔ تمہاری یہ حالت کیوں ہے کہ تم اپنی بکریوں کو پانی پر جانے سے روک رہی ہو۔ خطب کا معنی شان اور حالت۔ قاموس میں اسی طرح ہے(2)۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی اس روکنے سے تمہارا مقصود و مطلوب کیا ہے؟ ان دونوں نے کہا ہم اپنے ریوڑوں کو نہیں پلا سکتیں

[3] يُصْدِرَ کو ابو جعفر، ابو عمرو اور ابن عامر نے يَصْدُرَ یعنی یاء کے فتحہ اور دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ فعل لازم ہے۔ اور باقیوں نے یاء کے ضمہ اور دال کو کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے یہاں تک کہ چرواہے اپنے مویشیوں پانی سے واپس لے جائیں۔ اس کلام میں يَسْقُوْنَ، تَذُوْدٰنِ اور لَا نَسْقِيْ کا مفعول ذکر نہیں کیا گیا اور وجہ یہ ہے کہ یہاں مقصود فعل ہے مفعول نہیں۔ کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ آپ نے ان دونوں کے ساتھ اس لیے رحم اور مہربانی فرمائی کہ یہ اپنی کمزوری اور ضعف کے سبب پانی پلانے کی ضرورت اور حاجت کے باوجود جانوروں کو روکے ہوئے تھیں۔ اور لوگ پلا رہے تھے کسی نے ان کے ساتھ مہربانی نہیں کی۔ اس لیے کہ ان کے جانور بکریاں تھیں اور ان کے جانور اونٹ تھے۔ اور اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ یہ ان دونوں عورتوں کی عفت و پاکدامنی اور مردوں کے ساتھ اختلاط سے اجتناب پر دلالت کرتی ہے۔

[4] اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں۔ یعنی ان کی عمر اتنی ہو چکی ہے کہ وہ مویشیوں کو پانی پلانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس لیے ہمیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 140 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 157 (التراث العربی)

مویشیوں کو پانی پلانے کے لیے آنا پڑتا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ لَا نَسْقِیْ کے فاعل سے حال ہے۔ بظاہر ان کا جواب آپ کے سوال کے مطابق دیکھائی نہیں دیتا۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ جواب کی سوال کے ساتھ وجہ مطابقت یہ ہے کہ آپ نے ان دونوں سے جانوروں کو روکنے کا سبب پوچھا تھا۔ تو ان دونوں نے اس کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم پردہ دار کمزور عورتیں ہیں۔ ہم مردوں کی مزاحمت کی طاقت نہیں رکھتیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہم ان کے ساتھ اختلاط سے شرم و حیا بھی محسوس کرتی ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے جانوروں کو روک کر رکھیں اور پلانے کو مؤخر کریں تاکہ ریوڑوں کا اختلاط نہ ہو جائے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ ان دونوں عورتوں کے والد کے نام میں اختلاف ہے۔ مجاہد، ضحاک، سدی اور حسن نے کہا ہے کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ اور وہب اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ اس کا نام شیرون تھا جو حضرت شعیب علیہ السلام کا بھتیجا تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام تو اس سے قبل اپنی بصارت ختم ہو جانے کے بعد وفات پا چکے تھے اور آپ کو مقام ابراہیم اور زمزم کے درمیان دفن کیا جا چکا تھا۔ اور یہ قول بھی ہے یہ ایک مومن انسان تھا جو شعیب علیہ السلام پر ایمان لایا تھا۔ (1)

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴿۲۴﴾

"تو آپ نے پانی پلا دیا ان (کے ریوڑ) کو پھر لوٹ کر سایہ کی طرف آ گئے [1] اور عرض کرنے لگے میرے مالک! واقعی میں اس خیر و برکت کا جو تو نے میری طرف اتاری ہے [2] محتاج ہوں [3]"

[1] پس جب موسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں عورتوں کی گفتگو سنی تو آپ نے ان پر مہربانی فرمائی اور ان کی بکریوں کو پانی پلا دیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ آپ لوگوں میں گھس گئے اور انہیں کنوئیں کی منڈیر سے دور ہٹایا اور ان دونوں عورتوں کے ریوڑ کو پانی پلایا۔ بعض (ا) نے یہ کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کنوئیں کے قریب ہی دوسرے کنوئیں کے منہ سے ایک بھاری پتھر کو اکھیڑ دیا جو اتنا وزنی تھا کہ اسے لوگوں کی ایک جماعت ہی اٹھا سکتی تھی اور یہ روایت بھی ہے کہ اسے اٹھانے کے لیے دس افراد درکار تھے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ آپ نے ایک ڈول نکالا اور اس میں برکت کی دعا کی تو تمام بکریاں اسی سے سیراب ہو گئیں (2)۔ پھر آپ درخت کے سایہ کی طرف لوٹ کر آ گئے۔ اور سخت گرمی کے سبب اس کے سائے میں بیٹھ گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کا امتحان طویل ہوا۔ تو اپنے مولیٰ سے ہی اپنی تکلیف کا شکوئی کرنے لگے اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ رب کی بھیجی ہی آزمائشوں پر شکوہ بھی اسی سے ہو کسی غیر سے نہ ہو۔

[2] اہل علم نے کہا ہے کہ یہاں لام اِلیٰ کے معنی میں ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے فقیرٌ لہٗ اور فقیرٌ الیہ۔ اور انزال سے مراد عطا کرنا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى نِعْمَةً یا نِعْمَتَهٗ عَلَى الْخَلْقِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے نعمتیں عطا فرمائیں۔ پھر کبھی تو نعمت کی عطا اسی شے کو بالذات اتارنے کے ساتھ ہوتی ہے مثلاً قرآن کریم کو نازل کرنا اور بارش برسانا وغیرہ۔ اور کبھی عطاء نعمت اس کے اسباب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 140 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 140 (التجاریہ)

(ا) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب مدین کے پانی پر تشریف لائے تو آپ نے لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا جو پانی پلا رہے ہیں۔ جب وہ فارغ ہو گئے تو انہوں نے کنوئیں کے منہ پر پتھر کو واپس رکھ دیا جسے اٹھانے کے لیے دس افراد درکار تھے۔ تو اتنے میں آپ نے دو عورتوں کو دیکھا جو اپنے جانوروں کو روکے ہوئے ہیں۔ پس ان دونوں نے آپ سے گفتگو کی۔ تو آپ اس پتھر کے پاس آئے اور اسے اکیلے اٹھا لیا پھر آپ نے صرف ایک ڈول ہی نکالا جس سے سارا ریوڑ سیراب ہو گیا۔ پھر وہ دونوں عورتیں لوٹ کر اپنے والد کے پاس گئیں اور اسے سارا واقعہ سنایا اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف

اتارنے اور اس کی طرف راہنمائی کر دینے سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ (اور ہم نے لوہا نازل کیا) وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ (اور اس نے تمہارے لیے چوپاؤں میں سے آٹھ جوڑے اتارے) اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا (اور ہم نے تم پر لباس اتارا) اس آیت کریمہ میں اَنْزَلْتَ صیغہ ماضی ذکر کیا گیا ہے لیکن اس سے مراد مستقبل ہے۔ یا پھر یہ قدرت انزاله الیّ کے معنی میں ہے۔ اور معنی یہ ہوگا بے شک وہ نعمت جو تو مجھے عطا فرمائے گا۔ یا وہ خیر و برکت جسے عطا کرنا تو نے میرے لیے مقدر کر دیا ہے۔ اس سے مراد خیر و برکت ہے چاہے طعام قلیل ہو یا کثیر۔

سے محتاج ہوں میں سائل ہوں۔ یعنی تو جو چاہے مجھے عطا فرما چاہے قلیل ہو یا کثیر ہو۔ چونکہ یہ لفظ سوال کے معنی کو متضمن ہے اس لیے الیٰ کی بجائے لام کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ایک لقمہ کا سوال کیا جس کے سبب وہ اپنی پشت کو سیدھا رکھ سکیں۔ امام باقرؒ نے فرمایا کہ انہوں نے یہ اس لیے کہا کیونکہ وہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے بھی محتاج تھے۔ اور سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہوئے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ عرض کی رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بڑے معزز و مکرم تھے۔ لیکن اس وقت کھجور کے ایک ٹکڑے کے لیے محتاج تھے۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف خیر ہی کا سوال کیا ہے(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لما انزلت میں لام سببیہ ہے۔ اور خیر سے مراد دین وحکمت ہے۔ معنی یہ ہے جو خیر تو نے مجھے عطا فرمائی اس کے سبب میں دنیا میں فقیر ہو گیا۔ کیونکہ میں نے دین میں فرعون کی مخالفت کی ہے۔ کیونکہ آپ جب تک فرعون کے پاس تھے خوش حال تھے۔ اور یہ کہنے سے غرض اور مقصود اس نعمت پر اظہار مسرت اور ادائے شکر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ معنی مراد لینا بھی جائز ہے، بے شک وہ دین وحکمت جو تو نے مجھے عطا فرمائی میں اس میں اوراضافے کا تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ گویا آپ نے عرض یہ کی رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما)۔ میں کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ انزلتُ نُزُل سے مشتق ہو۔ یعنی اس میں نون اور زا دونوں مضموم ہیں۔ اور اس سے مراد وہ کھانا ہے جو مہمان کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے انزلتُ فلاناً یعنی میں نے اس کی میزبانی کی اور الیٰ فقیر کے معنی یہ ہے کہ میں کھانے میں سے ہر اس شے کا محتاج ہوں جو تو مجھے عطا فرمائے۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ ۫ قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَ قَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ٝ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵﴾

"کچھ دیر بعد آئی آپ کے پاس ان دونوں میں سے ایک خاتون شرم وحیا سے چلتی ہوئی (اور آ کر) کہا میرے والد تمہیں بلاتے ہیں تاکہ تم نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا تمہیں معاوضہ دیں[1]۔ پس جب آپ ان کے پاس آئے اور اپنا واقعہ ان کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے (تسلی دیتے ہوئے) کہا ڈرو نہیں۔ تم بچ کر نکل آئے ہو ظالموں (کے پنجہ) سے[2]"

[1] اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کہ وہ دونوں عورتیں لوگوں سے پہلے جلدی جلدی اپنے باپ کی طرف لوٹ کر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 141 (التجاریۃ)

آ گئیں۔اوران کی بکریوں نے اونٹوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔تو ان کے باپ نے ان دونوں سے کہا تم جلدی کیسے آ گئیں۔انہوں نے جواباً کہا کہ ہم نے ایک صالح اور نیک آدمی کو پایا، اس نے ہمارے ساتھ مہربانی کی اور ہماری بکریوں کو پانی پلا دیا۔یہ سن کر باپ نے ان میں سے ایک کو کہا تم جاؤ اور سے میرے پاس بلا لاؤ۔پس ان میں سے ایک آپ کے پاس آئی۔شرم وحیا میں چلتی ہوئی۔یہ جار مجرور ظرف تمشی فعل کے فاعل سے حال ہے۔اور پھر یہ مکمل جملہ جَآءَتْ فعل کے فاعل سے حال ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ وہ عورت ان جری خواتین میں سے نہیں تھی کہ مردوں کے پاس بے باک چلی آتی بلکہ وہ تو آپ کے پاس اس طرح چھپتے چھپاتے آئی کہ شرم وحیا کی وجہ سے اپنی قمیص کی آستیں اپنے چہرے پر رکھے ہوئی تھی(1)۔اور آ کر کہا میرے والد تمہیں بلاتے ہیں تا کہ تم نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا تمہیں معاوضہ دیں۔ابن عساکر نے اوراسی طرح بغویؒ نے بھی ذکر کیا کہ ابوحازم سلمہ بن دینار نے کہا جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ سنا تو چاہا کہ نہ جائیں لیکن چونکہ آپ کئی دنوں سے بھوک برداشت کر رہے تھے۔اس لیے آپ نے جانے کے بغیر کوئی چارہ نہ پایا۔پس عورت آگے آگے چلی اور موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے پیچھے، لیکن تیز ہوا کے سبب اس کی پنڈلیوں سے کپڑا ہٹ جاتا تھا اس لیے آپ نے یہ پسند نہ کیا کہ آپ کی نظر اس کی ننگی پنڈلیوں پر پڑے۔لہٰذا اسے فرمایا تو میرے پیچھے پیچھے چل۔اور اگر میں راستہ بھولنے لگوں تو میری راہنمائی کر دینا۔چنانچہ اس نے ایسے ہی کیا۔پس جب آپ شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچے تو وہ شام کا کھانا کھانے لگے تھے۔انہوں نے کہا اے نوجوان! بیٹھ جا اور کھانا کھا لے۔تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں۔تو شعیب علیہ السلام نے کہا ایسے کیوں کیا تم بھوکے نہیں ہو۔؟ آپ نے کہا کیوں نہیں۔لیکن میں اس سے ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ اس عمل کا عوض نہ ہو جو میں نے ان عورتوں کی بکریوں کو پانی پلانے کی صورت میں کیا۔اور میں ایسے گھرانے کا فرد ہوں جو اعمال آخرت میں سے کسی عمل کا عوض دنیا میں طلب نہیں کرتے۔تو حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا قسم بخدا! اے نوجوان ایسا نہیں۔بلکہ میری اور میرے قبیلے کی یہ عادت اور طریقہ ہے کہ مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور اسے کھانا کھلاتے ہیں۔یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام بیٹھ گئے اور کھانا کھا لیا۔(2)

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا اس معنی میں بالکل صریح اور واضح ہے کہ اس عورت نے موسیٰ علیہ السلام کو اجر عطا کرنے کے لیے ہی بلایا۔اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا اور اس کے ساتھ چل پڑے۔اور یہ بھی درست نہیں کہ پہلے آپ کے نہ جانے کا ارادہ تھا بعد میں بن گیا۔جیسا کہ ابوحازم نے کہا ہے۔گویا یہ آیت اس واقعہ کے بطلان پر دلالت کرتی ہے۔کیونکہ یہ واقعہ دعوت کے بعد اس کے انکار پر دلالت کر رہا ہے۔اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے بھی معارض ہے جو آپ نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَیْهِ اَجْرًا (اگر تو چاہے تو اس پر اجرت لے لے)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی بھی مبعوث نہیں فرمایا مگر یہ کہ اس نے بکریاں چرائیں۔تو صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے عرض کی کیا آپ بھی یا رسول اللہ ﷺ! تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں میں بھی قیراط لے کر اہل مکہ کی بکریاں چراتا رہا۔اسے بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔(3) اور عنقریب ہم یہ بھی ذکر کریں گے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی

1۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 141 (التجاریۃ)
2۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 141 (التجاریۃ)
3۔صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 301 (وزارت تعلیم)

شرمگاہ کی عفت و پاکیزگی اور طعام بطن کی خاطر اپنے آپ کو آٹھ یا دس سال کے لیے اجرت پر دیئے رکھا(1)۔حق تو یہ ہے کہ وہ اعمال جو بذات خود عباداتِ مقصودہ ہیں یا عباداتِ مقصودہ کے لیے شرط ہیں ان پر اجرت لینا مکروہ ہے۔ جیسے اذان، امامت اور تعلیم القرآن وغیرہ۔ لیکن ایسے اعمال جو فی نفسہ مباح ہیں اور نیت صالحہ کے سبب وہ اطاعت و فرمانبرداری بن جاتے ہیں ان پر اجرت لینا مکروہ نہیں۔ حضرت امام شافعیؒ نے ابتداء ہی اذان وغیرہ اعمال پر اجرت لینا جائز قرار دیا ہے۔ اور متاخرین احناف نے بھی قرآن کریم کی تعلیم پر اجرت لینا جائز قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

ﻫ یہ محذوف جملوں پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کہ جب وہ عورت آپ کے پاس آئی اور اس نے مذکور کلام کیا، تو موسیٰ علیہ السلام شعیب علیہ السلام کے پاس آئے، پس جب آپ ان کے پاس آئے۔ یعنی جَآءَ موسٰی عندہ ای عند شعیب۔ تو اس میں مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے ان کے سامنے اپنا واقعہ بیان کیا قصص مصدر معنی مفعول ہے۔ قاموس میں ہے قص اثرہ قصاً و قصصا (وہ اس کے پیچھے اس کے نشانات قدم پر چلا)(2)۔ اور قَصَّ الْخَبرَ کا معنی ہے۔ اس نے اسے واقعہ مکمل طور پر بتا دیا۔ لہٰذا آیت کا معنی یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کو قبطی کو قتل کرنے کا واقعہ اور فرعون کے انہیں قتل کرنے کے ارادہ سے مکمل طور پر آگاہ کر دیا۔ تو حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا فرعون اور اس کی قوم سے خوف نہ کر اور انہوں نے یہ اس لیے کیا۔ کیونکہ مدین پر فرعون کی حکومت نہیں تھی۔ اور جملہ نَجَوْتَ قول باری تعالیٰ لَا تَخَفْ کی علت ہے معنی یہ ہے۔ ڈرو نہیں تم ظالموں کے پنجہ سے بچ کر نکل آئے ہو۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ١ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝۲۶

''ان دو میں سے ایک خاتون نے کہا میرے (محترم) باپ اسے نوکر رکھ لیجئے۔ بے شک بہتر آدمی جس کو آپ نوکر رکھیں وہ ہے جو طاقتور بھی ہو دیانتدار بھی ہو۔''

ﻝ ان دونوں عورتوں میں سے اس ایک خاتون نے کہا جو آپ کو بلا کر لائی تھی اے میرے محترم باپ اسے بکریاں چرانے کے لیے ملازم رکھو لو۔ بے شک جسے آپ کام کے لیے ملازم رکھیں تو بہتر ملازم وہ ہے جو کام کرنے کی قوت اور طاقت رکھتا ہو اور امانتدار بھی ہو۔ اور علت کو دلیل کے قائم مقام رکھنا جائز ہے۔ اس بناء پر کہ حقیقتاً اچھے اجیر کے یہی اوصاف ہیں۔ اور اس میں مزید مبالغہ کے لیے اِنَّ کا اسم لفظ خیر اور پھر فعل ماضی ذکر کیا گیا ہے اگرچہ اس میں معنی مستقبل کا ہے۔ تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ آپ کے ان اوصاف کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔ خطیب نے اپنی تاریخ میں حضرت ابوذرؓ سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ اس لڑکی کو اس کے باپ نے کہا تجھے اس کی قوت و طاقت اور امانت کیسے معلوم ہے؟ تو اس نے جواباً عرض کی کہ اس کی قوت کا علم تو اس طرح ہوا کہ اس نے کنوئیں کے منہ سے وہ پتھر اکیلے اٹھایا جسے دس یا چالیس افراد مل کر اٹھا سکتے ہیں۔ اور اس کی امانت کی نشانی یہ ہے کہ اس نے مجھے اپنے پیچھے چلنے کے لیے کہا تاکہ تیز ہوا کے سبب کپڑا اڑنے کی وجہ سے اس کی نظر میرے بدن پر نہ پڑے(3)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تمام لوگوں سے زیادہ ذہین تین افراد تھے، ایک شعیب علیہ السلام کی بیٹی، دوسرا یوسف علیہ السلام کا وہ ساتھی جس نے یہ کہا تھا عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ (امید ہے یہ

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 239 (العلمیہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 851 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 141 (التجاریہ)

ہمیں نفع دے گا) اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جنہوں نے اپنی حیات میں ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کر دیا۔

قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ ؕ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۞

"آپ نے کہا میں چاہتا ہوں کہ میں بیاہ دوں تمہیں ایک اپنی ان دو بچیوں سے بشرطیکہ تو میری خدمت کرے آٹھ سال تک [1]۔ پھر اگر تم پورے کر دو دس سال تو یہ تمہاری اپنی مرضی ہے [2]۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تم پر سختی کروں [3]۔ تو پائے گا مجھے اگر اللہ نے چاہا نیک لوگوں سے (جو وعدہ ایفا کرتے ہیں) [4]"

[1] حضرت شعیب علیہ السلام نے اسے کہا "اِنِّیْ" میں نافع نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں ان دو بچیوں میں سے کسی ایک سے تمہارا نکاح کر دوں۔ شعیب جبائی کے قول کے مطابق ان دونوں کے نام صفورہ اور لیا تھے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے کہ ان کے اسماء صفورہ اور شرقا تھے۔ اور کئی دوسروں نے یہ کہا ہے کہ ان میں سے بڑی کا نام صفراء اور چھوٹی کا نام اصفیرا تھا۔ وہب بن منبہ نے کہا ہے کہ انہوں نے آپ کی شادی بڑی لڑکی سے کی۔ جبکہ اکثر کی رائے یہ ہے کہ آپ کی شادی چھوٹی لڑکی سے کی اور اس کا نام صفورہ تھا اور وہی آپ کو بلانے کے لیے بھی گئی تھی (1)۔ بزار اور طبرانی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث اسی طرح نقل کی ہے۔ حضرت امام بخاریؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ جب تجھ سے پوچھا جائے دو عورتوں میں سے کونسی عورت کے ساتھ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نکاح کیا تھا؟ تو یہ کہو کہ ان میں سے چھوٹی کے ساتھ۔ یہ وہ عورت ہے جو آپ کو بلانے آئی تھی۔ اور اسی نے کہا تھا یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ۔ لہٰذا ان دو میں سے چھوٹی کے ساتھ آپ کی شادی ہوگئی (2)۔ اس شرط پر کہ تو اپنا نفس مجھے اجرت پر دے اور تو میرا اجیر اور ملازم بن جائے۔ فراء نے کہا ہے کہ تم اس خدمت کو اس شادی کا عوض بنالو۔ عرب کہتے ہیں اجرک یا جرک ای اثابک (اس نے تجھے بدلہ دیا) (3)۔ معنی یہ ہے کہ تو اس شادی کے بدلے آٹھ سال تک میری بکریوں کو چرائے۔ پہلی دونوں تاویلوں کے مطابق ثمنی ظرف ہے اور فراء کی تاویل کے مطابق یہ مفعول بہ ہے اور اس میں مضاف مضمر ہے۔ اور حِجَجٍ حُجَّةٌ کی جمع ہے اور اس کا معنی سال ہے۔

[2] پھر اگر تم نے ریوڑ چرانے میں دس سال مکمل کیے تو یہ تمہاری اپنی مرضی ہوگی اور تمہاری طرف سے نیکی اور احسان ہوگا۔ تم پر لازم اور ضروری نہیں ہوگا۔ یہ عقد نکاح کی دعوت ہے۔ نفس نکاح نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ عقد نکاح ہوتا۔ تو آپ ان دونوں بچیوں میں سے ایک کو متعین کرتے ہوئے کہتے اَنْكَحْتُكَ هٰذِهٖ (میں نے تیرا اس سے نکاح کر دیا)۔ پس اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اس مشورہ کے بعد ان دونوں میں سے ایک معینہ بچی کے ساتھ آپ کا نکاح کیا۔ اور یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ آپ نے آٹھ سال تک بکریاں چرانے کو یا تو اس کا مکمل مہر قرار دیا یا پھر اسے کسی دوسرے مال کے ساتھ ملا کر مہر کا بعض حصہ قرار دیا۔ اور اسی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 141 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریۃ)

پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جسے امام احمد اور ابن ماجہ نے عتبہ بن منذر سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے کہ آپ ﷺ نے پڑھا طٰسٓمّٓ یہاں تک کہ آپ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ تک پہنچ گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی شرمگاہ کی عفت و پاکیزگی اور طعام بطن کے لیے اپنے آپ کو آٹھ سال تک کے لیے اجرت پر دے دیا۔(1)

مسئلہ:۔ اس آیت کریمہ اور حدیث طیبہ سے فقہاء نے یہ استدلال کیا ہے کہ جس آدمی نے کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ بطور مہر خاوند اپنی بیوی کی بکریاں چرائے گا تو یہ جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا اور اپنی شریعت میں اس کی نفی بیان نہیں کی۔ ابن سماعہ نے امام اعظم ابوحنیفہؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح نقل کی ہے۔ لیکن مبسوط اور جامع کی روایت کے مطابق امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت کریمہ اور مذکورہ حدیث طیبہ سے استدلال صرف اس صورت میں جائز ہے۔ جبکہ ریوڑ لڑکی کی ملکیت ہو کیونکہ ہماری شریعت میں مہر بالا جماع عورت کا حق ہوتا ہے نہ کہ اس کے ولی کا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں بکریاں حضرت شعیب علیہ السلام کی ملکیت تھیں۔ اور اجماع اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حکم ان کی شریعت میں تھا ہماری شریعت میں نہیں۔ یہ مسئلہ سورۃ النساء کی آیت وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ کی تفسیر میں ہم نے مفصل ذکر کر دیا ہے۔

۳ے اور میں نہیں چاہتا کہ تم پر دس سالوں کی تکمیل لازم کر کے یا اوقات کی پابندی اور پورا پورا کام لینے کے لیے طرح طرح کی جرح قدح کر کے آپ پر سختی کروں۔ مشقت الشق سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے الفرق۔ یعنی متفرق ہو جانا، پھٹ جانا۔ چونکہ وہ کام جو تجھ پر مشکل ہوتا ہے اسے برداشت کرنے کے بارے تیرا اعتقاد اور اسے بجالانے کے بارے میں تیری رائے متفرق ہو جاتی ہے (اس لیے مشکل اور دشوار کام کو شق کہا جاتا ہے)

۴ے سَتَجِدُنِیْٓ میں نافع نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے عمر نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تو مجھے حق صحبت کی حفاظت کرنے والوں اور جو کچھ میں نے کہا اسے پورا کرنے والوں میں سے پائے گا(2)۔ یہ جملہ اس ارشاد گرامی کی تاکید کے لیے ہے وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ مشروط کرنے سے مراد یہ ہے کہ نیکی کے وعدے کی تکمیل اور وفا کا انحصار اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد پر ہے۔ محض اپنی ذات پر توکل اور بھروسہ نہیں۔ اس شرط سے قطعاً یہ مقصود نہیں کہ انہیں وعدے کو وفا کرنے کے بارے تردد اور شک ہے۔

قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾

''موسیٰ نے کہا یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے پا گئی ۱ے ان دو میعادوں سے جو میعاد میں گزار دوں ۲ے تو مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی ۳ے اور اللہ تعالیٰ جو قول و قرار ہم نے کیا ہے اس پر نگہبان ہے ۴ے''

۱ے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ شرط اور وعدہ میرے اور آپ کے درمیان ثابت اور پختہ ہو گیا۔ پس جو ذمہ داری آپ نے مجھ پر عائد کی ہے وہ میں آپ کے لیے ادا کروں گا۔ اور دو بچیوں میں سے ایک سے شادی کے بارے میں جو حق آپ نے میرے لیے مقرر کیا

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3 صفحہ 172 (العلمیۃ)　　　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریۃ)

ہے وہ آپ میرے لیے ادا کریں گے۔

۲۔ اَیَّ قَضَیْتُ کی بناء پر منصوب ہے۔ اس میں مَا زائدہ ہے جو ابہام کی تاکید کے لیے ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ ان دو میعادوں یعنی طویل مدت یا چھوٹی مدت جو بھی میں آپ کے لیے گزار دوں۔ یعنی میں آپ کے لیے پوری کردوں۔

۳۔ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ کا جملہ اس معنی شرط کی جزاء ہے جسے اَیَّمَا کا لفظ متضمن ہے۔ اور جملہ شرطیہ ذٰلِکَ بَیْنِیْ وَبَیْنَکَ سے بدل ہے۔ معنی یہ ہے کہ آپ زیادتی کے مطالبہ کے سبب مجھ پر زیادتی نہیں کریں گے۔ اور جس طرح دس سال مکمل ہونے کے بعد مجھ سے مدت میں اضافے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح آٹھ برس مکمل ہونے کے بعد بھی مزید خدمت کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ یا معنی یہ ہے کہ اگر آٹھ سال مکمل ہونے کے بعد میں خدمت چھوڑ دوں تو اس اوپر والی زائد مدت کو چھوڑنے کے سبب میری طرف تعدی کی نسبت نہیں کی جائے گی اور نہ ہی مجھ پر کوئی حرج اور گناہ ہوگا۔ اختیار کو ثابت کرنے میں یہی انداز زیادہ بلیغ ہے اور اس میں دونوں مدتوں کو پورا کرنا مساوی ہے۔ بنسبت اس انداز کے کہ یہ کہا جاتا کہ اگر میں نے قلیل مدت پوری کردی تو مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی۔

۴۔ اور اللہ تعالیٰ ان شرائط پر جو ہم بیان کر رہے ہیں نگہبان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان جو قول و قرار ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ اس پر نگہبان ہے(1)۔ یہ جملہ ماقبل کلام سے حال ہے۔ اور وکیل وہ ہوتا ہے جس کے سپرد کوئی کام کر دیا جائے اور یہاں یہ شاہد اور نگہبان کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ اسی لیے اس کا صلہ عَلیٰ ذکر کیا گیا ہے۔

شداد بن اوس نے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت شعیب علیہ السلام اتنا زیادہ روئے کہ ان کی بینائی جاتی رہی پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی بصارت لوٹا دی۔ وہ پھر رونے لگے یہاں تک کہ پھر بینائی ختم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے پھر بینائی عطا فرما دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ رونا کیسا ہے کیا جنت کے شوق میں یا جہنم کے خوف سے؟ تو آپ نے عرض کی اے میرے پروردگار! ایسا ہرگز نہیں یعنی نہ تو میں جنت کے شوق میں روتا ہوں اور نہ ہی جہنم کے خوف سے روتا ہوں۔ بلکہ میں تو صرف تیرے دیدار کے شوق میں رو رہا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی اے شعیب! اگر ایسا ہے تو پھر تجھے میری ملاقات مبارک ہو۔ اسی لیے میں نے تیری خدمت کے لیے موسیٰ کو مقرر کر دیا ہے(2)۔ جب ان دونوں کے مابین معاہدہ مکمل ہوگیا تو شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی کو حکم ارشاد فرمایا کہ موسیٰ کو لاٹھی لا کر دو جس کے ساتھ وہ بکریوں کی درندوں سے حفاظت کریں گے۔ اب اس عصا (لاٹھی) کے بارے علماء کی مختلف آراء ہیں حضرت عکرمہ کا قول ہے کہ یہ لاٹھی حضرت آدم علیہ السلام جنت سے لائے پھر حضرت آدم علیہ السلام کے وصال کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس عصا کو اٹھالیا، پھر یہ انہی کے پاس رہا یہاں تک کہ ایک رات وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملے اور وہ انہیں دے دیا۔ اور دوسروں نے یہ کہا ہے کہ یہ عصا جنت کے درخت آس سے بنا ہوا تھا آدم علیہ السلام اسے جنت سے ساتھ لائے تھے۔ پھر انبیاء علیہم السلام کو وراثۃً یہ ملتا رہا۔ نبی کے علاوہ کوئی اور اسے نہیں لے سکتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک پہنچ گیا۔ پھر ان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہنچا۔ پھر ان سے شعیب علیہ السلام تک پہنچا۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا عصا انہی کے پاس رہا۔ پھر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا کر دیا۔(3)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریہ)

سدی نے کہا ہے کہ یہ عصا ایک فرشتے نے انسانی صورت میں ان کے پاس امانت رکھا ہوا تھا۔ پس جب آپ نے اپنی بچی کو عصا لانے کا حکم دیا۔ تو اس نے موسیٰ علیہ السلام کو وہی لا کر دے دیا۔ جونہی شعیب علیہ السلام نے اسے دیکھا تو بچی کو فرمایا یہ عصا واپس لے جا اور اس کے سوا کوئی اور لا کر اسے دے دے۔ چنانچہ اس نے اسے واپس رکھا اور اس کے علاوہ دوسرا اٹھانے کی کوشش کی مگر ہر بار یہی عصا اس کے ہاتھ میں آیا اس نے مسلسل تین بار ایسا کیا۔ بالآخر وہی عصا شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو دے دیا اور موسیٰ علیہ السلام اسے اپنے ساتھ باہر لے گئے۔ بعد ازاں حضرت شعیب علیہ السلام اس پر خوب نادم ہوئے کہ وہ تو ان کے پاس امانت تھا۔ نتیجۃً آپ موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے چل پڑے تا کہ انہیں تلاش کر کے عصا واپس لے آئیں۔ مگر اب موسیٰ علیہ السلام نے انہیں دینے سے انکار کر دیا اور کہا یہ تو میرا عصا ہے۔ بالآخر وہ دونوں اس پر متفق ہوئے کہ جو آدمی اب سب سے پہلے انہیں ملے گا اس کا فیصلہ دونوں قبول کریں گے پس اتنے میں ایک فرشتہ انسانی صورت میں ان کے پاس آیا اس نے فیصلہ یہ کیا کہ وہ عصا کو زمین پر پھینک دیں پس جس نے اسے اٹھا لیا وہ اسی کا ہو جائے گا۔ چنانچہ اسے زمین پر رکھ دیا گیا پھر حضرت شعیب علیہ السلام نے اسے اٹھانے کی پوری کوشش کی مگر نہ اٹھا سکے۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام نے جونہی اسے اٹھانے کی کوشش کی فوراً اٹھا لیا نتیجۃً حضرت شعیب علیہ السلام نے وہ انہی کے پاس رہنے دیا۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام مدت مکمل کر چکے اور شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی ان کے حوالے کر دی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زوجہ سے کہا اپنے باپ سے یہ مطالبہ کرو کہ کچھ بکریاں ہمیں بھی دیں۔ چنانچہ اس نے اپنے والد محترم سے اس کا مطالبہ کیا۔ تو جواباً شعیب علیہ السلام نے کہا اس سال جتنے دورنگے بچے پیدا ہوں گے وہ تمہارے ہوں گے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حسن کارکردگی اور احسن انداز میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے اعزاز میں اور اپنی بیٹی کے ساتھ اظہار شفقت و محبت کے طور پر انہیں کچھ دینے کا ارادہ فرمایا تو کہا میں نے تمہیں بکریوں کے وہ تمام بچے دے دیئے جو اس سال چتکبرے پیدا ہوں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ خواب بتایا کہ وہ اپنا عصا اس پانی پر ماریں جو وہ اپنی بکریوں کو پلاتے ہیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے پانی پر عصا مارا پھر بکریوں کو وہ پانی پلایا۔ پس جس نے بھی وہ پانی پیا۔ ان تمام نے آگے نر اور مادہ چتکبرے بچے دیئے۔ یہ دیکھ کر شعیب علیہ السلام جان گئے کہ یہ تو خاص رزق اور انعام ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ چنانچہ آپ نے اپنا وعدہ وفا کرتے ہوئے وہ تمام چتکبرے بچے موسیٰ علیہ السلام کے حوالے کر دیئے۔ (1)

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

"پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے مقررہ مدت پوری کر دی [1] اور (وہاں سے) چلے اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر تو آپ نے دیکھی طور کے ایک طرف آگ آپ نے اپنے اہل خانہ سے کہا تم ذرا ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے [2] (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں لے آؤں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر یا آگ کی کوئی چنگاری [3] تا کہ تم اسے تاپ سکو [4]"

[1] پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے مقررہ مدت پوری کر دی اور اس سے فارغ ہو گئے۔ علامہ بغویؒ نے سعید بن جبیر سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا مجھ سے حیرہ کے یہودیوں میں سے ایک نے پوچھا موسیٰ علیہ السلام نے دو مدتوں میں سے کونسی پوری کی تھی؟ تو میں نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریہ)

کہا میں تو نہیں جانتا البتہ میں حبر العرب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس جاؤں گا اور ان سے اس بارے میں دریافت کروں گا۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوا اور اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دونوں میں سے زیادہ اور اچھی مدت کو مکمل کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا رسول جب کچھ کہتا ہے تو اس کے مطابق عمل بھی کرتا ہے۔(1)

علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب تجھ سے پوچھا جائے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کونسی مدت پوری کی؟ تو تیرا جواب یہ ہونا چاہئے کہ دونوں مدتوں میں سے بہتر اور خوشگوار مدت انہوں نے مکمل کی(2) ''رواہ البزار'' اور مجاہد نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام مدت مکمل کر چکے تو آپ مزید دس سال تک اپنے خسر کے پاس ٹھہرے رہے۔ گویا اس طرح آپ بیس برس تک وہاں رہے۔ پھر آپ نے مصر واپس لوٹنے کی اجازت طلب کی، تو حضرت شعیب علیہ السلام نے آپ کو اجازت دے دی۔ لہٰذا آپ مصر کی طرف چلے گئے(3)۔ یہاں تک کہ جب آپ طور سیناء کے قریب صحراء میں پہنچے صورت حال یہ تھی کہ موسم سرما کی انتہائی سخت سرد اور تاریک رات تھی اور آپ کی اہلیہ محترمہ بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ تو آپ نے کوہ طور کی ایک سمت آگ دیکھی۔ تو آپ نے اپنے اہل خانہ سے کہا تم ذرا ٹھہرو۔ اگر یہ صحیح ہے کہ آپ کے ساتھ اپنی اہلیہ کے بغیر اور کوئی نہ تھا تو پھر جمع کی ضمیر ذکر نہ ہوتی جس کا مرجع اہل ہے۔

2۔ ''اِنِّیٓ'' اسے نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اٰنَسْتُ نَارًا کا جملہ امکثوا کی علت بیان کر رہا ہے (تم ٹھہرو کیونکہ میں نے آگ دیکھی ہے)۔

3۔ اس میں کوفیوں نے یاء کو ساکن اور باقیوں نے مفتوح پڑھا ہے۔ معنی اس طرح ہے شاید میں وہاں سے تمہارے پاس راستے کو روشن کرنے کے لیے کچھ آگ لے آؤں۔ کیونکہ وہ راستہ بھول چکے تھے۔ یا آگ کی چنگاری لے آؤں۔ پس جَذْوَۃٍ میں عاصم نے جیم کو مفتوح، حمزہ نے مضموم اور باقیوں نے مکسور پڑھا ہے، یعنی اس میں یہ تینوں لغات ہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ قتادہ اور مقاتل نے کہا ہے کہ جذوۃ سے مراد وہ لکڑی ہے جس کا کچھ حصہ جل چکا ہو۔ اس کی جمع جذی آتی ہے(4)۔ قاموس میں ہے کہ جذوۃ سے مراد آگ کا تہائی حصہ اور آگ کی چنگاری ہے۔(5)

4۔ یعنی ہم اسے آگ میں سے لے لیں گے۔ مِنَ النَّارِ میں مِنْ یا تو ابتدائیہ ہے یا تبعیضیہ ہے۔ اور علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ جذوۃ موٹی لکڑی کو کہتے ہیں چاہے اس کے سرے پر آگ ہو یا نہ ہو(6)۔ اسی لیے اس کی وضاحت مِنَ النَّارِ کے قول سے فرمائی۔ گویا اس میں مِنْ بیانیہ ہے۔ تاکہ تم اسے تاپ سکو۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۰

''پس جب آپ وہاں گئے تو ندا آئی وادی کے دائیں کنارہ سے 1۔ اس بابرکت مقام میں ایک درخت سے 2۔ کہ اے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریۃ)
5۔ [illegible] 1997 [illegible]
6۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 291 (الفکر)

موسیٰ! ۳؎ بلاشبہ میں ہی ہوں اللہ جو رب العالمین ہے ۴؎ ''

۱؎ پس جب آپ وہاں گئے تو وادی میں آپ کی دائیں جانب سے ایک کنارے سے ندا دی گئی۔

۲؎ نُوْدِیَ کے متعلق ہے۔ یعنی یہ مقام موسیٰ کے لیے اس حیثیت سے بابرکت ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام فرمایا اور آپ کو نبوت سے بھی سرفراز فرمایا۔ عطا نے کہا ہے کہ مبارکہ سے مراد مقدسہ ہے(1) ترکیب کلام میں من الشجرة من الشاطیٔ سے بدل اشتمال ہے۔ کیونکہ یہ اس کنارے پر اگا ہوا تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے یہ سرسبز درخت تھا جو چمک رہا تھا۔ قتادہ، مقاتل اور کلبی نے کہا ہے کہ یہ عوجہ تھا، وھب نے کہا ہے یہ علیق تھا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے یہ عذاب تھا۔(2)

۳؎ اَنْ مفسرہ ہے جو نُوْدِیَ کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔ اِنِّیْ میں نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔

۴؎ (کہ اے موسیٰ! بلاشبہ میں ہی ہوں اللہ جو رب العالمین ہے) سورۂ طٰہٰ میں فرمایا اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ (بلاشبہ میں ہی تیرا رب ہوں)۔ سورۂ نمل میں فرمایا اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (بے شک وہ اللہ میں ہی ہوں جو غالب حکمت والا ہے)۔ مذکورہ آیات میں الفاظ گو مختلف ہیں لیکن مقصود ایک ہے۔ یہ یا تو روایت بالمعنی کے اعتبار سے ہے۔ یا پھر وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت تو مذکورہ تمام صفات ذکر فرمائیں۔ لیکن قرآن کریم میں بیان کرتے وقت ان میں سے بعض پر ہی اختصار کیا۔ جیسا کہ بعض دیگر مقامات پر بھی کلام میں یہ اختصار موجود ہے۔ مثلاً سورۂ طٰہٰ میں ذکر فرمایا فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى الخ وَمَا تِلْكَ بِیَمِیْنِكَ یٰمُوْسٰی اور سورۂ نمل میں فرمایا بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ الخ (یعنی اس امر الفاظ تو مختلف ہیں مگر معانی سب میں ایک ہی مراد ہیں۔ جیسے روایت بالمعنی ہوتی ہے)۔

وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ﴿۳۱﴾

''اور (ذرا) ڈال دو (زمین پر) اپنے عصا کو اب جو اسے دیکھا تو وہ اس طرح لہرا رہا تھا جیسے وہ سانپ ہو۔ آپ پیٹھ پھیر کر چل دیئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (آواز آئی) اے موسیٰ! سامنے آؤ اور ڈرو نہیں یقیناً تم (ہر خطرہ سے) محفوظ ہو ۱؎ ''

۱؎ اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے پس آپ نے عصا ڈال دیا تو وہ سانپ بن گیا اور لہرانے لگا۔ پس اب جو اسے دیکھا تو وہ اس طرح لہرا رہا تھا جیسے وہ سانپ ہو، یعنی وہ حرکت کی تیزی اور اپنے اضطراب کی شدت میں چھوٹے سانپ کی مثل تھا۔ آپ اس سے پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ تو آواز آئی اے موسیٰ! سامنے آؤ اور ڈرو نہیں۔ یقیناً تم ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ ہو۔ کیونکہ میرے رسول کسی چیز سے ڈرتے نہیں ہیں۔

اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّ اضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۳۲﴾

''ڈالو اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں وہ نکلے گا سفید (چمکتا ہوا) بغیر کسی تکلیف کے ۱؎ اور رکھ لے اپنے سینہ پر اپنا ہاتھ خوف دور کرنے کے لیے ۲؎ تو یہ دو دلیلیں ہیں ۳؎ تمہارے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں (کی طرف لے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریۃ)

جانے) کے لیے بے شک وہ نافرمان لوگ ہیں ۔“

۱۔ اپنا ہاتھ اپنی قمیص کے گریبان میں داخل کیجئے ”تَخْرُجْ“ امر کے جواب میں ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ اور ”بَيْضَآءَ“ تخرج کے محذوف مفعول سے حال ہے۔ یعنی تو اسے نکالے گا درآنحالیکہ وہ سفید چمکدار ہوگا۔ بغیر کسی تکلیف کے مِنْ غَيْرِ سُوْءٍ بیضاء کے متعلق ہے۔

۲۔ الرَّهْبُ میں حفص کے سوا کوفیوں اور اہل شام نے راء کو مضموم اور ھاء کو ساکن پڑھا ہے۔ حفص نے راء کو مفتوح اور ھاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حرفوں کو مفتوح پڑھا ہے۔ ان تمام لغات میں اس کا معنی خوف ہی ہے۔ عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیں تاکہ ان کا خوف ختم ہو جائے۔ اور آپ نے فرمایا موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی بھی ڈرنے والا جب اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیتا ہے تو اس کا خوف جاتا رہتا ہے۔(1)

مجاہد نے کہا ہے جو بھی گھبرانے والا اپنے دونوں ہاتھ سینے کے ساتھ ملا لیتا ہے تو اس کی گھبراہٹ ختم ہو جاتی ہے۔ جناح سے مراد مکمل ہاتھ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد بازو ہیں۔ عصا کے سانپ میں تبدیل ہونے کے وقت جو سینے پر ہاتھ رکھنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو یہ لفظ اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں بلکہ اس سے مراد سکون، جرأت اور استقامت و ثبات ہے۔ گویا اس میں پرندے کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ وہ بھی خوف کی حالت میں اپنے پروں کو پھیلا لیتا ہے۔ اور جب امن اور اطمینان کی حالت ہو تو وہ انہیں سمیٹ لیتا ہے۔(2)

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اس کا مطلب ہے تم اپنے خوف کو دور کرو اور اپنے پہلو کو اپنے لیے نرم کر لو کیونکہ ڈرنے والے کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کا دل مضطرب ہوتا ہے اور بدن کانپ رہا ہوتا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات بھی ہیں وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞ اور وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ۔ اس سے مراد ان سے نرمی کرنا ہے۔ فراء نے کہا ہے کہ جناح سے مراد عصا ہے۔ تو معنی یہ ہوگا تم اپنا عصا اٹھا لو۔ اور رَهْب سے مراد بنی حمیر کی لغت کے مطابق آستین ہے۔ اصمعی نے کہا ہے کہ میں نے بعض عربوں کو یہ کہتے سنا ہے اَعْطِنِيْ مَافِيْ رَهْبِكَ اَيْ مَافِيْ كُمِّكَ (یعنی جو کچھ تمہاری آستین میں ہے مجھے دے دو)۔ تو آیت کریمہ میں معنی یہ بنا کہ آستین سے نکال کر اپنا ہاتھ سینے سے لگا لو(3) کیونکہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ فرمایا تھا۔ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ اس وقت وہ عصا کو پکڑے ہوئے تھے اور ان کا ہاتھ آستین میں تھا۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ ”اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ“ میں عطف تفسیری ہے۔ یعنی دوسرا جملہ پہلے جملے کی تفسیر اور وضاحت بیان کرتا ہے۔ گویا دوسرے جملے سے بھی مقصود یہی ہے کہ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو۔ اس تکرار سے مقصود دو امر کو بیان کرنا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔ جرأت اور ضبط نفس، خوف کا ازالہ اور قوت و ثبات کا اظہار۔ اور یہی مفہوم اس قول سے مقصود ہے اضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ یعنی تمہارے وہ دونوں ہاتھ جنہیں تم نے سانپ سے بچنے کے لیے پھیلایا ہوا ہے خوف کو دور کرتے کے لیے انہیں گریبان میں ڈال لو۔ اور ان میں سے دوسری چیز ایک دوسرے معجزہ کا اظہار ہے۔ اور اس قول سے یہی مقصود ہے تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْءٍ۔ اور اس پر تو سورۂ طٰہٰ میں موجود اللہ تعالیٰ کا ارشاد صراحۃً دلالت کرتا ہے وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریہ)

بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ اٰیَةً اُخْرٰى

۳؎ یہ اشارہ عصا اور ہاتھ کی طرف ہے۔ ابن کثیر اور ابن عمرو نے اس کی نون کو مشدد اور باقیوں نے مخفف پڑھا ہے۔ قاموس میں ہے کہ البرہان کا معنی حجۃ (دلیل) ہے۔ اور برہن علیہ کا معنی حجت قائم کرنا ہے(1)۔ اور اس کا وزن فُعْلَانٌ ہے۔ اور بعض نے اس کا وزن فُعْلَانٌ کہا ہے۔ اس کا مادہ البَرْہُ ہے۔ مثلاً جب کوئی آدمی سفید ہو جائے تو کہا جاتا ہے بَرِہَ الرَّجُلُ اور سفید عورت کے لئے بُرْهَاءُ اور بَرَهْرَهَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور قاموس میں ہے کہ اَبْرَهَ کا معنی ہے اس نے دلیل قائم کی یا اس نے عجیب و غریب باتوں کا اظہار کیا اور لوگوں پر غالب آ گیا۔(2)

۴؎ یہ دونوں دلیلیں تمہارے رب کی طرف سے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ بُرهَانِ کی صفت ہے اور یہ شبہ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی ان دونوں کے ساتھ تمہیں فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔ یہ یا تو برہانان کی صفت کے بعد دوسری صفت ہے۔ یا پھر یہ محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی اِذْهَبْ بِهِمَا اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ (توان دونوں کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف جا)۔ بے شک وہ نافرمان لوگ ہیں۔ یہ جملہ محل تعلیل میں ہے۔ کیونکہ وہ یہ حق رکھتے تھے کہ ان کی طرف رسول بھیجا جائے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾

"آپ نے عرض کی میرے رب! میں نے تو قتل کیا تھا ان سے ایک شخص کو پس میں ڈرتا ہوں کہیں وہ مجھے قتل نہ کر ڈالیں ۱؎"

۱؎ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ میں ضمیر مفعول محذوف ہے۔ اصل میں اس طرح ہے اَنْ یَقْتُلُوْنِیْ۔

وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ ؗ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾

"اور میرا بھائی ہارون وہ زیادہ فصیح ہے مجھ سے گفتگو کرنے میں ۱؎ تو اسے بھیج میرے ساتھ ۲؎ میرا مددگار بنا کر ۳؎ تاکہ وہ میری تصدیق کرے ۴؎ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے ۵؎"

۱؎ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ اس لیے کہا چونکہ منہ میں آگ کی چنگاری رکھنے کے سبب آپ کی زبان میں گرہ اور لکنت پڑ گئی تھی۔

۲؎ حفص نے مَعِیَ کی یاء کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔

۳؎ مثلاً کہا جاتا ہے ارْدَتُه یعنی میں نے اس کی مدد کی۔ ترکیب کلام میں رِدْاً ارسلہ کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔ ردأ اصل میں اس شے کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ مدد کی جاتی ہے۔ جیسے دِفْءٌ۔ نافع نے رِدْاً کی دال کو بغیر ہمزہ کے مفتوح پڑھا ہے۔ باقیوں نے دال کو ساکن اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حمزہ نے وقف کی صورت میں دونوں کو ساکن پڑھا ہے۔

۴؎ عاصم اور حمزہ نے رِدْاً کی صفت ہونے کی بناء پر یُصَدِّقُنِیْ کو مرفوع پڑھا ہے۔ یعنی ردأ مصدقني (میری تصدیق کرنے والا معاون و مددگار) اور دوسروں نے اسے جواب دعا ہونے کی وجہ سے مجزوم پڑھا ہے۔ اور اس میں ضمیر عائد ضمیر مرفوع ہے یعنی اگر تو اسے میرے ساتھ بھیجے گا تو وہ پختہ دلائل، شبہات کو ختم کرنے اور زبان کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ میری تصدیق کرے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کی توضیح و تقریر کے سبب قوم کا تصدیق کرنا ہے۔ لیکن فعل کی نسبت ان کی طرف کی گئی ہے اس لیے کہ آپ

1۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1550 (التراث العربی)	2۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1550 (التراث العربی)

قوم کی تصدیق کا سبب بنیں گے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ ضمیر مرفوع فرعون کی طرف لوٹ رہی ہے۔ معنی یہ ہے اگر تو ہارون کو میرے ساتھ بھیجے تا کہ ہارون کی حسن تقریر کے سبب فرعون میری تصدیق کرے۔

۵ "اِنِّیْٓ" میں نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اور "اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ" کو جمہور نے حذف یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ورش نے حالت وصل میں یاء کو قائم رکھا ہے، یعنی یکذبونی۔ معنی یہ ہے میں ڈرتا ہوں کہ فرعون اور اس کی قوم مجھے جھٹلائیں گے کیونکہ ضرورت کے وقت میری زبان میرا ساتھ نہیں دیتی۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا ۚۛ بِاٰیٰتِنَاۤ ۚۛ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم مضبوط کریں گے تیرے بازو کو تیرے بھائی سے ۱؎ اور ہم عطا کریں گے تمہیں ایسا غلبہ (اور شوکت) کہ وہ تمہیں (اذیت) نہیں پہنچا سکیں گے ۲؎ ہماری نشانیوں کے باعث۔ تم دونوں اور تمہارے پیروکار ہی غالب آئیں گے ۳؎"

۱؎ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم تیرے بازو کو تیرے بھائی سے مضبوط اور قوی کر دیں گے۔ بازو کو مضبوط کرنے سے مراد تقویت دینا ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی شخص کی قوت کا انحصار کسی کام کو سرانجام دینے میں اس کے ہاتھ کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے ید (ہاتھ) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ہاتھ کی قوت بازو کی قوت سے ہوتی ہے۔ اور ان دنوں ہارون مصر میں تھے۔

۲؎ اور ہم تمہیں ایسا غلبہ یا حجت عطا کریں گے کہ فرعون اور اس کی قوم تمہیں ہماری نشانیوں کے سبب کوئی اذیت نہیں پہنچا سکیں گے۔

۳؎ یا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے یعنی اذھبا باٰیٰتِنَا (تم ہماری نشانیاں لے کر جاؤ) یا پھر یہ نَجْعَلُ کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ہم تمہیں ایسے معجزات عطا کریں گے جو تمہیں دشمن پر غلبہ عطا کر دیں گے۔ یا یہ لَا یَصِلُوْنَ کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ہم اپنی نشانیوں یعنی معجزات کے سبب فرعون اور اس کی قوم کو روکے رکھیں گے وہ تم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ یا پھر یہ قسم ہے اور اس کا جواب لَا یَصِلُوْنَ ہے۔ یا یہ غٰلِبُوْنَ کا بیان ہے۔ یا تو یہ اس کے درمیان صلہ ہے یا یہ اس کے لیے صلہ کے معنی میں ہے جب کہ لام اس میں تعریف (معرفہ) کے لیے ہے نہ کہ بمعنی الذی ہو۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْۤ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۶﴾

"پھر جب آئے فرعونیوں کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) ہماری روشن نشانیاں لے کر۔ انہوں نے کہا نہیں ہے یہ مگر جادو گھڑا ہوا۔ اور ہم نے نہیں سنیں اس قسم کی باتیں اپنے پہلے آباؤ اجداد کے زمانہ میں ۱؎"

۱؎ یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کی طرف واضح اور روشن نشانیاں یعنی عصا اور ید بیضاء لے کر آئے پس جب آپ ان کے پاس آئے تو انہوں نے کہا یہ عصا اور دیگر نشانیاں نہیں ہیں مگر گھڑا ہوا جادو۔ جس کی مثل اس سے قبل کسی نے نہیں کیا۔ یا یہ جادو ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کرتے ہیں پھر اس کی جھوٹی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر

دیتے ہیں۔ یا یہ جادو بھی جادو کی دوسری تمام قسموں کی طرح گھڑا ہوا اور جھوٹا ہے۔ اور ہم نے اس جادو یا دعویٰ نبوت کے بارے اپنے پہلے آباؤ اجداد کے زمانہ میں نہیں سنا۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾

''اور موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا میرا رب خوب جانتا ہے اسے جو اس کی بارگاہ سے (نور) ہدایت لے کر آیا ہے ۱؎۔ اور وہی جانتا ہے کہ اس کا انجام اچھا ہوگا۔ بے شک بامراد نہیں ہوتے ظلم وستم کرنے والے ۲؎''

۱؎ رَبِّیْٓ میں نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔ (اور موسیٰ علیہ السلام) نے کہا میرا رب تمہاری نسبت اسے خوب جانتا ہے۔ جو اس کی بارگاہ سے نور ہدایت لے کر آیا ہے)۔ پس وہ جانتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور تم باطل پر ہو۔ تم ظلم و زیادتی کی بناء پر حق کا انکار کرتے ہو حالانکہ وہ روشن علامات کے ساتھ واضح ہو چکا اور تمہارے نفس اندرونی طور پر اس کا یقین رکھتے ہیں۔ اس کا عطف قالوا پر ہے۔ اور مقصود دونوں قولوں کو بیان کرنا ہے تا کہ وہ دونوں میں غور وفکر کر کے صحیح کو قول فاسد سے ممتاز کر سکے۔ ابن کثیر نے واؤ عاطفہ کے بغیر قَالَ مُوْسیٰ پڑھا ہے۔ ان کے مصاحف میں اسی طرح ہے۔ کیونکہ یہ ان کے کلام کے جواب میں ہے۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ ان کے جواب میں فرمایا وہ نیا کلام ہے۔

۲؎ وَمَنْ تَكُوْنُ کو حمزہ اور کسائی نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے تاء کے ساتھ۔ چونکہ اس کا مسند الیہ مؤنث غیر حقیقی ہے لہٰذا اس میں دونوں صورتیں جائز ہیں۔ اس جملہ کا عطف مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے جس کا انجام دار آخرت میں اچھا ہوگا۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ دار سے مراد دنیا ہے اور اس کا انجام اصلی تو جنت ہے۔ کیونکہ دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیا گیا ہے آخرت میں اسی پر جزاء دی جائے گی۔ اس کا مقصود حقیقی تو ثواب ہے اور عقاب (سزا) مقصود بالعرض ہے (1) اور محققین نے کہا ہے کہ عقبیٰ اور عاقبۃ کا اطلاق اس ثواب اور جزاء پر ہوتا ہے جو نیکیوں پر دیا جائے گا۔ اور عقاب، عقوبۃ اور معاقبۃ اس سزا کو کہا جاتا ہے جو برائیوں اور گناہوں پر دی جائے گی۔ یعنی عقبیٰ اور عاقبۃ اچھے انجام کو کہتے ہیں اور عقاب، عقوبۃ اور معاقبت برے انجام کو۔ مثلاً رب کریم نے فرمایا: خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا وَقَالَ عُقْبَى الدَّارِ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ فَحَقَّ عِقَابِ، شَدِيْدُ الْعِقَابِ، وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ۔ بے شک ظلم وستم کرنے والے دنیا میں ہدایت کے ساتھ اور آخرت میں حسن وثواب کے ساتھ کامیاب نہیں ہوتے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۸﴾

''یہ (سن کر) فرعون نے کہا اے اہل دربار! میں تو نہیں جانتا کہ تمہارے لیے میرے سوا کوئی اور خدا ہے۔ پس آگ جلا میرے لیے اے ہامان! اور اس پر اینٹیں پکوا میرے لیے ایک اونچا محل تعمیر کر ۱؎ شاید (اس پر چڑھ کر) میں سراغ لگا سکوں موسیٰ کے خدا کا ۲؎ اور میں تو اس کے بارے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے ۳؎''

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 293 (الفکر)

لے فرعون نے اپنے سوا کسی اور اللہ کے علم کی نفی کی ہے۔ وجود کی نفی نہیں کی، کیونکہ اس کے پاس کوئی ایسی پختہ دلیل نہیں تھی جو اسے عدم وجود کا یقین دلاتی۔ اسی لیے اس نے کہا پس اے ہامان! میرے لیے آگ جلا۔ ہامان فرعون کا وزیر تھا۔ فرعون نے اسے کہا تھا میرے لیے اینٹیں پکوا۔ کہا جاتا ہے یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اینٹیں بنوا کر ان سے عمارات تعمیر کرائی۔ "لِّيْ صَرْحًا" پس میرے لیے انتہائی اونچا محل تعمیر کر۔

ع اسے یہ وہم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کا خدا آسمان میں ہے اور اس تک چڑھنا ممکن ہوگا۔

سے میں تو موسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ یہ کہنے میں جھوٹے ہیں کہ زمین و آسمان کا خالق ایک ہے۔ چونکہ فرعون دہریہ تھا اس لیے وہ یہ اعتقاد نہیں رکھتا تھا کہ تمام ممکنات کی نسبت بہ حیثیت خلق واجب کی طرف کرنا درست ہے۔ بلکہ اس کا خیال یہ تھا کہ جو بھی سلطان دوسروں پر غالب ہو وہی اللہ ہے اور عبادت کا مستحق ہے۔ صَرْحًا میں تنوین تنکیر تعظیم کے لیے ہے۔ اور لَعَلِّی میں کوفیوں نے یاء کو ساکن اور باقیوں نے مفتوح پڑھا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ہامان نے پچاس ہزار افراد کام کرنے والے جمع کیے۔ تبعین، مزدور اینٹیں اور چونا پکانے والے، لکڑی کا کام کرنے والے اور کیل بنانے والے ان کے سوا تھے۔ انہوں نے انتہائی بلند و بالا اور مضبوط پختہ عمارت کھڑی کر دی یہاں تک کہ وہ اتنی بلند تھی کہ اس سے قبل کسی کی عمارت بھی اس کی بلندی تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں انہیں آزمانے اور فتنہ میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرمایا۔ پس جب وہ تعمیر سے فارغ ہو گئے۔ فرعون اور اس کی قوم کے افراد اس کے اوپر چڑھے۔ تو اس نے انہیں تیر پھینکنے کا حکم دیا۔ پس جو بھی تیر آسمان کی طرف پھینکا جاتا، تو وہ خون آلود ہو کر واپس آتا۔ یہ دیکھ کر فرعون نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ میں نے موسیٰ (علیہ السلام) کے خدا کو قتل کر دیا (نعوذ باللہ من ذالک) فرعون عربی گھوڑے کے ذریعے اس پر چڑھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے غروب آفتاب کے وقت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا۔ پس اس نے اسے اپنا پر مار کر تین ٹکڑوں میں کاٹ دیا۔ ان میں سے ایک فرعون کے لشکر پر جا گرا جس سے لاکھوں افراد مارے گئے، ایک سمندر میں جا گرا اور ایک ٹکڑا مغرب میں۔ اور جس نے بھی اس کام میں حصہ لیا تھا وہ باقی نہیں بچا بلکہ ہلاک ہو گیا۔(1)

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ ۝

"اور تکبر کیا اس نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں ناحق لے اور وہ یہ گمان کرتے رہے کہ انہیں ہماری طرف نہیں لوٹایا جائے گا ع"

لے اور بغیر استحقاق کے اس نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں تکبر کیا۔ کیونکہ بڑائی کے اظہار کا حق اسے ہے جس سے اوپر یا اس کی مثل بلکہ اس سے کچھ کم بھی اور کوئی بڑا نہ ہو۔ اور یہ وصف صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہے جو اپنے سوا ہر شے کا خالق ہے۔ پس وہی حقیقت میں بڑا ہے بلکہ کبریائی میں انتہاء کو پہنچنے والا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي وَالْعَظَمَةُ إِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ فِيْ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا قَذَفْتُهُ فِي النَّارِ" (بڑائی میری چادر ہے، عظمت میری ازار ہے پس جس نے بھی ان میں سے کوئی مجھ سے چھیننے کی کوشش کی تو میں اسے جہنم میں پھینکوں گا۔) اسے احمد، ابو داؤد اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی روایت کیا ہے(2)۔ اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں "اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ فِيْ رِدَائِيْ قَصَمْتُهُ" (کبریائی میری چادر ہے پس جس نے میری چادر مجھ

سے چھیننے کی کوشش کی میں اسے توڑ دوں گا (یعنی ہلاک کر دوں گا) اور اسی حدیث کو سمویہ نے ابو سعید اور ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔"اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ وَالْعِزُّ اِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ فِيْ شَيْءٍ مِّنْهُمَا عَذَّبْتُه" (کبریائی میری چادر ہے اور عزت میری ازار پس جس کسی نے ان میں سے کوئی مجھ سے چھیننے کی کوشش کی تو میں اسے عذاب دوں گا)

۲؎ لَا يُرْجَعُوْنَ میں نافع، یعقوب، حمزہ اور کسائی نے یاء کو مفتوح اور جیم کو مکسور پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ فعل مجرد اور معروف ہے۔ اور باقیوں نے یاء کو مضموم اور جیم کو مفتوح پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ فعل مجہول ہے اور ارجاع سے ماخوذ ہے۔

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾

"پس ہم نے پکڑ لیا اسے اور اس کے لشکریوں کو اور پھینک دیا انہیں سمندر میں۔ دیکھو! کیسا (ہولناک) انجام ہوا ظلم و ستم کرنے والوں کا ۱؎"

۱؎ پس ہم نے اسے اور اس کے لشکریوں کو پکڑا اور انہیں سمندر میں پھینک دیا۔ دیکھو! کیسا ہولناک انجام ہوا ظلم و ستم کرنے والوں کا۔ لہٰذا آپ اپنی قوم کو اس قسم کے عذاب سے ڈرایئے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾

"اور ہم نے بنایا تھا انہیں ایسے پیشوا جو بلا رہے تھے (اپنی رعایا کو) آگ کی طرف ۱؎ اور روز حشر ان کی مدد نہیں کی جائے گی ۲؎"

۱؎ اور ہم نے انہیں گمراہ لوگوں کا پیشوا بنا دیا اس لیے کہ وہ گمراہ کرنے پر برانگیختہ کرتے تھے۔ یا ہم نے انہیں مال و جاہ عطا کر کے دنیا میں پیشوا اور سردار بنا دیا۔ جو لوگوں کو آگ کی طرف بلا رہے تھے۔ یعنی کفر اور گناہوں کے ایسے اسباب کی طرف جو انہیں جہنم میں ڈالے جانے کا موجب تھے۔ ترکیب کلام میں يَدْعُوْنَ ائمۃ کی صفت ہے۔ اور قیامت کے دن ان میں سے کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچایا جائے گا۔ اس کا عطف یدعون پر ہے۔

وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿۴۲﴾

"اور ہم نے ان کے پیچھے اس دنیا میں بھی لعنت لگا دی اور قیامت کے دن بھی ان کا شمار ملعونوں میں ہوگا ۱؎"

۱؎ اور ہم نے انہیں رحمت سے دور بھگاتے ہوئے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی۔ یا ہم نے ان کے پیچھے اس دنیا میں لعنت کرنے والوں کی لعنت لگا دی۔ کہ اللہ تعالیٰ، ملائکہ اور مؤمنین ان پر لعنت کرتے ہیں۔ اس کا عطف جعلنا پر ہے۔ اور وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ مقبوحین کے متعلق ہے (اور قیامت کے دن ان کا شمار ملعونوں میں ہوگا)۔ مقبوحین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں رحمت سے دور کر دیا گیا ہے اور ان پر لعنت کی گئی ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے یہ وہ ہیں جنہیں ہلاک کیا گیا ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ ان میں سے ہیں جن کی شکلوں کو بگاڑ دیا گیا ہے۔ یعنی ان کے چہرے سیاہ ہیں اور آنکھیں نیلی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے قبحه الله۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بدصورت بنا دیا۔ اسی معنی میں یہ بھی کہا جاتا ہے شوهه الله۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی کو ہر قسم کی بھلائی اور خیر سے دور کر دے تو کہا جاتا ہے قبحه قبحا و قبوحا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور ہم نے دی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب اس کے بعد کہ ہم نے ہلاک کر دیا تھا پہلی (نافرمان) قوموں کو۔(یہ کتاب) لوگوں کے لیے بصیرت افروز ۱؎ اور سراپا ہدایت ورحمت تھی ۲؎ تا کہ وہ نصیحت قبول کریں ۳؎''

۱؎ یہاں کتاب سے مراد تورات ہے۔ یہ کلام محذوف قسم کا جواب ہے اور مَاۤ اَهْلَكْنَا میں مَا مصدریہ ہے۔ "الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى" سے مراد حضرت نوح، ہود، صالح اور لوط وغیرہ کی قوم ہے اور "بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ" الکتاب سے حال ہے۔ یعنی اس حال میں کہ یہ کتاب بصیرت کا سبب تھی۔ بَصَائِر بَصِيْرَة کی جمع ہے۔ اور بصیرت سے مراد دلوں کا وہ نور ہے جس کے ساتھ قلوب بشری طاقت کے مطابق اشیاء کی حقائق یعنی واجب اور ممکن ہونے کو دیکھ سکتے ہیں اور حق و باطل اور ہدایت و گمراہی کے مابین تمیز کر سکتے ہیں۔

۲؎ اور سراپا ہدایت تھی۔ یعنی وہ اس کے سبب راہ نجات کی طرف راہنمائی حاصل کر سکتے تھے۔ اور اس میں دنیا وآخرت کے امور کی اصلاح موجود تھی۔ اور سراپا رحمت تھی۔ یعنی یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ تھی اگر وہ اس سے رحمت حاصل کرتے۔ یا یہ ایسی کتاب تھی جو ان پر اللہ تعالیٰ کی ازلی رحمت ہونے کا تقاضا کرتی تھی۔

۳؎ تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ یا پھر وہ اس حال میں ہو جائیں کہ ان سے نصیحت قبول کرنے کی امید رکھی جا سکے۔ کیونکہ نصیحت قبول کرنا اور خشیت کا ہونا یہ دونوں علم کے ثمرات ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾

''اور آپ نہیں تھے (طور) کی مغربی سمت میں جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف رسالت کا (حکم) بھیجا ۱؎ اور نہ آپ گواہوں میں شامل تھے ۲؎''

۱؎ اور آپ موسیٰ علیہ السلام کے مقام یعنی طور سے مغربی سمت میں نہیں تھے۔ قتادہ اور سدی نے کہا ہے کہ آپ مغربی پہاڑ کی جانب نہیں تھے۔ اور کلبی نے کہا ہے کہ آپ مغربی وادی کی سمت نہیں تھے(1)۔ ان تمام کی مراد یہ ہے کہ اس میں صفت موصوف کی طرف مضاف نہیں بلکہ موصوف محذوف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام کو اپنے رب سے شرف ہم کلامی حاصل ہوا(2)۔ اور كُنْتَ میں خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ یعنی اے محمد! ﷺ آپ وہاں حاضر نہیں تھے۔ جب ہم نے وحی فرمائی۔ موسیٰ علیہ السلام کی طرف کہ آپ فرعون اور اس کی قوم کے لیے رسول ہیں۔

۲؎ اور آپ گواہوں میں شامل نہیں تھے۔ یعنی آپ ان کی طرف وحی کے نزول کے وقت حاضر نہیں تھے یا پھر آپ ان کی طرف نازل ہونے والی وحی پر گواہوں میں سے نہیں تھے۔ اور شاہدین سے مراد وہ ستر افراد ہیں جنہیں موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر لے جانے کے لیے منتخب کیا تھا۔ یعنی آپ کا موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی خبر دینا یہ اخبار بالغیب ہے۔ جس پر اطلاع وحی کے بغیر ممکن نہیں۔ پس یہ آپ کے لیے معجزہ ہے اور آپ کے دعویٰ نبوت پر مضبوط دلیل ہے۔ اسی لیے استدراک اپنے اس قول سے فرمایا۔

وَلٰكِنَّاۤ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ

تَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرۡسِلِيۡنَ ﴿۴۵﴾

”لیکن ہم نے پیدا فرمائیں کئی قومیں (یکے بعد دیگرے) اور کافی لمبا عرصہ گزر گیا ان پر (اور انہوں نے عہد خداوندی بھلا دیا) ۱ اور آپ اہل مدین میں مقیم نہ تھے۔ تا کہ آپ پڑھ کر سناتے ہوں انہیں ہماری آیتیں، لیکن ہم ہی رسول بنا کر بھیجنے والے تھے ۲ “

۱ لیکن ہم نے کئی قومیں پیدا فرمائیں، یعنی ایسے افراد پیدا کیے جو باہم ہم عصر تھے۔ یا مختلف اہل زمانہ کو پیدا کیا۔ اس اعتبار سے قرن کا معنی زمانہ ہے اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ یعنی اہل قرون۔ لیکن ہم نے تمہاری طرف وحی کی اس کے بعد کہ بہت سا زمانہ بغیر کسی نبی اور رسول کے گزر چکا تھا، علوم ختم ہو چکے تھے، ماقبل شریعتوں کے احکام تبدیل ہو چکے تھے اور خبروں میں اضطراب اور تعارض پیدا ہو چکا تھا اس لیے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد مختلف قوموں کو پیدا کیا تھا اور ان پر طویل زمانہ گزر گیا۔ اور وہ باہم ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے اور ایک دوسرے کو جھٹلانے لگے۔ لہٰذا یہاں مستدرک کو حذف کر کے اس کے قائم مقام سبب کو رکھ دیا گیا۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم سے حضور نبی رحمت ﷺ پر ایمان لانے اور علاوہ ازیں کئی دیگر عہد بھی لیے۔ لیکن جب مدت دراز گزر گئی اور یکے بعد دیگرے کئی قومیں پیدا ہوئیں، تو وہ ان معاہدوں کو بھول گئیں اور انہیں پورا کرنا انہوں نے چھوڑ دیا (1)۔ پس اس اعتبار سے آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ آپ اس وقت حاضر نہ تھے جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے آپ کے بارے میں عہد لیا۔ اور وہ عہد آپ کی استدعا پر نہیں لیا گیا۔ بلکہ وہ تو محض ہماری جانب سے فضل تھا اور علت یہ تھی کہ آپ کے مخالفین کا عذر کلیۃً ختم ہو جائے۔ لیکن جب ہم نے یکے بعد دیگرے کئی قومیں پیدا فرمائیں اور ان پر طویل زمانہ گزر گیا تو وہ اس عہد کو بھول گئے۔ اسی کے مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ وَ اِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِيۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ الی قولہ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِيۡنَ۔

۲ اور آپ اہل مدین میں مقیم نہیں تھے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام ان میں مقیم تھے۔ تا کہ آپ انہیں وعدے اور وعیدیں سنا کر نصیحت کرتے ہو۔ ترکیب کلام میں تَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ كُنۡتَ کی دوسری خبر ہے۔ یا یہ ثَاوِیًا کی ضمیر سے حال ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے آپ اہل مدین میں حاضر نہیں تھے کہ آپ اہل مکہ کو ان کی خبریں بتا رہے ہو۔ لیکن ہم ہی آپ کو اہل مکہ اور دوسرے تمام لوگوں کی طرف معجزات اور اخبار غیبیہ کے ساتھ بھیجنے والے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ انہیں ان واقعات سے آگاہ نہ کر سکتے۔

وَمَا كُنۡتَ بِجَانِبِ الطُّوۡرِ اِذۡ نَادَيۡنَا وَلٰكِنۡ رَّحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰٮهُمۡ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۴۶﴾

”اور آپ (اس وقت) طور کے کنارہ پر بھی نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) ندا فرمائی۔ لیکن یہ آپ کے رب کی محض رحمت ہے۔ (کہ اس نے آپ کو ان حالات پر آگاہ کر دیا) ۱ تا کہ آپ (قہر الٰہی سے) ڈرائیں اس قوم کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے ۲ شاید وہ نصیحت قبول کریں ۳ “

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 145 (التجاریۃ)

لے اور آپ اس وقت اس طور پہاڑ کے کنارے پر نہیں تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہم کلامی عطا فرمایا۔ جب ہم نے انہیں ندا فرمائی کہ اس کتاب کو قوت و مضبوطی کے ساتھ پکڑلو خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ۔ اس سے مراد وہ وقت ہے جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی اور ما کنت بجانب الغربی سے مراد آپ کو نبوت عطا ہونے کا وقت ہے۔ وہب نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار! مجھے محمد ﷺ کا دیدار کرا دے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم ہرگز ان تک نہیں پہنچ سکو گے اور تم چاہو تو میں ان کی امت کو ندا دوں اور تمہیں ان کی آواز سنوا دوں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے رب! ضرور۔ تو رب کریم نے امت محمد یہ کو ندا دیتے ہوئے فرمایا یا امة محمد (ﷺ) تو انہوں نے اپنے آباء کی صلبوں سے اس آواز پر لبیک کہی۔ ابو زرعہ بن عمرو بن جریر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ندا فرمائی اے محمد ﷺ کی امت میں نے تمہاری دعا کو قبول فرما لیا اس سے قبل کہ تم مجھ سے دعا مانگو اور میں نے تمہیں عطا فرما دیا اس سے پہلے کہ تم مجھ سے سوال کرو۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد ﷺ کی امت! تو انہوں نے آباء کی صلبوں اور ماؤں کی رحموں سے یہ جواب دیا لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے احمد ﷺ کی امت۔ بے شک میری رحمت میرے غضب پر اور میری معافی میری سزا پر سبقت لے گئی میں نے تمہارے سوال کرنے سے پہلے تمہیں عطا فرما دیا، تمہارے دعا مانگنے سے پہلے میں نے اسے قبول کر لیا اور میں نے تمہاری مغفرت فرما دی اس سے قبل کہ تم میری نافرمانی کرو۔ جو یہ شہادت دیتے ہوئے قیامت کے دن حاضر ہوگا "لا اله الا اللّٰه وان محمداً عبدی ورسولی" (کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد ﷺ میرے بندے اور رسول ہیں) وہ جنت میں داخل ہوگا اگرچہ اس کے گناہ سمندر کی جھاگ سے بھی زیادہ ہوں(1)۔ لیکن ہم نے آپ پر رحمت فرمائی اور یہ آپ کے رب کی محض رحمت ہے کہ اس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا، آپ کی طرف وحی فرمائی اور آپ کو معیبات سے آگاہ کیا یا ہم نے آپ کو بھیجا یا ہم نے آپ کو علم عطا فرمایا۔ تو یہ آپ کے رب کی رحمت ہے۔

ع لِتُنْذِرَ اس فعل محذوف کے متعلق ہے جو کہ رحمۃ کے قول کو نصب دے رہا ہے۔ یعنی رحمناک یا ارسلناک یا علمناک لِتُنْذِرَ۔ مَا اَتٰهُمْ قَوْمًا کی صفت ہے اور "مِّنْ نَّذِيْرٍ" اتاهم کا فاعل ہے اور اس سے پہلے مِنْ زائدہ ہے قوم سے مراد اہل مکہ ہیں کیونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد اہل مکہ کی طرف کوئی نبی نہیں بھیجا گیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسروں کی دعوت فقط بنی اسرائیل کے لیے تھی۔

سے تا کہ وہ نصیحت قبول کریں۔ اس کا تعلق قول باری تعالیٰ لتنذر سے ہے۔

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

"(اور اس کی وجہ یہ ہے) کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب پہنچے انہیں کوئی مصیبت ان اعمال کے باعث جو انہوں نے کیے ہیں لے تو وہ یہ نہ کہنے لگیں کہ اے ہمارے رب! کیوں نہ بھیجا تو نے ہماری طرف کوئی رسول تا کہ ہم پیروی کرتے تیری آیات کی ع اور ہم ہو جاتے ایمان لانے والوں سے سے"

۱؎ جب انہیں کوئی عذاب اور تکلیف پہنچے اس کفر اور گناہوں کے سبب جو انہوں نے کیے۔ چونکہ اکثر اعمال ہاتھ کی کوشش اور محنت سے ہوتے ہیں اس لیے اکثر اور اغلباً اعمال کی نسبت ہاتھوں کی طرف کی جاتی ہے۔ اگر چہ ان میں سے بعض دل کے افعال ہوتے ہیں۔

۲؎ فَيَقُولُوا یہ منصوب ہے کیونکہ اس کا عطف تُصِيبَهُمْ پر ہے۔ اور فاء سببیہ کے ساتھ عطف کرنا اس پر متنبہ کرنے کے لیے ہے تا کہ یہ لَوْلَا کے جواب کے انکار کا سبب ہو جائے۔ اور ان سے یہ قول صادر نہیں ہوگا مگر انہیں عذاب پہنچنے کے بعد فَنَتَّبِعَ اس لیے منصوب ہے کیونکہ یہ لولا جو کہ تحضیض کے لیے ہے اور مشابہ بالامر ہے کے جواب میں واقع ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے "هَلَّا كَانَ مِنكَ اِرْسَالُ رَسُوْلٍ اِلَيْنَا فَاتِّبَاعًا مِنَّا" کیوں نہیں تیری طرف سے ہماری طرف کوئی رسول بھیجا گیا کہ ہم پیروی کرتے تیری آیات کی۔ اور ہم ایمان لانے والوں میں سے ہو جاتے۔ اس کا عطف نتبع پر ہے۔

۳؎ لَوْلَا کا جواب محذوف ہے۔ معنی یہ ہے۔ اگر ان کے کفر اور گناہوں کے سبب انہیں عذاب پہنچنے کے بعد ان سے اس قول کا خدشہ نہ ہوتا "رَبَّنَا هَلَّا اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا" اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کیوں نہیں رسول بھیجا جو ہمیں تیری آیات کی تبلیغ کرتا تو ہم ان کی پیروی کرتے اور ہم تصدیق کرنے والوں میں سے ہو جاتے۔ تو ہم آپ کو ان کی طرف رسول بنا کر نہ بھیجتے۔ اور ہم انہیں ان کے کفر کے سبب۔ عذاب سے پیشگی ڈرانے سے قبل ہی عذاب میں مبتلا کر دیتے۔ لیکن ہم نے تو آپ کو ان کی طرف مبعوث کیا تا کہ ان کے عذر ختم ہو جائیں اور ان کے خلاف حجت قائم ہو جائے اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ۱؎ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۫ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

"پھر جب آ گیا ان کے پاس حق ہماری جناب سے تو وہ کہنے لگے کیوں نہ دیے گئے انہیں اس قسم کے معجزے جو موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے تھے ۱؎ (ان نابکاروں سے پوچھو) کیا انہوں نے انکار نہیں کیا تھا ان معجزات کا جو موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے تھے ۲؎ ان ہی نے کہا (موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام) دو جادوگر ہیں ۳؎ جو ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔ نیز انہوں نے کہا تھا کہ ہم ان تمام کا انکار کرتے ہیں ۴؎"

۱؎ پھر جب ان کے پاس حق آ گیا یعنی قرآن کریم یا حضرت محمد ﷺ ایسے رسول بن کر جن کی تصدیق قرآن کریم کے ساتھ کی گئی۔ ہماری جانب سے تو کفار مکہ نے سرکشی اور ضد کی بنا پر کہا آپ ﷺ کو ایسے معجزات کیوں نہیں عطا کیے گئے جیسے معجزات موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیے گئے۔ مثلاً عصا، ید بیضاء۔ یا یہ مکمل کتاب ایک ہی بار کیوں نہیں نازل کی گئی جیسے موسیٰ علیہ السلام کو تورات ایک ہی بار دے دی گئی تھی۔ یہ جملہ سابقہ جملے کے مضمون پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے وَلٰكِنْ بَعَثْنَاكَ اِلَيْهِمْ قَطْعًا لَا عْتِذَارِهِمْ وَالْزَامًا لِلْحُجَّةِ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ الخ اور لَوْلَا هَلَّا کے معنی میں ہے۔

۲؎ کیا انہوں نے قرآن سے پہلے جو معجزات موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے تھے ان کا انکار نہیں کر دیا تھا؟ یہ استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے۔ یعنی انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ واؤ عاطفہ ہے اور اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَلَمْ يُكَذِّبُوْا مُوْسٰى وَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى۔ یعنی انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور انہوں نے ان معجزات کا انکار

کیا جو اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے۔ تو یہ آپ سے کیسے ان کی مثل معجزات کا مطالبہ کر رہے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے؟۔ یعنی رائے اور مذہب میں وہ بھی ان ہی (کفار مکہ) کی جنس سے تھے۔ اور وہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے کافر تھے جنہوں نے ان معجزات کا انکار کیا تھا جو موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے۔ کلبی نے کہا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے اہل مکہ کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ تو انہوں نے اپنے آدمیوں کو مدینہ طیبہ کے یہودی علماء کی طرف بھیجا۔ پس انہوں نے ان سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے پوچھا تو انہوں نے انہیں بتایا کہ آپ کی تعریف وتوصیف ان کی کتاب تورات میں موجود ہے۔ چنانچہ انہوں نے واپس آ کر اہل مکہ کو یہودی علماء کی باتوں سے آگاہ کیا(1)۔ تو اہل مکہ نے موسیٰ علیہ السلام اور انہیں دیئے گئے معجزات کا انکار کر دیا۔

3۔ سِحْرٰنِ کو حجاز، بصرہ اور شام کے قُراء نے اسے اسم فاعل کے وزن پر سٰحِرٰنِ پڑھا ہے۔ اور اس سے مراد حضرت محمد ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام لیتے ہیں (کہ یہ دونوں جادوگر ہیں) اور کوفیوں نے سِحْرٰنِ یعنی سین کو مکسور اور حاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ مصدر ہے اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ یا انہوں نے ان دونوں کو مبالغہ کے طور پر جادو ہی کہہ دیا۔ یا انہوں نے سحرین سے مراد تورات اور قرآن لیا ہے۔ جبکہ کلبی کے علاوہ دوسروں نے یہ کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے کافروں نے کہا یہ دونوں یعنی موسیٰ اور ہارون جادوگر ہیں۔

4۔ دونوں یعنی محمد ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام اپنی کتابیں ایک دوسرے کے موافق ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔ یا پھر موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہما السلام باہم ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں۔ اور کفار مکہ نے یا موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے کافروں نے کہا بے شک ہم ان دو میں سے ہر ایک کا یا انبیاء میں سے ہر ایک کا انکار کرتے ہیں۔ کلبی کا قول اس مفہوم کے زیادہ مناسب ہے جس کا تقاضا سیاق کلام کرتا ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَاۤ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾

"آپ فرمائیے تم لے آؤ کوئی کتاب اللہ کے پاس سے جو زیادہ ہدایت بخش ہو ان دونوں (قرآن وتورات) سے 1 تو میں اس کی پیروی کروں گا اگر تم سچے ہو 2"

1۔ اے محمد! ﷺ آپ فرمائیے۔ اے اہل مکہ! لے آؤ۔ یہ فاء مقدر شرط کے جواب میں ہے، یعنی اگر تم قرآن اور تورات دونوں کتابوں کا انکار کرتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ دونوں جادو ہیں تو لے آؤ۔ کوئی کتاب اللہ کے پاس سے جو ان دونوں کی نسبت زیادہ ہدایت بخش ہو یعنی قرآن اور تورات کی نسبت جو کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئیں۔ کلام میں ان دونوں کو مضمر رکھا، کیونکہ معنی ان پر دلالت کر رہا ہے۔

2۔ اَتَّبِعْهُ جواب امر ہونے کی بناء پر مجزوم ہے۔ یعنی اگر تم ایسی کتاب لے آؤ گے جو ان دونوں کی نسبت زیادہ ہدایت بخش ہو گی تو میں اس کی پیروی کروں گا۔ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ یہ دونوں جادو ہیں۔ اور جو انہیں لے کر آئے ہیں وہ جادوگر ہیں۔ اس میں جواب شرط محذوف ہے۔ جس پر ماقبل کلام دلالت کرتا ہے۔ اور وہ فاء تو اہے۔ اور یہ ایسی شرط ہے جس سے مراد الزام دینا اور انہیں لاجواب کرنا ہے۔ اور حرف شک تو ان سے استہزاء اور تحکم کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔

فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ ۚ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝٥٠

"پس اگر وہ قبول نہ کریں آپ کے اس ارشاد کو[1] تو جان لو کہ وہ صرف اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں[2] اور کون زیادہ گمراہ ہے اس سے جو پیروی کرتا ہے اپنی خواہش کی اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی راہنمائی کے بغیر۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم لوگوں کو[3]"

[1] پس اگر وہ ہدایت بخش کتاب لانے کی تمہاری دعوت کو قبول نہ کریں۔ اس میں مفعول معلوم ہونے کی وجہ سے محذوف ہے۔ فعل استجابۃ دعاء کی طرف بذات خود بغیر واسطہ کے متعدی ہوتا ہے۔ اور ذاعی (بلانے والا) کی طرف لام کے واسطہ سے متعدی ہوتا ہے۔ اور جب اس کی طرف متعدی ہوتا ہے تو اکثر دعا (دعوت) محذوف ہوتی ہے۔ اور معنی یہ ہوگا اگر وہ ہدایت بخش کتاب نہ لائیں۔

[2] تو جان لیجئے انہیں الزام دے دیا گیا اور ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں کہ وہ صرف اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ کیونکہ اگر ان کے پاس کوئی دلیل ہوتی تو وہ ضرورت کے وقت اسے ضرور پیش کرتے۔

[3] یعنی اس سے زیادہ گمراہ کوئی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی راہنمائی کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔ اس میں بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ تاکید یا تقیید کے لیے حال کے محل میں ہے۔ کیونکہ کبھی خواہش نفس بھی حق کے موافق ہو جاتی ہے جب آدمی کا ایمان کامل ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ" (تم میں سے کوئی کامل مومن نہیں ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اس کی خواہش اس دین کے تابع ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔)(1)۔ اسے بغویؒ نے شرح السنۃ میں حضرت عبداللہؓ بن عمرو سے نقل کیا ہے۔ اور امام نوویؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ان لوگوں کو جو خواہش نفس کی پیروی میں منہمک ہونے کے سبب اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝٥١

"اور ہم مسلسل بھیجتے رہے ان کی طرف اپنا کلام تا کہ وہ نصیحت قبول کریں[1]"

[1] فراء نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے۔ ہم قرآن کریم کی آیات یکے بعد دیگرے مسلسل نازل کرتے رہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں ترکیب کلام میں یہ وصّلنا کے متعلق ہے(2)۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ تسلسل آیات نازل کرنے میں ہے تا کہ مسلسل یاد دہانی ہوتی رہے۔ یا پھر اس سے مراد نظم قرآن میں تسلسل کا ہونا ہے تا کہ دعوت حجت کے ساتھ، پند و موعظت وعد و وعید کے ساتھ اور نصائح عبرتوں کے ساتھ پختہ اور مضبوط رہیں(3)۔ صاحب مدارک نے کہا ہے کہ التوصیل سے مراد اتصال کا کثرت سے اور بار بار ہونا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے وَصَّلْنَا کا معنی ہے بَيَّنَّا(4)۔ (یعنی ہم نے واضح طور پر بیان کر دیا)۔ میں کہتا ہوں اس سے مقصود یہ ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات دوسری بعض کی وضاحت کرتی ہیں۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کریم میں گزشتہ لوگوں کے حالات مسلسل بیان کر دیئے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا اور مقاتل کا قول ہے کہ ہم نے کفار مکہ کے لیے امم ماضیہ کی

1۔ مصابیح السنۃ، جلد 1 صفحہ 33 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 146 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 297 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 146 (التجاریۃ)

خبریں کھول کر بیان کر دی ہیں کہ انہیں جھٹلانے کے عوض کیسے عذاب دیا گیا۔ اور ابن زید نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے ان کے لیے دنیا کی خبر کو آخرت کی خبر کے ساتھ ملا دیا ہے یہاں تک کہ انہوں نے دنیا میں آخرت کا مشاہدہ کر لیا(1)۔ ابن جریر اور طبرانی نے رفاعہ قرظی سے نقل کیا ہے کہ آیت وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ دس آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ میں ان میں سے ایک ہوں(2)۔ اور ابن جریر نے علی بن رفاعہ سے نقل کیا ہے کہ اہل کتاب میں سے دس افراد نکل کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور دولت ایمان سے مشرف ہوئے ان میں سے ایک علی کے باپ رفاعہ بھی تھے۔ پھر انہیں طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دی گئیں۔ لہٰذا یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(3)

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

''جن کو ہم نے عطا فرمائی کتاب (نزول) قرآن سے پہلے وہ اس پر ایمان لائے ہیں۔[1]''

[1] جن کو ہم نے محمد ﷺ یا قرآن سے پہلے کتاب عطا فرمائی۔ وہ اس پر ایمان لائے ہیں۔ ابن جریر نے قتادہ سے قول نقل کیا ہے کہ ہم بیان کرتے تھے یہ آیت اہل کتاب میں سے ان افراد کے بارے نازل ہوئی جو حق پر تھے یہاں تک کہ حضور نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تو وہ آپ کے ساتھ ایمان لے آئے انہی میں سے ایک عثمان اور عبداللہ بن سلام ہیں(4)۔ علامہ بغویؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نجاشی کے ساتھیوں میں سے چالیس افراد حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور غزوہ خیبر میں شریک ہوئے، ان میں سے بعض زخمی بھی ہوئے، لیکن شہید کوئی نہیں ہوا۔ پھر جب انہوں نے اہل ایمان کو سخت حاجت مند دیکھا۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم اپنے ملک میں بہت خوش حال ہیں۔ ہمیں اجازت عطا فرمایئے ہم وہاں سے مال لا کر مسلمانوں کی حاجات پوری کرنے میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت جعفرؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ نجاشی کے پاس پہنچے۔ تو اس نے انہیں اپنے پاس رکھا اور انتہائی حسن سلوک سے پیش آیا پھر جب انہوں نے وہاں سے واپس لوٹنے کا ارادہ کیا۔ تو اس کی مملکت کے وہ افراد جو ایمان لائے تھے انہوں نے نجاشی سے اجازت طلب کی کہ ہم ان لوگوں کی سمندر میں خدمت کریں گے۔ ہم اس نبی (ﷺ) کے پاس حاضر ہوں گے اور ان سے کسی عہد کے بارے گفتگو کریں گے۔ چنانچہ وہ وہاں سے چلے اور رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ پھر وہ آپ ﷺ کی معیت میں غزوۂ احد، حنین اور خیبر میں شریک بھی ہوئے اور ان میں سے کوئی بھی شہید نہیں ہوا۔ فارغ ہونے کے بعد انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ ہمیں اجازت عطا فرمایئے کہ ہم واپس اپنی سرزمین میں چلے جائیں کیونکہ وہاں ہمارا بہت سا مال و منال ہے۔ ہم اسے وہاں سے لا کر یہاں مہاجرین پر خرچ کریں گے کیونکہ ہم انہیں یہاں سخت مصیبت اور مشقت میں دیکھ رہے ہیں۔ پس آپ ﷺ نے انہیں اجازت عطا فرما دی اور وہ واپس چلے گئے۔ پھر وہ اپنے مال لے کر آئے اور اسے مہاجرین پر خرچ کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 47-146 (التجاریہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 249 (العلمیہ)
3۔ تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 56 (الامیریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 249 (العلمیہ)

کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی (1)۔ علامہ بغویؒ نے سعید بن جبیر سے اسی طرح ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ سے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ تک ان کے بارے نازل فرمائی۔ اور علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ یہ آیت انہی اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ان میں سے چالیس نجران سے تعلق رکھتے تھے بتیس حبشہ سے اور آٹھ شام کے رہنے والے تھے (2)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

وَاِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ﴿۵۳﴾

”اور جب یہ ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اس کے ساتھ بے شک یہ حق ہے۔ ہمارے رب کی طرف سے ہم اس سے پہلے ہی سر تسلیم خم کر چکے تھے ؀“

؀ اور جب ان پر قرآن کریم پڑھا جاتا ہے۔ عَلَیْهِمْ ظرف مابعد قول کے متعلق ہے تو کہتے ہیں ہم اس کے ساتھ ایمان لے آئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس کا عطف یؤمنون پر ہے اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے۔ یہ جملہ مستأنفہ ہے اس لیے کہ اس نے ایمان کو ثابت کیا ہے۔ بے شک ہم تو اس کے نزول سے پہلے بھی سر تسلیم خم کر چکے تھے یعنی توحید میں اللہ تعالیٰ کے لیے مخلص تھے اور محمد ﷺ کے ساتھ ایمان رکھتے تھے کہ وہ نبی ہیں اور یہ اس وقت سے تھا جب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ کہہ کر بشارت دی تھی مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ اور آپ ﷺ کا ذکر تو تورات اور انجیل میں بھی ہے۔ اور یہ دوسرا استیناف ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ ان کا ایمان نیا نہیں تھا بلکہ یہ تو اب قدیمی ہو چکا تھا۔ لہٰذا یہ جائز ہے کہ یہ جملہ رَبِّنَاۤ اٰمَنَّا کا بیان ہو کیونکہ وہ تو بعید وقریب (جدید وقدیم) دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ لیکن اس آیت سے قریب (جدید) کا احتمال ختم ہو جاتا ہے۔ اور ایمان قدیم ثابت ہو جاتا ہے۔

اُولٰٓىِٕكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾

”یہ لوگ ہیں جنہیں دیا جائے گا ان کا اجر دو مرتبہ بوجہ ان کے صبر کے ؀ اور وہ دور کرتے ہیں نیکی کے ساتھ برائی کو نیز اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے خرچ کرتے رہتے ہیں ؀“

؀ یہ لوگ ہیں جنہیں دو مرتبہ ان کا اجر دیا جائے گا ایک مرتبہ قرآن کریم کے نزول سے پہلے اپنے نبی اور کتاب کی شہادت کے سبب اپنی کتاب اور قرآن کریم کے ساتھ ایمان لانے کی بناء پر اور ایک بار قرآن کریم کے نزول کے بعد اس پر ایمان لانے کے سبب۔ اس وجہ سے کہ قرآن کریم کے نزول کے بعد اس پر ان کا ایمان باقی رہا اور وہ اس پر ڈٹے رہے جیسے کہ قرآن کریم کے نازل ہونے سے پہلے تھا۔ بخلاف دوسرے اہل کتاب کے جو قرآن کریم کے نزول سے پہلے تو ایمان رکھتے تھے اور وہ اس کے سبب کافروں کے خلاف فتح کے لیے دعا مانگتے تھے لیکن جب وہ ان کے پاس آ گیا تو انہوں نے نہ پہچانا اور حسد کی بناء پر اس کا انکار کر دیا اور اپنے سابقہ ایمان پر صبر نہ کر سکے۔ شیخین نے صحیحین میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین آدمی ہیں جن کے لیے دو اجر ہیں ایک اہل کتاب میں سے وہ آدمی جو اپنے نبی علیہ السلام پر بھی ایمان لایا اور پھر حضور نبی رحمت ﷺ کے

1۔ الدرالمنثور، جلد 5 صفحہ 252 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 147 (التجاریہ)

ساتھ بھی ایمان لانے کی سعادت حاصل کی، دوسرا وہ عبد مملوک جس نے اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقاؤں کا حق بھی پورا کیا۔ اور تیسرا وہ شخص جس کے پاس باندی تھی وہ اس سے وطی کر سکتا تھا لیکن اس نے اسے خوب اچھی طرح ادب سکھایا اور خوب اچھی طرح تعلیم دی پھر اسے آزاد کر کے اس سے شادی کر لی تو اس کے لیے بھی دو اجر ہوں گے۔

۲۔ وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ کے بارے حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ وہ لا الہ الا اللہ کی شہادت دے کر شرک کو دور کرتے ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے وہ مشرکین کی جانب سے گالی گلوچ اور اذیت دینے والے الفاظ سن کر ان کا دفاع عفو و درگزر سے کرتے ہیں (1)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بھی جائز ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کی عداوت کو ان کے ساتھ نیکی اور احسان کر کے دور کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ اطاعت و فرمانبرداری کے سبب معصیت اور برائی کو دور کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (بے شک نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اتبع الحسنة السّیئة یمحُھا (برائی کے پیچھے نیکی کرو وہ اسے مٹا دے گی)۔ اور جو مال ہم نے انہیں دیا ہے اس سے بھلائی کے راستے میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔

وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ٘ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ٘ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ ﴿۵۵﴾

"اور جب وہ سنتے ہیں کسی بیہودہ بات کو تو منہ پھیر لیتے ہیں اس سے اور کہتے ہیں ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں تم سلامت رہو ۱۔ ہم جاہلوں (سے الجھنے) کے خواہاں نہیں ہیں ۲۔"

۱۔ اور جب وہ کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ مشرکین اہل کتاب میں سے ایمان لانے والوں کو برا بھلا کہتے تھے اور کہا کرتے تھے تم ہلاک ہو جاؤ تم نے اپنا دین چھوڑ دیا ہے۔ تو وہ ان کی ایسی باتیں سن کر ان سے منہ پھیر لیتے تھے اور انہیں کوئی جواب نہیں دیتے تھے (2)۔ اور یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارا دین ہے اور تمہارے لیے تمہارا دین ہے۔ تم سلامت رہو۔ یہاں اسلام سے مراد تحیۃ اور دعا نہیں بلکہ اس سے مراد سلام متارکہ ہے معنی یہ ہے کہ تم ہماری جانب سے سلامت اور محفوظ ہو کہ ہم تمہیں گالی گلوچ نہیں دیں گے اور برا بھلا نہیں کہیں گے۔

۲۔ یعنی ہم جاہلوں کے دین کے متلاشی نہیں ہیں۔ اور نہ ہم تمہارے اس دین کو پسند کرتے ہیں جس پر تم ہو۔ یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے ہم جاہلوں کی صحبت کے خواہاں نہیں ہیں یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ ہم جاہلوں میں سے ہونے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ان کا مقصود یہ ہوتا تھا کہ اگر تمہاری گالی گلوچ کے مقابلے میں ہم بھی تمہیں سب و شتم ہی کریں تو پھر ہم بھی تمہاری طرح ہی ہو جائیں گے اور ہم ایسا نہیں چاہتے ہم تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم جاہلوں میں سے ہوں۔ جملہ شرطیہ یعنی اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ الی آخرہ۔ وَاِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ پر معطوف ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے یہ حکم اس سے پہلے کا ہے جبکہ ابھی مسلمانوں کو کفار سے قتال کا حکم نہیں دیا گیا تھا (3)۔ میں کہتا ہوں کہ علامہ بغویؒ کا قول اس آیت کے سبب نزول میں سے کسی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ آیت یا تو عبداللہ بن سلامؓ اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 147 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 147 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 147 (التجاریہ)

ان کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی اورانہوں نے ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا۔ یا یہ آیت نجاشی کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی جبکہ وہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کے ساتھ آئے اور وہ بھی 6ھ میں غزوہ خیبر کے وقت آئے۔ یا پھر یہ آیت اہل نجران میں سے چالیس افراد اور اہل شام میں سے آٹھ افراد کے بارے نازل ہوئی۔ یہ تمام واقعات ہجرت کے بعد ہوئے جبکہ قتال کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ واللہ واعلم۔ امام مسلم اور دیگر محدثین نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب سے کہا کہہ دو لا الہ الا اللہ تو میں قیامت کے دن تمہاری شہادت دوں گا تو انہوں نے کہا اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ قریش کی عورتیں عار دلائیں گی اور کہیں گی کہ موت کی گھبراہٹ نے اسے کلمہ پڑھنے پر برانگیختہ کیا ہے تو میں یہ کلمہ پڑھ کر آپ کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈا کرتا۔ تو تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٥٦﴾

"بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت یافتہ لوگوں کو۔ ؎"

؎ بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ ہدایت دینا پسند کریں۔ یا جسے آپ قرابتداری کی وجہ سے پسند کریں۔ البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے وہ ہدایت دینا چاہتا ہے (اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو خوب جانتا ہے)۔ مجاہد اور مقاتل نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جن کے لیے ہدایت مقرر کر دی ہے۔ امام نسائی نے اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں سند جید کے ساتھ ابو سعید بن رافع سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عمرؓ سے اس آیت کے بارے پوچھا کہ کیا اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ ابو جہل اور ابو طالب کے بارے نازل ہوئی؟ تو انہوں نے فرمایا جی ہاں یہ انہی کے بارے میں ہے(2)۔ شیخین، امام نسائی، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ، ابن مردویہ اور بیہقی نے حضرت سعید بن مسیب کی حدیث نقل کی ہے جو انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ جب ابو طالب قریب المرگ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے۔ تو آپ نے ان کے پاس ابو جہل اور عبد اللہ بن امیہ بن مغیرہ کو موجود پایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے چچا! ایک بار کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ الخ کہہ دو میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہارے لیے اس کی شہادت دوں گا۔ یہ سن کر ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ نے کہا کیا تم عبد المطلب کے دین سے پھرنے کی ترغیب دے رہے ہو۔؟ پس رسول اللہ ﷺ ان پر مسلسل یہ کلمہ پیش کرتے رہے اور اپنا یہ کلام بار بار دہراتے رہے۔ حتیٰ کہ ابو طالب نے سب سے آخری کلام یہ کیا علی ملة عبد المطلب۔ (کہ میں عبد المطلب کے دین پر ہوں) اور انہوں نے لا الہ الا اللہ کہنے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تک مجھے منع نہیں کیا جائے گا میں تمہارے لیے استغفار کرتا رہوں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ الآیہ۔ اور ابو طالب کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔(3)

وَقَالُوٓا إِن نَّتَّبِعِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا ۚ أَوَلَمْ نُمَكِّن لَّهُمْ حَرَمًا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 40 (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 147 (التجاریہ)
3۔ تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 59 (الامیریہ)

اٰمِنًا يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾

''اورانہوں نے کہا اگر ہم اتباع کریں ہدایت کا آپ کی معیت میں تو ہمیں اچک لیا جائے گا ہمارے ملک سے کیا ہم نے بسانہیں دیا انہیں حرم میں جو امن والا ہے [1] کھچے چلے آتے ہیں [2] اس کی طرف ہر قسم کے پھل یہ رزق ہے ہماری طرف سے لیکن ان کی اکثریت کچھ نہیں جانتی [3]''

[1] ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ قریش میں سے کچھ لوگوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی اگر ہم آپ کی اتباع کریں تو لوگ ہمیں اچک لیں گے۔(1) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَقَالُوْۤا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى الایہ۔ اس کا عطف اس آیت پر ہے قَالُوْا لَوْلَاۤ اُوْتِيَ مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى۔ اور ان کے درمیان تمام جملے معترضے ہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت حارث بن عثمان بن نوفل بن عبد مناف کے بارے میں نازل ہوئی کہ اس نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بارگاہ میں عرض کی ہم یقیناً یہ جانتے ہیں کہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہ حق ہے۔ لیکن اگر ہم آپ کی اتباع کریں تو ہمیں یہ خوف ہے کہ عرب ہمیں سرزمین مکہ سے نکال دیں گے۔ اور نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا کا یہی معنی ہے(2)۔ اسی طرح نسائی اور ابن منذر نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ اور امام نسائیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ حارث بن عامر بن نوفل وہ ہے جس نے یہ کہا تھا۔ اختطاف کا معنی ہے تیزی کے ساتھ کوئی چیز چھین لینا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ''اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ'' یہ استفہام انکاری ہے اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَلَمْ نُسْكِنْهُمْ بِمَكَّةَ وَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ۔ کیا ہم نے انہیں مکہ میں بسانہیں دیا اور ہم نے انہیں قدرت نہیں دی؟۔ حرم میں جو امن والا ہے۔ چونکہ عرب زمانہ جاہلیت میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تھے اور آپس میں قتال کرتے رہتے تھے۔ لیکن اہل مکہ حرمت حرم کی وجہ سے امن میں رہتے تھے۔ اور یہ معروف بات ہے کہ حرم پاک میں ہرن بھیڑوں سے اور کبوتر چیلوں سے امن میں ہو جاتے تھے۔

[2] يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ کو نافع اور یعقوب نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس کا نائب الفاعل ثَمَرٰتُ مؤنث ہے۔ اور باقیوں نے یاء کے ساتھ ہی پڑھا ہے اس لیے کہ نائب الفاعل اور فعل کے درمیان فاصلہ موجود ہے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ مؤنث غیر حقیقی ہے۔ اس کا معنی ہے کھچا چلا آنا اور جمع ہو جانا۔

[3] یعنی ہر جانب سے پھل اس کی طرف کھچے چلے آتے ہیں۔ پس جب یہ ان کا حال ہے جبکہ وہ بوجا بتوں کی کرتے ہیں تو جب انہوں نے حرمت بیت کے ساتھ حرمت توحید کو بھی ملالیا تو پھر اللہ تعالیٰ انہیں خوفزدہ کرنے اور اچک لے جانے پر کیسے دوسروں کو قدرت دے گا؟ لیکن ان جہلاء میں سے اکثر کچھ نہیں جانتے۔ نہ وہ اسے سمجھتے ہیں اور نہ غور و فکر کرتے ہیں کہ وہ جان لیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے قول مِنْ لَّدُنَّا کے متعلق ہے۔ یعنی ان میں سے قلیل لوگ تدبر کرتے ہیں تو وہ یہ جان لیتے ہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے رزق ہے۔ کیونکہ اگر وہ یہ جان لیتے تو وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہ ڈرتے۔ اور رِزْقًا منصوب ہے کیونکہ یہ يُجْبٰى کا مصدر معنوی ہے (یعنی یہ ترکیب کلام میں مفعول مطلق ہے۔) کیونکہ یہ اس معنی میں ہے یرزق رزقًا۔ یا پھر اس لیے منصوب ہے کہ یہ ثمرات سے حال ہے اور ثمرات اضافت کے سبب نکرہ مخصوصہ ہو کر ذوالحال ہے۔ پھر یہ بیان فرمایا کہ بے شک حقیقت امر تو اس کے برعکس ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 60 (الامیریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 148 (التجاریہ)

کیونکہ واجب تو یہ ہے کہ وہ اپنے کفر اور گناہوں کے سبب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈریں (لیکن وہ ایمان لانے سے ڈر رہے ہیں)۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَ كُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾

''اور ہم نے کتنے شہر برباد کر دیے جب وہ فخر کرنے لگے[1] اپنی خوشحالی پر[2] پس یہ ہیں ان کے گھر جن میں سکونت نہیں کی گئی ان کے بعد مگر بہت کم عرصہ اور (آخرکار) ہم ہی ان کے وارث بنے[3]''

[1] یہ اصل میں اہل قریۃ ہے۔ یعنی ہم نے کتنے شہروں کے رہنے والوں کو ہلاک کر دیا جن کی حالت تمہاری حالت کی مثل تھی۔ وہ نازاں ہوئے اور سرکش ہوئے۔ یہ حقیقت میں شہر میں رہنے والوں کا وصف ہے جس سے قریہ کو متصف کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل قریہ نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے سبب سرکشی اختیار کر لی اور انہوں نے ان پر شکر ادا نہیں کیا عطا نے کہا ہے کہ انہوں نے فخر اور تکبر کرتے ہوئے زندگی گزاری اس طرح کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا رزق کھایا اور اسی کی نافرمانی کی اور ساتھ ہی بو جا پاٹ بتوں کی کی۔(1)

[2] مَعِيْشَتَهَا ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی یہ اپنی خوش حالی کے عرصہ میں فخر کرتے رہے تو نتیجۃً اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ کر دیا اور ان کے گھروں کو برباد کر دیا۔ پس یہ ہیں ان کے گھر جو برباد ہو چکے ہیں۔ ان سے مراد حجر اور قوم لوط کی بستیاں ہیں۔ یہ جملہ اہلاک القریٰ کی علت بیان کرتا ہے۔

[3] ترکیب کلام میں لم تسکن مساکنهم سے حال ہے۔ اور اس میں عامل معنی اشارہ ہے۔ اور اِلَّا قَلِيْلًا یہ یا تو مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا ظرفیت کی بناء پر۔ (پہلی صورت میں مفعول مطلق ہے اور دوسری صورت میں مفعول فیہ ہے)۔ یعنی اصل عبارت اس طرح ہے اِلَّا سُكُوْنًا قليلًا یا زمانًا قليلًا (مگر بہت کم یا بہت کم وقت)۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ ان میں سکونت اختیار نہیں کی مگر کسی مسافر نے یا راستے سے گزرنے والے نے اور وہ بھی صرف ایک دن کے لیے یا ایک ساعت کے لیے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ ان کے گناہوں کی نحوست کی وجہ سے سوائے تھوڑی مدت کے کسی کی سکونت ان میں باقی نہیں رہ سکی(2)۔ آخر کار ہم ہی ان کے وارث بنے جبکہ ان کے پیچھے کوئی ایسا نہیں رہا جو ان کے گھروں میں سکونت اختیار کرتا اور ان کی دیگر اشیاء اپنے تصرف میں لاتا۔

وَ مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْۤ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَ مَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰۤى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اور نہیں ہے آپ کا رب ہلاک کرنے والا بستیوں کو یہاں تک کہ بھیجے ان کے مرکزی شہر میں کوئی رسول جو پڑھ کر سنائے وہاں کے رہنے والوں کو ہماری آیتیں۔ اور ہم نہیں ہیں ہلاک کرنے والے بستیوں کو مگر یہ کہ ان کے بسنے والے ظالم ہیں[1]''

[1] یعنی اس کی عادت کافروں کی بستیوں کو تباہ کرنا نہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے بڑے عظیم شہر میں کوئی رسول بھیجے۔ جو انہیں ڈرائے۔ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی بعثت کے لیے بڑے بڑے شہروں کو مختص کیا ہے کیونکہ رسول اشراف کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پیروکار ایمان اور کفر میں انہی کی اتباع کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہرقل روم کی طرف خط لکھا کہ تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 148 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 148 (التجاریۃ)

اسلام قبول کر لے محفوظ ہو جائے گا۔ ورنہ تیری رعایا کے گناہوں کا بوجھ بھی تجھ پر ہوگا۔ اور اشراف بڑے بڑے شہروں اور ایسے مقامات پر سکونت پذیر ہوتے ہیں جو اپنے گردونواح کا مرکز ہوں۔ مقاتل نے کہا ہے کہ رسول انہیں یہ خبر دیتا ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو ان پر عذاب نازل ہوگا(1)۔ اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں ہیں مگر یہ کہ ان کے بسنے والے رسولوں کو جھٹلانے اور کفر کے ساتھ سرکشی اختیار کرنے کے سبب ظالم ہیں۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۶۰

"اور جو چیز دی گئی ہے تمہیں تو یہ سامان ہے دنیوی زندگی کا اور اس کی زیب و زینت ہے۔ اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ بہتر اور دیرپا ہے۔ ۱؎ کیا تم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے ۲؎"

۱؎ اور دنیا کے خزانوں میں سے جو چیز بھی تمہیں دی گئی تم اس سے زندگی بھر لطف اندوز ہوتے ہو اور زیب و زینت حاصل کرتے ہو۔ اور جو جنت اور مراتب قرب اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ ذاتی طور پر اس سے بہتر ہیں کیونکہ وہ تو خالص لذت اور کامل سرور ہیں۔ وہ دیرپا ہیں کیونکہ وہ ابدی ہیں۔

۲؎ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ میں استفہام انکاری ہے اور فا تعقیبیہ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے "الا تتفکرون فلا تعقلون" کیا تم غور و فکر نہیں کرتے کہ تم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝۶۱

"(تم خود سوچو) آیا وہ (نیک بخت) جس کے ساتھ ہم نے وعدہ کیا ہے بہت اچھا وعدہ اور وہ اس کے پانے والا بھی ہے۔ اس (بدبخت) کی مانند ہو سکتا ہے جسے ہم نے دنیوی زندگی کا سامان دیا ہے ۱؎ پھر وہ (اس چند روزہ آسائش کے بعد) روز قیامت (مجرموں کے کٹہرے میں) پیش کیا جائے گا ۲؎"

۱؎ اس کا عطف وَمَا عند اللّٰه خَيْرٌ وَّاَبْقٰى پر ہے۔ اور اس میں ہمزہ برائے استفہام انکاری ہے۔ یہ معطوف علیہ کے پیچھے معطوف آنے کے انکار پر دلالت کرنے کے لیے ہے۔ یعنی کیا اتنے واضح اور روشن تفاوت کے بعد بھی تم نے اس شخص کو جس سے ہم نے بہت اچھا وعدہ یعنی جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ کیونکہ وعدے کا حسن موعود کے حسن کے ساتھ ہوتا ہے (تو چونکہ جنت بذات خود حسین ہے اس لیے اس کا وعدہ بھی حسین ہے) اور وہ اسے بالیقین پانے والا بھی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے وعدہ میں اس کا خلاف ہونا ممتنع ہے۔ اسی لیے یہاں بطور حرف عطف فاء ذکر کی گئی ہے جو سببیت کا فائدہ دیتی ہے۔ اس کی مثل ہے جسے ہم نے دنیوی زندگی کا سامان دیا ہے۔ جو سامان دردوں اور مصائب سے گھرا ہوا ہے، مشقتوں اور تکالیف سے مکدر ہے اور ختم ہونے کے بعد اپنے پیچھے حسرت اور مایوسی کو لانے والا ہے۔

۲؎ پھر اسے یوم قیامت کو حساب یا عذاب کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اس میں ثُمَّ بعد زمانی کے لیے ہے یا بعد رتبی کے لیے ہے۔ نافع،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 148 (التجاریۃ)

ابن عامر نے ایک روایت میں اور کسائی نے ثُمَّ ھُوَ کو ہاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ضمیر منفصل کو ضمیر متصل کے مشابہ پڑھا ہے۔ قتادہؒ نے کہا ہے اس کا معنی ہے مومن اور کافر برابر نہیں ہو سکتے (1)۔ بلکہ مومن بہت اچھی حالت میں ہوگا۔ علامہ بغویؒ نے اور اسی طرح ابن جریر نے بھی نقل کیا ہے کہ مجاہد نے کہا ہے کہ یہ آیت حضور نبی کریم ﷺ اور ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان سے ایک دوسری سند سے مروی ہے کہ یہ آیت حضرت حمزہ اور ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ مقاتل اور محمد بن کعب کا قول ہے کہ یہ آیت حضرت حمزہ یا حضرت علی اور ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی (2)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ عمار اور ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٦٢﴾

”اور اس دن اللہ انہیں آواز دے گا تو فرمائے گا کہاں ہیں وہ شریک جنہیں تم (میرا شریک) گمان کیا کرتے تھے ؎“

؎ اس کا عطف یوم القیامۃ پر ہے۔ یا یہ اُذْکُرْ فعل محذوف کے سبب منصوب ہے یعنی مفعول بہ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ مشرکین سے فرمائے گا کہاں ہیں وہ شریک جنہیں تم دنیا میں میرا شریک خیال کرتے تھے۔ یہاں تَزْعُمُوْنَ کے دونوں مفعول محذوف ہیں کیونکہ کلام ان پر دلالت کر رہی ہے۔ میں کہتا ہوں شاید شرکاء سے مراد کافروں کے وہ سردار ہیں جن کے سبب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت چھوڑ کر ان کی عبادت اور اتباع اختیار کر لی۔ اور یہاں انہیں شرکاء کا نام بطور استہزاء دیا گیا ہے۔

قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۖ تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ ﴿٦٣﴾

”کہیں گے وہ لوگ جن پر عذاب کا فرمان ثابت ہو چکا ؎ اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ جنہیں ہم نے گمراہ کیا۔ ہم نے انہیں بھی گمراہ کیا ؎ جیسے ہم خود گمراہ ہوئے ؎ ہم (ان سے) بیزار ہو کر تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ ہماری پوجا نہیں کیا کرتے تھے ؎“

؎ وہ لوگ کہیں گے جن پر عذاب کا فرمان قول کے مقتضی کے وجوب کی وجہ سے ثابت ہو چکا ہے۔ اور قول سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اور دیگر آیات وعید ہیں لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (کہ میں جہنم کو جنات اور آدمیوں سے بھر دوں گا)۔ تو یہ قول کافروں کے رؤساء کہیں گے۔

؎ ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر مابعد کلام ہے۔ اَغْوَيْنَا میں وہ ضمیر منصوب جو اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے وہ محذوف ہے۔ یعنی اَغْوَيْنَاهُمْ اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ پیروکار جنہیں ہم نے گمراہ کیا۔ ہم نے انہیں گمراہ کیا تو وہ گمراہ ہو گئے۔

؎ کَمَا غَوَيْنَا میں کاف فعل محذوف کے مصدر کی صفت ہے۔ جس پر اغویناھم دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فَغَوَوْا غَيًّا كَمَا غَوَيْنَا اَيْ مِثْلَ مَا غَوِيْنَا۔ یعنی وہ اسی طرح گمراہ ہو گئے جیسے ہم خود گمراہ تھے۔ اور یہ جملہ مستانفہ ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ بیشک وہ اسی طرح اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے جیسے ہم اپنی مرضی سے گمراہ ہوئے تھے اور ہم نے ان کے ساتھ تو وسوسہ اندازی اور لالچ دینے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ اگرچہ ہمارا وسوسہ اور فریب انہیں کفر کی طرف دعوت دینے والا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دلائل قائم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 148 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 149 (التجاریہ)

کرتے ہوئے، رسول بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر انہیں جو دعوت دی وہ زیادہ بہتر اور اس لائق تھی کہ یہ ہماری وسوسہ اندازی کی نسبت اس کی پیروی کرتے۔ لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الآیہ۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول صفت ہو اور اغوینھُم خبر ہو اس کے لیے جو اس کے ساتھ مقدر اور ملفوظ کلام میں سے متصل ہے۔ یعنی فَغَوَوْا كَمَا اَغْوَيْنَا۔ پس اس نے صفت پر زیادتی کا فائدہ دیا ہے اور وہ اگرچہ فضلہ ہے لیکن وہ لوازم میں سے ہو چکی ہے۔

۲؎ ہم ان سے اور اس کفر سے جسے انہوں نے اپنی خواہش نفس کی بناء پر اختیار کیا ہے بیزار ہیں۔ "اِلَيْكَ" "تَبَرَّاْنَا" کے متعلق ہے۔ اور توجہ کے معنی کو متضمن ہے۔ یعنی ہم ان سے بیزار ہو کر تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی خواہشات کی پوجا کرتے تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ مَا مصدریہ ہے جو تبرّاْنَا سے متصل ہے یعنی ہم اس سے بیزار ہیں کہ وہ ہماری عبادت کرتے تھے۔

وَ قِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَ رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۴﴾

"اور (انہیں) کہا جائے گا (لو) اب پکارو اپنے شریکوں کو تو وہ انہیں پکاریں گے۔ لیکن وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور دیکھ لیں گے عذاب کو ۱؎ کیا اچھا ہوتا اگر وہ ہدایت یافتہ ہوتے ۲؎"

۱؎ اس کا عطف قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ پر ہے۔ اور کفار کو کہا جائے گا اب اپنے شریکوں کو پکارو کہ وہ آکر تمہیں عذاب سے نجات دلائیں۔ یہاں شرکاء سے مراد بت اور انہی کی طرح کے معبودان باطلہ ہیں۔ تو وہ انہیں پکاریں گے اس حال میں کہ وہ حد درجہ حیرت زدہ اور بدحواس ہو چکے ہوں گے یا پھر اس لیے کہ وہ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے۔ لیکن وہ جواب دینے اور مدد کرنے سے عاجز ہونے کے سبب انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے۔ اور کفار اپنے نفسوں اور معبودوں کے لیے عذاب دیکھ لیں گے۔

۲؎ لَوْ کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اگر وہ دنیا میں ہدایت حاصل کر چکے ہوتے تو وہ عذاب نہ دیکھتے۔ اظہر قول یہ ہے کہ لَوْ تمنی کے لیے ہے یعنی وہ خواہش کریں گے کہ کاش وہ ہدایت یافتہ ہوتے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶۵﴾

"اور اس دن اللہ تعالیٰ آواز دے گا انہیں پھر پوچھے گا تم نے کیا جواب دیا تھا (ہمارے) رسولوں کو ۱؎"

۱؎ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ الآیہ کا عطف پہلے سوال پر ہے۔ ان سے پہلا سوال ان کے شرک کرنے پر زجر و توبیخ کے لیے ہے اور دوسرا سوال رسولوں کو جھٹلانے کے بارے میں ہے۔

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَىِٕذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

"تو اندھی ہو جائیں گی ان پر خبریں ۱؎ اس دن ۲؎ پس وہ (مارے دہشت کے) ایک دوسرے سے کچھ پوچھ نہ سکیں گے ۳؎"

۱؎ تو ان پر خبریں اندھوں کی مثل ہو جائیں گی کہ وہ ان تک راہنمائی ہی نہیں پا سکیں گے۔ اس میں اصل کلام تو اس طرح ہے فعموا عن الانباء کہ وہ خبریں دینے سے اندھے ہو جائیں گے۔ لیکن مبالغہ کے لیے انداز کلام میں تبدیلی کی گئی اور اس پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ جو کچھ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے وہ عارضی ہوتا ہے اور اس پر باہر سے وارد ہوتا ہے۔ لیکن جب قیامت برپا ہوگی تو ان کے پاس کوئی بیرونی حیلہ موجود نہیں ہوگا اس لیے وہ جواب بھی نہیں دے سکیں گے۔ یہاں انباء سے مراد رسولوں کو جھٹلانے کے عذر ہیں۔ اور مجاہد نے کہا ہے کہ ان سے مراد دلائل ہیں (1)۔ معنی یہ ہے کہ وہ کسی بھی شے کے ساتھ جواب نہیں دے سکیں گے اور نہ ہی دلائل پیش کر سکیں گے۔ یا ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی۔

۲؎ یَوْمَىٕذٍ قول باری تعالیٰ یَوْمَ یُنَادِیْهِمْ کے لیے تاکید ہے۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ جب اس قسم کے جواب میں خوف کی وجہ سے رسولوں کی زبانیں بھی لڑکھڑائیں گی اور وہ اپنے جواب اللہ تعالیٰ کے علم کو تفویض کر دیں گے تو پھر کفار کے جواب کے بارے کیسے تصور کیا جا سکتا ہے؟ آیت طیبہ میں عَمِیَ فعل صلہ عَلٰی سے متعدی ہے اس لیے کہ یہ خفاء کے معنی کو متضمن ہے۔ (2)

۳؎ یعنی وہ دہشت اور خوف کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے سے جواب کے بارے پوچھ بھی نہیں سکیں گے یا وہ اس وجہ سے سوال نہیں کریں گے کہ وہ یہ جانتے ہوں گے کہ جس سے سوال کریں گے وہ بھی اسی کی مثل لاجواب ہوگا۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِیْنَ ﴿۶۷﴾

"تو وہ جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے یقیناً وہ کامیاب و کامران لوگوں میں ہوگا ۱؎"

۱؎ تو وہ جس نے شرک سے توبہ کی اور اس نے ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی کیا تو یقیناً وہ اللہ کے نزدیک کامیاب و کامران لوگوں میں سے ہوگا۔ یہاں پر عسیٰ یا تو حقیقتاً اشراف اور بادشاہوں کے طریقہ کے مطابق ذکر کیا گیا ہے کہ وہ یقینی بات کو بھی الفاظ شک سے ظاہر کرتے ہیں۔ یا پھر اس لیے کہ امید کی نسبت توبہ کرنے والے کی طرف ہے اور معنی یہ ہوگا کہ اسے چاہیے وہ فلاح و کامرانی کی توقع رکھے۔

وَ رَبُّكَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَ یَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۶۸﴾

"اور آپ کا رب پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے (جسے چاہتا ہے) ۱؎ نہیں ہے انہیں کچھ اختیار۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور برتر ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں ۲؎"

۱؎ اور آپ کا رب جسے جس شے کے لیے چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ پس اس نے تمام لوگوں میں سے حضور نبی رحمت محمد مصطفےٰ ﷺ کو نبوت کے لیے پسند فرما لیا۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے جواب میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے یہ کہا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ (یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی عظیم آدمی پر کیوں نہ اتارا گیا) اور اس سے ان کی مراد ولید بن مغیرہ اور عروہ بن مسعود ثقفی ہوتا تھا۔ (3)

۲؎ اَلْخِیَرَةُ یہ اختیار سے اسم ہے۔ جو قائم مقام مصدر کے ہے اور یہ مفعول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے مُحَمَّدٌ

1۔ الدرالمنثور، جلد 5 صفحہ 257 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 301 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 149 (التجاریۃ)

خِيَرَةُ اللّٰهِ مِنْ خَلْقِهٖ (محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ساری مخلوق میں سے زیادہ پسندیدہ ہیں)۔ اور آیت کا معنی یہ ہے کہ اس بارے میں بندوں کو کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ کہنے لگیں فلاں کو رسول بنا کر ہماری طرف کیوں نہیں بھیجا گیا۔ لہٰذا یہ سابقہ کلام کی تاکید کے قائم مقام ہے۔ اسی لیے یہاں حرف عطف موجود نہیں۔ اور واقعہ کا سیاق بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے قول کے جواب میں نازل ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی اسی سے مناسبت رکھتا ہے کہ سُبْحٰنَ اللّٰهِ۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ کوئی غیر اس کے اختیارات میں منازعت یا مزاحمت کرے۔ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ اور وہ اس سے برتر ہے جو وہ شرک کرتے ہیں۔ یا وہ ان کی مشارکت سے پاک اور برتر ہے جنہیں وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ میں ما موصولہ یَخْتَارُ کا مفعول ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ آپ کا رب وہ شے اختیار فرماتا ہے جس میں بندوں کے لیے بہتری اور نفع ہوتا ہے۔ یعنی حضور نبی رحمت ﷺ کو رسول بنا کر بھیجنا کسی اور کی نسبت ان کے لیے زیادہ مفید اور نفع بخش تھا۔ اس تاویل میں اگرچہ تکلف ہے لیکن اس کے باوجود یہ معتزلہ کے لیے اس بات پر حجت نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ پر اصلح اور زیادہ نفع بخش چیز کو پیدا کرنا واجب ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ بے شک وہ اپنے فضل اور مہربانی سے وہی کچھ کرتا ہے جس میں اغلباً بندوں کے لیے بھلائی اور بہتری ہوتی ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ ما کان لھم الخیرۃ میں مکمل طور پر بندوں کے لیے اختیار کی نفی ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ بندے اپنے افعال میں مجبور ہیں انہیں کوئی اختیار نہیں۔ یہ تاویل بھی باطل ہے۔ کیونکہ اگر یہ مراد ہوتی تو پھر الخیرۃ کو نکرہ ذکر کیا جاتا، اس پر لام عہد ذکر نہ ہوتا جو کہ اختیار معین کی طرف مشیر ہے۔ اور اختیار معین سے مراد رسول بنانے کا اختیار ہے جیسا کہ سبب نزول اس پر دلالت کرتا ہے۔

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٦٩﴾

''اور آپ کا رب خوب جانتا ہے جو چھپائے ہوئے ہیں ان کے سینے اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں [1]''

[1] اور آپ کا رب خوب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں جیسے رسولوں سے عداوت اور ان کے بارے حقد اور کینہ وغیرہ رکھنا اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں جیسے ان کے بارے طعن و تشنیع کرنا وغیرہ۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٧٠﴾

''اور وہی اللہ ہے نہیں کوئی معبود بجز اس کے۔ اسی کو زیبا ہے ہر قسم کی تعریف دنیا میں اور آخرت میں [1] اور اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے [2]''

[1] اور وہی اللہ عبادت کا مستحق ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔ کیونکہ وہ مطلقاً بذات جمیل ہے اور دوسروں کا حسن و جمال اس سے مستعار ہے۔ وہی دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں کا مالک ہے۔ اہل ایمان آخرت میں بھی اس کی اسی طرح حمد و ثناء بیان کریں گے جیسے دنیا میں کرتے ہیں۔ وہ کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ۔ وہ اس کے فضل پر اظہار مسرت کرتے ہوئے اور مکلف ہونے کے سبب اس کی حمد و ثناء سے لطف اندوز ہوتے ہوئے یہ کہیں گے۔

معصیت کے لیے اس کا حکم بدبختی اور نحوست کا ہے(1)۔ اور اسی کے فیصلے کی طرف تم موت کے بعد اٹھا کر لوٹائے جاؤ گے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۱﴾

"آپ فرمایئے بھلا اتنا تو سوچو اگر بنا دے اللہ تعالیٰ تم پر رات ہمیشہ کے لیے قیامت کے دن تک تو کون سا خدا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جو لادے تمہیں روشنی۔ کیا تم سن نہیں رہے ہو۔ 1"

1۔ اے محمد! ﷺ آپ فرمایئے اے اہل مکہ! تم مجھے بتاؤ اگر تم پر اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لیے رات بنا دے۔ سَرْمَدًا سرود سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس میں میم زائد ہے۔ کہ قیامت تک تم پر سورج طلوع ہی نہ ہو۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کے سوا کون سا خدا ہے جو تمہیں روشنی لا کر دے جس میں تم ذرائع معاش تلاش کرتے ہو۔ اس میں مَنْ برائے استفہام انکاری ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الله نہیں جو تمہیں روشنی لا کر دے۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ حق تو یہ تھا کہ کہا جاتا ھَلْ اِلٰهٌ؟ لیکن مَنْ اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ کے سوا بھی الٰہ ہیں(2)۔ کیا تم میری نصیحت کو سن نہیں رہے ہو کہ اس سے تدبر و غور و فکر کرو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾

"فرمایئے بھلا اتنا تو سوچو اگر بنا دے اللہ تعالیٰ تم پر دن ہمیشہ کے لئے روز قیامت تک تو کون سا خدا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جو لا دے تمہیں رات جس میں تم آرام کر سکو۔ کیا تمہیں (کچھ) نظر نہیں آتا؟ 1"

1۔ فرمایئے بھلا اتنا تو سوچو اگر ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ تم پر دن بنا دے کہ سورج آسمان کے وسط میں روز قیامت تک ٹھہر جائے تو کون سا خدا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جو تمہیں رات لا دے جس میں تم کاروبار حیات کی تھکاوٹ سے راحت اور سکون حاصل کر سکو۔ کیا تمہیں ہماری آیات و نشانیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ اور ضیاء (روشنی) کو کسی وصف سے متصف نہیں کیا جب کہ اس کے مقابل رات کو سکون سے متصف کیا ہے کیونکہ روشنی بذات خود ایسی نعمت ہے جو مقصود بذات ہے۔ اور رات اس طرح نہیں کیونکہ دن کے منافع اور فوائد اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ وہ ذکر کیے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد تو اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ذکر کیا گیا ہے جب کہ رات کے ذکر کے بعد اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ فرمایا ہے۔ کیونکہ عقل سمع (سننے) سے استفادہ بنسبت بصراء (دیکھنے) کے زیادہ کرتی ہے۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

"اور محض اپنی رحمت سے 1 اس نے بنا دیا ہے تمہارے لیے رات اور دن کو تاکہ تم آرام کرو رات میں اور تلاش کرو (دن میں) اس کے فضل (رزق) سے اور تاکہ تم شکر گزار بنو۔ 2"

1۔ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ میں من برائے سببیت ہے۔ اور یہ مابعد جعل لکم کے متعلق ہے۔ اور اسے حصر کے معنی کے لیے فعل سے مقدم کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 149 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 302 (الفکر)

گیا ہے۔

۲؎ اور اس نے محض اپنی رحمت سے تمہارے لیے رات اور دن کو بنا دیا ہے تا کہ تم رات میں آرام کرو اور دن کے وقت دنیا اور آخرت کے منافع تلاش کرو۔ اس کلام میں لف ونشر مرتب ہے (یعنی لتسکنوا کا تعلق رات سے ہے اور لتبتغوا کا تعلق دن سے ہے) اور زجاج نے کہا ہے کہ اس میں یہ معنی بھی جائز ہے کہ تم آرام کرو دونوں (رات اور دن) میں اور دونوں میں اس کا فضل (رزق) تلاش کرو۔ میں کہتا ہوں کہ اس بناء پر با لَیْلَ و النھارِ مذکور ہوا اور جعل لکم الرقان نہیں کہا گیا کیونکہ رات اور دن دونوں میں آرام کرنے اور کام کرنے یعنی اللہ کے فضل کو تلاش کرنے کی قسمیں مختلف ہوتی ہیں۔ تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرو۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٧٤﴾

''اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے کر فرمائے گا کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے ۱؎''

۱؎ اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے کر فرمائے گا کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے کہ وہ تمہاری شفاعت کریں گے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچائیں گے۔ یہ گویا ایک ڈانٹ کے بعد دوسری ڈانٹ ہے یہ احساس دلانے کے لیے شرک سے بڑھ کر کوئی شے اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی نہیں۔ پہلے مقام پر انہیں اس پر زجر و توبیخ تھی کہ انہوں نے اپنے سرداروں کی اتباع کی اور ان کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ دیا۔ اور اس مقام پر ان کی اس رائے اور امید کو فاسد اور باطل قرار دینا مقصود ہے کہ یہ پتھروں کے بت اور انہی کی طرح دیگر معبودان باطلہ ان کی سفارش کریں گے۔

وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٧٥﴾

''اور ہم نکالیں گے ہر امت سے گواہ پھر (ان امتوں کو) ہم کہیں گے لے آؤ اپنی دلیل تو وہ جان لیں گے کہ بے شک حق اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور گم ہو جائیں گے ان سے جو افتراء وہ باندھا کرتے تھے ۱؎''

۱؎ یا تو اس کا عطف یَقُوْلُ پر ہے۔ اور یہ علی سبیل الالتفات ہے یا پھر یہ جملہ معترضہ ہے۔ اور ہم نکالیں گے ہر امت سے گواہ جو ان کے خلاف اس عمل کی شہادت دے گا جس پر وہ عمل پیرا ہے اور وہ ان کا نبی ہوگا۔ پھر ان امتوں کو ہم کہیں گے کہ تم اپنے اعتقاد کے صحیح ہونے پر دلیل لے آؤ جس پر تم رہے۔ پس اس وقت وہ جان لیں گے کہ بے شک الوہیت میں حق اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے کوئی بھی اس میں شریک نہیں۔ اور وہ ان سے ضائع ہونے والے غیب کی طرح غائب ہو جائیں گے جو افتراء وہ دنیا میں باندھا کرتے تھے۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ﴿٧٦﴾

''(بے شک قارون موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم میں سے تھا۔ پھر اس نے سرکشی کی ان پر ۱؎ اور ہم نے دے دیئے تھے اسے اتنے خزانے کہ ان کی چابیاں (اپنے بوجھ سے) جھکا دیتی تھیں ایک طاقتور جتھہ (کی کمروں) کو ۲؎ جب کہا اسے اس کی قوم نے زیادہ خوش نہ ہو ۳؎ بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا اترانے والوں کو ۴؎''

لہ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ وہ آپ کے چچا کا بیٹا تھا۔ کیونکہ سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ قارون بن یصہر بن قاہت بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام۔ اور موسیٰ علیہ السلام بن عمران بن قاہت بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام(1)۔ ابن منذر نے ابن جریج سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور ابن اسحاق نے کہا ہے کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا تھا، عمران کا بھائی تھا اور یہ دونوں یصہر بن قاہت کے بیٹے تھے۔ اور بنی اسرائیل میں قارون سے بڑھ کر تورات کا قاری کوئی نہیں تھا۔ لیکن اس نے بھی سامری کی طرح منافقت کی۔ اور جلال الدین محلی نے کہا ہے کہ وہ آپ کے چچا کا بیٹا بھی تھا اور آپ کی خالہ کا بیٹا بھی(2)۔ کہا جاتا ہے کہ وہ فرعون کی جانب سے بنی اسرائیل پر عامل تھا پس وہ ان پر ظلم وزیادتی کرتا تھا۔ ضحاک نے کہا ہے کہ اس نے ان کے خلاف شرک کے ذریعے بغاوت کی(3)۔ بعض نے کہا ہے اس نے ان کے خلاف تکبر اور نخوت ورفعت کے سبب سرکشی کی۔ اور یہ معنی بھی کہا گیا ہے کہ اس نے ان کے ساتھ حسد کیا اور ان پر فضیلت و برتری کا مطالبہ کرنے لگا۔

عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہؓ سے نقل کیا ہے کہ قارون موسیٰ علیہ السلام کے چچا کا بیٹا تھا اور آپ کا چچا ان کے باپ کا بھائی تھا۔ اس نے بنی اسرائیل کے ساتھ سمندر عبور کیا تھا۔ اور یہ تورات بڑی خوش آوازی سے پڑھتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا دشمن سامری کی طرح منافق ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہلاک اور برباد کر دیا اور اسے اپنے کیے کی پوری پوری سزا دی۔ اس نے اپنے مال و اولاد کی کثرت کے سبب بغاوت وسرکشی اختیار کی تھی(4)۔ لیکن سورۂ مومن میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ اس پر دلالت کرتا ہے کہ قارون موسیٰ علیہ السلام پر کبھی بھی ایمان نہیں لایا نہ ظاہراً اور نہ باطناً۔ شہر بن حوشب نے کہا ہے کہ قارون نے اپنے کپڑوں کی لمبائی میں ایک بالشت کا اضافہ کیا تھا۔(5)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَا یَنْظُرُ اللّٰہُ اِلٰی مَنْ جَرَّ ثَوْبَہٗ خُیَلَاءَ (اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر کرم نہیں فرمائے گا جو اپنے کپڑوں کو تکبر کے سبب گھسیٹ کر چلا)(6)۔ اسے بغویؒ نے روایت کیا ہے اور امام مسلمؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی تکبر اور فخر کی وجہ سے اپنی چادر زمین پر گھسیٹ کر چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہیں دیکھے گا(7)۔ اور امام احمد اور نسائی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ چادر لٹکا کر چلنے والے کی طرف نظر نہیں فرمائے گا۔

ٹہ اَلْكُنُوْزِ سے مراد جمع شدہ مال ہے۔ اور مفاتح مِفْتَح کی جمع ہے۔ جن کے ساتھ تالوں کو کھولا جاتا ہے۔ یہی قول قتادہ، مجاہد اور ایک جماعت کا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفاتح سے مراد اس کے خزانے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر فرمایا وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ تو اس میں مفاتح الغیب سے مراد غیب کے خزانے ہیں۔ اور اس صورت میں اس کا واحد مفتح ہے۔ لیکن اس تاویل کی بناء پر قول باری تعالیٰ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ اس کے خزانوں کی بہت زیادہ کثرت پر دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ خزانہ جسے چالیس آدمی اٹھا سکتے ہوں۔ وہ تو غالباً چار لاکھ درہم کی مقدار تک بھی نہیں پہنچے گا۔ جریر نے منصور سے اور اس نے خیثمہ سے یہ نقل کیا ہے کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ) 2۔ تفسیر جلالین صفحہ 333 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ) 4۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 259 (العلمیہ)
5۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 260 (العلمیہ) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ)، صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 195 (قدیمی)
7۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 195 (قدیمی)

میں نے انجیل میں قارون کے خزانوں کی چابیوں کے بارے یہ پڑھا ہے کہ وہ ساٹھ خچروں کا بوجھ تھیں۔ ان میں سے ہر چابی انگلی سے بڑی نہیں تھی اور ہر خزانے کے لیے علیحدہ چابی تھی(1)۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قارون جہاں بھی جاتا تھا اپنے خزانوں کی چابیاں اپنے ساتھ اٹھا کر لے جاتا تھا اور وہ چابیاں لوہے کی بنی ہوئی تھیں۔ پھر جب وہ اس پر بوجھل اور بھاری ہو گئیں۔ تو اس نے لکڑی کی چابیاں بنوا لیں۔ پھر جب ان کا بوجھ بھی بڑھ گیا۔ تو اس نے ایک انگلی کی لمبائی کے برابر گائے کے چمڑے کی چابیاں تیار کروائیں تو وہ اس کے ساتھ ساتھ چالیس خچروں پر لاد کر اٹھائی جاتی تھیں جہاں بھی وہ جاتا۔ لیکن قرآن کریم ان روایات کی تائید نہیں کرتا۔ کیونکہ عُصبہ کا اطلاق مردوں پر ہوتا ہے نہ کہ خچروں پر۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ علماء نے عُصبہ کی مقدار میں اختلاف کیا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ عصبہ سے مراد دس سے لے کر پندرہ تک افراد ہیں۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد تین سے لے کر دس تک کے درمیان افراد ہیں۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ اس کا اطلاق دس سے لے کر چالیس تک کے درمیان افراد پر ہوتا ہے(2) اور قاموس میں اسی طرح ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ستر افراد ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ اس کی چابیوں کو مردوں میں سے قوی ترین چالیس افراد اٹھاتے تھے(3)۔ اور لَتَنُوٓاُ بِالْعُصْبَةِ کا معنی ہے کہ وہ جماعت انہیں اٹھا کر چلتی تھی تو ان کے بوجھ کی وجہ سے وہ جھک جاتے تھے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ اس عبارت میں قلب کیا گیا ہے۔ اصل عبارت اسی طرح تھی ما ان العصبة لتنوء بها (کہ وہ جماعت ان کے بوجھ کے سبب جھک جاتی تھی) مثلاً کہا جاتا ہے نَاءَ فلان بکذا کہ فلاں اس بھاری بھرکم بوجھ کے ساتھ اٹھا(4)۔ یہ جملہ انّ کی خبر ہے اور وہ اپنے جملے کے ساتھ مل کر ما کا صلہ ہے۔ اور یہ اٰتَیْنٰهُ کے دو مفعولوں میں سے دوسرا ہے۔ اور اپنے سے مقدم الکنوز سے حال ہے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ یہ لَتَنُوٓءُ کی ظرف ہے۔ اور فرح کا معنی سرور خوشی اور مرغوب فیہ شے پانے کے سبب سینے کا کھل جانا ہے اور وہ فرح جس سے منع کیا گیا ہے وہ ہے جس میں تکبر اور غرور موجود ہو یعنی اپنے نفس کو ہر شے سے مستغنی کرتے ہوئے حق کو قبول کرنے سے تکبر اور سرکشی اختیار کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤی ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی قاموس میں ہے کہ الفرح کا معنی ہے خوش ہونا اور اپنے آپ کو دیکھنا(5)۔ بغویؒ نے لاتفرح کی تفسیر اس طرح کی ہے تکبر نہ کر، غرور نہ کر اور نہ اکڑ(6) کیونکہ مرغوب فیہ چیز کے حصول کے وقت فرحت و مسرت کا ہونا ایک طبعی امر ہے۔ جس میں بندے کو کوئی اختیار نہیں ہوتا لہٰذا اس سے روکنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ دنیا کے حصول پر فرحت و خوشی کا ہونا مطلقاً مذموم ہے کیونکہ دنیا کی محبت اور اس کی پسند اس کے فانی اور زوال پذیر ہونے کے تصور سے غفلت کا موجب ہے اور یہ غفلت بالیقین مذموم ہے۔ کیونکہ اس شے کا یقین ہونا کہ دنیا کی تمام لذات فانی اور ختم ہونے والی ہیں وہ بالیقین اس سے دور رہنے کا موجب بنتا ہے(7)۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىکُمْ (تم اس چیز پر افسوس اور غم نہ کرو جو تم سے فوت ہو جائے اور جو کچھ اس نے تمہیں عطا فرما دیا ہے اس پر خوش نہ ہو) اور یہاں اس نہی کی علت یہ بیان کی ہے کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی محبت سے روکتی ہے۔ پس فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 68 (الامیریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ)
5۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 351 (التراث العربی)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ)

ہے بے شک اللہ تعالیٰ دنیوی خزانوں کے سبب اترانے والوں اور ان پر شکر ادا نہ کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ بعض محققین نے کہا ہے کہ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں خوشی کی مذمت موجود ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ، وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ، ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اور مزید فرمایا حَتّٰی اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا۔ اللہ تعالیٰ نے خوشی منانے کی رخصت صرف اپنے اس ارشاد میں دی فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ اور اپنے اس ارشاد میں وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ میرے نزدیک دنیا میں ایسی چیز کے سبب خوشی کا اظہار کرنا جو آخرت میں نفع بخش ہو مطلقاً قابل تعریف ہے اور اسی کا حکم اس ارشاد میں دیا گیا ہے فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔ اور دنیوی لذات پر خوشی کے اظہار کے ساتھ اگر شکر بھی ادا کیا جائے تو وہ بھی محمود اور قابل ستائش ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شکر ادا کرتے ہوئے کھانے والا صبر کرنے والے روزے دار کی مثل ہے(1) اور اگر خوشی تکبر اور کفران نعمت کے ساتھ مقترن ہو تو وہ بالیقین مذموم ہے۔ پس مدح اور ذم کا تعلق یا تو اس شے سے ہے جس سے خوشی متعلق ہے یا پھر مدح اور ذم کا تعلق شکر اور ناشکری سے ہے۔ کیونکہ کسی مرغوب فیہ چیز کے حصول پر فرحت و مسرت امر طبعی ہے جس میں بندے کو کوئی اختیار نہیں۔ لہٰذا حکم تکلیفی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوگا۔ مگر جب بندے کو اللہ تعالیٰ سے سچی محبت ہو تو وہ صرف اس چیز سے خوش ہوگا جس سے اس کا رب راضی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کرتا ہے جو اس سے محبت کرتا ہے۔ پس وہ اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کرتا جو اپنی مرغوب فیہ شے سے اس لیے خوش ہوتا ہے کہ وہ اس کی اپنی پسندیدہ ہے نہ کہ اس وجہ سے کہ وہ اس کے رب کی پسندیدہ ہے۔ واللہ اعلم۔

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

"اور طلب کر اس (مال و زر) سے جو دیا ہے تجھے اللہ تعالیٰ نے آخرت کا گھر اور نہ فراموش کر اپنے حصہ کو دنیا سے ۱؎ اور احسان کیا کر (غریبوں پر) جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے ۲؎ اور نہ خواہش کر فتنہ و فساد کی ملک میں یقیناً اللہ تعالیٰ نہیں دوست رکھتا فساد برپا کرنے والوں کو ۳؎"

۱؎ اور طلب کر ان دنیوی نعمتوں کے ذریعے جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمائی ہیں۔ آخرت کا گھر یعنی جنت۔ اس طرح کہ تو ان نعمتوں پر شکر ادا کرے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی راہ میں خرچ کرے۔ اور بھولی ہوئی شے کو چھوڑنے کی طرح۔ دنیا سے اپنا وہ حصہ چھوڑ نہ دے جس کے سبب تو اپنی آخرت کو حاصل کر سکے۔ کیونکہ حقیقتاً دنیا میں انسان کا حصہ یہ ہے کہ وہ آخرت کے لیے عمل کرے کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ اسی طرح مجاہد اور ابن زید نے کہا ہے۔(2)

سدی نے کہا ہے نصیبک من الدنیا سے مراد صدقہ دینا اور صلہ رحمی کرنا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تو آخرت کو طلب کرتے ہوئے اپنی صحت، اپنی قوت، جوانی اور مال و منال کو ترک نہ کر(3)۔ وہی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِغْتَنِمْ خَمْساً قَبْلَ خَمْسٍ حَيَاتَکَ قَبْلَ مَوْتِکَ وَ صِحَّتَکَ قَبْلَ سُقْمِکَ وَ فَرَاغَکَ قَبْلَ شُغْلِکَ وَ شَبَابَکَ قَبْلَ

1۔ مستدرک حاکم، جلد 4 صفحہ 151 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ)

هَرَمِکَ وَ غِنَاکَ قَبْلَ فَقْرِکَ(1) (پانچ چیزوں کو پانچ سے پہلے غنیمت سمجھو۔ اپنی زندگی کو موت آنے سے پہلے، اپنی صحت کو بیماری آنے سے پہلے، اپنی فراغت کو کسی کام میں مشغول ہونے سے پہلے، اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے اور اپنے غنی کو غربت و افلاس سے پہلے) اسے حاکم اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام احمد نے زہد میں نقل کیا ہے اور علامہ بغوی، ابن حبان اور ابونعیم نے حلیہ میں عمر بن میمون الاودی سے اسی طرح مرسل روایت کیا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے کہ اس میں حکم دیا گیا ہے کہ ضرورت سے زائد مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیش کر دیا جائے اور اتنا روک لیا جائے جو اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ اور منصور بن زاذان نے کہا ہے کہ لا تنس نصیبک من الدنیا کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی خوراک (روزی) کا سامان نہ چھوڑ۔(2)

۲؎ اور اللہ تعالیٰ کے بندوں پر احسان کیا کر یا ذکر، شکر اور اطاعت پر دوام اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت اچھی طرح کر جیسے اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے اس طرح کہ بغیر کسی انقطاع کے اس نے مسلسل اتنی نعمتوں سے نوازا جنہیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

۳؎ اور ملک میں فتنہ فساد کی خواہش نہ کر۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اس میں ظلم اور بغاوت سے منع کیا گیا ہے(3) اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے ہر وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تحقیق وہی زمین میں فساد کا طلب گار رہتا ہے(4)۔ بے شک اللہ تعالیٰ فساد برپا کرنے والوں کو ان کے اعمال کی برائی کے سبب دوست نہیں رکھتا۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ ؕ اَوَ لَمْ یَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَ لَا یُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾

"وہ کہنے لگا مجھے دی گئی ہے یہ (دولت وثروت) اس علم کی وجہ سے جو میرے پاس ہے ۱؎ کیا اس (مغرور) کو اتنا علم بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہلاک کر ڈالیں اس سے پہلے قومیں جو اس سے قوت میں کہیں سخت اور دولت جمع کرنے میں کہیں زیادہ تھیں ۲؎ اور نہیں دریافت کیے جائیں گے مجرموں سے ان کے گناہ ۳؎"

۱؎ یہاں ضمیر مرفوع سے حال ہونے کی بناء پر عَلٰى عِلْمٍ ظرف محل نصب میں ہے۔ اور "عِنْدِیْ" میں نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ یہ یا تو ظرف مستقر ہے اور علم کی صفت ہے یا پھر ظرف لغو ہے اور اُوْتِیْتُهٗ کے متعلق ہے۔ جیسے تیرا یہ قول هذا عندی یعنی یہ میرے گمان میں ہے اور میرے اعتقاد میں ہے۔ اور اس میں ان کے اس قول کا رد ہے۔ جو انہوں نے قارون سے کہا تھا کہ اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ۔ یعنی اس نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر استحقاق کے محض فضل کرتے ہوئے مجھ پر احسان نہیں کیا کہ مجھ پر اس کا شکر واجب ہو اور اس کے بندوں پر احسان کرنا ضروری ہو۔ بلکہ مجھے یہ جاہ وحشمت، مال و دولت اور لوگوں پر فوقیت اس علم کی بناء پر دی گئی جو میرے پاس ہے یا جو میرے اعتقاد میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس علم سے مراد علم کیمیا ہے۔ حضرت سعید بن المسیب نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کیمیا گری کا علم جانتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اس علم کا ایک تہائی یوشع بن نون کو سکھایا، ایک تہائی کالب بن یوقنا کو سکھایا اور ایک تہائی قارون کو سکھا دیا۔ پھر قارون نے ان دونوں کے ساتھ دھوکہ کیا یہاں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (التجاریۃ)

تک کہ ان دونوں کا علم بھی سیکھ لیا اور یہ علم ہی اس کی دولت وثروت کا سبب تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ سے مراد تجارت، زراعت اور کمانے کے دیگر مختلف الانواع ذرائع کا علم ہے(1)۔ سہل نے کہا ہے کہ جس کسی نے اپنے آپ کی طرف نہیں دیکھا اس نے فلاح اور کامیابی حاصل کرلی۔ سعید اور خوشبخت وہ ہے جس نے اپنے اقوال وافعال سے اپنی نگاہ کو پھیر لیا اور اپنے تمام تر افعال واقوال میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کو دیکھنے کی راہ کھول لی اس کے برعکس شقی اور بدبخت وہ ہے جس نے اپنے اقوال وافعال اور احوال کو اپنے ہی سامنے مزین کیا پھران پر فخر کیا اور اپنے خالق ہونے کے لیے ہی ان کا دعویٰ کیا تو عنقریب اسے کسی دن اسی طرح ہلاک کردیا جائے گا جیسے قارون کو دھنسا دیا گیا کیونکہ اس نے بھی اپنی ذات کے لیے فضیلت اور برتری کا دعویٰ کیا تھا۔

2۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور ہمزہ استفہام تعجب اور توبیخ کے لیے ہے اور واؤ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے۔ اَلَمْ یَتَفَکَّرْ قَارُوْنُ وَلَمْ یَعْلَمْ۔ کیا قارون نے غور وفکر نہیں کی اور اسے اتنا علم بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے کئی قومیں ہلاک کر ڈالیں جو قوت میں اس سے کہیں سخت اور دولت جمع کرنے میں اس سے کہیں زیادہ تھیں اگر وہ یہ جان لیتا تو وہ اپنے مال کے سبب غرور اور تکبر نہ کرتا۔ اور اگر اسے یہ علم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہلاک کرنے والا ہے، وہی عطا کرنے والا ہے اور وہی روکنے والا ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور نہ ہی اس پر کسی کا کوئی حق ہے۔ اس میں اس کے دعویٰ علم وعظمت کا رد اس علم کی نفی کے ساتھ کیا جارہا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل قوم عاد کو تباہ وبرباد کردیا حالانکہ وہ قوت وطاقت اور کثرت تعداد کی وجہ سے اس سے کہیں زیادہ مضبوط اور طاقتور تھی۔ اور ان میں شداد بن عاد تو ساری زمین کا بادشاہ تھا۔

3۔ اور مجرموں سے ان کے گناہ دریافت نہیں کیے جائیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان پر مطلع ہے اسے سوال کرنے اور معلومات لینے کی ضرورت نہیں۔ پس وہ انہیں دنیا میں ہلاک کر کے اور آخرت میں جہنم میں داخل کر کے ان کے اعمال کی سزا دے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے قارون کو ان لوگوں کی ہلاکت اور بربادی کا ذکر کر کے خوف زدہ کردیا جو اس سے قبل اپنی قوت وطاقت اور مال کی کثرت میں اس سے کہیں زیادہ تھے تو پھر اس آیت میں اسی حکم کو مزید مؤکد کیا کہ وہ ہلاکت صرف انہی لوگوں کے ساتھ مختص نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ تو ان تمام مجرموں کے گناہوں پر آگاہ ہے جو پہلے تھے اور بعد میں ہوں گے وہ تمام کو ان کے گناہوں کی سزا بالیقین دے گا۔ قتادہ نے کہا ہے کہ انہیں بغیر پوچھ گچھ کے اور حساب وکتاب کے جہنم میں داخل کردیا جائے گا۔ اور مجاہد کا قول ہے کہ ملائکہ ان سے سوالات نہیں کریں گے کیونکہ وہ انہیں ان کی پیشانیوں سے پہچان لیں گے۔ اور حسن نے کہا ہے کہ ان سے معلومات حاصل کرنے کے لیے نہیں پوچھا جائے گا بلکہ ان سے سوالات زجر وتوبیخ اور جھڑکنے کے لیے کیے جائیں گے۔(2)

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۷۹﴾

"الغرض (ایک دن) وہ نکلا اپنی قوم کے سامنے بڑی زیب وزینت کے ساتھ 1 کہنے لگے وہ لوگ جو آرزومند تھے دنیوی زندگی کے اے کاش! ہمیں بھی اسی قسم کا (جاہ وجلال) نصیب ہوتا جیسے دیا گیا ہے قارون کو واقعی وہ تو بڑا خوش نصیب ہے 2"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (التجاریۃ)

1۔ اس کا عطف قَالَ پر ہے۔ ابراہیم نخعی نے کہا ہے کہ قارون اپنی قوم کے ساتھ نکلا درآنحالیکہ وہ سب سبز اور سرخ لباس پہنے ہوئے تھے۔ ابن زید نے کہا ہے کہ وہ ستر ہزار افراد کے ساتھ باہر نکلا وہ سب زعفرانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ وہ سفید گھوڑوں پر سوار ہو کر باہر آئے ان پر ارغوانی زینیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ خود زعفرانی لباس میں ملبوس تھے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ سفید خچر پر سوار تھا جس پر سنہری ارغوانی زین پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ چار ہزار گھوڑ سوار تھے اور ان کے گھوڑوں پر بھی ارغوانی زینیں تھیں۔ اور اس کے ساتھ تین سو سفید رنگ کی باندیاں تھیں جو زیورات سے آراستہ تھیں اور سرخ لباس پہنے سفید خچروں پر سوار تھیں۔(1)

2۔ تو وہ لوگ کہنے لگے جو دنیوی زندگی کے آرزو مند تھے جیسا کہ رغبت کی لوگوں میں عادت ہوتی ہے یعنی اے قوم! کاش! ہمیں بھی اسی قسم کا جاہ و جلال نصیب ہوتا جیسا قارون کو دیا گیا ہے۔ تو اس میں انہوں نے قارون کی مثل کی آرزو کی، اس کی اپنی دولت اور جاہ وحشمت کی آرزو نہیں کی، تو انہوں نے ایسا حسد سے بچنے کے لیے کیا اور یہ احتیاط اس لیے برتی کیونکہ بنی اسرائیل دنیا کے طالب ہونے کے باوجود مومن تھے۔ وہ تو واقعی بڑا خوش نصیب تھا کہ اسے دنیا میں حظ وافر نصیب ہوا۔ تو یہ جملہ ان کی آرزو اور تمنا کی علت بیان کر رہا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝۸۰

"اور کہا ان لوگوں نے جنہیں (دنیا کی بے ثباتی کا) علم دیا گیا تھا 1۔ حیف تمہاری عقل پر 2۔ اللہ کا ثواب بہتر ہے۔ اس کے لیے جو ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے 3۔ اور نہیں مرحمت کی جاتی یہ نعمت بجز صبر کرنے والوں کے 4۔"

1۔ جنہوں نے اس طرح کی آرزو کی تھی انہیں ان لوگوں نے کہا جنہیں اس شے کا علم دیا گیا تھا جس کا اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لیے آخرت میں وعدہ کر رکھا ہے۔ مقاتل نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے علماء تھے۔(2)

2۔ وَيْلَكُمْ میں ویل مصدر ہے اور اس کا معنی ہلاکت ہے۔ ترکیب کلام میں یہ مصدر ہونے (مفعول مطلق ہونے) کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی هَلَكْتُمْ هلاكًا۔ یا پھر مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَلْزَمَكُمُ اللّٰهُ هلاكًا (اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور ہلاک کرے)۔ یہ حقیقت میں تو بددعا ہے لیکن یہ ایسے عمل پر زجر و توبیخ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ناپسندیدہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ راضی نہ ہو۔

3۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا ثواب اس سے بہتر ہے جو کچھ قارون کو دیا گیا بلکہ دنیا و مافیہا سے بہتر اور افضل ہے اور لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا یا تو خیر کے متعلق ہے یا ثواب اللہ کے متعلق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ثواب ایمان لانے والوں کے لیے بہتر ہے۔ یا یہ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ کے متعلق ہے۔ یعنی انہوں نے یہ اہل ایمان کو کہا۔

4۔ یہ نیا کلام ہے یا یہ خیر میں موجود ضمیر سے حال ہے اور ضمیر کا مرجع وہ کلمہ ہے جس کے ساتھ ان علماء نے گفتگو کی۔ یا اس ضمیر کا مرجع ثواب ہے کیونکہ اس میں ثواب بمعنی مثوبۃ ہے۔ یا پھر یہ ضمیر جنت یا ایمان اور عمل صالح کے لیے ہے کیونکہ یہ دونوں سیرت اور طریقہ کے معنی میں ہیں۔ یعنی وہ کلمہ یا ثواب یا جنت یا سیرت عطا نہیں ہوگی مگر صرف ان لوگوں پر جنہوں نے طاعات پر قائم رہنے میں صبر

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (التجارية)

اختیار کیے رکھا اور معاصی اور گناہوں سے بچنے کے لیے دنیا سے دور رہے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ﴿۸۱﴾

"پس ہم نے غرق کر دیا اسے بھی اور اس کے گھر کو بھی زمین میں۔ تو نہ تھی اس کے حامیوں کی کوئی جماعت جو (اس وقت) اس کی مدد کرتی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں۔ اور وہ خود بھی اپنا انتقام نہ لے سکا[1]۔"

[1] پس ہم نے اسے بھی اور اس کے گھر کو بھی زمین میں غرق کر دیا تو اس کے حامیوں کی کوئی جماعت نہ تھی۔ فِئة سے مراد ایسے ساتھیوں کا گروہ ہے جن کی طرف آدمی مصیبت اور تکلیف کے وقت رجوع کرتا ہے۔ فَخَسَفْنَا میں فا تعلیلیہ ہے۔ کہ وہ اس سے عذاب الٰہی کو روکتے اور اسے بچا لیتے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں۔ اور وہ خود بھی اپنے آپ کو نہ بچا سکا اس عذاب اور گرفت سے جو خسف اور غرق کی صورت میں اس پر اتری۔ مثلاً کہا جاتا ہے نصره من عدوه فانتصر۔ (اس نے دشمن کے خلاف اس کی مدد کی پس وہ محفوظ ہو گیا) جب کہ وہ اسے روکے تو وہ رک جائے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف فما کانَ پر ہے۔ علماء نے بذریعہ اخبار یہ کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ علم رکھتا تھا، وہ تورات کا بہت بڑا قاری تھا، شکل وصورت کے اعتبار سے حسین تھا، بہت زیادہ مال ودولت کا مالک تھا اور آواز کے اعتبار سے انتہائی خوش الحان تھا۔ لیکن اس نے بغاوت اور سرکشی اختیار کر لی۔ اور اس کی بغاوت اور نافرمانی میں سب سے اول یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ اپنی چادروں کے ساتھ چاروں طرف ایسے نیلے رنگ کا دھاگا باندھ لیں جس کی رنگت آسمان کی رنگت کی مثل ہو۔ تو وہ جب بھی اسے دیکھیں گے تو وہ انہیں آسمان کی یاد دلاتا رہے گا۔ اور وہ یہ جان لیں گے کہ بے شک میرا کلام اسی سے نازل کیا گیا ہے۔ یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار! کیا تو نے انہیں یہ حکم نہیں فرمایا کہ وہ اپنی چادریں مکمل طور پر نیلے رنگ میں رنگ لیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل تو ان دھاگوں کو حقیر جانیں گے۔ تو رب کریم نے جواب میں ارشاد فرمایا اے موسیٰ! بے شک میرے احکام میں سے چھوٹا حکم بھی چھوٹا نہیں ہوتا۔ پس جب انہوں نے امر صغیر میں میری اطاعت وفرمانبرداری نہ کی، تو وہ بڑے حکم میں بھی میری اطاعت بجا نہیں لائیں گے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ساری قوم کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم ارشاد فرما رہا ہے کہ تم اپنی چادروں کے ساتھ آسمانی رنگ کے نیلے دھاگے باندھ لو۔ تا کہ تم جب بھی انہیں دیکھو تو اپنے رب کو یاد کرو۔ پس بنی اسرائیل نے ویسے ہی کیا جیسے موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حکم دیا تھا لیکن قارون نے اظہار تکبر کیا اور آپ کی بات تسلیم نہ کی اور کہنے لگا کہ یہ عمل تو مالک اپنے غلاموں سے کراتے ہیں تا کہ وہ انہیں دوسروں سے ممتاز کر سکیں۔ یہی اس کی نافرمانی اور بغاوت کا پہلا اظہار تھا۔ پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ساتھ سمندر کو عبور کر لیا تو آپ نے ان کی قربانیاں ہارون علیہ السلام کے سپرد کر دیں یعنی قربانیوں کا انتظام وانصرام ان کے حوالے کر دیا۔ پس بنی اسرائیل اپنی قربانی کے جانور لے کر حضرت ہارون علیہ السلام کے پاس حاضر ہوتے پھر انہیں مذبح میں ذبح کر کے رکھ دیتے پھر آسمان سے آگ اترتی تھی اور انہیں کھا جاتی تھی قارون نے اسے اپنے دل میں برا منایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس حاضر ہو کر کہا اے موسیٰ! رسالت تیرے لیے ہے، قربانیوں کا انتظام ہارون کے سپرد ہے اور میرے لیے کچھ بھی نہیں حالانکہ میں تورات کا بڑا قاری ہوں میں اس پر صبر نہیں کر سکتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواباً

فرمایا۔ ہارون کو یہ عہدہ میں نے نہیں دیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ تفویض کیا ہے۔ پھر قارون نے کہا میں تو آپ کی یہ بات تسلیم نہیں کروں گا یہاں تک کہ تم تفصیلاً مجھے دکھادو۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو جمع کیا اور ارشاد فرمایا اپنے اپنے عصا لے آؤ۔ چنانچہ وہ لے کر آئے تو آپ نے انہیں اپنے اس خیمے میں گاڑ دیا جس میں آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ پس وہ اپنی لاٹھیوں کی حفاظت کرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ تو صبح کے وقت کیا دیکھا کہ صرف ہارون علیہ السلام کا عصا ان کے سامنے سبز پتوں کے ساتھ لہلہارہا ہے۔ یہ دیکھ کر قارون نے کہا قسم بخدا! یہ اس جادو سے زیادہ تعجب خیز نہیں جو آپ کرتے رہتے ہیں۔ پھر قارون اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر موسیٰ علیہ السلام سے علیحدہ ہوگیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس کے ساتھ قرابت داری کا تعلق ہونے کی وجہ سے نرم سلوک کرتے رہے اور وہ ہمہ وقت آپ کو اذیتیں پہنچاتا رہا اور اس کی سرکشی، تکبر و غرور اور عداوت میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک گھر بنایا اور اس کا دروازہ سونے کا بنوایا اور اس کی دیواروں پر سونے کی پتریاں لگوائیں۔ بنی اسرائیل کے سردار صبح و شام اس کے پاس آتے جاتے تھے وہ انہیں کھانا کھلاتا اور وہاں بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں کرتے اور ایک دوسرے کے ساتھ تمسخر و استہزاء کرتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر زکوٰۃ کا حکم نازل ہوا۔ تو قارون نے زکوٰۃ کا انکار کردیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے اس کے ساتھ اس طرح مصالحت کی کہ وہ ایک ہزار دینار کے بدلے ایک دینار، ہر ہزار درہم کے بدلے ایک درہم، ہر ہزار بکری میں سے ایک بکری اور ہر ہزار شے میں سے ایک شے بطور زکوٰۃ دے گا۔ پھر جب وہ لوٹ کر اپنے گھر گیا اور اس کا حساب لگایا تو اسے بہت زیادہ پایا۔ لہٰذا اس نے اپنے آپ کو دینے کے لیے تیار نہ پایا پھر اس نے بنی اسرائیل کو جمع کیا اور ان سے کہا اے بنی اسرائیل! موسیٰ علیہ السلام نے تمہیں جس شے کا بھی حکم دیا تم نے اسے پورا کیا اور وہ شے اسے دی اور اب وہ یہ چاہتا ہے کہ تمہارے مال بھی لے لے۔ یہ سن کر انہوں نے اسے کہا تو ہمارا سردار ہے جو چاہے حکم دے ہم ماننے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ اس نے انہیں کہا کہ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ فلاں زانیہ عورت کو لے آؤ۔ وہ اپنے ساتھ بدکاری کرنے کی موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائے ہم اسے مال و دولت دیں گے۔ پس جب اس نے بنی اسرائیل کی موجودگی میں ایسا کردیا تو یہ موسیٰ علیہ السلام کو چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس عورت کو بلایا اور قارون نے اس کے لیے ایک ہزار درہم مقرر کیے۔ ایک روایت ہے کہ ایک ہزار دینار مقرر کیے، ایک روایت میں ہے کہ سونے کا بھرا ہوا ایک طشت مقرر کیا اور ایک روایت میں ہے کہ اس نے اسے کہا کہ میں تجھے مال و دولت سے نوازوں گا اور تجھے اپنی بیویوں میں شامل کرلوں گا بشرطیکہ کل جب بنی اسرائیل حاضر ہوں تو تو موسیٰ علیہ السلام پر اپنے ساتھ بدکاری کرنے کی تہمت لگائے۔ پس دوسرے دن قارون نے بنی اسرائیل کو جمع کیا اور پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور آپ سے کہا کہ بنی اسرائیل آپ کے باہر آنے کا انتظار کررہے ہیں تاکہ تم انہیں اوامر و نواہی کے بارے کچھ بتاؤ۔ پس موسیٰ علیہ السلام باہر تشریف لائے۔ اس وقت بنی اسرائیل ایک کھلے میدان میں موجود تھے۔ آپ ان میں تشریف لائے اور فرمایا اے بنی اسرائیل! جس کسی نے چوری کی ہم اس کا ہاتھ کاٹ دیں گے۔ جس کسی نے دوسرے پر تہمت عائد کی ہم اسے اسی کوڑے لگائیں گے۔ اور جس نے زنا کیا اس حال میں کہ اس کی بیوی نہ ہو (یعنی وہ شادی شدہ نہ ہو) تو ہم اسے ایک سو درے لگائیں گے اور جو کوئی بیوی کے ہوتے ہوئے زنا کرے گا (یعنی شادی شدہ ہونے کی حالت میں) تو ہم اسے رجم کریں گے یہاں تک کہ وہ مرجائے گا۔ یہ سن کر قارون نے آپ کو کہا اگرچہ آپ خود ہی یہ کیوں نہ کریں؟ تو آپ نے فرمایا اگرچہ میں بھی ایسا کروں۔ پس یہ سن کر اس نے کہا کہ بنی

اسرائیل تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے فلاں عورت کے ساتھ بدکاری کی ہے۔ آپ نے فرمایا اسے بلاؤ۔ اگر اس نے بھی ایسا کہہ دیا تو ایسے ہی ہوگا جیسے اس نے کہہ دیا (یعنی میں تسلیم کرلوں گا)۔ پس جب وہ عورت آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے فرمایا اے فلانہ! کیا میں نے تیرے ساتھ ایسے کیا ہے جیسے یہ کہہ رہے ہیں۔ آپ نے اس پر بڑا زور دیا اور اس رب کے وسیلہ سے کہا جس نے بنی اسرائیل کے لیے سمندر کو پھاڑ دیا اور تورات نازل فرمائی کیا تو سچ نہیں بولے گی؟ پس اللہ تعالیٰ نے اس کے ذہن کو بدل دیا۔ اس نے اپنے ہی دل میں کہا۔ آج کے دن توبہ کر لینا میرے لیے اس سے کہیں افضل ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے رسول کو اذیت پہنچاؤں۔ چنانچہ اس نے کہا ایسا نہیں انہوں نے جھوٹ بولا ہے۔ بلکہ قارون نے تو میرے لیے معاوضہ مقرر کیا ہے کہ میں تم پر اپنے سے بدکاری کرنے کی تہمت لگاؤں۔ پس موسیٰ علیہ السلام روتے ہوئے سجدے میں گر گئے اور کہنے لگے اے اللہ! اگر میں تیرا رسول ہوں تو میرے لیے اس پر غضب نازل فرما۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی میں نے زمین کو تیرا تابع فرمان بنا دیا ہے۔ جو چاہے اسے حکم دے وہ بجا لائے گی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے بنی اسرائیل! بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے قارون کی طرف بھی اسی طرح بھیجا ہے جیسے اس نے مجھے فرعون کی طرف بھیجا ہے۔ پس جو اس کے ساتھ ہے اسے چاہیے کہ وہ اس کے ساتھ ٹھہرا رہے اور جو کوئی میرے ساتھ ہے وہ اس سے علیحدہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ تمام کے تمام علیحدہ ہو گئے اور دو آدمیوں کے سوا قارون کے ساتھ کوئی بھی باقی نہ رہا۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے زمین کو حکم دیتے ہوئے فرمایا انہیں پکڑ لے پس زمین نے انہیں پاؤں تک اپنی گرفت میں لے لیا اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ اس وقت وہ اپنے تخت اور فرش پر تھا۔ پس زمین نے اسے پکڑا تو اس کے تخت کو اپنے اندر غیب کر لیا۔ پھر آپ نے زمین کو حکم دیا انہیں پکڑ لے۔ پس زمین نے گھٹنوں تک انہیں اپنے اندر دھنسا لیا۔ پھر فرمایا اے زمین! انہیں پکڑ لے۔ تو زمین نے کمروں تک انہیں گرفت میں لے لیا۔ آپ نے پھر فرمایا اے زمین! انہیں اور پکڑ لے۔ تو زمین نے گردنوں تک انہیں قبضے میں لے لیا۔

قارون اور اس کے ساتھی ہر بار عاجزی وزاری کرتے رہے، قارون اللہ تعالیٰ اور اپنی قرابت کے واسطے دیتا رہا حتیٰ کہ ستر بار اس نے آپ کو یہ واسطہ دیا۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام نے شدت غضب کی وجہ سے کسی بار بھی اس کی جانب توجہ نہ فرمائی۔ پھر فرمایا اے زمین! اسے پکڑ لے۔ پس زمین ان پر جڑ گئی (یعنی زمین نے انہیں مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا اور اوپر سے بند ہو گئی)۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی تیرا دل بھی کتنا سخت ہے کہ اس نے ستر بار تجھ سے فریاد کی لیکن تو نے اس کی دادرسی نہ کی مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم وہ اگر ایک بار بھی مجھ سے فریاد کرتا تو میں اس کی مدد ضرور کرتا۔ اور بعض آثار میں اس طرح مروی ہے کہ رب کریم نے فرمایا تیرے بعد میں زمین کسی کے تابع فرمان نہیں کروں گا(1)۔ قتادہ نے کہا ہے زمین نے اسے اپنے اندر دھنسا لیا ہے پس وہ ہر روز آدمی کے قد برابر نیچے دھنس جاتا ہے لیکن یوم قیامت تک وہ زمین کی اتھاہ گہرائی تک نہیں پہنچے گا۔ قارون کا یہ حال ملاحظہ کرنے کے بعد بنی اسرائیل آپس میں یہ چہ میگوئیاں کرتے لگے کہ موسیٰ علیہ السلام نے قارون کے لیے اس لیے بددعا کی ہے تاکہ اس کے گھر بار، خزانے اور اس کے مال ومتاع کے خود مالک بن جائیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام تک یہ بات پہنچی تو آپ نے رب کریم کی بارگاہ میں یہ التجا کی یہاں تک کہ زمین نے اس کے گھر، خزانے اور تمام اموال کو اپنے اندر دھنسا لیا۔ یہی مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں بیان کیا گیا ہے۔ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ(2)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 53-152 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 153 (التجاریہ)

وَ اَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ یَقُوْلُوْنَ وَیْكَاَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ یَقْدِرُ ۚ لَوْ لَاۤ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَیْكَاَنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

''اور صبح کی ان لوگوں نے جوکل تک اس کے مرتبہ کی آرزو کر رہے تھے یہ کہتے ہوئے [1] اوہو! (اب پتہ چلا) [2] کہ اللہ تعالیٰ کشادہ کر دیتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) [3] اگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں گاڑ دیتا [4] اوہو! (اب پتہ چلا) کہ کفار بامراد نہیں ہوتے [5]''

1۔ اور یہ کہتے ہوئے ان لوگوں نے صبح کی جو اس کے مرتبہ کی کل تک یعنی زمانہ قریب تک آرزو کر رہے تھے۔

2۔ ''وَیْكَاَنَّ'' یہ لفظ بصریوں کے نزدیک وَیْ اور كَاَنَّ سے مرکب ہے۔ اس میں وَیْ تعجب کے لیے ہے اور كَاَنَّ تشبیہ کے لیے ہے۔ اور اس کا معنی ہے دونوں امر ایک دوسرے کے کتنے مشابہ ہیں۔

3۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) یعنی یہ دونوں امر برابر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ مربوط ہے نہ کہ اس کی وسعت و کشادگی کا سبب عزت و تکریم ہے جو اس میں فراخی کا تقاضا کرتی ہے اور نہ ہی رزق میں تنگی کسی اہانت اور حقارت کے سبب ہوتی ہے جو اس میں تنگی اور کمی کا باعث بنتی ہے (ایسا ہرگز نہیں بلکہ دونوں کا مدار اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے)۔ خلیل نے کہا ہے کہ وَیْ اسم فعل ہے اور تعجب کے معنی کے لیے ہے۔ اور ندامت کے اظہار کے لیے ہے۔ کیونکہ وہ لوگ نادم ہوئے اور انہوں نے اپنے گزشتہ اعمال پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا تھا۔ اور كَاَنَّ کا معنی ہے میں ایسا گمان کرتا ہوں اور میں (میرا یہ اندازہ ہے) ایسا خیال کرتا ہوں جیسا کہ کوئی کہتا ہے'' كَاَنَّ الْفَرَجَ قَدْ اَتَاكَ'' (میں یہ خیال کرتا ہوں یا مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خوشی تیرا مقدر ہے)۔ قطرب نے کہا ہے وَیْكَ وَیْلَكَ کے معنی میں ہے اس سے لام حذف کر دی گئی ہے اور اَنَّ فعل مقدر کے ساتھ منصوب ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے وَیْلَكَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ وَیَقْدِرُ (تو ہلاک ہو جائے یہ یقین کر لے اللہ تعالیٰ ہی رزق کو وسیع بھی کرتا ہے اور تنگ بھی)۔ یہ قول بھی ہے کہ وَیْكَاَنَّ حرف تنبیہ ہے اور قائم مقام اَلَا کے ہے۔ اور حسن سے مروی ہے کہ یہ کلمہ ابتدائیہ ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے وَاَنَّ اللّٰهَ الخ۔ مجاہد نے کہا ہے اس کا معنی ہے الم تعلم کیا تو نہیں جانتا۔ قتادہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے الم تو کیا تو نے نہیں دیکھا۔ اور فراء نے کہا ہے کہ یہ کلمہ تقریر ہے جیسے کسی کا یہ قول'' اَمَا تَرٰی اِلٰی صُنْعِ اللّٰهِ وَاِحْسَانِهٖ'' کیا اللہ تعالیٰ کے حسن سلوک اور اس کے احسان کی طرف تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ یعنی تو ضرور دیکھ رہا ہے۔ فراء نے یہ بھی ذکر کیا کہ میں ایک بدوی عورت کو اپنے خاوند کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اَیْنَ ابْنُكَ (تیرا بیٹا کہاں ہے؟) تو اس نے جواب دیا'' وَیْكَاَنَّهٗ وَرَآءَ الْبَیْتِ'' یعنی کیا تو اسے گھر کے پیچھے نہیں دیکھ رہی (1) (یعنی تو دیکھ رہی ہے کہ وہ وہاں ہے)۔

4۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا ''لَخَسَفَ'' میں حفص اور یعقوب نے فعل معروف کی صورت میں خاء اور سین کو مفتوح پڑھا ہے۔ اور عام قراء نے فعل مجہول ہونے کی بناء پر خاء کو مضموم اور سین کو مکسور پڑھا ہے۔ تو وہ ہمیں بھی زمین میں گاڑ دیتا جیسے اس نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 153 (التجاریۃ)

قارون کو گاڑ دیا۔

۵ اوہو! اب پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرنے والے، اور رسولوں کو اور ان وعدوں کو جھٹلانے والے جو انہوں نے آخرت کے ثواب کے بارے ان سے کیے بامراد نہیں ہوتے۔ یہاں پر تشبیہ کے علاوہ وَیْکَاَنَّہٗ کے دیگر تمام معانی مراد لینا صحیح ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾

''یہ آخرت کا گھر ہم مخصوص کر دیں گے اس (کی نعمتوں) کو[1] ان لوگوں کے لیے جو خواہش نہیں رکھتے زمین میں بڑا بننے کی[2] اور نہ فساد برپا کرنے کی[3] اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے[4]۔''

۱ تلک اسم اشارہ تعظیم کے لیے ہے اور یہ اس کی صفت ہے (یعنی الاخرۃ الدار کی صفت ہے اور الدار تلک کی صفت ہے)۔ گویا کہ فرمایا یہ ہے کہ یہ دار آخرت جس کے بارے تم نے سن رکھا ہے اور اس کے اوصاف تم تک پہنچ چکے ہیں۔ نَجْعَلُهَا تلک مبتدا کی خبر ہے۔

۲ کلبی اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ ہیں جو ایمان قبول کرنے سے تکبر اور سرکشی نہیں کرتے۔ عطاء نے کہا ہے وہ جو لوگوں پر غلبہ پانے اور جبر کرنے کی خواہش نہیں رکھتے اور نہ ان کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرتے ہیں۔ حسن نے کہا ہے وہ لوگ جو بادشاہ کے پاس عزت و شرف کے طالب نہیں ہوتے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ یہ آیت ان حاکموں اور با اختیار لوگوں کے بارے نازل ہوئی جو قدرت ہونے کے باوجود تواضع اور انکساری کرتے ہیں (1) یعنی والیوں میں سے وہ جو قدرت کے باوجود تواضع کرتا ہے اور زمین میں بڑا بننے کی خواہش نہیں رکھتا۔

۳ کلبی نے کہا ہے فساد سے مراد غیر اللہ کی عبادت کے لیے دعوت دینا ہے۔ عکرمہ نے کہا ہے اس سے مراد بغیر حق کے لوگوں کا مال و متاع لینا ہے۔ اور ابن جریج اور مقاتل نے کہا ہے اس سے مراد معاصی اور گناہ کا عمل کرنا ہے۔ (2)

۴ قتادہ نے کہا ہے عاقبۃ سے مراد جنت ہے (3)۔ میں کہتا ہوں کہ نیکیوں کے انجام اور ان پر دیے جانے والے ثواب کے لیے عاقبۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ برائیوں کے انجام اور ان پر ہونے والے عذاب کے لیے عقاب استعمال ہوتا ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾

''جو کرتا ہے نیکی تو اس کے لیے بہتر صلہ ہے اس نیکی سے اور جو ارتکاب کرتا ہے برائی کا تو نہ بدلہ دیا جائے گا انہیں جنہوں نے بدکاریاں کیں۔ مگر اتنا جتنا انہوں نے کیا[1]۔''

۱ نیکی کا صلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ہے اور اس سے آگے جتنا اللہ تعالیٰ چاہے اور وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ میں مضمر کی جگہ مظہر کو رکھا گیا ہے یعنی فلا یجزون کی جگہ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ رکھا گیا ہے تاکہ ان کی طرف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریہ)

برائی کی نسبت دوبار کرنے سے ان کے حال کی حقارت اور برائی بیان ہو۔

ے یعنی إِلَّا مِثْلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ مگر اسی کی مثل، جتنا عمل انہوں نے کیا۔ اس میں لفظ مثل محذوف ہے اور مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ کو مماثلت میں مبالغہ کے اظہار کے لیے اس کے قائم مقام بنا دیا ہے۔ (یعنی برائی کا ارتکاب کرنے والوں کو ان کی برائی کے برابر سزا دی جائے گی)

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ مَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٨٥﴾

"(اے محبوب) یقیناً وہ (قادر مطلق) جس نے آپ پر قرآن کی تبلیغ فرض کی ہے آپ کو واپس لے جائے گا جہاں آپ چاہتے ہیں لہ آپ فرمایئے میرا رب خوب جانتا ہے اسے جو آیا ہدایت یافتہ ہو کر اور اسے بھی جو کھلی گمراہی میں ہے ے"

لہ یعنی بے شک وہ قادر مطلق جس نے آپ پر قرآن کریم کی تلاوت، تبلیغ اور اس کے مطابق عمل فرض کیا ہے۔ عطاء نے اسی طرح کہا ہے۔ اور بغویؒ نے کہا ہے کہ اکثر مفسرین نے کہا ہے اس کا معنی ہے۔ یعنی بے شک وہ جس نے آپ پر قرآن کریم نازل کیا ہے۔ وہ آپ کو مکہ کی طرف واپس لے جائے گا(1)۔ تحقیق رب کریم نے آپ کو فتح مکہ کے دن واپس مکہ مکرمہ میں لوٹا دیا۔ مَعَادٍ کو نکرہ ذکر کیا ہے۔ اور اس کی تنوین اس کی (مکہ) عظمت وشان کو بیان کرنے کے لیے ہے کیونکہ یہی وہ شہر ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ لوٹ کر تشریف لائے۔ دشمنوں پر آپ کو غلبہ عطا ہوا، اسلام کو بلندی نصیب ہوئی اور کفر وشرک ذلیل وخوار ہوا۔ عوفی نے حضرت ابن عباسؓ سے یہی روایت نقل کی ہے(2)۔ اور مجاہد کا قول بھی اسی طرح ہے۔ قتیبی نے کہا ہے کہ کسی آدمی کا معاد سے مراد اس کا وہ شہر ہوتا ہے جس سے جانے کے بعد پھر وہ اس کی طرف لوٹ کر آتا ہے(3)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے غار سے نکلے تو آپ ﷺ دشمن کے تعاقب کے ڈر سے عام راستے سے ہٹ کر دوسرے راستے پر چلنے لگے۔ پس جب آپ خطرے سے محفوظ ہوئے تو صحیح راستے کی طرف لوٹ آئے اور مکہ اور مدینہ کے درمیان جحفہ کے مقام پر آپ نے نزول فرمایا۔ تو جب آپ ﷺ نے اس مقام سے مکہ کی طرف جانے والے راستہ کو پہچانا تو آپ میں مکہ مکرمہ کا اشتیاق پیدا ہوا تو جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو کہا کیا آپ اپنے شہر اور اپنی جائے ولادت کے لیے مشتاق ہیں؟ تو آپ نے فرمایا جی ہاں۔ تو اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ پھر اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے دن آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ واپس لوٹا دیا۔ ابن ابی حاتم نے ضحاک سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور یہ آیت مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان جحفہ کے مقام پر نازل ہوئی۔ سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت کی ہے کہ معاد سے مراد موت ہے(4)۔ میں کہتا ہوں چونکہ موت کے ذریعے اصلی حالت کی طرف لوٹنا ہوتا ہے۔ اسی لیے معاد کو موت کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا كُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ۔ زہری اور عکرمہ نے کہا ہے کہ معاد سے مراد قیامت ہے۔ بعض نے کہا ہے اس سے مراد جنت ہے(5) کیونکہ جب اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریۃ)

نے صراحۃً بیان کر دیا ان العاقبة للمتقین کہ اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے تو نیکی کرنے والوں کو ثواب دینے اور برائی کرنے والوں کو عذاب دینے کا وعدہ کر کے اس کی مزید تائید و تاکید کر دی۔ اور اللہ تعالیٰ نے نیکوکاروں کے لیے دونوں جہاں میں اچھے انجام کا وعدہ فرمایا۔ جب کفار مکہ نے حضور نبی کریم ﷺ سے کہا اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

۲۔ قُلْ رَّبِّیْٓ میں نافع، ابو عمرو اور ابن کثیر نے یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے ساکن۔ اور ابوربیعہ نے قنبل اور نبری سے بھی یاء کو ساکن روایت کیا ہے۔ معنی یہ ہے آپ فرما دیجئے میرا رب اسے خوب جانتا ہے جو ہدایت یافتہ ہو کر آیا اور وہ کس ثواب اور مدد کا مستحق ہے۔ اس سے مراد حضور نبی رحمت ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ ترکیب کلام میں مَنْ اس فعل محذوف سے منصوب ہے جس پر اَعْلَمُ دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ربی اعلم الکائنات یعلم من جآءَ بِالْهُدٰی۔ اور اسے بھی جو کھلی گمراہی میں ہے اور وہ کس عذاب اور ذلت کا مستحق ہے۔ اس سے مراد مشرکین ہیں۔ اس آیت میں سابقہ وعدہ کو مزید پختہ کیا گیا ہے۔ یعنی یہ اس کے لیے تاکید ہے اسی لیے اسے اس کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

"اور آپ کو تو یہ امید نہ تھی کہ نازل کی جائے گی آپ کی طرف کتاب مگر یہ محض رحمت ہے آپ کے رب کی (جو آپ کو صاحب قرآن بنا دیا) [1] تو آپ ہرگز کافروں کے مددگار نہ بنیں [2]"

۱۔ اور آپ کو تو یہ امید نہ تھی کہ آپ کی طرف قرآن مجید کی وحی کی جائے گی۔ فراء نے کہا ہے کہ الا رحمة میں استثناء منقطع ہے۔ اس کا معنی ہے لیکن آپ کے رب نے محض رحمت فرماتے ہوئے آپ پر قرآن کریم نازل فرما دیا(1)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مستثنیٰ منفصل مفرغ ہو۔ اور اس کو اس معنی پر محمول کیا جائے کہ آپ کے رب نے کسی شے کی وجہ سے آپ کو یہ کتاب عطا نہیں فرمائی مگر یہ محض اس کی رحمت ہے۔

۲۔ تو آپ ہرگز کافروں کے مددگار نہ بنیں اس طرح کہ آپ ان سے نرم سلوک کریں، ان کی جانب سے اذیتوں اور تکالیف کو برداشت کریں اور ان کے مطالبات کو قبول کریں۔ مقاتل نے کہا ہے کہ یہ اس وقت ہوا جب کفار نے آپ ﷺ کو اپنے آباء و اجداد کے دین کی طرف دعوت دی تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی نعمتیں یاد دلائیں اور آپ کو ان کی امداد کرنے اور ان کے مقاصد کو پورا کرنے سے منع فرمایا۔(2)

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۷﴾

"اور (خیال رہے) وہ ہرگز نہ روکیں آپ کو اللہ تعالیٰ کی آیات سے اس کے بعد کہ وہ اتاری گئیں آپ کی طرف اور بلایئے (لوگوں کو) اپنے رب کی طرف اور ہرگز نہ ہو جانا شرک کرنے والوں سے [1]"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریۃ)

۱؎ اور (خیال رہے) کفار مکہ آپ کو ہرگز نہ روکیں اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے۔ اس کے بعد کہ وہ آپ کی طرف نازل کی گئیں اور لوگوں کو اپنے رب کی معرفت، توحید اور عبادت کی طرف بلایئے۔ اور کفار کی امداد کرنے کے سبب ہرگز مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾

''اور نہ پکارو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو۔ نہیں ہے کوئی معبود بجز اس کے۔ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے ۱؎ اسی کی حکمرانی ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا ۲؎''

۱؎ اس آیت اور ماقبل آیات میں حکم دیا گیا ہے کہ آپ مشرکین کی اس حرص اور امید کو کلیۃً ختم کر دیں کہ آپ ان کی کوئی امداد کریں گے۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہ ایک مذکورہ نہی کی علت بیان کر رہی ہے۔ اور كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ کا معنی ہے کہ اس کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔ کیونکہ اس کے سوا ہر شے ممکن ہے اپنی ذات کے اعتبار سے ہلاک ہونے والی اور معدوم ہے۔ ہر شے کا وجود اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ ہے اور مستعار ہے۔ بعض نے یہ معنی کیا ہے کہ ہر عمل لغو اور باطل ہے مگر وہ جس سے اس کی ذات کی رضا مقصود ہو۔ جملہ کل شیء سابق کلام کی علت ہے۔

۲؎ مخلوق میں اسی کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے اور اسی کی طرف تمہیں آخرت میں لوٹایا جائے گا۔ پس وہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزاء دے گا۔

سورۃ القصص کی تفسیر 28 ربیع الاول بمطابق 1206ھ اختتام پذیر ہوئی بحمد اللہ۔

سورۃ القصص کا ترجمہ 3 رمضان المبارک 1420ھ، 12 دسمبر 1999ء بروز اتوار بوقت ساڑھے دس بجے شب اپنے اختتام کو پہنچا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذَالِکَ

سورۃ العنکبوت

آیاتہا ۶۹ ۔ سُوْرَۃُ الْعَنْکَبُوْتِ مَکِّیَّۃٌ ۲۹ ۔ رکوعاتہا ۷

سورۃ العنکبوت مکی ہے اور اسکی انہتر آیتیں اور سترہ رکوع ہیں۔ اس کی پہلی دس آیتیں مدنی ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

الٓمّٓ ۞ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۞

''الف۔ لام۔ میم۔ کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا[1]۔''

[1] ابن ابی حاتم نے شعبیؒ سے نقل کیا ہے کہ کچھ لوگ اسلام کا اقرار کرتے ہوئے مکہ میں ہی مقیم تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام نے مدینہ طیبہ سے ان کی طرف لکھا کہ تمہاری جانب سے اسلام کا اقرار قابل قبول نہیں ہوگا یہاں تک کہ تم ہجرت کر آؤ۔ چنانچہ وہ یہ خط پا کر مدینہ طیبہ کے ارادہ سے مکہ مکرمہ سے نکل پڑے۔ لیکن مشرکین مکہ نے ان کا تعاقب کیا اور انہیں واپس پھیر لائے۔ تو ان اہل ایمان کے بارے یہ آیت نازل ہوئی(1)۔ الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ پھر اہل مدینہ نے ان کی طرف لکھا کہ تمہارے متعلق اس طرح حکم نازل ہوا۔ تو پھر انہوں نے کہا کہ اب ہم نکلیں گے۔ اگر کسی نے ہمارا پیچھا کیا تو ہم اس سے قتال کریں گے۔ چنانچہ مشرکین نے پھر ان کا تعاقب کیا۔ تو انہوں نے ان سے قتال کیا۔ نتیجۃً کچھ ان میں سے شہید ہو گئے اور کچھ بچ نکل کر مدینہ طیبہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو پھر ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا الآیہ۔ اور قتادہؒ سے بھی اسی طرح منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اہل مکہ میں سے ان لوگوں کے بارے نازل ہوئی جو حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے ارادہ سے مکہ مکرمہ سے نکلے۔ پس مشرکین نے ان سے تعرض کیا تو وہ واپس لوٹ آئے۔ پھر مدینہ طیبہ میں ان کے رہنے والے ان کے اہل ایمان بھائیوں نے ان کی طرف یہ آیت لکھ کر بھیج دی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے نازل فرمائی۔ تو پھر وہ دوبارہ مکہ مکرمہ سے نکل پڑے۔ پس ان میں سے جو شہید ہوئے سو شہید ہوئے اور جو بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے سو کامیاب ہوئے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے یہ آیت نازل فرمائی وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا الخ ''(2) اور علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے النَّاس سے مراد وہ لوگ لیے ہیں جو مکہ مکرمہ میں ایمان لائے یعنی سلمہ بن ہشام، عیاش بن ربیعہ، ولید بن ولید اور عمار بن یاسر وغیرہ۔(3)

ابن سعید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عبید اللہ بن عمیر سے نقل کیا کہ یہ آیت حضرت عمار بن یاسرؓ کے بارے نازل ہوئی جبکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اذیتیں دی جاتی تھیں۔ یعنی اَحَسِبَ النَّاسُ الایہ(4)۔ علامہ بغوی نے ابن جریج کا قول بھی اسی طرح نقل

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 268 (العلمیۃ)
2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 268 (العلمیۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 155 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 83 (الامیریۃ)

کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا کہ مقاتل نے کہا ہے یہ آیت حضرت عمر فاروق اعظم بن خطابؓ کے غلام مہجع بن عبداللہ کے حق میں نازل ہوئی۔ اور یہی وہ بلند اقبال آدمی ہے جسے اس امت میں سے سب سے پہلے باب جنت کی طرف بلایا جائے گا(1)۔ میں کہتا ہوں یہی وہ آدمی ہے جو غزوۂ بدر کے دن مسلمانوں کی صفوں سے سب سے پہلے مقابلے کے لیے باہر نکلا تھا اور پھر عامر بن حضرمی نے تیر مار کر انہیں شہید کر دیا۔ اور سب سے پہلے شہید ہونے والا یہی ہے جیسا کہ سبیل الرشاد میں ہے۔ اور جب اس کے والدین اور بیوی نے اس کی شہادت پر اظہار غم کیا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی۔ الٓمّٓ کے بعد ہمزہ استفہام کا واقع ہونا اس کے مستقل آیت ہونے کی دلیل ہے (کیونکہ ہمزۂ استفہام صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر یہ مستقل آیت نہ ہوتی تو پھر ہمزہ اس کے بعد کی بجائے اس سے پہلے آتا۔ مترجم)۔ حِسبان سے مراد ظن (گمان) ہے اور اس کا تعلق جملہ کے مضمون سے ہے کیونکہ یہ اس کے ثبوت کی حجت پر دلالت کرتا ہے۔ اسی لیے یہ دو مفعولوں کا تقاضا کرتا ہے یا پھر اس کا جو دو مفعولوں کے قائم مقام ہو۔ جیسا کہ قول باری تعالیٰ اَن يُّتْرَكُوْا ہے۔ اور یہ استفہام انکار اور زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ اور اَنْ يَّقُوْلُوْا میں تقدیر کلام اس طرح ہے لِاَنْ يَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ اور اس میں وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ يَقُوْلُوْا کے فاعل سے حال ہے۔ معنی یہ ہے کہ کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ انہیں بغیر کسی آزمائش میں مبتلا کیے صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیا جائے گا کہ ہم ایمان لے آئے (اَظَنُّوْا تَرْكَهُمْ غَيْرَ مَفْتُوْنِيْنَ لِقَوْلِهِمْ اٰمَنَّا) تو اس میں ترک مفعول اول اور غیر مفتونین سے مکمل کرنے کے لیے ہے۔ اور لقولھم دوسرا مفعول ہے۔ اور یہ اس قول کی مثل ہے۔ حسبت ضربه للتاديب۔ یا پھر یہ معنی ہے کیا وہ اپنے قول اٰمَنَّا کی وجہ سے اپنے آپ کو بغیر آزمائش کے چھوڑا ہوا گمان کرتے ہیں۔ یعنی انہیں ایسا گمان نہیں کرنا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ تو انہیں بڑی مشقت آمیز آزمائشوں میں مبتلا کرے گا مثلاً ہجرت، جہاد اور دیگر طرح طرح کی مصیبتیں جن کا تعلق ان کی ذاتوں، مال اور اولاد سے ہے۔ تاکہ وہ منافق سے مخلص کو اور مضطرب سے دین پر ثابت قدم رہنے والے کو ممتاز کر دے۔ اور اس لیے بھی تاکہ وہ ان آزمائشوں میں صبر کا دامن مضبوطی سے تھامنے کے سبب درجات علیا پر فائز ہو سکیں۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ابتداء میں صرف ایمان لانے کا حکم ارشاد فرمایا اور پھر ان پر نماز، زکوٰۃ اور دیگر تمام احکام شرعیہ فرض کیے۔ تو ان میں سے بعض پر یہ امور شاق گزرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(2)۔ تو اس اعتبار سے معنی یہ ہو گا۔ کیا وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ انہیں صرف ایمان پر ہی چھوڑ دیا جائے گا اور انہیں مزید اوامر و نواہی کے سبب آزمایا نہیں جائے گا؟۔ ایسا نہیں کیونکہ بے شک صرف ایمان بھی ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہنے کے مانع ہے لیکن اعلیٰ مراتب اور بلند درجات تو طاعات پر عمل پیرا ہونے اور شہوات چھوڑنے کے سبب ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ③

"اور بے شک ہم نے آزمایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے [1]۔ پس اللہ تعالیٰ ضرور دیکھے گا انہیں جو (دعویٰ ایمان) میں سچے تھے [2] اور ضرور دیکھے گا (ایمان کے) جھوٹے (دعویداروں کو) [3]"

[1] اور بے شک ہم نے ان انبیاء اور مؤمنین کو آزمایا تھا جو ان سے پہلے گزرے۔ پس ان میں سے بعض کو آروں سے چیر ڈالا گیا، بعض کو قتل کر دیا گیا۔ اور بنی اسرائیل کو فرعون کے سبب آزمایا گیا کہ وہ انہیں شدید ترین عذاب دیتا رہا۔ یہ جملہ یا تو اَحَسِبَ کے قول کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 155 (التجاریۃ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 155 (التجاریۃ)

ساتھ متصل ہے یا پھر لَا یُفْتَنُوْنَ کے ساتھ یعنی یہ قدیمی طریقہ ہے جو تمام امتوں میں جاری رہا لہٰذا کسی کو بھی اس کے برعکس توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ یا پھر یہ جملہ معترضہ ہے اور مومنین کی تسلی کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔

۲؎ پس اللہ تعالیٰ انہیں ضرور دیکھے گا جو اپنے قول اٰمَنَّا میں سچے تھے۔ یہ جملہ وَلَقَدْ فَتَنَّا پر معطوف ہے۔ اور اس میں تکلم سے غیب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔

۳؎ اللہ تعالیٰ تو ازل سے جانتا ہے۔ آیت کا معنی یہ ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے علم کا اس حالت کے ساتھ تعلق ہو جائے جس کے سبب وہ انہیں جو ایمان میں سچے ہیں ممتاز کر دے گا جو ایمان میں جھوٹے ہیں۔ اور اس کے سبب وہ انہیں ثواب عطا فرمائے گا اور ان پر عذاب مسلط کرے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ سچ بولنے والوں کو جھوٹ بولنے والوں سے الگ ظاہر کر دے گا تاکہ اس کی معلومات کا اظہار ہو جائے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ انہیں ضرور دیکھے گا اور بعض نے کہا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک کو پاک اور طیب سے ممتاز کر دے لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

''کیا خیال کر رکھا ہے انہوں نے جو کر رہے ہیں برے کرتوت کہ وہ ہم سے آگے نکل جائیں گے ۱؎ بڑا غلط فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں ۲؎ ''

۱؎ کیا انہوں نے خیال کر رکھا ہے جو کفر اور گناہ کر رہے ہیں۔ (اس میں لفظ عمل دل اور دیگر اعضاء جسمانی کے تمام افعال کو شامل ہے) کہ وہ ہم سے آگے نکل جائیں گے اور ہم ان سے انتقام لینے پر قادر نہیں ہوں گے۔ ترکیب کلام میں اَنْ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر حَسِبَ کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اور وہ اَحَسِبَ پر معطوف ہے۔ اس میں اَمْ منقطعہ بمعنی بل ہے۔ اور یہ اضراب اس لیے ہے کیونکہ یہ حِسْبَان پہلے حِسْبَان کو باطل کرتے رہا ہے۔ کیونکہ پہلے حِسْبَان میں گمان یہ ہے کہ ایمان کے سبب انہیں مزید آزمائش میں نہیں ڈالا جائے گا اور اس میں یہ ہے کہ انہیں ان کے گناہوں کی سزا نہیں دی جائے گی۔ اور بعض علماء نے کہا ہے کہ پہلا گمان کرنے والے اہل ایمان تھے اور یہ دوسرا گمان رکھنے والے کافر تھے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی جائز ہے کہ اَمْ متصلہ ہو۔ اور انکار دو گمانوں میں سے ایک پر وارد ہو۔ اس طرح ان دونوں میں ہمزہ اور ام کے ذریعے تردد پیدا کر دیا گیا۔ اور انکار سے حاصل ہونے والی نفی کے محل میں نکرہ عام ہو گا۔ پس معنی یہ ہو گا کہ یہ دونوں گمان باطل ہیں۔ پس اے مؤمنین تم یہ گمان نہ کرو کہ تمہیں آزمایا نہیں جائے گا بلکہ تمہیں تو شدید ترین تکالیف اور مصائب کے ساتھ آزمایا جائے گا تاکہ تم مراتب رفیعہ اور درجات علیا کو پا سکو۔ اور تمہارے دشمن یہ خیال نہ کریں کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں انہیں عذاب نہیں دے گا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ دنیا میں انہیں مؤمنین کے ہاتھوں عذاب اور تکلیف میں مبتلا رکھے گا اور آخرت میں اپنی طرف سے عذاب دے گا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اہل ایمان کو پہلے مصائب و آلام سے آزمایا جائے گا پھر بالآخر انہی کو غلبہ بھی عطا ہو گا۔

۲؎ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ میں مَا موصولہ ہے اور فاعل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے۔ یا پھر یہ مَا موصوفہ ہے اور ضمیر مرفوع مستتر مبہم سے تمیز ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ اور مخصوص بالذم محذوف ہے۔ یعنی بہت برا ہے ان کا یہ فیصلہ جو وہ کر رہے ہیں۔ تقدیر کلام اس طرح ہے بِئْسَ الَّذِيْ يَحْكُمُوْنَهٗ حُكْمُهُمْ هٰذِهٖ یا بِئْسَ حُكْمًا يَحْكُمُوْنَهٗ حُكْمُهُمْ هٰذَا۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

''جو شخص امید رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ملنے کی [1] تو (وہ سن لے) کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا وقت ضرور آنے والا ہے۔ اور وہی ہر بات سننے والا، ہر چیز کو جاننے والا ہے [2]''

[1] حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہاں رجا سے مراد خوف ہے۔ یعنی جو شخص دوبارہ قبروں سے اٹھائے جانے، حساب و کتاب اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ سعیدؒ بن جبیر نے کہا ہے جو شخص اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنے کی حرص اور طمع رکھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنے کی آرزو رکھتا ہے(1)۔ پس اسی آیت کریمہ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ جو کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج اپنے رب کریم کو دیکھا۔ تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یہ دیدار اس دنیا سے خارج تھا۔ لہٰذا جس کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ میں نے اس دنیا میں اپنے سر کی آنکھوں سے دیدار الٰہی کیا ہے تو اس نے کذب بیانی کی ہے۔

[2] اَجَلَ اللّٰهِ میں لفظ اللہ سے پہلے لقاء مضاف محذوف ہے۔ اس سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا مقررہ وقت بالیقین ضرور بضرور آنے والا ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے قیامت کا دن بالیقین آنے والا ہے(2)۔ پس آدمی کو چاہیے کہ وہ ایسے کاموں کی طرف جلدی کرے جنہیں کرنے کے سبب وہ اپنی آرزو اور امید کو پا سکتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو اس عذاب سے نجات دلا سکتا ہے جس سے وہ ڈر رہا ہے۔ اور یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی مثل ہے فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا اور وہی بندوں کی باتیں سننے والا ہے۔ اور ان کے عقائد اور افعال کو جاننے والا ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

''اور جو شخص کوشش کرتا ہے (حق کو سر بلند کرنے کی) تو وہ اپنے فائدہ کے لیے ہی کوشاں ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ غنی ہے تمام کائنات سے [1]''

[1] اور جو شخص جنگ میں اللہ تعالیٰ کے دشمنوں یعنی کفار کے خلاف کوشش کرتا ہے۔ یا اپنے نفس کے خلاف اسے ایسی خواہشات پوری کرنے سے روک کر جہاد کرتا ہے جن سے منع کیا گیا ہے۔ اور اطاعت و فرمانبرداری پر صبر و استقامت اختیار کر کے اور شیطان کے وساوس سے بچنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ تو وہ اپنے فائدہ کے لیے ہی کوشاں ہے کیونکہ اس کے منافع اسی کی طرف راجع ہوں گے اس جملے کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ پر ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کو ان کی اطاعت و فرمانبرداری کی کوئی حاجت نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے محض ان پر رحمت فرماتے ہوئے اور ان کے مصالح و منافع کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں عبادت کا مکلف بنایا۔ یہ جملہ سابقہ کلام کے لیے علت بن رہا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

''اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے۔ تو ہم دور کر دیں گے ان سے ان کی برائیوں (کی نحوست کو) [1] اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 155 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 155 (التجاریۃ)

ہم انہیں بہت عمدہ بدلہ دیں گے۔ان (اعمال حسنہ) کا جو وہ کیا کرتے تھے ۲۔''

۱۔یعنی ہم ان کی برائیوں کو نیکیوں کے سبب ختم کر دیں گے۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا پانچ نمازیں، ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان المبارک دوسرے رمضان المبارک تک ان تمام گناہوں کو مٹا دیتے ہیں جو ان کے درمیانی وقت میں کیے جائیں بشرطیکہ آدمی گناہ کبیرہ سے اجتناب رکھے۔اسے مسلمؒ نے روایت کیا ہے(1)۔اس کی وضاحت اس ارشاد کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ۔

۲۔اور ہم انہیں ان کے احسن اعمال کا بہت عمدہ بدلہ دیں گے احسن عمل سے مراد اطاعت و فرمانبرداری ہے۔یعنی ہم انہیں ضائع نہیں کریں گے۔اور اس کا معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ ہم انہیں اس سے کہیں زیادہ عطا فرمائیں گے جو انہوں نے عمل کیے یعنی دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک اور پھر آگے جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں احسن بمعنی حسن ہے۔یعنی یہ اسم تفضیل کے معنی میں نہیں بلکہ صفت مشبہ کے معنی میں ہے۔

وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حُسْنًاؕ وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَاؕ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

''اور ہم نے حکم دیا انسان کو کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے ۱۔اور اگر وہ یہ کوشش کریں تیرے ساتھ کہ تو شریک بنائے کسی کو میرا جس کے متعلق تجھے کوئی علم نہیں تو (اس بات میں) ان کی اطاعت نہ کر ۲۔میری طرف ہی تمہیں لوٹنا ہے۔پھر میں آگاہ کروں گا تمہیں ان اعمال سے جو تم کیا کرتے تھے ۳۔''

۱۔وصیت سے مراد کسی غیر کو ایسے کام کی تلقین کرنا ہے جس میں نصیحت موجود ہو۔یعنی ہم نے اسے والدین کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کا حکم دیا جو حسین ہو۔گویا کہ وہ اپنی ذات میں بہت زیادہ حسن پائے جانے کے سبب سراپا حسن ہو اور وہ فعل اس کے والدین کے شایان شان ہو۔یعنی ان کے ساتھ حد درجہ نیک سلوک کرے اور ان پر مہربان رہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے صاحب حسن انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔مسلم، ترمذی، بغوی، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ سعد بن مالک ابو اسحاق زہری اصحاب عشرہ مبشرہ میں سے ایک تھے، ان کا شمار سابقون الاولون میں تھا اور اپنی والدہ کے بہت زیادہ فرمانبردار تھے کہ جب آپ مشرف باسلام ہوئے تو ان کی ماں نے کہا (اور وہ حمنہ بنت ابی سفیان بن امیہ بن عبد شمس تھی) (تحقیق اللہ تعالیٰ نے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ ایک روایت میں ہے) کہ یہ کیا ہے جو تو نے نیا دین اپنا لیا ہے۔قسم بخدا! میں ہرگز کھانا نہیں کھاؤں گی اور نہ ہی پانی پیئوں گی یہاں تک کہ میں مر جاؤں گی۔جب تک کہ تو اس نئے دین کا انکار نہ کر دے(2)۔اور ایک روایت میں ہے یہاں تک کہ تو اس دین کی طرف واپس لوٹ آئے جس پر تو پہلے تھا۔ورنہ میں اسی حال میں مر جاؤں گی اور ہمیشہ کے لیے تجھے یہ کہہ کر عار دلائی جاتی رہے گی کہ یہ اپنی ماں کا قاتل ہے۔تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حُسْنًا۔

۲۔اس سے قبل قول مضمر ہے۔یعنی اور ہم نے اسے کہا اگر تیرے ساتھ یہ کوشش کریں کہ تو کسی کو میرا شریک بنائے۔جس کی الوہیت

1۔صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 122 (قدیمی) 2۔جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 150 (وزارت تعلیم)

کے متعلق تجھے کوئی علم نہیں تو اس میں تو ان کی اطاعت نہ کر یہاں الوہیت کی نفی کو اس کے علم کی نفی کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، اس لیے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس شے کے صحیح ہونے کا علم نہ ہو اس کی اتباع جائز نہیں ہوتی۔ اگر چہ اس کے باطل ہونے کا علم بھی نہ ہو چہ جائیکہ ایسی چیز جس کے بطلان کا علم دلائل قطعیہ سے ہو تو پھر اس کی اتباع کیسے جائز ہو سکتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خالق کی معصیت و نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت و فرمانبرداری جائز نہیں۔ اسے احمدؒ اور حاکمؒ نے روایت کیا ہے (1)۔ اور اسے صحیح کہا ہے انہوں نے اسے عمران اور حکم بن عمرو الغفاری سے نقل کیا ہے۔ اور صحیحین، سنن ابی داؤد اور نسائی میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی بھی اطاعت جائز نہیں۔ کیونکہ اطاعت تو نیکی کے کاموں میں ہوتی ہے (2)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ پھر حضرت سعد کی والدہ ایک دن رات ٹھہری رہی نہ اس نے کچھ کھایا نہ پیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ تین دنوں تک ایسے ہی ٹھہری رہی۔ پھر حضرت سعد آئے اور کہا یَا اُمَّاهُ لَوْ كَانَتْ لَكِ مِائَةُ نَفْسٍ فَخَرَجَتْ نَفْسًا نَفْسًا مَا تَرَكْتُ دِيْنِيْ اِنْ شِئْتِ كُلِيْ وَاِنْ شِئْتِ فَلَا تَاْكُلِيْ۔ فَلَمَّا اَيِسَتْ مِنْهُ اَكَلَتْ وَشَرِبَتْ (4)۔ (اے میری ماں! اگر تیرے لیے سو جانیں ہوتیں پھر وہ ایک ایک کر کے نکل جائیں تو بھی میں اپنا دین نہیں چھوڑوں گا اب اگر چاہے تو کھالے اور اگر چاہے تو نہ کھا۔ پس جب وہ ان سے مایوس ہوگئی تو اس نے کھانا پینا شروع کر دیا۔) اور وہ آیت بھی ام سعد کے قصہ میں ہی نازل ہوئی جو سورۂ لقمان میں ہے اور وہ بھی جو سورۃ الاحقاف میں ہے۔

ع پھر میں تمہیں ان اعمال کی جزاء دے کر تمہیں آگاہ کروں گا جو تم کیا کرتے تھے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ۝

"اور جو لوگ ایمان لائے۔ اور انہوں نے نیک اعمال بھی کیے۔ تو ہم ضرور شامل کر لیں گے انہیں نیکوں (کے زمرہ) میں [1]"

[1] صالحین سے مراد انبیاء شہداء اور اولیاء ہیں یعنی ہم اعمال صالحہ کرنے والے اہل ایمان کو ان کے گروہ میں شامل کر لیں گے اور ان ہی کے ساتھ انہیں اٹھائیں گے۔ یا انہی کے ساتھ انہیں جنت میں جگہ دیں گے۔ صلاح میں کمال ہی مؤمنین کے درجات کی انتہا ہے اور اللہ تعالیٰ کے انبیاء و مرسلین کی بھی منتہائے تمنا یہی ہے۔ کیونکہ اصلاح کمال سے مراد اعتقاد، اعمال، اخلاق اور دیگر مشاغل میں کسی بھی اعتبار سے فساد اور خرابی کا نہ ہونا ہے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ پر ہے۔ اور ان کے مابین جملے معترضے ہیں۔ ابن جریر اور ابن منذر نے عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اہل مکہ میں سے ایک قوم اسلام لائی۔ اور وہ لوگ اسلام کو مخفی رکھ رہے تھے کہ مشرکین انہیں غزوۂ بدر میں اپنے ساتھ لے گئے۔ نتیجۃً ان میں سے کچھ لوگ مقتول ہوئے۔ تو مسلمانوں نے ان کے بارے یہ کہا کہ یہ تو مسلمان تھے۔ انہیں جنگ میں مجبوراً لایا گیا۔ پس آپ ﷺ نے ان کے لیے دعا مغفرت کی۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ الایہ (4)۔ یہ آیت سورۃ النساء میں ہے۔ تو اہل مدینہ نے یہ آیت لکھ کر ان کی طرف بھیج دی جوان میں سے مکہ مکرمہ میں باقی بچے تھے۔ اور لکھا کہ اب ان کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ چنانچہ وہ مدینہ منورہ کے ارادہ سے نکل پڑے۔ تو مشرکین انہیں پیچھے سے جا ملے اور انہیں واپس لوٹا کر لے گئے۔ تو پھر آیت وَمِنَ النَّاسِ نازل ہوئی۔

1۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 94 (صادر)　　2۔ مستدرک حاکم، جلد 3 صفحہ 133 (العلمیۃ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 156 (التجاریۃ)　　4۔ تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 86 (الامیریہ)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾

''اور بعض لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اللہ پر۔ پھر جب ستایا جائے اسے راہ خدا میں تو بنا لیتا ہے لوگوں کی آزمائش کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے برابر[1] اور اگر آ جائے نصرت آپ کے رب کی طرف سے تو وہ کہنے لگتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہر اس چیز کو جو لوگوں کے سینوں میں (پنہاں) ہے[2]۔''

[1] اس کا عطف سابقہ کلام پر ہے۔ پہلے مؤمنین کا ذکر فرمایا اور پھر منافقین کا ذکر کیا۔ یعنی جب کفار انہیں اسلام لانے کی بناء پر اذیتیں دیتے ہیں تو وہ کفار کی طرف سے پہنچنے والی اذیت کو آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کے برابر بنا لیتے ہیں۔ یعنی وہ لوگوں کی اذیت سے گھبرا جاتے ہیں اور صبر نہیں کر سکتے۔ پس وہ لوگوں کی اطاعت کرنے لگتے ہیں اور اسلام کو اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں جیسے مسلمان آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کے ڈر سے کفر اور معاصی کو ترک کر دیتے ہیں۔ ترکیب کلام میں اس جملہ شرطیہ کا عطف مَنْ کے صلہ پر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ مدینہ طیبہ کے مسلمانوں نے ان کی طرف یہ آیت کریمہ لکھ کر بھیج دی تو پھر انہوں نے آپس میں گروہ بندی کی، اور کہا اب ہم نکلیں گے اگر کسی نے ہمارا تعاقب کیا تو ہم اس سے قتال کریں گے۔ تو پھر یہ آیت نازل ہوئی ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا الآیۃ۔ پس انہوں نے یہ آیت لکھ کر بھیج دی۔ تو پھر وہ مکہ مکرمہ سے نکل پڑے۔ مشرکین نے ان کا تعاقب کیا۔ پس جنہوں نے نجات پائی سو نجات پائی اور جو قتل ہوئے سو قتل ہو گئے۔ اور قتادہ سے یہ مروی ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہیں مشرکین واپس مکہ کی طرف لوٹا کر لے گئے تھے۔ (1)

[2] اور اگر مومنین کے لیے آپ کے رب کی طرف سے فتح اور غنیمت کی صورت میں مدد آ جائے۔ تو وہ کہنے لگتے ہیں ہم تو دین میں تمہارے ساتھ تھے۔ یہ لفظوں میں محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور معنوی طور پر شرط کی جزاء ہے۔ اور یہ جملہ شرطیہ سابقہ جملہ شرطیہ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ پر معطوف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے۔ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ یہاں ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور واؤ حالیہ ہے۔ اور انکار حال کی طرف راجع ہے۔ اور معنی یہ ہے حال ایسا نہیں کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے سینوں میں پوشیدہ چیزوں کو نہیں جانتا بلکہ حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو جانتا ہے جو لوگوں کے سینوں میں پنہاں ہے، چاہے وہ اخلاص ہو یا نفاق۔ اور وہ منافقین کو ان کے نفاق کے مطابق سزا دے گا۔ یا پھر یہ واؤ سابقہ کلام کے مضمون پر عطف کے لیے ہے یعنی وہ نفاق کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں ہے۔ (نافقوا وَلَا یخفٰی ذالک علی اللہ)

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾

''اور ضرور دیکھ لے گا اللہ تعالیٰ[1] انہیں جو ایمان لائے اور ضرور دیکھ لے گا منافقوں کو[2]۔''

[1] محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور یہ جملہ معترضہ مؤمنین کے لیے وعدہ اور منافقین کے لیے وعید ہے یا پھر یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے علم کی نفی

1۔ تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 86 (الامیریہ)

کے انکار کے مضمون پر معطوف ہے اور اس کے لیے تاکید ہے۔

۲۔ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان لانے میں مخلص ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کے مطابق جزاء عطا فرمائے گا جو وہ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ شعبی نے کہا ہے کہ سورت کی ابتدا سے لے کر یہاں تک یہ وہ دس آیات ہیں جو مدنی ہیں اور ان کے بعد کی تمام آیات مکی ہیں۔(1)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اور کہا کافروں نے ایمان والوں سے تم چلو ہماری راہ پر ۱؎ اور ہم اٹھالیں گے تمہارے گناہوں (کے بوجھ) کو اور وہ نہیں اٹھا سکتے ان کے گناہوں سے کچھ بھی وہ بالکل جھوٹ بول رہے ہیں ۲؎''

۱؎ یعنی کفار مکہ نے کہا ہے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے(2)۔ جبکہ کلبی اور مقاتل کا قول ہے کہ ابوسفیان نے یہ قریش میں سے ایمان لانے والوں کو کہا تھا کہ ہمارے دین اور اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کی پیروی کرو(3)۔ اس کا عطف سابقہ منافقین کے ذکر پر ہے۔

۲؎ یعنی اگر یہ راہ غلط ہوئی اور دوبارہ اٹھا کر مؤاخذہ کیا گیا تو اس صورت میں وہ بذات خود ان کے گناہوں کا بوجھ اٹھالیں گے اور ان سے ان کا بوجھ ہلکا کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ تو انہوں نے ان کا بوجھ اٹھانے کو اپنے دین کی پیروی کے ساتھ معلق کر دیا تا کہ ان پر آباؤ اجداد کے دین کی پیروی آسان ہو جائے۔ اور بوجھ ہلکا کرنے کا وعدہ اس لیے کیا تا کہ ان میں سابقہ دین کی طرف پھرنے کی جرأت ہو جائے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ وَلْنَحْمِلْ لفظ کے اعتبار سے صیغہ امر ہے۔ لیکن معنوی طور پر یہ شرط محذوف کی جزاء ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اِنِ اتَّبَعْتُمْ سَبِيْلَنَا حَمَلْنَا خَطَايَاكُمْ۔ یعنی اگر تم ہمارے راستے پر چلو گے تو ہم تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھالیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پاک میں ہے فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ، یعنی دریا اسے ساحل پر پھینک دے گا۔ تو چونکہ ان کے کلام میں کفر اور معاصی پر تشجیع دلائی گئی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا قول ان کے منہ پر دے مارا اور اپنے اس ارشاد کے ساتھ ان کی تکذیب کر دی وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ یہ جملہ قَالَ کے فاعل سے حال ہے۔ بے شک وہ ان کے گناہوں کا بوجھ اٹھانے کی خبر دینے میں صریح جھوٹ بول رہے ہیں۔ آیت طیبہ میں پہلا مِنْ بیانیہ ہے اور دوسرا زائدہ ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ وہ ان کے گناہوں میں سے کوئی شے بھی نہیں اٹھا سکتے۔

وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۙ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اور وہ ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ ۱؎ اور دوسرے کئی بوجھ اپنے (گناہوں کے) بوجھوں کے ساتھ ۲؎ اور ان سے باز پرس ہوگی قیامت کے دن ان (جھوٹوں) کے متعلق جو وہ گھڑا کرتے تھے ۳؎''

۱؎ اور وہ اپنے ان اعمال کے بوجھ ضرور اٹھائیں گے جو انہوں نے خود کیے۔ یہ قسم مقدر کا جواب ہے۔ اور یہاں صیغہ امر قسم کی حکایت کیلئے ہے انشاء کیلئے نہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ خبر کے معنی میں ہے۔ اور وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ پر معطوف ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 157 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 157 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 157 (التجاریہ)

۲؎ کیونکہ وہ انہیں گمراہ کرنے کے باعث اس بوجھ کا سبب بنے ہیں۔لہٰذا ایسے گناہوں کا بوجھ بھی انہی پر ہوگا مگر اس کے باوجود ان کی پیروی کرنے والوں کا بوجھ کم نہیں ہوگا۔

۳؎ اس سوال کا مقصود انہیں مزید خوفزدہ کرنا اور رلانا ہوگا۔یعنی وہ جھوٹی اور گھڑی ہوئی باتیں جن کے سبب انہوں نے لوگوں کو گمراہ کیا، ان کے بارے قیامت کے دن ان سے پوچھا جائے گا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اور بے شک ہم نے بھیجا نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف تو وہ ٹھہرے رہے ان میں پچاس کم ہزار سال۔آخر کار آلیا انہیں طوفان نے ۱؎ اس حال میں کہ وہ ظالم تھے ۲؎''

۱؎ اس کا عطف وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ پر ہے۔اور اس میں غیب سے متکلم کی طرف التفات کیا گیا ہے۔''فَلَبِثَ'' اس کا عطف اَرْسَلْنَا پر ہے۔جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ رسالت کی ذمہ داری سونپے جانے کے بعد ان میں پچاس کم ہزار سال ٹھہرے رہے۔آخر کار انہیں پانی کے طوفان نے آلیا۔جب بھی کوئی چیز کثرت سے گردش کرے، چاہے پانی یا ہوا یا کوئی اور چیز، اسے طوفان کہا جاتا ہے تو یہاں مراد پانی کا طوفان ہے یعنی وہ اس میں غرق ہو گئے۔

۲؎ اور وہ کفر کے سبب ظلم کرنے والے تھے۔وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ترکیب کلام میں اَخَذَهُمْ کے مفعول سے حال ہے۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا کی گئی اور پھر آپ ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو تبلیغ کرتے رہے اور طوفان کے بعد بھی مزید ساٹھ برس تک آپ زندہ رہے۔یہاں تک کہ لوگوں کی تعداد کثیر ہوگئی اور ہر طرف پھیل گئے۔آپ کی عمر شریف ایک ہزار پچاس برس تھی (1)۔اسے ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ، حاکم اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔اور علامہ بغویؒ نے بھی ذکر کیا ہے۔اور حضرت وہب سے مروی ہے کہ آپ علیہ السلام ایک ہزار چار سو برس تک زندہ رہے (2)۔پھر آپ کو ملک الموت علیہ السلام نے کہا اے تمام انبیاء علیہم السلام کی نسبت زیادہ عمر پانے والے! آپ نے دنیا کو کیسے پایا؟ تو آپ نے جواباً فرمایا ایسے ہی جیسا کہ ایک دار (حویلی) ہو اور اس کے دو دروازے ہوں۔پس میں ایک سے داخل ہوا اور دوسرے سے نکل گیا۔آیت کریمہ میں تِسْعُ مِائَةٍ وَّخَمْسِيْنَ عَامًا (ساڑھے نو سو سال) نہیں فرمایا۔ایک تو اس لیے کہ لفظ الف میں اختصار ہے۔اور دوسرا اس لیے کہ یہاں مقصود اس طویل عرصہ تک صبر کرنے کا بیان ہے جو آپ اپنی امت کی پرفریب اور اذیت ناک تدبیروں کے مقابلہ میں کرتے رہے۔اس لیے لفظ الف ذکر فرمایا کیونکہ یہ انتہائی عظیم الشان اور ذی وقار لفظ ہے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾

''پس ہم نے نجات دے دی نوح علیہ السلام کو اور کشتی والوں کو اور ہم نے بنا دیا اس کشتی کو ایک نشانی سارے جہان والوں کے لیے ۱؎''

۱؎ تو ہم نے نوح علیہ السلام کو نجات دے دی۔اور ان لوگوں کو جو آپ کی اولاد اور متبعین میں سے آپ کے ساتھ کشتی پر سوار ہو گئے۔

1۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 157 (التجاریۃ) 2۔تفسیر ابی السعود، جلد 5 صفحہ 146 (العلمیۃ)

ان کی تعداداسی تھی۔ بعض نے کہا ہے وہ اٹھتر افراد تھے۔اور ایک قول کے مطابق ان کی تعداد صرف دس تھی۔ ان میں سے نصف مرد تھے اور نصف عورتیں تھیں۔ یہ مفصل واقعہ سورۂ ہود اور سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ اور ہم نے کشتی یا اس واقعہ کو بنادیا سارے جہان والوں کے لیے ایک نشانی۔ جس سے وہ نصیحت حاصل کر سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر استدلال کر سکتے ہیں۔

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾

''اور ابراہیم علیہ السلام کو یاد کرو جب آپ نے فرمایا اپنی قوم کو کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی [1] اور اس سے ڈرتے رہا کرو۔ یہی بہتر ہے تمہارے لیے [2] اگر تم (حقیقت کو) جانتے ہو [3]''

[1] اس کا عطف نُوحًا پر ہے یعنی اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا۔ یا پھر اس سے پہلے اُذْكُرْ فعل محذوف ہے اور اسی کے سبب یہ منصوب ہے۔ اور اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ اَرْسَلْنَا فعل کی ظرف ہے۔ یعنی ہم نے انہیں اس وقت رسالت عطا فرمائی جبکہ ان کی عقل کامل ہو چکی تھی۔ اور غور وفکر کی صلاحیت اس طرح مکمل ہو چکی تھی کہ انہوں نے حق کی معرفت حاصل کر لی اور لوگوں کو بھی اس پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا۔ اور اگر اُذْكُرْ فعل مقدر مانا جائے تو پھر یہ اس سے بدل اشتمال ہے۔

[2] یعنی تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کے عذاب سے بچو۔ یہ تمہارے لیے اس سے بہتر ہے جس نظریہ پر تم اب ہو۔ یہ عبادت اور تقویٰ اختیار کرنے کے حکم کی علت ہے۔

[3] اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یہ شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ اگر تم خیر وشر کو جانتے ہو اور ان کے مابین تمیز کر سکتے ہو۔ یا اگر تم نظر علم کے ساتھ بغیر کسی تعصب اور فساد کے غور وفکر کر سکتے ہو یا اگر تم صاحب علم ہو اور امتیاز کی صلاحیت رکھتے ہو تو پھر تم پر یہ امر مخفی نہیں رہے گا کہ بے شک اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کا ڈر تمہارے لیے یقیناً اس نظریہ سے بہتر ہے جسے تم اب اپنائے ہوئے ہو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَ اعْبُدُوْهُ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

''تم تو پوجا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کی اور گھڑا کرتے ہو نرا جھوٹ [1] بے شک جن کو تم پوجتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر وہ مالک نہیں تمہارے رزق کے [2] پس طلب کیا کرو اللہ تعالیٰ سے رزق کو اور اس کی عبادت کیا کرو۔ اور اس کا شکر ادا کیا کرو۔ اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے [3]''

[1] اَوْثَان (بت) یہ پتھر ہیں نہ نقصان دے سکتے ہیں اور نہ ہی نفع پہنچا سکتے ہیں۔ اور ''اِفْكًا'' مصدر (مفعول مطلق) ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی ای تكذبون كذبا۔ تم تو نرا جھوٹ بولتے ہو۔ یاتقولون قولاً ذا افک۔ یعنی تم ان بتوں کو الٰہ کہنے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے سفارشی ہونے کا دعویٰ کر کے بالکل صریح جھوٹ بولتے ہو۔ یا پھر یہ مفعول لہٗ ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور یہ اپنے فعل سابق کی علت بیان کر رہا ہے، یعنی تم انہیں محض جھوٹ کی وجہ سے تراشتے ہو۔ یا پھر یہ مفعول بہٖ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور معنی یہ

ہے کہ تم محض جھوٹی شے گھڑتے ہو۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور ان کی تشنیع اور بری حالت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ اسی طرح اس کا مابعد جملہ بھی ہے۔ یا پھر یہ ان کی اس شرارت (قبیح حرکت) پر استدلال ہے جسے وہ اپنائے ہوئے تھے کہ وہ محض جھوٹ اور باطل ہے۔

؎ یہ اس اعتبار سے ان کی شرارت پر دوسری دلیل ہے کہ وہ اپنے قبضے میں کوئی نفع اور رزق نہیں پاتے۔ رزق مصدر ہونے کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ یعنی وہ تمہیں رزق دینے کی طاقت نہیں رکھتے اور یہ احتمال بھی ہے کہ مصدر بمعنی مفعول ہو اور اس سے مراد وہ شے ہو جو دی جاتی ہے۔ اس صورت میں رزقاً کی تنوین تعمیم اور تحقیر کے لیے ہوگی۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ رزق میں سے کوئی حقیر اور ادنیٰ شے بھی دینے کے مالک نہیں ہیں۔

؎ پس تم تمام کا تمام رزق اللہ تعالیٰ سے طلب کرو کیونکہ اس کا مالک وہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ اور اس کی عبادت کیا کرو اور اس کا شکر ادا کیا کرو۔ یعنی اپنے مطالب و مقاصد کے حصول کے لیے انہیں وسیلہ بناؤ اور اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں تمہیں عطا فرمائی ہیں ان پر اس کا شکر ادا کرو اور پھر اسی عبادت اور شکر کے سبب اس کی ملاقات کے لیے تیار رہو کیونکہ اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ترکیب کلام میں اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ اُشْكُرُوْا کے فاعل سے حال مقدرہ ہے۔

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝

''اگر تم جھٹلاتے ہو تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) جھٹلایا (اپنے نبیوں کو) ان امتوں نے بھی جو تم سے پہلے تھیں۔ اور رسول پر فرض نہیں بجز اس کے کہ وہ (اللہ کا حکم) صاف طور پر پہنچا دے ؎''

؎ اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ مجھ سے پہلے رسولوں کو بھی تم سے پہلی امتوں نے جھٹلایا ہے۔ لیکن ان کے جھٹلانے نے ان رسولوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچایا، یعنی اس جھٹلانے کے سبب انہیں عذاب دیا گیا۔ پس اسی طرح تمہیں بھی جھٹلانے کے سبب عذاب ہوگا۔ اور رسول پر فرض نہیں بجز اس کے کہ وہ اللہ کا حکم اتنا صاف طور پر پہنچا دے جو شکوک و شبہات کو زائل کر دے۔ یعنی جو بھی رسول کو جھٹلائے اس کی تکذیب اسے (رسول کو) کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ مخلوق کو ہدایت دینا اس پر فرض نہیں کیونکہ یہ تو اس کے اختیار میں ہی نہیں بلکہ اس کے ذمہ تو پیغام پہنچانا ہے۔ یہ آیت اور اس کے بعد فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ تک آیات ممکن ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام سے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بطور جملہ معترضہ مذکور ہوں اور نبی مکرم ﷺ کی شان اور قریش کی حالت، ان کے مذہب کے غلط ہونے اور ان کی بری عادات پر وعید کا ذکر اس قصہ کے درمیان کر دیا گیا ہو تا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے لیے باعث تسلی ہو کہ آپ کے باپ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے بھی ان کی قوم نے آپ ہی کی مثل مخالفت کی اور اسی طرح انہیں جھٹلایا۔

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝

''کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح آغاز فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پیدا کرنے کا ؎ پھر وہ (کس طرح) اس کا اعادہ کرتا ہے ؎ بلاشبہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے ؎''

؎ اَوَلَمْ يَرَوْا کو ابوبکر، حمزہ کسائی نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یاء کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اس میں ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے۔ اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے الم ينظروا ولم يروا (کیا انہوں نے غور

وفکر نہیں کی اور نہیں دیکھا) یا پھر واؤ حالیہ ہے اور انکار تکذیب کے وقت عدم رؤیت کی حالت کے انکار کے لیے ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تحقیق تم سے پہلی امتوں نے بھی جھٹلایا حالانکہ انہوں نے اپنی تخلیق کے آغاز کی کیفیت کو دیکھا تھا۔ لیکن انہوں نے اس سے عبرت حاصل نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نطفہ سے پھر جمے ہوئے خون سے پھر گوشت کے لوتھڑے سے بنایا اور پھر بچہ بنا کر انہیں باہر نکالا۔ پھر وہ بچہ مختلف اور متفرق حالات سے گزرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے موت آ جاتی ہے۔

۲۔ پھر وہ اسے موت کے بعد دوبارہ حیات کی طرف لوٹا دے گا۔ یُعِیدُ کا عطف اَوَلَمْ یَرَوْا پر ہے نہ کہ یُبْدِئُ پر۔ کیونکہ رؤیت اس پر واقع نہیں ہوئی۔ اور اعادہ کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نباتات اور پھلوں وغیرہ کو ہر سال اسی طرح پیدا کرتا ہے جیسے اس نے انہیں گذشتہ سال پیدا کیا تھا۔ اس صورت میں اس کا عطف یُبْدِئُ پر ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف یُبْدِئُ پر ہو اور اس پر رؤیت کا اطلاق مجازاً کیا گیا ہو جو اعادہ کے امکان پر دلالت کرتی ہے۔

۳۔ بے شک اعادہ یا دو امروں میں سے جو ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے۔ کیونکہ وہ اپنے فعل میں کسی شے کا محتاج نہیں اور نہ وہ ایسا کرنے میں تھکتا ہے۔

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۚ۝۲۰

''فرمایئے۔ سیر و سیاحت کرو زمین میں اور غور سے دیکھو۔ کس طرح اس نے خلق کی ابتدا فرمائی ۱۔ پھر اللہ تعالیٰ (اسی طرح) پیدا فرمائے گا دوسری بار بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے ۲۔''

۱۔ یہ یا تو اس خطاب کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا اس صورت میں قول مقدر ہے، یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو کہا فرمایئے زمین میں سیر و سیاحت کرو اور غور سے دیکھو کس طرح اس نے مختلف اجناس اور احوال پر خلق کی ابتدا فرمائی یا پھر یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔

۲۔ قیاس تو یہ تھا کہ کلام اس طرح ہوتا۔ فَانْظُرُوْا كَیْفَ بَدَاَ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ (غور سے دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے خلق کی ابتدا فرمائی ہے پھر وہ اسی طرح دوسری بار پیدا فرمائے گا) (یعنی پہلے فعل کے ساتھ فاعل ظاہر ہوتا اور دوسرے فعل میں ضمیر اس کی طرف راجع ہوتی)۔ لیکن اس میں تبدیلی اس لیے کی گئی ہے کیونکہ اس سے مقصود اعادہ کے جواز کو ثابت کرنا ہے۔ پس جب ان کے لیے یہ ثابت کر دیا کہ خلق کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے تو یہی اس کی دلیل ہے کہ اعادہ بھی ابتداء کی مثل ہے۔ لہٰذا جو ذات تخلیق کی ابتداء پر قادر ہے وہ اس کے اعادہ سے قطعاً عاجز نہیں ہو سکتی۔ گویا کہ فرمایا ہے جس ذات نے پہلی بار پیدا فرمایا ہے وہی وہ ذات ہے جو دوسری بار بھی پیدا فرمائے گی۔ پس اسی معنی پر تنبیہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنا اسم گرامی ظاہر ذکر فرمایا اور اسے بطور مبتدا ابتدا میں ذکر فرمایا۔ بعض محققین نے یہ کہا ہے۔ کہ ثُمَّ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ سابقہ کلام سے حاصل ہونے والے محذوف مفہوم پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام کچھ اس طرح ہے۔ فرمایئے زمین میں سیر و سیاحت کرو اور غور سے دیکھو کس طرح اس نے خلق کی ابتدا فرمائی ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے پہلی بار پیدا فرمایا پھر اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے پہلی بار پیدا فرمایا ہے وہی دوسری بار پیدا فرمائے گا۔ ابن کثیر

... اسی طرح پڑھا ہے اور باقیوں نے شین کو

ساکن اور بغیر الف کے پڑھا ہے۔ اور ہمزہ نے اس میں دو وجہوں کی بناء پر وقف کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ شین کو حرکت دیتے ہیں اور پھر قیاس کے مطابق اسے ساقط کر دیتے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ شین کو فتحہ دیتے ہیں اور خط کی اتباع کرتے ہوئے ہمزہ کو الف سے بدل دیتے ہیں۔ دانی نے کہا ہے کہ اس کی مثل عربوں سے سنا گیا ہے۔ کیونکہ ہر شے پر اس کی قدرت تقاضا کرتی ہے اور تمام تر ممکنات کی طرف اس کی ذات کی نسبت مساوی ہے۔ پس وہ دوسری بار پیدا کرنے پر اسی طرح قدرت رکھتا ہے جس طرح پہلی بار پر قادر ہے۔

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿٢١﴾

''سزا دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے [1] رحم فرماتا ہے۔ جس پر چاہتا ہے [2] اور اسی کی طرف تم پھیرے جاؤ گے''

[1] وہ سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ وہ آخرت میں عذاب دے گا آگ کے ساتھ اور دنیا میں اس کے عذاب دینے کے مختلف انداز ہیں، یعنی رسوا کر دے یا حریص اور لالچی بنا دے یا بد اخلاق بنا دے یا اللہ تعالیٰ سے اعراض کرنے والا بنا دے یا کسی بدعت کا ارتکاب کرا دے۔

[2] اور رحم فرماتا ہے جس پر چاہتا ہے آخرت میں اس کی رحمت یہ ہے کہ وہ جنت میں داخل فرمائے گا اور دنیا میں یہ ہے کہ وہ اپنی تائید عطا فرماتا ہے، قناعت عطا کر دیتا ہے، حسن خلق عطا فرما دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور اتباع سنت کی توفیق عطا فرما دیتا ہے۔

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۫ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٢٢﴾

''اور نہیں ہو تم بے بس کرنے والے (اللہ تعالیٰ کو) زمین میں (بھاگ کر) اور نہ آسمان میں (پناہ لے کر)۔ اور نہیں ہے۔ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار [1]''

[1] اور تم اپنے آپ کو پانے سے اپنے رب کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ یعنی اگر تم قضاء خداوندی سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے زمین میں چھپ جاؤ یا اس کی غاروں میں داخل ہو جاؤ یا آسمان اور ایسے قلعوں میں پناہ گزیں ہو جاؤ جن کی بلندی آسمان کو چھو رہی ہے تو پھر بھی تم قضاء خداوندی سے بچ نکل نہیں سکتے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وَلَا فِي السَّمَآءِ میں تقدیر عبارت یہ ہو وَلَا مَنْ فِي السَّمَآءِ یعنی تم ان ملائکہ کو بھی عاجز نہیں کر سکتے جو آسمانوں میں ہیں۔ اس صورت میں اس کا عطف مَا کے اسم پر ہو گا جیسا کہ حضرت حسانؓ کا قول ہے فَمَنْ يَّهْجُوْ رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنْكُمْ۔ وَيَمْدَحُهٗ وَيَنْصُرُهٗ سَوَآءٌ (1) (تم میں سے جو کوئی رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرے اور جو کوئی آپ کی مدح اور مدد کرے وہ سب آپ کے لیے برابر ہیں)۔ (یعنی کسی کی ہجو آپ کو ضرر نہیں پہنچا سکتی اور کسی کی مدح آپ کو نفع نہیں دے سکتی۔) اللہ تعالیٰ ہی تمہاری حفاظت کرتا ہے ایسی بلاؤں اور مصیبتوں سے جو زمین میں ظاہر ہوتی ہیں یا آسمان سے نازل ہوتی ہیں اور انہیں تم سے دور ہٹاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٣﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 158 (التجاریۃ)

”اور جن لوگوں نے انکار کیا اللہ تعالیٰ کی آیات کا اور اس کی ملاقات کا، وہ لوگ مایوس ہو گئے ہیں میری رحمت سے [1] اور وہی لوگ ہیں جن کے لیے عذاب الیم ہے [2]“

[1] اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل یا اس کی کتب میں نازل کردہ آیات کا انکار کیا۔ اور دوبارہ اٹھائے جانے کے سبب ملاقات کا انکار کیا (یعنی یوم قیامت کا)۔ وہ قیامت کے دن میری رحمت سے مایوس ہوں گے یا پھر رحمت سے مراد جنت ہے اور وہ یوم قیامت کا انکار کرنے کے سبب دنیا میں ہی جنت سے مایوس ہیں۔

[2] یہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام میں سے ہے تو پھر تقدیر کلام یہ ہے قَالَ اللّٰهُ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ۔ یعنی اس میں قال اللّٰه کے الفاظ محذوف ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے۔ اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی کلام ہے تو پھر جملہ معترضہ ہے اور قُلْ سِيْرُوْا پر معطوف ہے۔ قُلْ کے مقولہ پر اس کا عطف نہیں ہے۔ بعد ازاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی طرف رجوع فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

”آپ کی قوم سے کوئی جواب نہ بن آیا بجز اس کے کہ انہوں نے کہا کہ اسے قتل کر ڈالو یا اسے جلا دو [1] سو بچا لیا اسے اللہ تعالیٰ نے آگ سے بے شک اس واقعہ میں نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں [2]“

[1] یہ اَرْسَلْنَا اِبْرٰهِيْمَ پر معطوف ہے۔ قوم نے جواب دیا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ اگرچہ یہ ان میں سے بعض نے بعض کو کہا تھا۔ یا پھر ان میں سے ایک نے یہ قول کیا لیکن چونکہ وہ تمام اس قول پر راضی تھے اس لیے ان تمام کی طرف فعل کی نسبت کی گئی ہے۔

[2] یہ محذوف عبارت پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کہ انہوں نے آپ کو جلا دینے پر اتفاق کر لیا، سو انہوں نے آپ کو آگ میں پھینک دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگ سے بچا لیا۔ اس طرح کہ آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیا۔ بے شک آپ کو اس آگ سے نجات دینے میں نشانیاں ہیں، اور وہ آپ کو آگ کی اذیت سے محفوظ رکھنا، باوجود اس کے عظیم اور شدید ہونے کے تھوڑے سے وقت میں اسے ٹھنڈا کرنا اور آگ کی بجائے اسے گلزار بنا دینا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں کیونکہ وہی اس سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

”اور ابراہیم نے کہا کہ تم نے بنالیا اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کو باہمی محبت (و پیار) کا ذریعہ [1] اس دنیوی زندگی میں [2] پھر قیامت کے دن تم انکار کرو گے ایک دوسرے کا [3] اور پھٹکار بھیجو گے ایک دوسرے پر [4] تمہارا ٹھکانا آتش (جہنم) ہوگا۔ اور نہیں ہوگا تمہارا کوئی مددگار [5]“

لے اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا۔ اس کا عطف "قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ" پر ہے۔ مَوَدَّۃٌ مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی مَوْدُوْدًا۔ یا اس سے پہلے مضاف مقدر ہے۔ یعنی سبب مودۃ (محبت کے سبب)۔ ابن کثیر، ابو عمرو، کسائی اور یعقوب نے اسے مرفوع پڑھا ہے اور اسے مابعد بَيْنِكُمْ کی طرف مضاف کیا ہے۔ اور یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے (یعنی هِيَ مَوْدُوْدَةٌ اَوْ سَبَبُ مَوَدَّةِ بَيْنِكُمْ) یعنی تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور ان بتوں کی عبادت پر اپنے اجماع کے سبب ایک دوسرے سے پیار کا سلوک کرتے ہو۔ اور پھر یہ جملہ یا تو اَوْثَانًا کی صفت ہے یا اِنَّ کی خبر ہے اس بناء پر کہ مَا یا تو مصدر یہ ہے یا موصولہ ہے اس میں ضمیر عائد محذوف ہے اور وہی مفعول اول ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اِنَّمَا اتَّخَذْ تُمُوْهُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا سَبَبٌ لِّلْمَوَدَّةِ مِنْكُمْ۔ اور حفص اور حمزہ نے مَوَدَّةَ کو مفعول لہٗ ہونے کی بناء پر بَيْنِكُمْ کی طرف مضاف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے تا کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرو اور بتوں کی عبادت پر اپنے متفق ہونے کے سبب ایک دوسرے سے ملو۔ اس صورت میں اِتَّخَذْتُمْ کا مفعول اول اوثانًا ہے اور مفعول ثانی محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے۔ اِتَّخَذْتُمْ اَوْثَانًا مَّعْبُوْدِيْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (تم نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کو معبود بنالیا ہے) اور یہ بھی ممکن ہے کہ مفعول ثانی مودۃ ہو۔ اس بناء پر کہ اس سے پہلے مضاف مقدر ہو یا یہ مودودۃ کی تاویل میں ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اِتَّخَذْتُمْ اَوْثَانًا سَبَبَ الْمَوَدَّةِ بَيْنِكُمْ اَوْ مَوْدُوْدَةً (تم نے بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنالیا ہے) اور نافع، ابن عامر اور ابو بکر نے مودۃ کو تنوین کے ساتھ منصوب پڑھا ہے۔ اس صورت میں بَيْنَكُمْ بھی منصوب ہے۔ جیسا کہ ہم نے حفص کی قرآت میں ذکر کیا ہے۔

۲ مودۃ کے متعلق ہے، یعنی تمہارے درمیان محبت صرف دینوی زندگی تک ہی محدود ہے اس کے بعد ختم ہو جائے گی۔ پھر قیامت کے دن تو وہ دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔

۳ یعنی کفار باہم ایک دوسرے کا انکار کریں گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے یا پھر وہ کفار بتوں کا انکار کرتے ہوئے ان پر لعنت کریں گے۔ یہ جملہ قَالَ کے مقولہ پر معطوف ہے۔

۴ اے عبادت کرنے والو! اور اے معبودو! تم تمام کا ٹھکانا آتش جہنم ہوگا۔ اور تمہیں اس سے نجات دلانے کے لیے کوئی مددگار نہیں ہو گا۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۶﴾

"تو ایمان لائے ان پر لوط اور ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رب کی طرف۔ بے شک وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے لے"

لے اس کا عطف قال پر ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام پر لوط علیہ السلام ایمان لے آئے کیونکہ وہ انبیاء کی تکذیب کرنے سے محفوظ و مامون تھے۔ آپ ہی نے سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصدیق کی۔ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی ہاماں کے بیٹے تھے۔

۲ اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا بے شک میں اپنی قوم سے ہجرت کرنے والا ہوں اس جگہ کی طرف جہاں میرے رب نے مجھے حکم فرمایا ہے۔ یا اس جگہ کی طرف جہاں میرے لیے اپنے رب کی عبادت آسان ہوگی۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ بے شک میں اپنی قوم سے

اعراض کرتے ہوئے اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ہجرت کرنے والا ہوں (ا) اصطلاح صوفیہ میں اسی کو وطن میں سفر کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوثی (یہ شہر کوفہ کے نواح میں واقع ہے) سے حران کی طرف ہجرت کی پھر وہاں سے شام تشریف لائے حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ آپ کے ساتھ شریک سفر تھیں۔ آپ ہی وہ پہلے شخص (ب) تھے جنہوں نے سب سے پہلے ہجرت فرمائی۔ آپ نے فلسطین کو اپنا مسکن بنایا اور لوط علیہ السلام سدوم میں ٹھہرے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ ہجرت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر پچھتر برس تھی۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ جَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ وَ اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۲۷﴾

''اور ہم نے عطا فرمایا آپ کو اسحاق (جیسا فرزند) اور یعقوب (جیسا پوتا) اور ہم نے رکھ دی ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب اور ہم نے دیا ان کو ان (کی جاں نثاری) کا اجر اس دنیا میں [1] اور بلاشبہ وہ آخرت میں صالحین کے (زمرہ) میں ہوں گے [2]''

[1] اور ہم نے آپ کو اسماعیل کے بعد عطا فرمایا اسحاق جیسا فرزند، اس کے بعد کہ آپ اپنی کبر سنی اور زوجہ کے عمر رسیدہ اور بانجھ ہونے کے سبب کسی بچے کی ولادت سے مایوس ہو چکے تھے اور پھر مزید یعقوب جیسا پوتا عطا فرمایا اور ہم نے ابراہیم کی اولاد میں رکھ دی نبوت اور کتاب یعنی تورات، انجیل، زبور اور قرآن کریم اور ہم نے انہیں ہماری راہ میں ہجرت کرنے کا اجر دنیا میں عطا فرمایا، یعنی کہ ہم نے انہیں عمر زائد ہونے کے باوجود بچے عطا فرمائے اور پاکیزہ نسل عطا فرمائی۔ سدی نے اسی طرح کہا ہے (1)۔ اور دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ اس اجر سے مراد یہ ہے کہ آپ کی اولاد میں نبوت مسلسل جاری رہی، تمام مذاہب و ادیان کا آپ کی طرف منسوب ہونا اور تا قیام قیامت آپ کی ذات پر درود و سلام کا پڑھا جانا وغیرہ۔ میں کہتا ہوں کہ شاید دنیا میں اجر سے مراد ذکر و فکر اور عبادت الٰہی میں لذت کا حاصل ہونا ہے۔ کیونکہ اہل دنیا جن امور حسنہ اور طیبہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں آپ کو ان میں ان کی نسبت کہیں زیادہ لذت نصیب تھی۔ اسی کی مثل رب کریم کا یہ ارشاد ہے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ۔

[2] اور بے شک وہ آخرت میں کاملین فی الصلاح کے زمرہ میں ہوں گے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا پر ہے۔ عام اسلوب کے بغیر جملہ اسمیہ کا جملہ فعلیہ پر عطف اس پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ آخرت کو استمرار اور دوام حاصل ہے۔ دنیا کو نہیں۔

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۫ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 159 (التجاریہ)۔

(ا) حضرت اسماء بنت ابی بکر سے مروی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہما السلام کے بعد سب سے پہلے ہجرت کی ہے۔

(ب) حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جس نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کی وہ عثمان بن عفان ہیں جیسا کہ لوط علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہجرت کی۔

'' اور (ہم نے) لوط کو رسول بنا کر بھیجا جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا تم ایسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو [1] کہ نہیں پہل کی تم سے اس (بے حیائی) کی طرف کسی قوم نے دنیا بھر میں [2] ''

[1] وَلُوْطًا کا عطف ابراہیم پر ہے۔ ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے اِنَّكُمْ کو دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان میں سے ایک ہمزہ برائے استفہام انکاری زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ اور باقیوں نے خبر ہونے کی بناء پر صرف ایک ہمزہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔ لَتَاْتُوْنَ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور ''الْفَاحِشَةَ'' سے مراد ایسا فعل ہے جو انتہائی قبیح ہو۔

[2] یہ جملہ الفاحشۃ کی صفت ہے جیسا کہ وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ (تحقیق میں لئیم کے پاس سے گزرتا ہوں، وہ مجھے گالی گلوچ دے رہا ہوتا ہے) میں جملہ صفت ہے۔ یا یہ جملہ حال ہے یا پھر یہ جملہ مستانفہ ہے۔

اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾

'' کیا تم بدفعلی کرتے ہو مردوں کے ساتھ اور ڈاکے ڈالتے ہو عام راستوں پر [1] اور اپنی کھلی مجلسوں میں گناہ کرتے ہو [2] تو نہیں تھا کوئی جواب آپ کی قوم کے پاس بجز اس کے کہ انہوں نے کہا اے لوط۔ لے آؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو [3] ''

[1] یہ اس برائی کا بیان ہے۔ اور راستہ کاٹنے کا مفہوم یہ ہے کہ جو مسافر ان کے پاس سے گزرتے تھے وہ ان سے برائی کا ارتکاب کرتے تھے۔ لہٰذا لوگوں نے ان کے پاس سے گزرنا چھوڑ دیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ وہ عورتوں پر مردوں کو ترجیح دیتے ہوئے عورتوں کا راستہ کاٹ دیتے تھے۔

[2] النادی سے مراد ایسی مجلس ہے جس میں اہل مجلس موجود ہوں۔ ام ھانیؓ بنت ابی طالب کے غلام ابو صالح سے علامہ بغویؒ نے روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے پوچھا وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ میں نے عرض کی کون سا وہ گناہ ہے جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ راستے سے گزرنے والوں پر غلیل مارتے اور ان سے تمسخر کرتے تھے۔ اسے احمد اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے (1)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ روایت بھی ہے کہ وہ اپنی مجالس میں بیٹھا کرتے تھے ہر آدمی اپنے پاس ایک پیالے میں کچھ کنکریاں لیے ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی مسافر ان کے قریب سے گزرتا تھا تو آپس میں کہتے اسے پکڑ لو پھر وہ اس پر کنکریاں پھینکتے تو جس کی کنکری اسے لگ جاتی وہی اس کا زیادہ حق دار ٹھہرتا۔ کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے وہ اس سے سامان چھین لیتا، پھر اس کے ساتھ بدفعلی کا ارتکاب کرتا اور پھر اسے تین درہم دے کر فارغ کر دیتا۔ ان کے لیے ان کے سردار کا فیصلہ اسی طرح تھا۔ قاسم بن محمد نے کہا ہے کہ وہ اپنی مجالس میں ہوا خارج کرتے تھے۔ مجاہد نے کہا ہے وہ اپنی مجالس میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑ پڑتے تھے۔ عبداللہ بن سلام سے مروی ہے کہ وہ ایک دوسرے پر تھوکتے تھے اور مکحول نے کہا ہے کہ قوم لوط کی بری عادات یہ تھیں کہ وہ مصطگی چباتے، انگلیاں مہندی سے رنگتے، تہبند کھول دیتے، سیٹیاں بجاتے، کنکریاں مارتے اور بدفعلی کا ارتکاب کرتے تھے۔ (2)

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 150 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 159 (التجاریہ)

۳؎ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖ کا عطف قَالَ پر ہے۔ مگر انہوں نے استہزاءً کہا۔ لے آؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم اس میں سچے ہو جس کے سبب تم نے ہمیں نزول عذاب کی دھمکی دی ہے۔ یا تم ان افعال کو قبیح سمجھنے میں سچے ہو یا تم اس دعویٰ نبوت میں سچے ہو جو اس زجر و توبیخ سے سمجھا جا رہا ہے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَی الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ ۝۳۰

''آپ نے عرض کی۔ میرے مالک! مدد فرما میری ان فسادی لوگوں کے مقابلہ میں ا؎''

ا؎ لوط علیہ السلام نے عرض کی میرے مالک! عذاب نازل کرنے میں میری مدد فرما۔ ان فسادی لوگوں کے مقابلہ میں کہ انہوں نے اس بدفعلی کا آغاز کیا ہے اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے اسے ظاہر کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مفسدین کا وصف دیا ہے، ایک تو اس لیے کہ ان کے لیے نزول عذاب کی طلب میں مبالغہ کا اظہار ہو اور دوسرا یہ احساس دلانے کے لیے کہ وہ اس کے مستحق ہیں کہ انہیں فوراً عذاب میں مبتلا کیا جائے۔

وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ ۝۳۱

''اور جب آئے ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر! انہوں نے بتایا کہ ہم ہلاک کرنے والے ہیں اس بستی کے رہنے والوں کو ا؎ بے شک یہاں کے رہنے والے بڑے ظالم تھے ۲؎''

ا؎ اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس آپ کے فرزند اسحاق اور پوتے یعقوب کی خوشخبری لے کر آئے انہوں نے بتایا کہ ہم اس سدوم گاؤں کے باشندوں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ مُهْلِكُوْٓا میں اضافت لفظیہ ہے کیونکہ اس میں معنی استقبال کے ہیں۔

۲؎ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ یہ جملہ انہیں ہلاک کرنے کی علت کو بیان کر رہا ہے کہ وہ لوگ اپنے ظلم یعنی کفر اور گناہوں پر اصرار کرتے کرتے سرکش ہو چکے ہیں (لہٰذا وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں)۔

قَالَ اِنَّ فِیْهَا لُوْطًا ؕ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِیْهَا ٚ لَنُنَجِّیَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ ۝۳۲

''آپ نے کہا اس میں تو لوط بھی رہتا ہے ا؎ فرشتوں نے عرض کی ہم خوب جانتے ہیں جو وہاں رہتے ہیں ہم ضرور بچا لیں گے اسے اور اس کے گھر والوں کو ۲؎ سوائے اس کی عورت کے وہ پیچھے رہ جانے والوں سے ہے ۳؎''

ا؎ ابراہیم علیہ السلام نے کہا اس میں تو لوط بھی رہتا ہے، یعنی آپ نے یہ کہہ کر ان پر یہ اعتراض کیا کہ اس گاؤں میں وہ ہے جس نے ظلم نہیں کیا۔ یا پھر آپ نے اس مانع کا ذکر کیا جو موجب عذاب کے معارض ہے۔ یعنی یہ درست ہے کہ اس گاؤں میں ظالم موجود ہیں اور ان کا ظلم موجب عذاب ہے لیکن ان کے درمیان نبی کا موجود ہونا اس عذاب کے مانع ہے۔

۲؎ تو ان ملائکہ نے کہا ہم آپ کی نسبت انہیں بہتر جانتے ہیں جو وہاں رہتے ہیں، ہم اسے اور اس کے گھر والوں کو ضرور بچا لیں گے۔ حمزہ اور کسائی نے لَنُنَجِّیَنَّهٗ کو باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے باب تفعیل سے مشدد پڑھا ہے۔ فرشتوں کی

طرف سے یہ جواب اس پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول کو تسلیم کیا لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی زیادتی علم کا دعویٰ بھی کیا۔ اور آپ کو جواب اس تخصیص کے ساتھ دیا کہ یہاں اہل قریہ سے مراد لوط علیہ السلام اور آپ کے گھر والوں کے سوا دوسرے افراد ہیں۔ اور ہلاک صرف انہیں ہی کیا جائے گا۔ یا ان کی ہلاکت کا وقت مقرر کر دیا گیا ہے کہ لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کو اس شہر سے نکالنے کے بعد اس کے باشندوں کو ہلاک کیا جائے گا۔ تو یہاں فرشتوں نے اپنے پہلے قول میں یہ وضاحت نہیں کی۔ بلکہ حضرات ابراہیم علیہ السلام کے سوال کے جواب میں لوط علیہ السلام اور آپ کے گھر والوں کی اس حکم سے مستثنیٰ ہونے کی وضاحت کی ہے تو یہ وضاحت خطاب سے مؤخر ہے اور یہ تاخیر جائز ہے۔ البتہ وقت حاجت سے بیان کو مؤخر کرنا جائز نہیں ہوتا۔

۳؎ سوائے اس کی عورت کے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ عذاب میں یا گاؤں میں رہ جائے گی۔ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ استثناء کی علت بیان کرتا ہے۔

وَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالُوْا لَا تَخَفْ وَ لَا تَحْزَنْ ۫ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَ اَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ ﴿۳۳﴾

''جب آئے ہمارے فرشتے لوط (علیہ السلام) کے پاس تو وہ بڑے غمزدہ ہوئے ان کی آمد سے ۱؎ اور دل تنگ ہوئے ۲؎ اور (انہیں پریشان دیکھ کر) فرشتوں نے کہا نہ خوف زدہ ہو اور نہ ہی رنجیدہ خاطر ہوں ہم نجات دینے والے ہیں تجھے اور تیرے کنبہ کو سوائے تمہاری بیوی کے وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے ۳؎''

۱؎ اور جب ہمارے فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو انہیں غم اور پریشانی لاحق ہوگئی۔ ان فرشتوں کے سبب، اس خوف کی بناء پر کہ ان کی قوم ان کے بارے میں برا ارادہ رکھتی ہے۔ اس جملہ میں اَنْ دونوں فعلوں کی تاکید اور ان کے اتصال کے لیے صلہ ہے۔

۲؎ اور لوط علیہ السلام دل تنگ ہوئے ان آنے والے فرشتوں کے سبب ''ذَرْعًا'' ترکیب کلام میں نسبت سے تمیز ہے۔ اور الذرع کا معنی ہے طاقت۔ کہا جاتا ہے فلاں طویل الذراع۔ فلاں لمبے ہاتھوں والا ہے، یعنی بہت زیادہ طاقتور ہے۔ کیونکہ لمبے ہاتھوں والا ان چیزوں تک بھی پہنچ سکتا ہے جہاں تک چھوٹے ہاتھوں والا نہیں پہنچ سکتا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ لوط علیہ السلام کی طاقت ان ملائکہ کی عظمت وشان کے مطابق کم تھی اور وہ اس سے عاجز تھے کہ وہ اپنی قوم سے ان کی حفاظت کے سلسلہ میں کیا تدبیر کریں۔

۳؎ اور جب ملائکہ نے آپ پر غم واندوہ کے آثار دیکھے تو کہا تم اس سے نہ خوفزدہ ہو نہ رنجیدہ خاطر کہ وہ ہم پر قدرت پا کر غالب آ جائیں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ تم اس سے خوفزدہ نہ ہو کہ وہ ہم پر قدرت نہ پا سکیں گے اور اس سے غم زدہ نہ ہو کہ ہم انہیں ہلاک کر دیں گے۔

۴؎ یہ مذکورہ نہی کی علت ہے۔ ابن کثیر، حمزہ کسائی اور ابو بکر نے اسے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ۔ کوفیوں کے نزدیک کاف محل نصب میں ہے اور اس کی تائید یہ عطف کرتا ہے۔ ''وَ اَهْلَكَ'' کیونکہ یہ منصوب ہے۔ اور بصریوں کے نزدیک کاف محل جر میں ہے۔ اور اَهْلَكَ کی نصب کا سبب اس سے پہلے فعل مضمر ہے۔ یعنی وننجی اهلک۔ یا یہ کاف کے محل بعید پر عطف ہونے کے سبب منصوب ہے کیونکہ اضافہ لفظیہ انفصال کے حکم میں ہوتی ہے اور وہ اصل میں تو منصوب ہے۔

اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤى اَهۡلِ هٰذِهِ الۡقَرۡيَةِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۳۴﴾

"بے شک ہم اتارنے والے ہیں۔ اس بستی کے باشندوں پر[1] عذاب آسمان سے اس وجہ سے کہ وہ نافرمانیاں کیا کرتے تھے[2]"

[1] اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ کو ابن عامر نے باب تفعیل بناتے ہوئے مشدد پڑھا ہے اور باقیوں نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

[2] رِجۡزًا سے مراد عذاب ہے۔ اور عذاب کو رجز اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ اسے مضطرب کر دیتا ہے جسے عذاب دیا جائے۔ یہ عربوں کے قول ارتجز سے ماخوذ ہے جبکہ کوئی آدمی بے چین اور بے قرار ہو جائے تو وہ کہتے ہیں ارتجز فلان۔ مقاتل نے کہا ہے کہ رجز سے مراد زمین میں دھنسانے اور اوپر سے پتھر پھینکنے کا عذاب ہے۔(1)

وَلَقَدۡ تَّرَكۡنَا مِنۡهَاۤ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۳۵﴾

"اور بے شک ہم نے باقی رہنے دیئے اس بستی کے کچھ واضح آثار[1] ان لوگوں (کی عبرت) کے لیے جو عقلمند ہیں[2]"

[1] اور بے شک ہم نے لوط علیہ السلام کی بستیوں میں واضح آثار باقی رہنے دیئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آية بيّنة سے مراد ان کی تباہ شدہ گھروں کے نشانات ہیں اور قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر ہیں جو انہیں ہلاک کرنے کے لیے اوپر سے ان پر برسائے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں باقی رکھا۔ یہاں تک کہ اس امت کے پہلے لوگوں نے انہیں دیکھا تھا۔ مجاہد نے کہا ہے کہ آیة بینة سے مراد سطح زمین پر سیاہ رنگ کے پانی کا ظاہر ہونا ہے(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کے واقعہ کا مشہور ہونا ہے۔

[2] ان لوگوں کی عبرت کے لیے جو ان آیات میں صاحب عقل لوگوں کی طرح غور وفکر اور تدبر کرتے ہیں۔

وَاِلٰى مَدۡيَنَ اَخَاهُمۡ شُعَيۡبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَارۡجُوا الۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ﴿۳۶﴾

"اور (ہم نے بھیجا) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو آپ نے کہا اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی[1] اور امید رکھو پیچھے آنے والے دن کی اور ملک میں فتنہ وفساد برپا نہ کرو[2]"

[1] یہ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے وَاَرۡسَلۡنَا اِلٰى مَدۡيَنَ۔ اور اس کا عطف "وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا" پر ہے۔

[2] وَارۡجُوا الۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہاں رَجَا خوف کے معنی میں ہے۔ یعنی خَافُوۡا عَذَابَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ (تم یوم آخرت کے عذاب سے ڈرو)۔ یا معنی یہ ہے تم ایسے افعال کرو جن کے عوض تم آخرت میں ثواب کی امید رکھو۔ پس مسبب کو سبب کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

[3] مُفۡسِدِيۡنَ اپنے عامل کے لیے حال مؤکدہ ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حال منتقلہ ہو۔ اور معنی یہ ہے کہ فساد برپا کرنے کے ارادہ سے زمین میں فساد اور فتنہ برپا نہ کرو۔ لہٰذا اس میں اس معنی سے احتراز ہے، جبکہ وہ اصلاح کے ارادہ سے فساد برپا کریں۔ مثلاً قتل وغارت، گھروں کو گرانا، آبادیوں کو تباہ کرنا اور جنگ کے دوران اہل حرب کے درختوں کو کاٹنا وغیرہ۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جٰثِمِينَ ﴿۳۷﴾

''اور پھر انہوں نے جھٹلا دیا تو آ لیا انہیں زلزلہ (کے جھٹکوں) نے پس صبح ہوئی تو وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل گرے پڑے تھے ۱؎''

۱؎ پھر انہوں نے آپ کے دعویٰ نبوت کو جھٹلایا تو انہیں شدید زلزلے نے آ لیا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد جبرائیل علیہ السلام کی چیخ ہے کیونکہ اس سے ان کے دل کانپنے لگے تھے پس صبح ہوئی تو وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل مردہ حالت میں گرے پڑے تھے۔ دارھم سے مراد ان کے شہر یا ان کے گھر ہیں۔ دار کو جمع اس لیے نہیں کیا گیا کیونکہ اس میں التباس کا کوئی اندیشہ نہیں۔

وَعَادًا وَّثَمُودَا۟ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۖ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ﴿۳۸﴾

''اور (ہم نے برباد کیا) عاد اور ثمود کو ۱؎ اور واضح ہیں تمہارے لیے ان کے مکانات ۲؎ اور آراستہ کر دیا تھا ان کے لیے شیطان نے ان کے برے عملوں کو اور روک لیا انہیں راہ (راست) سے ۳؎ حالانکہ وہ اچھے بھلے سمجھدار تھے ۴؎''

۱؎ یہ دونوں منصوب ہیں ان سے پہلے اُذْکُرْ فعل محذوف ہے۔ یا ان سے پہلے وہ فعل ہے جس پر ماقبل دلالت کرتا ہے مثلاً اَهْلَكْنَا وغیرہ۔ اور یہ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ پر معطوف ہے۔ حمزہ، حفص اور یعقوب نے ثَمُودَا کو قبیلہ کی تاویل پر غیر منصرف ثَمُودَ پڑھا ہے۔

۲؎ وَقَدْ تَّبَيَّنَ یہ اپنے معطوف سمیت جملہ معترضہ ہے۔ اے اہل مکہ! تمہارے لیے ان کے بعض مکانات واضح ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ تمہارے لیے ان کا ہلاک ہونا ان کے مکانوں سے واضح ہوتا ہے جب تم ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کی طرف دیکھتے ہو۔

۳؎ اور شیطان نے ان کے لیے ان کے برے اعمال مثلاً کفر اور دیگر معاصی وغیرہ کو آراستہ کر دیا تھا۔ اور شیطان نے انہیں اس راستے سے روک لیا جو انہیں رسولوں نے بتایا اور وہ جنت تک پہنچانے والا ہے۔

۴؎ مقاتل، قتادہ اور کلبی نے کہا ہے کہ وہ لوگ اپنے دین اور اپنی گمراہی کو پسند کرتے تھے اور یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ اور معنی یہ ہے کہ بے شک وہ اپنے دین کے معاملہ میں اچھے بھلے سمجھدار تھے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ ذی عقل تھے (1)۔ صاحب بصیرت تھے اور وہ نظر و فکر اور دیکھ بھال کی قدرت رکھتے تھے لیکن انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے کام نہیں لیا۔ اور اس کا یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے کہ رسولوں کے خبر دینے کے سبب ان پر یہ واضح تھا کہ ان پر عذاب ضرور آئے گا۔ لیکن وہ اپنے موقف پر مصر رہے حتیٰ کہ نتیجۃً ہلاک کر دیے گئے۔

وَقَارُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۖ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا سٰبِقِينَ ﴿۳۹﴾

''اور (ہم نے ہلاک کر دیا) قارون، فرعون، اور ہامان کو ۱؎ اور بلاشبہ تشریف لائے موسیٰ ان کے پاس روشن دلیلوں کے ساتھ پھر بھی وہ غرور و تکبر کرتے رہے زمین میں اور وہ (ہم سے) آگے بڑھ جانے والے نہ تھے ۲؎''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 160 (التجاریہ)

۱؎ ان تمام کا عطف عَادًا پر ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان میں سے قارون کو نسبی شرف کی بنا پر مقدم ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس سے یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ شریف النسب آدمی کے لیے کفر اور گناہ کا ارتکاب دوسروں کی نسبت زیادہ قبیح ہوتا ہے۔

۲؎ اور بلا شبہ موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس روشن دلیلوں کے ساتھ تشریف لائے پھر بھی وہ زمین میں غرور وتکبر کرتے رہے اور وہ ہم سے آگے بڑھ جانے والے نہ تھے، یعنی وہ ہماری گرفت سے بچ نہ سکے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے عذاب نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہاں سٰبقین فائتین کے معنی میں ہے۔ یہ سَبَقَ طَالِبَه سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ اپنے تلاش کرنے والے سے آگے نکل گیا اور اس کے ہاتھ نہ آیا۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۴۰

''پس ہر (سرکش) کو ہم نے پکڑا اس کے گناہ کے باعث پس ان میں سے بعض پر ہم نے برسائے پتھر اور ان میں بعض کو آلیا شدید کڑک نے اور بعض کو ہم نے غرق کر دیا زمین میں اور بعض کو ہم نے (دریا میں) ڈبو دیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ ان پر ظلم کرے۔ بلکہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے تھے ۱؎''

۱؎ یہ مابعد فعل کے سبب منصوب ہے۔ پس ان میں سے ہر ایک کو ہم نے پکڑا اور اسے اس کے گناہ کے عوض سزا دی۔ پس ان میں سے بعض پر ایسی ہوا چلائی جو پتھر کی کنکریاں اٹھائے ہوئے تھی۔ حصبًا سے مراد چھوٹی چھوٹی کنکریاں ہیں۔ اور وہ قوم لوط تھی۔ اور ان میں سے بعض یعنی ثمود اور مدین کو شدید کڑک نے آلیا۔ اور ان میں سے بعض یعنی قارون کو ہم نے زمین میں غرق کر دیا۔ اور ان میں سے بعض یعنی قوم نوح، فرعون اور اس کی قوم کو ہم نے (پانی میں) ڈبو دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ ان کے ساتھ ایک ظالم جیسا معاملہ کرے اور انہیں بغیر کسی جرم کے سزا دے۔ بلکہ وہ اپنی جانوں کو عذاب کے لیے پیش کرنے کے سبب خود ان پر ظلم ڈھاتے رہے تھے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۖۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۴۱

''ان نادانوں کی مثال جنہوں نے بنا لیے اللہ کو چھوڑ کر اور دوست، مکڑی کی سی ہے۔ اُس نے (جالے کا) گھر بنایا ۱؎ اور (تم سب جانتے ہو) کہ تمام گھروں سے کمزور ترین گھر مکڑی کا ہوا کرتا ہے۔ کاش! وہ بھی اس حقیقت کو جانتے ۲؎''

۱؎ یعنی کفار کی مثال اس میں جو انہوں نے بتوں کو محل اعتماد بنا رکھا ہے اور انہیں پر بھروسہ کر رکھا ہے۔ مکڑی کی سی ہے جس نے جالے کا گھر بنایا، یعنی ان کا یہ اعتقاد و اعتماد اپنی کمزوری اور ضعف میں مکڑی کے جالے کی مثل ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ کیونکہ جالے کی کچھ حقیقت ہے اور اس کا مکڑی کو کچھ نہ کچھ فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن انہیں اتنا بھی نہیں۔ یعنی ان کا مذہب اور دین کی مثل مکڑی کے جالے سی ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ ان کفار کی مثال جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور دوست بنا لیے موحد یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے والے کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے مکڑی کا جالا ایسے آدمی کے مقابلہ میں جس نے اپنا گھر پتھر اور چونے سے انتہائی مضبوط

بنایا ہو۔ لفظ عنکبوت (۱) کا اطلاق واحد، جمع اور مذکر و مونث تمام پر ہوتا ہے۔ اس میں تاء طاغوت کی تاء کی مثل ہے۔ اس کی جمع عناکیب، عکاب اور اعکب آتی ہے۔

۲۔ تمام گھروں سے کمزور ترین گھر مکڑی کا ہوا کرتا ہے۔ اس سے زیادہ کمزور اور گرمی، سردی سے اس کی نسبت کم بچانے والا اور کوئی گھر نہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ حال ہے یا مستانفہ ہے۔ کاش وہ علم کی طرف رجوع کرتے تو یقیناً جان لیتے کہ یہی ان کی مثال ہے اور ان کا دین و مذہب اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۴۲﴾

''یقیناً اللہ جانتا ہے جس چیز کو وہ پوجتے ہیں اس کو چھوڑ کر اور وہی سب پر غالب حکمت والا ہے ۱؎''

۱؎ یہاں قول مضمر ہونے کی بناء پر اِنَّ پڑھا گیا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے قُلْ لِلْكَفَرَةِ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ (آپ کفار کو بتا دیجئے بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے)۔ مَا يَدْعُونَ کو ابو عمرو اور عاصم نے صیغہ غیب ہونے کی بناء پر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسے ان سابقہ امتوں پر محمول کیا ہے جن کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ اور باقیوں نے اسے صیغہ خطاب کی بناء پر تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے کفار مکہ پر محمول کیا ہے۔ اس میں مَا استفہامیہ ہے اور یہ يَدْعُونَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یعنی وہ اللہ کے سوا کس چیز کو پوجتے ہیں؟ پس اللہ تعالیٰ اس سے متعلقہ چیزوں کو بھی جانتا ہے۔ اس صورت میں مِنْ تبیینیہ ہے۔ یا مَا نافیہ ہے اور مِنْ زائدہ ہے اور شیء یدعون کا مفعول ہے (یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اس کے سوا کسی چیز کو نہیں پکارتے)۔ اس صورت میں کلام ان کی جہالت کے اظہار کے لیے ہے۔ اور مثال کی تاکید کے لیے ہے۔ یا مَا مصدریہ ہے اور شیء مصدر ہے۔ یعنی اللہ ان کی غیر اللہ کی عبادت کرنے کو جانتا ہے۔ یا مَا موصولہ ہے اور يَعْلَمُ کا مفعول ہے اور يَعْلَمُ کے مفعول کی طرف لوٹنے والی ضمیر عائد محذوف ہے۔ اور یہ کلام ان کے لیے بطور وعید مذکور ہے۔ اور وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ سابقہ کلام کی علت بیان کر رہا ہے کیونکہ سب سے زیادہ حماقت اور گمراہی یہ ہے کہ ایسی شے جس کی کوئی حقیقت نہیں اس کو اس ذات کے ساتھ شریک ٹھہرانا جس کی شان یہ ہے کہ وہ سب پر غالب بھی ہے اور حکمت والا بھی ہے۔ بے شک جماد اس ذات کے مقابلہ میں معدوم کی طرح ہے جو ہر شے پر قادر ہے، ہر شے کا علم رکھتی ہے اور اپنے فعل میں مستقل بالذات ہے۔ اور بے شک جس کی یہ صفت ہو وہ انہیں سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے۔

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ﴿۴۳﴾

''اور یہ مثالیں ہیں ہم بیان کرتے ہیں انہیں لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے اور نہیں سمجھتے انہیں مگر اہل علم ۱؎''

۱؎ ان مثالوں کے حسن اور فائدہ کو نہیں سمجھتے مگر صرف وہ اہل علم ہی ان کو سمجھتے ہیں جو اشیاء میں ایسی غور و فکر کرتے ہیں جیسے کرنی چاہئے۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ علامہ بغوی نے عطا اور ابو زبیر کے واسطہ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے یہ آیت تلاوت کی وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ۔ اور کہا کہ عالم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے سمجھ بوجھ عطا ہو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے اعمال کرتا رہے اور معصیت سے اجتناب رکھے۔(1)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (التجاریہ)

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اور ابوبکر غار میں داخل ہوئے تو مکڑیوں نے جمع ہو کر دروازے پر جالا بن دیا لہٰذا تم انہیں قتل نہ کرو۔

ثعلبی اور واحدی نے اسی طرح روایت کی ہے۔ اور ابو داؤد بن الحر نے کتاب العقل میں حارث بن اسامہ کی سند سے نقل کیا ہے۔ اور ابن جوزی نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۴﴾

"پیدا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ بے شک اس میں (اس کی قدرت کی) نشانی ہے ایمان والوں کے لیے [1]"

[1] کیونکہ ان کی تخلیق سے مقصود بالذات خیر و بھلائی کا پہنچانا اور اس کی ذات وصفات پر دلالت کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول (اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ) سے اسی طرف اشارہ کیا ہے، بے شک اس تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے وجود، علم، قدرت، ارادہ، وحدت اور کمزوریوں سے پاک ہونے پر دلالت ہے۔ بے شک اس میں ایمان والوں کے لیے اس کی قدرت کی نشانی ہے۔ کیونکہ وہی اس سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

اُتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

"آپ تلاوت کیجیے اس کتاب کی جو وحی کی گئی ہے آپ کی طرف [1] اور نماز صحیح صحیح ادا کیجیے۔ بے شک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور گناہ سے [2] اور واقعی اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو [3]"

[1] آپ تلاوت کیجیے اس قرآن کی جو آپ کی طرف وحی کیا گیا تا کہ اس کی تلاوت سے اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہو، اس کی نصیحتوں اور احکام کی حفاظت ہو، اس کی امثال اور قصص سے سامان عبرت حاصل ہو اور س کے معانی کی وضاحت اور اظہار ہو۔ کیونکہ غور و فکر کرتے ہوئے پڑھنے والے کے لیے بار بار پڑھنے سے ایسے اسرار و رموز کھلتے ہیں جو پہلی مرتبہ پڑھنے سے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ نتیجۃً آدمی اس کے اوامر کی پیروی کرنے لگ جاتا ہے اور اس کی مناہی سے رک جاتا ہے۔

[2] فرض نماز صحیح صحیح ادا کیجیے بے شک نماز ایسے کاموں سے روکتی ہے جن کی قبح اور برائی شرعاً اور عقلاً ظاہر اور واضح ہے۔ اور گناہوں سے روکتی ہے اس طرح کہ نماز اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتی ہے اور نفس میں خشیت اور خوف پیدا کرتی ہے یہ جملہ اقامۃ صلوٰۃ کے حکم کی علت بیان کر رہا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ انصار میں سے ایک نوجوان تھا جو رسول اللہ ﷺ کی معیت میں پانچوں نمازیں ادا کرتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ طرح طرح کے گناہوں کا ارتکاب کرتا تھا۔ تو رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اس کی یہ حالت عرض کی گئی۔ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یقیناً اس کی نماز کسی دن اسے ان گناہوں سے روک دے گی۔ پس ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس نے توبہ کر لی اور اس کی حالت بہت اچھی ہو گئی (1)۔ مسند اسحاق، بزار اور ابی یعلی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضور نبی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی، فلاں آدمی رات کو نماز پڑھتا ہے پھر صبح ہوتی ہے تو چوری کرتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک اس کی نماز اسے برے اعمال سے روک دے گی (2)۔ حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا بے شک نماز میں روکنے اور گناہوں سے جھڑکنے کی طاقت ہے۔ پس جس آدمی کو اس کی نماز نیکی کا حکم نہ

1. تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 [illegible]   2. تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (التجارۃ)

دے اور برائی سے منع نہ کرے سو اس کی نماز اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دوری میں اور اضافہ کرے گی(1)۔ حسن اور قتادہ نے کہا جس کی نماز اسے بے حیائی اور گناہ سے نہ روکے تو اس کی نماز اس کے لیے وبال ہوگی(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں صلوٰۃ سے مراد قرآن ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ ۔ تو اس میں صلوٰۃ سے مراد نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن بے حیائی اور گناہ سے روکتا ہے۔ علامہ بغویؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کہ بے شک ایک آدمی ساری رات قرآن پڑھتا ہے اور جب صبح ہوتی ہے تو چوری کرتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا عنقریب قرأت قرآن اسے اس کام سے روک دے گی۔ اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ کہ بے شک فلاں آدمی دن کے وقت نمازیں پڑھتا ہے اور رات کے وقت چوری کرتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عنقریب اس کی نماز اسے اس کام سے روک دے گی۔(3)

ابن عطاء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس سے بہت بڑا ہے کہ کوئی گناہ باقی رہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ باقی نہیں رہتا بلکہ تمام کو وہ مٹا ڈالتا ہے۔ مترجم) یہاں ذکر اللہ سے مراد بے حیائی اور گناہ سے روکنے والی نماز ہے(4)۔ اور نماز کو ذکر سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ نماز ذکر الٰہی پر مشتمل ہے اور اسی ذکر کے سبب ہی نماز نیکیوں تک پہنچانے والی اور برائیوں سے روکنے والی ہے۔ ذکر کی فضیلت میں کوئی احادیث موجود ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(1) حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں ایسے اعمال پر متنبہ نہ کروں جو تمہارے مالک کے نزدیک زیادہ بہتر اور پاکیزہ تر ہوں، تمہارے درجات میں سب سے بلند درجہ ہوں تمہارے لیے سونا، چاندی خرچ کرنے کی نسبت زیادہ بہتر ہوں اور تمہارے لیے اس سے بہتر ہوں کہ تم دشمن کے خلاف جہاد کرو اور تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنوں کو ماریں۔ تو تمام نے عرض کی کیوں نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ذکر۔ اسے امام مالکؒ، احمدؒ ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ مگر امام مالکؒ نے اسے ابو الدرداءؓ سے موقوف نقل کیا ہے۔(5)

(2) حضرت ابو سعیدؓ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کون سے بندے افضل ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجہ کے اعتبار سے کون بلند ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ کیا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے سے بھی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر مجاہد اپنی تلوار کے ساتھ کفار کو اس حد تک مارے کہ تلوار ٹوٹ جائے اور خون سے رنگین ہو جائے تو اس سے بھی کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے درجہ میں افضل ہیں۔ اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔(6)

(3) حضرت عبد اللہ بن بسر سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی کون سے لوگ بہتر ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا خوشی اور مبارک ہے ایسے آدمی کے لیے جس نے لمبی عمر پائی اور اچھے عمل کئے۔ پھر اس نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کون سے اعمال افضل ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا تو اس حال میں دنیا سے جدا ہو کہ تیری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 162 (التجاریہ)
5۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 173 (وزارت تعلیم) 6۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 173 (وزارت تعلیم)

تر ہو۔ اسے احمد اور ترمذی نے روایت کی ہے۔(1)

(4) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ کے ایک راستے پر چل رہے تھے تو آپ کا گزر ایک پہاڑ کے قریب سے ہوا جسے جمدان کہا جاتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا چلتے چلو یہ جمدان ہے۔ مفردون آگے نکل گئے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مفردون کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔(2)

(5) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک ملائکہ راستوں میں گھومتے پھرتے اہل ذکر کو تلاش کرتے ہیں پھر جب وہ کسی قوم کو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے پاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو بلاتے ہیں آ جاؤ اپنے مطلوب و مقصود کی طرف۔ حضور ﷺ نے پھر فرمایا کہ فرشتے انہیں آسمان تک اپنے پروں کے ساتھ ڈھانپ لیتے ہیں۔ مزید فرمایا پھر ان سے ان کا رب سوال کرتا ہے (حالانکہ وہ خود انہیں خوب جانتا ہے) میرے بندے کیا کہہ رہے تھے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ تیری تسبیح، تکبیر، تحمید اور تمجید (حمد و ثنا) کہہ رہے تھے (یعنی سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ اور اَلْمَجْدُ لِلّٰهِ)۔ پھر رب کریم فرماتا ہے کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ وہ کہتے ہیں نہیں۔ قسم بخدا انہوں نے تجھے نہیں دیکھا۔ پھر رب کریم فرماتا ہے اگر وہ مجھے دیکھ لیتے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ تجھے دیکھ لیتے تو وہ اس سے زیادہ تیری عبادت کرتے۔ اس سے زیادہ تیری ثناء بیان کرتے اور اس سے کہیں زیادہ تیری تسبیح بیان کرتے۔ پھر رب کریم فرماتا ہے وہ کون سی شے کے بارے سوال کر رہے تھے؟ تو وہ کہتے ہیں وہ تجھ سے جنت مانگ رہے تھے۔ رب کریم فرماتا ہے کیا انہوں نے اسے دیکھ رکھا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں قسم بخدا انہوں نے اسے نہیں دیکھا۔ پھر وہ کہتا ہے اگر انہوں نے اسے دیکھ لیا ہوتا؟ تو وہ عرض کرتے ہیں اگر انہوں نے اسے دیکھا ہوتا تو بالیقین ان کی حرص اور طلب اور شدید ہوتی اور اس میں ان کی رغبت بڑھ جاتی۔ پھر رب کریم فرماتا ہے کیا وہ کسی شے سے پناہ بھی طلب کر رہے تھے؟ تو وہ کہتے ہیں ہاں وہ جہنم کی آگ سے پناہ طلب کر رہے تھے۔ رب کریم فرماتا ہے کیا انہوں نے اسے دیکھا ہے وہ کہتے ہیں نہیں۔ قسم بخدا اے پروردگار انہوں نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ پھر رب کریم فرماتا ہے اگر انہوں نے اسے دیکھ لیا ہوتا تو ان کی کیفیت کیا ہوتی؟ وہ کہتے ہیں اگر انہوں نے اسے دیکھا ہوتا تو وہ اس سے بہت زیادہ ڈرتے اور اس سے بہت دور بھاگتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر رب کریم فرماتا ہے کہ میں تمہیں اس پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انہیں بخش دیا۔ پھر ملائکہ میں سے ایک کہتا ہے ان میں فلاں آدمی ہے جو ان میں سے نہیں ہے۔ بے شک وہ تو اپنے کام آیا تھا۔ تو رب کریم فرماتا ہے وہاں بیٹھنے والے وہ خوش نصیب ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا بھی بدبخت نہیں رہتا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ اور مسلمؒ نے بھی اسی طرح روایت کی ہے اور اس میں اس طرح ہے کہ فرشتے کہتے ہیں اے پروردگار! ان میں ایک بندہ خطا داخل ہو گیا ہے۔ کہ وہ ادھر سے گزرا اور ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تو رب کریم فرماتا ہے میں نے اسے بھی بخش دیا۔ وہ ایسی قوم ہے جن کے پاس بیٹھنے والا بھی بدبخت نہیں رہتا۔(3)

(6) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم جنت کے باغوں کے پاس سے گزرو تو تم ان سے حصہ لیا کرو۔ انہوں نے کہا جنت کے باغات کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ذکر کے حلقے۔ رواہ الترمذی(4)

1۔ مسند احمد، جلد 4 صفحہ 188 (صادر)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 341 (قدیمی)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 948 (وزارت تعلیم)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 189 (وزارت تعلیم)

(7) مسلمؒ نے حضرت معاویہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے حلقہ کی طرف تشریف لائے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہیں کس شے نے یہاں بٹھا رکھا ہے؟ انہوں نے عرض کی ہم یہاں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہیں اور اس پر اس کی حمد و ثناء بیان کر رہے ہیں کہ اس نے اسلام کی طرف ہماری راہنمائی فرمائی اور اس دین اسلام کے ساتھ ہم پر احسان فرمایا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ ملائکہ کے سامنے تم پر فخر و مباہات فرما رہا ہے۔(1)

(8) حضرت امام مالکؒ سے روایت ہے مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل لوگوں کے مابین ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے میدان جنگ سے پیچھے بھاگنے والوں میں میدان میں ثابت قدمی سے جنگ لڑنے والا، غافلین میں اللہ کا ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے خشک درخت میں سبز ٹہنی، غافلوں میں ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے تاریک گھر میں چراغ، غافلوں میں ذکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ اسی زندگی میں جنت میں اس کا ٹھکانہ دکھا دیتا ہے۔ اور غافلین میں ذکر کرنے والے کے اتنے گناہوں کو رب کریم معاف فرما دیتا ہے جتنی تعداد تمام انسانوں اور چوپاؤں میں سے بولنے اور نہ بولنے والوں کی ہے(2)۔ اسے رزین نے روایت کیا ہے۔

(9) حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بڑھ کر آدمی کا کوئی ایسا عمل نہیں جو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے والا ہو۔ اسے امام مالکؒ، ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے روائت کیا ہے۔(3)

(10) حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ وہ حضور نبی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے بیٹھتی ہے تو ملائکہ اس کا احاطہ کر لیتے ہیں، رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے، ان پر سکینت و راحت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان مقربین میں کرتا ہے جو اس کے قرب میں موجود ہیں۔ رواہ مسلم۔(4)

(11) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اپنے بندے کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا ہوں جیسے وہ میرے بارے میں گمان رکھتا ہے۔ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے۔ پس اگر وہ میرا ذکر تنہائی میں بذات خود کرتا ہے تو میں بھی تنہائی میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اور اگر وہ جماعت اور محفل میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کا ذکر اس سے بہتر جماعت میں کرتا ہوں۔ متفق علیہ۔(5)

اور بعض نے کہا ہے کہ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا تمہارا ذکر کرنا تمہارے اس کا ذکر کرنے سے افضل و اعلیٰ ہے۔ یہ معنی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ مجاہد، عکرمہ اور سعید بن جبیر نے بھی یہی کہا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ معنی اس مرفوع سند سے بھی مروی ہے عن موسیٰ بن عقبہ عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی ﷺ۔ معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کوتاہی اور غفلت نہ برتو۔ کیونکہ تمہارا اس کا ذکر کرنا اس کے تمہارا ذکر کرنے تک پہنچا دیتا ہے اور اس کا تمہارا ذکر کرنا تمہارے اس کا ذکر کرنے سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ اس پر کوئی شئی مخفی نہیں۔ عطاء نے اسی طرح کہا ہے۔(6)

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 346 (قدیمی)
2۔ مشکوۃ المصابیح صفحہ 199 (قدیمی)
3۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 277 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 345 (قدیمی)
5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 341 (قدیمی)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (التجاریہ)

مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اور (اے مسلمانو!) بحث مباحثہ نہ کیا کرو اہل کتاب سے مگر شائستہ طریقے سے [1] مگر وہ جنہوں نے ظلم کیا ان سے [2] اور تم کہو ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف اور اتارا گیا تمہاری طرف [3] اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے۔ اور ہم اس کے سامنے گردن جھکانے والے ہیں [4]۔''

[1] یعنی تم باہم جھگڑا نہ کرو۔ اس کا عطف اَقِمِ الصَّلٰوۃَ پر ہے، یعنی اے محبوب ﷺ تم اور مومنین اہل کتاب سے بحث مباحثہ نہ کیا کرو۔ مگر ایسے طریقے سے جو بہت شائستہ اور عمدہ ہو۔ یعنی قرآن، اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی آیات کے سبب بلانے اور اس کے دلائل پر متنبہ کرنے کے ساتھ۔ یہ مستثنیٰ مفرغ ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ تم ایسے طریقے سے مباحثہ کرو جو اس طریقے سے بہتر اور اچھا ہو جو کفار اختیار کرتے ہیں۔ یعنی شدت کے مقابلے میں نرمی، غصے اور غضب کے مقابلے میں تحمل و برداشت اور شور و شغب کے مقابلے میں نصیحت اختیار کرو۔ کیونکہ نصیحت مجادلہ اور مباحثہ میں داخل نہیں اس لیے یہ مستثنیٰ منقطع ہوگا۔

[2] مگر ان میں سے جنہوں نے عہد توڑ کر یا جزیہ قبول نہ کر کے ظلم کیا۔ پس تم ان سے اس وقت تک قتال کرو یہاں تک کہ وہ اسلام لے آئیں یا وہ حقیر و ذلیل ہو کر جزیہ ادا کریں۔ سعید بن جبیر نے اسی طرح کہا ہے کہ اہل حرب کی استثنا کی گئی ہے(1) اور استثنا کے بعد باقی رہنے والے اہل ذمہ ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حسین مباحثہ کا حکم جہاد کے حکم سے پہلے کا ہے کیونکہ یہ آیت مکیہ ہے۔ لہٰذا اس صورت میں الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا سے مراد وہ لوگ ہیں جو عداوت اور عناد میں حدود سے بہت تجاوز کرنے والے ہیں اور یہ کہنے والے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ (نعوذ باللہ) بندھے ہوئے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ فقیر اور محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ تو ایسی صورت میں درشتی اور سختی کے ساتھ بھی ان سے مجادلہ کرنا جائز ہے۔ اسی بناء پر قتادہ اور مقاتل نے کہا ہے کہ یہ آیت آیت قتال سے منسوخ ہے۔(2)

[3] یہ حسن مجادلہ کا بیان ہے۔ اور وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب وہ تمہیں ان چیزوں کی خبر دیں گے جو ان کی کتابوں میں ہیں تو تم ان کی تکذیب نہ کرو مگر ان لوگوں کی جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا۔ یعنی وہ لوگ جو ایسی شے کی خبر دیں جس کے بارے یہ قطعی طور پر معلوم ہو کہ یہ اس میں جھوٹ بول رہے ہیں۔ جیسے ان کا یہ قول کہ موسیٰ علیہ السلام کا دین ہمیشہ رہے گا، عیسیٰ علیہ السلام قتل کر دیئے گئے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ یا اسی نوع کے اور اقوال۔ تو ایسی صورت میں ان کی تکذیب واجب ہے اور مباہلہ ضروری ہے۔ اور ان سے کہو وہ ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور جو تمہاری طرف اتارا گیا تھا۔

[4] اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اس کے سامنے گردن جھکانے والے ہیں۔ یعنی صرف اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ یہ اس میں اس امر کی تعریض ہے کہ اہل کتاب نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا رکھا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اہل کتاب تورات عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور اہل اسلام کے لیے عربی میں اس کی تفسیر بیان کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب کرو اور کہو اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ الایہ۔ اسے بخاریؒ نے روایت کیا ہے(3)۔ ابو نملہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ اس اثناء میں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 162 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 162 (التجاریۃ)　3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 1125 (وزارت تعلیم)

یہودیوں میں سے ایک آدمی آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ اور اسی وقت ایک جنازہ بھی ادھر سے گزرا۔ تو اس نے کہا اے محمد! ﷺ کیا یہ میت کلام کرتی ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تو نہیں جانتا۔ تو یہودی نے کہا یہ میت کلام کرتی ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اہل کتاب جو کچھ تمہیں بتائیں تم نہ تو اس کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو۔ اور کہو ہم اللہ کے ساتھ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کے ساتھ ایمان لائے۔ پس اگر وہ باطل ہو تو ان کی تصدیق نہ کرو اور اگر وہ حق ہو تو ان کی تکذیب نہ کرو۔(1)

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

"اور (اے حبیب!) اس طرح ہم نے نازل کی آپ کی طرف کتاب[1] پس وہ جنہیں ہم نے دی تھی کتاب (تورات) وہ ایمان لاتے ہیں قرآن پر۔ اور ان اہل مکہ سے بھی کئی لوگ ایمان لا رہے ہیں قرآن پر[2] اور نہیں انکار کرتے ہماری آیتوں کا مگر کفار[3]"

[1] جیسا کہ ہم نے کتابیں اتاریں ان پر جو آپ سے پہلے تھے۔ اسی طرح ہم نے آپ کی طرف بذریعہ وحی کتاب نازل کی جو کہ سابقہ تمام کتب الہیہ کی تصدیق کرتی ہے اور یہ اس قول کی تحقیق ہے۔

[2] پس وہ جنہیں ہم نے کتاب (تورات) دی تھی وہ اس قرآن کے ساتھ بھی ایمان لاتے ہیں۔ ان سے مراد عبداللہ بن سلام اور ان کے دیگر وہ ساتھی ہیں جو اہل کتاب میں سے ایمان لائے تھے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی تھی وہ اس قرآن کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے پہلے ہی ایمان رکھتے تھے۔ اور ان اہل مکہ میں سے یا اہل عرب میں سے یا حضور نبی رحمت ﷺ کے مقدس زمانہ میں اہل کتاب میں سے بعض وہ ہیں جو قرآن کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔

[3] بِاٰیٰتِنَا میں اضافت عہدی ہے یعنی قرآن کی آیات کا انکار نہیں کرتے مگر کفار۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور تمام کتابوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ یعنی جس نے قرآن کو جھٹلایا تحقیق اس نے تورات اور انجیل کو بھی جھٹلا دیا۔ کیونکہ یہ دونوں قرآن کی تصدیق کرتی ہیں۔ لہٰذا قرآن کی تکذیب ان دونوں کی تکذیب ہوگی۔ پس جس نے قرآن کا انکار کیا اور تورات پر ایمان کا دعویٰ کیا تو اس کا دعویٰ باطل ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ انکار معرفت کے بعد ہوتا ہے(2)۔ اہل کتاب یہ جانتے تھے کہ حضور نبی رحمت محمد مصطفےٰ ﷺ حق ہیں اور قرآن بھی حق ہے تو اس کے بعد انہوں نے انکار کر دیا۔

وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾

"اور نہ آپ پڑھ سکتے تھے اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ ہی اسے لکھ سکتے تھے[1] اپنے دائیں ہاتھ سے[2] (اگر آپ لکھ پڑھ سکتے) تو ضرور شک کرتے اہل باطل[3]"

[1] اس کا عطف كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ پر ہے، یعنی اے محمد ﷺ اور نہ آپ کوئی کتاب آپ کی طرف کتاب نازل کیے جانے سے قبل پڑھ سکتے تھے۔ اور نہ ہی اسے لکھ سکتے تھے۔

[2] یہاں یمین (دایاں) کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، ایک تو اس لیے کہ اس سے لکھنے کی نفی کی زیادہ تصویر کشی ہوتی ہے اور دوسرا اس لیے کہ یہ

1۔ مسند احمد، جلد 4 صفحہ 136 (صادر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 163 (التجاریہ)

معلوم ہو جائے کہ یہاں یہ لفظ مجازی معنی میں مستعمل نہیں بلکہ یہاں حقیقی معنی ہی مقصود ہے۔

۳؎ یعنی اگر آپ سابقہ کتابوں کو پڑھ لکھ سکتے تو کفار یعنی اہل مکہ اس میں ضرور شک کرتے اور یہ کہتے کہ شاید آپ نے یہ متقدمین کی کتابوں سے خوشہ چینی کی ہے۔ قتادہ نے اسی طرح کہا ہے اللہ تعالیٰ نے کفار کو مبطل کہا ہے یا تو ان کے کفر کی وجہ سے یا ان کے شک میں پڑنے کی وجہ سے کیونکہ اتنے کثیر معجزات پائے جانے کے سبب کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ کفر کرتے یا شک میں پڑتے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ یہاں مبطلین سے مراد اہل کتاب ہیں چونکہ آپ کا وصف اُمّی ان کتابوں میں موجود ہے اس لیے انہیں تو آپ کے امی ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ اسی طرح مقاتل نے کہا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مبطل ہونا واقعۃً ہے نہ کہ تقدیراً۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝

''بلکہ وہ روشن آیتیں ہیں ۱؎ جو ان کے سینوں میں محفوظ ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے ۲؎ اور ظالموں کے بغیر ہماری آیتوں کا کوئی انکار نہیں کر سکتا ۳؎''

۱؎ بلکہ وہ قرآن روشن آیتیں ہیں جو اپنی سچائی پر واضح دلالت کرتی ہیں۔ یہ سابقہ کلام سے پیدا ہونے والے مفہوم سے اضراب ہے، یعنی یہ قرآن نہ تو آپ کی اپنی طرف سے گھڑا ہوا ہے اور نہ ہی آپ کے دائیں ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ بلکہ یہ تو روشن اور واضح آیات ہیں۔

۲؎ یعنی ان مومنین کے سینوں میں جو قرآن کے حامل ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ کوئی بھی اس میں تحریف اور تغیر و تبدل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ یہ قرآن کریم کے خصائص میں سے ہے کہ اس کی آیات واضح معجزہ ہیں اور تحریف و اسقاط سے محفوظ ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ اور یہ قرآن مومنین کے سینوں میں محفوظ ہے بخلاف دیگر تمام کتب کے۔ کیونکہ وہ معجزہ نہیں۔ اس لیے وہ ان میں جگہ جگہ الفاظ میں تحریف اور تغیر و تبدل کرتے تھے اور وہ صرف دیکھ کر ہی پڑھی جاتی تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس آیت میں هُوَ سے مراد حضور نبی رحمت ﷺ کی ذات ہے۔ یعنی آپ ﷺ ان روشن اور واضح علامات کے حامل ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جنہیں اہل کتاب میں سے علم دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی کتابوں میں آپ ﷺ کے اوصاف کو پاتے ہیں۔ (1)

۳؎ ظلم کا معنی ہے ''وضع الشيء في غير موضعه'' یعنی کسی شے کو اس کے اصلی محل کے علاوہ اور مقام پر رکھنا۔ ہماری آیات معجزہ ہیں لفظاً اور معنیً اپنی صداقت پر ان کی دلالت واضح اور بین ہے۔ لہٰذا جو بھی معجزہ ہونے کے بعد ان کا انکار کرے گا یقیناً وہ ظالم (بے جا کوشش کرنے والا) اور حق کا منکر ہوگا۔

وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

''اور انہوں نے کہا ۱؎ کیوں نہ اتاری گئیں ان پر نشانیاں ان کے رب کی طرف سے ۲؎ آپ فرمایئے نشانیاں تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں ۳؎''

۱؎ اس کا عطف قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا پر ہے۔ اور ان کے درمیان تمام جملے معترضہ ہیں۔

۲؎ یہاں لَوْلَا هَلَّا کے معنی میں ہے، یعنی انہوں نے کہا کیوں نہ اتاری گئیں ان پر نشانیاں ان کے رب کی طرف سے جیسا کہ ان سے

پہلے انبیاء پر اتاری گئیں۔ مثلاً ناقہ صالح، عصا موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کا دسترخوان۔ نافع، ابن عامر، بصریان اور حفص نے ایاتٌ جمع کی صورت میں پڑھا ہے اور باقیوں نے واحد کی صورت میں ایۃٌ قرأت کی ہے۔

؎ اے محمد! ﷺ آپ فرما دیجئے نشانیاں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہیں اسی کے ارادہ کے ساتھ مربوط ہیں میں ان کا ملک نہیں کہ میں تمہاری تجاویز اور فرمائشوں کے مطابق انہیں لاتا رہوں۔ میری ذمہ داری تو صرف ڈرانا ہے اور جو نشانیاں مجھے عطا کی گئی ہیں ان کا اظہار ہے۔

اَوَلَمۡ یَکۡفِهِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ یُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَرَحۡمَةً وَّ ذِكۡرٰی لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۱﴾

''کیا انہیں کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر اتاری ہے کتاب جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے ؎ بے شک اس میں رحمت اور نصیحت ہے مومنوں کے لیے ؎''

؎ یہ ہمزہ انکار اور توبیخ کے لیے ہے اور واو فعل مقدر کے فاعل سے حال ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کیا وہ آپ سے کسی معجزہ اور نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں اور حال یہ ہے کہ انہیں وہ قوی نشانی کافی نہیں جو انہیں کسی اور نشانی کے مطالبہ سے مستغنی کر دیتی ہے کہ ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے۔ جو معجزہ ہے، علوم شریفہ کی تمام انواع کی جامع ہے اور سابقہ کتب سے مطابقت بھی رکھتی ہے۔ حالانکہ آپ تو امی تھے۔ اس کی تلاوت ان پر ہمیشہ ہوتی ہے درآنحالیکہ وہ اس سے متحد اور متفق ہیں۔

لَمْ يَقْتَرِنْ بِزَمَانٍ وَهِيَ تُخْبِرُنَا　　عَنِ الْمَعَادِ وَعَنْ عَادٍ وَّعَنْ اِرَمِ

دَامَتْ لَدَيْنَا فَفَاقَتْ كُلَّ مُعْجِزَةٍ　　مِّنَ النَّبِيِّيْنَ اِذْ جَاءَ تْ وَلَمْ تَدُمِ

آپ ﷺ ایک زمانہ میں نہیں تھے اور یہ کتاب آخرت اور قوم عاد وارم کے بارے ہمیں خبر دے رہی ہے۔ اس کی آیات ہمیشہ کے لیے ہمارے پاس ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے فائق اور ارفع ہیں کیونکہ ان کے معجزات کو دوام نصیب نہیں ہوا۔

؎ بے شک اس کتاب میں جو کہ واضح اور دائمی معجزہ ہے عظیم نعمت ہے اور نصیحت ہے ان کے لیے جنہوں نے اس پر ایمان لانے کا قصد کیا نہ کہ سرکشی اور ہٹ دھرمی کا۔ یہ آیت زجر و توبیخ کی علت ہے۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، دارمی نے اپنی مسند میں اور ابوداؤد نے مراسیل میں عمرو بن دینار عن یحییٰ بن جعدہ کی سند سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ شانہ کی ہڈی لے کر آئے اس پر انہوں نے یہود سے سنی ہوئی کچھ چیزیں لکھ رکھی تھیں۔ تو اسے دیکھ کر حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی قوم کے گمراہ ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ جو کچھ ان کا اپنا نبی لے کر آیا اس سے وہ اعراض برتیں اور اس کی طرف متوجہ ہوں جو دوسروں کی طرف ان کے انبیاء لے کر آئے(1) تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اَوَلَمۡ یَکۡفِهِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ یُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ۔ روایت ہے کہ کعب بن اشرف نے کہا اے محمد! (ﷺ) کون شہادت دیتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلۡ كَفٰی بِاللّٰهِ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَكُمۡ شَهِیۡدًا ۚ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡبَاطِلِ وَ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۵۲﴾

1۔ تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 6 (الامیریہ)

’’آپ فرمائیے کافی ہے اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان گواہ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے [1] اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں باطل پر اور انکار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا وہی لوگ گھاٹے میں ہیں [2]‘‘

[1] آپ فرمائیے میرے اور تمہارے درمیان بطور گواہ اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس پر کوئی شے مخفی نہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو شهیدًا کی صفت ہے یا پھر کَفٰی کی علت ہے۔

[2] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے اس میں باطل سے مراد غیر اللہ ہیں، یعنی وہ لوگ جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں پر ایمان لائے۔ اور مقاتل نے کہا ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے شیطان کی عبادت کی (1) اور اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں وہی لوگ گھاٹے میں ہیں اپنی تجارتوں میں۔ کیونکہ انہوں نے حق کے مقابلہ میں باطل کو پسند کیا اور جنت کے مقابلہ میں دوزخ کو خرید لیا۔ یہ جملہ کفٰی پر معطوف ہے۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ لَوْ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَ لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾

’’وہ آپ سے جلدی عذاب نازل ہونے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر میعاد مقرر نہ ہوتی تو آجاتا ان پر عذاب (اپنے وقت پر) [1] وہ ان پر اچانک آئے گا اور انہیں ہوش تک نہ ہوگا [2]‘‘

[1] اس کا عطف قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ الآیہ پر ہے۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب نضر بن حارث نے کہا تھا اَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ۔ (ہم پر آسمان سے پتھر برسا) (2)۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اجل مسمی کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں نے آپ سے یہ وعدہ نہ کیا ہوتا کہ میں آپ کی قوم کو عذاب نہیں دوں گا اور انہیں جڑ سے نہیں اکھیڑوں گا اور میں ان کا عذاب قیامت کے دن تک مؤخر کردوں گا تو عذاب آجاتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ (بلکہ قیامت کی گھڑی ان کے عذاب کے لیے مقرر ہے اور قیامت کی گھڑی انتہائی خوف ناک اور سخت کڑوی ہے) اور ضحاک نے کہا ہے کہ اَجَلٌ مُّسَمًّى سے مراد ان کی مدت عمر ہے کیونکہ جب وہ مر جائیں گے تو عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور بعض نے کہا ہے اس سے مراد غزوۂ بدر کا دن ہے۔ (3)

[2] اور ان پر اچانک عذاب آئے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضمیر کا مرجع الاجل ہے، یعنی عذاب میعاد مقرر پر آئے گا۔ دنیا میں جیسا کہ واقعۂ بدر یا پھر آخرت میں جب کہ ان پر موت طاری ہوگی۔ اور انہیں اس کے آنے کا احساس تک نہیں ہوگا۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾

’’وہ آپ سے جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کرتے ہیں (ذرا سی دیر ہے) جہنم یقیناً گھیرے گا ان کافروں کو [1]‘‘

[1] یہ تاکید کے لیے دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔ اور وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ کا عطف لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً پر ہے۔ یعنی عنقریب جس دن ان پر عذاب آئے گا وہ انہیں گھیر لے گا۔ یا یہ معنی ہے کہ گویا جہنم اب بھی انہیں گھیرے ہوئے ہے کیونکہ وہ کفر اور معاصی ان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں جو ان کے لیے جہنم کو واجب کرتے ہیں۔ الکافرین پر الف لام عہدی ہے اور ضمیر کی جگہ اسم ظاہر اس لیے رکھا گیا

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (التجارۃ)

ہے تا کہ اس پر دلالت ہو جائے جو اس احاطہ کا موجب ہے۔ یا الف لام جنسی ہے تو اس صورت میں جنس کے حکم سے کافروں کے حکم پر استدلال ہوگا۔

يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

''جس دن ڈھانپ لے گا انہیں عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا لو اب چکھو اپنے کرتوتوں کا مزہ[1]''

[1] يَوْمَ یا تو محیطة کی ظرف ہے یا فعل مقدر کی ظرف ہے مثلاً کان کیت و کیت وغیرہ۔ جس دن عذاب انہیں تمام اطراف سے ڈھانپ لے گا۔ نافع اور کوفیوں نے يَقُوْلُ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا یا اس کے حکم سے بعض ملائکہ کہیں گے۔ اور باقیوں نے اسے صیغہ جمع متکلم ہونے کی بناء پر نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ چکھو ان اعمال کی جزاء کا مزہ جو تم کرتے رہے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

''اے میرے بندو! جو ایمان لے آئے ہو میری زمین بڑی کشادہ ہے[1] سو میری ہی تم عبادت کیا کرو[2]''

[1] ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے یعبادی کو حالت وصل میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے حالت وصل میں یاء کو مفتوح اور حالت وقف میں یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اور ابن عامر نے اَرْضِی کو یاء مفتوح اور باقیوں نے یاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

[2] اِيَّايَ فعل محذوف کا مفعول ہے جس کی تفسیر ما بعد فعل شرط کر رہا ہے۔ اور فاء شرط محذوف کی جزاء کے لیے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ کہ اگر تم طاقت نہیں رکھتے کہ تم میری عبادت کرو اس زمین میں جس میں تم ہو تو اس کے علاوہ کسی اور زمین میں جا کر میری عبادت کرو۔ اس میں شرط کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس حذف کے عوض مفعول کو مقدم کر دیا گیا ہے یہاں تک کہ ضمیر متصل کی بجائے ضمیر منفصل ذکر کی گئی۔ اور مفعول کی اس تقدیم نے اختصاص کا معنی دیا اور معنی یہ ہو گیا کہ تم صرف میری ہی عبادت کرو۔ پھر اسے نصب دینے والے فعل کو حذف کر دیا گیا اور اس کی تفسیر فاعبدونی کے قول سے کی۔ تا کہ یہ تاکید کا فائدہ دے۔ گویا کہ اس طرح فرمایا فاعبدونی فاعبدونی۔ مقاتل اور کلبی نے کہا ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ کے کمزور اور ضعیف مسلمانوں کے بارے نازل ہوئی رب کریم ان سے فرما رہے ہیں کہ اگر مکہ مکرمہ میں رہ کر تمہارے لیے ایمان کا اظہار مشکل ہے تو مکہ کو چھوڑ کر کسی دوسری ایسی زمین کی طرف نکل جاؤ جہاں تمہارے لیے ایمان کا اظہار ممکن ہو۔ جیسا کہ مدینہ طیبہ کیونکہ میری زمین تو بہت وسیع ہے۔ مجاہد نے کہا ہے مطلب یہ ہے بے شک میری زمین بہت وسیع ہے۔ پس تم ہجرت کرو اور اس میں جہاد کرو۔ سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ جب کسی زمین میں گناہ کے اعمال کیے جائیں تو اس سے نکل جاؤ کیونکہ میری زمین بہت وسیع ہے۔ عطاء نے کہا ہے جب تمہیں گناہ کا حکم دیا جائے تو بھاگ جاؤ کیونکہ میری زمین بہت وسیع ہے۔ اسی طرح ایسا آدمی جو ایسے شہر میں رہتا ہو جہاں گناہ کے اعمال کیے جاتے ہوں اور اس میں کسی تغیر اور تبدیلی کا امکان نہ ہو تو اس پر واجب ہے کہ اسے چھوڑ کر ایسی جگہ چلا جائے جہاں وہ اپنے آپ کو عبادت کے لیے تیار کر سکتا ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے لیے نازل ہوئی جو مکہ مکرمہ میں ہجرت کرنے سے پیچھے رہ گئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر ہم

ہجرت کریں تو ہم بھوکے مر جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور ان کی ہجرت کرنے کے اس عذر کو قبول نہیں کیا۔ مطرف بن عبداللہ نے کہا ہے کہ اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ کا معنی ہے میرا رزق تمہارے لیے بہت وسیع ہے لہٰذا تم ہجرت کرو(1)۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو کوئی اپنے دین کی خاطر ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف بھاگ کر گیا اگرچہ وہ ایک بالشت ہی ہو وہ جنت کا مستحق ہو گیا۔ اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ساتھی ہو گیا(2)۔ ثعلبی نے اسے حسن کی حدیث سے مرسلاً روایت کیا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۫ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾

"ہر ایک موت کا مزہ چکھنے والا ہے[1] پھر ہماری طرف ہی تم لوٹائے جاؤ گے[2]"

[1] یعنی ہر نفس موت کی حرارت اور اس کی تلخی کو بالیقین پانے والا ہے جیسا کہ چکھنے والا کسی بھی شے کے ذائقہ کو پاتا ہے۔ لہٰذا تم موت کے خوف سے دارالشر میں مقیم نہ رہو بلکہ تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم عبادت الٰہی کے ذریعے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرو۔

[2] پھر ہماری طرف ہی تم لوٹائے جاؤ گے۔ تو ہم تمہیں تمہارے اعمال کی جزاء دیں گے۔ پس تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہجرت کرو تو ہم تمہیں اس کی جزاء عطا فرمائیں گے۔ ابوبکر نے يُرْجَعُوْنَ کو صیغہ غیب ہونے کی بناء پر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے خطاب کی بناء پر اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ تو اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۵۸﴾

"اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے انہیں ہم ٹھہرائیں گے جنت کے بالا خانوں میں رواں ہوں گی جن کے نیچے نہریں وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے[1] کتنا عمدہ صلہ ہے نیک کام کرنے والوں کا[2]"

[1] لَنُبَوِّئَنَّهُمْ کو حمزہ اور کسائی نے لَنُثْوِیَنَّهُمْ پڑھا ہے یعنی ثاء ساکنہ، واؤ مخففہ اور ہمزہ کی بجائے یاء کے ساتھ۔ کہا جاتا ہے ثوی الرجل و اَثْوَیْتُهٗ۔ جب آدمی کو کسی خاص منزل میں اتارا جائے تو یہ کہا جاتا ہے۔ اور باقیوں نے اسے باء مفتوحہ، واؤ مشددہ اور اس کے بعد ہمزہ سے پڑھا ہے، یعنی ہم انہیں جنت کے بالا خانوں میں اتاریں گے۔ صاحب البحر المعراج نے کہا ہے کہ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ باء کے ساتھ ایک مفعول کی طرف متعدی ہونے والا فعل ہے اور اس کا مجرد لازم ہے۔ اور غُرَفًا حرف جر کے محذوف ہونے کے سبب منصوب ہے۔ یہ اس فعل کا دوسرا مفعول نہیں۔ ہاں فعل کے لَنُنْزِلَنَّ کے معنی کو متضمن ہونے کی بناء پر یہ دوسرا مفعول بن سکتا ہے۔

[2] نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ میں مخصوص بالمدح محذوف ہے ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے۔ تقدیر عبارت ہے۔ غرف الجنة او اجرهم۔ یعنی کتنا عمدہ صلہ ہے نیک کام کرنے والوں کا اور وہ ہے جنت کے بالا خانے یا ان کا اجر۔

الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾

"وہ جنہوں نے (ہر حال میں) صبر کیا اور صرف اپنے رب پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں[1]"

[1] وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لیے مشرکین کی اذیت ہجرت اور دیگر مشقتوں اور آزمائشوں میں صبر کیا اور صرف اپنے

رب پر بھروسہ کیے ہوئے یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ وہ انہیں وہاں سے رزق عطا فرمائے گا جہاں سے انہیں وہم وگمان بھی نہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے ان مومنین سے فرمایا جو مکہ مکرمہ میں باقی رہ گئے تھے کہ وہ مشرکین کی اذیتوں سے بچنے کے لیے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر آئیں۔ تو انہوں نے جواباً کہا ہم مدینہ طیبہ کی طرف کیسے آجائیں جبکہ نہ ہمارا وہاں کوئی گھر ہے نہ مال۔ پس کون ہمیں کھلانے پلانے کا انتظام کرے گا۔؟ تو پھر یہ آیت نازل ہوئی۔(1)

وَكَأَيِّن مِّن دَابَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٠﴾

''اور کتنے ہی زمین پر چلنے والے ہیں جو اٹھائے نہیں پھرتے اپنا رزق[1] اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے انہیں بھی اور تمہیں بھی[2] اور وہ سب باتیں سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے[3]''

[1] اور کتنے ہی ایسے چوپائے اور پرندے ہیں جو غذا کے محتاج ہیں جو اپنے ساتھ اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے اور نہ ہی آنے والے کل کے لیے ذخیرہ کرتے ہیں۔ سفیان بن علی بن ارقم نے کہا ہے انسان، چوہے اور چیونٹیوں کے سوا اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی شے نہیں ہے جو خوراک کا ذخیرہ کرتی ہو۔(2)

[2] اللہ تعالیٰ انہیں بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی جہاں تم ہو۔ یعنی بے شک وہ اپنے ضعف اور اپنا رزق ذخیرہ نہ کرنے اور تم اپنی قوت اور کوشش کرنے کے باوجود آپس میں برابر ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی انہیں بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی۔ وہ بھی تمہاری طرح وہی رزق کھا کر جیتے ہیں اور بالآخر ویسے ہی مر جاتے ہیں جیسے تم۔ لہٰذا تمہاری رزق جمع کرنے کی کوشش عبث اور رائیگاں ہے۔ اس لیے تم ہجرت کے سبب اپنی معاش کے بارے خوف زدہ نہ ہو۔

[3] اور وہ تمہاری سب باتیں سننے والا ہے اس نے تمہارا یہ قول سن رکھا ہے کہ ہم مدینہ طیبہ میں خرچ کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں پائیں گے۔ اور وہ تمہارے دلوں میں پائے جانے والے یقین کے ضعف اور کمزوری کو جاننے والا ہے۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم، بیہقی اور ابن عساکر نے ضعیف سند کے ساتھ اور اسی طرح علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے، آپ فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ انصار کے باغات میں سے ایک باغ میں گیا۔ تو رسول اللہ ﷺ اپنے دست مبارک سے تازہ کھجوریں توڑ توڑ کر کھانے لگے پھر آپ ﷺ نے فرمایا اے ابن عمر! تو بھی کھا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں تو کھانے کی طلب نہیں رکھتا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میں تو اس کی طلب رکھتا ہوں آج چوتھی صبح ہے کہ میں نے کوئی شے نہیں کھائی اور نہ ہی میں نے کھانے کے لیے کوئی شے پائی۔ میں نے کہا انا للہ المستعان۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے ابن عمر! اگر میں اپنے رب سے سوال کروں تو وہ مجھے بالیقین شہنشاہ کسریٰ وقیصر کی مثل بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ عطا فرمائے۔ لیکن میں تو ایک دن بھوکا رہتا ہوں اور ایک دن سیر ہو کر کھاتا ہوں اے ابن عمر! اس وقت تیری کیا حالت ہوگی جب کہ تو اس عمر کو پہنچے اور ایسی قوم میں باقی رہے جو ایک سال کے لیے رزق کو ذخیرہ کر لے گی اور ان کے یقین کمزور ہو جائیں گے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں قسم بخدا! ابھی ہم وہیں تھے اور وہاں سے ہٹنے کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا کہ یہ آیت نازل ہوگئی وَكَأَيِّن مِّن دَابَّةٍ الآیہ(3)۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ آنے والے کل کے لیے کوئی چیز ذخیرہ نہیں کرتے تھے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے(4)۔ حضرت عمر بن خطابؓ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 165 (التجاریہ)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 59 (وزارت تعلیم)

روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایسے توکل کرتے جیسے توکل کا حق ہے تو وہ تمہیں ایسے ہی رزق عطا فرماتا جیسے پرندوں کو دیتا ہے کہ وہ صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں۔ اسے ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسی شے نہیں ہے جو تمہیں جنت سے قریب کرنے والی ہو اور جہنم سے دور کرنے والی ہو مگر میں نے تمہیں اس کا حکم دے دیا ہے اور کوئی ایسی شے نہیں جو تمہیں جہنم کے قریب کرنے والی ہو اور جنت سے دور کرنے والی ہو مگر میں نے تمہیں اس سے منع کر دیا ہے بے شک روح القدس جبرائیل امین نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ کوئی نفس اپنا رزق مکمل کرنے سے پہلے ہرگز نہیں مرے گا۔ خبردار! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی طلب میں حسن پیدا کرو۔ رزق ملنے میں دیر ہونا تمہیں اس پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں کے ذریعے اسے تلاش کرنے لگو۔ کیونکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اسے صرف اور صرف اس کی اطاعت وفرمانبرداری کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اسے بغویؒ نے شرح السنہ اور معالم میں ذکر کیا ہے۔(2)

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اور (اے حبیب!) اگر آپ پوچھیں ان (مشرکوں) سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور کس نے فرمانبردار بنادیا ہے سورج اور چاند کو تو وہ ضرور کہیں گے، اللہ تعالیٰ نے، پھر وہ کہاں توحید سے پھیرے جاتے ہیں لے''

لے یعنی اگر آپ ان اہل مکہ سے پوچھیں۔ محذوف قسم کے جواب میں یہ شرط ہے۔ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ یہ جملہ استفہامیہ بتاویل مفرد ہو کر سَاَلْتَهُمْ کے لیے مفعول مطلق ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے سالتهم هذا السوال (اگر آپ ان سے یہ سوال پوچھیں۔) لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ میں لفظ اللّٰهُ فعل محذوف کا فاعل ہے۔ تقدیر عبارت ہے لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ اللّٰهُ۔ اور قول باری تعالیٰ لَيَقُوْلُنَّ لفظاً جواب قسم ہے اور معنی شرط کی جزاء ہے۔ یعنی قسم بخدا وہ نہیں کہیں گے مگر یہی جواب۔ جب عقول میں یہی بات راسخ ہو چکی ہے کہ ممکنات کی انتہاء اس واحد و یکتا ذات پر ہوتی ہے جس کی ذات واجب الوجود ہے تو اس اقرار کے بعد وہ پھر توحید سے کیسے پھیرے جاتے ہیں۔؟

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۲﴾

''اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے لے بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ٢''

لے اس میں اس معنی کا احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کسی کے لیے چاہتا ہے کبھی اس کا رزق وسیع کر دیتا ہے اور کبھی تنگ کر دیتا ہے۔ یہ دونوں عمل زمانے کے اعتبار سے ایک دوسرے کے تعاقب میں ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ضمیر مَنْ يَّشَآءُ کی جگہ رکھی گئی ہے، یعنی وَيَقْدِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے مَنْ يَّشَآءُ غیر معین ہیں۔ اور اس کی مثل ضمیر بھی مبہم ہے۔

۳؎ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے منافع اور مفاسد کو خوب جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میرے مومن بندوں میں سے بعض وہ ہیں جو مجھ سے بابِ عبادت کا سوال کرتے ہیں تو میں انہیں اس سے روک لیتا ہوں تا کہ ان میں تکبر اور غرور داخل نہ ہو جائے کہ وہ انہیں تباہ و برباد کر دے۔ میرے مومن بندوں میں سے بعض وہ ہیں جن کا ایمان صرف دولت اور غنا سے ہی سلامت رہ سکتا ہے اگر میں انہیں فقر اور افلاس میں مبتلا کر دوں۔ تو وہ انہیں تباہ کر دے۔ اور میرے اہل ایمان بندوں میں سے بعض وہ ہیں جن کا ایمان صرف فقر کے ساتھ ہی سلامت رہ سکتا ہے۔ اگر میں انہیں دولت عطا کر دوں تو وہ اسے فاسد کر دے اور بعض اہل ایمان ایسے ہیں جن کا ایمان صرف صحت کے سبب ہی سلامت رہ سکتا ہے اگر میں انہیں بیماری لگا دوں تو وہ انہیں تباہ کر دے۔ اور بعض مومن بندے ایسے ہیں کہ ان کا ایمان صرف بیماری کے سبب سلامت رہتا ہے، اگر میں انہیں صحت عطا کر دوں تو وہ اسے فاسد کر دے۔ بے شک میں اپنے بندوں کے معاملات کی تدبیر اس شے کے علم کے مطابق کرتا ہوں جو ان کے دلوں میں ہے بے شک میں خوب جاننے والا خبر رکھنے والا ہوں۔ اسے علامہ بغویؒ نے ایک طویل حدیث میں حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ ہم اسے عنقریب سورۃ الشوریٰ میں ذکر کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۳﴾

''اور اگر آپ پوچھیں ان سے کہ کس نے اتارا آسمان سے پانی، پھر زندہ کر دیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے بنجر بن جانے کے بعد تو ضرور کہیں گے اللہ تعالیٰ نے ۱؎ آپ فرمائیے الحمد للہ (حق واضح ہو گیا) ۲؎ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں ۳؎''

۱؎ یعنی اگر آپ اہل مکہ سے سوال کریں۔ اس کا عطف لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ پر ہے۔ اور اس میں بحث بھی حسب سابق ہے۔ یعنی اہل مکہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ بے شک تمام کی تمام اشیاء چاہے وہ بسائط ہوں یا مرکبات، اصول ہوں یا فروع، ان کا موجد اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس اعتراف کے باوجود اس کے ساتھ عبادت میں وہ اس کی ایسی مخلوق کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی بھی شے پر قدرت نہیں رکھتی۔

۲؎ آپ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہہ دیجیے **الحمد للّٰہ** کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس قسم کی ذلالت و گمراہی میں واقع ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔ یا اس پر شکر ادا کیجیے کہ انہوں نے آپ کے موقف کی تصدیق کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی حجت کو غلبہ عطا فرمایا ہے۔

۳؎ بلکہ ان میں سے اکثر تو اپنے کردار کی قباحت اور اپنے اقوال کے تضاد اور تناقض کو سمجھتے ہی نہیں۔ اس طرح کہ وہ اقرار یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے سوا ہر شے کا موجد ہے اور پھر اس کے باوجود موجودات میں سے خسیس ترین اور عاجز ترین کو عبادت میں اس کا شریک بھی ٹھہراتے ہیں۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾

’’اورنہیں یہ دنیوی زندگی [1] مگر لہو ولعب [2] اور دار آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے (جسے موت نہیں) [3] کاش! وہ اس حقیقت کو جانتے [4]‘‘

[1] اسم اشارہ قریب دنیا کی حقارت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

[2] لہو سے مراد ہر وہ شے ہے جو آدمی کو نفع بخش شے سے غافل کر دیتی ہے۔ کیونکہ آدمی کا دنیوی زندگی میں مشغول ہونا اسے ان چیزوں سے غافل کر دیتا ہے جو اسے دائمی زندگی (اخروی زندگی) میں فائدہ دے سکتی ہیں۔ دنیوی زندگی کو لعب اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ زندگی فانی ہے۔ اور آدمی دنیوی زندگی میں جو طاعات وفرمانبرداری کے افعال کرتا ہے وہ اس دنیا سے نہیں ہوتے بلکہ وہ امور آخرت میں ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ثمرہ اور نتیجہ آخرت میں ہی ظاہر ہوگا۔

[3] اور دار آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے۔ یعنی وہ زندگی کا گھر ہے۔ یعنی اس میں ایسی زندگی عطا ہوگی جس پر کبھی موت طاری نہیں ہوگی۔ یا پھر مبالغہ کے لیے آخرت کو ہی زندگی قرار دیا گیا ہے۔ حَیَوَان مصدر بمعنی حیوٰۃ ہے۔ یہ اصل میں حییان ہے۔ پھر دوسری یاء کو واؤ سے تبدیل کیا گیا ہے۔ اور یہ حیوٰۃ کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ فَعَلَان کے وزن پر ہے جو حرکت واضطراب کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہ حیوٰۃ (زندگی) کو لازم ہے اسی لیے اسے یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

[4] اگر وہ دنیا کی فناء اور آخرت کی بقاء کو جانتے تو وہ دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دیتے۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾

’’پھر جب سوار ہوتے ہیں کشتی میں [1] تو دعا مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ سے خالص کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے دین کو [2] پھر جب وہ سلامتی پہنچاتا ہے انہیں خشکی پر تو اس وقت وہ شرک کرنے لگتے ہیں [3]‘‘

[1] پھر جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں۔ اور انہیں غرق ہونے کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ یہ کلام اس کیفیت کے ساتھ متصل ہے جس پر ان کے حال کی شرح دلالت کرتی ہے، یعنی جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو وہ اس حال پر ہوتے ہیں کہ اپنے دلوں میں شرک اور عناد رکھتے ہیں۔

[2] وہ خوف کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں اور وہ ایسے مومن کی مثل صورت بنائے ہوئے ہوتے ہیں جو اپنے دین کو اللہ تعالیٰ کے لیے ہی خالص کرتا ہے۔ اس طرح کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا ذکر نہیں کرتے اور اس کے سوا کسی سے دعا نہیں مانگتے کیونکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ضرر اور تکلیف کو دور نہیں کر سکتا۔

[3] پھر جب اللہ تعالیٰ انہیں سلامتی سے خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو وہ فوراً شرک کی طرف واپس لوٹ آتے ہیں۔ اس کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ پر ہے۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب اہل جاہلیت سمندر میں کشتیوں پر سوار ہوتے تھے تو وہ اپنے ساتھ بتوں کو اٹھائے ہوئے ہوتے تھے پر جب تیز ہوا چلنے لگتی، تو وہ انہیں سمندر میں پھینک دیتے اور کہنے لگتے یارب یارب(1)۔ اس قول کے مطابق مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حقیقی معنی پر ہے۔ یعنی وہ مصائب اور تکالیف کے وقت تو دین کو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کر لیتے تھے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 166 (التجاریہ)

شرک کو چھوڑ دیتے تھے۔ لیکن مصائب سے نجات پانے کے بعد دوبارہ شرک کا ارتکاب شروع کر دیتے تھے۔

لِيَكْفُرُوا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوا ۗ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

''وہ ناشکری کر لیں جو نعمت ہم نے انہیں دی ہے[1] اور لطف اٹھالیں (اس سے)[2] وہ عنقریب جان لیں گے حقیقت کو[3]''

[1] لِيَكْفُرُوا پر لام امر ہے۔ اور یہ تہدید اور وعید کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں امر اسی معنی میں ہے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا انکار کریں جو اللہ نے انہیں مصیبت سے نجات دلانے کی صورت میں عطا فرمائی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام کَیْ ہے۔ یعنی وہ شرک کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے شرک کے سبب نجات دلانے کی نعمت کا انکار کرنے والے ہو جائیں۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ ان کے لیے اس شرک کرنے میں کوئی فائدہ نہیں سوائے کفر اور ان چیزوں سے لطف اندوز ہونے کے جن سے وہ دنیا میں لطف اندوز ہو سکتے تھے آخرت میں اس کا کوئی حصہ اور فائدہ نہیں۔ بخلاف مخلص مومنین کی عادت کے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ انہیں مصیبت سے نجات عطا فرماتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کرتے ہیں اور وہ اسی احسان کو اطاعت میں اضافے اور زیادتی کا سبب اور ذریعہ بناتے ہیں۔

[2] وَلِيَتَمَتَّعُوا میں ابن کثیر، حمزہ، کسائی اور قالون نے نافع سے لام کو سکون کے ساتھ نقل کیا ہے۔ لہٰذا ان کی قرأت کے مطابق یہ لام امر ہے اور باقیوں نے لام کو مکسور پڑھا ہے اور اسے لِيَكْفُرُوا پر عطف کیا ہے۔ اس صورت میں یہ لام لام امر اور لام کَیْ دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔

[3] جب انہیں سزا دی جائے گی تو وہ اس کے انجام کو جان لیں گے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿۶۷﴾

''کیا انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنادیا ہے حرم کو امن والا[1] حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو ان کے آس پاس سے[2] کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں[3] اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں[4]''

[1] یہ استفہام انکاری ہے۔ اور واؤ فعل محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اَلَمْ يَنْظُرُوْا وَلَمْ يَرَوْا اَهْلُ مَكَّةَ۔ (کیا ان مکہ کے رہنے والوں نے غور و فکر نہیں کی اور نہیں دیکھا کہ ہم نے مکہ کو حرم بنا دیا ہے کہ وہ لوٹ مار اور ظلم و تعدی سے محفوظ ہے۔ اس کے باسی قتل اور قید کی صعوبتوں سے پرامن ہیں۔

[2] وَّ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ کا عطف اس جملہ محذوفہ پر ہے جو سابقہ کلام سے سمجھا جا رہا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اَنَّا جَعَلْنَا مَكَّةَ حَرَماً اٰمِناً لَا يُغَارُ وَ لَا يُتَعَرَّضُ اَهْلُهَا وَ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (ہم نے حرم کو امن والا بنا دیا ہے اس میں غارت گری نہیں کی جاتی اور نہ اس کے باسیوں سے کوئی تعرض کیا جاتا ہے حالانکہ لوگوں کو ان کے آس پاس سے اچک لیا جاتا ہے)۔ تحقیق عرب لوگوں کو قتل اور قید و بند کے لیے اٹھا کر لے جاتے تھے لیکن وہ اہل مکہ سے کوئی تعرض نہیں کرتے تھے۔

۳؎ اَفَبِالْبَاطِلِ یہاں ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور فاء سابقہ مضمون پر تفریع کے لیے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تو اہل مکہ پر یہ احسان فرمایا حالانکہ وہ اس نعمت ظاہرہ اور دیگر نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی باطل یعنی بتوں اور شیطان کے سبب قدرت نہیں رکھتے تھے۔ اور یہ مفہوم بھی درست ہے کہ باطل سے مراد اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ سب سے اچھا قول لبید کا ہے۔

اَلَا كُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلُ (خبردار! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے باطل ہے)(1)

۴؎ کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں اس طرح کہ وہ اس کے ساتھ غیر کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ کو يَكْفُرُوْنَ سے مبالغہ کے طریقے پر اہتمام یا اختصاص کے لیے مقدم کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے نعمۃ اللّٰہ سے مراد حضور نبی کریم ﷺ اور قرآن ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِیْنَ ۝۶۸

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان لگایا، یا حق کو جھٹلایا جب وہ اس کے پاس آیا۔ ۱؎ کیا نہیں ہے جہنم میں ٹھکانا کفار کے لیے ۲؎ ''

۱؎ اور کون شخص زیادہ ظالم ہے۔ اس شخص سے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان لگایا، یعنی یہ گمان کیا کہ اس کا کوئی شریک ہے۔ یا حق یعنی رسول اور قرآن کو جھٹلایا۔ یعنی جونہی حق ان کے لیے ظاہر ہوا تو انہوں نے رسول کے آتے ہی نہ توقف کیا اور نہ ہی غور وفکر کی پہلی بار ہی جو کچھ سنا اسے جھٹلا دیا۔

۲؎ اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِیْنَ میں استفہام تقریری ہے اور جہنم میں ان کے ٹھکانے کو پختہ کرنے کے لیے ہے۔ مفہوم یہ ہے۔ کیا وہ جہنم میں قرار پذیر ہونے اور ٹھہرنے کے مستحق نہیں ہیں حالانکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر بھی بہتان تراشی کی اور حق کو بھی مکمل طور پر جھٹلا دیا۔ یا یہ استفہام ان کی جرات کی تقریر کے لیے ہے۔ یعنی کیا وہ نہیں جانتے کہ کافروں کے لیے جہنم میں ٹھکانا ہے کہ انہوں نے اس افتراء پردازی اور تکذیب کی جرأت کی ہے۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝۶۹

''اور جو (بلند ہمت) مصروف جہاد رہتے ہیں ہمیں راضی کرنے کے لیے ۱؎ ہم ضرور دکھا دیں گے انہیں اپنے راستے ۲؎ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ہر وقت) محسنین کے ساتھ ہے ۳؎ ''

۱؎ اَلْجِهَادُ بَذْلُ الْوُسْعِ وَالطَّاقَةِ (جہاد کا معنی ہے اپنی وسعت اور طاقت کو خرچ کر دینا) اور یہاں مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی تمام تر وسعت (وسائل) اور طاقت کفار سے جنگ کرنے نفس اور خواہشات کی مخالفت کرنے میں صرف کر دی۔ ''فِیْنَا'' ہماری رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے، ہمارے دین کی مدد اور نصرت کے لیے، ہمارے اوامر کی پیروی کرنے کے لیے اور ہماری منع کی ہوئی چیزوں سے رکنے کے لیے۔

1۔ مسند احمد، جلد 2 صفحہ 470 (صادر)

ے تو ہم انہیں اپنے راستے ضرور دکھا دیں گے۔ یعنی ایسے راستے جو ہماری طرف لے کر آنے والے ہیں اور ہماری بارگاہ تک بلا کیف پہنچانے والے ہیں۔ یا ہم انہیں ضرور بھلائی اور نیکی کے راستے دکھا دیں گے اور ان پر چلنے کی توفیق بھی ارزانی فرمائیں گے۔ رب کریم نے ارشاد فرمایا وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (جو لوگ ہدایت پالیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت میں اضافہ فرمادیتا ہے) حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے یہ معنی منقول ہے کہ جن لوگوں نے ان چیزوں میں اپنی طاقت کو صرف کیا جنہیں وہ جانتے ہیں تو ہم ضرور ان کی راہنمائی ان چیزوں کی طرف کر دیں گے جنہیں وہ نہیں جانتے۔

حضرت عطاء رضی اللہ عنہ سے یہ معنی منقول ہے کہ جن لوگوں نے ہماری رضا کے حصول کے لیے اپنی وسعت و طاقت کو خرچ کیا ہم انہیں ضرور اپنے ثواب کے راستے دکھا دیں گے۔

حضرت جنیدؒ بغدادی سے یہ معنی منقول ہے کہ جنہوں نے توبہ کے لیے اپنی طاقت خرچ کی ہم انہیں اخلاص کے راستے ضرور دکھا دیں گے اور سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب لوگوں میں اختلاف ہو جائے تو تم اس کی طرف دیکھو جس پر اہل سرحد ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا(1) (گویا آپ کے نزدیک جہاد سے مراد کفار سے جہاد کرنا ہے) حسن نے کہا ہے کہ افضل ترین جہاد خواہشات کی مخالفت ہے (افضل الجهاد مخالفة الهوى)۔ فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے جنہوں نے علم کی تلاش میں اپنی طاقت اور کوشش صرف کی ہم انہیں ضرور عمل کی راہیں دکھائیں گے۔ سہیل بن عبداللہ نے کہا ہے کہ جنہوں نے سنت کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہم ضرور انہیں جنت کے راستے دکھائیں گے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جنہوں نے ہماری اطاعت میں اپنی طاقت صرف کی ہم انہیں اپنے ثواب کے راستے ضرور دکھائیں گے(2) اور حدیث طیبہ میں ہے کہ جس کسی نے اس کے مطابق عمل کیا جس کا وہ علم رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ان کا علم عطا فرمائے گا جنہیں وہ نہیں جانتا۔

لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا کا جملہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور جملہ قسمیہ موصول کی خبر ہے۔ اور اسم موصول مبتدا اپنی خبر کے ساتھ مل کر الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ پر معطوف ہے۔

سے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر وقت محسنین کے ساتھ ہے، یعنی دنیا میں مدد اور اعانت کے ذریعے اور آخرت میں ثواب اور مغفرت نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور صوفیاء نے کہا ہے کہ محسنین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معیت غیر متکیف ہے۔ اس کا ادراک صرف اہل بصیرت ہی بصیرت کے سبب کر سکتے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا پر معطوف ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ لَنَهْدِيَنَّهُمْ کے فاعل سے حال ہو۔ اور ضمیر عائد کی جگہ اسم ظاہر کو رکھ دیا گیا ہو اور تقدیر کلام اس طرح ہو۔ وَاِنَّا لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی صراحۃً ذکر کرنا تاکید میں اضافہ کے لیے ہے۔ واللّٰه اعلم بالصواب۔

سورۂ عنکبوت کی تفسیر 9 رجب 1206ھ کو اختتام پذیر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے سورۂ عنکبوت کا ترجمہ 7 شوال 1420ھ بمطابق 15 جنوری 2000ء بروز ہفتہ ساڑھے نو بجے رات اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس سے آگے سورۃ الروم کا ترجمہ آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 166 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 166 (التجاریہ)

اٰیاتہا ۶۰ 　 سُوْرَةُ الرُّوْمِ مَكِّيَّةٌ ۳۰ 　 رکوعاتہا ۶

سورۃ الروم مکی ہے، اس کی ساٹھ آیتیں اور چھ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾

"الف۔لام۔میم [1] ہرا دیئے گئے رومی پاس کی زمین میں [2] اور وہ ہار جانے کے بعد ضرور غالب آئیں گے [3]"

[1] ابن ابی حاتم نے ابن شہاب سے اور ابن جریر نے عکرمہ، یحییٰ بن یعمر اور قتادہ سے روایت نقل کی ہے کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہجرت کرنے سے قبل مکہ مکرمہ میں مشرکین مسلمانوں سے جھگڑا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ تم یہ شہادت دیتے ہو کہ روم والے اہل کتاب ہیں حالانکہ ان پر فارس کے مجوسی غالب آچکے ہیں اور تم بھی یہ گمان رکھتے ہو کہ عنقریب تم بھی اس کتاب کے سبب ہم پر غالب آجاؤ گے جو تمہارے نبی پر نازل کی گئی ہے۔ تو پھر مجوس اہل روم پر کیسے غالب آگئے حالانکہ وہ اہل کتاب ہیں۔ پس ہم بھی تم پر ایسے ہی غلبہ پالیں گے جیسے فارس نے روم (۱) پر غلبہ پالیا۔(1)

[2] اَدْنَى الْاَرْضِ سے مراد سرزمین عرب کا وہ حصہ ہے جو رومیوں کے قریب تھا۔ الارض پر الف لام عہدی ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہی زمین معہود تھی۔ یا اس سے مراد ہے رومیوں کی سرزمین کا وہ حصہ جو عربوں کے قریب ہے۔ اس صورت میں الارض پر الف لام عوضی ہے جو مضاف الیہ کے عوض آیا ہے۔ عکرمہ نے کہا ہے کہ اَدْنَى الْاَرْضِ سے مراد اذرعات اور کسکر کا علاقہ ہے (2)۔ مجاہد کا قول ہے اس سے مراد جزیرہ کی سرزمین ہے۔ اور مجاہد کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اردن اور فلسطین ہے۔(3)

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 290 (العلمیۃ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (التجاریۃ)　　3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (التجاریۃ)

(۱) ترمذی اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے ضمن میں نقل کیا ہے۔ اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے کہ آپ نے فرمایا مشرکین یہ پسند کرتے تھے کہ اہل فارس روم پر غالب آجائیں کیونکہ اہل فارس بت پرست تھے۔ اور مسلمان یہ پسند کرتے تھے کہ اہل روم فارس پر غالب آئیں کیونکہ وہ اہل کتاب تھے۔ پس جب روم پر غلبہ پالیا گیا تو مشرکین نے اس کا ذکر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کیا۔ پھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا۔ تو سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک عنقریب وہ رومی غالب آجائیں گے۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کا تذکرہ مشرکین سے کر دیا۔ تو انہوں نے کہا تم ہمارے اور اپنے درمیان ایک مدت مقرر کر لو۔ اگر ہم غالب آگئے (یعنی ہم جیت گئے) تو ہمارے لیے اتنا اتنا مال ہوگا اور اگر تم غالب آگئے تو تمہارے لیے اتنا اتنا مال ہوگا۔ پس دونوں نے اپنے درمیان پانچ سال کی مدت مقرر کی لیکن اتنے عرصے میں رومی غالب نہ آئے۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم نے دس سال کے دوران کی مدت کیوں نہیں مقرر کی۔ پس اس کے بعد رومی غالب آگئے۔ اسی کا ذکر اس ارشاد میں ہے الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ۔ سفیان نے کہا ہے کہ میں نے سنا ہے وہ ان پر بدر کے دن غالب آئے تھے۔ یہ حدیث مستفیض اور متعدد طرق سے حضرت ابن مسعود، براء بن عازب اور بنار بن مکرم اسلمی سے مروی ہے۔

۳؎ فعل مجہول کا مصدر ہے، یعنی رومی اس کے بعد کہ ان پر غلبہ پالیا گیا، عنقریب فارس پر ضرور غالب آئیں گے۔

فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۬ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ یَوْمَىٕذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ۝۴

''چند برس کے اندر ۱؎ اللہ ہی کا حکم ہے پہلے بھی اور بعد بھی۔ اور اس روز خوش ہوں گے اہل ایمان اللہ کی مدد سے ۲؎ ''

۱؎ البضع سے مراد تین سے سات سال کی مدت ہے۔ ایک قول ہے کہ اس سے مراد تین سے لے کر نو سال تک کی درمیانی مدت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد دس سال سے کم کا عرصہ ہے۔ جوھری نے کہا ہے کہ جب تعداد دس تک ہو تو اس کے لیے تو بضع اور بضعة استعمال ہوتا ہے لیکن جب تعداد بیس سے تجاوز کر جائے تو پھر آپ بضع و عشرون نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ موقف اس حدیث طیبہ کے خلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّ سَبْعُوْنَ شُعْبَةً۔ کہ ایمان کے ستر سے زائد حصص ہیں۔(1)

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ فارس اور روم کے درمیان جنگ تھی۔ مشرکین یہ پسند کرتے تھے کہ اہل فارس روم پر غالب آئیں کیونکہ اہل فارس مجوسی (آتش پرست) تھے اور ان کے پاس کوئی بھی آسمانی کتاب نہیں تھی۔ اور مسلمان یہ چاہتے تھے کہ اہل روم فارس پر غالب آئیں کیونکہ وہ اہل کتاب تھے۔ چنانچہ کسریٰ فارس پرویز بن ہرمز بن نوشیروان نے ایک لشکر روم کی طرف بھیجا اور اس کا امیر شہر یزاد نامی آدمی کو مقرر کیا۔ اور قیصر روم نے بھی ایک لشکر روانہ کیا اور اس کا امیر تحنیس نامی آدمی کو بنایا۔ ان دونوں لشکروں کا مقابلہ شام اور بصریٰ کے علاقہ اذرعات میں ہوا۔ (شام کا یہ علاقہ سرزمین عرب وعجم کے قریب تھا)۔ نتیجۃً فارسی لشکر رومی لشکر پر غالب آگیا۔ پس جونہی یہ خبر مکہ مکرمہ کے مسلمانوں تک پہنچی تو ان پر انتہائی شاق گزری اور اس پر انہیں دلی رنج وغم ہوا۔ اور کفار مکہ کو از حد خوشی ہوئی۔ اور انہوں نے مسلمانوں سے کہا تم بھی اہل کتاب ہو اور نصاریٰ بھی اہل کتاب ہیں۔ اور ہم تو کتاب سے خالی ہیں۔ لیکن ہمارے فارس کے رہنے والے بھائی تمہارے روم کے رہنے والے بھائیوں پر غالب آگئے ہیں۔ لہٰذا اگر تم نے ہمارے ساتھ جنگ لڑی تو ہم بھی بالیقین تم پر غالب آئیں گے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ پس حضرت ابوبکر صدیقؓ کفار کی طرف تشریف لے گئے اور جا کر فرمایا۔ تم اپنے بھائیوں کے غلبے سے بہت خوش ہو۔ لیکن قسم بخدا رومی اہل فارس پر ضرور غالب آئیں گے۔ ہمارے نبی مکرم ﷺ نے ہمیں اس کی خبر دی۔ یہ سن کر اُبی بن خلف جمحی نے کہا تم نے جھوٹ بولا ہے۔ تو جواباً آپؓ نے فرمایا اے اللہ کے دشمن! تو بہت زیادہ جھوٹا ہے۔ اس پر اُبی نے کہا اپنے اور ہمارے درمیان ایک مدت مقرر کر لو دس اونٹ بطور شرط میری طرف سے ہوں گے اور دس آپ کی طرف سے۔ اگر اہل روم اہل فارس پر غالب آگئے تو میں تاوان ادا کروں گا اور اگر اہل فارس رومیوں پر غالب آگئے تو تم تاوان ادا کرو گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کر لیا اور تین سال کی مدت مقرر کر لی۔ پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ کو سارے واقعہ سے آگاہ کیا۔ (یہ واقعہ جوئے کی حرمت سے پہلے کا ہے)۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے تو اس طرح بیان نہیں کیا تھا بلکہ بضع سے مراد تو تین سال سے نو برس تک کی درمیانی مدت ہے۔ لہٰذا اب جاؤ مال میں اضافہ کر دو اور مدت بڑھا دو۔ چنانچہ ابوبکر صدیقؓ باہر تشریف لائے تو آپ نے اُبی کو دیکھا۔ تو اس نے فوراً کہا شائد اب تو تم اپنی شرط پر نادم ہو گئے۔ آپ نے فرمایا ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو تیرے لیے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 47 (قدیمی)

مال میں اضافہ کرنے لگا ہوں اور تیرے ساتھ مدت مقررہ میں توسیع چاہتا ہوں۔ چنانچہ نو سال تک کی مدت مقرر کر کے اونٹنیوں کی تعداد سو کر دی۔ بعض نے کہا ہے سات سال کی مدت مقرر کی۔ یہ سن کر اُبی نے بھی کہہ دیا میں نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ پس جب اُبی بن خلف کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکہ مکرمہ سے نکل جانے کا خطرہ لاحق ہوا۔ تو وہ آپ کے پاس آیا اور آپ سے چمٹ کر کہا۔ مجھے یہ خطرہ ہے کہ تم مکہ سے چلے جاؤ۔ اس لیے میرے لیے اپنا ضامن مقرر کر دو۔ چنانچہ آپ نے اس کے لیے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن ابی بکر کو ضامن مقرر کر دیا۔ چنانچہ اس نے یہ کہا تھا قسم بخدا میں تم کو نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ تم مجھے اپنا کفیل دے دو۔ چنانچہ آپ نے اسے ضامن دے دیا۔ اس کے بعد اُبی بن خلف جنگ احد میں شریک ہونے کے لیے مکہ سے نکلا اور وہاں مقابلہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک سے زخمی ہو گیا اور اسی زخم کی تاب نہ لاتے ہوئے وہاں سے مکہ کی طرف واپسی کے دوران مر گیا۔ پھر حدیبیہ کے دن رومی اہل فارس پر غالب آ گئے۔ یہ ان کی شرط کے دن سے لے کر ساتویں سال کا آخیر تھا۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ بدر کے دن رومیوں کو فارسیوں پر غلبہ نصیب ہوا(1)۔ شعبی نے کہا ہے کہ ابھی تک اہل مکہ اور ان کے صاحب شرط اُبی بن خلف اور مسلمانوں او ران کے صاحب شرط حضرت ابوبکر صدیقؓ کے درمیان طے پانے والی مقررہ مدت مکمل طور پر نہیں گزری تھی کہ رومی فارس پر غالب آ گئے اور انہوں نے اپنے گھوڑے مدائن میں پہنچ کر باندھ لیے اور تیر اندازی کے لیے مخصوص جگہیں بنا لیں۔ پس حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُبی سے اپنی شرط جیت لی، اور اس کے وارثوں سے آپ نے معینہ مال وصول کر لیا۔ آپ وہ مال لے کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اسے صدقہ کر دو(2)۔ ترمذی نے ابوبکر صدیقؓ کی حدیث سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ (یہ واقعہ قمار کی حرمت کے حکم سے پہلے کا ہے)

مسئلہ: حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ دار الحرب میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان عقود فاسدہ جائز ہیں مثلاً سود کی بیع وغیرہ۔ اور اس کا استدلال حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اسی واقعہ سے کیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ کافر کا مال محفوظ نہیں ہوتا اس لیے اسے لینا جائز ہوتا ہے۔ البتہ انہیں امان دینے کے بعد دھوکے سے ان کا مال لینا جائز نہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ عکرمہ کے قول کے مطابق اہل روم کے فارس پر غلبے کا سبب یہ تھا کہ روم پر غلبہ پانے کے بعد شہر یزاد رومیوں کو روندتا اور ان کے شہروں کو تباہ و برباد کرتے ہوئے خلیج تک جا پہنچا۔ پس اسی اثناء میں ایک دن اس کا بھائی فرخان اس کے تخت پر بیٹھا شراب پی رہا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں اپنے آپ کو کسریٰ کے تخت پر بیٹھے دیکھ رہا ہوں۔ اس کی بات کسریٰ تک پہنچ گئی، تو اس نے شہر یزاد کی طرف لکھا کہ جونہی آپ کے پاس میرا یہ خط پہنچے تو فرخان کا سر میری طرف بھیج دینا۔ اس کے جواب میں شہر یزاد نے اسے لکھا اے شہنشاہ تو فرخان کی مثل ہرگز کسی کو نہیں پائے گا، اس کے بہت کارنامے ہیں اور دشمن پر اس کا بہت رعب ہے۔ لہٰذا آپ اس سے غافل نہ رہیں۔ چنانچہ کسریٰ نے اس کی طرف دوبارہ لکھا کہ فارس کے لوگوں میں بہت سے ہیں جو اس سے اچھے ہیں۔ لہٰذا تم اس کا سر فوراً میری طرف بھیج دو۔ اس نے دوبارہ وہی جواب لکھا۔ جس سے کسریٰ غضبناک ہو گیا اور اب اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ ڈاک کے ذریعے اہل لشکر کی طرف یہ حکم بھیج دیا کہ میں نے تمہاری امارت سے شہر یزاد کو معزول کر دیا ہے۔ اور اس کی جگہ تمہارا امیر فرخان کو بنا دیا ہے۔ پھر ساتھ یہ ایک مختصر سا خط ڈاک لانے والے کو دیا جس میں شہر یزاد کے قتل کا حکم تھا۔ اور اسے کہا کہ جب فرخان ولایت کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 67-166 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 167 (التجاریہ)

اختیارات حاصل کرلے اور اس کا بھائی اس کے تابع فرمان ہوجائے تو یہ خط تب اسے دینا۔ چنانچہ جب شہر یزاد نے وہ خط پڑھا تو کہا سَمۡعًا و طاعۃً کہ میرا اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔ اور اپنے تخت سے اتر گیا اور اس کی جگہ فرخان نے اختیارات سنبھال لیے، تو اس وقت اس نے وہ خط اس کے حوالے کر دیا۔ اسے پڑھنے کے بعد فرخان نے کہا کہ شہر یزاد کو میرے پاس لاؤ۔ پس اس نے اسے مزید آگے کیا تاکہ اس کی گردن مار دے۔ لیکن شہر یزاد نے اسے کہا مجھے قتل کرنے میں اتنی جلدی نہ کر، یہاں تک کہ مجھے وصیت لکھنے کی مہلت دے۔ فرخان نے کہا ٹھیک ہے۔ پس شہر یزاد نے اپنا بستہ منگوایا اور اس سے تین خط نکال کر اس دیئے۔ اور کہا یہ تمام وہ خطوط ہیں جو میں نے تیرے بارے میں کسریٰ کو جواباً لکھے ہیں۔ اور تو صرف ایک خط کے سبب مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ فرخان نے ولایت کے تمام اختیارات اپنے بھائی کے حوالے کر دیئے۔ تو اس کے بعد شہر یزاد نے شہنشاہ روم قیصر کی طرف لکھا کہ مجھے تیرے ساتھ ایک ضروری کام ہے لیکن ڈاک والا نہ تو اسے بصورت پیغام اٹھا کر لاسکتا ہے۔ اور نہ ہی بصورت خط پہنچا سکتا ہے۔ اس لیے تم میرے ساتھ ملاقات کرو۔ اور ملاقات کے لیے تمہارے ساتھ پچاس رومیوں کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ اور میرے ساتھ پچاس فارسیوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ چنانچہ قیصر اپنے ساتھ پچاس رومیوں کو لے کر آیا۔ چونکہ اسے اس کی جانب سے مکر اور دھوکے کا خوف تھا اس لیے اس نے راستے میں آگے آگے جاسوس بھیج دیے۔ حتیٰ کہ جاسوسوں نے اسے اطلاع دی کہ شہر یزاد کے ساتھ بھی پچاس آدمیوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ پھر دونوں کے لیے ایک ریشمی خیمہ لگایا گیا جس میں دونوں نے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک خنجر تھا۔ اور دونوں کے درمیان ترجمان بھی موجود تھے۔ چنانچہ شہر یزاد نے کہا کہ وہ لوگ جنہوں نے تیرے شہروں کو برباد کیا ہے وہ میں اور میرا بھائی ہیں ہم نے اپنی چال اور شجاعت کے ساتھ ایسا کیا ہے۔ لیکن کسریٰ نے ہمارے ساتھ حسد کیا ہے۔ اور اس نے یہ خواہش کی کہ میں اپنے بھائی کو قتل کر دوں۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ پھر اس نے میرے بھائی کو مجھے قتل کرنے کا حکم دیا۔ ہم تو اکٹھے پیدا ہوئے ہیں (اس لیے ہم اس کے کہنے پر عمل نہیں کر سکے)۔ لہٰذا اب ہم تیرے ساتھ مل کر اس سے قتال کرنا چاہتے ہیں۔ تو قیصر نے کہا تم دونوں نے صحیح کیا۔ پھر دو میں سے ہر ایک نے دوسرے کو اشارۃً کہا کہ راز دو آدمیوں کے درمیان ہی ہوتا ہے۔ جب وہ دو سے تجاوز کر جائے تو پھیل جاتا ہے۔ چنانچہ دونوں نے اپنے اپنے خنجروں کے ساتھ اپنے ترجمانوں کو ایک ساتھ قتل کر دیا۔ پس اس وقت سے رومیوں کو اہل فارس پر غلبہ حاصل ہوگیا۔ چنانچہ رومیوں نے اہل فارس کو تلاش کر کر کے قتل کیا۔ اور کسریٰ بھی مر گیا۔ اور یہ خبر حدیبیہ کے دن حضور نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ اور آپ کے ساتھی یہ سن کر از حد خوش ہوئے۔ اسی کے بارے میں یہ ارشاد گرامی ہے۔ الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ فِیۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ الآیہ(1)۔

غُلِبَتِ کو صیغہ معروف کی صورت میں فتحہ کے ساتھ غَلَبَتْ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور سَیَغۡلِبُوۡنَ کو ضمہ کے ساتھ سَیُغۡلَبُوۡنَ پڑھا گیا ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ بے شک رومی اہل فارس کی سرزمین پر غالب آگئے اور مسلمان عنقریب ان پر غالب آجائیں گے۔ چنانچہ رومیوں کے غلبے کے نویں سال میں مسلمانوں نے ان سے جنگ لڑی اور ان کے بعض شہروں کو فتح کر لیا۔ اس بناء پر الغلب فعل معروف کا مصدر ہے جو کہ فاعل کی طرف مضاف ہے۔ اس قرأت کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے ترمذی نے ابوسعید سے نقل کیا ہے کہ جب یوم بدر تھا تو رومی اہل فارس پر غالب آگئے۔ تو اس خبر نے مؤمنین کو از حد خوش کیا۔ پس اس وقت یہ آیت نازل ہوئی الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ (2)۔ بِنَصۡرِ اللّٰہِ۔ تو اس میں غَلَبَتْ کی غین مفتوح ہے۔ ابن جریر نے حضرت ابن مسعودؓ سے بھی اسی طرح

روایت نقل کی ہے۔ لیکن قرأت شاذہ ہے اور پہلی متواترہ ہے۔ جب رومی اہل فارس پر غالب آئے تو شاید حضور نبی کریم ﷺ نے وحی غیر متلو کے ذریعے جان لیا کہ بے شک آج رومی اہل فارس پر غالب آئے ہیں حالانکہ رومیوں کہ اہل فارس پر غلبہ پانے کے بعد عنقریب مومنین ان پر غالب آ جائیں گے۔ چنانچہ تب رسول اللہ ﷺ نے ان کی اس طرح قرأت کی جیسے ترمذی نے ابوسعید سے اسے نقل کیا ہے۔ یعنی غَلَبَتْ کو صیغہ معروف کی صورت میں اور سَيُغْلَبُوْنَ کو صیغہ مجہول کی صورت میں پڑھا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہے رومیوں کے اہل فارس پر غلبہ پانے سے پہلے بھی۔ جبکہ وہ مغلوب تھے۔ اور ان کے ان پر غلبہ پانے کے بعد بھی۔ جس وقت کہ وہ غالب تھے اور ان دونوں کے درمیان اس کے فیصلے اور اندازے کے بغیر کوئی شے وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ یہ جملہ سَيَغْلِبُوْنَ کی علت بیان کرتا ہے۔ اور اس دن جبکہ رومیوں کو غلبہ حاصل ہوگا۔ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی مدد سے خوش ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو ان پر غالب کر دیا جو اہل کتاب نہیں، مومنین نے مشرکین کو جو خبر دی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کی صداقت کو ظاہر کر دیا اور انہیں اپنی شرط میں غلبہ عطا کیا اور ساتھ ہی اپنے دین کے بارے میں ان کے یقین اور ثبات میں مزید اضافہ فرمایا۔ سدیؒ نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ بدر کے دن بہت خوش ہوئے کہ مسلمانوں کو مشرکین پر فتح نصیب ہوئی اور اہل کتاب کو اہل شرک پر غلبہ عطا ہوا(1)۔ علامہ جلال الدین محلیؒ نے کہا ہے مسلمان غلبہ کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے اور انہیں اس واقع کا علم یوم بدر کو ہوا کہ اس روز جبریل امین علیہ السلام یہ خبر لے کر آئے اور اس کے ساتھ ہی اس دن مسلمانوں کو مشرکین پر اپنے غلبے کی بھی از حد خوشی تھی(2)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ پر معطوف ہے۔

بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ﴿۵﴾

"وہ مدد فرماتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہی سب پر غالب ہے ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۱۔"

۱۔ وہ جس کی چاہتا ہے مدد فرماتا ہے۔ پس وہ کبھی ایک فریق کی مدد کرتا ہے اور کبھی دوسرے فریق کی اور وہی سب پر غالب ہے۔ کبھی اپنے بعض بندوں پر دوسروں کو مسلط کر کے انہیں سزا دیتا ہے۔ اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر رحم فرماتا ہے اور ان کی مدد فرما کر انہیں دوسروں پر غالب کر دیتا ہے۔

وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾

"یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے ۱۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت) کو نہیں جانتے ۲۔"

۱۔ اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ کیا ہے۔ اس میں وعدہ مصدر ہے جو اپنی ہی ذات کی تاکید کے لیے ہے نہ کہ ماقبل کی اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ کیونکہ یہ وعدہ کے معنی میں ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی طرف کذب کی نسبت ممتنع ہے لیکن اکثر لوگ یعنی کفار مکہ اپنی جہالت اور غور و فکر نہ کرنے کے سبب اس وعدے اور اس کے صحیح ہونے کو نہیں جانتے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 168 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر جلالین صفحہ 341 (وزارت تعلیم)

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝

"وہ جانتے ہیں دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو[1] اور وہ آخرت سے بالکل غافل ہیں[2]۔"

[1] یعنی وہ جانتے ہیں امور معاش کو کہ انہیں کیسے حاصل کرنا ہے، تجارت کیسے کرنی ہے اور کھیتی باڑی اور دیگر ایسے طریقے کیا ہیں۔

[2] اور وہ اس آخرت سے جو ہمیشہ رہنے والی ہے وہ بالکل غافل ہیں۔ یعنی اس کا تصور بھی ان کے دلوں میں نہیں کھٹکتا۔ دوسری ہم ضمیر پہلے ہم کی تکریر و تاکید کے لیے ہے۔ یا دوسری ہم ضمیر مبتدا ہے اور غافلون اس کی خبر ہے۔ اور پھر یہ جملہ پہلے کی خبر ہے۔ اور اس میں رابطہ مبتدا کے لفظ کا دوبارہ مذکور ہونا ہے جیسے اَلْحَآقَّةُ ۝ مَا الْحَآقَّةُ ۝ میں ہے۔ اور یہ دونوں ترکیبوں کی بناء پر آخرت سے ان کی غفلت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ جملہ سابقہ جملہ کے مضمون کی تاکید اور اسے پختہ کرنے کے لیے ہے۔ اور یہ لا یعلمون کے قول سے بدل برائے تقریر ہے۔ اور انہیں ان حیوانات سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جن کا ادراک دنیا کی بعض چیزوں کے ظاہر تک محدود ہوتا ہے تمام چیزوں کے بارے انہیں معلومات نہیں ہوتیں۔ کیونکہ ظاہر کے علم سے مراد اشیاء کی حقائق، صفات، خصائص افعال اور اسباب کی پہچان ہے اور اسباب سے چیزوں کے صادر ہونے کی کیفیت اور ان میں تصرف کی کیفیت کی پہچان ہے۔ اسی لیے ظاہراً کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن دنیا کے باطن کا علم، کہ یہ دنیا آخرت کی گزرگاہ ہے، آخرت کے حصول تک پہنچانے والی ہے اور یہ دنیا احوال آخرت کے لیے نمونہ ہے (اس سے تو جانور قطعاً ناواقف ہیں) اور یہ اس کا احساس دلانے کے لیے ہے کہ عدم علم اور اس علم کے درمیان کوئی فرق نہیں جو صرف دنیا کے ظاہر کے ساتھ مختص ہو۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝

"کیا انہوں نے کبھی غور نہیں کیا اپنے جی میں۔ نہیں پیدا فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ ایک مقررہ مدت تک کے لیے[1] اور بلاشبہ اکثر لوگ اپنے رب کی ملاقات کے سخت منکر ہیں[2]۔"

[1] یہ ہمزہ استفہام زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ اور واؤ محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کیا انہوں نے اپنی نظروں کو صرف دنیوی زندگی کے ظاہر تک محدود رکھا اور کبھی بھی غور و فکر نہیں کیا، یعنی انہوں نے دنیا میں غور و فکر کیا ہی نہیں کہ ان کے لیے اس کے باطن کا کچھ حصہ ظاہر ہوتا۔ یا معنی یہ ہے کیا انہوں نے اپنے نفسوں کے بارے میں غور و فکر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ تو کسی اور کی نسبت ان کے زیادہ قریب تھے۔ اور نفس میں غور و فکر کرنے والے کے لیے وہ سب کچھ منکشف ہو جاتا ہے جو کچھ تمام ممکنات میں غور و فکر کرنے والے کے لیے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ انسان عالم صغیر ہے (اور عالم کبیر کے لیے نمونہ ہے)۔ اگر وہ غور و فکر کرتے تو جان لیتے اور یہ کہہ اٹھتے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں باطل، بے کار اور بغیر حکمۃ بالغہ کے پیدا نہیں کیا بلکہ انہیں کامل حکمت اور مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور انہیں ہمیشہ باقی رہنے کے لیے پیدا نہیں کیا بلکہ ایک معینہ مدت تک کے لیے پیدا فرمایا جب وہ مدت مقررہ ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد قیامت قائم ہو جائے گی۔ اور حساب و کتاب اور ثواب و عقاب کا وقت آ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کیا ہے اور بے شک تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے) تو یہ

ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ انہیں واپس لوٹائے بغیر ویسے چھوڑ دینا عبث اور بے کار ہے۔ پس جو بھی آسمانوں، زمین اور ان کے مابین موجود کائنات کے نظام میں غور وفکر کرتا ہے وہ یقیناً یہ فیصلہ دیتا ہے کہ اس نظام کا خالق حکیم اور دانا ہے اور حکیم سے کبھی بھی بے کار اور عبث فعل صادر نہیں ہوتا۔ اور ان کی تخلیق میں حکمت خالق کی ذات وصفات کی پہچان ہے۔ اور اگر قیامت برپا نہ ہو، حشر ونشر نہ ہو اور جزاء وسزا کا تصور نہ ہو تو پھر پہچاننے والا اور کافر مساوی ہو جائیں گے۔ پس جو ان میں غور وفکر کر کے آخرت کے بارے علم حاصل کرتا ہے تو پھر وہ غافلین میں شمار نہیں ہوتا۔

۲؎ اور بلاشبہ اکثر لوگ یعنی کفار مکہ اپنی کند ذہنی اور غور وفکر نہ کرنے کے سبب اپنے رب کی ملاقات کے۔ یعنی دنیا ختم ہو جانے کے وقت اس کی جانب سے جزاء پانے کے سخت منکر ہیں۔ اور وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی ہے نہ قیامت قائم ہوگی اور نہ ہی حساب وکتاب ہوگا۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٩﴾

"کیا انہوں نے سیر وسیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ وہ دیکھتے ۱؎ کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ زیادہ تھے ان سے زور میں ۲؎ اور انہوں نے خوب ہل چلائے زمین میں اور انہوں نے اسے آباد کیا اس سے زیادہ جتنا انہوں نے اسے آباد کیا۔ اور آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر ۳؎ پس نہ تھی اللہ کی یہ شان کہ وہ ان پر ظلم کرتا، بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے رہتے تھے ۴؎"

۱؎ یہ ہمزہ استفہام انکاری اور زجر وتوبیخ کے لیے ہے۔ اور نفی کا انکار اثبات اور تقریر ہوتا ہے۔ اور واؤ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے کیا اہل مکہ اپنے گھروں سے نہیں نکلے اور انہوں نے زمین میں سیر وسیاحت نہیں کی۔ تاکہ وہ دیکھتے یہاں فَيَنظُرُوا جواب نفی میں ہونے کے سبب منصوب ہے۔

۲؎ كَيْفَ كَانَ کی خبر ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اسے مقدم اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس کے لیے صدر کلام کا ہونا ضروری ہے۔ اور پھر یہ مکمل جملہ فَيَنظُرُوا کا مفعول ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ یعنی بے شک انہوں نے اپنے سفروں کے دوران سیر وسیاحت کی ہے اور ان لوگوں کے نشانات کو دیکھا ہے جنہوں نے ان سے قبل اپنے انبیاء ورسل علیہم السلام کو جھٹلایا اور پھر اسی تکذیب کی بناء پر وہ تباہ وبرباد کر دیے گئے۔ وہ زور میں ان سے زیادہ تھے۔ جیسے قوم عاد اور ثمود وغیرہ کیونکہ اُھم مافیه آنے والے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ زور آور، طویل العمر اور کثیر الآثار تھیں۔ یہ جملہ اپنے معطوف سمیت عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ کے جواب میں مستأنفہ ہے۔

۳؎ یہ جملہ اپنے معطوف سمیت كَانُوا پر معطوف ہے۔ یعنی انہوں نے پانی نکالنے اور معدنیات برآمد کرنے کے لیے سطح زمین کو پلٹ دیا اور زراعت اور دیگر امور کے لیے اس میں ہل چلائے۔ اور انہوں نے زمین کو اچھی طرح آباد کیا۔ اس میں اَكْثَرَ محذوف

مصدر کی صفت ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔یعنی عَمَرُوْھَا عِمَارَۃً اَکْثَرَ مِنْ عِمَارَۃِ اَھْلِ مَکَّۃَ اِیَّاھَا۔یعنی انہوں نے زمین کو اہل مکہ کی نسبت زیادہ آباد کیا۔ کیونکہ اہل مکہ وادی غیر ذی زرع میں سکونت پذیر تھے اور کہیں ان کا پھیلاؤ بھی نہیں تھا۔اور اس میں ان پر اس حیثیت سے طعن بھی ہے کہ وہ دنیا پر فریفتہ ہیں اور اس پر فخر کناں ہیں حالانکہ ان کی حالت دنیا میں انتہائی کمزور ہے۔کیونکہ دنیوی ترقی کا دارومدار شہروں میں پھیلنے،لوگوں پر تسلط حاصل کرنے اور زمین کی اطراف واکناف میں آبادی کی مختلف انواع کے ساتھ تصرف کرنے میں ہے۔حالانکہ وہ تو کمزور تھے،ایسی وادی میں پناہ لیے ہوئے تھے جو ان کے لیے نفع بخش نہ تھی۔اور اگر وہ موسم سرما اور گرما میں یمن اور شام کی طرف سفر نہ کرتے اور وہاں سے ساز وسامان نہ لاتے تو بھوک سے مر جاتے۔وَجَآءَتْھُمْ رُسُلُھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ کا عطف کَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْھُمْ قُوَّۃً پر ہے۔

ٰ یہ دو محذوف جملوں پر معطوف ہے۔اور وہ دونوں جَآءَتْھُمْ پر معطوف ہیں۔تقدیر کلام اس طرح ہے ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے انہوں نے انہیں جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں ہی تباہ و برباد کر دیا۔پس اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں تھی کہ وہ ان پر ظلم کرتا۔یعنی ان پر ظلم کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی صفت اور شان نہیں۔لِیَظْلِمَھُمْ میں لام لام الجحود ہے۔اور اس کے بعد اَنْ مقدرہ ہے۔ یعنی مَا کَانَ صِفَۃُ اللّٰہِ اَنْ یَّفْعَلَ بِھِمْ مَّا یَفْعَلُ الظَّلَمَۃُ مِنَ التَّعْذِیْبِ بِغَیْرِ جُرْمٍ وَّلَا تَذْکِیْرٍ۔(یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ ان کے ساتھ ظالموں جیسا سلوک کرتا،یعنی بغیر جرم اور نصیحت کے عذاب دیتا وغیرہ۔) بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے رہتے تھے۔یعنی انہوں نے ایسے افعال کیے جنہوں نے انہیں ہلاکت اور تباہی تک پہنچا دیا۔

ثُمَّ کَانَ عَاقِبَۃَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰۤی اَنْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَکَانُوْا بِھَا یَسْتَھْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾

"آخر کار ان کا انجام ۱؎ جنہوں نے برائی کی تھی ۲؎ بہت برا ہوا ۳؎ کیونکہ انہوں نے جھٹلایا اللہ کی آیتوں کو اور وہ ان کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے ۴؎"

۱؎ دنیا میں ہلاک اور تباہ کرنے کے بعد۔اس کا عطف جملہ مقدرہ پر ہے اور وہ ہے فدمرھم اللّٰہ ثُمَّ۔پس اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ کر دیا اور پھر اہل حجاز اور بصریوں نے عاقبۃ کو کَانَ کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے اور مابعد کلام کَانَ کی خبر ہے۔یا پھر خبر محذوف ہے۔جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے۔اور اہل کوفہ وشام نے اسے کَانَ کی خبر ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔اور اَنْ کَذَّبُوْا کو اس کا اسم قرار دیا ہے۔

۲؎ پھر ان کا انجام جنہوں نے برے اعمال کیے تھے بہت برا ہوا۔اصل عبارت اس طرح تھی ثُمَّ کَانَ عَاقِبَتَھُمْ۔اس میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا تا کہ ان بعض امور پر دلالت ہو جائے جو اس انجام کا تقاضا کرتے ہیں۔

۳؎ السُّوْٓاٰۤی یہ اَسْوَءُ کی مؤنث ہے۔جیسا کہ اَحْسَن کی مؤنث حُسْنٰی ہے۔یعنی ایسی خصلت اور عادت جو انہیں برا بنا دیتی ہے۔یا ایسی سزا جو تمام سزاؤں سے شدید ترین ہے۔یا پھر یہ مصدر ہے جیسا کہ بُشْرٰی۔لہٰذا مبالغہ کے لیے اس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ السُّوْٓاٰۤی جہنم کے ناموں میں سے ایک ہے۔جیسا کہ جنت کے ناموں میں سے ایک نام حُسْنٰی ہے۔

مفعول لہٗ ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ تقدیر عبارت ہے لِاَنْ کَذَّبُوْا (کیونکہ انہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا) اور یہ بھی جائز ہے کہ لسُّوآی سے بدل ہو یا عطف بیان ہو۔ یعنی پھر برائی کرنے والوں کا انجام تکذیب ہوا۔ یعنی ان برے اعمال نے انہیں اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے پر برانگیختہ کیا۔ اور وہ ان کے ساتھ مذاق کرنے لگے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مومن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ داغ نمودار ہو جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لے اور گناہ کو چھوڑ کر رب کریم سے مغفرت طلب کر لے تو اس کا دل صاف شفاف ہو جاتا ہے (یعنی وہ داغ مٹ جاتا ہے) اور اگر وہ اور گناہ کرے تو وہ داغ بھی بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ وہ سارے دل پر پھیل جاتا ہے۔ اور یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کَلَّا بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ اسے احمد، ترمذی اور نسائی وغیرہم نے روایت کیا ہے۔ ترکیب میں یہ بھی جائز ہے کہ اَنْ کَذَّبُوْا اپنے معطوف کے ساتھ مل کر کَانَ کی خبر ہو اور السُّوآی اَسَآءُوْا فعل کا مفعول مطلق یا مفعول بہ ہو۔ اور معنی اس طرح ہو۔ پھر ان گناہ کرنے والوں کا انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر ثبت کر دی یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلا دیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ السُّوآی فعل کا مصدر اور مفعول ہو اور اَنْ کَذَّبُوْا بدل یا عطف بیان ہونے کی وجہ سے اس کا تابع ہو۔ اور ابہام اور تہویل کے لیے خبر محذوف ہو۔ تقدیر کلام اس طرح ہو پھر ان جھٹلانے والوں کا انجام جہنم ہوا اور اس میں ان کے لیے جو عذاب تیار کیا گیا ہے اس کی پہچان نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اَنْ کَذَّبُوْا اِساءۃ (برے اعمال) کی تفسیر ہو۔ اور جب اساءۃ کی تفسیر تکذیب اور استہزاء سے ہوگی تو یہ قول کے معنی کو متضمن ہوگا۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾

"اللہ تعالیٰ ابتداء کرتا ہے تخلیق کی پھر (فنا کرنے کے بعد) دوبارہ پیدا کرے گا اسے۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے [1]"

[1] اللہ تعالیٰ ہی انہیں ابتداء (پہلی بار) پیدا فرماتا ہے۔ پھر وہی مخلوق کو دوبارہ پیدا کرے گا، یعنی موت کے بعد اٹھائے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ پس وہی انہیں ان کے اعمال کی جزاء دے گا۔ ابوبکر نے ترجعون کو یاء کے ساتھ صیغہ غائب کی صورت میں پڑھا ہے۔ کیونکہ ضمیر خلق کی طرف عائد ہے۔ اور باقیوں نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے یعنی یہاں مقصود میں اظہار مبالغہ کے لیے غیب سے خطاب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾

"اور جس روز برپا ہوگی قیامت مجرموں کی آس ٹوٹ جائے گی [1]"

[1] یہ ظرف مابعد فعل کے متعلق ہے۔ اور یہ جملہ اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ پر معطوف ہے۔ قتادہ اور کلبی نے کہا ہے (قیامت قائم ہونے کے دن) مجرم ہر بھلائی سے مایوس ہو جائیں گے۔ مجاہد نے کہا ہے وہ رسوا ہو جائیں گے۔ اور فراء نے کہا ہے ان کا کلام اور دلائل (عذر) منقطع ہو جائیں گے (1)۔ قاموس میں ہے کہ بَلَسَ سے مراد ایسا آدمی ہے جس کے پاس کوئی خیر اور بھلائی نہ ہو۔ اور مُبْلِس وہ شخص ہوتا ہے جو اپنی بات دل میں رکھتے ہوئے خاموش رہے (2)۔ اور اَبْلَسَ کا معنی ہے وہ مایوس ہوا اور حیران و ششدر ہوا۔ اسی سے لفظ ابلیس بھی ہے۔ یا پھر یہ عجمی لفظ ہے۔ اور جزری نے نہایہ میں کہا ہے کہ مُبْلِس سے مراد حزن و ملال اور خوف کے سبب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 169 (التجاریہ)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 734 (التراث العربی)

خاموش رہنے والا آدمی ہے۔ اور ابلاس کا معنی ہے حیران وششدر رہنا۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

''اور نہیں ہوں گے ان کے لیے ان کے شریکوں میں سے شفاعت کرنے والے ۱؎ اور وہ اپنے شریکوں کے منکر ہو جائیں گے ۲؎''

۱؎ اور ان کے لیے ان شریکوں میں سے نہیں ہوں گے جنہیں انہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ عبادت میں شریک ٹھہرایا اور گمان یہ رکھا کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں ہماری شفاعت کریں گے۔ لیکن وہ ان کے لیے شفاعت نہیں کریں گے کہ وہ انہیں اللہ کے عذاب سے بچا لیں گے۔ چونکہ اس واقعہ کا وقوع یقینی ہے اس لیے اسے صیغہ ماضی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

۲؎ اور جس وقت وہ ان کی شفاعت سے ناامید ہو جائیں گے تو اپنے معبودوں کا انکار کر دیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ دنیا میں اپنے ان شریکوں کے سبب اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے تھے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اور جس روز برپا ہوگی قیامت اس دن وہ جدا جدا ہو جائیں گے ۱؎''

۱؎ یہ ظرف اپنے مابعد فعل يَتَفَرَّقُوْنَ کے متعلق ہے۔ اور يَوْمَئِذٍ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ سے بدل ہے یا اس کے لیے تاکید ہے۔ یعنی اس دن جبکہ وہ ناامید ہو جائیں گے اور اپنے شرکاء کا انکار کر دیں گے تو وہ جدا جدا ہو جائیں گے (1)۔ مقاتل نے کہا ہے حساب کے بعد لوگ متفرق ہوں گے اس طرح کہ مؤمنین کو جنت کی طرف اور کفار کو جہنم کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ پھر وہ کبھی بھی جمع نہیں ہو سکیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل اپنے اس قول سے ارشاد فرمائی۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾

''تو وہ جو ایمان لائے تھے اور نیک عمل کرتے رہے تھے۔ وہ باغ (جنت) میں مسرور (اور محترم) ہوں گے ۱؎''

۱؎ پس وہ لوگ جو ایمان لائے تھے اور نیک عمل کرتے رہے تھے وہ جنت کے باغات میں سے نہروں اور پھولوں والی زمین میں ہوں گے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا ان کی انتہائی عزت وتکریم کی جائے گی۔ قتادہؓ نے کہا وہ انتہائی نعمتوں اور عیش میں ہوں گے اور ابوعبیدہؓ نے کہا وہ انتہائی خوش اور مسرور ہوں گے۔ اور الحبرۃ کا معنی ہوتا ہے سرور اور خوشی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر اچھی نعمت کو حبرۃ کہا جاتا ہے۔ اور حسین بنا دینے کو تعبیر کہا جاتا ہے (2)۔ اور علامہ جزری نے نہایہ میں کہا ہے کہ الحَبَرَۃُ حاء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے نعمت اور خوش حال زندگی۔ اور اگر الحِبْرَۃُ حاء کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے حسن وجمال اور اچھی حالت اور کبھی حاء مفتوحہ کے ساتھ بھی یہی معنی ہوتا ہے۔ اور قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ اگر میں یہ جانتا کہ آپ میری قرأت سماعت فرما رہے ہیں تو میں یقیناً آپ کے لیے اس میں تحبیر کرتا۔ یعنی میں اسے مزید اپنی آواز کے ساتھ خوبصورت بناتا (3)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ امام اوزاعیؒ نے یحییٰ بن کثیر کا قول نقل کیا ہے۔ کہ یحبرون جنت میں آسمان کا نام ہے۔ اسی طرح ہنادؒ اور بیہقی نے

بھی یحییٰ بن کثیر سے اس آیت کے ضمن میں نقل کیا ہے۔ اور امام اوزاعیؒ نے کہا ہے جب وہ سماع میں شروع ہوگا تو جنت میں کوئی ایسا درخت باقی نہیں رہے گا جس پر پتے نہ ہوں۔ اور یہ بھی کہا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں حضرت اسرافیل علیہ السلام سے بڑھ کر حسین اور خوبصورت آواز والا اور کوئی نہیں۔ پس جب وہ سماع میں شروع ہوں تو ساتوں آسمانوں میں رہنے والوں کی صلوٰۃ اور تسبیحات منقطع ہو جاتی ہیں(1) اور ابن عسا کر نے اسی آیت کے ضمن میں امام اوزاعیؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ یحبرون سے مراد سماع ہے جب اہل جنت وجد وطرب کا ارادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان ہواؤں کی طرف وحی فرمائے گا جنہیں عفافہ کہا جاتا ہے تو وہ تازہ موتیوں کے بستان میں داخل ہوکر اسے حرکت دیتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر بجتے ہیں جس سے اہل جنت کو وجد وطرب حاصل ہوتا ہے۔ تو یہ طرب میں ہوتے ہیں تو پھر جنت میں کوئی درخت باقی نہیں رہتا جس پر پتے نہ ہوں(2)۔ طبرانی اور بیہقی نے حضرت امامہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی بھی جنت میں داخل ہوگا اس کے سر اور پاؤں کی جانب بیٹھ کر دو حوریں انتہا حسین وجمیل آواز کے ساتھ کچھ گائیں گی جسے انسان اور جنات میں سے کسی نے نہ سنا ہوگا۔ وہ شیطانی کلام نہیں ہوگا بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تحمید وتقدیس ہوگی(3)۔ بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ان سے غناء جنت کے بارے سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کستوری کے رومال ہیں جن پر وہ اللہ تعالیٰ کی ایسی خوبصورت آواز کے ساتھ تسبیح وتحمید بیان کریں گے جس کی مثل آواز کبھی کسی کان نے نہیں سنی۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا میں شعر اور گانے سے لذت وسرور حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں انتہائی موزوں اور حسین آواز میں موزوں کلام کے ساتھ محبوب کا ذکر ہو۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب لوگ جمال الٰہی کے دیدار میں کامیاب ہوں گے اور اس سے بڑھ کر نہ کوئی جمال ہے اور نہ ہی اس کے سوا اور کوئی محبوب ہے۔ تو وہ بالیقین انتہائی خوبصورت اور حسین آواز میں اس کا ذکر سن کر خوش ہوں گے۔ اور بعض احادیث میں ہے کہ غزالہ چشم حوریں اپنے خاوندوں کے لیے ایسی حسین آوازوں میں کچھ گائیں گی جس کی مثل آواز کبھی بھی کسی نے نہیں سنی ہوگی۔ پس جو کچھ وہ گائیں گی اس میں سے بطور نمونہ کچھ یہ ہے

نَحْنُ الْخَيْرَاتُ الْحِسَانُ　　اَزْوَاجُ قَوْمٍ كِرَامٍ

نَحْنُ الْخَالِدَاتُ فَلَا نَمُوْتَنَّ　　نَحْنُ الْاٰمِنَاتُ فَلَا نَخَافَنَّ　　نَحْنُ الْمُقِيْمَاتُ فَلَنْ نَظْعَنَّ

(ہم انتہائی حسین اور اعلیٰ مرتبہ ہیں۔ ہم معزز لوگوں کی بیویاں ہیں۔ ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں، ہم کبھی فوت نہیں ہوں گی، ہم پرامن ہیں ہمیں کوئی خوف نہیں ہوگا۔ ہم مقیم رہنے والیاں ہیں اور کبھی کوچ نہیں کریں گی)۔ طبرانی نے حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور طبرانی بیہقی اور ابن ابی الدنیا میں حضرت انسؓ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور امام احمدؒ نے مالک بن دینار سے الزہد میں یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ داؤد علیہ السلام سے فرمائے گا کہ اپنی خوبصورت اور حسین آواز کے ساتھ میری تسبیح وتحمید بیان کیجئے۔ پس جب داؤد علیہ السلام اپنی آواز کے ساتھ اس میں شروع ہوں گے تو وہ اہل جنت کی نعمتوں پر غالب آجائے گی۔ اصبہانیؒ حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ جنت کے درخت کو حکم دے گا میرے ان بندوں کو میری تسبیح وتقدیس سناؤ جنہوں نے میرے ذکر کی وجہ سے تمام باجوں اور سرنگیوں کو چھوڑے رکھا تو وہ درخت انہیں ایسی حسین آواز میں سنائے گا جس کی مثل آواز مخلوق نے کبھی بھی نہیں سنی ہوگی(4)۔ اس بارے میں بہت سی احادیث ہیں۔ حکیم نے نوادر الاصول میں حضرت ابو موسیٰؓ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 169 (التجاریہ)　　2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 294 (العلمیہ)

3۔ کنز العمال، جلد 14 صفحہ 488 (التراث الاسلامی)　　4۔ کنز العمال، جلد 14 صفحہ 479 (التراث الاسلامی)

روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے گانے کی آواز سنی اسے روحانیین کی آواز سننے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ آپ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ روحانیین کون ہیں؟ فرمایا اہل جنت کے سامنے پڑھنے والے (1)۔ دینوری نے مجاہد سے یہ روایت نقل کی ہے کہ قیامت کے دن ندا دینے والا ندا دے گا۔ بے شک جن لوگوں نے اپنی آوازوں اور اپنے کانوں کو لہو ولعب اور شیطانی مزامیر سے پاک رکھا ہے اللہ تعالیٰ انہیں خوشبودار باغات میں اتاریں گے اور ملائکہ کو فرمائیں گے میرے بندوں کو میری تحمید و تمجید سناؤ۔ اور انہیں یہ اطلاع دے دو کہ ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ انہیں کوئی حزن ہوگا (2)۔ دیلمی نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے بھی اسی طرح مرفوع روایت نقل کی ہے۔

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾

''اور جنہوں نے کفر کیا تھا اور جھٹلایا تھا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو تو وہ عذاب میں حاضر رکھے جائیں گے 1 ''

1 اور جنہوں نے کفر کیا تھا اور ہماری آیتوں اور آخرت یعنی یوم بعث اور قیامت کی ملاقات کو جھٹلایا تھا۔ تو وہ عذاب میں داخل کیے جائیں گے اس سے وہ غائب نہیں ہوسکیں گے۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾

''سو پاکی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو 1 ''

1 یہ فعل محذوف کا مصدر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے فَسَبِّحُوا اللّٰهَ سُبْحَانًا۔ پس اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرو۔ اس میں فعل کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ اور پہلے فاء سببیہ ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی سابقہ صفات ابداء، اعادہ (خالق اور معید) وغیرہ سے یہ نتیجہ ہے۔ اور تسبیح سے مراد نماز ہے یعنی اللہ کے لیے نماز پڑھو۔ جب تم شام میں داخل ہو تو نماز مغرب ادا کرو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے کہ تمہارا دن سلامتی سے گزرا، اس نے طرح طرح کی تمہیں نعمتیں عطا فرمائیں اور راحت و سکون کے لیے رات داخل ہوگئی۔ چونکہ مہینوں اور دنوں میں رات دن سے مقدم ہوتی ہے اس لیے مغرب کی نماز سے اللہ تعالیٰ نے آغاز فرمایا۔ اور جب تم صبح کرو تو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے نماز صبح ادا کرو کہ راحت و سلامتی کے ساتھ رات پایہ تکمیل کو پہنچی اور دنیا و آخرت کی کمائی کے لیے دن کا آغاز ہوگیا۔ چونکہ صبح شام کے بالمقابل ہوتی ہے اس لیے مغرب کے بعد صبح کی نماز کا ذکر فرمایا۔

وَ لَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

''اور اسی کے لیے ساری تعریفیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں نیز (پاکی بیان کرو) سہ پہر کو 1 اور جب تم دوپہر کرتے ہو 2 ''

1 حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تمام آسمانوں اور زمین کے باسی اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید بیان کرتے ہیں اور اس کی عبادت میں

1۔ نوادر الاصول للترمذی صفحہ 154 (صادر) 2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 294 (العلمیہ)

مصروف رہتے ہیں(1)۔ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو لفظ اللہ سے حال ہے یا معترضہ ہے۔

2۔یہ عشی العین سے ماخوذ ہے جب کہ سورج کا نور کم ہو جاتا ہے۔اس کا عطف یُصْبِحُوْنَ پر ہے۔یعنی عصر کی نماز ادا کرو جو کہ صلوٰۃ الوسطیٰ ہے۔چونکہ یہ وقت بازار کے معاملات میں لوگوں کے مصروف و مشغول ہونے کا وقت ہے اس لیے خاص اہتمام کے تحت اس کا ذکر ظہر کی نماز کے ذکر سے پہلے کیا، یعنی تمہارے لیے اس وقت نماز میں مصروف ہونا ضروری ہے جب کہ لوگ دنیوی معاملات میں مصروف ہوتے ہیں۔تا کہ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دیتی ہے۔ اور جب تم دوپہر کے وقت میں داخل ہوتے ہو۔ سورج کی گرمی تم پر غالب آتی ہے اور وہ تمہیں نار جہنم کی گرمی اور قیامت کے دن سورج کی تپش کی یاد دلاتی ہے۔ ان اوقات کو نماز کے لیے اس لیے مخصوص کیا گیا ہے کیونکہ ان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے، اس کی نعمت و احسان کی تجدید ہوتی ہے اور ان میں تنزیہ باری تعالیٰ اور اس کے حمد و شکر کے مستحق ہونے پر واضح شواہد اور روشن دلائل کا ظہور ہوتا ہے۔نتیجۃً زمین و آسمان کے باسی اس کی عبادت میں مصروف ہو کر اس کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازوں میں سے چار کا ذکر فرمایا ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حِیْنَ تُمْسُوْنَ مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کی طرف اشارہ ہے۔ ابن جریر، طبرانی اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت پانچوں نمازوں کی جامع ہے۔ اور حِیْنَ تُمْسُوْنَ مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کی طرف اکٹھا اشارہ ہے۔علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کیا آپ پانچوں نمازوں کا ذکر قرآن کریم میں پاتے ہیں تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جی ہاں۔اور پھر آپ نے یہی دو آیتیں پڑھیں اور فرمایا اس آیت میں پانچوں نمازوں اور ان کے اوقات کا ذکر ہے(2)۔حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی صبح اور شام کے وقت یہ پڑھے گا سُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ سے وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ تک تو اس دن اس سے جو کچھ فوت ہوا اسے وہ پالے گا۔اور جو انہیں شام کے وقت پڑھے گا تو وہ اسے پالے گا جو رات کے وقت اس سے فوت ہو گی(3)۔اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔آپ ﷺ سے یہ بھی مروی ہے جسے یہ بات خوش کرے کہ اس کے لیے پورے پیمانے کے ساتھ ناپ تول کیا جائے (یعنی اسے پورا پورا اجر دیا جائے) تو اسے چاہیے کہ وہ یہ پڑھے فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ الآیہ۔اسے ثعلبی نے انتہائی ضعیف سند کے ساتھ حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دن میں ایک سو مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ کہا تو اس کے گناہ مٹا دیے جائیں گے اگر چہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔متفق علیہ(4)۔آپ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس آدمی نے صبح و شام ایک سو مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ کہا تو قیامت کے دن اس سے افضل عمل کوئی نہیں لائے گا سوائے اس آدمی کے جس نے اسی کی مثل یہ پڑھا یا اس سے زائد پڑھا۔متفق علیہ(5)۔آپؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو کلمے ہیں جو زبان پر انتہائی خفیف یعنی ان کی ادائیگی انتہائی آسان ہے میزان میں انتہائی ثقیل اور وزنی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انتہائی محبوب ہیں۔وہ ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ۔متفق علیہ۔(6)

1۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 170 (التجاریہ)
2۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 170 (التجاریہ)
3۔سنن ابی داؤد صفحہ 692 (نور محمد)
4۔صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 948 (وزارت تعلیم)
5۔صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 344 (قدیمی)
6۔صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 948 (وزارت تعلیم)

حضرت جویریہ بنت حارث بن ابی ضرارؓ سے روایت ہے (ان کا نام برہ تھا) ایک صبح حضور نبی کریم ﷺ ان کے پاس سے نکلے اور یہ مسجد میں تھیں۔ پھر خوب دن چڑھنے کے بعد آپ واپس تشریف لائے اور فرمایا میرے نکلنے کے بعد سے لے کر اب تک اسی جگہ بیٹھی ہو؟ انہوں نے عرض کی جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تو تجھ سے جانے کے بعد چار کلمات تین مرتبہ کہے ہیں، اگر تیرے کلمات کے ساتھ ان کا موازنہ کیا جائے تو وہ ان سے وزنی ہوں گے۔ وہ کلمات یہ ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَرِضَاءَ نَفْسِهٖ وَزِنَةَ عَرْشِهٖ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ افضل ترین کلام چار کلمات ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ اور ایک روایت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پسندیدہ کلام چار کلمات ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ ان میں سے جس سے بھی تم نے آغاز کیا تمہارے لیے باعث ضرر نہیں ہوگا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کون سا کلام افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کے لیے پسند فرمایا۔ اور وہ ہے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔ اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهٖ کہا اس کے لیے کھجور کا ایک درخت جنت میں لگا دیا گیا۔ اسے ترمذیؒ نے روایت کیا ہے(4)۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾

"نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد[1] اور یونہی (قبروں سے) تمہیں نکالا جائے گا[2]"

[1] جیسے انسان کو نطفہ سے اور پرندے کو انڈے سے۔ اور نطفہ اور انڈے کو حیوان (جاندار) سے۔ یا اس کا معنی ہے وہ حیات کو موت کے پیچھے اور اس کے برعکس موت کو حیات کے پیچھے لاتا ہے۔ اور وہ زندہ کرتا ہے زمین کو نباتات کے ساتھ اس کے مردہ یعنی خشک ہونے کے بعد۔

[2] اسی طرح تمہیں بھی اپنی قبروں سے موت کے بعد زندہ کر کے نکالا جائے گا۔ پس تم زندہ کرنے کی اس طرح کی مثالوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد پھر اس کا انکار کیوں کرتے ہو؟ پس یہی موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کی علت اور دلیل ہے۔ حمزہ اور کسائی نے اسے صیغہ معروف ہونے کی بناء پر تاء کو مفتوح اور راء کو مضموم پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے مجہول کی بناء پر تاء کو مضموم اور راء کو مفتوح پڑھا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾

"اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے (ایک یہ) ہے کہ اس نے پیدا کیا تمہیں مٹی سے[1] پھر تم اچانک بشر بن کر (زمین میں) پھیل رہے ہو[2]"

1۔ مشکاۃ المصابیح صفحہ 200 (قدیمی)
2۔ مشکاۃ المصابیح، جلد 2 صفحہ 24 (الفکر)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 351 (قدیمی)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 184 (وزارت تعلیم)

۱؎ قیامت برپا کرنے پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری اصل یعنی آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔

۲؎ اس میں اذامفاجاتیہ جملہ کی طرف مضاف ہے اور اس میں عامل معنی مفاجات ہے۔ اور معنی یہ ہے پھر تم اچانک بشر ہو کر (آدمی بن کر) زمین میں پھیل رہے ہو جبکہ اس سے قبل تم بے حس وحرکت جماد (مٹی) تھے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْۤا اِلَیْہَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

"اور اس کی (قدرت کی) ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے پیدا فرمائیں تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں ۱؎ تاکہ تم سکون حاصل کرو ان سے ۲؎ اور پیدا فرمادیئے تمہارے درمیان محبت اور رحمت (کے جذبات) ۳؎ بے شک اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں ۴؎"

۱؎ اس میں مِنْ ابتدائیہ ہے۔ کیونکہ حضرت مائی حواء علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ پھر تمام عورتوں کو مردوں کے نطفہ سے پیدا کیا گیا۔ یا یہ مِن بیانیہ ہے کیونکہ عورتیں مردوں کی جنس سے ہی ہیں نہ کہ کسی دوسری جنس سے۔

۲؎ تاکہ تم ان کی طرف مائل ہو اور ان کے لیے الفت پیدا کرو۔ کیونکہ ہم جنس ہونا باہم محبت و پیار اور ایک دوسرے میں ضم ہونے کی علت ہے اور جنس کا مختلف ہونا باہم نفرت کا سبب ہے۔

۳؎ اور مردوں اور عورتوں کے درمیان یا ایک جنس کے افراد کے درمیان پیدا فرمادیے از دواجی تعلقات کے واسطہ سے محبت ورحمت کے جذبات جب بھی منفی خواہشات کا غلبہ ہوتا کہ امور معاش منظم رہیں۔ بخلاف دیگر حیوانات کے کہ ان میں ایسے جذبات نہیں پائے جاتے۔ یا پھر اس لیے کہ انسانی زندگی کی خوش حالی باہمی تعاون پر موقوف ہے اور تعاون باہم ایک دوسرے سے محبت اور رحم کرنے کے جذبات کا محتاج ہوتا ہے (اس لیے مردوں اور عورتوں کے درمیان محبت ورحمت کے جذبات پیدا کردیے)۔

۴؎ بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت میں غور فکر کرتے ہیں وہ جانتے ہیں اس میں جو حکمتیں ہیں اور جس طرح سلسلہ تناسل جاری ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ﴿۲۲﴾

"اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق ہے نیز تمہاری زبانوں ۱؎ اور رنگوں کا اختلاف ۲؎ بے شک اس میں بھی نشانیاں ہیں اہل علم کے لیے ۳؎"

۱؎ یعنی تمہاری زبانوں (لغتوں) کے اختلاف۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے صنف اور قوم کو علیحدہ زبان سکھا دی، اس کے بارے الفاظ اس کے ذہن میں القاء کردیے اور اس کے بولنے پر اسے قادر کردیا۔ یا پھر زبانوں کے اختلاف سے مراد ہے تمہارے بولنے کی مختلف اجناس واشکال اور تمہاری آوازوں کی کیفیات کا مختلف ہونا اس طرح کہ کسی کی آواز دوسرے سے ملتبس نہیں ہوتی (یعنی ان کے مابین

اشتباہ نہیں ہوتا)۔

۲؎ اور جلد کے رنگوں کا اختلاف ہے مثلاً سیاہ ہونا، سفید ہونا وغیرہ یا اس سے مراد ہے اعضاء کے تشخص، ہیئت، رنگ اور حلیہ میں اس طرح مختلف ہونا کہ کلی طور پر کسی کی دوسرے سے مشابہت نہیں ہوتی۔

۳؎ بے شک اس میں اہل علم کے لیے نشانیاں ہیں جو کہ کسی ذی عقل پر مخفی نہیں ہیں چاہے وہ فرشتہ ہو، انسان ہو یا جن۔ حفص نے لِلْعٰلِمِیْنَ میں لام کو مکسور پڑھا ہے۔ اور اہل علم کا خصوصی ذکر اس لیے فرمایا کیونکہ یہ معرفت اور پہچان کا زیادہ حق رکھتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا سونا رات کے وقت اور دن کے وقت اور تمہارا تلاش کرنا اس کے فضل کو ۱؎ بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں ۲؎''

۱؎ اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا دونوں زمانوں (رات اور دن) میں قوائے نفسانیہ کو راحت پہنچانے کے لیے اور قوائے طبعیہ کو قوت دینے کے لیے سونا ہے۔ دونوں زمانوں (رات اور دن) میں اس کے فضل میں سے تمہارا معاش و معاد کو تلاش کرنا ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے تمہارا رات کو سونا اور دن کو اللہ کا فضل تلاش کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔ پس دو فعلوں کو دو حروف عطف کے ساتھ دو اوقات کے ساتھ ملا دیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اگرچہ دونوں اوقات میں سے ہر ایک ایک فعل کے ساتھ مختص ہے لیکن ضرورت کے وقت وہ دوسرے فعل کی بھی صلاحیت رکھتا ہے (یعنی اصلاً رات سونے کے لیے اور دن کام کے لیے ہے لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رات کو کام کر لیا جائے اور دن کو سویا جائے)۔ اس کی تائید ان تمام آیات سے ہوتی ہے جو اس بارے میں وارد ہیں۔

۲؎ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فہم و بصیرت کے کانوں سے سنتے ہیں۔ کیونکہ اس میں حکمت ظاہر اور واضح ہے۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾

''اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ دکھاتا ہے تمہیں بجلی ۱؎ ڈرانے اور امید دلانے کے لیے ۲؎ اور اتارتا ہے آسمان سے پانی اور زندہ کرتا ہے اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقلمند ہیں ۳؎''

۱؎ فعل سے پہلے یا تو اَن مقدر ہے یا پھر فعل قائم مقام مصدر کے ہے۔ جیسے اس قول میں تَسْمَعُ بِالْمُعَيْدِيِّ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ تَرَاهُ یا یہ موصوف محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر عبارت ہوگی اٰيَةٌ يُرِيْكُمْ بِهَا الْبَرْقَ۔

۲؎ بجلی کی کڑک سے اور حالت سفر میں ڈرانے کے لیے۔ اور بارش کی امید دلانے کے لیے جبکہ تم اپنے گھروں میں ہو۔ یہ دونوں (خَوْفًا وَّ طَمَعًا) اس فعل کی علت ہونے کی بناء پر منصوب ہیں جسے فعل مذکور مستلزم ہے۔ کیونکہ انہیں دکھانا ان کے بجلی کی طرف خوف

اور امید کے لیے دیکھنے کو مستلزم ہے۔ یا یہ فعل مذکور کی علت ہیں۔ اس صورت میں مضاف محذوف ہوگا، یعنی لارادۃ خوف و طمع۔ یا خوف اور طمع اخافہ اور اطماع (ڈرانا اور امید دلانا) کی تاویل میں ہے۔ تیرا یہ قول ہے فَعَلْتُهُ رَغْمًا لِلشَّيْطَانِ۔ یا یہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہیں جیسے یہ قول۔ کلمته شفاها۔

۳؎ اور آسمان سے بارش اتارتا ہے۔ اور نباتات کے سبب زمین کو زندہ کرتا ہے۔ اس کی موت (خشک ہونے) کے بعد یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل مند ہیں، یعنی وہ اپنی عقلوں کو استعمال کرتے ہیں اور صانع کمال قدرت اور حکمت کا ادراک کر لیتے ہیں۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖۗ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾

''اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ قائم ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے ۱؎ پھر جب بلائے گا تمہیں زمین سے تو تم فوراً باہر نکل آؤ گے ۲؎''

۱؎ اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ آسمان اور زمین اپنے حیز میں اس کے حکم سے باقی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے انہیں قائم رکھنے اور انہیں باقی رکھنے کا ارادہ کرنے کے سبب وہ باقی ہیں۔

۲؎ پھر جب تمہیں بلائے گا زمین سے تو تم فوراً باہر نکل آؤ گے۔ یہ جملہ بتاویل مفرد ہو کر اَنْ تَقُوْمَ پر معطوف ہے۔ گویا یہ کہا ہے اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں و زمین کا قائم ہونا پھر تمہارا قبروں سے نکلنا جب کہ وہ تمہیں ایک ہی بار بلائے گا۔ اس میں ثُمَّ یا تو تراخی زمانہ کے لیے ہے یا پھر قیامت کی عظمت و شان کو بیان کرنے کے لیے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک مِّنَ الْاَرْضِ تَخْرُجُوْنَ کے متعلق ہے(1)۔ لیکن علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ جائز نہیں کیونکہ اِذَا کا مابعد فعل اس کے ماقبل میں عامل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے یہ دَعَاكُمْ کے متعلق ہوگا (یعنی جب اللہ تم کو زمین سے بلائے گا)۔ جیسا کہ یہ قول ہے۔ دَعَوْتُهٗ مِنْ اَسْفَلِ الْوَادِیْ (میں نے اسے وادی کی نچلی طرف سے بلایا)(2)۔ ابن عساکر نے زید بن جابر شافعی سے ارشاد باری تعالیٰ وَاسْتَمِعْ یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ کے ضمن میں نقل کیا ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام صخرۃ بیت المقدس (بیت المقدس میں موجود خاص پتھر) پر کھڑے ہو کر یہ آواز لگائیں گے اے بوسیدہ ہڈیو! پھٹی ہوئی جلد و اور کٹے ہوئے بالو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم ارشاد فرما رہا ہے کہ حساب و کتاب کے فیصلے کے لیے جمع ہو جاؤ۔ دوسرا اِذَا مفاجات کے لیے ہے۔ اسی لیے پہلے کے جواب میں قائم مقام فاء کے ہے۔ ترکیب کلام میں یہ ظرف ہے اور جملہ کی طرف مضاف ہے اور اس میں عامل مفاجات کا معنی ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے فَفَاجَاْتُمْ وَقْتَ خُرُوْجِكُمْ (یعنی تم اچانک اس وقت نکل آؤ گے)۔

وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾

''اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کے تابع فرمان ہیں ۱؎''

۱؎ اور اسی کی ملکیت اور مخلوق ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ ان میں سے ہر ایک اسی کا تابع فرمان ہے۔ کلبی نے کہا ہے کہ یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 171 (التجاریۃ)　　2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7 صفحہ 386 (العلمیۃ)

ان میں سے مطیع اور فرمانبرداروں کے ساتھ خاص ہے(1)۔لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ عام ہے اور اللہ تعالیٰ کے قہار اور غالب ہونے کا بیان ہے۔ اور اس سے مراد امور تکوینیہ میں اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرنا ہے۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ ہر کوئی موت وحیات اور قیامت کے دن اٹھنے وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کا مطیع وفرمانبردار ہے۔اگر چہ وہ عبادت میں نافرمان ہی ہو۔(2)

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهٗ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۚ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٢٧﴾

''اور وہی ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے پھر (فناء کرنے کے بعد) اسے دوبارہ بنائے گا اور یہ آسان تر ہے 1۔ اور اسی کے لیے برتر شان ہے 2۔ آسمانوں اور زمین میں 3۔ اور وہی سب پر غالب حکمت والا ہے 4۔''

1۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عکرمہؓ سے نقل کیا ہے کہ کفار کو مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر تعجب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَهُوَ الَّذِي يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهٗ(3) اور وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے پھر فنا کرنے کے بعد اسے دوبارہ بنائے گا۔ھُو ضمیر خبر کے مذکر کی وجہ سے مذکر ذکر کی گئی ہے یا اعادہ بمعنی ان يُعِيدَ ہے اور أَهْوَنُ عَلَيْهِ مکمل جملہ يُعِيدُ کے فاعل سے حال ہے یا سابقہ کلام پر معطوف ہے۔ ربیع بن خیثم، حسن، قتادہ اور کلبی نے کہا ہے اھون بمعنی ھین ہے۔ (آسان ہونا) اور اللہ تعالیٰ پر کوئی شے بھی غالب اور مشکل نہیں۔ اور افعل اسم تفضیل کا وزن فَعِيلٌ صفت مشبہ کے معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔حضرت ابن عباسؓ سے بھی عوفی نے اسی طرح روایت کیا ہے(4)۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا ہے یہاں اَھْوَنُ ضرب المثل کے انداز میں استعمال ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر دوبارہ اٹھانا آسان تر ہے اور یہ بات تمہاری عقلوں میں بھی آنے والی ہے کیونکہ لوگوں کی عقول کے مطابق بھی دوبارہ اٹھانا پہلی بار پیدا کرنے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اس پر یہ کام تمہارے نزدیک زیادہ آسان ہے۔ اور بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ مخلوق پر دوبارہ اٹھنا زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ وہ ایک ہی چیخ کے ساتھ دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں گے اور یہ ان پر اس کی نسبت آسان تر ہے کہ وہ نطفہ ہوں پھر علقہ اور پھر مضغہ اور اس کے بعد وہ مرد یا عورت ہو کر ظاہر ہوں۔ یہی معنی ہے اس روایت کا جو حیان نے اور کلبی نے ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے۔(5)

2۔ اس کی شان اتنی بلند اور وصف اتنا اعلیٰ ہے کہ کسی غیر کے لیے نہ تو اس کے مساوی شان ہے اور نہ اس کے قریب تر۔ جیسا کہ قدرت کاملہ اور حکمت تامہ وغیرہ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ شان اتنی بلند ہے کہ اس کی مثل اور کوئی شان نہیں(6)۔ عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ حضرت قتادہؓ نے قول باری تعالیٰ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ کے بارے کہا کہ اس سے مراد لا الٰہ الا اللّٰہ کی شہادت ہے(7)۔ میں کہتا ہوں کہ مثل الاعلیٰ سے مراد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے۔

3۔ یعنی ہر وہ شے جو زمین وآسمان میں ہے وہ اسی کی صفت بیان کرتی ہے، زبان قال سے بھی اور زبان حال سے بھی۔

اور وہی سب پر غالب ہے، یعنی وہ اپنی ملکیت اور خلاقیت میں غالب ہے اور ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ کوئی شے بھی اسے پہلی بار پیدا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 171 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 171 (التجاریۃ)
3۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 297 (العلمیۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 171 (التجاریۃ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 171 (التجاریۃ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 172 (التجاریۃ)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 172 (التجاریۃ)

کرنے اور دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز نہیں کر سکتی۔ اور حکمت والا ہے۔ یعنی جیسے اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے ویسے وہ افعال کرتا ہے۔ طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ مشرکین یہ تلبیہ کہا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَتْ۔ (اے اللہ میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اس شریک کے جسے تو نے شریک کر لیا ہے تو اس کا مالک ہے وہ تیرا مالک نہیں) تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾

''اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لیے ایک مثال تمہارے ہی حالات میں سے (یہ بتاؤ) کیا تمہارے غلام تمہارے حصہ دار ہوتے ہیں اس مال میں جو ہم نے تم کو عطا فرمایا ہے یوں کہ تم (اور وہ) اس میں برابر کے حصہ دار بن جاؤ۔ حتیٰ کہ تم ڈرنے لگو ان سے جیسے تم ڈرتے ہو آپس میں ایک دوسرے سے۔ یوں ہم کھول کر بیان کرتے ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لیے جو عقلمند ہے لے''

لے اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے۔ تمہارے لیے اے مشرکو! ایک مثال جو تمہارے ہی احوال سے اخذ کی گئی ہے۔ کیونکہ وہ تمہارے امور کے ہی قریب تر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تم بتاؤ کیا تمہارے غلام تمہارے حصہ دار ہوتے ہیں اس مال وغیرہ میں جو ہم نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔ پس تم اور وہ اس میں ملکیت اور تصرف کے اعتبار سے برابر ہوتے ہو کہ وہ بھی اس میں ایسے ہی تصرف کر سکتے ہیں جیسے تم؟ حتیٰ کہ تم ان کے بغیر اس میں تصرف کرنے سے ڈرنے لگو جیسے تم آپس میں ایسے لوگوں سے ڈرتے ہو جو تمہاری مثل آزاد ہیں۔ یہ استفہام برائے انکار ہے یعنی معاملہ اس طرح نہیں۔ اور بے شک یہ تمہارے لیے باعث عار ہے اس کے باوجود کہ وہ تمہاری مثل بشر ہیں تو پھر تم یہ کیسے جائز قرار دیتے ہو کہ وہ پتھر جو تمام مخلوقات میں سے عاجز ترین مخلوق ہیں وہ اس اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہوں جو زمین و آسمان کا خالق ہے۔ اسی تفصیل کی مثل مفصل نشانیاں ہم بیان کرتے ہیں کیونکہ تمثیل معانی کو ظاہر کرتی ہے اور ان کی وضاحت کرتی ہے۔ اس قوم کے لیے جو امثال میں غور و فکر کرنے کے لیے اپنی عقلیں استعمال کرتی ہے۔ آیت کے سبب نزول میں طبرانی کی مثل جویبر نے بھی ایک روایت اس سند سے نقل کی ہے۔ عن داؤد بن ابی هند عن ابی جعفر محمد بن علی عن أبيه عليهم السلام۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۹﴾

''بلکہ پیروی کرتے رہے ظالم اپنی (نفسانی) خواہشات کی لے بغیر کسی دلیل کے پس کون ہدایت دے سکتا ہے ۲ے جسے (پیہم نافرمانی کے باعث) اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے۔ اور ان لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ۳ے''

لے اس میں سابقہ کلام کے مضمون سے اضراب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے

1۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 12 صفحہ 198 (العلوم والحکم)

رہے۔ جنہوں نے اپنے اپنے نفسوں پر ظلم کیا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا کر اپنے نفسوں کو عذاب کے لیے پیش کیا۔

۲؎ یہ اتبعوا کے فاعل سے حال ہے، یعنی درآنحالیکہ وہ ان سے جاہل تھے جنہیں جاننا ان پر واجب تھا۔ پس کون اسے ہدایت دے سکتا ہے۔ فَمَنْ یَّهْدِیْ میں فاء سببیہ ہے اور استفہام انکاری ہے۔ یعنی جب انہوں نے اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو قبول نہ کیا تو پھر کوئی بھی انہیں ہدایت نہیں دے سکتا۔

۳؎ اس میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں گمراہ کیا ہے۔ پس کون ہے جو ان کی ہدایت پر اب قادر ہو سکتا ہے؟ اور ان لوگوں کا کوئی مددگار نہیں جو انہیں ان آفات سے نجات دلائے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

”پس آپ کرلیں اپنا رخ (دین) اسلام کی طرف پوری یکسوئی سے ۱؎ (مضبوطی سے پکڑ لو) اللہ کے دین کو جس کے مطابق اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا ہے ۲؎ کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا اللہ کی تخلیق میں ۳؎ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ۴؎“

۱؎ یہ فاء سببیہ ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ثابت ہو گئی اور یہ ظاہر ہو گیا کہ مشرکین نے جہالت کے سبب اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے تو آپ خالص طور پر پوری یکسوئی سے اپنا رخ دین اسلام کی طرف کرلیں۔ یعنی کسی اور کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اسلام کی طرف مائل ہوتے ہوئے اور اس پر استقامت اختیار کرتے ہوئے۔

۲؎ یہ اغراء کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی فطرت یعنی دین اسلام کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ اور مفسرین کی جماعت نے کہا ہے (1)۔ آیت میں خطاب حضور نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے تابع ہونے کی وجہ سے آپ کی امت کو ہے۔ پس یہ آیت سابقہ کلام کی تاکید یا تفسیر کے قائم مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فطرت کا نام دیا ہے کیونکہ یہ ساری مخلوق کو لازم ہے جیسا کہ اس پر یہ ارشاد گرامی دلالت کرتا ہے اَلَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا یعنی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا فرمایا اور ان میں دین کی استعداد اور اس کے ادراک کی قدرت رکھ دی۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد عہد ہے جو آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت سے لیا گیا، یعنی اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰی (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو تمام نے جواب دیا کیوں نہیں (تو ہی ہمارا رب ہے)۔ ان علماء نے کہا ہے کہ اس عالم میں پیدا ہونے والا ہر بچہ اسی اقرار پر پیدا ہوتا ہے اور وہ اقرار ہی وہ حنیفیت ہے جس پر خلقت واقع ہوتی ہے۔ سورۂ اعراف میں اس آیت کی تفسیر میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر بچہ فطرت پر ہی پیدا کیا جاتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں جیسا کہ ایک چوپایہ صحیح سالم چوپائے کو جنم دیتا ہے کیا تم اس میں کوئی ناک کٹا پاتے ہو پھر آپ ﷺ نے یہ آیت طیبہ تلاوت فرمائی فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔ متفق علیہ (2)۔ یعنی ہر بچہ ابتداً فطرت سلیمہ اور ایسی طبیعت پر پیدا کیا جاتا ہے جسے حق کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ پس اگر اسے اسی فطرت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ بالیقین اسی فطرت پر برقرار رہے کیونکہ اس دین کا حسن عقول سلیمہ میں انتہائی مضبوطی کے

ساتھ مذکور ہے اور اس سے اعراض وہی کر سکتا ہے جو بیرونی آفات میں سے کسی آفت (سبب) کے سبب اس سے اعراض کرے گا مثلاً اپنے آباؤ اجداد کی تقلید و پیروی وغیرہ۔ ارشاد گرامی ہے لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔

یہ اس میں ظرف مستقر خبر ہے اور جملہ خبریہ نہی کے معنی میں ہے۔ یعنی تم اللہ کے دین کو تبدیل نہ کرو۔ مجاہد اور ابراہیم نخعی نے کہا ہے اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لو، اس کی اتباع کرو اور توحید کو شرک سے نہ بدلو(1)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فِطْرَةَ اللّٰهِ اس فعل کا مفعول مطلق ہونے کی بناء پر منصوب ہے جس پر اس کا مابعد دلالت کر رہا ہے۔ یعنی فَطَرَ اللّٰهُ النَّاسَ فِطْرَةَ الَّتِیْ فَطَرَهُمْ عَلَيْهَا (اللہ تعالیٰ نے لوگوں میں وہی فطرت رکھی ہے جس پر اس نے انہیں پیدا فرمایا ہے)۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے حدیث كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ کا معنی اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ہر بچے کو سعادت وشقاوت (خوش بختی اور بدنصیبی) میں اس فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے جس پر وہ علم الٰہی میں ہے۔ اور ان میں ہر ایک اپنے انجام کے لحاظ سے اس فطرت تک پہنچ جاتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا ہے اور وہ دنیا میں ایسے عمل کرتا ہے جو اس کی فطرت کے مشابہ ہوتے ہیں(2)۔ اس بناء پر قول باری تعالیٰ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کا معنی یہ ہوگا کہ سعادت وشقاوت میں سے جس فطرت پر انسان کو پیدا کیا جاتا ہے وہ تبدیل نہیں ہوتی۔ پس کوئی بدبخت سعادت مند نہیں بنتا اور کوئی سعادت مند شقی نہیں ہوتا۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ صادق ومصدوق رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیث بیان فرمائی کہ بے شک تم میں سے ہر ایک کی تخلیق کے لیے چالیس دن تک نطفہ رحم مادر میں جمع رہتا ہے۔ پھر وہ اتنے ہی دن جمے ہوئے خون کی صورت میں رہتا ہے۔ پھر اتنی ہی مدت کے لیے گوشت کے لوتھڑے کی صورت اختیار کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار کلمات کے ساتھ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے۔ پس وہ فرشتہ اس کا عمل، عمر، رزق اور سعادت یا شقاوت لکھ دیتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں تم میں سے ایک آدمی اہل جنت کے اعمال کی مثل عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ جنت اور اس کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر اس کی لکھی ہوئی تقدیر غالب آجاتی ہے۔ پس اس سے اہل نار کا عمل سرزد ہو جاتا ہے اور وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور ایک آدمی اہل نار کے اعمال کی مثل عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جہنم اور اس کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر لکھی ہوئی تقدیر غالب آجاتی ہے۔ پس وہ اہل جنت کے اعمال کی مثل عمل کرنے لگ جاتا ہے۔ نتیجۃً جنت میں داخل ہو جاتا ہے (متفق علیہ)(3)۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھ کر یہ مذاکرہ کر رہے تھے کیا ہوگا تو آپ ﷺ نے فرمایا جب تم یہ سنو کہ پہاڑ نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے تو اس کی تصدیق کر لو اور جب کسی آدمی کے بارے یہ سنو کہ وہ اپنی فطرت سے بدل گیا ہے تو اس کی تصدیق نہ کرو کیونکہ وہ ہمیشہ اسی فطرت پر رہتا ہے جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے۔ اسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے(4)۔ اس تاویل کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو ایسی فطرت پر پیدا کیا ہے جس سے وہ تبدیل نہیں ہوگا۔ تحقیق آپ اور آپ کے ساتھی فطرۃ سعادت مند ہیں۔ پس تم اپنا رخ دین کی طرف کر لو۔ اس اعتبار سے فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ سابقہ کلام کی علت بیان کرنے اور اخلاص کی تشجیع وترغیب دینے کے لیے ہے۔ اس تاویل کے مطابق یہ بھی جائز ہے کہ فِطْرَةَ اللّٰهِ اس تقدیر کی بناء پر منصوب ہو۔ مُلْتَزِمِیْنَ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَكُمْ عَلَيْهَا ضمیر کی جگہ پر لفظ الناس کو ظاہر رکھا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ تمام کے تمام لوگ ایک فطرت پر پیدا کیے گئے ہیں جسے وہ چھوڑ نہیں سکتے۔ لہٰذا تم اپنے رخ دین کی طرف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 173 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 173 (التجاریہ)

3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 469 (وزارت تعلیم)　4۔ [illegible] جلد 6 صفحہ 469 (وزارت تعلیم)

سیدھے کرلو۔ عکرمہ اور مجاہد نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو نہ بدلو سے مراد یہ ہے کہ تم جانوروں کو خصی نہ کرو۔(1)

ؔ یہ اشارہ اس دین کی طرف ہے جسے قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا یہ اشارہ فطرت کی طرف ہے۔ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ پہلی تاویل کے مطابق معنی یہ ہے، یہی سیدھا دین ہے، یعنی یہ ایسا دین مستقیم ہے جس میں کوئی کجی نہیں لیکن اکثر لوگ یعنی کفار مکہ نہیں جانتے کہ یہ دین مستقیم ہے کیونکہ وہ غور وفکر ہی نہیں کرتے۔

مُنِیْبِیْنَ اِلَیْهِ وَ اتَّقُوْهُ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۳۱﴾

''(اے غلامانِ مصطفیٰ ﷺ تم بھی اپنا رخ اسلام کی طرف بدلو۔) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے ۱؎ اور ڈرو اس سے اور قائم کرو نماز کو اور نہ ہو جاؤ ان (مشرکین) میں سے''

۱؎ یہ اَنَابَ سے ماخوذ ہے۔ معنی یہ ہے یکے بعد دیگرے (بار بار) رجوع کرتے ہوئے اور بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے غیروں سے اللہ کی طرف کٹتے ہوئے۔ یہ النِاب سے ماخوذ ہے۔ اور یہ فعل مقدر کے سبب منصوب ہے۔ اور وہ فعل تکُوْنُوْا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ لَا تَكُوْنُوْا اس پر معطوف ہے۔ یا پھر یہ الزموا یا ملتزلِیْنَ کی ضمیر سے حال ہے۔ اور یہ فطرۃَ اللّٰہ کو نصب دینے والے افعال مقدرہ ہیں۔ یا پھر اَقِمْ کی ضمیر سے حال ہے۔ کیونکہ اس آیت میں خطاب رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کو ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کے لیے آیت کا آغاز آپ کے خطاب سے کیا گیا جیسا کہ اس ارشاد میں ہے یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ۔ اس مفہوم پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے وَ اتَّقُوْهُ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔

مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾

''جنہوں نے پارہ پارہ کر دیا اپنے دین کو اور خود گروہ گروہ ہو گئے ۱؎ ہر گروہ جو اس کے پاس ہے اسی پر خوش ہے ۲؎ ''

۱؎ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ یہ مشرکین سے بدل ہے۔ یعنی وہ مشرکین پارہ پارہ ہو گئے اور اپنی خواہشات مختلف ہونے کی بناء پر مختلف معبودوں کی عبادت کرنے لگے۔ حمزہ اور کسائی نے اسے فَارَقُوا پڑھا ہے، یعنی انہوں نے اس دین کو چھوڑ دیا، جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ اور خود گروہ گروہ ہو گئے۔ اور ہر گروہ نے اپنے لیے اسے امام بنا لیا جس نے ان کے لیے کوئی دین ایجاد کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ ان سے مراد اس امت کے اہل بدعت ہیں کہ انہوں نے دین ترک کر دیا اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کی۔ اور ان کے لیے مشرکین کا لفظ اس لیے استعمال کیا کیونکہ یہ ان میں سے ہیں جنہوں نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، ایک کے سوا باقی تمام جہنم میں ہوں گے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ وہ ایک کون سا فرقہ ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ وہ فرقہ جو اس طریقہ پر ہو گا جس پر میں اور میرے صحابہ کرام ہیں۔ رواہ الترمذی۔(2)

۲؎ ان میں سے ہر گروہ اپنے اعتقاد کے ساتھ خوش ہے اس گمان کے ساتھ کہ وہی حق پر ہے۔ دارمی نے ابراہیم بن اسحاق سے اور انہوں نے ابن مبارک کے واسطہ سے امام اوزاعیؒ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ابلیس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کون سی شے کے سبب بنی آدم کے پاس پہنچتے ہو؟ انہوں نے کہا ہر شے سے اس کو بہکا سکتے ہیں۔ تو اس نے کہا کیا تم استغفار کے راستے سے بھی ان کے پاس

پہنچتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا یہ بہت بعید شے ہے کیونکہ یہ توحید کے ساتھ ملی ہوئی ہے تو اس نے کہا۔ میں بالیقین ان میں ایسی شے پھیلا دوں گا جس سے وہ استغفار بھی نہیں کریں گے۔ راوی نے فرمایا پس شیطان نے لوگوں میں خواہش نفس کی پیروی کو عام کر دیا۔

وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِیْبِیْنَ اِلَیْهِ ثُمَّ اِذَاۤ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ یُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

''اور جب پہنچتی ہے لوگوں کو کوئی تکلیف تو پکارنے لگتے ہیں اپنے رب کو رجوع کرتے ہوئے اس کی طرف پھر جب ان کو (ان کی فریاد قبول فرما کر) چکھاتا ہے رحمت اپنی جناب سے تو یکا یک ایک گروہ ان میں سے اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے[1]''

[1] اور جب پہنچتی ہے لوگوں یعنی کفار مکہ کو کوئی مصیبت اور قحط تو اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہوئے اسے پکارنے لگتے ہیں اور ایسے وقت میں اس کے سوا کسی کو بھی نہیں پکارتے۔ پھر جب رب کریم ان کی فریاد قبول کرتے ہوئے انہیں اپنی رحمت عطا فرماتا ہے یعنی مصیبت اور تکلیف سے انہیں نجات اور رہائی عطا فرماتا ہے یا انہیں خوشحالی (سبزہ شادابی) اور رحمت عطا کرتا ہے۔ تو انہی میں سے ایک گروہ اپنے اسی رب کے ساتھ شریک ٹھہرا لیتا ہے جس نے انہیں عافیت عطا فرمائی اور وہ اس نجات اور عافیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کی طرف کرنے لگتے ہیں۔ حضرت زید بن خالد جُہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیبیہ کے مقام پر صبح کی نماز پڑھائی بارش کے ان نشانات پر جو رات کو ہوئی تھی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ لوگوں نے عرض کی اللہ ورسولہ اعلم (اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں) تو آپ نے فرمایا کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا صبح کے وقت میرے بندوں میں سے بعض مومن رہے اور بعض کافر۔ پس جنہوں نے یہ کہا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کے ساتھ بارش عطا کی گئی۔ پس وہ میرے ساتھ ایمان لانے والے ہیں اور وہ ستاروں کا انکار کرنے والے ہیں۔ اور جنہوں نے یہ کہا کہ ہمیں فلاں ستارے کے سبب بارش دی گئی تو وہ میرے سے کفر کرنے والے ہیں اور ستارے کے ساتھ ایمان لانے والے ہیں۔ (متفق علیہ)۔(1)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جب بھی آسمان سے برکت (بارش) نازل فرماتا ہے تو لوگوں میں سے ایک گروہ اس کا انکار کرنے لگتا ہے۔ بارش اللہ تعالیٰ برساتا ہے اور وہ گروہ کہتا ہے کہ یہ فلاں فلاں ستارے کے وسیلہ سے ہوئی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔(2)

لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ٝ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

''(اچھا!) ناشکری کر لیں اس نعمت کی جو ہم نے دی ہے انہیں پس (اے ناشکرو!) لطف اٹھا لو تمہیں اس کا انجام معلوم ہو جائے گا[1]''

[1] اس میں لام عاقبت کے لیے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام امر ہے اور تہدید کے معنی میں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَتَمَتَّعُوْا اچھا ناشکری کر لیں اس نعمت کی جو ہم نے انہیں دی ہے۔ پس اے ناشکرو! لطف اٹھا لو۔ اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 117 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 59 (قدیمی)

تمہیں اپنے اس لطف کا انجام معلوم ہو جائے گا۔

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ یَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ یُشْرِكُوْنَ ﴿۳۵﴾

''کیا ہم نے اتاری ہے ان پر کوئی دلیل لے پس وہ گواہی دیتی ہے اس شرک (کی سچائی) کی جو وہ کرتے ہیں ۲''

لے اس میں اَمْ منقطعہ بمعنی بل ہے۔اور ہمزہ استفہام انکار کے لیے ہے۔اس کا عطف کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ پر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ام متصلہ ہو اور مقدر کلام پر معطوف ہو۔اور تقدیر عبارت یہ ہے اَیُشْرِكُوْنَ بِلَا حُجَّةٍ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمْ سُلْطَانًا۔کیا وہ حجت کے بغیر شرک کر رہے ہیں یا ہم نے ان پر کوئی دلیل اتاری۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا سلطان سے مراد دلیل اور عذر ہے۔اور حضرت قتادہ نے کہا ہے اس سے مراد کتاب ہے(1)۔اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ اس سے مراد ذو سلطان (صاحب دلیل) ہے۔یعنی کیا ہم نے ان پر کوئی ایسا فرشتہ نازل کیا جس کے ساتھ دلیل ہو یا ایسا رسول بھیجا جس کی تائید معجزہ سے ہو۔

۲ پس وہ زبان قال یا زبان حال سے کہہ رہی ہو۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے كِتٰبُنَا یَنْطِقُ عَلَیْكُمْ بِالْحَقِّ (ہماری کتاب تمہارے سامنے حق بیان کرتی ہے)۔اس شرک کی سچائی کے بارے جو وہ کرتے ہیں۔یعنی وہ دلیل گواہی دیتی ہو ان کے شرک کرنے اور اس کی سچائی کی۔یا اس امر کی جس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی الوہیت میں شرک کرتے ہیں۔اور اَمْ اَنْزَلْنَا میں استفہام تقریری ہے،یعنی مخاطب کو اس اقرار پر برانگیختہ کیا جا رہا ہے کہ وہ بغیر دلیل کے شرک کر رہے ہیں۔

وَ اِذَاۤ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ اِذَا هُمْ یَقْنَطُوْنَ ﴿۳۶﴾

''اور جب ہم چکھاتے ہیں لوگوں کو رحمت (کا مزہ) تو وہ اس پر پھولے نہیں سماتے اور اگر پہنچتی ہے انہیں کوئی تکلیف بوجہ ان کرتوتوں کے جو آگے بھیجے ہیں ان کے ہاتھوں نے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں لے''

لے اور جب ہم لوگوں کو رحمت یعنی صحت اور خوشحالی جیسی نعمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ اس کے سبب خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔اور اگر ان کے گناہوں کی نحوست کے بدلے انہیں کوئی تکلیف اور شدت پہنچتی ہے تو وہ یکدم اس کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں۔اور یہ بندہ مومن کی شان کے خلاف ہے کیونکہ وہ نعمت کے وقت شکر ادا کرتا ہے اور تکلیف اور شدت کی حالت میں اپنے رب سے رحمت کی امید رکھتے ہوئے صبر اختیار کرتا ہے اور ثواب کا طالب رہتا ہے۔

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

''کیا انہوں نے (بارہا) مشاہدہ نہیں کیا لے کہ اللہ تعالیٰ کشادہ کر دیتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) ۲ بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لے آئے ہیں ۳''

لے یہ استفہام انکاری ہے اور واؤ کلام محذوف پر عطف کے لیے ہے۔تقدیر عبارت اس طرح ہے کیا وہ غور و فکر نہیں کرتے اور یہ نہیں

جانتے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

۲؎ یَقْدِرُ کا معنی ہے وہ تنگ کر دیتا ہے۔ پس کیا ہے انہیں کہ وہ خوشحالی میں تو اترائیں اور شکر ادا نہ کریں اور شدت تکلیف کی حالت میں نا امید ہو جائیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی مغفرت کے امیدوار بن کر رجوع نہ کریں اس طرح کہ سابقہ گناہوں پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے توبہ کریں اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا وعدہ کریں اور نہ وہ صبر کریں اور نہ ہی ثواب کے طالب ہوں جیسا کہ مومنین ایسے حالات میں صبر بھی کرتے ہیں اور ثواب کے امیدوار بھی ہوتے ہیں۔

۳؎ بے شک اس تنگی اور کشادگی میں ایسی نشانیاں ہیں جن سے اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی کامل قدرت اور حکمت پر استدلال کرتے ہیں۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۙ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾

"پس دو رشتہ دار کو اس کا حق ۱؎ نیز مسکین اور مسافر کو ۲؎ یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو رضائے الٰہی کے طلب گار ہیں ۳؎ اور وہی لوگ دونوں جہانوں میں کامیاب ہوں گے ۴؎"

۱؎ اس میں فاء سببیہ ہے یعنی جب تو یہ پہچان چکا کہ رزق میں تنگی اور وسعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے تو پھر ادا کرو (قُرْبٰی مصدر بمعنی قرابت ہے) یعنی رشتے دار کے لیے اس کا حق یعنی حسن سلوک، صلہ رحمی اور نفقہ جو اس ارشاد باری تعالیٰ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کے مطابق واجب ہوتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اسی آیت کے ضمن میں رشتہ داروں کے نفقہ کی تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

۲؎ اور ادا کرو مسکین کو اور ایسے مسافر کو جس کے پاس کوئی مال نہ ہو اگرچہ اس کے اپنے وطن میں اس کا مال ہو۔ تو مال زکوۃ سے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہوئے اور دنیا و آخرت میں اس کے فضل کی امید رکھتے ہوئے ان کے حقوق ادا کرو۔

۳؎ اپنی ذاتوں کے لیے لذات کو ترجیح دینے کی نسبت رشتہ داروں وغیرہ کو دینا بہتر ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی جہت کا ارادہ رکھتے ہیں یعنی اس کے سبب اس کی رضا اور خوشنودی کا قصد کرتے ہیں اور اس پر ثواب کی امید رکھتے ہیں اور ان کے دینے کا مقصد ریاکاری اور شہرت کا حصول نہیں ہوتا۔

۴؎ وَ اُولٰٓىِٕكَ کا عطف اسم موصول اَلَّذِیْنَ یا اسم اشارہ ذٰلِكَ پر ہے۔ وہی لوگ دونوں جہانوں میں کامیاب ہوں گے نہ کہ ان کے سوا کوئی اور۔ کیونکہ انہوں نے فنا ہونے والی دنیا کے بدلے باقی رہنے والی آخرت کو خرید لیا ہے۔

وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَاۡ فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

"اور جو روپیہ تم دیتے ہو بیاج پر ۱؎ تاکہ وہ بڑھتا رہے لوگوں کے مالوں میں ۲؎ (سن لو) اللہ کے نزدیک یہ نہیں بڑھتا ۳؎ اور جو زکوۃ تم دیتے ہو رضائے الٰہی کے طلبگار بن کر۔ پس یہی لوگ ہیں (جو اپنے مالوں کو) کئی گنا کر لیتے ہیں ۴؎"

۱؎ جمہور کے نزدیک وَمَاۤ اٰتَیْتُمْ کی قرأت مد کے ساتھ ہے۔ یعنی جو کچھ تم نے سود کھانے والوں کو دیا ربوا سے مراد یا تو وہ زیادتی ہے جو کاروبار میں شرعاً حرام قرار دی گئی ہے۔ یا اس سے مراد ایسا عطیہ ہے جو ہدیۃً یا ہبۃً دیتا ہے ... [illegible]

عوض زیادہ ملنے کی توقع ہو۔ اس تاویل کی بناء پر مطلوب ومقصود کی بناء پر عطیہ کو ربوا کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بھی مقصود زیادتی ہی ہے۔

ابن کثیر نے دونوں جگہوں پر مَآ اٰتَیْتُمْ پڑھا ہے۔ یعنی جو تم دینے کے لیے لائے چاہے وہ ایسی زیادتی ہو جو حرام ہے یا مباح عطیہ ہو جس کے عوض وہ زیادہ لینے کی توقع رکھتے ہوں۔

2۔ لِیَرْبُوَا کو اہل مدینہ اور یعقوب نے تاء خطاب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں تاء اور یاء مضموم ہیں اور واؤ ساکن ہے۔ یعنی لِتُرْبُوْا اَنْتُمْ وَ تَصِیْرُوْنَ ذَا زِیَادَةٍ (کہ تمہیں زیادہ دیا جائے اور تم کثیر والے ہو جاؤ) تاکہ وہ لوگوں کے مالوں میں بڑھتا ہے۔ اموال الناس سے مراد یا تو دینے والوں کا مال ہے یا ان کا مال ہے جنہیں دیا گیا ہے۔

باقیوں نے اسے لِیَرْبُوَا پڑھا ہے، یعنی اس میں یاء اور واؤ دونوں مفتوح ہیں۔ معنی یہ ہے تاکہ وہ اپنے مالوں میں اضافہ کریں۔

3۔ اپس وہ اللہ کے نزدیک اسے نہیں بڑھا سکتے اور نہ ہی اس میں برکت رکھی جاتی ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ علماء نے آیت کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت سعید بن جبیر، مجاہد، طاؤس، قتادہ اور اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسا آدمی ہے جو کسی دوسرے کو اس لیے عطیہ دیتا ہے تاکہ اس کے عوض وہ اسے زیادہ واپس لوٹائے تو یہ عطیہ جائز اور حلال ہے لیکن قیامت کے دن اس پر اسے کوئی ثواب نہیں دیا جائے گا اور قول باری تعالیٰ لَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ کا یہی معنی ہے۔ یہ عمل حضور کریم ﷺ پر حرام تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ فرمایا وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (1) اور ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے رشتہ دار یا اپنے دوست کو اس کے مال میں اضافہ کرنے کے لیے دیتا ہے اور اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا ارادہ نہیں کرتا۔ (2) اور امام شعبیؒ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جو کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ساتھ لگا رہتا ہے، اس کی خدمت بجالاتا ہے اور اس کے ساتھ سفر پر بھی جاتا ہے۔ پس وہ آدمی اس کے لیے اپنے مال کے منافع میں سے کچھ حصہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ اسے اس کا تعاون اور مدد حاصل رہے۔ اس سے اس کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا نہیں ہوتی۔ پس اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ مال نہیں بڑھتا۔ کیونکہ اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا قصد ہی نہیں کرتا (3)۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے ہر آدمی کے لیے وہی کچھ ہوگا جس کی اس نے نیت کی، پس جس نے اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہی ہوگی اور جس نے دنیا کو حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے ارادے سے اس نے ہجرت کی (4)۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور اسے حضرت فاروق اعظم عمر بن خطابؓ نے بیان کیا ہے۔

4۔ اور جو مال بطور صدقہ دیتے ہو یا بطور زکوٰۃ ادا کرتے ہو۔ اور اس سے ارادہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی جانب سے ثواب اور رضا کرتے ہو۔ پس وہ لوگ جو زکوٰۃ دیتے ہیں ان کے لیے ثواب کئی گنا کر دیا جاتا ہے۔ پس انہیں ایک نیکی کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک اور پھر اتنے گنا تک جس کی کوئی انتہا نہیں دیا جائے گا۔ اور ان کے مالوں کو زکوٰۃ کی برکت سے کئی گنا کر دیا جائے گا۔ یا معنی یہ ہے وہ کئی گنا ثواب والے ہیں یہ ایسے ہی ہے جیسے قوت والے کو مقوی اور مال والے کو مؤسر کہا جاتا ہے۔ عبارت اور الفاظ کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (التجارۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (التجاریۃ)

اعتبار سے مقابلے کے طریقہ میں تبدیلی مبالغہ کے لیے ہے۔(یعنی ظاہر عبارت کا تقاضا یہ تھا کہ لَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ کے مقابلہ میں یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ) اور اٰتیتم اور تریدون کے بعد خطاب سے ضمیر غائب کی طرف التفات تعظیم کے لیے ہے۔ گویا اس کے ذریعے ملائکہ اور مخلوق میں سے خواص کو خطاب کرتے ہوئے زکوٰۃ دینے والوں کی حالت سے انہیں آگاہ کیا یا پھر یہ التفات تعمیم کے لیے ہے۔ گویا یہ فرمایا جنہوں نے ایسا کیا وہی وہ لوگ ہیں جو اپنے مالوں کو کئی گنا کر لیتے ہیں۔ اگر آپ ما موصولہ بنائیں تو پھر اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے۔ تقدیر کلام المضعفون به ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے کہ تقدیر کلام یہ ہے فَاَهْلُهَا هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (یعنی زکوٰۃ دینے والے ہی مال کو کئی گنا کرنے والے ہیں)۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآىٕكُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝۴۰

"اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا پھر تمہیں رزق دیا پھر (مقررہ وقت پر) تمہیں مارے گا اور پھر تمہیں زندہ کرے گا[1] کیا تمہارے (ٹھہرائے ہوئے) شریکوں میں بھی کوئی ہے جو کر سکتا ہو ان کاموں میں سے کوئی پاک ہے اللہ تعالیٰ (ہر عیب سے) اور بلند ہے ان سے جنہیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں[2]۔"

[1] اَللّٰهُ اسم جلالت مبتدا ہے اور مابعد کلام اس کی خبر ہے۔ کیا بتوں وغیرہ میں سے جنہیں تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ہے کیا وہ بھی ایسا کر سکتے ہیں؟ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی ان میں سے کوئی بھی اس طرح نہیں کر سکتا۔

[2] اللہ تعالیٰ نے لوازم الوہیت کا ذکر فرمایا، انہیں اپنی ذات کے لیے ثابت کیا اور اپنے سوا ہر شے سے ان کی نفی کر دی اور استفہام انکاری کے ساتھ اس کی مزید تاکید ذکر کی جیسا کہ اس پر دلائل اور مشاہدہ دلالت کرتے ہیں اور اسی پر اجماع بھی واقع ہوا ہے۔ پھر اس کے نتیجے کے طور پر یہ بیان فرمایا کہ اس کی ذات ہر قسم کے شریک سے پاک اور مبرہ ہے۔ لہٰذا ارشاد فرمایا سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ۔ حمزہ اور کسائی نے یُشْرِكُوْنَ کو تاء کے ساتھ تُشْرِكُوْنَ پڑھا ہے (اللہ تعالیٰ (ہر عیب سے) پاک ہے اور جنہیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں ان سے بلند ہے)۔ اور باقیوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ ترکیب کے اعتبار سے یہ بھی ممکن ہے کہ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ لفظ اللہ کی صفت ہو اور هَلْ مِنْ شُرَكَآىٕكُمْ اس کی خبر ہو۔ اور ان میں رابطہ مِنْ ذٰلِكُمْ ہو۔ کیونکہ یہ من افعاله کے معنی میں ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا کیا تمہارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو اس کے افعال میں سے کوئی کر سکتا ہو؟ پہلے دونوں مقامات پر مِنْ یہ فائدہ دے رہا ہے کہ حکم شرکاء اور افعال کی جنس میں مشترک ہے۔ اور تیسرے مقام پر مِنْ زائدہ ہے جو تعمیم نفی کے لیے ہے اور ان میں سے ہر ایک مستقل طور پر شرکاء کو عاجز کرنے کے لیے ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝۴۱

"پھیل گیا فساد بر اور بحر میں[1] بوجہ ان کرتوتوں کے جو لوگوں نے کیے ہیں[2] تاکہ اللہ تعالیٰ چکھائے انہیں کچھ سزا ان کے (برے) اعمال کی[3] شاید وہ باز آ جائیں[4]۔"

۱؎ مثلاً قحط سالی اور موت، آگ لگانے، غرق ہونے اور جنگ وجدال کی کثرت، برکتوں کا مٹ جانا، ظلم عام ہونا اور ضرر، امراض اور گمراہی کی کثرت سے ہونا، سمندروں میں فساد برپا کرنے والی آندھیوں اور طوفانوں کا چلنا اور سمندری جانوروں کا باہم ایک دوسرے سے لڑنا وغیرہ۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ البَّر سے مراد صحراء اور جنگلات ہیں اور بحر سے مراد وہ شہر اور بستیاں ہیں جو جاری پانیوں کے کنارے آباد ہوں(1)۔ ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ عرب مصر کو بحر کا نام دیتے ہوئے کہتے ہیں اَجْدَبَتِ الْبَرُّ وَ انقَطَعَتْ مَادَةُ الْبَحْرِ(2) (زمین قحط زدہ ہوگئی اور سمندر پر بھی اس کا اثر ہوا کیونکہ اس کا مادہ منقطع ہو گیا)۔ عطیہ وغیرہ نے کہا ہے کہ بر سے مراد سطح زمین پر موجود شہر وغیرہ ہیں اور بحر سے مراد معروف معنی سمندر ہے۔ اور بارش کی قلت جس طرح خشکی (زمین میں اثر انداز ہوتی ہے) اسی طرح سمندر میں بھی مؤثر ہوتی ہے۔ پس سیپیں اندر سے خالی ہوتی ہیں لیکن جب بارش ہوتی ہے تو سیپ نیچے تہ سے سمندر کی ظاہری سطح کی طرف چڑھ آتی ہے اور اپنا منہ کھول دیتی ہے پس بارش کا جو قطرہ اس کے منہ میں پڑتا ہے وہ موتی بن جاتا ہے(3)۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ الفساد فی البرّ سے مراد ابن آدم کا اپنے بھائی کو قتل کرنا اور فساد فی البحر سے مراد جابر بادشاہ کا کشتیوں کو غصب کرنا ہے۔(4)

فریابی، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ زمین میں فساد قابیل کے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کرنے کے سبب ظاہر ہوگیا اور سمندر میں شہنشاہ عمان جلندی کے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں) کشتیوں کو چھیننے سے پھیلا۔ جیسا کہ فرمایا کَانَ یاْخُذُ کُلَّ سَفِیْنَةٍ غَصْبًا (وہ ہر کشتی کو غصب کر لیتا تھا)(5)۔

اور ضحاک نے کہا ہے کہ زمین سرسبز وشاداب تھی ابن آدم (آدمی) جس درخت کے پاس بھی آتا تھا اسے پھلدار پاتا اور سمندر کا پانی میٹھا اور شیریں تھا اور شیر گائے اور بکری کو مارنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا تھا۔ لیکن جب قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو زمین خشک ہوگئی، درخت کانٹے دار ہوگئے، سمندر کا پانی سخت نمکین ہوگیا اور جانوروں میں سے بعض بعض کو مارنے لگے۔(6)

۲؎ ایسا لوگوں کے گناہوں کی نحوست کے سبب قحط اور خشک سالی آگئی حتیٰ کہ وہ ہڈیاں اور مردار کھانے لگے۔ ”لِیُذِیْقَهُمْ“ کو قنبل نے نون کے ساتھ صیغہ جمع متکلم پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

۳؎ تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے برے اعمال کی کچھ سزا انہیں چکھائے۔ کیونکہ مکمل سزا تو آخرت میں دی جائے گی۔ لِیُذِیْقَهُمْ میں لام علت یا عاقبت کے لیے ہے۔

۴؎ شاید وہ اپنے برے اعمال سے باز آجائیں لَعَلَّكُمْ یَرْجِعُوْنَ کا تعلق لِیُذِیْقَهُمْ سے ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بعثت سے قبل زمین ظلم اور گمراہی سے بھری پڑی تھی۔ پس جب آپ ﷺ کی بعثت ہوئی تو لوگوں میں سے رجوع کرنے والوں نے اس سے رجوع کر لیا۔(7)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 32 (الامیریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر فتح القدیر، جلد 4 صفحہ 228
5۔ تفسیر فتح القدیر، جلد 4 صفحہ 228
6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (التجاریۃ)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (التجاریۃ)

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴿۴۲﴾

''(اے محبوب ﷺ) آپ (انہیں) فرمایئے کہ سیر وسیاحت کروزمین میں اور دیکھو کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے۱؎ ان میں سے اکثر مشرک تھے ۲؎''

۱؎ اے محبوب! آپ انہیں فرمایئے زمین میں سیر وسیاحت کرو اور دیکھو ان لوگوں کا کیسا انجام ہوا جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم دیکھ لو کہ جن لوگوں نے ظلم کیا ان کے گھر کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔

۲؎ یہ جملہ حال ہے اور اس سے پہلے قَدْ مقدر ہے۔ یا جملہ مستانفہ ہے اور اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے اس برے انجام کا سبب ان میں شرک کا ظاہر ہونا اور غالب ہونا ہے۔ یا پھر ان میں سے اکثر میں شرک پایا جاتا تھا اور اس سے کم درجے کے دیگر گناہ قلیل تعداد سے سرزد ہوتے تھے لیکن ان مشرکوں کے ساتھ سنگت رکھنے کی نحوست کے سبب تمام لوگوں کو ہی ہلاک وتباہ کر دیا گیا۔ یا پھر ان کی ہلاکت کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر دیا تھا۔ معنوی اعتبار سے قُلْ سِيْرُوْا کا جملہ لِيُذِيْقَهُمْ کے لیے تاکید ہے کیونکہ یہ عذاب چکھانے پر دلالت کرتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَىِٕذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿۴۳﴾

''پس کر لو اپنا رخ اس دین قیم کی طرف اس سے پہلے کہ آجائے وہ دن۱؎ اللہ کی طرف سے جسے ٹلنا نہیں ہے ۲؎ اس روز یہ لوگ جدا جدا ہو جائیں گے ۳؎''

۱؎ جو کچھ آپ سے پہلے لوگوں کو لاحق ہوا اس سے بچنے کے لیے اپنا رخ اس دین کی طرف کر لو جو انتہائی مستقیم اور صحیح ہے اور وہ دین اسلام ہے فَاَقِمْ پر فاء سببیہ ہے۔ وہ دن آنے سے پہلے جسے رد کرنے پر کوئی بھی قادر نہیں ہوگا۔

۲؎ مِنَ اللّٰهِ یہ يَاْتِيَ یا مَرَدَّ کے متعلق ہے۔ کیونکہ مَرَدَّ مصدر ہے اور لَا يَرُدُّهٗ کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسے نہیں لوٹائے گا کیونکہ اس دن کے آنے کا اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے تعلق ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ دن ہو جس دن دنیا میں ان پر عذاب آئے گا۔ لیکن ظاہر یہی ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔

۳؎ يَصَّدَّعُوْنَ اصل میں يَتَصَدَّعُوْنَ ہے۔ یعنی اس دن یہ لوگ جدا جدا ہو جائیں گے ایک فریق جنت میں اور ایک فریق جہنم میں چلا جائے گا۔ یا پھر ایک فریق کو دنیا میں عذاب دیا جائے گا اور ایک کو نہیں دیا جائے گا جیسے غزوۂ بدر کے دن ہوا۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿۴۴﴾

''جس نے کفر کیا تو اس پر ہے اس کے کفر کا وبال اور جنہوں نے نیک عمل کیے تو وہ اپنے لیے ہی راہ ہموار کر رہے ہیں۱؎''

۱؎ جس نے کفر کیا تو اس کے کفر کا وبال دنیا اور آخرت میں اس پر ہوگا۔ اور جنہوں نے نیک عمل کیے تو وہ اپنے لیے ہی راہ ہموار کر رہے ہیں یعنی وہ قبر اور جنت میں اپنے لیے اچھے اچھے گھر تیار کر رہے ہیں۔

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۴۵

"تا کہ اللہ تعالیٰ بدلہ دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اپنے فضل وکرم سے بے شک وہ پسند نہیں کرتا کفار کو۔"

لِیَجْزِیَ یَمْھَدُوْنَ کے متعلق ہے۔ تا کہ اللہ تعالیٰ بدلہ دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ ان کے معاوضہ کی علت بیان کرنے کے لیے ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے اور مِنْ فَضْلِهٖ یَجْزِیَ کے متعلق ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال کی نسبت زیادہ ثواب عطا کرے (1)۔ آیت میں صرف اہل ایمان کی جزاء کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ مقصود بالذات یہی ہے اور اللہ تعالیٰ تو ثواب ہی دینے کا ارادہ رکھتا ہے مگر جس نے خود انکار کیا، اپنے آپ پر ظلم کیا اور آخرت میں اپنے لیے جہنم کو پسند کر لیا تو ان کے کفر کے سبب اللہ تعالیٰ بھی انہیں سزا دے گا۔ جیسا کہ اس پر یہ قول باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے۔ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ بے شک اللہ تعالیٰ کفار کو پسند نہیں کرتا۔ پس وہ اپنے کفر کے سبب اس کے فضل کے مستحق نہیں بنتے۔ اور شیخ جلال الدینؒ نے کہا ہے کہ لِیَجْزِیَ قول باری تعالیٰ یَصَّدَّعُوْنَ کے متعلق ہے۔ اس کے مطابق دونوں فریقوں کی جزاء کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ پس اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ کا معنی یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ انہیں سزا دے گا۔ (2) واللہ اعلم۔ اور ارشاد باری تعالیٰ مِنْ فَضْلِهٖ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ثواب دینا محض اللہ کا فضل ہے۔ اور اگر اس کا معنی عطایا مقررہ ثواب سے زائد ہونا لیا جائے تو یہ ایسی تاویل ہوگی جس میں ظاہر لفظ سے عدول کیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جو امام احمدؒ نے الزہد میں ابو الحارث سے نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ وہ میرے نیک اور صالح بندوں کو ڈرائیں تا کہ وہ اپنے نفسوں پر اترانے نہ لگیں اور اپنے اعمال پر ہی بھروسہ نہ کرنے لگ جائیں کیونکہ میرے بندوں میں سے کوئی ایسا بندہ نہیں جسے میں حساب کے لیے کھڑا کروں گا اور اس پر اپنے عدل کے تقاضے پورے کروں گا اور پھر اسے عذاب نہیں دوں گا (3)۔ (یعنی اسے ضرور عذاب دوں گا)۔ ابونعیم نے حضرت علیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک نبی علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ اپنی امت میں سے میری اطاعت کرنے والوں سے فرما دیجئے کہ وہ اپنے اعمال پر ہی بھروسہ نہ کر لیں۔ کیونکہ میں قیامت کے دن جس بندے کو حساب کے لیے کھڑا کروں گا اور اسے عذاب دینا چاہوں گا تو میں اسے ضرور عذاب دوں گا۔ اور اپنی امت کے گنہگاروں سے کہہ دیجئے کہ وہ ناامید نہ ہو جائیں کیونکہ میں بڑے بڑے گناہ بخش دیتا ہوں اور کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ طبرانی واثلہ بن اسقعؓ سے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایسے آدمی کو اٹھائے گا جس کے ذمے کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا تیرے نزدیک دو امروں میں سے کونسا امر پسندیدہ ہے کہ میں تجھے تیرے اعمال کی جزاء عطا فرماؤں یا تجھ پر احسان فرماؤں؟ وہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار! تو خوب جانتا ہے کہ میں نے تیری نافرمانی نہیں کی۔ تو رب کریم فرمائے گا میری نعمتوں میں سے ایک نعمت کے ساتھ میرے بندے کے اعمال کا موازنہ کرو۔ تو اس طرح وہ ایک نعمت ہی اس کی تمام نیکیوں کو محیط ہو جائے گی۔ اور اس کے پاس کوئی نیک عمل بھی باقی نہیں رہے گا۔ پس وہ عرض کرے گا تیرے احسان اور تیری رحمت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 175 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر جلالین صفحہ 344 (وزارت تعلیم) 3۔ کتاب الزہد از امام احمد صفحہ 92 (العلمیہ)

کے ساتھ ہی مغفرت کا طالب ہوں(1)۔ بزار نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن آدمی کے لیے تین رجسٹر لائے جائیں گے۔ان میں سے ایک میں اعمال صالحہ ہوں گے،ایک میں اس کے گناہ ہوں گے اور ایک میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کی جانے والی نعمتوں کا ذکر ہوگا۔اللہ تعالیٰ نعمتوں کے رجسٹر سے چھوٹی سی نعمت لے کر اسے فرمائے گا کہ تو اس کے اعمال صالحہ کے ساتھ اپنا موازنہ کر۔تو وہ چھوٹی سی نیکی اس کے تمام نیک اعمال کو گھیر لے گی پس وہ رجسٹر کہے گا تیری عزت کی قسم میں نے ابھی مکمل طور پر گھیرا نہیں۔کیونکہ گناہ ابھی باقی ہیں اور تمام کے تمام نیک اعمال ختم ہو چکے ہیں۔پھر جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر رحم کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو فرمائے گا اے میرے بندے! میں نے تیرے لیے تیری نیکیوں کو کئی گنا کر دیا ہے، تیرے گناہوں سے درگزر کر لی ہے اور تجھے اپنی نعمتیں بخش دی ہیں(2)۔طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عمرؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس آدمی نے کہہ دیا لا الہ الا اللّٰہ تو اس کے عوض اس کے لیے (جنت) میں داخل ہونے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وعدہ ہو گیا۔اور کسی نے کہا سبحان اللّٰہ۔تو اس کے عوض اس کے لیے ایک لاکھ نیکیاں لکھ دی جائیں گی۔تو پھر ایک آدمی نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ اس کے بعد ہم ہلاک کیسے ہو سکتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے بے شک قیامت کے دن آدمی ایسا عمل لے کر آئے گا کہ اگر اسے پہاڑ پر رکھا جائے تو وہ اس پر بوجھل ہو جائے لیکن جونہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ان کے مقابل آئے گی تو تمام اعمال اس ایک کے مقابلے میں ختم ہو جائیں گے۔پس اس دن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہی فضل فرمائے گا(3)۔اور شیخین نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا سیدھے رہو،ایک دوسرے کا قرب اختیار کرو اور خوش رہو۔کیونکہ کسی کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا۔انہوں نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ کیا آپ بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں میں بھی نہیں۔مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت ومغفرت کے ساتھ مجھے ڈھانپ لے(4)۔امام مسلمؒ نے حضرت جابرؓ سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔امام احمدؒ نے اسے ابوسعید سے بھی نقل کیا ہے۔بزار نے اسے ابن ابی موسیٰ اور شریک بن طارق دونوں سے نقل کیا ہے۔اور شریک بن طریف،اسامہ بن شریک اور اسد بن کرز کی حدیث سے اسے طبرانی نے ذکر کیا ہے۔

دو شبہات: یہاں دو شبہات پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس وقت اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرنے اور معصیت چھوڑنے کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہے گا۔کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا تو وہ اہل اطاعت کو بھی عذاب دے گا اور اگر اس نے فضل فرمایا تو اہل معصیت کو بھی بخش دے گا اور جنت میں داخل فرما دے گا۔دوسرا اشکال یہ ہے کہ یہ مذکورہ بالا احادیث کا مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے معارض ہے ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کے سبب جو تم کرتے رہے) کیونکہ یہ ارشاد تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنت میں داخل ہونے کا سبب اعمال ہیں۔اور یہ ان کا مسبب ہے۔

جواب: پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ بے شک اطاعت وفرمانبرداری بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کا تقاضا کرتی ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو پھر میری

1۔معجم کبیر طبرانی،جلد 22 صفحہ 59 (العلوم والحکم)
2۔الترغیب والترہیب،جلد 4 صفحہ 98-397 (الفکر)
3۔مجمع الزوائد،جلد 10 صفحہ 648 (الفکر)
4۔صحیح مسلم،جلد 2 صفحہ 377 (قدیمی)

اطاعت کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا)۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ میرا بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل میرا قرب اختیار کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں(1)۔ اسے بخاری نے ایک طویل حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور محبت فضل و رحمت کا تقاضا کرتی ہے اور فضل کی بھلائی لانے اور ہر قسم کا ضرر دور کرنے کا سبب ہے۔

دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ جنت کے کئی درجات ہیں انہیں اعمال کے سبب ہی حاصل کیا جائے گا۔ کیونکہ اعمال کے مختلف ہونے کے سبب جنت کے درجات و مراتب میں بھی تفاوت ہے۔ اگرچہ ابتداءً جنت میں داخل ہونا اور پھر اس میں ہمیشہ رہنا محض اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے ہی ہوگا۔ اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے ھناد نے الزھد میں حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ تم پل صراط سے اللہ تعالیٰ کے عفو کے ساتھ گزرو گے، جنت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب داخل ہوگے اور تمہیں جنت کے مراتب تمہارے اعمال کے مطابق دیئے جائیں گے۔ اسی کی مثل ایک روایت ابونعیم نے عون بن عبداللہ سے نقل کی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّ لِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾

”اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو [1] (بارش کا) مژدہ سناتے ہوئے۔ نیز تاکہ وہ تمہیں چکھائے اپنی رحمت سے [2] اور تاکہ چلیں کشتیاں اس کے حکم سے اور تاکہ تم طلب کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم شکر ادا کرو [3]۔“

[1] اور اس کے دلائل قدرت میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بغیر کسی محرک کے اپنے ارادے کے مطابق ہواؤں کو شمال سے جنوب کی طرف اور اس کے برعکس (یعنی جنوب سے شمال کی طرف) اور مشرق سے مغرب کی طرف اور اس کے برعکس (مغرب سے مشرق کی طرف) بھیجتا ہے۔ جیسا کہ قوت حس اس کی شہادت دیتی ہے۔ حمزہ اور کسائی نے جنس کے طور پر اسے الرِّیْحَ پڑھا ہے۔

[2] ترکیب کلام میں مُبَشِّرٰتٍ الریاح سے حال ہے۔ اور وَلِیُذِیْقَكُمْ مُبَشِّرٰتٍ کے معنی پر معطوف ہے۔ گویا کہ یہ فرمایا ہے لیبشرکم وَلِیُذِیْقَكُمْ۔ یا اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے تاکہ تم سے گرمی اور گرم تیز لو کو دور کرے۔ اور تمہیں اپنی رحمت سے اناج اور پھلوں کا ذائقہ چکھائے ”مِنْ رَّحْمَتِهٖ“ میں مِنْ ابتدائیہ ہے۔

[3] اور تاکہ اس کے حکم سے ہواؤں کے سبب کشتیاں چلیں اور تاکہ تم سمندری تجارت کے سبب منافع تلاش کرو۔ تاکہ تم ان میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ پس تم اس کے فوائد و ثمرات دنیا اور آخرت میں پالو گے۔ مِنْ اٰیٰتِهٖ کا جملہ قول باری تعالیٰ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ الآیہ سے متصل ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَ كَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۷﴾

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 963 (وزارت تعلیم)

"اور بے شک ہم نے بھیجے آپ سے پہلے پیغمبر ان کی قوموں کی طرف پس وہ لے کر آئے ان کے پاس روشن دلیلیں۔
پس ہم نے بدلہ لیا ان سے جنہوں نے جرم کیے 1 اور ہمارے ذمۂ کرم پر ہے اہل ایمان کی امداد فرمانا 2"

1۔ ہم نے آپ سے پہلے ان کی قوموں کی طرف پیغمبر بھیجے۔ پس وہ ان کے پاس روشن دلیلیں لے کر آئے جو ان کی صداقت پر واضح دلالت کرتی تھیں۔ پس ان میں سے بعض ان کے ساتھ ایمان لائے اور بعض دوسروں نے ان کا انکار کر دیا۔ اسی پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا یعنی ہم نے انہیں عذاب دیا جنہوں نے ان سے کفر کیا۔

2۔ اس کا عطف محذوف جملہ پر ہے۔ تقدیر عبارت کچھ اس طرح ہے۔ وَنَصَرْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (اور ہم نے ان کی مدد کی جو ایمان لائے اور اہل ایمان کی مدد فرمانا ہمارے ذمہ کرم پر ہے۔) اور اس میں یہ احساس دلایا جا رہا ہے کہ کفار سے بدلہ لینا اور انہیں سزا دینا اہل ایمان کی مدد اور ان کی کرامت وعزت کے اظہار کے لیے تھا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ از روئے تفضل ومہربانی اہل ایمان کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ پر لازم ہے تو پھر اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کفار کبھی بھی مؤمنین پر غالب نہیں آسکیں گے حالانکہ کبھی اس کے خلاف بھی دیکھا جاتا ہے۔ تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ میں اضافت اور الف لام عہدی ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اہل ایمان جنہوں نے خالصۃً اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کفار سے جہاد کیا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ وعدہ ہے کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا (اور انہیں غلبہ عطا کرے گا) اگرچہ وہ کچھ وقت کے بعد ہی ہو۔ حضرت ابو الدرداء سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جو مسلمان اپنے بھائی کی عزت کا دفاع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر اس کا حق بن جاتا ہے کہ وہ قیامت کے دن اس سے جہنم کی آگ کو دور کرے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے (1)۔ اور اسے اسحاق بن راہویہ اور طبرانی وغیرہما نے اسماء بنت یزید کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ کبھی حقًّا پر وقف کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا تعلق انتقمنا سے ہوگا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

"اللہ تعالیٰ ہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو پس وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پس اللہ تعالیٰ پھیلا دیتا ہے اسے آسمان پر 1 جس طرح چاہتا ہے اور کر دیتا ہے اسے ٹکڑے ٹکڑے 2 پھر تو دیکھتا ہے بارش کو کہ ٹپکنے لگتی ہے اس میں سے پھر جب پہنچاتا ہے اسے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں سے اس وقت وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں 3"

1۔ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ پس وہ بادل کو اٹھاتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ اسے کبھی متصلاً آسمان پر پھیلا دیتا ہے۔ اور اس سے مراد اوپر کی سمت ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ۔

2۔ كَیْفَ یَشَآءُ یہ یَبْسُطُ کے مفعول سے حال ہے۔ یعنی ایک جانب سے دوسری جانب انہیں چلاتے ہوئے کبھی گھنے بادلوں کی

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 15 (وزارت تعلیم)

صورت میں اور کبھی بغیر گھٹا کے۔ اور کبھی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ابن عامر نے کِسْفًا کے سین کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ مخفف ہے یا کسفة کی جمع ہے یا مصدر ہے جس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے۔

۳؎ پھر تو بارش کو دیکھتا ہے۔ کہ کبھی اس میں سے بارش ٹپکنے لگتی ہے۔ پھر اسے اپنے بندوں میں سے جن کی بستی پر چاہتا ہے پہنچاتا ہے تو وہ سبزہ اور شادابی آنے سے خوش ہو جاتے ہیں۔

وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾

''اور اگر چہ وہ بندے اس سے پہلے کہ ان پر بارش ہوتی ۱؎ مایوس ہو چکے تھے ۲؎''

۱؎ یہ اِنْ مخففہ عن المثقلہ ہے اصل میں ہے۔ و اِنَّهُمْ كَانُوْا۔ مکی اور بصری نے اسے تخفیف کے ساتھ يُنْزَلَ پڑھا ہے اور ''مِنْ قَبْلِه'' مِنْ قَبْلِه کی تاکید کے لیے ہے۔ اور اس پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ ان پر بارش ہوئے طویل وقت گزر چکا تھا اور اب ان کی مایوسی اور ناامیدی مستحکم ہو چکی تھی (یعنی وہ حد درجہ ناامید اور مایوس ہو چکے تھے)۔ ابن مسعود کی قرأت میں مِنْ قَبْلِه کے الفاظ نہیں ہیں۔

۲؎ لَمُبْلِسِيْنَ پر لام ان مخففہ اور ان نافیہ کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے۔ بعض نے کہا ہے۔ اِنْ نافیہ ہے اور لام اِلَّا کے معنی میں ہے اور معنی یہ ہے۔ وہ اس سے قبل نہیں تھے مگر ناامید۔ وَمَا كَانُوا مِنْ قَبْلِهِ اِلَّا ائِسِيْنَ۔

فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

''پس (چشم ہوش سے) دیکھو رحمت الٰہی کی علامتوں کی طرف ۱؎ (تمہیں پتہ چلے گا) وہ کیسے زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد۔ بے شک وہی خدا مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے ۲؎''

۱؎ پس تم چشم ہوش سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی علامتوں کی طرف دیکھو، یعنی بارش کے اثرات نباتات، درختوں، اناج اور پھلوں وغیرہ کی صورت میں دیکھو۔ اسی لیے ابن عامر، حفص، حمزہ اور کسائی نے اسے جمع کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور جمہور نے جنس کا ارادہ کرتے ہوئے مفرد کی صورت میں اَثَرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ پڑھا ہے۔

۲؎ وہ کیسے زمین سے سبزہ اگا کر اسے زندہ کرتا ہے۔ اس کے مردہ یعنی خشک ہونے کے بعد بے شک وہ جو زمین کے مردہ ہونے کے بعد اسے زندہ کرنے پر قادر ہے۔ یقیناً وہی خدا مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ اے کفار! تمہارے انکار کی کوئی وجہ نہیں جب کہ تم حیات بعد الموت کی مثالوں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہو۔ اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ یعنی تمام ممکنات کی طرف اس کی قدرت کی نسبت مساوی ہے۔

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾

''اگر ہم بھیج دیتے ایسی ہوا (جس کے اثر سے) وہ دیکھتے اپنے سرسبز کھیتوں کو کہ وہ زرد ہو گئے ہیں ۱؎ تو اس کے باوجود وہ کفر پر اڑے رہتے ۲؎''

۱؎ اور اگر ہم ایسی ہوا بھیج دیتے جو زمین کو خشک کرنے کا موجب ہوتی۔ پس وہ دیکھتے اس کا اثر یا اپنے سرسبز کھیت کہ وہ زرد ہو گئے ہیں

یہی ماقبل کلام کا مدلول ہے۔ اور لام مقدر قسم کا جواب ہے۔

۲؎ تو اس کے باوجود وہ کفر پر اڑے رہتے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرتے۔ جواب قسم قائم مقام جزاء کے ہے جو کفار کی حالت کو بیان کر رہا ہے کہ ان میں استقلال اور ثبات کی قلت تھی، ان میں تدبر اور غور وفکر نہیں تھا۔ وہ غور وفکر نہ کرنے کے سبب بہت جلد متزلزل ہو جاتے تھے اور ان کی رائے انتہائی ناقص تھی۔ جبکہ صحیح نظر وفکر یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے، اور جب ان پر بارش نہ ہوتی تو وہ استغفار کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء کرتے اور اس کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہ ہوتے۔ اور جب اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش عطا فرما دیتا تو وہ اس کا شکر بجا لانے اور اس کی اطاعت اختیار کرنے میں تیزی کرتے اور خوشی کے اظہار میں حد سے تجاوز نہ کرتے۔ اور اگر ان کے کھیتوں پر کوئی آفت آ جاتی تو وہ اس مصیبت اور آزمائش میں صبر کا دامن مضبوطی سے تھامتے اور کبھی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار نہ کرتے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾

"پس آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو سنا سکتے ہیں اپنی پکار (خصوصاً) جب وہ پیٹھ پھیر کر جا رہے ہوں ۱؎"

۱؎ پس آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے۔ اور وہ بھی مردوں کی مثل ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے حواس کو حق بات سننے اور سمجھنے سے بند کر رکھا ہے۔ اور نہ آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں۔ ابن کثیر نے اسے لَا يَسْمَعُ صیغہ مجرد معروف کی صورت میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الصُّمُّ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور جمہور نے اسے باب افعال سے صیغہ مخاطب کی صورت میں اور الصُّمَّ کو مفتوح پڑھا ہے۔ اپنی پکار (خصوصاً) جب وہ پیٹھ پھیر کر جا رہے ہوں۔ یہ قید اس لیے ذکر کی ہے تاکہ یہ اظہار ہو کہ وہ بالکل ہی نہیں سن سکتے۔ کیونکہ اگر بہرے متوجہ ہوں تو اگرچہ کلام تو اس صورت میں بھی نہیں سنتے لیکن حرکات وسکنات کے واسطہ سے کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن جب وہ پیٹھ پھیرے ہوئے ہوں تو پھر تو بالکل ہی کچھ سمجھ نہیں سکتے۔

وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾

"اور نہ آپ ہدایت دے سکتے ہیں اندھوں کو ان کی گمراہی سے آپ نہیں سناتے ۱؎ مگر انہیں جو ایمان لائے ہماری آیتوں پر پس وہ گردن جھکائے ہوئے ہیں ۲؎"

۱؎ اور نہ آپ اندھوں یعنی کفار کو ان کی گمراہی سے ہدایت دے سکتے ہیں۔ اور آپ ایسا نہیں سناتے جسے سمجھا جائے اور قبول کیا جائے۔ حمزہ نے تَهْدِي صیغہ مضارع کی صورت میں پڑھا ہے۔ کفار کو اندھا اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ انہوں نے آنکھیں ہونے کے باوجود مقصود حقیقی کی طرف نہ دیکھا نہ اسے پایا۔ یا پھر اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے دلوں کے اندھا ہونے کی وجہ سے انہیں اندھا کہا گیا ہے۔

۲؎ مگر انہیں جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے۔ کیونکہ ان کا ایمان انہیں الفاظ قبول کرنے اور معنی میں غور وتدبر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مؤمن سے مراد وہ لوگ ہوں جو ایمان کے قریب پہنچنے والے ہیں یا وہ لوگ جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان مقدر بنا دیا ہے۔ پس وہ گردن جھکائے ہوئے ہیں۔ جب بھی آپ انہیں کوئی حکم ارشاد فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ﴿۵۴﴾

''اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں (ابتدا میں) کمزور پیدا فرمایا۔۱ پھر عطا کی (تمہیں) کمزوری کے بعد قوت۔ پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دے دیا۔۲ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہی سب کچھ جاننے والا بڑی قدرت والا ہے۔۳''

۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری ابتدا ضعف طفولیت سے فرمائی یا اللہ تعالیٰ نے تمہارے معاملے کی بنیاد ضعف کو بنایا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (فطرتاً انسان کو عجلت پسند پیدا کیا گیا ہے)۔ یا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک کمزور اور ضعیف اصل سے پیدا کیا ہے اور وہ نطفہ ہے۔ یہ اصل میں ذِیْ ضعف ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ (کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا نہیں فرمایا)

۲۔ پھر طفولیت کی کمزوری کے بعد (قوت دی) قوت سے مراد جوانی شباب ہے۔ ابوبکر اور حمزہ نے تینوں مقامات پر مِنْ ضَعْفٍ پڑھا ہے، یعنی ضاد کو مفتوح پڑھا ہے۔ حفص نے بھی ان مقامات میں عاصم سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ مگر پھر اسے چھوڑ دیا اور ضمہ (پیش) کو اختیار کیا اور اس روایت کی اتباع کی جو فضل بن مرزوق نے عطیہ العوفی کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فتحہ کو رد کر دیا۔ اسی طرح ابوداؤد اور ترمذی نے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے۔ اور یہ روایت ضعیف ہے جیسا کہ الدانی نے کہا ہے اور وہ روایت جو حفص نے عاصم کے واسطہ سے اپنے ائمہ سے نقل کی وہ زیادہ صحیح ہے اور باقیوں نے ان مقامات میں ضاد پر ضمہ پڑھا ہے۔ اسی طرح الدانی نے بھی کہا ہے۔ اور علامہ بغویؒ نے تفسیر میں لکھا ہے کہ حفص نے ضاد کو ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے اسے مفتوح پڑھا ہے۔ پس یہاں یہ دونوں لغتیں ہیں، ضمہ قریش کی لغت ہے اور فتحہ بنی تمیم کی اور قاموس میں ہے کہ ضاد مفتوح ہو تو معنی رائے کا کمزور ہونا ہے اور اگر ضاد مضموم ہو تو اس کا معنی بدن کا کمزور ہونا ہے۔

۳۔ اوہ کمزوری اور قوت، جوانی اور بڑھاپے میں سے جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہی اپنی تخلیق کی تدبیر کو جاننے والا ہے اور جو چاہتا ہے اس پر قدرت رکھتا ہے۔

وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬ مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾

''اور جس روز قیامت قائم ہوگی۔۱ قسمیں اٹھائیں گے مجرم کہ نہیں ٹھہرے وہ (دنیا میں)۔۲ مگر ایک گھڑی یونہی وہ (پہلے بھی) غلط بیانی کیا کرتے تھے۔۳''

۱۔ اور جس روز قیامت قائم ہوگی۔ یہاں قیامت کو ساعت کا نام دیا گیا ہے۔ یا تو اس لیے کہ قیامت دنیا کی ساعتوں میں سے آخری ساعت میں قائم ہوگی یا پھر اس لیے کہ یہ اچانک واقع ہوگی اور غلبہ استعمال کی وجہ سے الساعۃ قیامت کا علم ہوگیا ہے جیسا کہ زھرہ کو الکوکب کہا جاتا ہے۔

۲۔ مشرکین قسمیں اٹھائیں گے کہ وہ دنیا اور قبروں میں نہیں ٹھہرے مگر ایک گھڑی اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے لَقَدْ لَبِثْتُمْ

اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ (کہ تم ٹھہرے رہو نوشتہ الٰہی کے مطابق روز حشر تک)۔

ع یعنی انہوں نے آخرت میں اپنے عذاب کی مدت کی نسبت اس مدت کو قلیل سمجھا یا اس میں وہ اس ٹھہرنے کی مدت کو بھول گئے یا پھر اس لیے کہا کہ چونکہ وہ مدت گزر چکی تھی گویا وہ ایسے ہوگئی جیسے تھی ہی نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس طرح وہ اب صدق اور تحقیق حال سے پھرے ہوئے ہیں اسی طرح وہ دنیا میں حق سے روگرداں تھے اس طرح کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قیامت اور روز حشر کا وجود نہیں ہے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۫ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

"اور کہیں گے وہ لوگ جنہیں علم اور ایمان دیا گیا (انہیں) کہ تم ٹھہرے رہے نوشتہ الٰہی کے مطابق [1] روز حشر تک پس یہ (آگیا) ہے یوم محشر لیکن تم نہیں جانتے تھے [2]"

[1] اس کا عطف يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ پر ہے۔ اور ملائکہ، انبیاء علیہم السلام اور اہل ایمان ان کے قول کا رد کرتے ہوئے کہیں گے کہ تم اتنا زمانہ ٹھہرنے رہے جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ٹھہرنا لکھ دیا تھا۔ یا تم اتنا زمانہ ٹھہرے جتنا تمہارے ٹھہرنے کا زمانہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں لکھ دیا گیا ہے۔ یا پھر کتاب اللہ سے مراد لوح محفوظ ہے یا اس سے ان ملائکہ کے صحف ہیں جو رحموں میں مدت وغیرہ لکھنے کے لیے مقرر ہوتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کی تخلیق کے دوران چالیس دن تک رحم مادر میں نطفہ قیام پذیر رہتا ہے۔ پھر اتنی ہی مدت جمے ہوئے خون کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر اتنے ہی عرصہ کے لیے وہ گوشت کے لوتھڑے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار کلمات کے ساتھ اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے۔ پس وہ اس کے لیے اس کا عمل اور مدت عمر وغیرہ لکھ دیتا ہے الحدیث(1)۔ یا پھر کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔

[2] اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ یہ لَبِثْتُمْ کے متعلق ہے۔ پس یہ آگیا وہ یوم محشر جس کا تم انکار کرتے تھے یعنی تم دنیا میں اس کا انکار کرتے تھے اور آج تمہارے انکار کا باطل ہونا ظاہر ہوگیا ہے۔ لیکن تم نہیں جانتے تھے۔ یعنی یہ تو حق ہے لیکن تمہاری نظر وفکر میں کمزوری تھی۔

فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾

"پس اس دن نہ نفع دے گی ظالموں کو ان کی عذر خواہی [1] اور نہ انہیں اجازت ہوگی کہ توبہ کر کے اللہ کو راضی کر لیں [2]"

[1] کوفیوں نے لَا يَنْفَعُ یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے فاعل مؤنث ہونے کی وجہ سے اسے تاء کے ساتھ لَا تَنْفَعُ پڑھا ہے۔ لیکن فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے اور فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ بھی ہے (لہٰذا دونوں صورتیں جائز ہیں)

[2] اور نہ ان سے رضا کا مطالبہ کیا جائے گا۔ یعنی ان سے ایسی چیزیں طلب نہیں کی جائیں گی جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا سبب بنتی ہیں مثلاً توبہ اور اطاعت وغیرہ جیسا کہ دنیا میں ان سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا۔ عربوں کا قول ہے اِسْتَعْتَبَنِيْ فُلَانٌ فَاَعْتَبْتُهٗ یعنی فلاں نے مجھ سے راضی کرنے والی چیزوں کا مطالبہ کیا تو میں نے وہ کر کے اسے راضی کر لیا۔ یا معنی یہ ہے کہ اس دن ظالموں سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 469 (وزارت تعلیم)

راضی ہونے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا جیسا کہ مؤمنین سے ان کی رضا کا مطالبہ کیا جائے گا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ اہل جنت سے ارشاد فرمائے گا کیا تم راضی ہو؟ تو وہ عرض کریں گے ہمیں کیا ہے کہ ہم راضی نہ ہو حالانکہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمایا ہے جو تو نے مخلوق میں سے کسی کو بھی عطا نہیں فرمایا تو پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا ابھی میں تمہیں اس سے بھی افضل چیز عطا فرماؤں گا؟ تو وہ عرض کریں گے اس سے افضل و بہتر کیا ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا میں اپنی رضا تمہیں عطا فرماتا ہوں اور پھر اس کے بعد کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ متفق علیہ (1) اور اللہ تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا ہے وَلَسَوْفَ یَرْضٰی۔ (حدیث شریف کا عربی متن درج ذیل ہے)

(عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ یَقُوْلُ لِاَهْلِ الْجَنَّةِ هَلْ رَضِیْتُمْ فَیَقُوْلُوْنَ وَمَالَنَا لَانَرْضٰی وَقَدْ اَعْطَیْتَنَا مَا لَمْ تُعْطِ اَحَداً مِنَ الْخَلْقِ فَیَقُوْلُ اَمَا اُعْطِیْكُمْ اَفْضَلَ مِنْ ذٰلِكَ قَالُوْا وَمَا اَفْضَلُ مِنْ ذٰلِكَ فَیَقُوْلُ اُحِلُّ لَكُمْ رِضْوَانِیْ فَلَا اَسْخُطُ بَعْدَهٗ) متفق علیہ۔ (1)

وَ لَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ لَىٕنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اور بے شک ہم نے بیان فرمائی ہے لوگوں کے (بھلے) کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال ۱؎ اور اگر آپ لے آئیں ان کے پاس کوئی نشانی تو (جواباً) یہی کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا نہیں ہو تم مگر باطل پرست ۲؎''

۱؎ اور بے شک ہم نے بیان فرمائی ہے لوگوں کے بھلے کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال۔ یعنی ایسی طرح طرح کی حکایات جو ندرت اور غرابت میں امثال کی مثل ہیں۔ مثلاً قیامت کے دن کفار کو کیسے اٹھایا جائے گا، وہ کیا کہیں گے، ان سے کیا کہا جائے گا اور یہ کہ اس دن معذرت انہیں نفع نہیں پہنچائے گی اور وہ اس سے مستغنی بھی نہیں ہوں گے وغیرہ۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ ہم نے ان کے لیے ہر ایسی مثال بیان کردی ہے جو انہیں توحید قیامت اور رسول کی صداقت پر متنبہ کرتی ہے۔

۲؎ وَلَىٕنْ جِئْتَهُمْ محذوف قسم کا جواب ہے۔ آیة سے مراد یا تو آیات قرآن میں سے کوئی ہے۔ یا پھر اس سے مراد معجزہ ہے جیسے عصا موسیٰ علیہ السلام۔ تو جواباً یہی کہیں گے جنہوں نے اپنی عبادت کی زیادتی اور قساوتِ قلبی کے سبب کفر کیا۔ کہ تم نہیں ہو مگر باطل پرست۔ ان کا یہ خطاب رسول اور مومنین کے لیے ہے۔

كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''یونہی مہر لگا دیتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں پر جو (حق کو) نہیں جانتے ۱؎''

۱؎ جس طرح ہم نے ان کفار مکہ کے دلوں پر مہر لگائی جنہوں نے کہا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید کو نہیں جانتے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ علم طلب ہی نہیں کرتے اور بیہودہ خرافات پر ہی اعتقاد رکھے رہتے ہیں۔ کیونکہ جہل مرکب حق کی پہچان سے مانع ہوتا ہے۔ اور حق کو جھٹلانے کا سبب بنتا ہے۔

۱۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 969 (وزارت تعلیم)

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾

''سو آپ صبر فرمائیں بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور آپ کو پھسلا نہ دیں (راہ حق سے) وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے [1]''

[1] سو آپ ان کی اذیت رسانی پر صبر فرمائیں، بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت فرمانے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو تمام ادیان پر غالب کرنے کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ سچا ہے۔ اور آپ کو خفت اور اضطراب پر برانگیختہ نہ کریں یا وہ آپ کو جہالت اور گمراہی کی اتباع پر نہ ابھاریں جو تکذیب اور ایذاء رسانی کے سبب یقین نہیں رکھتے۔

تفسیر کا اختتام: رجب 1206ھ۔ ترجمہ سورۂ روم 28 جنوری 2000ء بروز جمعۃ المبارک 11 بجے شب اختتام پذیر ہوا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

سورۂ لقمان

آیاتہا ۳۴ — سُوْرَۃُ لُقْمٰنَ مَکِّیَّۃٌ ۳۱ — رکوعاتہا ۴

سورۂ لقمان مکی ہے، اس کی چونتیس آیتیں اور چار رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

الٓمّٓ ۚ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ ﴿۲﴾ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۙ ﴿۳﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۭ ﴿۴﴾

''الف۔ لام۔ میم یہ آیتیں ہیں کتاب حکیم کی [1] سراپا ہدایت اور رحمت ہے نیکوکاروں کے لیے [2] وہ جو صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور یہی لوگ ہیں جو آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں [3]''

[1] یہ آیتیں ایسی کتاب کی ہیں جو حکمت والی ہے۔ یا حکیم حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور مجازاً اس کی نسبت کتاب کی طرف کی گئی ہے۔ اور اٰیٰتُ الْکِتٰبِ میں اضافت منی ہے۔

[2] حمزہ نے اسے مرفوع پڑھا ہے اس لیے کہ یہ تلک کی خبر کے بعد پھر خبر ہے۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ھی ھُدًی وَّرَحْمَۃٌ۔ اور اسے مبالغہ کے معنی پر محمول کیا جائے گا جیسے زید عدل میں ہے۔ یا پھر اس سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی ذات ھُدًی۔ اور باقیوں نے آیات سے حال بناتے ہوئے اسے منصوب پڑھا ہے۔ اور اس میں عامل معنی اشارہ ہے۔

[3] اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ الآیہ ان کے احسان کا بیان ہے۔ یا پھر یہ تینوں یعنی اقامۃ صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ اور ایقان آخرت احسان کے اہم شعبے ہیں اس لیے ان کی فضیلت کے اظہار کے لیے انہیں یہاں بیان کیا گیا ہے۔ ضمیر (ھم) کو مکرر ذکر کرنا تاکید کے لیے ہے کیونکہ یہ اس کے اور اس کی خبر کے درمیان حائل ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

''یہ لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب کی توفیق سے اور یہی لوگ دونوں جہانوں میں کامران ہیں [1]''

[1] وہی لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں کیونکہ وہ عقیدہ حقہ اور عمل صالح کو اپنائے ہوئے ہیں۔ جویبر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ نضر بن حارث نے ایک مغنیہ (گانا گانے والی) خریدی پس جب بھی وہ کسی کے بارے سنتا کہ وہ اسلام لانے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ اسے اس مغنیہ (گانا گانے والی) کے پاس لے جاتا اور اسے کہتا اسے کھلاؤ پلاؤ اور گانا وغیرہ سناؤ (اور ساتھ ہی اس آدمی کو کہتا) کہ جس نماز، روزے اور اپنی معیت میں قتال کرنے کی طرف محمد (ﷺ) تجھے دعوت دیتے ہیں

اس سے یہ دعوت کہیں بہتر ہے۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔(1)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ⑥

''اور کئی ایسے لوگ بھی ہیں جو بیوپار کرتے ہیں (مقصد حیات سے) غافل کر دینے والی باتوں کا۔ تاکہ بھٹکاتے رہیں راہ خدا سے ا (اس کے نتائج بد سے) بے خبر ہو کر ؎ اور اس کا مذاق اڑاتے رہیں یہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے ؎''

ا۔ لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد ہر وہ بات ہے جو نفع بخش باتوں سے غافل کر دے، یعنی ایسی جھوٹی بات جس کی کوئی اصل نہ ہو، ایسے قصے کہانیاں جن کا اعتبار نہ ہو، علاوہ ازیں چٹکلے (ہنسانے والی باتیں) اور فضول کلام کو کہتے ہیں۔ اس میں اضافت بیانیہ ہے، بمعنی مِنْ ہے اگر حدیث سے مراد منکر اور بری بات ہو اور اگر اس سے مراد عام باتیں ہوں (چاہے اچھی ہوں یا بری) تو پھر اضافت تبعیضیہ بمعنی مِنْ ہوگی۔ ابن جریر نے عونی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت قریش میں سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے ایک گانے والی لونڈی خریدی تھی (2)۔ علامہ بغویؒ نے ابو سلمہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ گانے والی عورتوں کو (گانے) کی تعلیم دینا جائز نہیں ہے اور ان کے ثمن (قیمت) حرام ہیں۔ اور ایسے ہی ایک آدمی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ الآیہ۔ اور جو آدمی بھی گانے کے لیے اپنی آواز بلند کرتا ہے اللہ تعالیٰ دو شیطان اس کے پاس بھیج دیتا ہے۔ ان میں سے ایک اس کے ایک کندھے پر ہوتا ہے اور دوسرا دوسرے کندھے پر اور وہ دونوں اسے اپنی ٹانگوں کے ساتھ مارتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ خاموش ہو جاتا ہے (3)۔ ترمذی وغیرہ نے حضرت ابو امامہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم گانے والیوں کو نہ بیچو، نہ انہیں خریدو اور نہ انہیں تعلیم دو ان کی تجارت میں کوئی بھلائی اور منافع نہیں ہے اور ان کے ثمن حرام ہیں۔ ایسے آدمی کے بارے میں ہی یہ آیت نازل کی گئی ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ (4)۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ مقاتل اور کلبی نے کہا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث بن کلدہ کے بارے نازل ہوئی ہے۔ وہ تجارت کی غرض سے حیرہ میں آتا اور وہاں سے عجمیوں کے افسانے خرید کر لے جاتا اور قریش کے سامنے جا کر بیان کرتا اور ساتھ یہ کہتا تھا کہ محمد (ﷺ) تمہارے سامنے عاد و ثمود کے قصے بیان کرتے ہیں اور میں تمہیں رستم، اسفندیار اور شہنشاہان ایران کے قصے سناتا ہوں۔ پس وہ لوگ بڑے لطف اور مزے سے اس کی باتیں سنتے تھے اور قرآن کریم سننا چھوڑ دیتے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (5)۔ اسی طرح بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ مجاہد نے کہا ہے کہ لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد گانے والی عورتیں اور گانے والے مرد ہیں اس صورت میں لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے پہلے مضاف محذوف ہوگا اور وہ ذات یا ذا ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا جو بیوپار کرتے ہیں غافل کر دینے والی باتیں کرنے والیوں یا والوں کا یا مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ کا معنی ہوگا جو گانے اور ان کے آلات قرآن کے بدلے خریدتے یا انہیں پسند کرتے ہیں۔(6) (یعنی جو قرآن

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 307 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 41 (الامیریہ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 154 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (التجاریۃ)

پر انہیں ترجیح دیتے ہیں)۔

مکحول کا قول ہے کہ جس کسی نے گانے والی کو خریدا تا کہ وہ اپنے گانے بجانے کے سبب اسے نفع پہنچائے اور پھر وہ اپنی اسی حالت پر قائم رہا یہاں تک کہ مر گیا تو میں اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ الآیہ۔(1)

حضرت ابن مسعود، ابن عباس، حسن، عکرمہ اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم تمام نے یہ کہا ہے کہ لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد گانا سننا اور گانا ہے اور یہ آیت بھی اسی بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ابو الصہباء البکری نے کہا ہے میں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا۔ تو انہوں نے فرمایا اس سے مراد گانا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں آپ نے یہ جواب تین بار دہرایا۔

ابن جریج نے کہا ہے لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد طبل (ڈھول، طبلہ) ہے(2)۔ میں کہتا ہوں کہ نص وارد ہونے کا سبب اگرچہ خاص ہے اور وہ گانا سننا یا عجمیوں کے قصے اور افسانے ہیں لیکن لفظ عام ہے۔ اور اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ خاص سبب کا۔ اسی وجہ سے قتادہؒ نے کہا ہے کہ لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد ہر لہو ولعب ہے اور ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد شرک ہے۔(3)

مسئلہ: فقہاء(۱) کا اس پر اتفاق ہے کہ آلات موسیقی (سرنگی، باجا، طبلہ، اور ڈھول وغیرہ) بجانا حرام ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے کتے کی قیمت اور بانسری وغیرہ کی کمائی سے منع کیا ہے۔ اسے بغویؒ نے روایت کیا ہے(4)۔ حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا میری امت میں سے لوگ شراب پئیں گے اور اسے نام اس کے علاوہ کچھ اور دیں گے اور ان کے پاس باجے بجائے جائیں گے(5)۔ گانے والیاں گائیں گی اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو زمین میں دھنسا دے گا اور انہیں بندر اور خنزیر بنا دے گا۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور اس کی اصل صحیح بخاری میں ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب میری امت پندرہ کام کرنے لگے گی تو اس پر بلائیں اور مصیبتیں اترنے لگیں گی۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ وہ کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا (1) جب مال غنیمت کو دولت سمجھا جائے گا، (2) جب امانت کے مال کو مال غنیمت تصور کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (التجاریہ) 5۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 409 (العلمیہ)

(۱) الملتقط میں ہے کہ باجا بجانا اور سننا حرام ہے۔ اور فتاویٰ کبریٰ میں ہے کہ طبل (ڈھول) بجانا اور سننا حرام ہے کیونکہ یہ آلات لہو میں سے ہے۔ البتہ جنگ کی اطلاع اور قافلہ کی آمد پر ڈھول بجانا مباح ہے۔ کیونکہ اس میں مجاہدین اور قافلہ کے رفقاء کو اطلاع مقصود ہوتی ہے اور وہ باعث ثواب ہے۔ اور ملتقط میں ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ خوشی اور شادی وغیرہ کی تقریب میں گانا گانے میں کوئی حرج نہیں کیا آپ دیکھتے نہیں کہ خوشی اور شادی وغیرہ میں دف بجانے میں کوئی حرج نہیں، اگرچہ یہ بھی لہو کی ایک قسم ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ باعث حرج نہیں۔ کیونکہ اس کا مقصد نکاح کا اظہار اور اعلان ہوتا ہے۔ اور اس کا حکم رسول اللہ ﷺ نے اس طرح فرمایا اَعْلِنُوْا النِّكَاحَ وَلَوْ بِالدُّفِّ (اعلان نکاح کرو اگرچہ دف کے ساتھ ہی ہو) اور فتویٰ اسی پر ہے۔ اور ذخیرہ میں ہے بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ عیدوں کے دنوں میں دف بجانے میں کوئی حرج نہیں۔ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید کے دن اپنے کاشانہ اقدس میں تشریف فرما تھے کہ گھر کی دہلیز کے پاس دو نو عمر لڑکیاں دف بجا کر گا رہی تھیں۔ اتنے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپ نے انہیں فرمایا کیا تم رسول اللہ ﷺ کے گھر کی دہلیز کے پاس گا رہی ہو؟ تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا انہیں چھوڑ دو۔ آج عید کا دن ہے۔ (از مفسر قدس سرہ)

جائے گا(3) جب زکوٰۃ کو چٹی اور جرمانہ سمجھا جائے گا(4) جب مرد اپنی بیوی کا مطیع وفرمانبردار ہو جائے گا(5) اور اپنی ماں کا نافرمان ہو گا(6) اپنے دوست سے اچھا سلوک کرے گا(7) اور اپنے باپ سے ظلم وزیادتی کرے گا(8) جب مساجد میں آوازیں بلند ہونے لگیں گی(9) جب قوم کا سردار ان میں سے رذیل اور سب سے گھٹیا آدمی ہو گا(10) جب کسی آدمی کی تکریم اس کے شر سے بچنے کے لیے ہو گی(11) جب شراب پی جائے گی(12) اور ریشم پہنا جائے گا(13) جب گانے والیاں رکھی جائیں گی(14) باجے اور دیگر آلات بجائے جائیں گے(15) اور اس امت میں پیچھے آنے والے لوگ اس کے پہلے آنے والے لوگوں (اسلاف) پر لعنت بھیجیں گے۔ پس ایسے حالات میں لوگوں کو چاہئے کہ وہ سرخ آندھی، زمین میں دھنسائے جانے اور صورتیں مسخ ہونے کا انتظار کریں۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔(1)

مسئلہ: فقہاء نے کہا ہے کہ اس آیت طیبہ اور ان احادیث کے مطابق جو ہم نے ذکر کی ہیں گانا حرام ہے کیونکہ یہ **لهو الحديث** ہے۔ اور صوفیاء نے کہا ہے کہ ایسا آدمی جس کا دل ذکر الٰہی سے مطمئن ہو، یاد الٰہی میں مصروف ہو، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کی طرف متوجہ نہ ہو، گانے والا شہوت کا محل اور باعث نہ ہو، مجلس اغیار سے خالی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ نماز یا اسی طرح کی کسی اور عبادت کا وقت بھی نہ ہو تو اس صورت میں ایسے افراد کے لیے سماع جائز ہے بلکہ مستحب ہے کیونکہ سماع میں یہ خاصیت ہے کہ اس کے سبب دل میں مستور منجمد آتش محبت بھڑک اٹھتی ہے۔ اور یہی عوام الناس کے حق میں سماع کے حرام ہونے کا سبب ہے کیونکہ عوام کے دل عورتوں اور بچوں (اور لڑکوں) کی محبت میں مشغول ومصروف ہوتے ہیں۔ پس سماع کے وقت وہ محبت مشتعل ہو جاتی ہے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد سے غافل کر دیتی ہے۔ اس لیے یہ ان کے حق میں لَهْوَ الْحَدِيْثِ ہے۔ اور وہ آدمی جس کا دل اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی یاد میں مشغول ہو اور غیر اللہ سے فارغ ہو تو اس کے حق میں سماع محبت الٰہی کو تیز تر کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ پس ایسے آدمی کے حق میں یہ مستحب(۱) ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 44 (وزارت تعلیم)

(۱) شرح کافی میں ہے کہ ہمارے علماء کے نزدیک وہ سماع مکروہ ہے جو لھو ولعب کے لیے اور گناہ کے ارادے سے ہو اس طرح کہ بہت سے فاسق لوگ اس کے لیے اکٹھے ہوں اور اس کے لیے وہ نماز اور قرأت قرآن کو بھی ترک کر دیں۔ اور اگر اجتماع ایسے صالحین اور متقی لوگوں کا ہو جو نماز کے پابند بھی ہوں اور قرأت قرآن کے تارک بھی نہ ہوں تو ان کے لیے سماع حلال ہے اور اس میں ہمارے علماء کے مابین اختلاف نہیں۔ جبکہ وہ اس سے توبہ الی اللہ اور اس کی بارگاہ کی حاضری کا قصد کرتے ہوں۔ یہ تمام امور قابل تعریف ہیں مذموم نہیں۔ اس صورت میں وجد اور رقص بھی قابل مذمت نہیں۔ اور النوری شرح بزدوری مصنفہ ابو القاسم بن محمد بن عبد اللہ دمشقی میں ہے کہ سماع کے بارے میں ہمارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ پس ایسا سماع جو لہو ولعب کی طرز پر ہو، فاسق لوگ جمع ہوتے ہوں، وہ شراب پیتے ہوں اور نماز کے تارک ہوں تو ان کے لیے یہ حرام ہے اور اگر ایسے لوگ سماع سنیں جو صالح اور متقی ہوں، ہمیشہ نماز کے پابند ہوں اور اوراد ووظائف اور قرأت قرآن کے تارک نہ ہوں تو ان کے لیے حلال ہے۔ اس پر ہمارے علماء کا اتفاق ہے۔ یہی حکم وجد اور رقص کا بھی ہے۔ الاقناع میں ہے کہ سماع سے رقت قلب اور خشوع حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے دیدار کا شوق بڑھتا ہے، اس کی ناراضگی اور عذاب سے خوف آنے لگتا ہے اور یہ اسکی بارگاہ کا قرب عطا فرماتا ہے۔ پس جب سماع اس طرح ہو تو اس میں لھو اور خواہشات نفسانی کا شائبہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے العوارف میں ذکر کیا ہے کہ سماع اللہ کریم کی رحمت کو کھینچ لاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور فتاویٰ الخلاصہ میں ہے کہ یہ جاننا ضروری ہے کہ عام مشائخ کے نزدیک کسی غیر کو مانوس کرنے کے لیے گانا گانا مکروہ ہے اور بعض نے شادی اور خوشی کے مواقع پر اسے جائز بھی قرار دیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک اپنی ذاتی وحشت اور پریشانی کو دور کرنے کے لیے گانا مکروہ نہیں ہے۔ امام سرخسیؒ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ اور ان کے نزدیک سماع مکروہ ہے۔ جبکہ لہو ولعب کی طرز پر ہو۔ اور بعض علماء کا خیال ہے گانے کی تمام صورتیں مکروہ ہیں۔ امام خواہر زادہ کا نظریہ یہی ہے۔ (جاری ہے)

سماع کی حرمت کے بارے مذکورہ نصوص کا جواب یہ ہے کہ آیت طیبہ نے لَهْوَ الْحَدِيْثِ کو حرام قرار دیا ہے۔ جبکہ صوفیاء کا سماع لَهْوَ الْحَدِيْثِ نہیں ہے۔ اور وہ احادیث جو غناء کی حرمت کو ثابت کرتی ہیں وہ مخصوص عنہ البعض ہیں کیونکہ ایسی دوسری احادیث بھی موجود ہیں جو سماع کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا ہم نے ان احادیث کو جن میں حرمت غناء مذکور ہے کو ایسے سماع پر محمول کیا ہے جو لھو ولعب کے ارادہ سے ہو، کوئی شرعی مقصد نہ ہو اور وہ فسق کی طرف دعوت دینے والا ہو۔ پس اب ہم وہ احادیث ذکر کریں گے جو غناء کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں بلکہ دف بجانا بھی مباح قرار دیتی ہیں۔ چنانچہ ربیع بنت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ جب میری شادی ہوئی تو اس دن رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور میرے بستر پر ایسے تشریف فرما ہوئے جیسے تم میرے قریب بیٹھے ہوئے ہو۔ پس ہمارے ہاں کچھ بچیاں دف بجانے لگیں اور آباء میں سے ان کا مرثیہ کہنے لگیں جو یوم بدر کو مقتول ہوئے تھے تو اسی دوران ان میں سے ایک لڑکی نے کہا وَفِيْنَا نَبِيٌّ يَّعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ (اور ہمارے درمیان ایک ایسے نبی ہیں جو آئندہ کل ہونے والے واقعات کا علم رکھتے ہیں) تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دے اور جو کچھ پہلے کہہ رہی تھی وہی کہہ۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔ اور ابن ماجہ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اور اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ تم اس طرح نہ کہو کیونکہ آئندہ کل کی باتیں سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نے انصار میں سے ایک آدمی کے ساتھ شادی کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارے ساتھ لہو (گانے بجانے) کا انتظام نہیں ہے۔ حالانکہ انصار کو تو لھو پسند ہوتا ہے۔ (رواہ البخاری)(2)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس نکاح کا اعلان کرو، مساجد میں کرو اور اس پر دف بجاؤ۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے(3)۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ میرے پاس انصار کی ایک بچی تھی میں نے اس کی شادی کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ! کیا تو نہیں گائے گی انصار کا یہ قبیلہ تو غناء کو پسند کرتا ہے۔ اسے ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک قرابت دار لڑکی کی شادی انصار میں سے کسی سے کی، تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کیا تم نے دوشیزہ کو کچھ تحائف بھی دیئے ہے۔ تو انہوں نے عرض کی جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی گانے والی بھی بھیجی ہے۔ تو حضرت عائشہؓ نے عرض کی نہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک انصار تو ایسی قوم ہے جس میں غناء پسند ہے۔ پس اگر تم اس کے ساتھ کوئی ایسے بھیج دیتی جو یہ گیت جا کر گاتے اَتَيْنَاكُمْ اَتَيْنَاكُمْ فَحَيَّانَا وَحَيَّاكُمْ (تو اچھا ہوتا) (ہم تمہارے پاس آئی ہیں پس یہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 775 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 775 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 129 (وزارت تعلیم)

گزشتہ سے پیوستہ

اور جامع المضمرات میں النافع اور الذخیرہ کے حوالہ سے ہے کہ اگر گانے والا کسی دوسرے کو نہ سنائے بلکہ صرف اپنے آپ سے ہی وحشت دور کرنے کے لیے گائے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور کہا ہے کہ میں نے الامام الاجل شیخ نجم الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ سے سنا ہے کہ اگر وہ اپنی لونڈی سے بھی اس مقصد کے لیے سنے تو سماع اس کی اس کے لیے مباح ہے۔ انہوں نے اس کی اس قول کی نسبت واقعات حسامیہ کی طرف کی ہے۔ اور عوارف میں اپنی لونڈی یا اپنی بیوی مذکور ہے۔ جیسا کہ فتاویٰ ابراہیم شاہی میں ہے۔ اور المحیط میں ہے کہ امام محمدؒ نے السیر الکبیر میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ اپنے بھائی براء بن مالک کے پاس گئے تو اس وقت وہ گا رہے تھے۔ (از مفسر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ہمارے لیے بھی مبارک ہو اور تمہارے لیے بھی مبارک ہو) رواہ ابن ماجہ (1)۔ عامر بن سعد نے کہا ہے کہ میں ایک شادی میں شامل ہوا اور وہاں قرظہ بن کعب اور ابومسعود انصاری بھی تھے اور اس وقت چند بچیاں گا رہی تھیں۔ تو میں نے کہا اے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ اور اے اہل بدر! کیا تمہارے پاس یہ کچھ کیا جا رہا ہے؟ تو ان دونوں نے مجھے کہا اگر چاہے تو بیٹھ جا اور ہمارے ساتھ تو بھی سن۔ اور اگر چاہے تو واپس چلا جا۔ کیونکہ شادی کے موقع پر ہمیں گانا سننے کی رخصت دی گئی ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق میرے پاس تشریف لائے۔ یہ ایام منٰی یعنی عید کے دن تھے۔ میرے پاس بیٹھ کر دو لڑکیاں دف بجا رہی تھیں اور حضور نبی کریم ﷺ کپڑا لے کر استراحت فرما تھے۔ پس ابوبکر صدیق ؓ نے ان دونوں لڑکیوں کو جھڑکا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے رخ زیبا سے کپڑا اتارا اور فرمایا اے ابوبکر! انہیں رہنے دو کیونکہ یہ عید کے ایام ہیں۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے (2)۔ اور ابن ماجہ میں ہے۔ بے شک ہر قوم کے لیے عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے (3)۔ حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں نے یہ نذر مانی تھی کہ میں (آپ کے تشریف لانے کی خوشی میں) آپ کے سر پر (یعنی آپ کے پاس) دف بجاؤں گی تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا تو اپنی نذر پوری کر لے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے (4)۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ایسی نذر جس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی ہو اسے پورا نہ کیا جائے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (5)۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے اور بنی نجار میں اترے تو بنی نجار کی بچیاں یہ شعر گانے لگیں۔

نَحْنُ جَوَارٌ مِنْ بَنِی نَجَّارِ   یَا حَبَّذَا مُحَمَّدًا مِنْ جَارِ

(ہم بنی نجار کی بچیاں ہیں۔ محمد ﷺ بہت اچھے پڑوسی ہیں)(6)۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت انس ؓ سے روایت کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا اللہ تعالیٰ جانتا ہے بے شک میں تم سے محبت رکھتا ہوں امام بیہقی نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ ؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو عورتیں، بچیاں اور بچے یہ شعر گانے لگیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا   مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ

وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا   مَا دَعٰی لِلّٰہِ دَاعٍ

اَیُّهَا الْمَبْعُوْثُ فِیْنَا   جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاعِ

(ہم پر وداع کی گھاٹیوں سے چودھویں کا چاند طلوع ہوا ہے۔ جب تک کوئی اللہ تعالیٰ کی یاد کرنے والا باقی رہا ہم پر واجب ہے کہ ہم اس نعمت کا شکر ادا کرتے رہیں۔ اے ہم میں مبعوث ہونے والے نبی! ﷺ آپ ایسے احکام لے کر تشریف لائے جن کی پیروی لازم ہے)(7)۔ امام احمد ؒ نے حضرت انس ؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کی آمد کی خوشی میں حبشیوں نے چھوٹے چھوٹے نیزوں کا کھیل پیش کیا (8)۔ محمد بن حاطب جمحی سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا حلال وحرام کے مابین فرق کرنے کے لیے نکاح کے وقت دف بجانا اور گیت گانا ہے (9)۔ اسے احمد، ترمذی، نسائی اور ابن

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 445 (العلمیہ)   2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 135 (وزارت تعلیم)   3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 445 (العلمیہ)

4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 469 (نور محمد)   5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 45 (وزارت تعلیم)   6۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 3 صفحہ 274 (العلمیہ)

7۔ [illegible] 274 (العلمیہ)   8۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 3 صفحہ 271 (العلمیہ)   9۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 129 (وزارت تعلیم)

ماجہ نے روایت کیا ہے۔ پس مذکورہ بحث سے یہ معلوم ہوا کہ وہ غناء حرام ہے جو فسق کی دعوت دیتا ہو اور یاد الٰہی سے غافل کرتا ہو۔ اور جو غناء اس طرح نہ ہو وہ حرام نہیں۔ مگر تقرب الی اللہ کے لیے غناء کا سماع نہ تو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے۔ اسی لیے سلسلہ نقشبندیہ کے اکابرین نے اسے پسند نہیں کیا۔ اگرچہ انہوں نے سماع کا انکار بھی نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

۲؎ تاکہ لوگوں کو بھٹکاتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ کے دین سے یا اس کے ذکر اور کتاب کی قرأت سے ابن کثیر اور ابو عمرو نے لِیَضِلَّ صیغہ مجرد کی صورت میں یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے وہ اپنی گمراہی پر ڈٹا رہتا ہے اور اس میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

۳؎ اس شے کی حالت سے بے خبر ہو کر جسے وہ خریدتا ہے یا وہ اس تجارت کی کیفیت سے بے خبر ہے جس کے سبب اس نے قرأت قرآن کے بجائے لہو ولعب کو اختیار کر لیا ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے کسی آدمی کی گمراہی کے لیے یہی کافی ہے کہ باطل اور غلط بات کو حق اور سچی بات پر ترجیح دے۔

۴؎ اور وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو مذاق بنا لے۔ حمزہ، کسائی، یعقوب اور حفص نے یَتَّخِذَ کا لِیُضِلَّ پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے اور باقیوں نے یَشْتَرِیْ پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ هُزُوًا مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی هزوًا بمعنی مهزوًا به یعنی جس سے مذاق کیا جائے) یہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْۤ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

"اور جب پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اسے ہماری آیتیں تو منہ پھیر لیتا ہے تکبر کرتے ہوئے گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں ۱؎ جیسے اس کے دونوں کان بہرے ہیں ۲؎ سو آپ اسے دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیں ۳؎"

۱؎ اور جب اسے ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ ان کی طرف تکبر کرتے ہوئے توجہ نہیں کرتا۔ اس جملہ شرطیہ کا عطف یَشْتَرِیْ پر ہے اور كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا یہ وَلّٰى یا مُسْتَكْبِرًا میں پوشیدہ ضمیر سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔

۲؎ اُذُنَيْهِ کو نافع نے جنس کے ارادہ پر مفرد لفظ کی صورت میں اُذْنِهِ پڑھا ہے۔ اور "وَقْرًا" سے مراد ایسا بوجھ ہے جو سننے سے مانع ہو۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا سے بدل ہے یا لَمْ يَسْمَعْهَا میں پوشیدہ ضمیر سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔

۳؎ پس آپ اسے دردناک عذاب کی خبر دے دیں جس کے سبب وہ برباد ہو جائے گا۔ یہاں بشارت اور خوشخبری کا ذکر استہزاء اور تہکم کے طور پر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے خوشیوں والے باغات ہیں ۱؎ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ۲؎ اللہ کا یہ سچا وعدہ ہے ۳؎ اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے ۴؎"

۱؎ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے خوشیوں والے باغات ہیں۔ جنت النعیم اصل میں نعیم الجنات

ہے اس میں تبدیلی مبالغہ کے اظہار کے لیے ہے۔

۲۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا۔ لهم کی ضمیر سے حال مقدر ہے یا جنّات سے۔ اور اس میں عامل وہ فعل ہے جس کے متعلق لام ہے۔ یعنی جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو اس میں ان کا ہمیشہ رہنا مقدر کر دیا گیا ہے۔

۳۔ یعنی وعد الله وعداً (اللہ تعالیٰ کا یہ سچا وعدہ ہے)۔ اس میں وعدًا ماقبل مذکور وعدہ کی تاکید کے لیے ہے۔ "حَقًّا" کا مفہوم ہے وہ وعدہ بالکل حق ہے۔ حقًّا مصدر اپنے غیر کی تاکید کے لیے ہے کیونکہ وعدے کا حق ہونا نفس وعدہ کا مغایر ہے۔

۴۔ اور وہی ہر شے پر غالب ہے۔ کوئی شے اسے اپنا وعدہ اور وعید پورا کرنے سے روک نہیں سکتی۔ وہ وہی فعل کرتا ہے جس کا تقاضا حکمت کرتی ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ ﴿۱۰﴾

"اس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو[1] ایسے ستونوں کے بغیر جنہیں تم دیکھ سکو[2] اور کھڑے کر دیئے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تاکہ زمین ڈولتی نہ رہے ساتھ تمہارے[3] اور پھیلا دیے ہیں اس میں ہر قسم کے جانور اور اتارا ہم نے آسمان سے پانی، پس اگائے ہم نے زمین میں ہر نوع کے نفیس جوڑے[4]"

۱۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ۔ الحکیم کی صفت ہے اور اس سے پہلے اسم موصول محذوف ہے تقدیر کلام ہے الّذی خلَقَ یا پھر اس میں ضمیر مستتر سے حال ہے۔ اس صورت میں اس سے پہلے قد مقدر ہے۔ یا پھر محل تعلیل میں جملہ مستأنفہ ہے۔

۲۔ تَرَوْنَهَا کا جملہ عَمَدٍ کی صفت ہے۔ اور ضمیر اسی کی طرف راجع ہے۔ اور وہ یہ فرما رہا ہے کہ ان کے لیے بالکل کوئی ستون نہیں۔ یا ضمیر کا مرجع السّمٰوٰت ہے اور جملہ کا ترکیب میں کوئی محل نہیں ہے یہ مفہوم سورۂ رعد میں گذر چکا ہے

۳۔ رَوَاسِیَ سے مراد زمین میں مضبوط گڑھے ہوئے پہاڑ ہیں۔ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ یہ عبارت ہے لان لا تمیدبکم تاکہ وہ تمہارے ساتھ ڈولتی نہ رہے۔

۴۔ اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے ہیں اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا۔ پس ہم نے زمین میں ہر نوع کے نفیس جوڑے اگائے۔ یعنی ہر اچھی اور کثیر المنفعت نوع سے۔ اس میں غیب سے تکلّم کی طرف التفات ہے۔ گویا اس سے اس کے غلبے پر استدلال ہے کہ اسے کمال قدرت حاصل ہے اور اس کی حکمت پر استدلال ہے جو کہ کمال علم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس سے توحید کی بنیاد کو ہموار کیا اور اپنے اس قول کے ساتھ اسے مضبوط اور پختہ کیا۔ یعنی یہ جو میں نے ذکر کیا ہے تم اسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۱﴾

"یہ تو ہے اللہ کی تخلیق (اے مشرکو!) اب ذرا دکھاؤ مجھ کو، کیا بنایا ہے اوروں نے اس کے سوا؟ (کچھ بھی نہیں)[1] مگر یہ ظالم کھلی گمراہی میں ہیں[2]"

۱۔ فَاَرُوْنِیْ میں فاء سببیہ ہے۔ یعنی جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہ تو اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ پس اے مشرکو! تم دکھاؤ تمہارے معبودوں نے

کیا پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہونے کے مستحق ہو گئے۔ ترکیب کلام میں مَاذَا یا تو خَلَقَ کے سبب منصوب ہے۔ یا مَا استفہام انکاری کے لیے مبتدا ہے اور ذا بمعنی الَّذِی اپنے صلہ کے ساتھ مل کر اس کی خبر ہے۔ فَأَرُوْنِيْ معلق عن العمل ہے (یعنی یہ فعل قلب تعلیق کے باب سے ہے) اور اس کا مابعد دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

۳؎ (مگر یہ ظالم کھلی گمراہی میں ہیں) یہ اضراب ان پر ایسی گمراہی کی مہر ثبت کرنے کے لیے ہے جو کسی معمولی غور و فکر کرنے والے پر بھی مخفی نہیں۔ اس میں الظالمون اسم ظاہر ضمیر کی جگہ پر رکھا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ہی ظلم کرنے والے ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ یَّشْكُرْ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴿۱۲﴾

''اور ہم نے عنایت فرمائی لقمان کو ۱؎ حکمت (ودانائی) ۲؎ اور فرمایا اللہ کا شکر ادا کرو ۳؎ اور جو شکر ادا کرتا ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے ۴؎ اور جو کفران نعمت کرتا ہے تو بے شک اللہ تعالیٰ غنی ہے حمید ہے ۵؎''

۱؎ علامہ بغویؒ نے لقمان کا سلسلہ نسب اس طرح بیان کیا ہے لقمان بن باعور بن ناخور بن تارخ اور یہی تارخ آزر تھا۔ اور مزید کہا کہ وہب کا قول ہے لقمان حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے۔ اور مقاتل نے ذکر کیا کہ وہ حضرت ایوب علیہ السلام کی خالہ کے بیٹے تھے (1)۔ اور علامہ بیضاویؒ وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ لقمان زندہ رہے یہاں تک کہ انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو پالیا اور پھر ان سے علم حاصل کیا وہ حضرت داؤد علیہ السلام کی بعثت سے قبل فتویٰ دیا کرتے تھے (2)۔ مگر آپ علیہ السلام کی بعثت کے بعد فتویٰ دینا چھوڑ دیا۔ اور کہا کیا میں قناعت اختیار نہ کروں جب میں قناعت اختیار کر سکتا ہوں (کیا میں فتویٰ دینے سے باز نہ رہوں جبکہ میں اس سے بے نیاز ہو سکتا ہوں)۔ واقدی نے کہا ہے کہ لقمان بنی اسرائیل کے قاضی تھے (3)۔ اور درمنثور میں ہے کہ ابن ابی شیبہ اور احمد نے الزہد میں، ابن ابی الدنیا نے کتاب المملوکین میں، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے اور بڑھئی تھے (4)۔ اسی طرح علامہ بغویؒ نے خالد الربعی سے نقل کیا ہے۔ اور مزید کہا کہ مجاہد نے کہا ہے لقمان غلام تھے۔ ان کی رنگت سیاہ تھی، ہونٹ بڑے بڑے تھے اور ان کے پاؤں پھٹے رہتے تھے (5)۔ اور حضرت سعید بن مسیبؓ نے فرمایا کہ لقمان درزی تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ریوڑ (بھیڑ بکریاں) چرایا کرتے تھے (6)۔ واللہ اعلم۔

۲؎ قاموس میں ہے کہ حکمت سے مراد عدل وانصاف علم، حلم (بردباری) نبوت، قرآن کریم اور انجیل سب ہو سکتے ہیں (7)۔ حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً میں حکمت سے مراد علم ہے۔ اور آپ ﷺ کے ارشاد اَلَا وَفِیْ رَأْسِهٖ حِكْمَةٌ میں حکمت سے مراد عقل ہے۔ یہ مقام مذکورہ معانی میں سے تمام کا احتمال رکھتا ہے۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ تمام علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے لقمان حکیم تھے، یعنی آپ فقیہ عالم تھے نبی نہیں تھے۔ مگر عکرمہ نے کہا ہے کہ آپ نبی تھے۔ لیکن عکرمہ اپنے اس قول میں منفرد ہیں (8)۔ ابن ابی حاتم نے وہب بن منبہ سے یہ روایت کی ہے کہ ان سے پوچھا گیا کیا لقمان نبی تھے تو انہوں نے کہا نہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7 صفحہ 415 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 310 (العلمیہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)
7۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 444 (التراث العربی)
8۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)

ان کی طرف وحی نہیں بھیجی گئی بلکہ وہ حکیم (دانا) آدمی تھے۔اسی طرح ابن جریر نے مجاہد سے نقل کیا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ لقمان کو نبوت اور حکمت کے درمیان اختیار دیا گیا تھا تو انہوں نے حکمت کو اختیار (پسند) کیا۔علامہ بغویؒ نے لکھا ہے یہ بھی مروی ہے کہ آپ دوپہر کے وقت سو رہے تھے تو غیب سے آواز دی گئی اے لقمان! کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین میں تجھے خلیفہ بنا دے اور آپ لوگوں کے درمیان حق کے فیصلے کریں۔تو آپ نے اس غیبی آواز کا جواب دیتے ہوئے کہا اگر میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے تو پھر تو میں نے عافیت کو اختیار کیا۔(یعنی مجھے لوگوں کے جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں)۔اور اگر اللہ تعالیٰ نے میرے لیے اس کا قطعی فیصلہ اور ارادہ فرمالیا ہے تو پھر امنا و صدقنا سر تسلیم خم۔کیونکہ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ ضرور میری معاونت بھی فرمائے گا اور غلطی سے میری حفاظت بھی فرمائے گا۔یہ سن کر ان ملائکہ نے بلند آواز سے کہا جنہیں وہ دیکھ نہیں رہے تھے اے لقمان! تم نے ایسا کیوں کیا؟ تو آپ نے کہا کیونکہ سخت ترین اور مبہم مقامات پر فیصلہ ہر جانب سے ظلم و زیادتی سے گھرا ہوا ہوتا ہے۔اگر لقمان نے اپنی چھان بین اور جستجو سے صحیح فیصلہ کیا تو وہ نجات پائے گا اور اگر اس نے خطا کا ارتکاب کیا تو گویا اس نے جنت کا راستہ کھو دیا۔اور جو دنیا میں عاجز اور حقیر بن کر رہتا ہے وہ اس سے بہتر ہوتا ہے جو سردار اور بڑا بن کر رہے۔اور جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو پسند کرتا ہے دنیا اس سے ضائع ہو جاتی ہے اور وہ آخرت تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔پس ملائکہ آپ کے حسن گفتگو سے بہت متعجب ہوئے۔پس آپ ابھی نیند کی حالت میں ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمت عطا فرما دی۔جب آپ بیدار ہوئے تو آپ حکیمانہ گفتگو فرمانے لگے۔پھر اس کے بعد داؤد علیہ السلام کو آواز دی گئی تو آپ نے اسے قبول کر لیا اور لقمان کی طرح آپ نے کوئی شرط عائد نہیں کی۔یہی وجہ ہے کہ وہ کئی بار خطا میں واقع ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ہر بار آپ کو معاف فرما دیا۔اور لقمان اپنی حکمت کے ساتھ ان کی مدد کرتے تھے(1)۔یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حکمت سے مراد لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں عدل کرنا نہیں۔البتہ حکمت کی تفسیر میں علامہ جزری نے النہایہ میں لکھی ہے وہ انتہائی عمدہ ہے کہ حکمت سے مراد افضل ترین علم کے ساتھ سب سے افضل شے کی معرفت حاصل کرنا ہے۔میں کہتا ہوں کہ تمام چیزوں میں سے افضل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جیسا کہ خود رب کریم نے ارشاد فرمایا لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ۔اور مزید ارشاد فرمایا اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ اور افضل ترین علم وہ ہے جس پر غفلت طاری نہ ہو اور وہ علم حضوری ہے۔کیونکہ علم حصولی غفلت سے بچ نہیں سکتا۔اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ علم حصولی کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو جاننا ممکن بھی نہیں۔کیونکہ علم حصولی سے مراد ذہن میں کسی شے کی صورت کا آنا ہے۔اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات صورت اور کسی حیز میں ہونے سے مبرہ ومنزہ ہے۔بلکہ وہ علم جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق ہے وہ علم حضوری سے بھی فائق اور اعلیٰ ہے۔اور وہ علم حضوری جو عالم کی ذات سے تعلق رکھتا ہے اس کی نسبت اس کے علم کے ساتھ ایسے ہی ہے جو علم حصولی کو علم حضوری کے ساتھ ہے۔اور وہ علم قلب انسانی کے خصائص میں سے ہے۔اسی وجہ سے حدیث قدسی میں ہے "لَا يَسَعُنِيْ اَرْضِيْ وَلَا سَمَائِيْ وَلٰكِنْ يَسَعُنِيْ قَلْبُ عَبْدِي الْمُؤْمِنِ" (میری زمین اور آسمان میری وسعت نہیں رکھتے (یعنی وہ مجھے اپنے اندر نہیں سما سکتے) لیکن بندۂ مومن کا دل میری وسعت رکھتا ہے (یعنی وہ مجھے اپنے اندر سما سکتا ہے) اور وہ علم اولیاء اللہ میں سے اخص الخواص کو حاصل ہوتا ہے۔واللہ اعلم۔

حاکمؒ اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ لقمان حضرت داؤد علیہ السلام کے غلام تھے۔وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 179 (لقمان)

زر ہیں بناتے رہے لیکن آپ نے ان سے ان کے بارے کچھ نہ پوچھا۔ پس جب آپ مکمل کر چکے تو اسے پہن کر فرمایا نِعْمَ لَبُوْسُ الْحَرْبِ اَنْتَ (تو بہت اچھا جنگی لباس ہے)۔ تو یہ سن کر لقمان نے کہا اَلصَّمْتُ حِكْمَةٌ وَقَلِيْلٌ فَاعِلُهٗ (1)۔ (خاموشی حکمت ہے اور اسے اختیار کرنے والے قلیل ہیں)۔ یہ روایت بھی ہے کہ لقمان سے پوچھا گیا لوگوں میں سے کون زیادہ برا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا وہ آدمی جو یہ پرواہ نہیں کرتا کہ لوگ اسے برائی کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ابن ابی شیبہ، احمد اور ابن جریر نے خالد الربعی سے نقل کیا ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے اور بڑھئی کا پیشہ کرتے تھے تو ایک دن آقا نے آپ کو کہا ایک بکری ذبح کرو اور اس کے گوشت میں سے پاکیزہ ترین دو بوٹیاں میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ آپ زبان اور دل لے کر آئے۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ اس نے پھر وہی حکم دیا اور کہا کہ اب کی بار غلیظ ترین دو بوٹیاں لے کر آؤ۔ چنانچہ آپ پھر وہی (زبان اور دل) لے کر آئے۔ تو اب اس نے ان کے بارے پوچھا تو آپ نے کہا جب یہ دونوں پاک اور صاف ہوں تو یہ تمام سے اچھے اور اعلیٰ ہیں اور جب یہ دونوں ناپاک اور غلیظ ہوں تو تمام سے بڑھ کر ناپاک اور نجس ہیں۔ (2)

ہے ظاہر یہی ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہے اور ہم نے لقمان کو کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو حکمت عطا فرمائی ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ اَنْ مفسرہ ہے کیونکہ ایتاء حکمت میں قول کا معنی موجود ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی توجیہ یہ ہے کہ ایتاء حکمت سے مراد حکمت کی تعلیم ہے اور تعلیم اکثر قول کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا اٰتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ کا معنی ہے ہم نے اسے شکر ادا کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حکمت سے مراد شکر ہے اور ایتاء الحکمۃ کا معنی ہے شکر ادا کرنے کا حکم دینا۔ اور امر سے مراد امر تکوینی ہے نہ کہ تکلیفی۔ کیونکہ امر تکلیفی تو لقمان اور آپ کے سوا تمام کو شامل ہے اور وہ حصول شکر کو مستلزم نہیں، بخلاف امر تکوینی کے کہ وہ حصول شکر کو مستلزم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایتاء حکمت حصول حکمت کو مستلزم ہے۔ اور حکمت پر معنی شکر کا اطلاق مجازی ہے کیونکہ شکر حکمت کو لازم ہے (اور حکمت شکر کے لیے ملزوم ہے) اور مبالغہ کے طور پر لازم اور ملزوم میں سے ایک کا اطلاق دوسرے پر کرنا مجازاً جائز ہوتا ہے۔ شکر سے مراد نعمت کا اظہار کرنا ہے اور اس کی ضد کفران ہے اور اس کا معنی نعمت کو چھپانا ہے۔ قاموس میں ہے کہ شکر کا معنی احسان کی پہچان اور عرفان حاصل کرنا ہے (3)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ شکر كَشْرٌ سے مقلوب ہے (یعنی یہ اصل میں كَشْرٌ تھا پھر اس کے پہلے دو حرفوں میں تقدیم و تاخیر کر کے شکر بنا دیا گیا)۔ كَشْرٌ کا معنی کھولنا اور ظاہر کرنا ہے۔ اور شکر میں بھی نعمت کا اظہار ہوتا ہے۔ شکر کی تین قسمیں ہیں (۱) شکر بالقلب ہے یعنی دل سے شکر ادا کرنا۔ اس سے مراد کسی نعمت کا تصور کرنا ہے۔ (۲) شکر باللسان۔ یعنی زبان سے شکر ادا کرنا۔ اس سے مراد کسی نعمت پر نعمت عطا فرمانے والے کا زبان سے شکر ادا کرنا اور اس کی مدح کرنا ہے۔ (۳) شکر الجوارح یعنی اعضاء جسمانی سے شکر ادا کرنا۔ اس سے مراد نعمت کے بدلے منعم کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ شکر اصل میں عَيْنٌ شَكِرٌ سے ماخوذ ہے۔ اس سے مراد بھرا ہوا چشمہ ہے۔ اس اصل کی بناء پر شکر کا معنی ہے منعم اور اس کی نعمتوں کی یاد سے بھر جانا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے بندوں میں سے دو کو وصف شکر کے ساتھ متصف فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ان کے بارے فرمایا شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ اور دوسرے نوح علیہ السلام ہیں۔ ان کے بارے ارشاد گرامی ہے اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا۔ علامہ جزری نے النہایہ میں کہا ہے کہ نعمت کے مقابلہ میں شکر بالقول بھی ہوتا ہے، بالفعل بھی اور بالنیۃ بھی۔ چنانچہ منعم کی

1۔ شعب الایمان، جلد 4 صفحہ 264 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 43 (الامیریہ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 588 (التراث العربی)

تعریف زبان سے بھی کرنی چاہیے (یہ شکر بالقول ہے) اور شکر گزار کو چاہیے کہ وہ منعم کی اطاعت وفرمانبرداری میں اپنے نفس کو جھکا دے (اعضائے جسمانی کو اس کا تابع فرمان کردے یہ شکر بالفعل ہے) اور ساتھ ہی یہ اعتقاد بھی رکھے کہ منعم ہی آقا ومولیٰ ہے (اور یہ شکر بالنیۃ ہے) اور لفظ شُکر شَکَرَتِ الْاِبِلُ شُکْرًا سے ماخوذ ہے۔ یعنی جب اونٹ چراگاہ پہنچے اور چرنے کے سبب خوب موٹا ہو جائے (تو یہ جملہ کہا جاتا ہے) اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو: اور ہم نے اسے کہا کہ جو ہم نے آپ کو حکمت اور اس کے سوا دیگر نعمتیں عطا فرمائیں ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے (وَقُلْنَا لَهُ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ عَلٰى مَا اٰتَيْنَاكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَغَيْرِهَا)۔

۲؎ اور جو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو وہ اپنے ذاتی نفع کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔ کیونکہ شکر موجود نعمت کے لیے قید ہے، جو نعمت موجود نہیں اس کے حصول کا ذریعہ ہے، معبود حقیقی پروردگار کے قرب کا موجب ہے اور دار الخلود میں باعث ثواب ہے (فَاِنَّ الشُّكْرَ قَيْدٌ لِّلْمَوْجُوْدِ وَصَيْدٌ لِّلْمَفْقُوْدِ وَمُوْجِبُ تَقَرُّبٍ اِلَى الرَّبِّ الْمَعْبُوْدِ وَثَوَابٍ فِيْ دَارِ الْخُلُوْدِ) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ۔

۵؎ اور جو اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتا ہے تو اس کا وبال اس پر ہوگا اور اللہ تعالیٰ شکر کے لیے اس کا محتاج نہیں ہے۔ (البتہ) وہ حمد وستائش کا حق رکھتا ہے اور اگر وہ اس کی حمد نہیں کرتا تو تمام مخلوق اپنی زبان حال سے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾

''اور یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا اسے نصیحت کرتے ہوئے ۱؎ اے میرے پیارے فرزند ۲؎ کسی کو اللہ کا شریک نہ بنانا ۳؎ یقیناً شرک ظلم عظیم ہے ۴؎''

۱؎ اور یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا۔ اس کا نام انعم، اشکم یا ماثان تھا۔ وَهُوَ يَعِظُهٗ ترکیب کلام میں لُقْمٰنُ سے حال ہے۔

۲؎ (اے میرے پیارے فرزند!) یہ تصغیر برائے اشفاق ہے۔ ابن کثیر نے یاء کو ساکن، حفص نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے مکسور پڑھا ہے۔

۳؎ ترکیب کلام میں بِاللّٰهِ لَا تُشْرِكْ کے متعلق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ قسم ہو اور مابعد کلام اس کا جواب ہو۔ کہا گیا ہے کہ آپ کا بیٹا کافر تھا۔ پھر آپ اسے مسلسل نصیحت کرتے رہے یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو گیا۔

۴؎ یہ جملہ مذکورہ نہی کی علت ہے۔ ظلم سے مراد کسی شے کو اس کے مخصوص محل کے بغیر دوسرے مقام پر رکھنا ہے، چاہے اس میں کمی کی جائے یا زیادتی، تبدیلی اس کے وقت میں کی جائے یا اس کی جگہ میں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ظلم سے مراد حق سے تجاوز کرنا ہے، چاہے وہ تجاوز تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اسی لیے یہ لفظ گناہ صغیرہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور کبیرہ کے لیے بھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شرک ظلم عظیم ہے۔ کیونکہ عبادت کو ایسے محل میں رکھنا جو جو بالکل ہی عبادت کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اپنے محل سے بہت بڑا تجاوز ہے (یعنی معبود حقیقی کے سوا کسی اور کی عبادت کرنا ظلم عظیم ہے) اور منعم حقیقی کو اس کے مساوی قرار دینا جو مطلقاً انعام کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، بہت بڑا ظلم (اور انتہائی بے جا حرکت) ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾

''اور ہم نے تاکیدی حکم دیا انسان کو کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے ۱؎ شکم میں اٹھائے رکھا ہے اسے اس

کی ماں نے ۲؎ کمزوری پر کمزوری کے باوجود ۳؎ اور اس کا دودھ چھوٹنے میں دو سال لگے ۴؎ (اس لیے ہم نے حکم دیا) کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا ۵؎ (آخر کار) میری طرف ہی (تمہیں) لوٹنا ہے ۶؎ ''

۱؎ یعنی ہم نے انسان کو حکم دیا کہ وہ والدین سے حسن سلوک کرے اور ان کا شکر ادا کرے۔ یہ لقمان کے واقعہ کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔

۲؎ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ معترضہ کے دوران یہ جملہ معترضہ ماں کے حق میں حسن سلوک کے حکم میں مزید تاکید پیدا کرنے کے لیے ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میرے حسن معاشرت کا کون زیادہ حق رکھتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیری ماں۔ (اس نے عرض کی) پھر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیری ماں۔ (اس نے پھر عرض کی) اس کے بعد کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیری ماں۔ (اس نے عرض کی) پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیرا باپ۔ (پھر کون؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا) جو تیرا زیادہ قریبی ہو، پھر جو اس کے بعد قریبی ہو۔ متفق علیہ (1)۔ حضرت مغیرہؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی حرام قرار دی ہے (متفق علیہ) (2)۔

۳؎ عَلٰى وَهْنٍ، وھن کی صفت ہے اور وہ حَمَلَتْهُ کے فاعل سے حال ہے۔ تقدیر کلام ہے ذات وھن یاہو ھن وھنا۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے شدت پر شدت (تکلیف پر تکلیف)۔ ضحاک نے کہا ہے کمزوری پر کمزوری اور مجاہد نے کہا ہے مشقت پر مشقت۔ کیونکہ عورت جب حاملہ ہوتی ہے تو اس پر پے در پے کمزوری اور مشقت آتی ہے حمل کمزوری ہے، درد زہ کمزوری ہے حمل وضع کرنا ضعف ہے (3) اور دودھ پلانا ضعف ہے۔

۴؎ اور اس کا دودھ چھوٹنے میں دو سال لگے۔ اور وہ اتنی مدت دودھ پلاتی رہی۔ اسی آیت سے امام شافعی، ابو یوسف اور امام احمدؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے۔ ہم نے مسئلہ رضاعت سورۃ البقرہ کی آیت وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ الآیہ اور سورۃ النساء کی آیت وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ کی تفسیر میں تفصیل سے ذکر کر دیا ہے۔

۵؎ "اَنِ اشْكُرْ لِيْ" یا توو َصَّیْنَا کی تفسیر ہے۔ یا پھر وَالِدَیْهِ سے بدل اشتمال ہے۔ حضرت سفیان بن عیینہ نے اس آیت کے ضمن میں کہا ہے کہ جس نے پانچ نمازیں ادا کیں تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور جس نے پانچوں نمازوں کے بعد اپنے والدین کے لیے دعا کی تو اس نے اپنے والدین کا شکر ادا کیا۔ (4)

۶؎ (آخر کار) میری طرف ہی (تمہیں) لوٹنا ہے۔ اس میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی، یعنی تیرے شکر ادا کرنے اور ناشکری کرنے پر میں تجھے بدلہ دوں گا۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾

''اور اگر وہ دباؤ ڈالیں تم پر کہ تو میرا شریک ٹھہرائے اس کو جس کا تجھے علم تک نہیں تو ان کا یہ کہنا نہ مان ۱؎ البتہ گزران کرو

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 312 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 884 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 179 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 179 (التجاریہ)

ان کے ساتھ دنیا میں خوبصورتی سے ۲؎ اور پیروی کر داس کے راستہ کی جو میری طرف مائل ہوا ۳؎ پھر میری طرف ہی تمہیں لوٹنا ہے پس میں آگاہ کروں گا تمہیں ان کاموں سے جو تم کیا کرتے تھے ۴؎ ''

۱؎ وَ إِنْ جَاهَدٰكَ یہ قول اَنِ اشْكُرْ پر معطوف ہے۔ اور اگر وہ تم پر دباؤ ڈالیں کہ تو اس کو میرا شریک ٹھہرائے جس کا تجھے علم تک نہیں کہ وہ شریک بننے کا مستحق ہے (تو توان کی بات نہ مان) یعنی پھر (ایسی حالت میں ان کی پیروی کیسے ہوسکتی ہے) جبکہ تو ادلہ قطعیہ سے شرک کے بطلان کے بارے جانتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حق ہر صاحب حق پر غالب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا خالق کی نافرمانی کرتے ہوئے مخلوق کی اطاعت (جائز) نہیں (1)۔ اسے امام احمد اور حاکم نے عمران اور حکیم ابن عمرو الغفاری سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اور اسی طرح یہ روایت حضرت علیؓ سے صحیحین، سنن ابی داؤد اور نسائی میں موجود ہے۔

۲؎ البتہ دنیا میں ان کے ساتھ ایسی خوبصورتی سے گزران کرو جسے شریعت اور عقل دونوں پسند کرتے ہوں۔

مسئلہ: ۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسے والدین جو فقیر اور محتاج ہوں ان پر مال خرچ کرنا اور ان سے صلہ رحمی کرنا واجب ہے اگر چہ وہ کافر ہوں۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ میری والدہ میرے پاس آئی اس حال میں کہ وہ مشرکہ تھی اور قریش کے ساتھ منسلک تھی تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میری ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ (مدد کی) خواہش رکھتی ہے، کیا میں اس سے صلہ رحمی کر سکتی ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں، تو اس سے صلہ رحمی کا سلوک کر۔ متفق علیہ (2)۔ سورۂ عنکبوت میں یہ گزر چکا ہے کہ یہ دونوں آیتیں حضرت سعد بن ابی وقاص اور ان کی والدہ کے بارے نازل ہوئیں۔

۳؎ اور پیروی کر داس کے دین کی جو میری طرف مائل ہوا۔ اور میری اطاعت وفرمانبرداری کی۔ اور وہ نبی مکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ہیں۔ حضرت عطاء نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ارادہ فرمارہا ہے۔ اور وہ اس لیے کہ جب ابوبکر صدیقؓ مشرف باسلام ہوئے تو حضرات عثمان، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف آپ کے پاس آئے اور کہا کیا تم نے اس آدمی کی تصدیق کر دی ہے اور اس کے ساتھ ایمان لے آئے ہو؟ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا جی ہاں، وہ صادق ہیں، تم بھی ان پر ایمان لے آؤ۔ پھر آپ انہیں لے کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے یہاں تک کہ انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ پس یہی وہ اسلام کے اسلاف ہیں جنہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی راہنمائی کے سبب اسلام قبول کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے فرمایا وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۔(3)

مسئلہ: ۔ والدین جب کسی فرض کو چھوڑنے یا مکروہ تحریمی پر عمل کرنے کا حکم دیں تو اس بارے میں ان کا کہا ماننا جائز نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کو چھوڑنا اور کسی غیر کے حکم کی پیروی کرنا شرک معنوی ہے۔ جبکہ ہم رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کر چکے ہیں کہ خالق کی نافرمانی کرتے ہوئے مخلوق کی فرمانبرداری جائز نہیں ہے۔ اور جب والدین ایسی مباح چیز کا حکم دیں جو عقلاً اور شرعاً ممنوع نہ ہو تو ان کی اطاعت و پیروی واجب ہے۔ اگر والدین کثرت ذکر اور نوافل کو ترک کرنے اور ضرورت سے زائد مال کمانے سے رکنے کا حکم دیں تو کیا ان کی بات ماننا واجب ہے؟ میری نزدیک ظاہر یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں ان کا کہا ماننا واجب نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے راستے کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے جو اس کی طرف مائل ہوا۔ اور کثرت نوافل، لایعنی چیزوں کو ترک کرنا، دنیا کو

1۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6 صفحہ 545 (الزمان) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 884 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 179 (التجاریۃ)

چھوڑ نا اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا بالیقین اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہونے والوں کا راستہ ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے ماں باپ کی رضا کے بغیر اپنے وطنوں کو چھوڑ کر ہجرت کی اور اپنی جانیں اور اموال خرچ کیے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِیْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ﰳاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے ماں باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیبیاں اور کنبہ والے اور کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کے بگڑنے کا تمہیں اندیشہ ہو اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں تمہارے نزدیک اللہ، رسول ﷺ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے اور محبوب ہیں تو منتظر رہو! کہ اللہ اپنا حکم لے آئے (یعنی جہاد ترک کرنے پر کہیں تم پر عذاب مسلط نہ کر دیا جائے) تو پھر اپنے ماں باپ کی رضا چاہنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے راستے میں نفس اور شیطان کے خلاف جہاد ترک کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ حاکم نے عامر بن عبد اللہ بن زبیر سے اور انہوں نے اپنے باپ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ابوقحافہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ تو کمزور غلام آزاد کرتا ہے۔ پس اگر تو طاقتور اور قوی غلاموں کو آزاد کرے۔ تو یہ اچھا ہوتا تا کہ وہ تیری حفاظت کریں اور دشمنوں کے مقابلے میں وہ تیرے ساتھ کھڑے ہوں۔ تو یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا اے ابا جان! اس سے میں تو اس ثواب کا ارادہ رکھتا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے(1)۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی وَ سَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿﴾ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ جب کہ آپ نے حضرت بلال، عامر بن فہیرہ۔ ام عمیس اور زبیرہ وغیرھم رضی اللہ عنہم کو آزاد کیا۔ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ہجرت کی تو آپ کے پاس چار ہزار درہم تھے اور آپؓ نے اپنے باپ کی رضا کے خلاف اپنے اہل خانہ کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ جیسا کہ ہم نے سورۃ التوبہ کی آیت اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ کی تفسیر میں حضور نبی کریم ﷺ کی ہجرت کے واقعہ میں ذکر کر دیا ہے۔

ے پھر میری طرف ہی تم نے اور ان دونوں نے بھی لوٹنا ہے۔ پس میں ہی تم کو تمہارے اسلام کی جزاء دوں گا اور انہیں ان کے کفر کی سزا دوں گا۔ یہ دونوں آیتیں لقمان کی وصیت کے دوران بطور جملہ معترضہ ہیں اور یہ اس آیت کے لیے بطور تاکید ہیں جس میں شرک سے منع کیا گیا ہے۔ گویا کہ یہ کہا اور ہم نے اسی کی مثل انسان کو حکم دیا جیسے لقمان نے اپنے بیٹے کو دیا۔ اور اس میں والدین کا ذکر تو مبالغہ کے لیے ہے۔ کیونکہ اس کے باوجود کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے بعد تعظیم واطاعت کا حق سب سے زیادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اگر یہ بھی شرک کا حکم دیں تو ان کا کہا ماننا جائز نہیں تو پھر ان کے سوا کسی اور کے بارے تم کیا گمان رکھتے ہو۔

یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۶﴾

"(لقمان نے کہا) پیارے فرزند! اگر کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر ہو لے یا پھر وہ کسی چٹان میں یا آسانوں یا زمین میں (چھپی) ہو سے تو لے آئے گا اسے اللہ تعالیٰ۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت باریک بیں ہر چیز سے باخبر ہے سے"

لے بنی کو حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ، باقیوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اِنَّهَا کا مطلب ہے بے شک کوئی بری یا اچھی خصلت

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2 صفحہ 573 (العلمیہ)

قتادہ نے کہا ہے کہ یہ ضمیر خطیئۃ کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ لقمان کے بیٹے نے اپنے باپ کو کہا تھا اے ابا جان! اگر میں گناہ ایسی جگہ کروں جہاں کوئی بھی مجھے دیکھ نہ رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے کیسے جان سکتا ہے؟ تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اگر کوئی چیز چھوٹا ہونے میں رائی کے دانہ کے برابر وزنی ہو (1)۔ ترکیب کلام میں تک کا اسم ضمیر مستتر ہے اور اس کی خبر مثقال ہے۔ کیونکہ جمہور کی قرأت کے مطابق یہ منصوب ہے۔ لیکن نافع نے اسے تک کا اسم ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے۔ اور یہ کان تامہ ہے اور چونکہ مثقال حبّۃ کی طرف مضاف ہے اس لیے فعل مؤنث ہے۔ اور اس قرأت کے مطابق انّھا کی ضمیر ضمیر قصہ ہے۔

ل یعنی وہ انتہائی مخفی اور محفوظ جگہ میں ہو جیسے جوف چٹان یا انتہائی بلند جگہ میں ہو جیسے آسمانوں کی بلندی یا انتہائی پست جگہ میں ہو جیسے زمین کا انتہائی گہرا مقام۔ قتادہ نے کہا ہے صخرۃ سے مراد پہاڑ ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے اس سے مراد وہ چٹان ہے جو ساتوں زمینوں کے نیچے ہے۔ اور یہ وہی ہے جس میں فاسقوں اور فاجروں کے اعمال لکھے جاتے ہیں۔ اور آسمان کا نیلگوں رنگ اسی کی وجہ سے ہے۔ اور سدی کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایک مچھلی پر پیدا فرمایا اور اس کا نام نون ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس طرح فرمایا نٓ وَالْقَلَمِ اور یہ مچھلی پانی میں ایک پتھر کی پشت پر ہے اور وہ پتھر ایک فرشتے کی پیٹھ پر ہے اور وہ فرشتہ ایک چٹان پر ہے۔ اور یہی وہ چٹان ہے جس کا ذکر لقمان نے کیا ہے۔ یہ چٹان نہ آسمان میں ہے اور نہ زمین میں بلکہ ہوا پر ہے۔ (2)

ع تو اللہ تعالیٰ اسے حاضر کرے گا اور اس پر محاسبہ بھی فرمائے گا۔ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ہر مخفی اور باریک ترین چیز کا بھی علم رکھتا ہے اور ہر شے کی حقیقت سے باخبر ہے۔ حسنؒ نے کہا ہے آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ تمام چھوٹی بڑی چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ بعض کتابوں میں ہے کہ حضرت لقمان کے یہی وہ آخری کلمات ہیں جو انہوں نے کہے پھر ان کے ہیبت وجلال کی وجہ سے ان کا پتہ پھٹ گیا۔ (3)

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿١٧﴾

"میرے پیارے بچے! نماز صحیح صحیح ادا کیا کرو، نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے ل بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں ع"

ل بُنَيَّ کو حفص اور بزی نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے مکسور پڑھا ہے۔ اپنے نفس کی تکمیل کے لیے صحیح صحیح نماز ادا کیا کرو۔ اور دوسروں کی تکمیل کے لیے نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو۔ اور امر بالمعروف نہی عن المنکر یا دیگر اسباب سے جو تکلیفیں اور اذیت تمہیں پہنچے اس پر صبر کیا کرو۔

ع بے شک صبر یا ہر وہ کام جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ان امور میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے قطعی طور پر فرض قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خَيْرُ الْاُمُوْرِ عَوَازِمُهَا یعنی اچھے امور وہ ہیں جنہیں کرنا اللہ تعالیٰ نے تجھ پر فرض کر دیا ہے۔ اصل میں عزم کا معنی کسی کام کے کرنے کا پختہ ارادہ کرنا ہے۔ اس بناء پر عزم مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ یہ ان امور میں سے ہے جنہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 179 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 179 (التجاریۃ)

واجب ہونے کی بناء پر پوری توجہ اور کوشش سے کرتا ہے۔

وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۚ﴿۱۸﴾

''اور (تکبر کرتے ہوئے) نہ پھیر لے اپنے رخسار کو لوگوں کی طرف سے ۱ اور نہ چلا کر زمین میں اتراتے ہوئے ۲۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا کسی گھمنڈ کرنے والے، فخر کرنے والے کو ۳''

۱۔ نافع، ابوعمرو، ابوجعفر اور کسائی نے اسے باب مفاعلہ سے وَلَا تُصَاعِرْ پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر، ابن عامر، عاصم، ابوجعفر اور یعقوب نے الف کے بغیر اور عین کو مشدد پڑھا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تو نہ لوگوں سے اکتا اور نہ ہی تکبر کرتے ہوئے اپنا چہرہ ان سے پھیر۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ تو تکبر نہ کر کہ تو انہیں حقیر جاننے لگے اور جب وہ تجھ سے گفتگو کریں تو تو ان سے اعراض کرتے ہوئے اپنا چہرہ پھیر لے۔(1)

۲۔ اور تو زمین میں اتراتے ہوئے اور اکڑتے ہوئے نہ چل۔ مَرَحًا مصدر حال کی جگہ واقع ہے۔ یعنی یمرح مرحًا۔ یا یہ مفعول لہٗ ہے یعنی لا جل المرح۔ (اترانے کے لیے)۔

۳۔ بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا چال میں گھمنڈ اور تکبر کرنے والے کو اور لوگوں پر فخر کرنے والے کو۔ یہ مذکورہ نھی کی علت ہے۔ رعایت قافیہ کے لیے یہاں لف ونشر غیر مرتب ہے (یعنی مختال دوسری نہی کی علت ہے اور فخور پہلی نہی کی علت ہے۔)

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴿۱۹﴾

''اور درمیانہ روی اختیار کر اپنی رفتار میں ۱ اور دھیمی کر اپنی آواز بے شک سب سے وحشت انگیز آواز، گدھے کی آواز ہے ۲''

۱۔ اور میانہ روی اختیار کر اپنی رفتار میں۔ یعنی ایسی درمیانی چال جو رینگنے کی چال (یعنی بہت ہی آہستہ) سے زیادہ ہو کیونکہ وہ غرور اور تکبر کرنے والوں کی چال ہے۔ اور اسراع (یعنی بہت زیادہ تیز) سے کم ہو کیونکہ وہ احمقوں اور بیوقوں کی چال ہے۔ اور اس سے وقار ختم ہو جاتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سرعت رفتار مومن کے وقار کو ختم کر دیتی ہے(2)۔ اسے ابن عدی اور ابونعیم نے الحلیہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور ابن عدی نے اسے ابوسعید اور ابن عمرؓ سے بھی نقل کیا ہے۔ وہ سرعت رفتار جس سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے مراد ایسی چال ہے جو طبعی چال سے انتہائی زیادہ ہو۔ لیکن ایسی تیز رفتاری جو عادت کے مطابق ہو اور دوڑ کی چال سے کم ہو تو وہ محمود اور پسندیدہ ہے۔ جیسا کہ ابن سعد نے یزید بن مرثد سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب چلتے تو رفتار اتنی تیز ہوتی کہ آپ ﷺ کے پیچھے دوڑنے والے بھی آپ کے ساتھ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اور طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر لازم ہے کہ وقار اختیار کرو اور تم پر لازم ہے کہ اپنے جنازوں کو اٹھا کر درمیانی چال میں چلو(3)۔ اور اصحاب ستہ نے آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے جنازہ کو جلدی سے لے جاؤ۔ کیونکہ اگر وہ نیک اور صالح ہے تو تم اسے جلدی آگے پہنچا دو گے اور اگر وہ برا ہے تو جلد اسے اپنے کندھوں سے اتار دو گے (4)۔ مذکورہ تمام احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 180 (التجاریۃ) | 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7 صفحہ 422 (العلمیۃ)
3۔ کنز العمال، جلد 15 صفحہ 594 (التراث الاسلامی) | 4۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 306 (قدیمی)

اسراع سے مراد وہی ہے جو میں نے ذکر کیا ہے (یعنی ایسی تیز رفتاری جو عادت کے مطابق ہو وہ ناپسندیدہ نہیں) اور قصد سے مراد ایسی تیز رفتاری ہے جو دوڑ کی چال سے کم ہو۔

۲۔ مقاتل نے اس کا معنی بیان کیا ہے پست کر، دھیمی کر (1) اپنی آواز، بے شک سب سے وحشت انگیز آواز گدھے کی آواز ہے۔ یہ آواز پست کرنے کی علت ہے۔ یعنی گدھوں کی آواز بہت زیادہ بلند ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہوتی ہے۔ پس تیری آواز ان کی آواز کی طرح نہیں ہونی چاہیے۔ ان کی آواز ابتدا میں زفیر اور انتہا میں شہیق کہلاتی ہے۔ اور یہ دونوں آوازیں اہل جہنم کی ہیں۔ موسیٰ بن اعین نے کہا ہے کہ میں نے قول باری تعالیٰ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ کے بارے حضرت سفیان ثوری کو کہتے سنا کہ اس سے مراد قبیح ترین ناپسندیدہ چھینک ہے (2)۔ وہب کا قول ہے کہ لقمان نے حکمت سے لبریز بارہ ہزار کلمات کہے ہیں اور لوگوں نے انہیں اپنے کلام اور فیصلوں میں شامل کیا ہے۔ (3)

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝

"کیا تم نے نہیں دیکھا اللہ تعالیٰ نے فرمانبردار بنا دیا ہے تمہارے لیے، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۱؎ اور تمام کر دی ہیں اس نے تم پر ہر قسم کی نعمتیں ۲؎ ظاہری بھی اور باطنی بھی ۳؎ اور بعض ایسے (نادان) لوگ بھی ہیں جو جھگڑتے ہیں (رسول کریم سے) اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہ ان کے پاس علم ہے ۴؎ اور نہ ہدایت اور نہ کوئی روشن کتاب ۵؎"

۱؎ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمانبردار بنا دیا ہے تمہارے نفع کے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہے، یعنی سورج، چاند، ستارے اور جو زمین میں ہے، یعنی سمندر، پہاڑ، معدنیات، نباتات اور حیوانات وغیرہ۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام سے بالواسطہ یا بلا واسطہ منافع اور فوائد حاصل کرنے کی تمہیں قدرت عطا فرما دی ہے۔

۲؎ اور اس نے تم پر ہر قسم کی نعمتیں تمام اور مکمل کر دی ہیں۔ اہل مدینہ ابو عمرو اور حفص نے نِعَمَهٗ میں عین کو مفتوح پڑھا ہے اس لیے کہ یہ صیغہ جمع ہے۔ اور ھاء کو مضموم پڑھا ہے اس لیے کہ ان کے درمیان اضافت پائی جاتی ہے۔ اور باقیوں نے صیغہ واحد کی صورت میں عین کو سکون کے ساتھ اور تاء کو تنوین کے ساتھ نِعْمَةً پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس سے جنس مراد لی گئی ہے۔

۳؎ ظَاهِرَةً ترکیب کلام میں اپنے معطوف کے ساتھ مل کر نِعَمَهٗ سے حال ہے۔ نعمة ظاهرة سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو محسوس کی جا سکتی ہیں مثلاً صورت کا حسین ہونا، اعضاء کا ایک دوسرے کے مساوی ہونا، رزق، عافیت اور دیگر دنیوی نعمتیں۔ اسی طرح اسلام، رسول مکرم، قرآن، احکام شرعیہ میں تخفیف اور آسانی پیدا کرنا، اتباع رسول کی توفیق عطا فرمانا، اسلام کو غلبہ عطا فرمانا اور دشمنوں کے خلاف مدد کرنا وغیرہ یہ سب ظاہری نعمتیں ہیں اور "بَاطِنَةً" سے مراد دل، عقل، حواس باطنہ، حسن اخلاق، ملائکہ کے ساتھ مدد فرمانا، حق کا اعتقاد رکھنے کا الہام کرنا، گناہوں پر پردہ ڈالنا اور ان کی سزا میں جلدی نہ کرنا، عرفان الٰہی کا نور، اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب ﷺ کی شدید محبت و عشق اور رسول معظم ﷺ کی شفاعت وغیرہ تمام باطنی نعمتیں ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 180 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 180 (التجاریۃ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 180 (التجاریۃ)

۴؎ کا عطف وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ پر ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان کلام معترضہ ہے۔ اور بعض نادان لوگ رسول اللہ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات کے بارے میں ایسے علم کے بغیر جھگڑتے ہیں جو کسی دلیل سے مستفاد ہو۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث، ابی بن خلف اور ان جیسے دیگر لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ (1)

۵؎ اور نہ ان کے پاس ہدایت ہے جو انہیں رسول مکرم نے فرمائی ہو۔ اور نہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ کوئی روشن کتاب ہے۔ بلکہ ان کے جھگڑے کا انحصار صرف اور صرف اپنے آباء واجداد کی تقلید اور پیروی پر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِیْرِ ﴿۲۱﴾

"اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو پیروی کریں گے اس کی جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادا کو ۱؎ کیا وہ (انہیں کا اتباع کریں گے) خواہ شیطان انہیں (اس طرح) دعوت دے رہا ہو بھڑ کتے ہوئے عذاب کی ۲؎۔"

۱؎ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس کی جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے کہتے ہیں ہم اس کی اتباع نہیں کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اس آیت میں دین کے اصولی اور بنیادی احکام میں تقلید سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "اَیَتَّبِعُوْنَ"۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے قُلْ اَیَتَّبِعُوْنَ اٰبَاءَ هُمْ (آپ کہہ دیجیے کیا وہ اپنے آباء کی پیروی کریں گے)۔

۲؎ "وَلَوْ كَانَ" میں واؤ حالیہ ہے یا پھر مقدر عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ یعنی لو لم یکن ولو کان۔ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْهُمْ میں ضمیر کا مرجع یا تو وہ خود ہیں یا ان کے آباء ہیں۔ خواہ شیطان انہیں اس طرح دعوت دے رہا ہو بھڑکتے ہوئے عذاب کی طرف۔ یعنی اس طرح کہ شیطان ان کے قلوب میں شرک یا تقلید کی حسن اور خوبیاں القاء کر دیتا ہے۔ یہ استفہام انکار اور تعجب کے لیے ہے۔

وَ مَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۲۲﴾

"اور جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے دراں حالیکہ وہ محسن ہو ۱؎ تو بے شک اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا مضبوط حلقہ کو اور اللہ کی طرف ہی تمام کاموں کا انجام ہے ۲؎۔"

۱؎ اور جو شخص اپنی توجہ کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف۔ اور کلیۃً اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے کے لیے ہی وہ کوئی فعل کرتا ہے اور کسی کو چھوڑتا ہے اور وہ اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔ درآنحالیکہ وہ اپنے اعمال میں محسن ہو۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا احسان کا معنی یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ یعنی مکمل طور پر حضور قلب حاصل ہو۔

۲؎ بے شک اس نے مضبوط حلقہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ یعنی اس نے پکڑی جانے والی چیزوں میں سے مضبوط ترین چیز کو پکڑ لیا ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 181 (التجاریہ)

اور تمام ذرائع میں سے ایک قوی ترین ذریعہ کو تھام لیا ہے جس کے ٹوٹنے کا کوئی احتمال نہیں۔ یہ متوکل انسان کی ایسے آدمی کے ساتھ انتہائی لطیف تشبیہ اور تمثیل ہے جو مضبوط حلقہ کو پکڑے ہوئے ہو۔ اور تمام کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہے۔ کیونکہ سب کے سب اسی کی طرف جانے والے ہیں۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ۭ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۲۳

''اور جس نے کفر کیا تو نہ غمزدہ کرے آپ کو اس کا کفر۱؎ ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پس ہم آگاہ کریں گے انہیں جو انہوں نے کیا تھا بے شک اللہ جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں (چھپا) ہے۲؎''

۱؎ اور جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی توجہ نہ کی تو اس کا کفر آپ کو غمزدہ نہ کرے۔ اس کا مفہوم اس طرح ہے کہ اس نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اور اذیت دی وہ آپ کو نہ تو دنیا میں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی آخرت میں۔ تو چونکہ ضرر (نقصان) نہ ہونا حزن (غم) نہ ہونے کا سبب ہے اس لیے ضرر کی جگہ حزن کا ذکر فرما دیا۔ نافع نے اسے لَايُحْزِنْكَ یعنی یاء کو مضموم اور زاء کو مکسور پڑھا ہے کہ یہ اَلْاِحْزَان سے ماخوذ ہے

۲؎ دارین میں انہوں نے ہماری طرف ہی لوٹنا ہے۔ پس ہم انہیں عذاب دے کر آگاہ کریں گے جو انہوں نے کیا تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں چھپا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تو سینوں میں چھپے اعتقادات اور وہاں پیدا ہونے والے خیالات سے بھی آگاہ ہے۔ چہ جائیکہ ایسے امور جو ظاہر ہیں (یعنی ان کے مخفی ہونے کا تو سوال ہی نہیں ہوسکتا)۔ پس اللہ تعالیٰ ہر آدمی کو اس کے اعتقاد اور عمل کے مطابق جزاء دے گا۔

نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝۲۴

''ہم لطف اندوز ہونے دیں گے انہیں تھوڑی دیر، پھر ہم انہیں ہانک کر لے جائیں گے سخت عذاب کی طرف۱؎''

۱؎ یعنی ہم انہیں مہلت دیں گے کہ وہ لطف اندوز ہولیں تھوڑا سا مزہ اڑا لیں یا دنیا میں اپنا مقررہ وقت گزرنے تک تھوڑی دیر لطف اندوز ہولیں۔ پھر ہم انہیں ہانک کر لے جائیں گے، یعنی ہم انہیں آخرت میں داخل کریں گے اور لوٹائیں گے سخت عذاب کی طرف۔ یعنی ایسے عذاب کی طرف جو سخت چیزوں کے بوجھ کی مثل ان پر ثقیل ہوگا اور وہ جہنم کا عذاب ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۵

''اور اگر دریافت کریں ان سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو تو ضرور کہیں گے اللہ نے۔ فرمایئے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (حق واضح ہوگیا)۱؎ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۲؎''

۱؎ چونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف خلق کی نسبت سے مانع دلیل انتہائی واضح ہے اس لیے وہ اس کا اقرار کرنے پر مجبور ہیں۔ فرمایئے الحمدللہ (حق واضح ہوگیا) کہ اس نے انہیں اس دلیل کے اعتراف واقرار پر مجبور کر دیا جو ان کے اعتقادات کو باطل کرنے کا

موجب ہے۔

۲۔ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اس توحید کا اقرار ان پر لازم ہے اور جب انہیں اس پر متنبہ کیا جاتا ہے تو وہ اس پر آگاہ نہیں ہوتے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۲۶

''اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے یقیناً اللہ ہی بے نیاز ہے (اور) ہر تعریف کے لائق ۱؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ کی ہی ملکیت اور تخلیق ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے پس اس کے سوا کوئی اور عبادت کا مستحق نہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تعریف کرنے والوں کی تعریف سے بے نیاز ہے۔ وہی ہر تعریف کے لائق ہے اگرچہ کوئی اس کی تعریف نہ کرے۔ ابن اسحاق نے عطا بن یسار سے اور اسی طرح علامہ بغویؒ نے بھی روایت کیا ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تو مدینہ طیبہ میں آپ کے پاس یہود کے علماء حاضر ہوئے اور عرض کی۔ کیا ہمیں آپ کی طرف سے یہ بات نہیں پہنچی کہ آپ کہتے ہیں وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (اور تمہیں علم میں سے تھوڑا سا دیا گیا ہے)، کیا آپ اس سے ہمارا ارادہ کرتے ہیں یا اپنی قوم کا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے اس سے تمام کا قصد کیا ہے۔ تو انہوں نے کہا کیا تم اس کلام میں یہ تلاوت نہیں کرتے جو تمہارے پاس آیا ہے کہ ہمیں تورات عطا کی گئی اور اس میں ہر شے کا کھلا بیان ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں قلیل ہی ہے (1)۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۷

''اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائے اور اس کے علاوہ سات سمندر اسے (مزید) سیاہی مہیا کریں ۱؎ تو پھر بھی ختم نہیں ہوں گی اللہ کی باتیں ۲؎ بے شک اللہ تعالیٰ سب پر غالب، بڑا دانا ہے ۳؎''

۱؎ یعنی اگر تمام کے تمام درختوں کا قلمیں ہونا ثابت ہو جائے۔ اور شجرۃ کو واحد اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہاں مراد آحاد کی تفصیل ہے۔ اور سارے کا سارا سمندر سیاہی بن جائے یعنی اس میں سات سمندر پیچھے سے مل کر اضافہ کریں سَبْعَةُ اَبْحُرٍ۔ یَمُدُّهٗ کا فاعل ہے۔ ابو عمرو اور یعقوب نے البحر کو منصوب پڑھا ہے اس لیے کہ یا تو یہ اَنَّ کے اسم پر معطوف ہے یا اس سے پہلے فعل مضمر ہے جس کی تفسیر یمدّہٗ کر رہا ہے۔ اور باقیوں نے اسے اَنَّ اور اس کے معمول پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ اور اس صورت میں یَمُدُّهٗ حال واقع ہو رہا ہے۔ اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس میں تو ذوالحال کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہی نہیں ہے۔ تو اس کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ یہ آپ کے اسی قول کی مثل ہے جئت والجیش قادم۔ اور اسی طرح وہ احوال جن کا حکم ظرف کا ہوتا ہے۔ اور کلام کا مقتضی یہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ اگر درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی ہو جائے اور پیچھے سے سات سمندر اس میں شامل ہو کر سیاہی میں اضافہ کر دیں۔ لیکن یَمُدُّهٗ کا قول مداد (سیاہی) کے ذکر سے مستغنی ہے کیونکہ مدالدوات سے ماخوذ ہے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 181 (التجاریہ)

اس کا معنی ہے دوات میں سیاہی داخل کرنا۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ آیت میں کلام مضمر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ یُکْتَبُ بِهَا کَلِمَاتُ اللّٰهِ۔(1)

۲۔ تو پھر بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ اگر ان قلموں اور اس سیاہی کے ساتھ معلومات باری تعالیٰ کو لکھا جائے بلکہ قلموں اور سیاہی کی مقدار جتنی بڑھ جائے وہ معلومات کو لکھنے کے لیے کافی نہیں۔ کیونکہ معلومات باری تعالیٰ غیر متناہی ہیں۔ ان کا ختم ہونا ممکن نہیں (آیت طیبہ میں کلمٰت اللہ سے مراد معلومات باری تعالیٰ ہیں) اور یہ احساس دلانے کے لیے جمع قلت کا صیغہ استعمال فرمایا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی معلومات کی قلیل مقدار کو لکھنے کے لیے بھی کافی نہیں، چہ جائیکہ کثیر کے لیے کافی ہوں۔

۳۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے کوئی شے اسے عاجز نہیں کر سکتی۔ اور کوئی امر اس کی حکمت اور علم سے خارج نہیں۔ ابن جریر نے حضرت عکرمہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ اہل کتاب نے رسول اللہ ﷺ سے روح کے بارے سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔ تو انہوں نے یہ کہا کیا آپ یہ گمان رکھتے ہیں کہ ہمیں تھوڑا علم عطا کیا گیا ہے حالانکہ ہمیں تورات دی گئی ہے اور وہ سراپا حکمت ہے اور جسے حکمت عطا کر دی گئی تحقیق اسے خیر کثیر عطا کر دیا گیا وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا(2) تو پھر یہ آیت طیبہ نازل ہوئی۔ پس ہم نے اس آیت کے سبب نزول کے بارے جو روایات نقل کی ہیں وہ دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت مدنی ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت مکی ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے قریش کے ایک گروہ کو کہا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے روح کے بارے سوال کریں اور آپ کو اس طرح کہیں اور اس وقت آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں ہی تھے۔ ابو الشیخ نے کتاب العظمۃ میں اور ابن جریر نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ مشرکین نے کہا تھا کہ یہ کلام عنقریب ختم ہو جائے گا(3) تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ الآیہ۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۲۸﴾

''نہیں ہے تم سب کو پیدا کرنا اور مارنے کے بعد پھر زندہ کرنا (اللہ کے نزدیک) مگر ایک نفس کی مانند ۱۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، دیکھنے والا ہے ۲۔''

۱۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم سب کو پیدا کرنا اور مارنے کے بعد پھر زندہ کرنا ایک نفس کو پیدا کرنے اور اسے مارنے کے بعد پھر زندہ کرنے کی مثل ہے۔ کیونکہ اسے ایک کام دوسرے کام سے قطعاً غافل نہیں کر سکتا۔ اور تمام کے وجود کے لیے اس کی ذاتی قدرت کے ساتھ اس کے ارادے کا تعلق ہی کافی ہوتا ہے۔ لہٰذا جس طرح اس کے لیے ایک نفس کو پیدا کرنا متعذر اور مشکل نہیں اسی طرح اس کے لیے تمام کو پیدا کرنا بھی قطعاً متعذر نہیں۔

۲۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا ہے اور ہر شے کو دیکھتا ہے۔ یعنی اسے بعض چیزوں کا ادراک دوسری بعض چیزوں کو جاننے سے غافل نہیں کرتا۔ پس اسی طرح تخلیق کا عمل بھی ہے (کہ ایک کو پیدا کرنا دوسرے کی تخلیق سے مانع نہیں ہوتا بلکہ اس کے ارادے سے سب کی تخلیق ہو سکتی ہے)۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ مشرکین کے ان اقوال کو سنتا ہے کہ مرنے کے بعد زندہ ہونے کا کوئی تصور نہیں (یعنی وہ قیامت کا انکار کرتے ہیں) اور ان کے اعمال کو دیکھتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۹﴾

''کیا تم نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور اس نے کام میں لگا دیا ہے سورج اور چاند کو، ہر ایک چل رہا ہے (اپنے مدار میں) وقت مقرر تک اور یقیناً اللہ تعالیٰ، جو کچھ تم کرتے ہو، خوب جاننے والا ہے [1]''

[1] سَخَّرَ یُوْلِجُ پر معطوف ہے یا پھر یہ حال ہے اور قد مقدر ہے۔ ان دونوں روشن ستاروں (سورج اور چاند) میں سے ہر ایک آسمان میں چلتا رہے گا وقت مقرر تک اور وہ قیامت کا دن ہے۔ اس قول اور لِاَجَلٍ مُّسَمًّى کے مابین فرق یہ ہے کہ اجل سے مراد وہ غایت اور آخری لمحہ ہے جہاں ان کی چال رک جائے گی اور وہی غایت اس چال کی حقیقی یا مجازی منزل اور غرض ہے۔ اور یہ دونوں معانی غایات سے حاصل ہوتے ہیں۔ (لہٰذا اس قول میں اِلٰی غایت کے لیے ہے۔ جبکہ دوسرے قول میں لام غایت پر دلالت نہیں کرتا) اور وَاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ کا عطف قول باری تعالیٰ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الآیہ پر ہے۔ اور پھر یہ جملہ اَلَمْ تَرَ اس ارشاد گرامی کے ساتھ متصل ہے اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ اور یہ اس کی تقریر کے لیے ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِىُّ الْكَبِيْرُ ﴿۳۰﴾

''یہ ہیں اس کی قدرت کے کرشمے تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ ہی حق ہے [1] اور بلاشبہ جنہیں وہ پکارتے ہیں [2] اس کے سوا، وہ سب باطل ہیں [3] اور بلاشبہ اللہ ہی بڑی شان والا اور بزرگ ہے [4]''

[1] یہ جو اللہ تعالیٰ کی وسعت علم، اس کی قدرت کا ہر شے کو شامل ہونا اور اس کی صنعت و کاریگری کے عجائبات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے، یعنی وہ واجب الوجود اور اس کے جمیع کمالات و اوصاف ثابت اور محقق ہیں۔ یا پھر اس لیے کہ اس کی الوہیت ثابت اور محقق ہے۔

[2] ابو عمرو، حفص، حمزہ اور کسائی نے یَدْعُوْنَ کو صیغہ غائب ہونے کی بناء پر یاء سے پڑھا ہے اور باقیوں نے صیغہ خطاب کی بناء پر تاء سے پڑھا ہے۔

[3] بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن خداؤں کو وہ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں۔ یعنی یا تو وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ہی معدوم ہیں یا ان کے بارے میں الوہیت کا دعویٰ کرنا باطل ہے۔

[4] اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر شے سے بلند و برتر اور اس پر غالب ہے۔ اس کی عظمت و کبریائی بالکل ظاہر اور واضح ہے اور جس کی یہ شان ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا علم اور اس کی قدرت جمیع اشیاء کو شامل ہو (اور کوئی شے بھی اس کے احاطہ قدرت سے باہر نہ ہو)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۱﴾

''کیا تم ملاحظہ نہیں کرتے کہ کشتی چلتی ہے سمندر میں اس کی مہربانی سے [1] تاکہ وہ دکھائے تمہیں اپنی (قدرت

کی) نشانیاں ہے۔ بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے شکر گزار کے لیے ہے۔"

۱۔ یہ اس ارشاد گرامی کے ساتھ متصل ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ۔ بِنِعْمَتِ اللّٰہِ کا معنی ہے کہ اسباب نعمت تیار اور مہیا کرنے میں اللہ تعالیٰ کا بہت احسان اور مہربانی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت واضحہ اور اس کے انعامات کے عام ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ اس میں باء صلہ یا حال کے لیے ہے۔

۲۔ تا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی قدرت کی بعض نشانیاں دکھائے۔ یعنی قدرت کے بعض دلائل اس سمندر کے عجائبات بھی ہیں جسے تم جانتے ہو۔

۳۔ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ سے مراد ہے جو مشقتوں پر صبر کرتے ہوئے اپنے آپ کو کائنات اور ذات میں غور و فکر کرنے میں مصروف رکھتا ہے۔ اور نعمتوں کا عرفان حاصل کرتا ہے اور پھر ان پر ان کے عطا کرنے والے کا شکر ادا کرتا ہے۔ یا صبار شکور سے مراد مؤمنین ہیں یعنی اس میں مؤمنین کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایمان کے دو نصف ہیں، نصف ایمان صبر میں ہے اور نصف شکر میں ہے (1)۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے، یعنی وہ خوشحالی میں شکر ادا کرتا ہے اور تکلیف اور تنگی کی حالت میں صبر کرتا ہے۔

وَ اِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ۝۳۲

"اور جب ڈھانپ لیتی ہیں انہیں ۱۔ پہاڑوں جیسی موجیں ۲۔ اس وقت پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کو خالص کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے عقیدہ کو ۳۔ پھر جب بچا لاتا ہے انہیں ساحل تک ۴۔ تو ان میں سے (چند ہی) حق پر رہتے ہیں ۵۔ اور نہیں انکار کرتا ہماری آیتوں کا مگر ہر وہ شخص جو غدار (اور) ناشکرا ہو ۶۔"

۱۔ یہ ظرف دَعَوُا اللّٰهَ کے متعلق ہے۔ اس میں شرط اور جزاء کا معنی ہے اور یہ جملہ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ پر معطوف ہو کر اَنَّ کی خبر ہے۔ اور غَشِيَهُمْ کی ضمیر اهل الفلک کی طرف راجع اور اسم اور خبر کے درمیان رابطہ ہے۔

۲۔ ظُلَل، ظلة کی جمع ہے۔ موج کو اس کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کیونکہ موج میں لہریں یکے بعد دیگرے اٹھتی رہتی ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے کہ ظلل سے مراد پہاڑ ہیں اور کلبی نے کہا ہے کہ اس سے مراد بادل ہیں۔ (2)

۳۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اپنے عقیدہ کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے کہ وہ انہیں نجات عطا فرمائے۔ اور اس وقت وہ کسی اور کو نہیں پکارتے۔ کیونکہ ان کے ذہنوں میں یہ نظریہ پختہ ہو چکا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا تکالیف اور مصائب کو دور کرنے والا اور کوئی نہیں۔ اور شدید خوف کے وقت خواہشات نفسانی اور تقلید آباء کا جو پردہ ان کی فطرت سلیمہ پر پڑا ہوا ہے وہ زائل ہو جاتا ہے۔

۴۔ اِلَى الْبَرِّ۔ نَجّٰىهُمْ کے متعلق ہے اور وہ او صلهم کے معنی کو متضمن ہے اور فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ جملہ وَ اِذَا غَشِيَهُمْ پر معطوف ہے۔

۵۔ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ لَمَّا کا جواب ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ لَمَّا کا جواب شرط محذوف ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے پھر جب اللہ تعالیٰ انہیں ساحل تک بچا لاتا ہے تو ان میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ پس ان میں سے بعض اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں، بعض کفر کرتے ہیں اور بعض درمیانی راہ اپناتے ہیں۔ یعنی ان میں سے بعض کفر اختیار

1۔ شعب الایمان، جلد 7 صفحہ 123 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 182 (التجاریۃ)

کرنے میں بعض کی نسبت درمیانی راہ اختیار کرتے ہیں اور بعض کا فر افتراء پردازی اور دیگر اقوال میں بعض دوسرے کافروں کی نسبت زیادہ سخت اور شدید ہوتے ہیں۔اور یہاں مقتصد کا ذکر اسی جانب پر دلالت کرنے کے اعتبار سے ہے۔کلبی نے مقتصد کا یہی معنی ذکر کیا ہے(1)۔لیکن اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ مقتصد سے مراد وہ آدمی ہے جو اس درمیانی راہ پر مقیم ہو، جو کہ توحید ہے۔کیونکہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت عکرمہ بن ابی جہلؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔وہ فتح مکہ کے وقت سمندر کی طرف بھاگ گئے تو انہیں (سمندر میں) سخت طوفان اور آندھی نے آ لیا۔تو اس وقت عکرمہ نے یہ دعا مانگی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس طوفان سے ہمیں نجات دے دی، تو میں ضرور بر ضرور محمد (ﷺ) کی طرف لوٹ کر جاؤں گا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا۔چنانچہ آندھی رک گئی، طوفان تھم گیا۔تو وہ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ آئے، ابھی تک حضور نبی کریم ﷺ وہیں تھے۔انہوں نے آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا اور پھر اپنے اسلام کو خوب حسین بنایا۔اس وضاحت کے مطابق تقدیر کلام یہ ہے کہ ان میں سے بعض معتدل رہتے ہیں اور بعض کفر کر جاتے ہیں۔اس پر یہ قول باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے۔

۵ اور ہماری نازل کردہ آیات کے حق ہونے کا انکار نہیں کرتا۔یا ہمارے دلائل قدرت کا انکار نہیں کرتا اور طوفانی موجوں سے نجات دینا بھی انہی میں سے ہے۔مگر ہر وہ شخص جو غدار ہو کیونکہ اس نے فطری عہد کو توڑ دیا ہے یا وہ عہد توڑ دیا ہے جو شدت اور مصیبت کے وقت اس نے کیا تھا۔اور الختّر کا معنی ہے انتہائی عہد شکن اور غدار انسان۔"کَفُوْرٍ" اور جو نعمتوں کی ناشکری کرنے والا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَ اخْشَوْا یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ٘ وَ لَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَیْــٴًـاؕ-اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاٙ- وَ لَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ(۳۳)

"اے لوگو! ڈرتے رہا کرو اپنے رب سے اور ڈرو اس دن سے کہ نہ بدلہ دے سکے گا کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے ۱؎ اور نہ ہی بیٹا بدلہ دے سکے گا اپنے باپ کی جانب سے کچھ بھی ۲؎ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور نہ دھوکہ دے تمہیں دنیوی زندگی ۳؎ اور نہ فریب میں مبتلا کرے تمہیں اللہ سے وہ بڑا مکار دھوکہ باز ۴؎"

۱؎ وَلَدِهٖ میں ضمیر موصوف کی طرف راجع ہے اور صفت محذوف ہے، یعنی مومن والد اپنے کافر بیٹے کی طرف سے اس دن بدلہ نہیں دے سکے گا۔

۲؎ اور وَلَا مَوْلُوْدٌ۔ والدٌ پر معطوف ہے اور هُوَ جَازٍ مولود کی صفت ہے۔یعنی مومن بیٹا اپنے کام سے اپنے کافر باپ کے لیے کوئی بدلہ نہیں دے سکے گا۔عَنْ وَّلَدِهٖ۔ لَا یَجْزِیْ کے متعلق ہے۔ہم نے یہاں کافر کی قید اس لیے ذکر کی ہے کیونکہ مومن تو مومن کے لیے شفاعت کر سکے گا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ۔اور مزید ارشاد فرمایا جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ۔"شَیْــٴًـا" مصدریت (مفعول مطلق) کی بناء پر منصوب ہے، یعنی لَا یَجْزِیْ شَیْئًا مِنَ الْاَجْزَاءِ (وہ کچھ بھی بدلہ نہیں دے سکے گا)۔یہ بھی جائز ہے کہ ترکیب کلام میں مَوْلُوْدٌ مبتدا ہو اور هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ اس کی خبر ہو۔اور نظم کلام میں تبدیلی یعنی جملہ فعلیہ کی جگہ جملہ اسمیہ ذکر کرنا اظہار تاکید کے لیے ہے۔کیونکہ

ایسا جملہ تاکید کے لیے ہی ذکر کیا جاتا ہے۔ اس پر عطف کے لیے اسے ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ جملہ اسمیہ میں جملہ فعلیہ کی نسبت تاکید زیادہ پائی جاتی ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ لفظ مولود ذکر کیا ہے اور اس میں دوسری تاکید ہے کیونکہ مَوْلُوْدٌ کا اطلاق صرف حقیقی بیٹے پر ہوتا ہے، جبکہ وَلَدٌ کا اطلاق بیٹے اور پوتے تمام پر ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَاِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ۔ پس جب بیٹا اپنے حقیقی باپ کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکے گا تو پھر اپنے اجداد (دادوں) کو تو بدرجہ اولیٰ کوئی فائدہ نہیں دے سکے گا۔ اسے بطور تاکید لانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے مؤمنین کو ہے۔ اور ان میں سے اکثر کے آباؤ اجداد حالت کفر پر مرے تھے لہٰذا اس تاکید کا مقصود ان کی اس حرص اور طمع کو ختم کرنا ہے کہ وہ آخرت میں شفاعت کے سبب اپنے آباؤ اجداد کو کچھ نفع پہنچا سکیں گے (یعنی وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکیں گے)۔

۳؎ بے شک اللہ تعالیٰ کی جانب سے دوبارہ زندہ کرنے اور ثواب اور سزا دینے کا وعدہ سچا اور حق ہے اس کے خلاف ہونا ممکن ہی نہیں۔ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ میں فاء سببیہ ہے۔ پس یہ دنیوی زندگی اپنی زینت و آرائش کے سبب تمہیں دھوکہ نہ دے۔ کیونکہ یہ زندگی فانی ہے اور اس کی لذت بھی ضعیف اور مصائب و آلام سے بھرپور ہے۔

۴؎ اور اللہ تعالیٰ کے حلم اور اس کے عذاب کو مؤخر کرنے کے سبب تمہیں فریب میں مبتلا نہ کرے شیطان جو کہ بڑا مکار اور دھوکے باز ہے۔ کیونکہ وہ تمہیں مغفرت کی امید دلاتا ہے اور تمہیں گناہوں کی جرات دلا کر ان پر برانگیختہ کرتا ہے۔ (لہٰذا تمہیں قطعاً اس کے دھوکہ اور فریب میں نہیں آنا چاہیے)۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ جنگل میں رہنے والوں میں سے ایک آدمی آیا۔ علامہ بغویؒ نے اس کا نام حارث بن عمرو بن حارث بن محارب بن حفصہ ذکر کیا ہے۔ تو اس نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر قیامت کے وقت کے بارے سوال کیا اور مزید کہا میری بیوی حاملہ ہے۔ پس آپ بتائیے کیا پیدا ہوگا (یعنی پیدا ہونے والا بچہ ہوگا یا بچی) ہمارے ملک میں خشک سالی ہے، آپ فرمائیے بارش کب ہوگی؟ اور میں جس زمین میں پیدا ہوا تھا اسے تو میں جانتا ہوں آپ یہ خبر دیجیے کہ میں کہاں مروں گا؟ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی۔(1)

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ؕ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴿۳۴﴾

"بے شک اللہ کے پاس ہی ہے قیامت کا علم اور وہی اتارتا ہے مینہ اور جانتا ہے جو کچھ (ماؤں کے) رحموں میں ہے ۱؎ اور کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ کس سرزمین میں مرے گا ۲؎ بے شک اللہ تعالیٰ علیم (اور) خبیر ہے ۳؎"

۱؎ بے شک اللہ کے پاس ہی ہے قیامت قائم ہونے کے وقت کا علم۔ یہ جملہ مستانفہ اس سوال کے جواب میں ہے کہ وہ دن کب ہوگا؟ اور وہ ہی اتارتا ہے مینہ جب چاہتا ہے۔ اس کے سوا بارش کے نزول کے بارے میں اور کوئی نہیں جانتا۔ اور وہی جانتا ہے جو کچھ (ماؤں کے) رحموں میں ہے کہ وہ مذکر ہے یا مؤنث اس کے سوا اسے اور کوئی نہیں جانتا۔

۲؎ اور کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائے گا۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ کس سرزمین میں مرے گا۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول

1۔ تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 55 (الامیریہ)

اللہ ﷺ نے فرمایا غیب کی چابیاں پانچ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا(1)۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی ایک کو یہ علم نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی یہ علم نہیں رکھتا کہ رحموں میں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ قیامت کس وقت مقرر پر قائم ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی نفس یہ نہیں جانتا کہ وہ کون سی زمین میں مرے گا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو یہ علم نہیں کہ بارش کب آئے گی۔ اسے احمدؒ اور بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ علامہ بغویؒ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عمرؓ سے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۚ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۚ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۚ(2)۔ اور صحیحین میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سوال کے واقعہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا پھر آپ نے یہ مکمل آیت پڑھی اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ الْآيَةِ۔(3) ابن ابی شیبہ نے مصنف میں حضرت خیثمہؒ سے روایت نقل کی ہے کہ ملک الموت علیہ السلام ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آئے اور آپ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک آدمی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ تو اس آدمی نے کہا یہ کون ہے؟ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا یہ ملک الموت ہے۔ تو اس آدمی نے کہا شائد یہ میری روح قبض کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لہٰذا آپ ہوا کو حکم فرمائیے کہ وہ مجھے اٹھائے اور سرزمین ہند میں پہنچا دے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے ایسا کر دیا۔ تو ملک الموت نے کہا میں بھی تعجب سے مسلسل اس کی جانب دیکھ رہا تھا، کہ مجھے حکم یہ دیا گیا ہے کہ میں اس کی روح سرزمین ہند میں قبض کروں اور یہ ابھی آپ کے پاس موجود ہے۔ واللہ اعلم۔ آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف علم کی نسبت کی گئی ہے اور بندے کے لیے درایت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ درایت اس جاننے کو کہتے ہیں جس میں ذاتی حیلہ اور غور و فکر کا دخل ہو۔ اس سے دونوں علموں (علم اور درایت) کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ قاموس میں ہے دَرَيْتُهٗ عَلِمْتُهٗ او بِضَرْبٍ مِّنْ حِيْلَةٍ کہ درایت کا معنی جاننا یا حیلہ اور فکر ونظر سے کسی چیز کو سمجھنا ہے۔ آیت میں اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ خواہ کتنا ہی حیلہ کرے اور اپنی ساری ظاہری اور باطنی قوتوں کو صرف کر دے وہ ان چیزوں کو بھی نہیں جانتا جن کا تعلق اس کے ذاتی کسب اور انجام سے ہے، تو وہ دوسری چیزوں کو کیسے جان سکتا ہے۔ ان امور کے جاننے کی ایک ہی صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا علم سکھا دے، خواہ رسولوں کے ذریعے سے یا اس پر دلائل قائم کر کے۔

ﮯ بے شک اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو جانتا ہے۔ اور وہ ان کے باطن کا علم ایسے ہی رکھتا ہے جیسے ان کے ظاہر کو جانتا ہے۔ یہ بیان کیا گیا ہے کہ منصور (عباسی خلیفہ) نے حالت خواب میں ملک الموت کو دیکھا اور اس سے اپنی مدت عمر کے بارے پوچھا۔ تو ملک الموت نے اس کی طرف اپنی پانچ انگلیوں سے اشارہ کیا۔ تو خواب کی تعبیر بتانے والوں نے اس کی تعبیر میں پانچ سال یا پانچ مہینے یا پانچ دن بیان کیے۔ لیکن حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ نے ارشاد فرمایا یہ اشارہ اس آیت کی طرف ہے کیونکہ یہ پانچوں علوم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا انہیں کوئی نہیں جانتا) واللہ اعلم۔

سورۂ لقمان کی تفسیر 22 رجب 1206ھ کو اختتام پذیر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے اس سورۃ کا ترجمہ 6 فروری 2000ء بروز اتوار 12 بجے شب اختتام پذیر ہوا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 704 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 183 (التجاریہ) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 704 (وزارت تعلیم)

سورۃ السجدہ

آیاتہا ۳۰ ﴿ سُوْرَۃُ السَّجْدَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۲۲ ﴾ رکوعاتہا ۳

سورۃ السجدہ مکی ہے۔ اس کی تیس آیتیں اور تین رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ﴿۲﴾

''الف۔ لام۔ میم اس کتاب کا نزول اس میں ذرا شک نہیں [1] سب جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے [2]۔''

[1] اگر الٓمّٓ کو سورت یا قرآن کریم کا نام قرار دیا جائے تو پھر ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر مابعد کلام تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ ہے۔ اس بناء پر کہ تنزیل مصدر بمعنی منزل (اسم مفعول) ہے۔ اور یہ اضافت اخلاق ثیاب کے قبیل سے ہے۔ بصورت دیگر یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور اصل کلام ھذا تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ ہے۔ یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر لَا رَیْبَ فِیْهِ ہے۔

[2] مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ فِیْهِ کی ضمیر سے حال ہے۔ کیونکہ مصدر خبر کے مابعد میں عمل نہیں کرتا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا کی خبر ثانی ہو یا پھر خبر اول ہو اور لَا رَیْبَ فِیْهِ جملہ معترضہ ہو جس کا کوئی محل نہیں۔ اور فِیْهِ کی ضمیر جملہ کے مضمون کی طرف لوٹ رہی ہے۔ گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ اس کے رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ ﴿۳﴾

''کیا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑا ہے ہرگز نہیں [1] بلکہ وہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے [2] تاکہ آپ ڈرائیں اس قوم کو نہیں آیا جن کے ساتھ کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے تاکہ وہ ہدایت پائیں [3]''

[1] اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ہے۔ اور لَا رَیْبَ فِیْهِ الْكِتٰبِ سے حال ہے۔ یا جملہ معترضہ ہے اور مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ تَنْزِیْلُ کے متعلق ہے۔ اور فِیْهِ میں ضمیر جملہ کے مضمون کے لیے ہے۔ اور اس کی تائید یہ قول باری تعالیٰ بھی کرتا ہے۔

[2] بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ کیونکہ یہ سابقہ کلام کے لیے تقریر و تاکید ہے۔ اس ترتیب کی بناء پر نظم کلام نے پہلے قول باری تعالیٰ الٓمّٓ کے ساتھ اعجاز قرآن کی طرف اشارہ فرمایا۔ پھر اس پر یہ مرتب ہوا کہ یہ بالیقین رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اور اس کی مزید تاکید اس میں ریب اور شک کی نفی فرما کر کی۔ پھر اس کے بعد کلام کو کفار کے اس قول کی طرف پھیر دیا جو اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے اس قول کا انکار بھی کیا اور اس پر اظہار تعجب بھی فرمایا۔ کیونکہ اس میں ام منقطعہ بل کے معنی میں ہے اور ہمزہ انکار کے لیے ہے۔ پھر

کلام کو اس سے یہ ثابت کرنے کی طرف پھیرا کہ قرآن کریم حق ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد تنزیل قرآن کا مقصد بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا

۳؎ اے محمد ﷺ تاکہ آپ ڈرائیں اس قوم کو نہیں آیا جن کے ساتھ کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے، کیونکہ یہ وہ اہل فترت تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور نبی کریم ﷺ کے درمیانی زمانہ میں تھے۔ (یہ زمانہ دور فترت کہلاتا ہے کیونکہ اس دوران کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں کیا گیا)۔ ما اتٰھُم کا جملہ قوماً کی صفت ہے تاکہ آپ کے انہیں ڈرانے کے سبب وہ ہدایت پا جائیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَهُمَا فِیۡ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ؕ مَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا شَفِیۡعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوۡنَ ۝

''اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں پھر متمکن ہوا تخت (سلطانی) پر ۱؎ نہیں تمہارے لیے اس کے بغیر کوئی مددگار اور نہ کوئی سفارشی ۲؎ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ۳؎''

۱؎ اس میں اسم جلالت لفظ اللہ مبتدا ہے اور الذی اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر اس کی خبر ہے۔ ان چھ دنوں میں سے پہلا دن اتوار ہے اور آخری دن جمعۃ المبارک ہے۔ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ کا عطف خلق پر ہے۔ ہم نے اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ کے بارے مفصل کلام سورہ یونس میں کی ہے اور سورۃ الاعراف میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

۲؎ یعنی جب تم اللہ تعالیٰ کی رضا سے تجاوز کر جاؤ گے اور اس سے دور ہٹ جاؤ گے تو پھر وہ مدد کرنے کے مقامات پر تمہاری مدد نہیں فرمائے گا۔ اور شفیع (سفارش کرنے والا) مجازاً مددگار کو کہا جاتا ہے، یعنی جب وہ تمہیں اپنی گرفت میں لے گا تو تمہارے لیے کوئی ولی اور مددگار باقی نہیں رہے گا۔ یہ ترکیب کلام میں یہ جملہ مستانفہ ہے یا پھر استوی کے فاعل سے حال ہے۔

۳؎ کیا تم اللہ تعالیٰ کی نصیحتوں کے سبب اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور فا فعل محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اَلَا تَتَفَكَّرُوۡنَ فَلَا تَتَذَكَّرُوۡنَ۔ (کیا تم غور و فکر نہیں کرتے اور سمجھتے نہیں)

یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ ثُمَّ یَعۡرُجُ اِلَیۡهِ فِیۡ یَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗۤ اَلۡفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ۝

''تدبیر فرماتا ہے ہر (چھوٹے، بڑے) کام کی آسمان سے زمین تک ۱؎ پھر رجوع کرے گا ہر کام اس کی طرف ۲؎ اس روز جس کی مقدار ہزار سال ہے اس اندازہ سے جس سے تم شمار کرتے ہو ۳؎''

۱؎ یہ جملہ مستانفہ ہے یا استوی کے فاعل سے حال ہے یا اسم جلالہ کی خبر کے بعد خبر ہے یا خبر اول ہے یا اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر اسم جلالہ لفظ اللہ موصوف کی صفت ہے۔ اور مَا لَكُمۡ حال ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ امور دنیا کی تدبیر فرماتا ہے۔ اسباب سماویہ کے ساتھ جن کے آثار زمین کی طرف نازل ہوتے ہیں۔

۲؎ پھر ہر کام اس کی طرف رجوع کرے گا۔ اور اس کے علم میں موجود رہے گا۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ وہ کام کا حکم فرماتا ہے اور جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے جو نازل کرتا ہے یا وہ قضا و قدر کا حکم اس فرشتے کے ذریعے آسمان سے زمین کی طرف نازل کرتا ہے جسے اس

خدمت پر معمور کیا گیا ہے۔ پھر جبرائیل علیہ السلام یا دوسرا فرشتہ اللہ تعالیٰ کی جانب اس مقام تک چڑھ جاتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔

؎ یہاں یَوْم سے مراد مطلق وقت ہے، صرف دن کی سفیدی مراد نہیں۔ کیونکہ ملائکہ کا اترنا اور آسمان کی طرف چڑھنا صرف دن کے ساتھ مختص نہیں۔ اور کَانَ مِقْدَارُهٗٓ ترکیب کلام میں حال ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔ یعنی اس کے اترنے اور چڑھنے کی مقدار ہزار سال ہے اس اندازہ سے جس سے تم شمار کرتے ہو۔ یعنی اگر انسانوں میں سے کوئی چل کر اسے طے کرے تو ہزار سال میں اسے طے کر سکتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کے سبب اس کا نزول وعروج آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہو جاتا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ تو ملائکہ کے آسمان سے زمین کی طرف نزول وعروج کا وصف ہے۔ لیکن قول باری تعالیٰ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ میں زمین سے سدرۃ المنتہیٰ تک کی مدت مسافت کا ذکر ہے اور یہی سدرۃ المنتہیٰ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا مقام ہے۔ اور جبرائیل علیہ السلام اور وہ فرشتے جو ان کے مقام کے مکین ہیں دنیوی ایام کے مطابق پچاس ہزار سال کی مسافت کو انتہائی قلیل وقت میں طے کر لیتے ہیں۔ مذکورہ تمام تفسیر مجاہد اور ضحاک کے قول کے مطابق ہے (1)۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں آیتوں میں زمین سے لے کر سدرۃ المنتہیٰ تک کی مسافت مراد ہو اور مسافت کا اختلاف چلنے والوں کی رفتار مختلف ہونے کی بناء پر ہو۔ کیونکہ ترمذی میں حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کی حدیث میں ہے کہ زمین و آسمان کے مابین فاصلہ اکہتر، بہتر یا تہتر برس کا ہے (2)۔ اور امام احمدؒ اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ زمین و آسمان اور ہر دو آسمانوں کے درمیان فاصلہ پانچ سو سال کا ہے۔ ان دونوں روایتوں کے درمیان چلنے والوں کی رفتار کے مختلف ہونے کے بغیر تطبیق کا اور کوئی سبب نہیں۔ واللہ اعلم۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ کا معنی یہ ہے امور دنیا کے آثار اسباب سماویہ یعنی ملائکہ وغیرہ کے ساتھ آسمان سے زمین کی طرف نازل ہوتے ہیں۔ پھر دنیا کے فنا ہونے، امراء کے امر اور حکام کے حکم کے منقطع ہونے کے بعد یہ امر اور تدبیر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو جائے گا اور یہ اس دن ہوگا جس کی مقدار ہزار سال ہے اور وہ یوم قیامت ہے۔ ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا فقراء پانچ سو سال اور نصف دن اغنیاء سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے (3)۔ اور قول باری تعالیٰ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ سے مراد بھی قیامت کا دن ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بھی کسی خزانے کا مالک اپنے خزانے کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا۔ تو اسے جہنم کی آگ میں گرم کر کے اس کی چوڑی تلواریں بنائی جائیں گی اور پھر ان سے اس کی پیشانی اور پہلوؤں پر داغ دیے جائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے مابین اس دن فیصلہ فرمائے گا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ پھر وہ اپنا راستہ جنت یا جہنم کی طرف دیکھ لے گا۔ الحدیث (4)۔ مذکورہ دونوں حدیثوں کے درمیان بھی وجہ تطبیق یہی ہے کہ قیامت کے دن کی طوالت اشخاص کی طرف نسبت کے اعتبار سے مختلف ہوگی۔ بعض لوگوں پر وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا اور بعض پر ایک ہزار سال کی مقدار کے برابر اور بعض پر ایام دنیا سے بھی زیادہ خفیف اور ہلکا ہوگا۔ حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ مرفوع اور موقوف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 183 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 167 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 58 (وزارت تعلیم) 4۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 319 (قدیمی)

روایت میں مؤمنین پر یوم قیامت کی طوالت کا ذکر کیا ہے کہ اس کی مقدار ظہر اور عصر کے درمیان وقت کے برابر ہوگی۔ اسی طرح علامہ بغویؒ نے ابراہیمؒ تیمی کا قول نقل کیا ہے(1)۔ اور ابو یعلی، ابو حبان اور بیہقی نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابو سعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس دن کے بارے پوچھا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ یہ دن تو بہت طویل ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے بے شک مومن کے لیے وہ دن انتہائی خفیف ہوگا حتیٰ کہ اس پر اس فرض نماز کی نسبت بھی زیادہ آسان اور ہلکا ہوگا جسے وہ دنیا میں ادا کرتا تھا(2)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ ابن ابی ملیکہ نے کہا ہے کہ میں اور حضرت عثمان بن عفانؓ کا غلام عبداللہ بن فیروز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوئے اور اس آیت طیبہ اور خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ کے بارے استفسار کیا۔ تو حضرت ابن عباسؓ نے ارشاد فرمایا یہ وہ ایام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں۔ ان کے بارے میں نہیں جانتا کہ یہ کیا ہیں؟ اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں کتاب اللہ کے بارے وہ کچھ کہوں جو میں نہیں جانتا(3)۔ امام بیہقی نے ابن ابی طلحہ کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے قول باری تعالیٰ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ کے بارے نقل کیا کہ آپؓ نے کہا یہ دنیا میں ہے۔ اور قول باری تعالیٰ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ یہ قیامت کا دن ہے اللہ تعالیٰ نے اسے کافر کے لیے پچاس ہزار سال کے برابر بنا دیا ہے(4)۔ جلال الدینؒ محلی نے اسی روایت کو اپنی تفسیر میں پسند کیا ہے۔ اس آیت کے بارے ایک قول یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہزار برس تک کے فیصلے فرما دیتا ہے اور فرشتہ انہیں لے کر زمین کی طرف نزول فرماتا ہے۔ پھر ایک ہزار سال گزرنے کے بعد دوسرے ہزار برس کے احکام لینے کے لیے وہ آسمان کی طرف چڑھتا ہے۔ اور یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ وہ آسمان سے زمین کی طرف وحی اتارتے ہوئے امور اطاعت کی تدبیر فرماتا ہے۔ پھر وہ امر اس کی طرف اس طرح خالص راجع نہیں ہوتا جیسے وہ راضی ہوتا ہے مگر اس طویل مدت میں، کیونکہ اعمال میں مخلصین کی تعداد کم ہوتی ہے۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ﴿۶﴾

''وہی جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے[1]''

[1] یعنی وہ مدبر جو کہ زمین و آسمان اور ان کے مابین تمام چیزوں کا خالق ہے۔ ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر عٰلِمُ الْغَيْبِ ہے۔ وہی جاننے والا ہے ہر اس شے کو جو مخلوق سے غائب اور مخفی ہے۔ اور جو ان کے پاس حاضر ہے۔ پس وہ حکمت کے مطابق امور کی تدبیر فرماتا ہے۔ وہ اپنے امر پر غالب ہے۔ اور اپنی تدبیر میں بندوں پر رحم فرمانے والا ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ اپنے فضل اور احسان سے بندوں کی مصالح کی رعایت فرماتا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ دونوں یا تو عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ کی صفتیں ہیں یا پھر اسی کی دوسری اور تیسری خبر ہیں۔

الَّذِيْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ﴿۷﴾

''وہ جس نے بہت خوب بنایا[1] جس چیز کو بھی بنایا اور ابتدا فرمائی انسان کی تخلیق کی گارے سے[2]''

[1] الذی اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر یا تو مذکورہ دو صفتوں کے بعد پھر صفت ہے یا پھر یہ اس کی چوتھی خبر ہے۔

[2] ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے خَلَقَهٗ میں لام کو ساکن پڑھا ہے۔ اور یہ كُلَّ شَيْءٍ سے بدل اشتمال ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 184 (التجاریہ) 2۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 324 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 184 (التجاریہ) 4۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 324 (العلمیہ)

کو خوب اچھا بنایا اور حکمت کے مطابق اس میں وہ وافر استعداد رکھی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے تیار کیا اور جو اس کے مناسب ہیں۔ حضرت قتادہؓ نے اسی طرح کہا ہے(1)۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے اس کا مفہوم اتقۂ و احکمۂ بیان کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو انتہائی مضبوط اور محکم بنایا ہے(2)۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قول باری تعالیٰ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ کے بارے فرمایا کہ بندر کی سرین حسین نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کو محکم کیا ہے(3)۔ اور مقاتل نے احسن کا معنی عَلِمَ کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ ہر شے کو کیسے تخلیق فرماتا ہے۔ جیسا کہ تیرا یہ قول ہے فُلَانٌ يَحْسُنُ كَذَا۔ یہ جملہ اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ وہ اس کام کے بارے خوب اچھی طرح جانتا ہو(4)۔ نافع اور کوفیوں نے صیغہ ماضی کی بناء پر خَلَقَهٗ میں لام کو مفتوح پڑھا ہے۔ اس لیے کہ یہ شے کی صفت ہے۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ ﴿۸﴾

”پھر پیدا کیا اس کی نسل کو[1] ایک جوہر سے یعنی حقیر پانی سے[2]“

[1] اور انسان یعنی آدم علیہ السلام کی تخلیق کی ابتداء گارے سے فرمائی۔ پھر اس کی نسل کو پیدا کیا۔ چونکہ نسل کا معنی جدا ہونا ہے لہٰذا اسے نسل اس لیے کہا گیا کیونکہ یہ انسان سے جدا ہوتی ہے۔

[2] نطفہ کو سلالہ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ انسان سے جدا ہوتا ہے۔ ترکیب کلام میں مِنْ مَاءٍ مَّهِيْنٍ سلالۃ سے بدل ہے یا اس کا بیان ہے۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۹﴾

”پھر اس (کے قد و قامت) کو درست فرمایا اور پھونک دی اس میں اپنی روح[1] اور بنا دیے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل[2] تم لوگ بہت کم شکر بجالاتے ہو[3]“

[1] پھر انسان کے اعضاء کو ایسی صورت پر درست فرمایا جس پر انہیں ہونا چاہیے اور پھونک دی انسان میں اپنی روح۔ یہ ضمیر یا تو الانسان کی طرف راجع ہے یا اس کا مرجع اَحْسَنَ خَلْقَ كُلَّ شَيْءٍ ہے۔ رُوْحِهٖ میں اضافت تشریفی ہے۔ اور اس اظہار کے لیے ہے کہ انسان کی تخلیق انتہائی عجیب اور عظیم الشان ہے اور اس کی نسبت اس کی طرف ہے جس کی نہ کوئی مثال ہے اور نہ اس کی کیفیت ہے۔

[2] وَجَعَلَ لَكُمُ میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ اور بنا دیے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل۔ تاکہ تم سنو، دیکھو اور سمجھو، حالانکہ اس سے قبل تم بغیر کان، آنکھ اور عقل کے صرف نطفہ تھے۔

[3] تم لوگ بہت کم شکر بجالاتے ہو۔ اس میں مَا زائدہ قلت کی تاکید کے لیے ہے، یعنی بہت کم شکر کرتے ہو یا بہت کم وقت میں شکر ادا کرتے ہو، یعنی یہ نعمتیں عطا فرمانے والے پروردگار کی وحدانیت اور عبادت کا حق بہت کم ادا کرتے ہو۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۰﴾

”اور کہنے لگے[1] کیا جب (مرنے کے بعد) ہم گم ہو جائیں گے زمین میں تو کیا ہم از سر نو پیدا کیے جائیں گے[2]“

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 184 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 184 (التجاریہ)
3۔ [illegible] جلد 5 صفحہ 331 (العلمیہ)

درحقیقت یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات سے انکار کررہے ہیں ۳؎ ''

۱؎ اور دوبارہ زندہ کیے جانے کے منکرین کہنے لگے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ پر ہے اور اس میں خطاب سے غیب کی طرف التفات ہے۔

۲؎ کیا جب ہم زمین میں غائب ہو جائیں گے، یعنی زمین کی مٹی کے ساتھ مل کر ایسے مٹی ہو جائیں گے کہ دونوں (مٹیوں) کے درمیان تمیز نہیں کی جاسکے گی تو کیا ہم از سر نو پیدا کیے جائیں گے؟ اس معنی میں اصل عربوں کا یہ قول ہے ضَلَّ الْمَآءُ فِي اللَّبَنِ (پانی دودھ میں گم ہو گیا)۔ یہ تب کہا جاتا ہے کہ جب پانی مکمل طور پر دودھ میں مل جائے اور اپنا وجود کھو دے۔ ابن عامر نے اِذَا کو خبر ہونے کی بناء پر ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس میں عامل وہ فعل ہے جس پر مابعد کلام ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ دلالت کررہا ہے اور وہ نُبْعَثُ اور نُجَدَّدُ خلقًا ہے۔ نافع، کسائی اور یعقوب نے خبر کی بناء پر اِنَّا کو ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اصلاً یہ قول ابی بن خلف کا ہے۔ لیکن اس کی نسبت تمام کی طرف کی گئی ہے کیونکہ وہ تمام ان سے متفق تھے۔ یہ استفہام برائے انکار ہے کیونکہ وہ دوبارہ زندہ کیے جانے کو بعید سمجھتے تھے۔

۳؎ درحقیقت یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات سے انکار کررہے ہیں۔ یعنی اس جزاء کا انکار کررہے ہیں جو دوبارہ زندہ کیے جانے کے بعد دی جائے گی۔ جب اللہ تعالیٰ نے دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے ان کے کفر کا ذکر کیا۔ تو اس سے اس جانب اشارہ کر دیا کہ وہ ان تمام معاملات کے منکر ہیں جو آخرت میں وقوع پذیر ہوں گے۔

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ⑪

'' فرمائیے جان قبض کرے گا تمہاری ۱؎ موت کا فرشتہ ۲؎ جو تم پر مقرر کر دیا گیا ہے ۳؎ پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۴؎ ''

۱؎ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمائیے تمہاری جان کو موت کا فرشتہ قبض کرے گا یعنی تمہاری جانوں کو اس طرح قبض کرے گا کہ ان میں سے کوئی شے نہیں چھوڑے گا یا پھر تم میں سے کسی کو باقی نہیں رہنے دے گا۔ ملک الموت حضرت عزرائیل علیہ السلام ہیں۔ باب تفعل اور استفعال دونوں ایک دوسرے کی جگہ استعمال کیے جاسکتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے تَقَصَّيْتُهٗ اور اِسْتَقْصَيْتُهٗ، اسی طرح تَعَجَّلْتُهٗ اور اِسْتَعْجَلْتُهٗ وغیرہ۔

۲؎ علامہ بغویؒ نے عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تمام قسم کی بیماریاں اور درد موت کی خبر دینے والے اور اس کے قاصد ہیں۔ پس جب مقررہ وقت آجاتا ہے تو ملک الموت آتے ہیں اور آکر یہ کہتے ہیں اے بندے! یکے بعد دیگرے کتنی خبریں، کتنے قاصد اور کتنے پیغام تیرے پاس آئے۔ اب میں تو ایسی خبر ہوں جس کے بعد اور کوئی خبر نہیں آئے گی اور میں وہ قاصد ہوں کہ میرے بعد اور کوئی قاصد نہیں آئے گا۔ اب طوعاً و کرہاً تو نے اپنے رب کا حکم تسلیم کرنا ہی ہے اور جب فرشتہ اس کی روح قبض کر لیتا ہے تو اس کے (اہل خانہ) اس پر روتے اور چیختے چلاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر موت کا فرشتہ کہتا ہے کہ تم کس پر چیخ و پکار کررہے ہو اور تم کس پر رو رہے ہو؟ قسم بخدا! میں نے اس کی مدت عمر کے بارے اس سے کوئی زیادتی نہیں کی اور نہ ہی

بار بار لوٹ کر آتا رہوں گا یہاں تک کہ تم میں سے کسی کو بھی باقی نہیں رہنے دوں گا۔

ہم نے ملک الموت اور ان کے معاون فرشتوں کے بارے احادیث کا تذکرہ سورۃ الانعام کی آیت حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ کی تفسیر میں کر دیا ہے۔

مسئلہ: ملک الموت کو کسی کے وقت مقررہ کا علم نہیں ہوتا جب تک کہ اسے اس کا حکم نہ دیا جائے۔ امام احمدؒ اور ابن ابی الدنیا نے حضرت معمر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ملک الموت یہ نہیں جانتا کہ کسی انسان کی موت کا مقررہ وقت کیا ہے یہاں تک کہ اسے اس کی روح قبض کرنے کا حکم دے دیا جاتا ہے (تو پھر اسے معلوم ہوتا ہے)۔ ابن ابی الدنیا نے ابن جریج سے روایت نقل کی ہے کہ ہم تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ملک الموت کو یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کی روح فلاں دن فلاں وقت قبض کر لے۔(1)

مسئلہ: ملک الموت مومن کے لیے انتہائی حسین صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کافر کے لیے انتہائی قبیح اور خوفناک صورت میں۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مقام خلت عطا فرمایا، تو ملک الموت نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ اگر مجھے اجازت ہو تو میں ابراہیم علیہ السلام کو جا کر یہ خوشخبری سنا دوں۔ تو رب کریم نے انہیں یہ اجازت عطا فرما دی۔ چنانچہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپ کو یہ خوشخبری سنائی۔ تو سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا الحمد للّٰہ۔ پھر آپ نے کہا اے فرشتہ موت! یہ تو دکھا، تو کفار کی روحیں کیسے قبض کرتا ہے! اس نے جواباً کہا اے ابراہیم! آپ اسے برداشت نہیں کر سکو گے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کیوں نہیں! تو اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔ پھر فوراً آپ کی طرف متوجہ ہوا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا ایک سیاہ رنگ کا آدمی ہے۔ اس کا سر آسمان تک پہنچا ہوا ہے۔ اور اس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ اور اس کے جسم کے ہر بال میں آدمی کی صورت نظر آتی ہے۔ اور اس کے منہ اور مساموں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ پس یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام پر غشی طاری ہو گئی۔ پھر جب کچھ وقت کے بعد آپ کو افاقہ ہوا تو اتنے میں ملک الموت اپنی پہلی صورت اختیار کر چکا تھا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اے ملک الموت! اگر کسی کافر کو تیری صورت کے بغیر کوئی تکلیف اور غم نہ بھی لاحق ہو، تو اسے یہ تیری صورت ہی کافی ہے۔ پھر فرمایا اب یہ دکھا کہ مومنین کی ارواح کیسے قبض کرتا ہے۔ اس نے آپ کی جانب سے منہ پھیر لیا پھر جب وہ آپ کی طرف متوجہ ہوا تو آپ نے اسے دیکھا کہ وہ ایک نوجوان آدمی ہے۔ اپنی شکل صورت کے لحاظ سے حسین تر ہے، اس کی مہک اور خوشبو انتہائی پاکیزہ ہے۔ اور سفید کپڑوں میں ملبوس ہے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اے ملک الموت! اگر کوئی مومن اپنی موت کے وقت تیری اس صورت کے بغیر عزت و کرامت اور آنکھوں کو تراوت بخشنے والی شے نہ بھی پائے، تو تیری یہی صورت اس کے لیے کافی ہو جاتی ہے(2)۔ اور حضرت کعبؓ سے مروی ہے کہ ملک الموت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی وہ صورت دکھائی جس میں وہ بندہ مومن کی جان قبض کرتا ہے تو آپ نے اسے ایسی پر رونق اور نورانی حالت میں دیکھا جسے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اور جب اس نے اپنی وہ صورت ظاہر کی جس میں وہ کفار و فجار کی روحیں قبض کرتا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے حتیٰ کہ آپ کے کندھوں پر رعشہ طاری ہو گیا، آپ نے اپنا پیٹ زمین سے چمٹا لیا اور قریب تھا کہ آپ کی جان نکل جاتی۔

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 334 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 333 (العلمیہ)

مسئلہ: انسانوں کے سوا دیگر حیوانات کی موت کیسے ہوتی ہے؟

ابوالشیخ اور عقیلی نے الضعفاء میں اور دیلمی نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمام چوپاؤں اور حشرات الارض کی مدت عمر اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید بیان کرنے تک ہوتی ہے۔ پس جب ان کی تسبیح وتحمید ختم ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی ارواح قبض فرمالیتا ہے۔ ان میں سے کوئی شے ملک الموت کے سپرد نہیں (1)۔ خطیب نے ایک دوسری سند سے اسی طرح حضرت ابن عمرؓ کی حدیث نقل کی ہے۔ ابن عطیہ اور قرطبی نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی ملک الموت کے واسطہ کے بغیر ختم کر دیتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی روحیں قبض کرنے کے لیے ملک الموت اور اس کے معاونین کو مقرر کیا ہے تاکہ اہل ایمان کی عزت وتکریم ہو اور کفار کے لیے اہانت ورسوائی اور عذاب کا باعث ہو۔ خطیب نے اپنی تفسیر میں ضحاک کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ملک الموت کو انسانوں کی ارواح قبض کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ پس وہی ان کی ارواح قبض کرتا ہے۔ ایک فرشتہ جنات کے لیے، ایک شیاطین کے لیے اور ایک فرشتہ وحشی جانوروں، پرندوں، درندوں، مچھلیوں اور چیونٹیوں کی موت کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ پس یہ چار فرشتے ہیں۔ تمام فرشتے پہلے صعقہ میں ہی مر جائیں گے۔ ملک الموت ان کی ارواح قبض کرنے پر مقرر ہے۔ پھر وہ خود بھی مر جائے گا۔ لیکن وہ لوگ جو سمندر میں شہید ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ارواح خود قبض کرتا ہے۔ ان کی عزت وتکریم کی خاطر انہیں ملک الموت کے سپرد نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں سمندر کا سفر طے کرتے ہیں۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی جویبر ہے جو بہت زیادہ ضعیف ہے۔ اور ضحاک اور حضرت ابن عباسؓ کے درمیان انقطاع بھی ہے۔ اور اس کے آخری حصہ کی شاہد روایت مرفوع ہے۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت ابوامامہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے اللہ تعالیٰ نے سمندر کے شہداء کے بغیر تمام لوگوں کی ارواح قبض کرنے کے لیے ملک الموت کو مقرر کیا ہے۔ کیونکہ ان شہداء کی ارواح قبض کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھا ہے (2)۔ میں کہتا ہوں عشق ومعرفت کے سمندر میں شہید ہونے والے بدرجہ اولیٰ اس عزت وتکریم کے اہل ومستحق ہیں۔ واللہ اعلم۔

ہ پھر موت کے بعد ملائکہ رحمت مومن کی روح لے کر آسمانوں کی طرف چڑھ جائیں گے یہاں تک کہ وہ اسے ساتویں آسمان تک لے جائیں گے۔ اور کافر کی روح ملائکہ عذاب لے جائیں گے یہاں تک کہ اسے لے کر جب آسمان دنیا پر پہنچیں گے۔ وہ اس کا دروازہ کھولنے کا مطالبہ کریں گے لیکن وہ نہیں کھولا جائے گا۔ پس اس روح کو وہیں سے پھینک دیا جائے گا۔ الحدیث۔ یہ حدیث سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ تمہیں حشر کے بعد حساب وکتاب کے مقام کی طرف زندہ کر کے لوٹایا جائے گا۔ پھر ہر نفس کو اس کے اعمال کی جزاء دی جائے گی۔ پھر حشر کے بعد ان کے حال کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

"اور کاش! تم دیکھو جب مجرم اپنے سر جھکائے ہوئے اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے ۱؎ (کہیں گے) اے ہمارے رب! ہم نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیا ہے اور (کانوں سے) سن لیا ہے پس (ایک بار) بھیج ہمیں (دنیا میں) اب

1۔ الفردوس، جلد 1 صفحہ 418 (العلمیۃ)　2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3 صفحہ 353 (العلمیۃ)

ہم نیک عمل کریں گے ؎ ہمیں اب پورا یقین آ گیا ہے ؎''

؎ اور کاش اے محمد! ﷺ تم دیکھو۔ جب مجرم یعنی وہ مشرکین جنہوں نے یہ کہا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ اپنے سر جھکائے ہوئے اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے تو ندامت اور غم کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہیں گے ترکیب کلام میں نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ مجرمون کی ضمیر سے جاتی ہے اور عند ربهم نَاكِسُوْا کے فاعل سے حال ہے۔ یا اس کے لیے حال مترادف ہے۔ یا یہ اس کے جواب میں مستانفہ ہے جو وہ اس وقت کہیں گے۔

؎ اے ہمارے رب! ہم نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیا اس وعدہ کو جو تو نے ہم سے کیا تھا اور ہم اسے جھٹلاتے تھے۔ اور ہم نے اس بارے میں تیری جانب سے رسولوں کی تصدیق اپنے کانوں سے سن لی ہے جس بارے میں ہم انہیں جھٹلاتے تھے۔ اور ان کا یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے اپنے گناہوں کو دیکھ لیا ہے اور جو کچھ ہمارے بارے میں کہا گیا ہے وہ ہم نے سن لیا ہے۔ پس ایک بار ہمیں دنیا کی طرف بھیج اب ہم نیک عمل کریں گے۔ نَعْمَلْ جواب دعا ہونے کے سبب مجزوم ہے۔

؎ ہمیں اب اس کے بارے پورا یقین آ گیا ہے جس میں ہم اس سے قبل شک کیا کرتے تھے۔ یہاں لَوْ کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام ہے لوایت امرًا قطیعًا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ لَوْ تمنی کے لیے ہو۔ اور لَوْ اِذْ میں ماضی کا مفہوم اس اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں جو شے ثابت ہے وہ واقعہ ہونے والی کے قائم مقام ہی ہے۔ اور تری کا مفعول مقدر نہیں ہوگا کیونکہ معنی یہ ہے کاش اس وقت تمہاری جانب سے رؤیت ہو۔ یا مفعول مقدر ہوگا جس پر اِذْ کا صلہ دلالت کرتا ہے۔ یعنی کاش آپ ان کے سروں کو جھکا ہوا دیکھیں۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾

''(جواب ملے گا) اور اگر ہم چاہتے تو ہم دے دیتے ہر شخص کو اس کی ہدایت لیکن یہ بات طے ہو چکی ہے میری طرف سے ؎ کہ میں ضرور بھروں گا جہنم کو تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے ؎''

؎ اور اگر ہم چاہتے کہ ہم ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیں، یعنی ایسی شے عطا فرما دیں جس سے ایمان اور عمل صالح کی طرف ہدایت حاصل کی جا سکتی ہو۔ اور اپنے اختیار سے قلب و بدن میں رسول مکرم کی اطاعت و فرمانبرداری کے جذبات پیدا کر دے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ اگر ہم ہر نفس کی ہدایت چاہتے۔ تو ہم جن و انس میں سے ہر ذی عقل کو (ہدایت) دے دیتے۔ لیکن انہیں ہدایت نہ دینے، ان کے ہدایت نہ پانے اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہونے کے بارے میرا فیصلہ ثبت ہو چکا ہے۔ یا مفہوم یہ ہے کہ میری یہ وعید اور دھمکی سبقت لے جا چکی ہے۔

؎ الجنّہ اور النّاس دونوں پر الف لام عہدی ہے۔ اور ان سے مراد ان دونوں فریقوں کے مجرم ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے (کہ میں جہنم کو ضرور بھروں گا تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے)۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو جنت کا اہل کیا اور انہیں اس وقت سے ہی جنت کا اہل بنا دیا درآنحالیکہ ابھی وہ اپنے آباء کی صلبوں میں تھے۔ اور بعض کو جہنم کے لیے پیدا فرمایا اور انہیں اس وقت سے ہی جہنم کے لیے بنا دیا درآنحالیکہ ابھی وہ اپنے آباء کی صلبوں میں تھے (رواہ مسلم)(1)۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 337 (قدیمی)

فرمایاتم میں سے کوئی بھی نہیں مگر اس کے لیے یہ لکھ دیا گیا ہے کہ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے یا اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔ صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ کیا ہم اپنی اسی تحریر پر توکل نہ کرلیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا عمل کرو، پس وہی کام آسان کیا جاتا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ پس وہ آدمی جو اہل سعادت میں سے ہو اس کے لیے اہل سعادت کا عمل آسان بنا دیا جاتا ہے اور جو اہل شقاوت (بدبخت) میں سے ہو اس کے لیے اہل شقاوت کا عمل آسان بنا دیا جاتا ہے۔ پھر آیت کریمہ تلاوت فرمائی فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ﴿۵﴾ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى الآیہ۔ متفق علیہ (1)۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، آپ کے دست مبارک میں دو کتابیں تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیا ہیں؟ ہم نے عرض کی نہیں یارسول اللہ ﷺ کیا آپ ہمیں مطلع نہیں فرمائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس کتاب کے بارے میں جو آپ ﷺ کے دائیں ہاتھ میں تھی، یہ رب العالمین کی طرف سے لکھی ہوئی کتاب ہے، اس میں اہل جنت کے اسماء ہیں اور ان کے آباء اور قبائل کے اسماء ہیں۔ پھر آخر میں ان کا حساب (میزان) کر دیا گیا ہے۔ پس ہمیشہ کے لیے نہ ان میں اضافہ کیا جائے گا اور نہ ان سے کسی کو کم کیا جائے گا۔ پھر اس کتاب کے بارے میں جو آپ کے بائیں ہاتھ میں تھی، فرمایا یہ رب العالمین کی طرف سے لکھی ہوئی کتاب ہے، اس میں اہل جہنم کے اسماء ہیں اور ان کے آباء اور قبائل کے اسماء ہیں۔ پھر آخر میں ان کا حساب کر دیا گیا ہے۔ پس اب ان میں نہ اضافہ کیا جائے گا اور نہ کمی کی جائے گی۔ تو یہ سن کر صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ پھر عمل کی کیا ضرورت ہے جبکہ یہ امر مکمل ہو چکا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا سیدھے (صحیح) عمل کرتے چلو اور قریب ہوتے جاؤ کیونکہ صاحب جنت کا خاتمہ اہل جنت کے عمل پر کیا جائے گا۔ اگر چہ وہ پہلے جو عمل بھی کرتا رہے۔ اور صاحب نار کا خاتمہ اہل نار کے عمل پر کیا جائے گا اگر چہ وہ پہلے جو عمل بھی کرتا رہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ فرمایا اور ان دونوں کو جھاڑ دیا۔ پھر فرمایا تمہارا رب اپنے بندوں کے فیصلے سے فارغ ہو چکا ہے۔ پس ایک فریق جنت میں ہے اور ایک جہنم میں ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔ جملہ لَاَمْلَـَٔنَّ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور قول مذکور کا بیان ہے۔ اس میں ھُوَ مقدر ہے یا اس سے بدل ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ حق القول قسم کے حکم میں ہے جیسے کہا جاتا ہے حقًا لا فعلن کذا۔ پس اسی بناء پر لَاَمْلَـَٔنَّ اس کا جواب ہوگا۔ مقاتل نے کہا ہے قول سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو ابلیس کے بارے ہے لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِیْنَ(3)۔ اور اس میں یہ تصریح ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب عدم مشیت ہے۔ اور حق القول عدم مشیت کے لیے تقریر و تاکید ہے، اور معنی یہ ہے لیکن میں نے ہی ان کا کفر اور جہنم میں ان کا ٹھکانہ چاہا۔ یا قضاء سابق کے سبب عدم مشیت کی تعلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عذاب کا مزہ چکھنے کا سبب عاقبت کو بھولنے اور اس میں غور و فکر نہ کرنے کو آئندہ ارشاد میں قرار دیا ہے لیکن اس سے قضاء سابق کے علت ہونے کا انکار نہیں ہوگا۔

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِیْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

"پس اب چکھو سزا اس جرم کی کہ تم نے بھلا دیا تھا اس روز کی ملاقات کو[1] ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا[2] اور چکھو ابدی عذاب ان (کرتوتوں) کے عوض جو تم کیا کرتے تھے[3]"

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 333 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 36 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 185 (التجاریہ)

لہ یہ فاء سببیہ ہے۔ یعنی جب میری طرف سے بات اس طرح طے ہو چکی ہے۔ جب وہ جہنم میں داخل ہوں گے تو جہنم کے داروغے انہیں کہیں گے جہنم کے عذاب کا مزہ چکھو۔ اس سبب سے کہ تم نے اپنے اس روز کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور اس سے مراد یوم بعث اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا دن ہے اور ھٰذَا، یَوْمِکُمْ کی صفت ہے۔ یہاں تک کہ تم نے عذاب کا سبب بننے والے اعمال کیے۔

۲ تو ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا۔ یعنی ہم نے تمہیں رحمت سے محروم کر دیا یا عذاب میں چھوڑ کر بھلا دیا گیا۔ اور اس کے جملہ مستانفہ ہونے اور فعل کی بناءاِنَّ اور اس کے اسم پر کرنا ان سے انتقام اور بدلہ لینے میں شدت کا اظہار کرنے کے لیے ہے۔

۳ اور چکھو ابدی عذاب ان کرتوتوں کے عوض جو تم کیا کرتے تھے۔ اس میں ذُوْقُوْا امر تاکید کے لیے مکرر ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس میں صراحتہً ان کے عذاب کی علت کفر، معاصی اور ان کے دیگر برے اعمال کو قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل آخرت کے امور میں غور و فکر اور تدبر نہ کرنے کو عذاب کی علت قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ان کے لیے عذاب کا تقاضہ کرتی ہیں۔ اور یہی آیت ہماری جبریہ اور قدریہ کے خلاف حجت ہے۔ جبریہ کے خلاف قول باری تعالیٰ بِمَا نَسِیْتُمْ حجت ہے۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے عذاب کا مزہ چکھنے کے سبب آخرت کے امور کو بھولنا اور اپنے اختیار سے ایمان اور اعمال صالح کو ترک کرنا قرار دیا ہے (جبکہ جبریہ بندے کو مجبور محض خیال کرتے ہیں) اور قدریہ کے خلاف اس طرح حجت ہے کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے تمام بندوں کے بارے میں ایمان اور اعمال صالح کی مشیت رکھتا ہے۔ لیکن وہ خود اپنی مشیت اور اختیار سے ایمان کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور آیت طیبہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ نہ تو مکمل جبر ہے اور نہ ہی مکمل اختیار انسان کے حوالے کیا گیا ہے بلکہ معاملہ ان دونوں صورتوں کے بین بین ہے۔

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۱۵﴾

"صرف وہی لوگ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں جنہیں جب ہماری آیتوں سے نصیحت کی جاتی ہے تو گر پڑتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے لہ اور پاکی بیان کرتے ہیں اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اور وہ غرور و تکبر نہیں کرتے ۲ "

لہ صرف وہی لوگ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں جنہیں جب ہماری آیتوں سے نصیحت کی جاتی ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اپنے چہروں کے بل سجدہ کرتے ہوئے گر پڑتے ہیں۔ اور ہر اس شے سے پاکی بیان کرتے ہیں جو اس کے لائق نہیں۔ جیسے دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز ہونا وغیرہ۔

۲ اور وہ اپنے رب کی حمد بیان کرتے ہیں اس نعمت پر شکر بجالاتے ہوئے کہ اللہ نے انہیں اسلام لانے کی توفیق مرحمت فرمائی۔ اور اس نے انہیں ہدایت عطا فرمائی۔ چنانچہ وہ کہہ رہے ہوتے ہیں سبحان اللہ و بحمدہ۔ اور وہ ایمان اور اطاعت قبول کرنے سے غرور و تکبر نہیں کرتے۔

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا٘ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾

''دور رہتے ہیں ان کے پہلو (اپنے) بستروں سے پکارتے ہیں [1] اپنے رب سے ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے اور ان نعمتوں سے جو ہم نے ان کو دی ہیں خرچ کرتے رہتے ہیں [2]''

[1] یدعون کے فاعل سے حال ہے، یعنی ان کے پہلو اٹھے ہوتے ہیں اور دور رہتے ہیں ان بستروں سے جن پر وہ سوتے ہیں یَدْعُوْنَ جنوبھم کی ضمیر مجرور سے حال ہے اور وہ تَتَجَافٰی کا فاعل ہے اسی طریقہ پر جیسا کہ دَابِرَ ھٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِیْنَ ہے۔

[2] اپنے رب کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے۔ اور اس کی رحمت وثواب کی امید رکھتے ہوئے اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ ہناد نے اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا۔ پکارنے والا انہیں اپنی آواز یکساں سنا سکے گا اور آنکھ ان تمام کو دوسرے کنارے تک دیکھ سکے گی۔ پس اس صورت میں ایک ندا دینے والا کھڑا ہو گا اور وہ یہ ندا دے گا کہاں ہیں وہ لوگ جو اپنی خوشحالی اور تنگی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے تھے۔ تو یہ آواز سن کر کچھ لوگ کھڑے ہوں گے لیکن وہ تعداد میں انتہائی قلیل ہوں گے۔ پس وہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر دوبارہ وہ ندا دے گا کہاں ہیں وہ لوگ جن کے پہلو بستروں سے دور رہا کرتے تھے۔ پس وہ کھڑے ہوں گے اور تعداد میں تھوڑے سے ہوں گے وہ بھی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر ساری مخلوق کھڑی ہو گی اور اس سے حساب لیا جائے گا(1)۔ ابن راہویہ اور ابو یعلی نے اپنی مسندوں میں اسی طرح یہ حدیث نقل کی ہے اور اس میں ہے وہ پہلے ایسی آواز کے ساتھ ندا دے گا کہ اسے تمام مخلوق سنے گی اور وہاں جمع ہونے والے تمام لوگ یہ جان لیں گے کون ہے جو سب سے زیادہ عزت وشرف کے اہل ہے۔ حسن، مجاہد، مالک، اوزاعی اور علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس آیت سے مقصود تہجد گزار لوگ ہیں جو کہ رات کی نماز کے لئے اٹھتے ہیں(2)۔ احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ اور ابن راھویہ نے اپنی مسندوں میں اور حاکم نے حضرت معاذؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مجھے ایسے عمل پر مطلع فرمایئے جو مجھے جنت میں داخل کر دے اور مجھے جہنم سے دور لے جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تو نے بہت عظیم سوال کیا ہے۔ لیکن اس کے لیے بہت آسان ہے جس پر اللہ تعالیٰ اسے آسان فرما دے تو فقط اللہ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ ٹھہرا۔ نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کر، رمضان المبارک کے روزے رکھ اور بیت اللہ شریف کا حج ادا کر۔ پھر ارشاد فرمایا کیا میں ابواب الخیر (بھلائی کے دروازے) پر تمہاری راہنمائی نہ کر دوں۔ فرمایا روزہ ڈھال ہے، صدقہ گناہوں کو ایسے ختم کر دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ اور آدمی کی وہ نماز جو رات کے وسط میں ادا کرے (بھی اسی میں سے ہے)۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت یعملون تک تلاوت فرمائی تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ الآیہ۔ پھر ارشاد فرمایا کیا میں تمہاری راہنمائی نہ کر دوں کہ رأس الامر کیا ہے۔ اس کا ستون کیا ہے اور اس کی کوہان کی چوٹی کیا ہے؟ میں نے عرض کی کیوں نہیں یا رسول اللہ! ﷺ۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا رأس الامر (دین کا سر) اسلام ہے۔ اس کا ستون نماز ہے اور اس کی کوہان کی چوٹی جہاد ہے۔ پھر ارشاد فرمایا کیا میں تمہیں مطلع نہ کر دوں کہ ان تمام کی اصل اور جڑ کیا ہے؟ میں نے عرض کی کیوں نہیں یا نبی اللہ ﷺ۔ تو آپ ﷺ نے اپنی زبان کو پکڑا اور فرمایا اسے روک کر رکھ۔ یہ سن کر میں نے عرض کی یا نبی اللہ ﷺ! کیا ہم زبان سے جو گفتگو کرتے ہیں اس پر ہمارا مواخذہ کیا جائے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اے معاذ تیری ماں تجھ پر روئے زبانوں کے سبب ہی تو لوگوں کو اپنے مونہوں یا ناکوں کے بل جہنم میں ڈالا جائے گا(3)۔ ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے

1۔ کنز العمال، جلد 15 صفحہ 853 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 185 (التجاریہ) 3۔ مستدرک حاکم، جلد 2 صفحہ 448 (العلمیہ)

شک جنت میں ایسے کمرے ہیں جن کا ظاہران کے باطن سے (باہر اندر سے) اوران کا باطن ظاہر سے (اندر باہر سے) دکھائی دے گا اللہ تعالیٰ نے وہ ان کے لیے تیار فرمائے ہیں جو گفتگو نرمی سے کرتے ہیں، (مستحقین کو) کھانا کھلاتے ہیں، مسلسل روزے رکھتے ہیں اور رات کے وقت نماز (تہجد) پڑھتے ہیں جبکہ لوگ سور ہے ہوتے ہیں(1)۔اسے بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور ترمذی نے حضرت علیؓ سے اس طرح روایت نقل کی ہے۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رمضان المبارک کے بعد افضل ترین روزے محرم کے ہیں جو کہ شہر اللہ ہے اور فرض نماز کے بعد افضل ترین نماز رات کی نماز ہے۔اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔اور امام احمدؒ نے اس کے آخری حصے میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ فرض نماز کے بعد افضل ترین وہ نماز ہے جو رات کے وسط (جوف) میں ادا کی جائے(3)۔علامہ بغویؒ نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ دو آدمیوں کو پسند کرتے ہوئے اظہار فخر فرماتا ہے، ایک وہ آدمی ہے جو اپنے بیوی بچوں کے درمیان سے بستر سے اٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت (نماز) کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ سے فرماتا ہے میرے اس بندے کی طرف دیکھو کہ اس نے میری جانب سے ملنے والے ثواب کی رغبت رکھتے ہوئے اور میری جانب سے ہونے والے عذاب سے ڈرتے ہوئے اپنے بستر اور اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ دیا ہے۔اور دوسرا وہ آدمی ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کے لیے شریک ہوا۔پھر شکست خوردہ ہو کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ راہ فرار اختیار کی۔پھر اسی دوران اسے علم ہوا کہ شکست کھا کر بھاگنے میں اس پر کتنی زیادہ گرفت ہے اور واپس لوٹنے میں اس کے لیے کتنا زیادہ ثواب ہے۔چنانچہ وہ واپس لوٹ پڑا۔یہاں تک کہ اسے شہید کر دیا گیا۔تو اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ سے فرماتا ہے میرے اس بندے کی طرف دیکھو کہ یہ میری طرف سے ملنے والے ثواب میں رغبت رکھتے ہوئے اور میری طرف سے ہونے والے عذاب سے ڈرتے ہوئے واپس لوٹ آیا یہاں تک کہ اسے شہید کر دیا گیا(4)۔علامہ بغویؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے، وہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جو حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجیؓ نے کہے ہیں۔

وَفِينَا رَسُوْلُ اللّٰهِ يَتْلُوْ كِتَابَهٗ　　　اِذَا انْشَقَّ مَعْرُوْفٌ مِّنَ الْفَجْرِ سَاطِعُ

اور ہم میں رسول اللہ ﷺ ہیں جو کہ سپیدہ فجر کے طلوع ہونے کے وقت کتاب الٰہی کی تلاوت فرماتے ہیں۔

اَرَانَا الْهُدٰى بَعْدَ الْعَمٰى فَقُلُوْبُنَا　　　بِهٖ مُوْقِنَاتٌ اَنَّ مَا قَالَ وَاقِعُ

آپ ﷺ نے ہمیں اندھے پن کے بعد راہ ہدایت دکھائی۔پس ہمارے دل اس پر یقین رکھتے ہیں کہ جو آپ نے فرمایا وہی حق ہے اور واقع ہو کر رہے گا۔

يَبِيْتُ يُجَافِيْ جَنْبَهٗ عَنْ فِرَاشِهٖ　　　اِذَا اسْتَثْقَلَتْ بِالْكَافِرِيْنَ الْمَضَاجِعُ

آپ ﷺ رات اس طرح بسر کرتے ہیں کہ اپنا پہلو بستر سے دور رکھتے ہیں (یعنی محو عبادت رہتے ہیں) جبکہ کفار کے بستر ان کے بوجھ سے ثقل محسوس کرتے ہیں۔

وہ احادیث جو کہ رات کی نماز کی فضیلت کے بارے مروی ہیں ہم نے سورۂ مزمل کی تفسیر میں ان کا ذکر کیا ہے(5)۔ترمذی نے

1۔جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 75 (وزارت تعلیم)　　2۔صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 368 (قدیمی)
3۔صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 368 (قدیمی)　　4۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 186 (التجاریۃ)
5۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 187 (التجاریۃ)

حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ یہ آیت تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (مغرب کی نماز کے بعد) عشاء کی نماز کا انتظار کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے(1)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہم گروہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ہم مغرب کی نماز پڑھتے تھے اور اپنے گھروں کی طرف نہیں لوٹتے تھے یہاں تک کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز بھی ادا کر لیتے۔ حضرت انسؓ سے ہی یہ روایت بھی ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام میں سے ان لوگوں کے بارے نازل ہوئی جو کہ مغرب کی نماز سے لے کر عشاء کی نماز تک نماز پڑھتے رہتے تھے۔ اسے ابن مردویہ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ اس کی اصل سنن ابی داؤد میں ہے۔ یہی قول ابو حاتم اور محمد بن منکدر کا ہے ان دونوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد نماز اوابین ہے(2)۔ ابن نصر نے محمد بن منکدر سے مرسل روایت نقل کی ہے جس نے وہ نماز پڑھی جو مغرب اور عشاء کے درمیان ہے۔ پس وہ صلوٰۃ الاوابین ہے۔ بزار سے ضعیف سند کے ساتھ حضرت بلالؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم مجلس میں بیٹھا کرتے تھے اور حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام میں سے کچھ لوگ مغرب سے عشاء تک نماز پڑھتے رہتے تھے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ(3)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابو الدرداء، ابوذر اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم سے روایت نقل کی ہے کہ اس آیت میں مقصود وہ لوگ ہیں جو عشاء اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں(4)۔ امام مسلمؒ اور امام احمدؒ نے حضرت عثمانؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی۔ تو گویا اس نے نصف رات قیام کیا اور جس نے صبح کی نماز بھی جماعت کے ساتھ ادا کی، تو گویا اس نے ساری رات نماز کے لیے قیام کیا(5)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر لوگ اذان دینے اور پہلی صف میں کھڑے ہونے کا ثواب جانتے ہوتے پھر وہ قرعہ اندازی کے بغیر اذان دینے اور صف اول میں کھڑے ہونے کی وسعت نہ پاتے تو وہ بالیقین اس کے لیے قرعہ اندازی کرتے۔ اور اگر وہ نماز ظہر میں شریک ہونے کا ثواب جان لیتے تو وہ بالیقین اس کی طرف تیزی سے آتے۔ اور اگر وہ عشاء اور صبح کی نمازوں کا ثواب جان لیتے تو وہ ان کی طرف ضرور آتے اگر چہ سرین کے بل ہی آنا پڑتا(6)۔ اسے شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد ونسائی نے روایت کیا ہے۔ اور ان نعمتوں سے جو ہم نے ان کو دی ہیں خرچ کرتے رہے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد فرض صدقہ (زکوٰۃ) ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد عام وجوہ خیر ہیں۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷﴾

"پس نہیں جانتا کوئی شخص جو (نعمتیں) چھپا کر رکھی گئی ہیں ان کے لیے [1] جن سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی [2] یہ صلہ ہے ان (اعمال حسنہ) کا جو وہ کیا کرتے تھے [3]"

[1] پس کوئی شخص نہیں جانتا، یعنی نہ تو کوئی مقرب فرشتہ جانتا ہے اور نہ ہی نبی مرسل جو (نعمتیں) ان کے لیے چھپا کر رکھی گئی ہیں۔ حمزہ اور یعقوب نے اُخْفِيَ میں یاء کو ساکن پڑھا ہے اس لیے کہ یہ اخفیت کا مضارع ہے۔ اور اس کی تائید حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت نُخْفِيُ بھی کرتی ہے۔ اور باقیوں نے اسے ماضی مجہول ہونے کی بناء پر یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 151 (وزارت تعلیم) | 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 185 (التجاریہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 337 (العلمیہ) | 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 185 (التجاریہ)
5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 232 (قدیمی) | 6۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 182 (قدیمی)

۲؎ جن سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ یہاں مِنْ زائدہ ہے اور قُرَّةِ اَعْیُنٍ حمزہ کی قرأت کے مطابق محل نصب میں ہے۔ اور جمہور کی قرأت کے مطابق محل رفع میں ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو کسی آنکھ نے دیکھی نہیں، کسی کان نے ان کے بارے سنا نہیں اور کسی انسان کے دل میں ان کا خیال تک نہیں آیا۔ اگر تم چاہو تو پڑھو فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ۔ متفق علیہ (1)۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا یہ وہ نعمت ہے جس کی کوئی تفسیر و تشریح بیان نہیں کی گئی۔

۳؎ جَزَآءً مفعول مطلق یا مفعول لہٗ ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی یجزون جزاء یا اخفی للجزاء۔ (انہیں یہ صلہ دیا جائے گا یا صلہ دینے کے لیے اسے مخفی رکھا گیا ہے) علامہ بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ واحدی اور ابن عساکر نے سعید بن جبیر کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ اور ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے درمیان کسی شے کے بارے کچھ جھگڑا ہوا اور باہم گفتگو بھی ہوئی۔ پس ولید نے حضرت علیؓ سے کہا تو خاموش رہ۔ کیونکہ تو ابھی بچہ ہے اور قسم بخدا میں تجھ سے زیادہ زبان دراز ہوں، تجھ سے زیادہ بہادر ہوں اور لشکر میں تجھ سے بڑھ کر پہلوان ہوں۔ تو حضرت علیؓ نے جواباً فرمایا خاموش ہو جا کیونکہ تو فاسق ہے (2)۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسْتَوٗنَ ﴿۱۸﴾

''تو کیا جو شخص ایمان دار ہو وہ اس کی مانند ہو سکتا ہے جو فاسق ہو؟ ۱؎ (نہیں) یہ یکساں نہیں ۲؎''

۱؎ ابن جریر نے عطاء بن یسار سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی مثل روایت نقل کی ہے۔ خطیب نے اپنی تاریخ میں اور ابن عدی نے کلبی کی سند سے ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ خطیب اور ابن عساکر نے ابن لھیعہ عن عمرو بن دینار عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی بن ابی طالبؓ اور عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں کے درمیان کچھ غلط الفاظ کا استعمال ہوا تھا۔ یہ استفہام انکاری ہے اور فاء محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کیا علی المرتضی جو اللہ تعالیٰ کے ولی ہیں اور ولید جو اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے برابر ہو سکتے ہیں۔ اور جو شخص ایمان دار ہو وہ اس کی مانند ہو سکتا ہے جو فاسق ہو؟۔ فاسق سے مراد جو اہل ایمان سے خارج ہوا ایسا نہیں ہو سکتا۔

۲؎ یہ شرف اور ثواب میں یکساں نہیں ہے۔ لَا یَسْتَوٗنَ جمع کا صیغہ اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہاں مراد جنس مومن اور کافر ہے۔ یہ جملہ مساوات کے انکار کے لیے تقریر اور تاکید ہے۔ پہلے استویٰ کا مجمل ذکر فرمایا پھر اس کی تفصیل اس ارشاد سے فرمائی۔

اَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ؗ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

''پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے جنتیں ہمیشہ کا ٹھکانہ ہیں بطور ضیافت ان (نیکیوں) کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے ۱؎''

۱؎ پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے جنتیں ہمیشہ کا ٹھکانہ ہیں کیونکہ وہی حقیقی ٹھکانہ ہے۔ اور دنیا تو ایسا گھر ہے جس سے بالیقین کوچ کرنا ہی ہے۔ اہل ایمان جنتوں کو جائے پناہ بنا رہے ہیں اور کفار اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 704 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 187 (التجاریۃ)

شرک کا ارتکاب کر کے ان میں داخل ہونے سے انکار کر رہے ہیں۔ ''نُزُلًا'' سے مراد وہ شے ہے جو مہمان نوازی کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جنت سے حال ہے اور وہ ظرف کے لیے فاعل ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝

''اور جنہوں نے نافرمانی کی تو ان کا ابدی ٹھکانہ آگ ہے جتنی مرتبہ وہ ارادہ کریں گے کہ (کسی طرح) یہاں سے نکل جائیں (تو ہر بار) انہیں لوٹا دیا جائے گا اس میں اور انہیں کہا جائے گا چکھو آگ کا عذاب جسے تم جھٹلایا کرتے تھے [1]''

[1] اور جنہوں نے کفر کیا تو ان کا ابدی ٹھکانا آگ ہے۔ یعنی انہوں نے جنت میں ٹھکانا بنانے کے بدلے جہنم میں بنالیا۔ اور كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِيْدُوْا فِيْهَا سے مقصود یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ اور وَقِيْلَ لَهُمْ الآیہ کا قول ان کی اہانت و رسوائی اور ان کے غیض وغضب میں اضافہ کرنے کے لیے انہیں کہا جائے گا۔

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

''اور ہم ضرور چکھاتے رہیں گے انہیں تھوڑا تھوڑا عذاب بڑے عذاب سے پہلے تاکہ وہ (فسق وفجور سے) باز آ جائیں [1]''

[1] یہ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ پر معطوف ہے۔ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى سے مراد عذاب دینا ہے۔ ابی بن کعب، ضحاک، حسن اور ابراہیم نے کہا ہے اس سے مراد دنیا کی مصیبتیں اور بیماریاں ہیں (1)۔ والبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت کی ہے۔ عکرمہ کا قول ہے اس سے مراد حدود ہیں۔ اور مقاتل نے کہا ہے اس سے مراد مکہ مکرمہ میں وہ سات برس کی قحط سالی ہے جس میں انہوں نے مردار، ہڈیاں اور کتے تک کھائے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد غزوۂ بدر میں ان کا تلواروں کے ساتھ قتل کیا جانا ہے (2)۔ اور یہی قول قتادہؒ اور سدیؒ کا ہے۔ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ سے مراد عذاب آخرت ہے۔ تاکہ وہ ایمان کی طرف لوٹ آئیں۔ یعنی ان میں سے وہ جو قحط اور میدان بدر میں مرنے سے باقی بچے ہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ۝

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جسے نصیحت کی گئی اس کے رب کی آیتوں سے پھر اس نے روگردانی کی ان سے بے شک ہم مجرموں سے ضرور بدلہ لیں گے [1]''

[1] اور کوئی بھی اس سے زیادہ ظلم کرنے والا نہیں جسے اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی گئی پھر اس نے روگردانی کی۔ اور ان میں غور وتدبر نہ کیا۔ اس میں ثُمَّ اس پر اظہار تعجب کے لیے ہے کہ اس کے باوجود کہ یہ آیات انتہائی واضح ہیں اور دونوں جہاں کی سعادت کی طرف ہدایت اور راہنمائی بھی فرما رہی ہیں لیکن یہ پھر بھی اعراض ہی کرتے جا رہے ہیں۔ بے شک ہم مجرموں سے ضرور بدلہ لیں گے تو پھر اسے کیسے چھوڑ دیں گے جو تمام سے زیادہ ظلم کرنے والا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۝

1. تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 188 (التجاریہ)
2. تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 188 (التجاریہ)

"اور بے شک ہم نے عطا فرمائی تھی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب ۱؎ تو آپ شک میں مبتلا نہ ہوں ایسی کتاب کے ملنے سے ۲؎ اور ہم نے بنایا تھا اسے ہدایت بنی اسرائیل کے لیے ۳؎"

۱؎ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور یہ اپنے معطوف سمیت اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُنْتَقِمُوْنَ اور اِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے آپ کو قرآن عطا فرمایا اسی طرح اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (تورات) عطا فرمائی تھی۔

۲؎ اے محمد! ﷺ آپ ایسی کتاب کے ملنے سے شک میں مبتلا نہ ہوں۔ لِقَآء مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے اور فاعل محذوف ہے، یعنی اگر آپ نے قرآن کریم حاصل کیا ہے تو یہ ایسا نیا امر نہیں جو اس سے پہلے نہ ہوا ہو، یہاں تک کہ آپ اس میں شک کرنے لگیں۔ یا معنی یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی رضامندی اور قبولیت کے ساتھ کتاب حاصل کی تھی آپ کو شک نہیں کرنا چاہئے سدی نے اسی طرح کہا ہے(1)۔ اور طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ فَلَا تَكُنْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ کے بارے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی اپنے رب کے ساتھ ملاقات کے بارے میں شک نہ کرو۔ بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے تم شب معراج موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اپنی ملاقات کے بارے میں شک نہ کرو(2)۔ حضرت ابن عباس وغیرہ نے یہی کہا ہے۔

شیخین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے شب معراج موسیٰ علیہ السلام کو گندمی رنگ، دراز قد اور گھنگھریالے بالوں والا آدمی دیکھا۔ گویا کہ آپ (قبیلہ ازد) شنوأۃ کے لوگوں میں سے ہیں۔ اور میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ متوسط القامت، سرخ وسفید رنگ اور سیدھے بالوں والے آدمی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو آیات ونشانیاں مجھے دکھائیں ان میں میں نے داروغہ جہنم مالک کو بھی دیکھا اور دجال کو بھی۔ پس تو اس ملاقات میں کوئی شک نہ کر۔ فَلَا تَكُنْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ(3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر پر تھے کہ ہمارا گزر ایک وادی کے پاس سے ہوا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ وادی کون سی ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی یہ وادی ازرق ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا گویا کہ میں اب بھی (شب معراج کی مثل) موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں جب کہ اس وقت میں اس وادی سے گزر رہا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے ان کے رنگ اور بالوں کا تذکرہ کیا کہ وہ اپنے کانوں میں انگلیاں رکھ کر بلند آواز سے لبیک کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغاثہ کرتے گزر رہے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا پھر ہم چلتے رہے یہاں تک کہ ایک گھاٹی کے پاس آئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ گھاٹی کونسی ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی یہ ہرشا یا لفت ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا گویا میں یونس علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ سرخ اونٹنی پر سوار ہیں، اونی جبہ زیب تن کیے ہوئے ہیں اور اونٹنی کی مہار پکڑے لبیک کہتے ہوئے اس وادی سے گزر رہے ہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(4)۔ سورۂ بنی اسرائیل میں حدیث معراج کے ضمن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کو چھٹے آسمان پر دیکھا اور نماز کے معاملہ میں ان کی طرف مراجعت فرما ہوئے یعنی بات چیت کی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مجھے رات کے وقت (معراج کے لیے) آسمان کی طرف لے جایا گیا تو میں نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر میں نماز پڑھتے دیکھا۔(5)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 188 (التجاریہ) 2۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 12 صفحہ 160 (الامۃ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 94 (قدیمی) 4۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 95 (قدیمی) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 188 (التجاریہ)

۳؎ وَجَعَلْنٰهُ میں ہٗ ضمیر سے مراد وہ کتاب ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی اور قتادہ نے کہا ہے ہٗ ضمیر مفعول کا مرجع حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں(1)۔ طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے لیے راہبر بنا دیا۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

''اور ہم نے بنایا ان میں سے بعض کو پیشوا، وہ رہبری کرتے رہے ہمارے حکم سے ۱؎ جب تک وہ صابر رہے اور جب تک وہ ہماری آیتوں پر پختہ یقین رکھتے تھے ۲؎ ''

۱؎ اور ہم نے بنی اسرائیل میں سے بعض کو پیشوا بنا دیا جن کی ہر بھلائی میں اقتداء کی جاتی تھی۔ اور ان سے مراد وہ انبیاء علیہم السلام ہیں جو ان میں موجود تھے۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد انبیاء علیہم السلام کے پیروکار اور تبعین ہیں(2)۔ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کی ان احکام کی طرف راہبری کرتے رہے جو اس کتاب میں موجود تھے۔ یا اس توفیق سے جو ہم نے انہیں عطا فرمائی۔

۲؎ حمزہ اور کسائی نے لَمَّا کو لِمَا یعنی لام کو مکسور اور میم کو مخفف پڑھا ہے، یعنی ان کے صبر کے سبب۔ اور باقیوں نے لام کو مفتوح اور میم کو مشدد پڑھا ہے۔ جب تک کہ وہ اپنے دین پر اور مصر میں اپنے دشمنوں سے اذیتیں برداشت کرنے میں صابر رہے۔ لہٰذا اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ (مصائب و آلام پر) صبر کرنے کے سبب لوگوں کی امامت کا منصب عطا ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہماری آیات میں گہری غور و فکر کرنے کے سبب ان پر پختہ یقین رکھتے تھے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾

''بے شک آپ کا پروردگار، وہی فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن، جن امور میں وہ (باہمی) اختلاف کیا کرتے تھے ۱؎ ''

۱؎ بے شک آپ کا پروردگار، وہی فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن امور دین میں جن میں وہ باہمی اختلاف کیا کرتے تھے۔ کہ وہ اہل حق کو اہل باطل سے ممتاز فرما دے گا۔ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ۔ اور اس میں تکلم سے غیبت کی طرف التفات ہے۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾

''کیا یہ چیز ان کی ہدایت کا باعث نہ بنی کتنی قومیں تھیں جن کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیا حالانکہ یہ چل پھر رہے ہیں ان کے مکانوں میں ۱؎ بے شک ان میں (عبرت کی) کئی نشانیاں ہیں۔ کیا وہ ان (در و دیوار سے داستان عبرت) نہیں سن رہے ۲؎ ''

۱؎ ہمزہ برائے استفہام انکاری ہے اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لیے ہے اور اس میں فاعل ضمیر ہے جو کہ رَبَّكَ کی طرف راجع ہے۔ یا فاعل وہ ہے جس پر كَمْ اَهْلَكْنَا دلالت کرتا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے کہ کیا انہوں نے اپنے اسلاف سے عبرت حاصل نہیں کی

اور تیرے رب نے ان کی راہنمائی نہیں فرمائی یا ان کی کثرت ہلاکت نے ان کی راہنمائی نہیں کی۔ ان سے قبل قرون ماضیہ میں کتنی قومیں تھیں جنہیں ہم نے ان کے کفر کے سبب ہلاک کر دیا۔ حالانکہ اہل مکہ اپنے سفروں کے دوران ان ہلاک ہونے والوں کی جگہوں میں چلتے ہیں۔

۲۔ بے شک اس ہلاک کرنے میں عبرت کی کئی نشانیاں ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انہوں نے جس کفر اور معاصی کا ارتکاب کیا وہ قبیح ہے اور اس پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ ہم انتقام لینے پر قادر ہیں۔ اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ میں ہمزہ برائے استفہام انکاری ہے اور فاء محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کیا وہ ہماری آیات سے اعراض کرتے ہیں اور انہیں غور وفکر اور نصیحت حاصل کرنے کے ارادے سے نہیں سنتے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ۗ اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

"کیا انہوں نے ملاحظہ نہیں کیا کہ ہم لے جاتے ہیں پانی بنجر زمین کی طرف ۱؎ پھر ہم نکالتے ہیں اس کے ذریعے سے کھیتی کھاتے ہیں اس سے ان کے چوپائے اور وہ خود بھی ۲؎ کیا وہ (یہ بھی) نہیں دیکھتے ۳؎"

۱؎ ہمزہ برائے انکار ہے اور واؤ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کیا وہ غور وفکر نہیں کرتے اور نہیں جانتے بلکہ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ ہم لے جاتے ہیں پانی بنجر زمین کی طرف۔ الارض الجرز سے مراد ایسی زمین ہے جس سے سبزہ منقطع ہو چکا ہو اور نباتات زائل ہو چکی ہو۔

۲؎ پھر ہم پانی کے ذریعے نکالتے ہیں کھیتی جس سے ان کے چوپائے کھاتے ہیں جیسا کہ بھوسہ اور پتے وغیرہ اور وہ خود بھی مثلاً غلہ اور پھل وغیرہ۔

۳؎ کیا وہ یہ بھی نہیں دیکھتے؟ اس میں ہمزہ برائے استفہام انکاری اور فاء محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کیا وہ اپنی نظریں نہیں گاڑتے اور اسے نہیں دیکھتے جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ وہ اس سے یہ استدلال کر سکیں کہ ہماری قدرت کامل ہے، ہمارا فضل وسیع ہے اور ہم موت کے بعد انہیں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہیں۔ ابن جریر نے حضرت قتادہؓ سے روایت نقل کی ہے اور علامہ بغویؒ نے بھی اسے ذکر کیا ہے کہ صحابہ کرام نے مشرکین سے کہا بے شک ہمارے لیے ایک دن ہے جس میں عنقریب ہم راحت و سکون پائیں گے اور طرح طرح کی نعمتیں حاصل کریں گے اور اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے گا(1)۔ میں کہتا ہوں کہ اس دن سے ان کی مراد وہ قیامت کا دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ کلبی نے کہا ہے اس سے ان کی مراد فتح مکہ کا دن ہے۔ سدی کا قول ہے اس سے مراد یوم بدر ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے خلاف ہماری مدد فرمائے گا اور ہمیں تم پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ تو مشرکین بطور استہزاء کہتے اس فتح کا دن کب آئے گا؟ تو پھر یہ آیت نازل ہوئی۔(2)

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۸﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 189 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 189 (التجاریۃ)

''اور (بار بار) پوچھتے ہیں یہ فیصلہ کب ہوگا؟ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو ۱''

۱ اور کفار مکہ (بار بار) پوچھتے ہیں۔ اس کا عطف اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ کے مضمون پر ہے۔ کیونکہ آیات قدرت کو دیکھنے کی نفی قدرت کا انکار ہے، یعنی کیا قدرت کا انکار کرتے ہیں اور استہزاء کہتے ہیں۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو پھر اس کا معین وقت ہمیں بتاؤ۔

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾

''آپ فرمائیے فیصلہ کے دن نہ فائدہ پہنچائے گا کافروں کو ان کا ایمان لانا ۱ اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی ۲''

۱ اے محمد! ﷺ آپ فرمائیے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور ان کے قول کا جواب ہے۔ اس ارشاد سے فوراً ذہن میں یہی آتا ہے کہ یوم الفتح سے مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ اس دن کا ایمان بالیقین نفع بخش نہیں ہوگا۔ اور جنہوں نے یوم الفتح کو فتح مکہ اور یوم بدر پر محمول کیا ہے۔ انہوں نے اس کا معنی یہ کیا ہے موت کے بعد عذاب دیکھ کر کفار کا ایمان لانا انہیں نفع نہیں دے گا جبکہ وہ کفر پر ہی مرے یا قتل کر دیئے گئے۔

۲ یوم الفتح کے بارے ان کے سوال کے ساتھ اس جواب کی وجہ تطبیق یہ ہے کہ ان کی طرف سے اس سوال میں یوم الفتح کا مطالبہ علی وجہ التکذیب اور استہزاء تھا۔ لہٰذا انہیں جواب بھی ان کے سوال کی غرض اور مقصود کے مطابق دیا گیا۔ پس اس سے مقصود یہ ہے کہ تم اس دن کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو اور نہ ہی استہزاء کرو۔ کیونکہ میں تمہیں اس دن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس کے عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے لیکن تمہارے ایمان نے تمہیں کوئی نفع نہیں دیا۔ اور تم نے عذاب میں داخل ہونے کے لیے کچھ مہلت طلب کی، لیکن تمہیں مہلت بھی نہیں دی گئی۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾

''پس (اے حبیب!) رخ (انور) پھیر لیجئے ان سے ۱ اور انتظار فرمائیے وہ بھی منتظر ہیں ۲''

۱ فاء سببیہ ہے یعنی جب آپ نے ان کے حال اور انجام کو پہچان لیا ہے تو پھر ان سے رخ انور پھیر لیجئے اور ان کے جھٹلانے کی پرواہ تک نہ کیجئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ آیت کا جملہ آیت السیف سے منسوخ ہے۔(1)

۲ میں نے آپ سے جس فتح کا وعدہ کیا ہے اس کا انتظار فرمائیے۔ بے شک وہ بھی آپ کے بارے میں حوادث زمانہ کے منتظر ہیں۔ بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ ان کے بارے میں آپ ہمارے عذاب کا انتظار کیجئے کیونکہ وہ بھی اسی کے منتظر ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن صبح کی نماز میں الٓمّٓ تَنْزِیْلُ اور ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ تلاوت فرماتے تھے(2)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سوتے نہیں تھے یہاں تک کہ آپ الٓمّٓ تَنْزِیْلُ اور تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ پڑھ لیتے(3)۔ اسے احمد، ترمذی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔ خالد بن معدان نے کہا ہے کہ مجھ تک الٓمّٓ تنزیل اور تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ کے بارے میں یہ خبر پہنچی ہے کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 189 (التجاریۃ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 68 (وزارت تعلیم)

ایک آدمی یہی دونوں سورتیں پڑھتا تھا، ان کے سوا کوئی شے نہیں پڑھتا تھا اور وہ بہت زیادہ گنہگار تھا۔ پس ان سورتوں نے اس پر اپنے پر پھیلا لئے اور رب کریم کی بارگاہ میں التجا کی اے پروردگار اسے بخش دے کیونکہ یہ مجھے کثرت سے پڑھتا تھا۔ رب کریم نے اس کے حق میں ان سورتوں کی شفاعت کو قبول فرما لیا ہے اور فرمایا ہے اس کے لیے ہر خطا کے بدلے ایک نیکی لکھ دو اور اس کا ایک درجہ بلند کر دو۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ سورت اپنے پڑھنے والے کی جانب سے قبر میں مجادلہ کرے گی اور عرض کرے گی کہ اگر میں تیری کتاب میں سے ہوں تو پھر اس آدمی کے حق میں میری شفاعت قبول فرما لے۔ اور اگر میں تیری کتاب میں سے نہیں تو مجھے اس سے مٹا دے۔ بے شک یہ سورت پرندے کی مثل اپنے پڑھنے والے پر اپنے پر پھیلا لے گی اور اس کے لیے شفاعت کرے گی اور اسے عذاب قبر سے بچا لے گی۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ قرآن کریم ہر سورت پر ان دونوں کی فضیلت ساٹھ نیکیوں کے برابر ہے۔ اسے دارمی نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی مروی ہے کہ جس کسی نے الٓمّ تنزیل اور تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ پڑھیں اسے اتنا اجر دیا جائے گا گویا اس نے لیلۃ القدر عبادت میں بسر کی(1)۔ اسے ثعلبی اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ ابن مردویہ نے ابن عمر سے بھی اسی طرح نقل کی ہے۔ امام سیوطی نے کہا یہ حدیث موضوع ہے۔ واللہ اعلم

اس سورت کی تفسیر 24 رجب 1206ھ بروز پیر اختتام پذیر ہوئی۔

اس سورت کا ترجمہ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے 14 فروری 2000ء بروز پیر ساڑھے نو بجے شب اپنے اختتام کو پہنچا۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7 صفحہ 455 (العلمیۃ)

سورۃ الاحزاب

ایاتھا ۷۳ سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ مَدَنِيَّةٌ ۹۰ رکوعاتھا ۹

سورۃ احزاب مدنی ہے اس کی تہتر آیتیں اور نو رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ

"(اے نبی مکرم!) (حسب سابق) ڈرتے رہیے اللہ تعالیٰ سے [1] اور نہ کہنا مانئے کفار اور منافقین کا۔ بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا، بڑا دانا ہے [2]"

[1] حضرت ابی بن کعبؓ نے حضرت ذرؓ سے کہا تم سورۃ الاحزاب کی کتنی آیتیں شمار کرتے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ تہتر آیات۔ حضرت ابی نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس کی قسم ابی کھایا کرتا ہے۔ سورۂ احزاب سورۂ بقرہ کے مساوی تھی یا اس سے بھی طویل تھی۔ اور ہم نے اس میں یہ آیت رجم بھی پڑھی ہے " اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ "(1)۔ جویبر نے ضحاک کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اہل مکہ نے جن میں ولید بن مغیرہ، شیبہ بن ربیعہ بھی تھے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ پیشکش کی کہ آپ اپنے قول سے رجوع کرلیں تو ہم اپنے مال کا ایک حصہ آپ کو دیں گے اور مدینہ طیبہ کے منافقین اور یہودیوں نے آپ کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی کہ اگر آپ نے اپنے قول سے رجوع نہ کیا تو وہ آپ کو قتل کر دیں گے (2)۔ تو اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا اے نبی!۔ یا محمد (ﷺ) نہیں فرمایا۔ اور اس کے ساتھ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تو اس سے مقصود تقویٰ کی عظمت و نشان کو بیان کرنا ہے (کہ یہ نبی کے لیے بھی ضروری امر ہے)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوسفیان بن حرب، عکرمہ بن ابی جہل اور ابو الاعور بن عمرو بن سفیان سلمی کے بارے نازل ہوئی۔ اس طرح کہ وہ غزوۂ احد کے بعد مدینہ طیبہ میں آئے اور رأس المنافقین عبداللہ بن ابی کے پاس آکر ٹھہرے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں اپنے ساتھ گفتگو کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ پس ان کے ساتھ عبداللہ بن ابی سعد اور طعمہ بن ابیرق حاضر خدمت ہوئے اور حضور نبی کریم ﷺ سے یہ کہا کہ آپ ہمارے معبودوں لات، عزیٰ اور منات کا ذکر چھوڑ دیں اور ساتھ یہ کہیں کہ جوان کی عبادت کرے گا۔ یہ اس کی شفاعت کریں گے تو ہم آپ کا اور آپ کے رب کا ذکر (غلط انداز میں کرنا) چھوڑ دیں گے۔ پس آپ ﷺ پر ان کی یہ بات انتہائی شاق گزری۔ حضرت عمر فاروق اعظمؓ اس وقت آپ ﷺ کے پاس موجود تھے

1۔ الدرالمنثور، جلد 5 صفحہ 345 (العلمیہ)
2۔ الدرالمنثور، جلد 5 صفحہ 347 (العلمیہ)

چنانچہ آپ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ آپ مجھے اجازت فرمائیں میں انہیں قتل کر دوں۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا میں نے انہیں امان دے رکھی ہے۔ آپ ﷺ نے انہیں فرمایا تم یہاں سے نکل جاؤ، تم پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور غضب ہو۔ پس آپ ﷺ نے انہیں مدینہ طیبہ سے نکال دینے کا حکم ارشاد فرمایا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب آپ ﷺ کو ہے اور اس سے مراد امت ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے اس کا معنی ہے تقویٰ اختیار کیجیے اور اس عہد کو نہ توڑیئے جو تمہارے اور ان کے درمیان قائم ہے(2)۔ یہ قول بھی ہے کہ خطاب آپ ﷺ کو ہے اور تقویٰ کا حکم اس پر اثبات اور دوام اختیار کرنے کے لیے ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ نے مابعد قول کے ساتھ جس عمل سے منع فرمایا ہے آپ اس سے رکے رہیں۔

؎ اور آپ اہل مکہ میں سے کفار کا کہنا نہ مانیے یعنی ابوسفیان، عکرمہ اور ابوالاعور وغیرہ کا۔ اور اہل مدینہ کے منافقین کا مثلاً عبداللہ بن ابی، عبداللہ بن سعد اور طعمہ بن ابیرق وغیرہ۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق اور اس کی مصالح اور مفاسد کو خوب جاننے والا ہے وہ کوئی حکم حکمت کے بغیر نہیں دیتا۔

وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ﴿۲﴾

''اور پیروی کرتے رہیے جو وحی کیا جاتا ہے آپ کی طرف اپنے رب کی جانب سے یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے رہتے ہو اس سے اچھی طرح واقف ہے؎''

؎ یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے توحید اور اخلاص پر قائم رہیے۔ یہ جملہ تقویٰ اختیار کرنے اور کفار کی پیروی نہ کرنے کی تاکید کے لیے ہے۔ ابوعمرو نے تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا کی بجائے یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا پڑھا ہے۔ اور ضمیر جمع کفار اور منافقین کی طرف راجع ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے مکر اور تدبیروں سے باخبر ہے وہ انہیں ان کا بدلہ دے گا۔ اور باقیوں نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کو ہے۔ تقویٰ کا حکم اگرچہ صیغہ واحد کے ساتھ فرمایا ہے لیکن اس سے مراد آپ ﷺ کی امت ہے۔ اس بناء پر یہ جملہ تقویٰ کے امر کی پیروی کرنے کے لیے تاکید ہے کیونکہ اس میں جزاء کی امید اور سزا سے خوفزدہ رہنے کا اشارہ ہے۔

وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۳﴾

''اور (اے محبوب) بھروسہ رکھیے اللہ پر، اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کا) کارساز؎''

؎ اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیے کیونکہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے ہی سپرد ہیں۔ یہی حکم توکل کا تتمہ ہے۔ زجاج نے کہ ہے اس کا عطف تَوَكَّلْ پر ہے الفاظ کے اعتبار سے یہ جملہ خبریہ ہے اور یہ امر کے معنی میں ہے۔ یعنی آپ بطور کارساز صرف اللہ تعالیٰ پر اکتفا کیجیے۔ یہ نسبت سے تمیز ہے۔ یعنی آپ فقط اللہ تعالیٰ کی وکالت پر اکتفا کیجیے (وہی کارساز کافی ہے) اور صیغہ امر میں توکل اور اکتفاء امر کی تعلیل کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ کے کمال علم، کمال قدرت اور رحمت کے سبب تمام امور اسی کے سپرد ہیں اس لیے کسی غیر کے سپرد کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ پس ایسی حالت میں اپنے امور کو اللہ کے سوا کسی اور کے سپرد کرنا بیوقوفی اور احمقانہ پن ہے۔ واللہ اعلم۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 189 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 189 (التجاریہ)

وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ ۝

”نہیں بنائے اللہ تعالیٰ نے ایک آدمی کے لیے دو دل اس کے شکم میں [1] اور نہیں بنایا اس نے تمہاری بیویوں کو [2] جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری مائیں [3] اور نہیں بنایا اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے فرزند یہ صرف تمہارے منہ کی باتیں ہیں [4] اور اللہ تعالیٰ تو سچی بات کہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے سیدھی راہ پر چلنے کی [5]“

[1] اس میں مِنْ زائدہ ہے اور قَلْبَیْنِ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ جَعَلَ کا مفعول اول ہے اور اس کا مفعول ثانی لِرَجُلٍ ہے۔ اور فِیْ جَوْفِہٖ ظرف لغو ہے یا قَلْبَیْنِ کی صفت ہے۔ جاننا چاہیے دل روح حیوانی کا مخزن اور تمام قوتوں کا منبع ہے۔ اس لیے ایک آدمی کے شکم میں متعدد دلوں کا ہونا ممنوع ہے۔ کیونکہ اگر ایک آدمی کے دو دل ہوں۔ تو وہ ان دو میں سے ہر ایک سے افعال قلوب میں سے ایک ہی عمل کرے گا تو اس صورت میں دوسرا دل فضلہ (زائد) ہوگا جس کی کوئی حاجت نہیں۔ یا پھر ان دو میں سے ہر ایک سے ایک دوسرے کے مخالف کام لے گا تو ایسی صورت میں دل کے اعمال میں تناقض واقع ہو جائے گا۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے اور اسی طرح ابن ابی حاتم نے سدی سے اور ابن نجیح نے مجاہد سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابومعمر جمیل بن معمر الفہری کے بارے نازل ہوئی۔ یہ آدمی انتہائی عقلمند اور ایسی قوۃ حفظ کا مالک تھا کہ جو سنتا اسے ازبر کر لیتا۔ تو قریش نے اس کے بارے کہا کہ ابومعمر کی اس قوۃ کا سبب فقط یہ ہے کہ اس کے دل دو ہیں۔ اور وہ خود بھی کہا کرتا تھا کہ میرے دو دل ہیں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اس سے بہتر اور زیادہ سمجھ بوجھ رکھتا ہوں جتنی محمد (ﷺ) رکھتے ہیں۔ پس جب میدان بدر میں قریش مکہ کو شکست کا سامنا ہوا، اور ان میں ابومعمر بھی شکست خوردہ ہو کر بھاگ نکلا۔ اس حال میں کہ ایک جوتا پاؤں میں تھا اور ایک ہاتھ میں۔ اسی دوران ابوسفیان اس سے ملا۔ تو اس نے پوچھا اے ابومعمر! لوگوں کا کیا حال ہے۔ تو اس نے جواب دیا شکست سے دوچار ہوئے ہیں۔ پھر اس نے کہا تیری یہ کیا حالت ہے کہ ایک جوتا تیرے پاؤں میں ہے اور دوسرا تیرے ہاتھ میں؟ تو ابومعمر نے کہا میں نے تو یہی محسوس کیا ہے کہ دونوں میرے پاؤں میں ہیں۔ پس اس دن قریش نے یہ جان لیا کہ اگر اس کے دو دل ہوتے تو یہ اپنے ہاتھ میں جوتا نہ بھولتا۔(1)

ابن ابی حاتم نے خصیف کی سند سے سعید بن جبیر، مجاہد اور عکرمہ سے یہ نقل کیا ہے کہ ایک آدمی تھا جسے دو دلوں والا کہا جاتا ہے(2) تو اس کے بارے یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور قتادہ کی سند سے حسن سے اسی کی مثل۔ روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ زائد بھی ہے کہ وہ کہا کرتے ہے میرا ایک دل مجھے کام کرنے کا حکم دیتا ہے اور ایک دل منع کرتا ہے۔ ترمذیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ قیام فرما تھے کہ آپ کے دل میں کچھ خطرہ سا لاحق ہوا۔ تو وہ منافقین جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے انہوں نے کہا کیا آپ نہیں دیکھ رہے، اس کے دو دل ہیں ایک دل تمہارے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے ساتھیوں کے ساتھ۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(3) اور زہری اور مقاتل نے کہا ہے یہ فقط ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی بیوی کے ساتھ ظہار کرنے والے اور کسی غیر کے بیٹے کو اپنا بیٹا (متبنّیٰ) بنانے والے کے لیے بیان فرمائی ہے۔ یعنی جس طرح ایک آدمی کے دو دل نہیں ہوتے کہ ان کا اجتماع ممتنع ہے اسی طرح یہ بھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 190 (التجاریۃ)
2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 347 (العلمیۃ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 151 (وزارت تعلیم)

نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی عورت مظاہر کی بیوی بھی ہو اور ماں بھی، کیوں کہ ان دونوں نسبتوں کا اجتماع ممتنع ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی بچہ اس کا بیٹا بھی ہو اور غیر کا بھی۔ کیونکہ یہ نسبتیں بھی جمع نہیں ہو سکتیں۔(1)

۲؎ قالون اور قنبل نے سورۂ مجادلہ، سورۂ طلاق اور یہاں الّٰٓـِٔی ہمزہ کے ساتھ بغیر یاء کے پڑھا ہے۔ اور ورش نے یاء کے ساتھ ہمزہ کے پیچھے کسرہ کو ذرا کھینچ کر پڑھا ہے۔ اور وقف کی صورت میں یاء کو ساکن کر دیا ہے۔ بزی اور ابو عمرو نے دونوں حالتوں میں ہمزہ کے بدلے یاء ساکن کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں ہمزہ کے بعد یاء پڑھی ہے۔ اور حمزہ نے وقف کی صورت میں ہمزہ کو اپنے اصل پر رکھتے ہوئے بین بین پڑھا ہے۔ جن قراء نے ہمزہ پڑھا اور جنہوں نے نہیں پڑھا ہر دو گروہوں نے دونوں حالتوں میں الف اشباع کا ذکر کیا ہے۔ مگر ورش نے اس میں مد اور قصر دونوں جائز قرار دیئے ہیں۔

۳؎ عاصم نے تُظٰهِرُوْنَ کو باب مفاعلہ سے تاء کے ضمہ، ظاء کی تخفیف اس کے بعد الف اور ھاء کو مکسور پڑھا ہے۔ جبکہ حمزہ اور کسائی نے باب تفاعل سے تاء اور ھاء کو مفتوح اور الف کو مخفف پڑھا ہے۔ اور ابتدا میں دو تاء میں سے ایک کو حذف کر دیا ہے۔ اور ابن عامر نے تاء اور ھاء کو مفتوح، ظاء کو مشدد اور الف کے ساتھ باب تفاعل ہی سے پڑھا ہے۔ لیکن تاء کو ظاء سے بدل کر پھر ظاء کو ساکن کر کے دونوں ظاء کو آپس میں ادغام کیا ہے۔ اور باقیوں نے باب تفعل سے تاء اور ظاء کو مفتوح اور ظاء کو مشدد پڑھا ہے۔ اس صورت میں بھی مذکورہ طریقے کے مطابق تاء کو ظاء میں ادغام کیا گیا ہے۔ اور پھر تظاہر کو مِنْ کے ساتھ اس لیے متعدی کیا گیا ہے کیونکہ تجنب کے معنی کو متضمن ہے۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت میں ظہار سے طلاق مراد ہوتی تھی۔ لیکن شریعت اسلامیہ میں اس سے مراد ایسی حرمت لی گئی ہے جو کفارہ ادا کرنے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے (یعنی مظاہر کے لیے کفارہ ادا کرنا لازم اور ضروری ہوتا ہے جب تک ادا نہیں کرتا وہ اپنی بیوی سے قربت اختیار نہیں کر سکتا) اور ظہار کی صورت یہ ہے کہ ظہار کرنے والا آدمی اپنی زوجہ سے یہ کہتا ہے اَنْتِ عَلَیَّ كَظَهْرِ اُمِّیْ (تو مجھ پر ماں کی پیٹھ کی مثل ہے)۔ ہم نے ظہار کے تفصیلی مسائل سورۂ مجادلہ میں ذکر کیے ہیں۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ ظہار میں ظہر (پیٹھ) کا ذکر بطن (پیٹ) سے کنایہ ہے جس کے لیے پیٹھ سہارا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا ذکر فرج کے ذکر کے قریب قریب ہوتا ہے۔ یا پھر ظہر کا ذکر خدمت میں شدت پیدا کرنے کے لیے ہے کیونکہ وہ عورت کے ساتھ اس حال میں قربت اختیار کرنے (جماع) کو حرام تصور کرتے تھے کہ اس کی پشت آسمان کی طرف ہو۔(2)

۴؎ اور اَدْعِيَآء خلاف قیاس دعی کی جمع ہے۔ قیاس کے مطابق دعویٰ ہونی چاہیے تھی جیسا کہ جرحیٰ جریح کی جمع ہے۔ کیونکہ یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔ چونکہ اسے فعیل بمعنی فاعل کے مشابہ قرار دیا گیا ہے اس لیے اس کی جمع اس کے مطابق ذکر کی گئی ہے۔ جیسا کہ تقی کی جمع اتقیاء، نجی کی جمع انجیاء اور شقی کی جمع اشقیاء آتی ہے۔ کسی کو منہ بولا بیٹا بنانے سے حقیقی بیٹے کے احکام میں سے کوئی شے ثابت نہیں ہوتی مثلاً وراثت، حرمت نکاح اور دیگر مسائل۔ اس آیت طیبہ میں اہل عرب کی ان باتوں کا رد ہے جو وہ اس وقت کیا کرتے تھے مثلاً عقلمند اور اعلیٰ قوت حفظ رکھنے والے کے دو دل ہوتے ہیں، ظہار کرنے والے کی زوجہ اس سے جدا ہو جاتی ہے اور اس پر ماں کی مثل ہمیشہ حرام ہو جاتی ہے۔ اور کسی آدمی کا منہ بولا بیٹا اس کا فرزند ہوتا ہے اور حقیقی بیٹے کی طرح اس کا وارث بنتا ہے۔ اور متبنی کے ساتھ بھی وہ تمام رشتے حرام ہوتے ہیں جو نسبی بیٹے کے ساتھ حرام ہوتے ہیں۔ بتحقیق حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ بن شرحبیل الکلبی کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 190 (التجارية)

2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7 صفحہ 62-461 (العلمیۃ)

وحی سے قبل آزاد فرمایا اور انہیں منہ بولا بیٹا بنالیا۔ اور حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور ان کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا۔ پھر جب حضرت زیدؓ نے اپنی زوجہ حضرت زینب بنت جحش کو طلاق دے دی اور رسول اللہ ﷺ نے ان سے شادی کر لی۔ تو منافقین یہ کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) نے اپنے بیٹے کی بیوی سے شادی کر لی ہے حالانکہ آپ اس سے منع فرماتے ہیں (1)۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ جو کچھ بھی ذکر کیا گیا ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ یہ صرف تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔ یعنی امر واقعہ میں ان کی کوئی حقیقت نہیں جیسا کہ ہذیان کے قول کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

ﮤ اور اللہ تعالیٰ تو سچی بات کہتا ہے، یعنی امر واقعہ میں اس کی حقیقت ہوتی ہے جو اس کے قول سے مطابقت رکھتی ہے۔ اور وہ راہ حق کی طرف راہنمائی فرماتا ہے۔ دارمی نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سہلہ بنت سہل بن عمرو حاضر ہوئی (وہ ابوحذیفہ بن عتبہ ابن ربیعہ کی بیوی تھی۔) اور عرض کی کہ ابوحذیفہ کا آزاد کیا ہوا غلام سالم ہمارے گھر آتا ہے درآنحالیکہ میں ایک کپڑا پہنے ہوتی ہوں (یا معنی یہ ہے کہ میں اپنے کام کاج کے کپڑے پہنے ہوتی ہوں) اور ہم اسے بیٹا ہی خیال کرتے ہیں اور ابوحذیفہ نے اسے اپنا منہ بولا بیٹا بنایا ہوا ہے جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے زید کو متبنیٰ بنایا ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ مَوَالِیْكُمْ ؕ وَ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ فِیْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۝

”بلایا کرو انہیں ان کے باپوں کی نسبت سے۔ یہ زیادہ قرین انصاف ہے اللہ کے نزدیک [1]۔ اگر تمہیں علم نہ ہو ان کے باپوں کا تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور دوست ہیں [2]۔ نہیں ہے تم پر کوئی گرفت جو تم نادانستہ کر بیٹھو۔ البتہ وہ کام جو تمہارے دل قصداً کرتے ہیں (ان پر ضرور گرفت ہوگی) [3] اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے [4]۔“

[1] یعنی تم ان کی نسبت ان کے ان باپوں کی طرف کرو جن کے نطفے سے یہ پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے اقوال حقہ سے یہی افراد مراد ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے حقیقی باپوں کی نسبت سے پکارنا اللہ کے نزدیک زیادہ قرین انصاف ہے۔ یہ قول اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ کی علت ہے۔ اَقْسَطُ صیغہ اسم تفضیل ہے۔ اس سے مراد مطلق زیادتی ہے اور یہ قسط بمعنی عدل سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی ہے صدق (سچائی) میں اپنی انتہاء کو پہنچنے والی (یعنی بہت زیادہ سچی بات) امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم زید بن حارثہ کو زید بن محمد ﷺ ہی کہا کرتے تھے یہاں تک کہ قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ (2)۔

[2] اگر تمہیں ان کے باپوں کا علم نہ ہو کہ تم ان کی نسبت کر سکو تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں۔ پس تم یہ کہو یہ میرا دینی بھائی ہے اور میرا دوست ہے۔

[3] اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس میں کہ تم نے نہی سے پہلے متبنیٰ کی نسبت سے نادانستہ بیٹا بنانے والے کی طرف کی یا نہی کے بعد بھول

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 91-190 (التجاریۃ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 705 (وزارت تعلیم)

کر یا سبقت لسانی کے سبب ایسا کیا۔لیکن اس میں گناہ ہے جو تمہارے دل قصداً کرتے ہیں۔ یا مفہوم عبارت اس طرح ہے البتہ وہ کام جو تمہارے دل قصداً کرتے ہیں ان میں ضرور گناہ ہوگا۔ حضرت سعید بن ابی وقاص اور ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے باپ کے سوا کسی غیر کی طرف اپنی نسبت کی دارآنحالیکہ وہ اپنے باپ کو جانتا ہو، تو اس پر جنت حرام ہے(1)۔ اسے شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد، ابوداؤد، اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے باپ کے سوا کسی غیر کی طرف اپنی نسبت کی یا کسی آزاد ہونے والے غلام نے آزاد کرنے والے آقا کے سوا کسی اور کی طرف اپنا آقا ہونے کی نسبت کی تو اس پر قیامت کے دن تک مسلسل اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو(2)۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اور امام سیوطی نے کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔

ہے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے وہ خطا کرنے والے کو معاف فرما دیتا ہے۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے جاننا چاہیے کہ ہمارے نزدیک متبنی کا کوئی اعتبار نہیں۔ (یہ موقف حضرت امام شافعی کا ہے) اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک کسی غلام کو متبنی بنانے سے اس کی آزادی ثابت ہو جاتی ہے اور اگر کسی مجہول النسب کو متبنی بنایا گیا، تو اگر اس کا الحاق بیٹا بنانے والے سے ممکن ہوا تو پھر اس کا نسب اس سے ثابت ہو جائے گا(3)۔ لیکن یہ علامہ بیضاویؒ سے سہو ہوئی ہے۔ کیونکہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک کوئی غلام اس قول سے آزاد نہیں ہوتا کہ تبنیتک اور جعلتک ابنی (میں نے تجھے متبنی بنالیا اور میں نے تجھے اپنا بیٹا بنالیا) اور نہ ہی یہی قول کسی مجہول النسب کے لیے کہنے سے اس کا نسب ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ آپ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر آقا نے اپنے غلام کے بارے یہ دعویٰ کیا یہ میرا بیٹا ہے تو اس سے وہ آزاد ہو جائیگا، چاہے اس کی مثل بچہ اس کی مثل سے پیدا ہوسکتا ہو یا ایسا نہ ہو۔ اور آقا کے کلام کے صحیح ہونے کے لیے غلام کے حق میں اسے مجازی معنی پر محمول کیا جائے گا۔ گویا کہ اس نے یہ کہا ہے کہ یہ آزاد ہے۔ یعنی سبب کا اطلاق مسبب پر کیا ہے۔ کیونکہ بیٹا ہونا آزادی کے لیے سبب ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو کسی بھی ذی رحم محرم کا مالک بنے گا تو وہ اس کی طرف سے آزاد ہو جائے گا(4)۔ اسے امام احمد اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔

صاحبین نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ سے اس صورت میں اختلاف کیا ہے کہ جب آقا نے ایسے غلام کو ھذا ابنی (یہ میرا بیٹا ہے) کہا جو عمر میں اس سے بڑا ہو تو اس صورت میں صاحبین کا موقف یہ ہے کہ وہ آزاد نہیں ہوگا۔ اس اختلاف کی بنیاد ایک اور اصول میں اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ امام صاحب کے نزدیک مجاز حقیقت کا خلیفہ ہے فقط تکلم اور گفتگو میں، حکم میں نہیں۔ لہٰذا جب کلام فی الحقیقت صحیح ہو تو آپ کے نزدیک مجازاً بھی صحیح ہوگی۔ اس لیے اگر چہ غلام عمر میں بڑا ہی ہو جب آقا نے اپنی طرف اس کے بیٹا ہونے کی نسبت کر دی تو وہ آزاد ہو جائے گا۔ جب کہ صاحبین کے نزدیک مجاز حکم میں حقیقت کا خلیفہ ہے۔ لہٰذا جب حقیقتاً اس حکم کا اثبات ممکن نہ ہو تو مجازاً بھی اس کا اثبات صحیح نہیں ہوگا۔ نتیجۃً مذکورہ صورت میں وہ غلام آزاد نہیں ہوگا (کیونکہ حقیقۃً بیٹے کا باپ سے بڑا ہونا ممکن نہیں) اور وہ آدمی جس نے کسی مجہول النسب کو کہا یہ میرا بیٹا ہے اور وہ اس حیثیت میں ہے کہ اس سے نسب کا ثبوت ممکن ہے۔ تو پھر اس سے نسب ثابت ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کے بیٹا ہونے کے بارے وہ خود اقرار کر رہا ہے اور نسب کا التزام خالص اس کا ذاتی حق ہے۔ اسی لیے اگر کسی نے مجہول النسب کے بارے یہ اقرار کیا کہ یہ میرا بھائی ہے تو اس کے باپ سے ثابت نہیں ہوگا مگر جب کسی غیر کے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 619 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع الاحادیث والسنن، جلد 5 صفحہ 491 (الفکر)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7 صفحہ 463 (العلمیہ) 4۔ مشکاۃ المصابیح، جلد 2 صفحہ 274 (الفکر)

بارے نسب کا اقرار کرنے والا فوت ہوگیا۔ درآنحالیکہ آخری وقت تک اپنے اقرار پر اصرار کرتا رہا۔ اور اس کے سوا اس کا کوئی دوسرا وارث بھی نہ ہو، تو پھر مزاحم نہ ہونے کی وجہ سے وہی اس کا وارث ہوگا جس کے بارے وہ اقرار کرتا رہا۔ اور ہمارے نزدیک اس کا حق بیت المال کی نسبت مقدم اور ارجح ہے۔ لیکن اصلی ورثاء میں سے کسی پر اس کا حق مقدم نہیں ہوگا اگرچہ وہ ذوی الارحام (اصحاب فرائض) میں سے ہی ہوں۔ اور نہ ہی مرنے والے نے اپنے تمام مال کے کسی کے لیے وصیت کی ہو۔ واللہ اعلم۔

علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ یہ روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ لوگوں کو جہاد کے لیے دعوت دیتے تھے تو بعض لوگ کہتے ہم جہاد پر ضرور جاتے ہیں تاہم اپنے والدین سے اجازت طلب کرلیں (1)۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝

''نبی (کریم) مومنوں کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں [1] اور آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں [2] اور قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ کتاب اللہ کی رو سے عام مومنوں اور مہاجرین سے [3] مگر یہ کہ تم کرنا چاہو اپنے دوستوں سے کوئی بھلائی (تو اس کی اجازت ہے) [4] یہ (حکم) کتاب (الٰہی) میں لکھا ہوا ہے [5]''

[1] یعنی مومنین میں سے بعض کو بعض سے جو قرب حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ قرب حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس سے ہے بلکہ آپ تو ان کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ کو ان پر حکم نافذ کرنے کا زیادہ اختیار ہے اور ان پر آپ ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری واجب ہے۔ لہٰذا ان کے لیے حضور نبی ﷺ کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے اپنے والدین کی نافرمانبرداری قطعاً جائز نہیں۔ اس لیے آپ ﷺ یہ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ انہیں جہاد پر برانگیختہ کریں اور راہ خدا میں اپنی جان تک خرچ کرنے کی ترغیب دلائیں۔

حضرت ابن عباسؓ اور عطاؒ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے۔ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم انہیں ایک شے کی طرف دعوت دیں اور ان کے اپنے نفس انہیں دوسری شے کی طرف بلائیں۔ تو ان کے لیے اپنے نفسوں کی اطاعت بجائے نبی کریم ﷺ کی فرمانبرداری کرنا اولیٰ اور ضروری ہے (2)۔ کیونکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے مطلع فرمانے کے سبب ان کے منافع اور مفاسد کا علم رکھتے ہیں لہٰذا آپ ﷺ بالیقین انہیں وہی حکم ارشاد فرماتے ہیں اور ان کے لیے وہ کام پسند فرماتے ہیں جس میں ان کے لیے فوائد اور کامیابی ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ جب کہ اس کے برعکس ان کا نفس برائی کا ہی حکم دیتا ہے سوائے ان کے جن پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اور وہ انتہائی زیادتی کرنے والا اور نادان ہے۔ اس لیے ان پر یہ ضروری ہے کہ ان کے نزدیک اپنے نفسوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کا رسول زیادہ محبوب ہو، ان پر اس کا حکم نفس کے حکم کے مقابلہ میں زیادہ نافذ ہو اور رسول اللہ ﷺ کی شفقت نفس کی اپنی ذات پر شفقت کی نسبت کہیں وافر اور زیادہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی ایک مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اس کے نزدیک میری ذات اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں کی نسبت زیادہ محبوب ہو جائے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 191 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 191 (التجاریہ)

متفق علیہ۔ یہ حدیث حضرت انسؓ سے مروی ہے۔(1)

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی بھی مومن نہیں مگر میں دنیا اور آخرت میں اس کے زیادہ قریب ہوں۔ اگر تم تصدیق چاہو تو یہ پڑھو اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ۔ پس جو مومن بھی اس حال میں فوت ہوا کہ اس نے کچھ مال چھوڑا تو اس کے جو عصبات ہوں گے وہی اس کے وارث ہوں گے اور جس کسی نے قرض یا کوئی مال بھی نہ چھوڑا (یعنی اپنے بیوی بچوں کو مفلس اور نادار چھوڑا)۔ پس اسے چاہیے کہ وہ میری طرف آئے، میں اس کا آقا و مولیٰ ہوں۔ رواہ البخاری۔(2)

۲؎ اور آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں اس اعتبار سے کہ ان کی طرف دیکھنا اور ان سے خلوت و تنہائی میں بیٹھنا صحیح ہے۔ بلکہ ان کے حق میں یہ عمل ایسے ہی حرام ہے جیسے اجنبیہ عورتوں کے حق میں حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (اور جب تم نے ان سے کوئی سامان مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو) اور امہات المومنین کی بیٹیوں کو مومنین کی بہنیں اور ان کے بھائیوں اور بہنوں کو اہل ایمان کے ماموں اور خالائیں نہیں کہا جائے گا۔ حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ حضرت زبیرؓ نے حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے شادی کی۔ اور یہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بہن تھیں لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ آپ مؤمنین کی خالہ ہیں(3)۔ میں کہتا ہوں کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنی صاحزادیوں کی شادی حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے کی (لہٰذا اگر یہ مؤمنین کی بہنیں ہوتی تو ان کا نکاح کسی سے نہ ہو سکتا)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ شعبیؒ نے مسروق سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک عورت نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کو یا امہ (اے اماں) کہہ کر پکارا، تو آپ نے فرمایا میں تیری ماں نہیں ہوں۔ میں تو تمہارے مردوں کی ماں ہوں۔ امام بیہقی نے بھی اسی طرح اپنی سنن میں اسے نقل کیا ہے۔ پس اس سے ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں حرمت نکاح کا ارادہ فرمایا ہے(4)۔ اور ابی بن کعبؓ کی قرأت میں ہے وَاَزْوَاجُہٗٓ اُمَّھٰتُھُمْ وَھُوَ اَبٌ لَّھُمْ۔ یعنی دینی اعتبار سے آپ کی بیویاں اہل ایمان کی مائیں ہیں اور آپ ان کے باپ ہیں۔ کیونکہ ہر نبی اس اعتبار سے اپنی امت کا باپ ہوتا ہے کہ وہ اس دین کی اصل اور بنیاد ہوتا ہے جس کے ساتھ ان کی ابدی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ اسی لیے تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں۔

۳؎ اور قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں کتاب اللہ کی رو سے۔ یہاں کتاب اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا حکم (فیصلہ) ہے یا لوح محفوظ ہے یا قرآن کریم کی یہ آیت ہے یا پھر آیت میراث ہے۔ یعنی رشتہ دار ایک دوسرے کا وارث بننے کے زیادہ مستحق ہیں۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مومن بھی فوت ہوا اور اس نے کچھ چھوڑا تو چاہیے کہ اس کا عصبہ وارث بنے(5) وہ جو بھی ہوں۔ اولی کا صلہ ہے۔ اور من تفصیلیہ ہے یہ آیت ابتدائے اسلام کے اس حکم کے لیے ناسخ ہے جس میں ایک دوسرے وارث بننے کی علت ہجرت اور دینی موالات تھی (یعنی مہاجرین ایک دوسرے کے وارث بنتے تھے اسی طرح دینی اخوت رکھنے والے (مہاجرین و انصار) آپس میں ایک دوسرے کے وارث بنتے تھے)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت قتادہؓ نے کہا ہے کہ مسلمان ہجرت کے سبب ایک دوسرے کے وارث بنا کرتے تھے۔ اور کلبی نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے درمیان مؤاخات قائم فرمائی۔ آپ ﷺ جن دو آدمیوں کے درمیان مؤاخات قائم کرتے تھے جب ان میں سے کوئی مر جاتا تو دوسرا عصبہ ہونے کی بناء پر اس کا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 7 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 323 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 192 (التجاریۃ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 192 (التجاریۃ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 192 (التجاریۃ)

وارث بنتا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ (1)۔ یہ آیت اپنی عمومیت کے اعتبار سے اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کے خلاف ہماری دلیل ہے کہ ایسا آدمی جس کے مرنے کے بعد ورثاء میں نہ ذوی الفروض ہوں اور نہ عصبات، تو اس کے وارث اولوا الارحام ہوں گے۔ جبکہ ان کے نزدیک فقط اولوا الارحام کسی صورت میں بھی وارث نہیں بن سکتے۔ اور اگر مرنے والا ایسا آدمی ہو جس کے ورثاء میں عصبات، ذوی الفروض اور اولوا الارحام میں سے کوئی بھی نہ ہو تو اس کا ترکہ بیت المال کے حوالے کر دیا جائے گا۔

؎ مگر تم مؤمنین اور مہاجرین میں سے اپنے دوستوں سے کوئی بھلائی کرنا چاہو۔ یہاں معروف سے مراد وصیت ہے۔ پس دوستوں میں سے جس کے لیے وصیت کی گئی وہ ان ورثاء کی نسبت زیادہ حق رکھتا ہے۔ یہ عام خص عنہ البعض ہے۔ اور سنت اور اجماع سے یہ ثابت ہے کہ وہ مال کے تیسرے حصے میں سے وارثوں کی نسبت اولیٰ ہے نہ کہ کل مال سے۔ یہ استثناء اس عام حکم سے ہے جس میں اولوا الارحام کو اولویت کا درجہ دیا گیا ہے (یعنی انہیں میراث کا زیادہ مستحق قرار دیا گیا ہے) یا پھر یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ نے مولات اور ہجرات کے سبب وارث بننے کے احکام کو منسوخ کیا تو یہ اجازت فرمادی کہ آدمی جس سے دوستی رکھتا ہے اگر اپنے مال کے تیسرے حصے میں سے اس کے لیے کچھ وصیت کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ میں مِنْ بیانیہ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ مؤمنین میں سے قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کا وارث بننے کے زیادہ مستحق ہیں۔ یعنی مسلم اور کافر ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں اور نہ ہی مہاجر اور غیر مہاجر ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں۔ مگر یہ کہ اگر تم اپنے ان رشتہ داروں میں سے کسی کے لیے وصیت کرنا چاہو تو یہ مباح ہے اگر چہ وہ ایماندار نہ ہوں اور نہ ہی مہاجر ہوں۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہ قول حضرت قتادہ، عکرمہ اور عطاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ہے (2)۔ میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں صیغہ اسم تفضیل الف لام، اضافت اور من تفضیلیہ تینوں صورتوں سے خالی ہو جاتا ہے (جب کہ اس کے استعمال کے یہی تین طریقے ہیں) پھر مومنین اور مہاجرین میں سے اولوا الارحام کا ایک دوسرے کی وراثت کا زیادہ اہل ہونا یہ تقاضا نہیں کرتا کہ مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے۔ نہ تو لفظاً اور یہ تو بالکل ظاہر ہے اور نہ ہی معناً۔ کیونکہ مومن کا اولیٰ ہونا اس پر دلالت نہیں کرتا کہ مومن وارث نہ ہونے کی صورت میں کافر مومن کا وارث نہیں بن سکتا۔ واللہ اعلم۔

؎ یہ (حکم) جو ذکر کیا گیا ہے۔ لوح محفوظ یا قرآن کریم میں لکھا ہوا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کتاب سے مراد تورات ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۪ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ

''اور (اے حبیب) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا؎ آپ سے بھی اور نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ ابن مریم سے بھی؎ اور ہم نے ان سب سے پختہ عہد لیا تھا؎''

؎ اور (اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا۔ جس وقت کہ انہیں صلب آدم سے نکالا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام سے یہ عہد لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے، لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلائیں گے، ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 192 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 192 (التجاریہ)

اپنی قوم کو نصیحت کریں گے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ نے عمومی ذکر کے بعد ان انبیاء علیہم السلام کا خصوصیت سے ذکر فرمایا اس لیے کہ انہیں یہ فضیلت حاصل ہے کہ یہ اصحاب شریعت بھی ہیں اور اصحاب کتاب بھی، اور ساتھ ہی یہ اولوا العزم رسولوں میں سے ہیں۔ اور پھر ان تمام سے پہلے حضور نبی کریم ﷺ کا ذکر فرمایا ایک تو آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم کے لیے اور دوسرا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے جس سے حضور نبی کریم ﷺ نے بذات خود مطلع فرمایا کہ میں تخلیق کے اعتبار سے تمام لوگوں سے اول ہوں اور بعثت کے اعتبار سے سب سے آخر ہوں۔ اسے سعد نے حضرت قتادہ سے مرسل روایت کیا ہے۔ لیکن علامہ بغویؒ نے اسے اس متصل سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ عن قتادہ عن الحسن عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ (1) اور کہا ہے کہ حضرت قتادہ نے اسے بیان کرنے کے بعد فرمایا یہی مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ الآیہ۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان تمام سے قبل اپنے محبوب ﷺ کا ذکر فرمایا۔(2)

ابن سعد اور ابونعیم نے الحلیہ میں میسرۃ الفجر بن سعد سے اور انہوں نے ابوالجدعاء سے اور طبرانی نے کبیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں كُنْتُ نَبِيًّا وَّادَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ (میں اس وقت نبی تھا در آنحالیکہ آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے مابین تھے)(3)۔

۳؎ اور ہم نے ان سب سے یہ پختہ عہد لیا تھا کہ جو انہوں نے عہد کیا ہے وہ اسے ضرور پورا کریں گے یا ایسا عہد جسے ایمان کے ساتھ مؤکد کیا گیا۔ اسے مکرر ذکر کرنے کی علت اسی وصف کو بیان کرنا ہے۔

لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۸﴾

''یہ کہ (آپ کا رب) پوچھے سچوں سے ان کے سچ کے متعلق ۱؎ اور اس نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے دردناک عذاب ۲؎''

۱؎ اور ہم نے یہ اس لیے کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان انبیاء علیہم السلام سے پوچھے گا جنہوں نے اپنے وعدوں کو سچا کر دکھایا اور اس کے بارے جو کچھ انہوں نے اپنی قوموں سے کہا۔ یا کفار سے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرنے کے متعلق پوچھے گا اور ان سے سوال کا مقصود انہیں مزید ذلیل و رسوا کرنا ہے۔ یا پھر انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرنے والوں سے پوچھے گا کیونکہ سچ بولنے والے کی تصدیق کرنے والا بھی سچا ہوتا ہے۔ یا ان مومنین سے سوال کرے گا جنہوں نے اپنے وعدوں کو سچا کر دکھایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے وعدے کی سچائی کے بارے میں انہیں اپنے نفسوں پر شاہد بنائے گا۔

۲؎ اس کا عطف اَخَذْنَا پر ہے اس اعتبار سے کہ رسولوں کی بعثت اور ان سے میثاق لینے کا مقصد اہل ایمان کو ثواب عطا فرمانا ہے یا پھر اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جس پر لِيَسْـَٔلَ دلالت کر رہا ہے۔ گویا ارشاد اس طرح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو ثواب عطا فرمایا اور کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۚ﴿۹﴾

''اے ایمان والو! یاد کرو اللہ تعالیٰ کے احسان کو جو اس نے تم پر کیا جب (حملہ آور ہوکر) آ گئے تھے تم پر (کفار کے) لشکر پس ہم نے بھیج دی ان پر آندھی ۱؎ اور ایسی فوجیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے ۲؎ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے تھے خوب دیکھ رہا تھا ۳؎ ''

۱؎ اِذْجَآءَ تْکُمْ نعمۃ اللّٰہ کی ظرف ہے۔ اور ان لشکروں سے مراد کفار قریش، بنی غطفان اور یہود بنی قریظہ کے لشکر تھے۔ ان میں افراد کی تعداد تقریباً بارہ ہزار تھی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سمیت مسلمانوں کا محاصرہ کر لیا تھا اور حضور نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کے اردگرد خندق کھدوائی تھی۔ پس ہم نے ان پر آندھی بھیج دی۔ امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صبا (آندھی، طوفان) سے میری مدد کی گئی اور قوم عاد کو دبور (تیز ہوا طوفان) کے ساتھ ہلاک کیا گیا(1) اللہ تعالیٰ نے سخت سردرات میں ان پر ٹھنڈی ہوا چلا دی جس نے ان کے خیموں کی رسیوں کو توڑ دیا، میخوں کو اکھیڑ دیا، جلنے والی آگ کو بجھا دیا اور ہانڈیوں کو الٹا کر دیا اور ساتھ ہی گھوڑے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے، اچھلتے کودتے بھاگ نکلے۔

۲؎ اور ملائکہ میں سے ایسے لشکر جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے لشکروں کی اطراف میں ملائکہ کی تکبیر کثرت سے بلند ہوئی اور ان کے دلوں میں رعب پڑ گیا۔ حتیٰ کہ ہر قوم کا سردار یہ کہنے لگا اے نبی فلاں! میری طرف آجاؤ۔ پس جب وہ اس کے پاس جمع ہو گئے تو اس نے کہا تم رات کی تاریکی میں بھاگ جاؤ۔ چنانچہ وہ بغیر قتال کے شکست خوردہ ہوکر بھاگ گئے۔ اور اس دن ملائکہ نے قتال نہیں کیا تھا۔

۳؎ اے مؤمنین! خندق کی کھدائی اور جنگ کے لیے جو تیاری تم کر رہے تھے۔ یہ معنی جمہور کی قرأت کے مطابق ہے۔ لیکن بصریوں کی قرأت کے مطابق معنی یہ ہے کہ مشرکین گروہوں کو اکٹھا کرنے اور جنگ کے لیے برانگیختہ کرنے کے بارے جو کچھ کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ اسے خوب دیکھ رہا تھا۔ غزوۂ خندق کا یہ واقعہ شوال 4ھ میں وقوع پذیر ہوا جیسا کہ مواہب اللدنیہ میں موسیٰ بن عقبہ کے قول سے مروی ہے یہود کے قبیلہ بنونضیر کو جلاوطن ہونے آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔ وہ جلاوطن ہوکر مختلف شہروں میں پھیل گئے سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن ربیع اور حیی بن اخطب وغیرہ ربیع الاول 4ھ میں خیبر جا پہنچے (اس وقت غزوۂ خندق پیش آیا) لیکن مشہور یہ ہے کہ یہ غزوۂ شوال 5ھ میں واقع ہوا۔ محمد بن اسحاق نے اسی طرح لکھا ہے(2)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ محمد بن اسحاق نے کہا ہے کہ یزید بن رومان (جو کہ آل زبیر کے آزاد کردہ غلام تھے) نے عروہ بن زبیر سے اور عبداللہ بن کعب بن مالک سے اور زہری اور عاصم بن عمرو بن قتادہ سے اور عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے اور محمد بن کعب القرظی وغیرہم سے نقل کیا ہے۔ (چونکہ ان تمام کی روایات ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اس لیے ہمارے علماء نے انہیں یکجا کر دیا ہے۔) کہ یہودیوں کا ایک گروہ جن میں سلام بن ابی الحقیق، حیی بن اخطب، کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق، ہودۃ بن قیس اور ابو عامر الوائلی شامل تھے۔ بنی نضیر اور بنی وائل کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر مکہ مکرمہ میں قریش مکہ کے پاس آئے (یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف مختلف گروہوں کو اکٹھا کرنے کا بنیادی کردار ادا کیا)۔ انہوں نے قریش مکہ کو حضور نبی کریم ﷺ کے خلاف جنگ لڑنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ کہا کہ اس جنگ میں ہم تمہارے ساتھ رہیں گے یہاں تک کہ ان کا مکمل طور پر خاتمہ ہو جائے۔ اس پر قریش نے انہیں کہا اے گروہ یہود! تم پہلے ہی اہل کتاب

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 589 (وزارت تعلیم)
2۔ شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیۃ، جلد 4 صفحہ 144 (الازہریۃ)

ہو اور یہ جانتے بھی ہو کہ ہمارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان اختلاف ہے، تم یہ بتاؤ کہ ہمارا دین بہتر ہے یا ان کا۔؟ تو یہ سن کر یہودیوں نے کہا تمہارا دین ان کے دین کی نسبت بہتر ہے اور تم ان کی نسبت زیادہ حق پر ہو۔ محمد بن اسحاق نے کہا انہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ...... الی قولہ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا۔ پس یہودیوں نے جب قریش کے بارے یہ کہا تو وہ خوش ہو گئے اور یہود کی دعوت قبول کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ پس انہوں نے اس کے لیے اپنا لشکر جمع کیا۔ بعد ازاں یہودی غطفان کے پاس آئے جو کہ قیس بن غیلان کا ایک ذیلی قبیلہ تھا۔ انہیں جنگ میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی۔ اپنے ساتھ ہونے کا یقین بھی دلایا اور یہ خبر بھی دی کہ قریش نے بھی جنگ کرنے کا معاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ یہ سب سن کر انہوں نے بھی ان کی دعوت کو قبول کر لیا۔(1)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ یہ بنی نضیر اور بنی وائل کے تقریباً بیس افراد تھے کہ جنہیں ابوسفیان بن حرب نے کہا مرحبا، خوش آمدید! تم ہمارے نزدیک انتہائی پسندیدہ اور محبوب لوگ ہو کہ تم نے محمد (ﷺ) کی عداوت و دشمنی پر ہمارے ساتھ معاہدہ کیا ہے۔ انہوں نے ابوسفیان کو کہا۔ تم قریش میں سے پچاس افراد کو چن لو اور تم بھی ان میں شامل ہو۔ پھر ہم تمام مل کر غلاف کعبہ کو پکڑ کر اور اپنے سینوں کو کعبہ کی دیواروں سے لگا کر یہ حلف اٹھائیں گے کہ ہم تمام محمد (ﷺ) کی عداوت و دشمنی پر متفق ہیں۔ اور ہم تمام کی بات ایک ہو گی۔ اور ہم یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ ہم اس وقت تک محمد (ﷺ) کے خلاف جنگ لڑتے رہیں گے جب تک ہمارا ایک آدمی بھی باقی ہو گا۔ پس انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب قریش سے معاہدہ کرنے کے بعد یہودی بنی غطفان کے پاس پہنچے اور انہیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ لڑنے پر ابھارا اور ان سے اس شرط پر وعدہ کیا کہ خیبر کے درختوں کی ایک سال کی کھجوریں انہیں دیں گے۔ یہ بھی مروی ہے کہ نصف کھجوروں کا وعدہ کیا۔ تو قبیلہ غطفان کے سردار عیینہ بن حصین فزاری نے ان کی اس شرط کو قبول کر لیا۔ اور بنی اسد میں سے اپنے حلیفوں کی جانب اس نے لکھ بھیجا۔ پس وہ اس کے پاس اکٹھے ہو گئے۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ ان گروہوں میں قریش کا سردار ابوسفیان بن حرب، غطفان کا قائد عیینہ بن حصین بن حذیفہ بن بدر فزاری، بنی مرہ کا سردار حارث بن عوف بن ابی حاتم المری اور بنی اشجع میں سے مسعر بن رحیلہ بن نویرہ بن طریف اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ جنگ کے لیے نکلے۔(2)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ ابوسفیان نے چار ہزار افراد پر مشتمل لشکر جمع کیا اور اس کا علم عثمان بن ابی طلحہ کو دیا۔ ان میں تین سو گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ بھی تھے۔ یہ مکہ مکرمہ سے نکل کر مر الظہران میں اترے تو وہاں اسلم، اشجع، بنو مرہ۔ بنو کنانہ۔ فزارہ اور غطفان قبائلؓ کے لشکر بھی ان کے ہمراہ ہو گئے یہاں تک کہ ان کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی پس وہاں سے یہ اکٹھے ہو کر مدینہ طیبہ کی طرف چلے۔ اسی وجہ سے اس غزوہ کا نام غزوۂ احزاب ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کے جمع ہو کر مدینہ طیبہ آنے کی خبر سنی تو آپ ﷺ نے مدینہ کے گرد خندق کھدوا دی اور اس کا مشورہ حضرت سلمان فارسیؓ نے رسول اللہ ﷺ کو دیا تھا۔ اور یہی وہ پہلی جنگ ہے جس میں حضرت سلمان فارسیؓ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں حاضر ہوئے۔ ان دنوں آپ آزاد تھے۔ انہوں نے آپ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی جب فارس میں ہمارا اس طرح محاصرہ کیا جاتا تو ہم اپنے ارد گرد خندق کھود لیتے تھے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اس تجویز کو قبول فرما لیا اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 94-193 (التجاریہ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 194 (التجاریہ)

صحابہ کرام کے ساتھ مل کر خندق کو انتہائی مضبوط اور پختہ کر دیا(1)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کو لشکر آنے کی خبر پہنچی تو آپ کی زبان اقدس سے یہ نکلا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ (ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہی اچھا کارساز ہے)۔ پھر آپ نے مہاجرین وانصار میں سے سرداروں کو جمع کیا اور ان سے اس بارے میں مشورہ طلب کیا۔ اس دوران حضرت سلمانؓ نے خندق کھودنے کا مشورہ پیش کیا جسے آپ ﷺ نے انتہائی مستحسن قرار دیا۔ پھر آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اور خود جنگ کے لیے باہر تشریف لائے۔ مہاجرین کا علم حضرت زید بن حارثہؓ کو اور انصار کا جھنڈا حضرت سعد بن عبادہؓ کو عطا فرمایا۔ آپ ﷺ کے ساتھ مدینہ طیبہ سے نکلتے وقت مہاجرین وانصار میں سے تین ہزار افراد تھے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ روایت بھی ہے کہ ان کے پاس صرف چھتیس گھوڑے اور نکلنے والوں میں آپ کے ساتھ ایسے بچے بھی تھے جو ابھی تک بلوغت کی عمر کو بھی نہیں پہنچے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں واپس مدینہ طیبہ لوٹا دیا۔ جن کی عمر ابھی پندرہ برس مکمل نہیں تھی۔ اور جن کی عمر پندرہ برس مکمل ہو چکی تھی انہیں جنگ میں شامل ہونے کی اجازت عطا فرمادی۔ ان میں عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، ابوسعید خدری اور براء بن عازب رضی اللہ عنہم تھے پھر رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی بعض اطراف میں خندق کھودنے کے لیے جگہ تلاش کی اور جبل سلع کے قریب جگہ کا انتخاب ہوا۔ آپ ﷺ نے جبل سلع کو لشکر کی پشت پر رکھتے ہوئے اپنے اور کفار کے درمیان خندق کے لیے ایک خط کھینچا۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں یہ خبر دی گئی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عوف نے اپنے باپ کے واسطہ سے یہ نقل کیا ہے کہ غزوۂ احزاب کے سال رسول اللہ ﷺ نے خط کھینچا۔ پھر ہر دس افراد کے لیے چالیس گز خندق کی کھدائی مقرر فرمادی۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر مہاجرین وانصار کے درمیان حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے کچھ اختلاف ہو گیا۔ چونکہ وہ انتہائی طاقت ور آدمی تھے لہٰذا مہاجرین نے کہا سلمان ہم میں سے ہیں اور انصار نے کہا سلمان ہم میں سے ہیں۔ تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سلمان ہم میں سے ہے، یعنی ہمارے اہل بیت میں سے ہے۔ حضرت عمر بن عوفؓ نے کہا ہے میں سلمان، حذیفہ، نعمان بن مقرن اور انصار میں سے چھ افراد کے ذمہ خندق کی چالیس گز کھدائی تھی۔ ہم اسے کھود رہے تھے یہاں تک کہ اسی دوران اللہ تعالیٰ کے حکم سے خندق میں ایک سخت ترین چٹان آ گئی جس نے ہمارے لوہے کے اوزاروں کو توڑ دیا اور ہم پر بہت مشکل بن گئی۔ پس میں نے سلمان سے یہ کہا کہ اوپر چڑھ کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو اور اس سخت چٹان کے بارے میں آپ ﷺ کو مطلع کرو۔ پس اگر آپ ﷺ نے مناسب خیال فرمایا کہ ہم یہاں سے خندق کی کھدائی موڑ دیں (تو ہم ایسا کر لیں گے) کیونکہ ابھی موڑنے کا مقام قریب ہے۔ یا پھر جو بھی اس کے بارے میں آپ ﷺ ہمیں حکم ارشاد فرمائیں گے۔ کیونکہ ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ ہم آپ ﷺ کے کھینچے ہوئے خط سے تجاوز کریں۔ پس سلمان اوپر چڑھ کر آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ ترکی خیمہ میں تشریف فرما تھے۔ وہاں جا کر عرض کی یارسول اللہ! ﷺ خندق کے درمیان سے سفید رنگ کی انتہائی سخت چٹان نکل آئی ہے۔ اس نے ہمارے اوزار توڑ دیئے ہیں۔ اور ہم پر انتہائی مشکل پڑ گئی ہے حتیٰ کہ اس پر تھوڑا یا زیادہ کچھ اثر بھی نہیں ہوا۔ اس کے بارے آپ ہمیں اپنا حکم ارشاد فرمائیں۔ کیونکہ ہم یہ تو پسند نہیں کرتے کہ ہم آپ کے کھینچے ہوئے خط سے تجاوز کریں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ حضرت سلمان کے ساتھ تشریف لائے اور خندق میں اترے جبکہ نو افراد اور بھی خندق میں تھے۔ پس حضور نبی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 194 (التجاریہ)

کریم ﷺ نے حضرت سلمانؓ کے ہاتھ سے کدال لیا اور ایک شدید ضرب چٹان پر لگائی، جس سے اس میں شگاف ہو گیا اور اس سے ایسی بجلی کی چمک ظاہر ہوئی جس میں مدینہ طیبہ کے دونوں کناروں کے مابین جگہ کو روشن کر دیا جیسا کہ ایک تاریک مکان میں چراغ روشن کر دیا گیا ہو۔ پس آپ ﷺ نے تکبیر فتح کہی اور آپ کے ساتھ اہل ایمان نے بھی تکبیر بلند کی۔ پھر آپ ﷺ نے اس پر دوسری ضرب لگائی اور اسے توڑ ڈالا اور ساتھ ہی اس سے ایک چمک ظاہر ہوئی جس نے مدینہ طیبہ کے دونوں کناروں کے مابین جگہ کو روشن کر دیا جیسا کہ ایک تاریک مکان میں چراغ روشن کر دیا گیا ہو۔ پس آپ ﷺ نے تکبیر فتح بلند فرمائی اور مسلمانوں نے بھی نعرہ تکبیر لگایا۔ پھر آپ ﷺ نے اس پر ضرب لگائی۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت سلمانؓ کا ہاتھ پکڑا اور خندق سے باہر تشریف لے آئے۔ تو حضرت سلمانؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ فداک أبي میں نے ایسی شے ملاحظہ کی ہے جس کی مثل کبھی بھی نہیں دیکھی۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم نے بھی دیکھا ہے جو کچھ سلمان کہہ رہے ہیں؟ تو انہوں نے عرض کی جی ہاں! پھر آپ ﷺ نے فرمایا جب میں نے پہلی ضرب لگائی۔ پس اس سے وہ چمک ظاہر ہوئی جو تم نے دیکھی۔ اس نے میرے لیے حیرہ اور کسریٰ کے محلات روشن کر دیے گویا کہ وہ کتوں کے دانت ہیں اور جبرئیل علیہ السلام نے مجھے خبر دی ہے کہ میری امت ان پر غالب آئے گی۔ پھر میں نے دوسری ضرب لگائی اس سے بھی وہ چمک ظاہر ہوئی جو تم نے دیکھی۔ تو اس نے مجھے روم کے سرخ محلات دکھا دیے۔ گویا کہ وہ کتوں کے دانت ہیں۔ اور جبرئیل علیہ السلام نے مجھے خبر دی ہے کہ میری امت ان پر بھی غالب آئے گی۔ پس تمہیں بشارت ہو یہ سن کر مسلمان انتہائی خوش ہوئے اور کہا سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس کا وعدہ سچا ہے اور اس نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ ہمارے محصور ہونے کے بعد وہ ہماری مدد فرمائے گا اور فتح سے نوازے گا۔ لیکن منافقین نے یہ کہا کیا تم محمد ﷺ پر تعجب نہیں کرتے کہ وہ تمہیں جھوٹی آرزوئیں دلا رہے ہیں اور جھوٹے وعدے کر رہے ہیں۔ اور تمہیں یہ بتا رہے ہیں کہ وہ یثرب سے حیرہ اور مدائن کسریٰ کے محلات دیکھ رہے ہیں اور یہ کہ وہ تمہارے لیے کھول دیئے جائیں گے حالانکہ تم تباہ ہونے سے بچنے کے لیے خندق کھود رہے ہو اور تم پر یہ طاقت نہیں رکھتے کہ باہر نکل کر کھلے میدان میں مقابلہ کرو۔ تو راوی کا بیان ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی وَ إِذْ يَقُولُ الْمُنٰفِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهٗۤ إِلَّا غُرُورًا۔ اور اس واقعہ کے بارے یہ آیت نازل فرمائی گئی قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ الآیہ۔(1)

صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ خندق کی طرف تشریف لے گئے، جبکہ مہاجرین و انصار سخت سردی میں صبح کے وقت خندق کھودنے میں مصروف تھے۔ ان کے پاس کام کرنے کے لیے خدام اور غلام موجود نہیں تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں انتہائی تھکن اور بھوک کی حالت میں دیکھا تو فرمایا۔

إِنَّ الْعَيْشَ عَيْشُ الْآخِرَةِ ۔۔۔ فَاغْفِرِ الْأَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَةَ

بے شک زندگی تو فقط آخرت کی زندگی ہے (اے اللہ!) انصار و مہاجرین کی مغفرت فرما دے تو پھر انہوں نے آپ ﷺ کے جواب میں یہ عرض کی

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا ۔۔۔ عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِينَا أَبَدًا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 95-194 (التجاریہ)

ہم وہ ہیں جنہوں نے حضور نبی رحمت ﷺ کے دست مبارک پر اس وقت تک ہمیشہ کے لیے جہاد کرنے کی بیعت کر رکھی جب تک ہم باقی ہیں۔(1)

اور صحیح میں حضرت براء بن عازبؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ غزوۂ احزاب کے دن تھے اور رسول اللہ ﷺ نے خندق کھدوائی۔ تو میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ بذات خود خندق کی مٹی اٹھا کر لا رہے ہیں یہاں تک کہ غبار نے آپ ﷺ کے بطن اقدس کو ڈھانپ لیا اور آپ کے جسم پر بال بہت زیادہ تھے۔ اور میں نے مٹی اٹھانے کے دوران آپ ﷺ کو ابن رواحہ کے یہ رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے سنا۔

اَللّٰھُمَّ لَوْ لَا اَنْتَ مَا اھْتَدَیْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا

اے اللہ! اگر تو مہربانی نہ فرماتا نہ ہم ہدایت پاتے۔ نہ صدقہ دیتے اور نہ ہی نماز ادا کرتے۔

فَاَنْزِلْ سَکِیْنَۃً عَلَیْنَا وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَّاقَیْنَا

پس ہم پر سکینت (طمانیت) نازل فرما اور اگر ہمارا (دشمن سے) مقابلہ ہو تو ہمیں ثابت قدمی عطا فرما۔

اِنَّ الْاُوْلٰی قَدْ بَغَوْا عَلَیْنَا اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَۃً اَبَیْنَا

بے شک یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہم پر زیادتی کی کیونکہ جب انہوں نے فتنہ وفساد کا ارادہ کیا تو ہم نے انکار کر دیا۔ آپ ﷺ ان کے آخری لفظ خوب کھینچ کر مد سے ادا فرماتے تھے(2)۔ اور ایک میں ہے کہ پہلے شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح ہے وَاللّٰہِ لَوْ لَا اللّٰہُ مَا اھْتَدَیْنَا (قسم بخدا! اگر اللہ تعالیٰ مہربانی نہ فرماتا تو ہم ہدایت نہ پاتے)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت سلمانؓ ایک طاقتور آدمی تھے وہ خندق کی کھدائی کے دوران دس آدمیوں کے کام کے برابر کام کرتے تھے اور یہ روایت بھی ہے کہ وہ ہر روز پانچ ہاتھ عرضاً طولاً خندق کھودا کرتے تھے اور اس کی گہرائی بھی پانچ ہاتھ ہوتی تھی۔ پس قیس بن ابی صعصعہ کی نظر آپ کو لگی تو فوراً بیہوش ہو کر گر پڑے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے قیس کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ سلمان کے لیے ایک برتن میں وضو کرے اور پھر اس پانی سے سلمان کو غسل دے اور پھر برتن الٹا کر کے اپنے پیچھے پھینک دے۔ پس انہوں نے اسی طرح کیا تو حضرت سلمان صحت یاب ہو گئے۔

امام احمدؒ اور امام بخاریؒ نے صحیح میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں خندق کی کھدائی کے دوران ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ ہمارے سامنے ایک انتہائی سخت چٹان آ گئی۔ صحابہ کرام حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی پہاڑ کا ایک سخت پتھر سامنے آ گیا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میں آ رہا ہوں۔ پھر آپ ﷺ اٹھے درآنحالیکہ آپ کے بطن پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ اور تین دنوں سے ہم نے بھی کوئی چیز چکھی تک نہ تھی۔ رسول اللہ! ﷺ نے کدال اپنے دست مبارک میں لیا اور پتھر پر ضرب لگا کر اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مجھے گھر جانے کی اجازت مرحمت فرمایئے۔ میں نے گھر جا کر اپنی رفیقہ حیات سے کہا۔ میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو شدید بھوک کی حالت میں دیکھا ہے جس پر مجھے صبر کا یارا نہ رہا، کیا تیرے پاس کوئی شے ہے۔ تو اس نے ایک تھیلا نکالا جس میں ایک صاع (چار سیر) جو تھے ہمارے گھر میں ایک چھوٹا سا بکری کا بچہ بھی تھا۔ پس میں نے اسے ذبح کیا اور اس نے جو پیس لیے اور میرے فارغ ہونے تک وہ بھی پیسنے سے فارغ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 588 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 589 (وزارت تعلیم)

ہوگئی۔ میں نے گوشت کاٹ کر ہنڈیا میں ڈالا اور اتنے میں گوندھا ہوا آٹا نرم ہوگیا۔ ہنڈیا چولہے پر چڑھا دی گئی جب وہ پکنے کے قریب ہوئی تو میں واپس لوٹ کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ واپس آتے وقت زوجہ نے یہ کہا مجھے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے سامنے رسوا نہ کرنا۔ پس میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے سرگوشی کرتے ہوئے عرض کی۔ یا رسول اللہ! ﷺ میرے پاس تھوڑا سا کھانا ہے آپ اور آپ کے ساتھ ایک دو آدمیوں کے لیے کافی ہوگا آپ تشریف لائیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ کتنا ہے؟ میں نے تفصیل ذکر کردی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بہت ہے اور پاکیزہ ہے۔ گھر پہنچ کر اپنی زوجہ سے کہہ دیں کہ میرے آنے تک ہانڈی چولہے سے نہ اتارے اور نہ ہی روٹیاں تنور سے نکالے (یعنی روٹیاں نہ پکائے) پھر تھوڑی دیر بعد رسول اللہ ﷺ نے بآواز بلند فرمایا اے اہل خندق! جابر نے تمہارے لیے کھانا تیار کیا ہے پس تم جلدی چلو۔ میں نے گھر پہنچ کر بیوی سے کہا تو ہلاک ہو! حضور نبی کریم ﷺ مہاجرین وانصار اور اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ تشریف فرما ہو رہے ہیں۔ تو اس نے کہا اللہ تیرے ساتھ اس طرح کرے! کیا آپ ﷺ نے تجھ سے تفصیلاً پوچھا نہیں تھا؟ میں نے کہا آپ ﷺ نے دریافت فرمایا ہے۔ تو پھر اس نے کہہ دیا اللّٰہ و رسولہ اعلم۔ پس اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو فرمایا اندر داخل ہو جاؤ لیکن بھیڑ نہ کرنا۔ پھر میں نے آٹا آپ کے سامنے پیش کیا تو آپ ﷺ نے اپنا لعاب دھن اس میں ڈالا اور برکت کی دعا فرمائی۔ پھر آپ ﷺ ہانڈی کے پاس تشریف لے گئے۔ اس میں لعاب دھن ڈالا اور برکت کی دعا فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا اے جابر اب روٹیاں پکانے والی کو بلاؤ تاکہ وہ روٹیاں پکائے اور ہانڈی سے سالن نکالے۔ اور ہانڈی کو چولہے سے نہ اتارنا۔ رسول اللہ ﷺ نے بذات خود روٹی کے ٹکڑے کرنے شروع کیے اور ان پر گوشت رکھنے لگے اور ساتھ ساتھ ہانڈی اور تنور کو ڈھانک کر رکھا۔ آپ ﷺ ان سے کچھ لیتے اور اسے صحابہ کرام کے قریب کردیتے۔ پھر ڈھکنا اتارتے۔ پس اسی طرح روٹی توڑتے رہے اور اس پر گوشت رکھ کر صحابہ کرام کو دیتے رہے یہاں تک کہ ایک ہزار افراد سیر ہوئے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں قسم بخدا! صحابہ کرام نے جی بھر کر کھایا یہاں تک کہ کھاتے کھاتے چھوڑ دیا اور واپس چل دیئے لیکن ہماری ہانڈی ایسے ہی ابل رہی تھی جیسے ابتداء میں تھی اور آٹے سے مسلسل روٹی پکتی رہی مگر وہ جوں کا توں رہا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس عورت سے ارشاد فرمایا اب تو بھی کھا اور لوگوں کو بطور ہدیہ بھی بھیج دے کیونکہ لوگ انتہائی بھوک اور فاقے کی حالت میں ہیں (1)۔ پھر ہم اسے کھاتے رہے اور سارا دن لوگوں کو بھی بھیجتے رہے۔ میں کہتا ہوں کہ صحابہ کرام خندق کی کھدائی سے چھ دن میں مکمل طور پر فارغ ہو چکے تھے۔

علامہ بغویؒ نے کہا کہ اب ہم پھر ابن اسحاق کی حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پس جب رسول اللہ ﷺ خندق کی کھدائی سے فارغ ہوئے تو قریش اپنے احابیش اور اپنے متبعین اہل تہامہ سے دس ہزار کا لشکر لے کر رومۃ الجرف اور الغابہ سے مجتمع الاحیال میں آ پہنچے اور بنی غطفان اور متبعین اہل نجد وغیرہ ٹمی کے پچھلے حصہ میں کوہ احد کی جانب اترے رسول اللہ ﷺ بھی اپنے علاموں کو ساتھ لے کر باہر تشریف لے گئے۔ لشکر کی تعداد تین ہزار تھی۔ آپ ﷺ نے جبل سلع کو پشت پر رکھ کر اپنے لشکر کو ٹھہرایا۔ مخالفین اور آپ ﷺ کے درمیان خندق حائل تھی۔ اور آپ ﷺ نے بچوں اور عورتوں کو ایک محفوظ بلند مقام پر چڑھ جانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ بنی نضیر کا سردار دشمن خدا حیی بن اخطب بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد قرظی کے پاس آیا۔ درآنحالیکہ وہ اپنی قوم کی جانب سے

رسول اللہ ﷺ سے مصالحت کا معاہدہ کر چکا تھا۔ جب کعب نے حیی بن اخطب کے بارے سنا تو اس نے اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اپنے قلعہ کا دروازہ بند کر دیا۔ لہٰذا جب حیی نے اجازت طلب کی تو کعب نے انکار کر دیا اور دروازہ نہ کھولا۔ پھر حیی نے آواز دی اے کعب! میرے لیے دروازہ کھول دے۔ تو اس نے جواب دیا تیری ہلاکت ہو اے حیی! یہ انتہائی بدبختی ہے کیونکہ میں محمد (ﷺ) سے معاہدہ کر چکا ہوں۔ اور میں ان کے ساتھ اپنا معاہدہ توڑ نہیں سکتا۔ کیونکہ میں نے انہیں ہمیشہ وعدے کو وفا کرتے ہوئے سچ بولنے والا پایا ہے۔ حیی نے کہا تیری ہلاکت ہو! دروازہ کھول میں تجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ کعب نے اندر سے کہہ دیا میں کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حیی نے کہا قسم بخدا! تو نے اس خوف سے مجھ پر دروازہ بند کر رکھا ہے کہ میں تیرے ساتھ کچھ کھا لوں گا۔ پس یہ سن کر کعب کے جذبات بھڑک اٹھے اور اسی حال میں اس نے دروازہ کھول دیا۔ تو حیی نے اندر داخل ہو کر کہا اے کعب! میں تو زمانے کی عزتیں تیرے پاس لایا ہوں اور قریش کے قائدین اور سرداروں پر مشتمل ایک لہریں مارتا ہوا سمندر تیرے پاس لے کر آ گیا ہوں۔ حتیٰ کہ میں نے قریش کو دومہ کے مقام مجتمع لاسیال پر اتارا ہے۔ اور بنی غطفان کو گذشتہ رات سے اپنی قائدین اور سرداروں سمیت جبل احد کی جانب نُمّی کے پچھلے حصہ میں اتار دیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے معاہدہ اور پختہ وعدہ کیا ہے کہ وہ واپس نہیں جائیں گے یہاں تک کہ محمد (ﷺ) اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو مکمل طور پر ختم کر دیں گے۔ یہ سن کر کعب بن اسد نے کہا قسم بخدا! تو زمانے بھر کی ذلتیں لے کر میرے پاس ہے اور ایسا بادل لے کر آیا ہے جس کا پانی برس چکا ہے اور اب اس میں گرج چمک کے سوا اور کوئی شے بھی نہیں۔ اس لیے تو مجھے محمد (ﷺ) کے ساتھ اپنے حال پر چھوڑ دے کیونکہ میں نے ان کی جانب سے صدق اور ایفائے عہد کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ لیکن حیی بن اخطب کعب کو فریب دینے کے لیے مسلسل اوپر نیچے باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے یہ کہہ دیا کہ میں اللہ کی قسم کھا کر تیرے ساتھ یہ عہد و میثاق کرتا ہوں کہ اگر قریش واپس لوٹ گئے اور وہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کا قلع قمع نہ کر سکے تو میں تیرے ساتھ اس قلعہ میں سکونت اختیار کر لوں گا۔ یہاں تک کہ جو اذیت اور تکلیف تجھے پہنچے گی میں بھی اس سے دوچار ہوں گا۔ بالآخر کعب نے اپنا معاہدہ توڑ دیا۔ اور رسول اللہ ﷺ اور اس کے درمیان معاہدہ کے سبب جو پابندیاں عائد تھیں ان سے اس نے برأت کا اظہار کر لیا۔ جب یہ خبر رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے پاس پہنچی۔ تو آپ ﷺ نے بنی اشہل میں سے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ، بنی ساعدہ میں سے قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ اور ان کے ساتھ بنی حارث بن خزرج کے بھائی عبداللہ بن رواحہ اور بنی عمرو بن عوف کے بھائی خوات بن جبیر رضی اللہ عنہم کو حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ اور فرمایا جاؤ اور غور سے دیکھو کہ آیا جو خبر ان کی جانب سے مجھ تک پہنچی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اگر وہ سچ ہو تو مجھے کنایۃً مطلع کر دینا میں جان لوں گا (صراحۃً بتا کر) لوگوں کی قوت وطاقت کمزور نہ کرنا۔ اور اگر وہ اپنے اور ہمارے درمیان والے معاہدہ کے پابند ہوں، اسے پورا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو پھر بلند آواز سے واضح الفاظ میں لوگوں کو بتا دینا۔ پس وہ چلے گئے حتیٰ کہ جب ان کے پاس پہنچے تو انہیں اس سے بھی زیادہ خبیث اور رذیل پایا جتنی خبر ان کے بارے پہنچی ہوئی تھی۔ وہ کلیۃً رسول اللہ ﷺ سے منہ موڑ چکے تھے اور کہنے لگے کہ ہمارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں۔ تو اس کے بعد حضرت سعد بن عبادہ اور ان کے درمیان گالی گلوچ کا تبادلہ بھی ہوا، کیونکہ آپ کے جذبات انتہائی تیز تھے۔ تو حضرت سعد بن معاذؓ نے کہا ان سے گالی گلوچ چھوڑ دو کیونکہ اب ہمارے اور ان کے درمیان معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ پھر حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ حضور علیہ

الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کرنے کے بعد کہا عضل والقارہ (یعنی جس طرح قبیلہ عضل اور قارہ نے اصحاب رسول اللہ ﷺ سے دھوکا کیا تھا اسی طرح انہوں نے بھی معاہدہ توڑ دیا ہے)۔ اللہ اکبر اے گروہ مسلمین! تمہیں بشارت ہو۔ اس کے ساتھ ہی آزمائش بڑھ گئی، خوف شدید ہوگیا اور صحابہ کرام کے دشمن اوپر نیچے سے ان پر چڑھ آئے۔ حتیٰ کہ بعض اہل ایمان کو بھی مختلف خیال آنے لگے۔ اور بعض منافقین کا نفاق ظاہر ہوگیا۔ یہاں تک کہ بنی عمرو بن عوی کے بھائی معتب بن قشیر نے کہا کہ محمد (ﷺ) ہم سے وعدہ کر رہے ہیں کہ ہم قیصر وکسریٰ کے خزانے کھائیں گے حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی قضائے حاجت کے لیے جانے پر قادر نہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ہمارے ساتھ سوائے فریب اور دھوکے کے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا اور بنی حارثہ میں سے ایک آدمی اوس بن قبطی نے یہ کہا ہمارے گھروں میں کوئی محافظ نہیں۔ لہٰذا ہمیں گھروں کو واپس جانے کی اجازت دی جائے کیونکہ وہ مدینہ طیبہ سے بہت باہر کی طرف ہیں۔ حالانکہ ان کے اپنے قبیلے کے افراد کی ایک جماعت گھروں کی حفاظت پر مامور تھی۔(1)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ جب کعب نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہوا اپنا وعدہ توڑ دیا۔ تو اس نے اپنی قوم کے اشراف کو جمع کیا۔ ان میں زبیر بن بلطا، نباش بن قیس اور عقبہ بن زید وغیرہ شامل تھے۔ اور انہیں اپنے فیصلے کے بارے آگاہ کیا۔ تو انہوں نے اسے خوب ملامت کی اور حد درجہ ناپسندیدگی کا اظہار کیا یہاں کہ کعب انتہائی نادم اور شرمندہ ہوا۔ لیکن چونکہ اب معاملے کی لگام اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی اس لیے اس خجالت اور ندامت نے اسے کوئی نفع نہ دیا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی قریظہ کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرمایا۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت زبیر بن عوامؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کون ہے جو بنی قریظہ میں جا کر ان کی خبر مجھ تک لائے گا؟ پس میں چلا گیا اور جب واپس لوٹ کر آیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے میرے لیے اپنے والدین کا اکٹھا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا فداک ابی و امی (میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں)(2)۔ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن عبادہؓ کو بنی قریظہ کی طرف بھیجنے سے قبل حضرت زبیر بن عوامؓ کو ادھر بھیجا تھا۔ کیونکہ یہ روایت ہے کہ جب حضرت زبیرؓ نے بنی قریظہ سے واپس لوٹ کر رسول اللہ ﷺ کو ان کے بارے مطلع کیا کہ وہ اپنے قلعوں کو درست کر رہے ہیں، راستوں اور سرحدوں کو بند کر رہے ہیں، اپنے گھوڑوں اور مویشیوں کو جمع کر رہے ہیں۔ تو اس وقت حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيًّا وَحَوَارِيُّ الزُّبَيْرُ (ہر نبی کے لیے ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے) علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مشرکین ایک مہینے میں سے بیس سے زائد راتوں تک اپنی اپنی قیام گاہوں میں ٹھہرے رہے اور اس دوران تیر اندازی اور پتھر پھینکنے کے سوا اور کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ پس جب رسول اللہ ﷺ کے لیے آزمائش مزید بڑھ گئی تو آپ ﷺ نے بنی غطفان کے سرداروں عیینہ بن حصین اور ابو الحارث بن عمرو کی طرف پیغام بھیجا کہ اگر وہ اپنے ساتھیوں کو واپس لوٹا کر لے جائیں تو انہیں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی طرف سے مدینہ طیبہ کے پھلوں میں سے پیداوار کا تیسرا حصہ دیا جائے گا۔ آپ ﷺ اور ان کے درمیان صلح کی بات طے ہوگئی حتیٰ کہ انہوں نے تحریر بھی لکھ دی۔ لیکن ابھی تک اس پر شہادت ثبت نہیں ہوئی تھی کہ آپ ﷺ نے اس کا ذکر حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ سے کیا اور اس بارے میں دونوں سے مشورہ طلب کیا۔ دونوں عرض

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 196-195 (التجاریۃ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 527 (وزارت تعلیم)

کی یارسول اللہ! ﷺ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم ارشاد فرمایا (اگر ایسا ہے) تو پھر اس پر عمل کیے بغیر ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہیں۔ یا آپ ایسا کرنا خود پسند فرمارہے ہیں (اگر اس طرح ہے) تو پھر ایسا ضرور کیجئے۔ یا آپ ایسا ہمارے لیے کرنا چاہتے ہیں ﷺ تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی سبب نہیں فقط تمہارے لیے ایسا کرنا چاہتا ہوں۔ قسم بخدا! میں نے عربوں کو دیکھا ہے وہ ایک قوس سے تم پر تیر پھینکنا چاہتے ہیں۔ ہر جانب سے تم پر اکٹھے ہو کر آگئے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ میں تمہارے خلاف ان کی قوت اور طاقت کو توڑ دوں۔ یہ سن کر حضرت سعد بن معاذ نے عرض کی یا رسول اللہ! ایک وقت تھا ہم اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا کرتے تھے، بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ نہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور نہ ہی اسے پہچانتے تھے لیکن اس حالت میں وہ یہ طاقت نہیں رکھتے تھے کہ وہ ایک کھجور بھی بغیر مہمانی یا خریدنے کے کھاسکیں۔ لیکن اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کے سبب عزت و تکریم عطا فرمائی ہے اور آپ کے سبب ہمیں عظمت ورفعت عطا فرمائی ہے تو ہم انہیں اپنا بلا وجہ دے دیں۔ ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں قسم بخدا ہم انہیں تلوار کے سوا اور کچھ نہیں دیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرمادے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پس تمہیں اختیار ہے وہی کرو جو پسند کرو۔ پس حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے صحیفہ پکڑا اور اس پر جو کچھ لکھا گیا تھا اسے مٹا دیا پھر کہا وہ ہمارے خلاف جو کر سکتے ہیں کریں۔(1)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سب سے اول یہ بات حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے کہی تھی اور پھر ان کے بعد حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما نے بھی ایسے ہی کہی۔ عینیہ بن حصین اس مجلس میں اپنی ٹانگ پھیلائے بیٹھا تھا۔ تو حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے اسے کہا اے بندر! اپنی ٹانگ پیچھے کھینچ لے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی مجلس کے آداب مانع نہ ہوتے تو میں اپنا نیزہ تیری کوکھ میں گاڑ دیتا۔ پس اس طرح عینیہ اور حارث دونوں خائب و خاسر ناکام ہو کر واپس لوٹ گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ انہیں مدینہ طیبہ پر غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا اور جب انہوں نے انصار کو اس قوت وطاقت کا مظاہرہ کیا تو وہ لرز گئے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قیام پذیر رہے اور دشمن محاصرہ کیے رہے لیکن ان کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ مگر یہ کہ قریش کے چند شہسوار جن میں عمرو بن عبدود بنی عامر بن لوی کا بھائی، عکرمہ بن ابی جہل مخزومی، ہبیرہ بن وہب مخزومی، نوفل بن عبداللہ، ضرار بن خطاب اور بنی محارب بن مہر کا بھائی مرداس بن لوی شامل تھے، جنگ کے لیے آئے۔ وہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر بنو کنانہ کے پاس سے گزرے اور انہیں کہا اے بنو کنانہ! جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آج تم جان لو گے شہسوار کون ہے؟ پھر خندق کی طرف آئے اور خندق کے پاس آکر ٹھہر گئے تو اسے دیکھ کر کہنے لگے قسم بخدا! بے شک یہ تو ایک چال ہے عرب پہلے تو یہ تدبیر نہیں کیا کرتے تھے پھر انہوں نے خندق کے ایک تنگ مقام کو تلاش کیا اور اپنے گھوڑوں کو اس میں ڈال دیا۔ پس گھوڑے انہیں لے کر خندق اور جبل سلع کے درمیان خالی جگہ میں گھومنے لگے۔ ادھر سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر اس مقام پر تشریف لے گئے جہاں سے انہوں نے اپنے گھوڑوں کو داخل کیا تھا۔ اتنے میں گھوڑ سوار بھی ان کے سامنے آگئے۔ عمرو بن عبدود جنگ بدر میں شریک ہوا اور اس میں زخمی ہونے کے سبب جنگ احد میں حصہ نہ لے سکا۔ لیکن اب جب جنگ خندق کا وقت آیا تو وہ پھر جنگی تدابیر سکھلاتے اور اپنی قوت دیکھنے کے لیے آگیا۔ چنانچہ اب وہی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 197 (التجاریہ)

آ کھڑا ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا اے عمرو! تو نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر یہ وعدہ کیا تھا کہ جب کبھی قریش میں سے کوئی آدمی دو چیزوں کی طرف دعوت دے گا تو تو ان میں سے ایک ضرور قبول کر لے گا۔ اس نے کہا بالکل ایسے ہی ہے۔ تو پھر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا۔ میں تجھے اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں (تو اسے قبول کر لے)۔ اس نے جواب دیا مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو پھر میں تجھے میدان میں اترنے کی دعوت دیتا ہوں (مقابل آ جا)۔ اس نے جواباً کہا کیوں اے بھتیجے قسم بخدا میں تجھے قتل کرنا پسند نہیں کرتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا قسم بخدا! میں تو تجھے قتل کرنا چاہتا ہوں۔ پس یہ سن کر عمرو کے جذبات بھڑک اٹھے اور وہ گھوڑے سے اچھل کر نیچے آ گیا۔ اس کی کونچیں زخمی کر دیں یا اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوا پھر دونوں ایک دوسرے کو پکڑنے لگے اور آپس میں لڑنے لگے یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا۔ اور اس کا گھوڑا بھاگتے ہوئے خندق سے دوسری جانب کود گیا۔ عمرو کے ساتھ دو اور آدمی بھی قتل ہوئے۔ ان میں ایک منبہ بن عثمان بن عبدالسباق بن عبدالدار تھا اسے تیر لگا اور وہ مکہ میں پہنچ کر مر گیا۔ اور دوسرا نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی تھا وہ خندق سے کودتے ہوئے اس میں گر پڑا۔ اور اوپر سے اسے پتھر مارے گئے۔ اس نے کہا اے گروہ عرب اس سے احسن انداز میں جنگ کرو۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نیچے اترے اور اسے قتل کر دیا۔ پس اس طرح مسلمان غالب آ گئے۔ تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ وہ اس کا جسم انہیں فروخت کر دیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمیں نہ اس کے جسم کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے عوض ثمن لینے کی۔ پس تم اس کا مردہ جسم لے جاؤ آپ نے ان کا راستہ چھوڑ دیا اور لاش اٹھانے کی اجازت دے دی۔(1)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ غزوۂ خندق کے وقت ہم بنی حارثہ کے قلعے میں تھیں وہ مدینہ طیبہ کا محفوظ ترین قلعہ تھا۔ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ بھی قلعہ میں ہمارے ساتھ تھے۔ اور یہ واقعہ ہمارے لیے پردے کے احکام نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ باہر نکلے اس حال میں کہ آپ چھوٹی زرہ پہنے ہوئے تھے مکمل بازو اس سے باہر تھا اور ہاتھ میں چھوٹا سا نیزہ پکڑے ہوئے تھے اور ساتھ یہ کہہ رہے تھے۔

یَا لیت قلاَ ملاَ یُدْرِکُ الْهَیْجَاء جَمَلُ لَابَاْسَ بِالْمَوْتِ اِذَا حَانَ الْاَجَلُ

اے کاش! میرا اونٹ بھڑکتی جنگ کو پالے جب موت کا مقررہ وقت آ جائے تو پھر مرنے سے کوئی انکار (حرج) نہیں۔

تو ان کی ماں نے کہا اے بیٹے جلدی رسول اللہ ﷺ سے جا مل قسم بخدا! تو نے دیر کر دی ہے۔ تو میں نے ان سے کہا اے سعد کی ماں! میں یہ چاہتی ہوں کہ سعد کے جسم پر ایسی زرہ ہوتی جو ان کے سارے جسم کو ڈھانپ لیتی مجھے ان کے بارے میں یہ خطرہ ہے کہ کہیں سے کوئی تیر نہ آ لگے۔ تو ان کی ماں نے جواباً عرض کی اللہ تعالیٰ کا جو فیصلہ ہو گا وہ ہو کر رہے گا پس اسی دن انہیں ایک تیر آ کر لگا جس نے ان کی رگ اکحل کو کاٹ دیا۔ یہ تیر بنی عامر بن لوی میں سے ایک آدمی حبان بن قیس غرقہ نے انہیں مارا۔ جب اس نے آپ کی طرف تیر پھینکا تو اس نے کہا یہ لے میں ابن غرقہ ہوں۔ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بددعا دیتے ہوئے فرمایا اللہ تجھے جہنم کے عذاب میں مبتلا کرے۔ پھر رب کریم کی بارگاہ میں یہ التجا کی اے اللہ! اگر قریش کے ساتھ ابھی تک جنگ باقی ہے تو پھر مجھے بھی اس کے لیے باقی رکھ۔ کیونکہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 197 (التجاریہ)

میرے نزدیک ان سے بڑھ کر اور کوئی ایسی پسندیدہ قوم نہیں جن کے خلاف میں جہاد کروں۔ کیونکہ انہوں نے تیرے رسول ﷺ کو اذیتیں دی ہیں، ان کی تکذیب کی ہے اور انہیں (شہر سے نکال دیا ہے اور اگر تو نے ہمارے اور ان کے درمیان جنگ ختم کر دی ہے تو پھر اسی زخم کو میرے لیے شہادت کا ذریعہ بن دے اور مجھے اس وقت تک موت نہ دے یہاں تک کہ میری آنکھیں بنی قریظہ (کی بربادی اور ہلاکت) سے ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔ حالانکہ یہ لوگ دور جاہلیت میں آپ کے حلیف اور دوست تھے(1)۔ مجاہد اور محمد بن اسحاق یحییٰ بن عباد بن عبداللہ بن زبیر سے اور وہ اپنے باپ عباد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قلعے میں تھیں اور حسان بن ثابت بھی وہیں ہم عورتوں اور بچوں کے ساتھ تھے۔ پس ہمارے پاس سے یہودیوں کا ایک آدمی گزرا اور قلعے کے گرد گھومنے لگا۔ اس وقت بنو قریظہ جنگ میں شریک تھے۔ رسول اللہ ﷺ اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہمارے اور بنو قریظہ کے درمیان ہمارے دفاع کے لیے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو ساتھ لے کر دشمن کے سامنے قیام فرما تھے۔ وہ انہیں چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ نہیں ہو سکتے تھے۔ اتنے میں وہ آدمی گھومتا پھرتا ہمارے سامنے آ گیا۔ میں نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا یہ یہودی جسے تم قلعے کے اردگرد گھومتے دیکھ رہے ہو قسم بخدا میں اس کے بارے میں پرامن نہیں یہ پیچھے کی جانب سے کسی کمزور جگہ سے یہودیوں کو ہمارے پاس اندر داخل کرنے کی کوشش کرے گا اور صورت حال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ہماری طرف متوجہ نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا تم اس کی طرف نیچے اترو اور اسے قتل کر دو۔ یہ سن کر حسان نے کہا اے عبدالمطلب کی بیٹی اللہ تعالیٰ تیری مغفرت فرمائے قسم بخدا! تو جانتی ہے مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ پس جب اس نے مجھے یہ کہا، اور مجھے ان سے کوئی امید نظر نہ آئی۔ تو میں نے اپنا ازار بند ذرا مضبوط کیا اور قلعے سے ایک چوب اٹھائی۔ اور پھر قلعے سے نیچے اتر کر اس یہودی کی گردن پر ایسے زور سے ماری کہ اسے قتل کر دیا۔ پھر جب اس سے فارغ ہو کر قلعے میں واپس لوٹی تو حسان نے کہا نیچے اترو اور اس کے ہتھیار اتار کر لے آؤ میرے لیے اس کے ہتھیار اتارنے میں فقط یہ رکاوٹ تھی کہ وہ اجنبی مرد تھا۔ مگر حسان نے پھر یہ کہہ دیا اے عبدالمطلب کی بیٹی! مجھے تو اس کے ہتھیار اتارنے کی کوئی حاجت نہیں۔(2)

میں کہتا ہوں کہ یہ روایات بھی ہے کہ بنی قریظہ نے رات کے وقت مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے قریش سے مدد طلب کی۔ جب یہ خبر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ کے تمام مقامات اور قلعوں کی حفاظت کے لیے سلمہ بن اسلم کو دو سو آدمیوں کے ساتھ اور زید بن حارثہ کو تین سو افراد کے ہمراہ بھیج دیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت عباد بن بشر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہر رات رسول اللہ ﷺ کے خیمہ کی نگہبانی کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ اور مشرکین جب خندق کو عبور کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو صحابہ کرام انہیں پتھر اور تیر مار کر روک دیتے تھے اور رسول اللہ ﷺ بذات خود بھی پہرہ دیا کرتے تھے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے، آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں پہنچ کر ایک رات جاگتے رہے اور فرمایا کاش میرے لیے کوئی ایسا صالح آدمی ہوتا جو میری نگہبانی کرتا۔ اسی اثناء میں ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی۔ آپ ﷺ نے پوچھا کون ہے؟ اس نے جواب دیا سعد ہوں آپ ﷺ نے فرمایا کیسے آئے ہو؟ تو انہوں نے عرض کی میرے دل میں آپ کے بارے میں کچھ خوف سا لاحق ہوا۔ پس میں آپ کی حفاظت کے لیے حاضر ہوا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 198 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 198 (التجاریہ)

ہوں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ان کے لیے دعا فرمائی اور پھر آرام فرما ہو گئے۔(1)

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میں اس دن سے سعد سے محبت کرتی ہوں جب سے وہ غزوۂ خندق کے دوران رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرنے لگے۔ خندق میں ایک مقام تھا جہاں سے کفار کے خندق عبور کرنے کا خطرہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس مقام کی خود نگہبانی کر رہے تھے۔ جب آپ کو شدید سردی محسوس ہوتی تو میرے پاس تشریف لاتے اور مجھ سے حرارت وگرمائش حاصل کرتے۔ پھر تشریف لے جاتے اور حفاظت کرنے لگتے اور فرماتے تھے مجھے اس مقام کے سوا کہیں سے بھی دشمن کے اندر داخل ہونے کا خوف وخطرہ نہیں۔ پس ایک بار آپ ﷺ میرے پاس تشریف لائے تاکہ گرمائش اور سکون حاصل کریں تو فرمایا کاش میرے لیے کوئی صالح آدمی ہوتا جو آج کی رات میری نگہبانی کرتا تاکہ میں آرام کرلوں۔ اسی اثناء میں ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی تو آپ ﷺ نے پوچھا کون ہے؟ اس نے کہا سعد ہوں۔ اور ہم اس مقام کی حفاظت کر رہے ہیں یہ سنا تو رسول اللہ ﷺ سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ ﷺ کے سانس کی آواز سنی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بذات خود نگہبانی کے فرائض سرانجام دیتے تھے حالانکہ سردی انتہائی شدید تھی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ایک رات اپنے خیمہ میں نماز ادا فرمائی پھر پہرہ دینے کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا یہ خندق کے اردگرد مشرکین کے گھوڑ سوار ہیں۔ پس آپ ﷺ نے عباد بن بشیر کو آواز دی۔ انہوں نے عرض کی لبیک یا رسول اللہ ﷺ۔ آپ نے پوچھا کیا تیرے ساتھ کوئی ہے؟ تو انہوں نے عرض کی جی ہاں میرے ساتھ میری قوم کے افراد ہیں جو آپ کی حفاظت کر رہے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنی قوم کے افراد کو لے جاؤ کیونکہ خندق کے اردگرد مشرکین کے یہ افراد رات کے وقت حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور آپ ﷺ نے یہ دعا مانگی اے اللہ! ہم سے ان کے شر کو دور فرما اور ان کے خلاف ہماری مدد فرما۔ پس عباد بن بشیر اپنے ساتھیوں کے ساتھ خندق کی طرف گئے۔ اتنے میں ابوسفیان اور اس کے مشرک ساتھی خندق کے تنگ مقام میں داخل ہو چکے تھے اور مسلمان ان پر پتھر اور تیر برسا رہے تھے پھر عباد بن بشیر ان سے جا ملے۔ عباد کہتے ہیں میں مومنین کے ساتھ مل کر ان پر تیر اندازی کرتا رہا یہاں تک کہ مشرکین شکست خوردہ ہو کر بھاگ گئے۔ جب میں رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ کر واپس آیا تو آپ ﷺ نماز ادا فرما رہے تھے۔ پس جونہی آپ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے صورت حال سے آپ کو مطلع کر دیا۔ پھر ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ آرام فرما ہو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ کی سونے کی حالت کی آواز سنی اور جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی تو آپ بیدار ہوئے پھر آپ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں اے اللہ عباد بن بشیر پر رحمت نازل فرما۔(2)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے خیمہ میں آرام فرما رہے تھے۔ جب نصف رات گزری تو آوازیں بلند ہونے لگیں اور میں نے یہ سنا کہ وہ کہہ رہے ہیں اے اللہ تعالیٰ کے شہسوارو! سوار ہو جاؤ۔ اس غزوہ میں یہ مہاجرین کا خصوصی شعار (نشان، نعرہ) تھا (اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب رات کے وقت تمہارا مقابلہ کفار سے ہو تو اس صورت میں تمہارا شعار حٰم لا ینصرون ہونا چاہئے۔ اب مذکورہ دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ یہ انصار کا شعار تھا اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 404 (وزارت تعلیم) 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4، صفحہ 30-529 (العلمیہ)

وہ مہاجرین کا) تو رسول اللہ ﷺ نیند سے بیدار ہوگئے اور اپنے خیمے سے باہر لوگروں کی طرف گئے۔ وہ آپ کے خیمے کی حفاظت کر رہے تھے۔ ان میں عباد بن بشیر بھی تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا یہ آوازیں کیسی ہیں؟ اور ساتھ ہی عباد کو حکم فرمایا کہ ان کی خبر لے آؤ۔ پس حضرت عباد رضی اللہ عنہ گئے اور رسول اللہ ﷺ ان کے واپس آنے تک انتظار فرماتے رہے حتیٰ کہ انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ یہ عمرو بن عبدود اپنے مشرک ساتھیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ لڑ رہا ہے اور وہ ان پر تیر اور پتھر برسا رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر خیمے میں تشریف لے گئے۔ وہاں سے ہتھیار اٹھائے، پھر گھوڑے پر سوار ہوئے اور صحابہ کرام کی ایک جماعت ساتھ لے کر میدان کارزار کی طرف تشریف لے گئے۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد شاداں وفرحاں واپس تشریف لے آئے اور ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کے شر کو دور فرما دیا ہے اور وہ زخموں سے چور ہو کر بھاگ گئے ہیں۔ پھر آپ ﷺ آرام فرما ہوئے اور سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ کے سانس کی آواز سنی۔ پھر دوبارہ آوازیں بلند ہونے لگیں۔ رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے اور حضرت عباد رضی اللہ عنہ سے فرمایا دیکھو! یہ آوازیں کیسی ہیں؟ وہ گئے اور واپس آ کر بتایا یا رسول اللہ! ﷺ یہ ضرار بن خطاب اپنے مشرک ساتھیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ لڑ رہا ہے اور پتھر اور تیر برسا رہا ہے۔ آپ ﷺ وہاں تشریف لے گئے اور صبح ہونے کی تک ان سے جنگ کرتے رہے، پھر واپس تشریف لائے اور فرمایا وہ شدید زخمی ہو کر بھاگ گئے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں غزوہ مریسیع، خیبر، حدیبیہ، فتح مکہ اور حنین میں آپ ﷺ کے ساتھ تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں غزوۂ خندق سے بڑھ کر آپ کے لیے کوئی غزوہ بھی زیادہ شدید اور تکلیف دہ نہیں تھا۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کو کثیر زخم آئے۔ موسم کے اعتبار سے شدید سردی تھی اور تنگ حالی کا دور تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایک دن کفار خندق کے ارد گرد جمع ہو گئے اور شدید جنگ لڑتے رہے یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا اور آپ ﷺ نے نماز تک کی فرصت نہ پائی یہاں تک کہ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں فوت ہو گئیں۔ پھر آپ ﷺ نے انہیں عشاء کے وقت میں قضا فرمایا۔

ترمذی اور نسائی نے ابوعبیدہ سے اور انہوں نے اپنے باپ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو غزوۂ خندق کے دن چار نمازوں سے مشغول رکھا یہاں تک کہ جتنا اللہ نے چاہا رات کا حصہ بھی گزر گیا پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی۔ پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی، پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھائی، انہوں نے پھر اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھائی۔ ترمذی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند میں اس کے سوا کوئی نقص نہیں کہ ابوعبیدہ نے اپنے باپ سے یہ حدیث نہیں سنی۔ اس لیے یہ روایت منقطع ہے۔

نسائی نے اپنی سنن میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ خندق کے دن ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں سے ہمیں روک دیا گیا۔ پھر آخر کار ہمیں وہ ادا کرنے کی فرصت دے دی گئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ۔ پھر رسول اللہ ﷺ قیام فرما ہوئے (حضرت بلال رضی اللہ عنہ) نے اقامت کہی اور آپ ﷺ نے ایسے ہی ظہر کی نماز پڑھائی جیسے پہلے پڑھاتے تھے۔ پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ پہلے کی طرح عصر کی نماز پڑھائی، پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے ویسے ہی مغرب کی نماز پڑھائی جیسے اس سے قبل پڑھاتے تھے اور پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ

ﷺ نے ایسے ہی عشاء کی نماز پڑھائی جیسے آپ ﷺ پڑھاتے تھے۔ یہ واقعہ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا کی آیت نازل ہونے سے پہلے کا ہے(1)۔ ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور اس میں عشاء کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ وہ اپنے وقت میں ادا ہوئی تھی۔ اور ایک دوسری روایت میں اس اعتبار سے اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے معتاد وقت سے تاخیر کے ساتھ ادا ہوئی۔

بزار نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ غزوۂ خندق کے دن ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں سے مشغول رہے یہاں تک کہ رات کا ایک پہر بھی گزر گیا۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ انہوں نے اذان دی، پھر اقامت کہی تو آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی۔ پھر آپ ﷺ نے حکم دیا تو انہوں نے اذان کہی، اور اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی۔ پھر آپ ﷺ نے حکم ارشاد فرمایا، پس انہوں نے اذان دی اور اقامت کہی تو آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھائی۔ پھر آپ ﷺ نے حکم ارشاد فرمایا۔ پس انہوں نے اذان اور اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھائی۔ بعد ازاں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا سطح زمین پر تمہارے سوا ایسی کوئی قوم نہیں جو اس وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف ہو(2)۔ اس روایت کی سند میں عبدالکریم بن ابی المخارق راوی کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ صحیحین میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوۂ خندق کے دن حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سورج غروب ہونے کے بعد آئے اور کفار قریش کو برا بھلا کہنے لگے اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں نے ابھی تک عصر کی نماز ادا نہیں کی۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہو گیا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم بخدا! میں نے بھی نماز عصر ادا نہیں کی۔ پھر ہم حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں وادی بطحان میں اترے۔ تو آپ ﷺ نے وہاں نماز کے لیے وضو فرمایا اور ہم نے بھی نماز کے لیے وضو کیا۔ پھر آپ ﷺ نے سورج غروب ہونے کے بعد نماز عصر پڑھائی اور پھر اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھائی(3)۔ صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ خندق کے دن رسول اللہ ﷺ نے یہ کہا اللہ تعالیٰ (ان کفار) کے گھروں اور قبروں کو آگ سے اسی طرح بھر دے جیسے انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ سے مشغول رکھا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا(4) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ پھر آپ ﷺ نے مغرب اور عشاء کی نماز کے درمیان یہ نماز ادا فرمائی(5)۔ مذکورہ احادیث کے بارے میں یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ یہ مختلف واقعات ہوں کیونکہ غزوۂ خندق کئی دنوں تک جاری رہا تھا۔ اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ یہ ایک ہی حالت کا واقعہ ہو۔ بہر حال ان میں تطبیق ممکن ہے اس میں کوئی خفا نہیں۔

مسئلہ: جب کئی نمازیں قضا ہو جائیں تو انہیں ادا کرتے وقت پہلی نماز کے لیے اذان اور اقامت دونوں کہی جائیں گی اور پھر ہر نماز کے لیے صرف اقامت ہی کہی جائے گی۔ لیکن افضل یہ ہے کہ ہر نماز کے لیے اذان اور اقامت دونوں کہی جائیں جیسا کہ حدیث بزار سے ثابت ہے واللہ اعلم۔

جب اہل ایمان پر آزمائش و ابتلاء شدید ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ نے کفار کے لیے بددعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا کو شرف قبول عطا فرمایا۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احزاب کے خلاف بددعا فرمائی اور بارگاہ الٰہی میں یہ عرض کی "اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ سَرِيْعَ الْحِسَابِ اهْزِمِ الْاَحْزَابَ اَللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَ

1۔ مجمع الزوائد، جلد 2 صفحہ 105 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 590 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 590 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 946 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 227 (وزارت تعلیم)

زَلْزِلْهُمْ" (اے اللہ! کتاب کو نازل فرمانے والے، جلد حساب کرنے والے ان گروہوں کو شکست سے دوچار فرما اے اللہ! انہیں ہزیمت اٹھانے پر مجبور کر دے اور ان پر زلزلہ (رعب، کپکپی) طاری کر دے)(1)۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مسلسل تین دن تک مسجد الفتح میں ان احزاب (گروہوں) کے لیے بددعا فرمائی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سوموار، منگل اور بدھ کے دن تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے بدھ کے دن ظہر اور عصر کی نمازوں کے درمیان آپ ﷺ کی دعا کو شرف قبول عطا فرمایا تو ہم نے آپ ﷺ کے چہرۂ مقدس پر فرحت و مسرت کے آثار دیکھ لیے۔ راوی کا کہنا ہے کہ اس کے بعد جو تکلیف اور مصائب بھی ہم پر آئی اور ہم نے اس وقت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے لیے دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے ہماری دعا قبول فرمائی۔

علامہ بغوی، نے ذکر کیا ہے کہ پھر نعیم بن مسعود بن عامر بن غطفان رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ عرض کی یارسول اللہ! ﷺ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن ابھی تک میری قوم کو میرے اسلام لانے کا علم نہیں۔ اس لیے آپ جو چاہیں مجھے حکم ارشاد فرمائیں تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا تو ہم میں اکیلا آدمی ہے۔ اگر تو طاقت رکھتا ہے تو ان گروہوں کو ہم سے پھیر دے کیونکہ جنگ تو ایک خفیہ تدبیر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ نعیم نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ مجھے اجازت فرمائیں کہ میں جو چاہوں انہیں کہہ لوں۔ تو آپ ﷺ نے اسے اجازت دے دی۔ چنانچہ نعیم بن مسعود بنی قریظہ کے پاس آئے دور جاہلیت میں آپ ان کے گہرے دوست تھے انہیں جا کر کہا اے بنی قریظہ! میری تمہارے ساتھ جو خاص محبت ہے اسے تم پہچانتے ہی ہو۔ انہوں نے کہا تو نے بالکل سچ کہا ہے تو ہمارے نزدیک متہم اور مشکوک آدمی نہیں ہے۔ پھر انہوں نے انہیں یہ کہا کہ قریش اور غطفان کے لوگ جنگ کے لیے آئے ہوئے ہیں اور تم جنگ میں ان کی مدد کر رہے ہو۔ لیکن قریش اور غطفان کی کیفیت تمہاری طرح نہیں۔ یہ شہر تمہارا شہر ہے۔ تمہارے اموال، اولاد اور عورتیں اسی شہر میں ہیں اور تم اس شہر سے کسی اور شہر کی طرف جانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ جبکہ اس کے برعکس قریش اور بنی غطفان کے اموال، اولاد اور ان کی عورتیں یہاں سے دور ہیں۔ اگر انہیں کامیابی اور مال غنیمت دکھائی دیا تو وہ اسے حاصل کریں گے اور اگر حالات اس کے برعکس ہوئے تو وہ اپنے شہروں کو چلے جائیں گے اور تمہارے اور اس آدمی کے درمیان سے نکل جائیں گے۔ اور یہ آدمی تمہارے شہر میں مقیم ہے اور اگر وہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلے جائیں تو تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے تم اس قوم سے اس وقت تک جنگ نہ کرو۔ یہاں تک تم ان میں سے چند سردار اپنے پاس بطور رہن نہ رکھ لو۔ اس سے تمہیں اعتماد حاصل ہو جائے گا (اور وہ بھاگ کر نہیں جائیں گے) اور پھر محمد (ﷺ) سے جنگ کرنا اور خوب مقابلہ کرنا۔ یہ سن کر انہوں نے کہا تو نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے۔ پھر نعیم وہاں سے نکل کر قریش کے پاس آئے اور ابوسفیان بن حرب اور اس کے قریشی ساتھیوں کو کہا تم اپنے ساتھ میری محبت کے بارے اور محمد (ﷺ) کے بارے میں میرے نظریات سے خوب واقف ہو مجھ تک ایک بات پہنچی ہے، میں نے یہ ضروری خیال کیا ہے کہ وہ تمہاری بھلائی کے لیے تم تک پہنچا دوں۔ لیکن میرے بارے میں اظہار نہ کرنا۔ انہوں نے جواب دیا ہم بالیقین ایسا ہی کریں گے۔ تو نعیم نے انہیں بتایا کہ تم جانتے ہو کہ گروہ یہود نے اپنے اور محمد (ﷺ) کے درمیان ہونے والے معاہدہ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اب وہ اس پر نادم اور شرمندہ ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ان کی طرف یہ پیغام بھیجا ہے کہ ہم اپنے کیے پر از حد نادم ہیں، کیا تم ہم سے اس شرط پر راضی ہو سکتے ہو کہ ہم قریش اور غطفان کے اشراف میں سے کچھ لوگ تمہارے حوالے کر دیں تاکہ انہیں قتل

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 946 (وزارت تعلیم)

کر دیا جائے اور پھر ہم تمہارے ساتھ مل کر باقی لوگوں کا مقابلہ کریں؟ تو اس پر محمد (ﷺ) نے اپنی رضا مندی کا پیغام بھیج دیا ہے۔ اس لیے اگر یہود تم سے یہ مطالبہ کریں کہ کچھ افراد ہمارے پاس بطور رہن رکھو تو انہیں بالکل ایک آدمی بھی نہ دینا۔ پھر نعیم وہاں سے نکلے اور غطفان کے پاس آئے اور کہا اے گروہ غطفان! تم میرے گھر اور خاندان کے افراد ہو تمام لوگوں سے زیادہ مجھے محبوب ہو اور میں قطعاً تمہارے بارے میں یہ رائے نہیں رکھتا کہ تم مجھے متہم کرو گے اور میری بات پر شک کرو گے۔ انہوں نے جواب دیا تم نے بالکل سچ کہا ہے۔ اس نے انہیں کہا میرا راز رکھنا میرے بارے کسی کے سامنے اظہار نہ کرنا۔ انہوں نے کہا ہم ایسا ہی کریں گے اور پھر اس نے ان سے بھی وہی کچھ کہا جو قریش سے کہا تھا اور ان کی طرح اسی شے سے انہیں بھی خوب ڈرایا۔ پھر جب شوال 5ھ ہفتے کے دن کی رات ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی خاص مدد فرمائی کہ ابوسفیان نے ورقہ بن غطفان اور عکرمہ بن ابی جہل کو قریش اور غطفان کے کچھ افراد کے ساتھ بنی قریظہ کی طرف بھیجا۔ اور انہوں نے وہاں پہنچ کر کہا کہ ہم ایسی جگہ پر نہیں جہاں قیام کیا جا سکے ہمارے اونٹ اور گھوڑے ہلاک ہو رہے ہیں۔ اس لیے تم جنگ کی تیاری کرو تا کہ ہم محمد (ﷺ) کے ساتھ خوب کھل کر مقابلہ کریں اور اس صورت حال سے فارغ ہو جائیں جو ہمارے اور ان کے درمیان بنی ہوئی ہے۔ لیکن انہوں نے جواب یہ دیا کہ آج ہفتے کا دن ہے۔ یہ تو ایسا دن ہے جس میں ہم کوئی کام بھی نہیں کرتے۔ ہمارے بعض افراد نے اس دن نیا کام (بدعت) کیا تھا۔ پس اس سبب سے انہیں جو اذیت پہنچی وہ تم پر مخفی نہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہم تمہارے ساتھ مل کر اس وقت تک جنگ نہیں کریں گے جب تک تم اپنے کچھ افراد بطور رہن ہمیں نہ دے دو۔ وہ ہمارے پاس ہوں گے تو ہمیں اعتماد رہے گا اور ہم محمد (ﷺ) کے ساتھ کھل کر جنگ کر سکیں گے۔ کیونکہ ہمیں یہ خوف ہے کہ اگر جنگ سے تمہیں نقصان پہنچایا اور اس کی آزمائش سخت ہو گئی تو تم اپنے شہروں کو لوٹ جاؤ گے اور ہمیں تنہا چھوڑ جاؤ گے۔ اور وہ لوگ ہمارے شہر میں رہنے والے ہیں اور ہم یہ طاقت نہیں رکھتے کہ ہم محمد (ﷺ) کا مقابلہ کر سکیں۔ پس جب واپس لوٹ کر قاصدوں نے انہیں جا کر وہ کچھ بتایا جو بنی قریظہ نے کہا تو قریش اور غطفان نے کہا قسم بخدا تم یقین کر لو جو کچھ نعیم بن مسعود نے تمہیں بتایا ہے وہ بالکل صحیح اور حق ہے۔ پھر انہوں نے بنی قریظہ کی طرف پیغام بھیجا قسم بخدا! ہم تو اپنے آدمیوں میں سے ایک آدمی بھی تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ لہٰذا اگر تم ارادہ رکھتے ہو تو نکلو اور جنگ کرو۔ پس جب یہ پیغام لے کر قصاد بنو قریظہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے بھی کہا کہ جو کچھ نعیم بھی مسعود نے انہیں بتایا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ وہ فقط یہی ارادہ رکھتے ہیں کہ جنگ کریں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو یہ غنیمت ہے۔ بصورت دیگر اپنے شہروں کو واپس لوٹ جائیں گے۔ اور تمہارے اور اس آدمی کے درمیان تمہارے شہر میں عداوت پیدا کر دیں گے۔ لہٰذا انہوں نے قریش اور غطفان کی طرف یہ پیغام بھیجا قسم بخدا! ہم اس وقت تک تمہارے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ نہیں لیں گے جب تک کہ تم اپنے آدمی ہمیں بطور رہن نہیں دو گے۔ لیکن انہوں نے یہ شرط قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں رسوا کیا اور ان کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور موسم سرما کی انتہائی ٹھنڈی رات میں ان پر شدید سرد ہوا چلا دی۔ جس نے ان کی ھانڈیوں کو اوندھا کر دیا اور برتنوں کو اڑا کر دور پھینک دیا۔ پس جب رسول اللہ ﷺ کے پاس ان کے معاملات میں باہمی اختلاف کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہیں ان کی طرف بھیجا تا کہ رات کے وقت جو کچھ وہ کریں دیکھ کر آئیں۔ محمد بن اسحاق نے زید بن زیاد سے اور انہوں نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا ہے اور دوسرے بعض نے ابراہیم تیمی سے

رضی اللہ عنہ سے پوچھا اے ابا عبد اللہ! کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا اور تم نے آپ ﷺ کی صحبت اختیار کی ہے تو آپ نے فرمایا اے بھتیجے! جی ہاں۔ پھر اس نے پوچھا۔ تم کیسا برتاؤ رکھتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا قسم بخدا! ہم تیار رہا کرتے تھے۔ پھر اس نوجوان نے کہا قسم بخدا! اگر ہم آپ ﷺ کو پالیتے تو ہم آپ ﷺ کو زمین پر چلنے کے لیے نہ چھوڑتے بلکہ ہم آپ کو اپنی گردنوں پر اٹھاتے اور آپ کی خدمت میں مصروف رہتے۔ یہ سن کر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے بھتیجے! قسم بخدا! میں اب بھی اپنے آپ کو غزوۂ احزاب کی ایک رات میں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں دیکھ رہا ہوں۔ جبکہ آپ ﷺ نے فرمایا جو کوئی آج ان احزاب کی طرف جا کر ان کی خبر ہمارے پاس لائے گا اللہ تعالیٰ اسے جنت عطا فرمائے گا لیکن ہم میں سے کوئی آدمی بھی نہ اٹھا۔ پھر آپ ﷺ کافی وقت تک نماز ادا فرماتے رہے۔ پھر ہماری طرف التفات فرمایا اور پہلے کی طرح پھر ارشاد فرمایا مگر اس بار بھی لوگ خاموش رہے اور ہم میں سے کوئی بھی نہ اٹھا۔ پھر آپ ﷺ نے کافی وقت نماز پڑھنے میں صرف کیا۔ پھر ہماری جانب توجہ فرمائی اور فرمایا کون آدمی کھڑا ہوگا جو ہمارے لیے ان احزاب کے حالات دیکھ کر آئے۔ پس وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا لیکن اس کے باوجود شدید خوف، سخت بھوک اور شدید سردی کی وجہ سے کوئی آدمی بھی نہ اٹھا۔ پس جب کوئی بھی کھڑا نہ ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلایا اور فرمایا اے حذیفہ! پس جب آپ ﷺ نے مجھے یاد فرمایا تو میرے لیے اٹھنے کے بغیر کوئی چارہ باقی نہ رہا۔ تو میں نے عرض کی لبیک یا رسول اللہ! ﷺ اور ساتھ ہی اٹھا اور آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا درآنحالیکہ میرے پہلو (سردی سے) کانپ رہے تھے۔ پس آپ ﷺ نے میرے سر اور چہرے پر اپنا دست مبارک پھیرا اور پھر فرمایا۔ تم اس قوم کے پاس جاؤ اور ان کی خبر لے آؤ اور کچھ بھی نہ کرنا یہاں تک کہ واپس میری طرف لوٹ آؤ۔ پھر میرے حق میں دعا فرمائی اے اللہ! اس کے سامنے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے اور اس کے اوپر اور نیچے سے اس کی حفاظت کرنا۔ پس میں نے اپنے تیر اٹھائے، اپنے ہتھیار باندھے اور پھر ان کی طرف چل پڑا۔ اور (مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا) گویا میں حمام میں چل رہا ہوں (یعنی مکمل طور پر میری سردی ختم ہوگئی)۔ میں وہاں پہنچا اور ان لوگوں میں داخل ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر سخت ہوا اور لشکر بھیج دیئے۔ اللہ تعالیٰ کے لشکروں نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ان کی کوئی ہانڈی، آگ اور خیمہ اپنی جگہ پر برقرار نہ رہا۔ اس وقت ابوسفیان بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ پس میں نے تیر نکالا، اسے کمان کے چلے پر چڑھایا اور ابوسفیان کو مارنے کا ارادہ کیا۔ اگر میں اسے مارتا تو بالیقین اسے مار دیتا۔ لیکن پھر مجھے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد یاد آگیا" کہ کچھ عمل بھی نہ کرنا یہاں تک کہ میرے پاس لوٹ آئے" چنانچہ میں نے اپنا تیر واپس ترکش میں رکھ دیا۔ جب ابوسفیان نے وہ حال دیکھا جو ہوا اور اللہ تعالیٰ کے لشکر ان کے ساتھ کر رہے تھے کہ کوئی ہانڈی سیدھی نہیں رہی۔ آگ چولہے میں موجود نہیں اور کوئی خیمہ سلامت نہیں۔ تو اٹھا اور کہا اے گروہ قریش! تم میں سے ہر کوئی اپنے پاس بیٹھنے والے کو پکڑے اور دیکھے کہ وہ کون ہے؟ پس میں نے اپنے ہمنشین کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کہا تو کون ہے؟ تو اس نے جواباً کہا سبحان اللہ کیا تو مجھے نہیں پہچانتا، میں فلاں بن فلاں ہوں۔ وہ بنی ہوازن میں سے ایک آدمی تھا۔ پھر ابوسفیان نے کہا اے گروہ قریش! قسم بخدا تم ایسی جگہ نہیں ہو جو قیام کے قابل ہو، ہمارے گھوڑے اور اونٹ ہلاک ہو گئے ہیں، بنو قریظہ نے ہماری مخالفت کر دی ہے اور ان کی طرف سے ہمیں ایسا پیغام موصول ہوا ہے جو ہمارے لیے پسندیدہ نہیں۔ اور ہوا نے ہمارا جو حشر کیا ہے اسے تم دیکھ رہے ہو۔ اس لیے تم یہاں سے چلے چلو۔ پس میں تو کوچ کرنے لگا ہوں۔ پھر وہ اٹھ کر اپنے اونٹ کے پاس گیا، وہ بندھا ہوا تھا، یہ اس کے اوپر بیٹھ گیا، اور اسے مارنا شروع کر دیا۔ پس وہ تینوں ٹانگوں پر ہی اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ تو پھر اس کے پاؤں کی رسی کھولی گئی۔ میں نے

غطفان کو بھی سنا انہوں نے بھی وہی کیا جو قریش نے کیا تھا۔ پس وہ لگا تار اپنے اپنے شہروں کو لوٹنے لگے۔ آپ فرماتے ہیں پھر میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں واپس لوٹ کر آیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا گویا میں حمام میں چل رہا ہوں۔ جب میں آپ ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ ﷺ کھڑے ہو کر نماز ادا فرما رہے تھے۔ پس جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو میں نے آپ کو ان لوگوں کے بارے میں مطلع کیا تو ایسے ہنسے کے رات کی سیاہی میں آپ ﷺ کے دندان مبارک کی سفیدی ظاہر ہوگئی۔ پس جب میں آپ ﷺ کو خبر دے کر فارغ ہوا اور زیارت کر چکا تو مجھ سے وہ گرمائش بھی جاتی رہی (جس کے سبب مجھے شدید سردی کے باوجود یہ محسوس ہوا کہ میں حمام میں چل رہا ہوں) تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے قریب بلایا اور مجھے اپنے پاؤں کے قریب کر کے اپنے کپڑے کی ایک طرف مجھ پر ڈال دی اور میرا سینہ اپنے قدموں کے تلووں سے لگا لیا۔ پھر میں صبح تک مسلسل سویا رہا۔ جب صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا "قُمْ يَا نَوْمَانُ" (اے سونے والے اٹھ کھڑا ہو)(1)۔ میں کہتا ہوں کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہؓ سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے لشکر پر ہوا چلائی اور لشکر کی اطراف میں ملائکہ نے تکبیر بلند کی تو طلیحہ بن خویلد اسدی نے کہا کہ محمد (ﷺ) نے تم پر جادو کا آغاز کر دیا ہے تیزی کرو اور جلدی سے نکل جاؤ پس وہ جنگ کیے بغیر وہاں سے بھاگ گئے(2)۔ میں کہتا ہوں کہ شیخ عماد الدین بن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین نہ ہوتے تو ہوا کفار میں سے کسی کو نہ چھوڑتی مگر یہ کہ انہیں بوسیدہ ہڈیوں کو قتل کر دیتی۔ جیسا کہ قوم عاد کے ساتھ ریح عقیم نے کیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب میں کفار کے لشکر سے واپس رسول اللہ ﷺ کی طرف آرہا تھا تو میں نے دوران راہ بیس گھوڑ سوار دیکھے جو سفید عمامے باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا اپنے صاحب کو کہہ دینا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمہارے لیے کافی ہے اور تم سے تمہارے دشمنوں کا شر دور کر دیا ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یوم احزاب کو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اس قوم کی خبر ہمارے پاس کون لائے گا؟ تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی، میں یا رسول اللہ! ﷺ۔ آپ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا کون ہے جو اس قوم کی خبر ہمارے پاس لائے گا؟ تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی میں یا رسول اللہ ﷺ۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کون ہے جو ہمارے پاس اس قوم کی خبر لائے گا؟ تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی میں یا رسول اللہ ﷺ تو اس وقت حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بے شک ہر نبی کے لیے حواری ہوتے ہیں اور میرا حواری زبیر ہے(3)۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے غزوۂ خندق کے دن، جب کفار کے گروہ وہاں سے چلے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا اب ان کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے ہم جائیں گے وہ ہمارے ساتھ لڑنے کے لیے نہیں آئیں گے بلکہ ہم ان کی طرف چل کر جائیں گے اَلْاٰنَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَنَا نَحْنُ نَسِيْرُ اِلَيْهِمْ(4) اور صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی غزوہ، حج یا عمرہ سے لوٹ کر واپس اپنے شہر آتے تو تین بار تکبیر کہتے اور پھر یہ کہتے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 442 (الفکر)

2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 357 (العلمیۃ)

الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ (1) محمد بن عمر نے کہا ہے کہ غزوۂ خندق میں مسلمانوں میں سے چھ افراد نے جام شہادت نوش کیا اور مشرکین میں سے بھی چھ افراد ہی قتل ہوئے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ⑩

"جب انہوں نے ہلہ بول دیا تھا تم پر اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی ۱ اور جب مارے دہشت کے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے ۲ اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے ۳"

۱ اِذْجَآءُوْكُمْ اِذْجَآءَتْكُمْ سے بدل ہے۔ مشرقی سمت سے یعنی وادی کی اوپر والی جانب سے وہ آنے والے بنی اسد اور بنی غطفان تھے۔ ان میں مالک بن عوف نظری اور عیینہ بن حصین فزاری کی زیر سیادت بنی غطفان کے ہزار افراد تھے اور ان کے ساتھ بنی اسد کا سردار طلیحہ بن خویلد اسدی بھی تھا جبکہ ان ہی کی جانب یہود بنی قریظہ کا سردار حیی بن اخطب بھی تھا۔ اور مغربی سمت سے یعنی وادی کی نچلی جانب سے۔ اور وہ آنے والے بنی کنانہ اور قریش اور ان کا سردار ابوسفیان بن حرب تھا اور ان کے ساتھ ان کے دیگر ساتھی بھی تھے اور ابواعور عمرو بن سفیان سلمی خندق کی جانب سے آیا تھا۔

۲ اور دشمن کو دیکھ کر خوف کے سبب آنکھیں حیرت میں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اور رعب کی وجہ سے کلیجے مونہوں کو آنے لگے۔ کیونکہ شدت خوف سے پھیپھڑے پھول جاتے ہیں اور دل حلقوم کی طرف اوپر کو اٹھنے لگتا ہے۔ اور کلیجہ منہ کو آنا ضرب المثل ہے جو شدت خوف کے اظہار کے لیے بولی جاتی ہے۔

۳ اور تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ پس منافقین نے یہ گمان کیا کہ اب محمد (ﷺ) اور آپ کے صحابہ کرام کا نشان تک مٹ جائے گا۔ اور مضبوط ایمان والوں نے نصرت اور کامیابی کا یقین کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے دین کی سربلندی کے لیے وعدہ فرما رکھا ہے۔ اور کمزور دل لوگ متزلزل بھی ہو گئے۔ ابوبکر، اہل مدینہ اور ابن عامر نے الظُّنُوْنَا، الرَّسُوْلَا، السَّبِيْلَا پڑھا ہے یعنی حالت وصل اور وقف دونوں میں الف کو ثابت رکھا ہے کیونکہ وہ مصاحف میں ثابت ہے۔ اہل بصرہ اور حمزہ نے دونوں حالتوں میں اصل کے مطابق بغیر الف کے پڑھا ہے اور باقیوں نے حالت وقف میں الف کے ساتھ پڑھا ہے تا کہ آیات کے آخری حرف ہم وزن ہو جائیں اور اس کے ساتھ تحریر کی اتباع بھی ہو جائے۔ اور حالت وصل میں وصل کے مطابق بغیر الف کے پڑھا ہے۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ⑪ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ⑫

"اس موقع پر خوب آزمایا گیا ایمان والوں کو اور وہ خوب سختی سے جھنجھوڑے گئے ۱ اور اس وقت کہنے لگے تھے منافق ۲ اور جن کے دلوں میں روگ تھا کہ نہیں وعدہ کیا تھا ہم سے (فتح کا) اللہ اور اسکے رسول نے مگر صرف دھوکہ دینے کے لیے ۳"

۱ اس وقت اہل ایمان کو خوب آزمالیا گیا تا کہ مخلص منافق سے اور ثابت قدم رہنے والے متزلزل لوگوں سے ممتاز ہو جائیں۔

۲ منافقین سے مراد معتب بن قشیر، عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہیں۔ ترکیب کلام میں اِذْ هُنَالِكَ سے بدل ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 590 (وزارت تعلیم)

۳؎ مرض سے مراد اعتقادی کمزوری اور بزدلی ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ قول منافقین کا ہے کہ محمد (ﷺ) ہمارے ساتھ شام و فارس کے محلات کا وعدہ کر رہے ہیں حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی اپنے مستقر سے باہر جانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ قسم بخدا یہ وعدہ دھوکہ اور فریب ہے (1)۔ ابن ابی حاتم نے سدی سے یہ نقل کیا ہے کہ انصار میں سے ایک منافق بشیر بن معتب نے اس طرح کا قول کہا تھا۔

وَ اِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ یٰۤاَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَ یَسْتَاْذِنُ فَرِیْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِیَّ یَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛؕ وَ مَا هِیَ بِعَوْرَةٍ ۚۛ اِنْ یُّرِیْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾

''اور یاد کرو! جب کہتی پھرتی تھی ایک جماعت ان میں سے کہ اے یثرب والو! ۱؎ تمہارے لیے اب یہاں ٹھہرنا ممکن نہیں ۲؎ (جان عزیز ہے تو) لوٹ چلو (اپنے گھروں کو) ۳؎ اور اجازت مانگنے لگا ان میں سے ایک گروہ نبی کریم سے یہ کہہ کر (حضور) ہمارے گھر بالکل غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے (اس بہانہ سازی سے) ان کا ارادہ محض (میدان جنگ سے) فرار تھا ۴؎''

۱؎ اور یاد کرو جب منافقین میں سے ایک جماعت کہتی پھرتی تھی اور اس میں اوس بن قبطی اور اس کے ساتھی شامل تھے۔ اے یثرب والو! یثرب سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یثرب کی ایک طرف میں واقع زمین کا نام مدینۃ الرسول ﷺ ہے (2)۔ علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ بعض روایات میں موجود ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کو یثرب پکارنے سے منع فرمایا ہے۔ اور فرمایا یہ طابہ ہے (3)۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس لفظ کو ناپسند کیا ہے کیونکہ وہ ثربہ یثربہ، ثَرَّبَهُ، تَثْرِیبَ علیہ اور اَثْرَبَهُ سے مشتق ہے۔ اور ان تمام کا معنی ہے اس نے اسے ملامت کی اور اسے اپنے گناہ پر عار دلائی، اور مُثْرِبٌ بہت کم عطا کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔

۲؎ لَا مُقَامَ لَكُمْ کو جمہور نے میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تمہارے لیے یہاں ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں۔ حفص نے میم کو مضموم پڑھا ہے۔ یہ یا تو ظرف مکان ہے یا پھر اَقَامَ (باب افعال) سے مصدر ہے۔

۳؎ (جان عزیز ہے) تو میدان جنگ سے اپنے گھروں کو لوٹ چلو اور محمد ﷺ کی رفاقت و سنگت چھوڑ دو۔ یا معنی یہ ہے کہ اب محمد ﷺ کے دین پر تمہارا قائم رہنا ممکن نہیں۔ لہٰذا شرک کی طرف واپس لوٹ جاؤ۔ اور اسے چھوڑ دو تاکہ تم محفوظ ہو جاؤ۔ یا معنی یہ ہے کہ اب یثرب میں تمہارے لیے قیام کی جگہ نہیں۔ پس تم شرک کی طرف لوٹ جاؤ اور اسے چھوڑ دو تاکہ تم محفوظ ہو جاؤ۔

۴؎ اور ان میں سے بنو حارثہ اور بنو سلمہ نبی کریم ﷺ سے اجازت مانگنے لگے۔ ترکیب کلام میں یَقُوْلُوْنَ یَسْتَاْذِنُ کے فاعل سے حال ہے۔ یہ کہہ کر کہ ہمارے گھر بالکل غیر محفوظ ہیں ان میں دشمن اور چور آسکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے اور وہ اس جھوٹے قول سے صرف میدان جنگ سے بھاگنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَیْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُىِٕلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَ مَا تَلَبَّثُوْا بِهَاۤ اِلَّا یَسِیْرًا ﴿۱۴﴾

''اور اگر گھس آتے (کفار کے لشکر) ان پر مدینہ کے اطراف سے ۱؎ پھر ان سے درخواست کی جاتی فتنہ انگیزی میں شرکت کی تو فوراً اسے قبول کر لیتے اور توقف نہ کرتے اس میں مگر بہت کم ۲؎''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 446 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 446 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 446 (الفکر)

۱؎ اور اگران پر کفار کے لشکر گھس آتے مدینہ طیبہ میں یا ان کے گھروں میں اس کی اطراف سے۔ یہاں فاعل کو اس طرف اشارہ کرتے ہوئے حذف کیا گیا ہے کہ ان گروہوں اور ان کے علاوہ کسی کا داخل ہونا اس پر مرتب ہونے والے حکم کے اقتضاء کے مطابق برابر ہے۔

۲؎ پھر ان سے شرک یا مسلمانوں سے جنگ کرنے کی درخواست کی جاتی۔ لَاٰتَوْهَا کو اہل حجاز نے اسے قصر کے ساتھ پڑھا ہے۔ تو وہ ضرور آتے اور ایسا کرتے۔ اور باقیوں نے اسے مد کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی جس فتنہ انگیزی کی ان سے درخواست کی جاتی تو وہ فوراً اسے قبول کر لیتے اور وہ اس فتنہ کو لانے اور اس پر عمل کرنے میں توقف نہ کرتے مگر بہت کم وقت۔ یعنی فقط اتنا وقت جتنا سوال و جواب میں صرف ہوتا۔ اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے وہ کفر اختیار کرنے کے بعد انتہائی قلیل وقت مدینہ طیبہ میں قیام پذیر رہیں۔ پھر انہیں ہلاک کر دیا جائے یا جلاوطن کر دیا جائے۔

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ⑮

"حالانکہ یہی لوگ پہلے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر چکے تھے کہ وہ پیٹھ نہیں پھیریں گے ۱؎ اور اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا جاتا ہے اس کے متعلق ضرور باز پرس کی جاتی ہے ۲؎"

۱؎ حالانکہ یہی لوگ غزوۂ خندق سے پہلے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر چکے تھے کہ وہ اپنے دشمنوں سے پیٹھ پھیر کر نہیں بھاگیں گے۔ یزید بن رومان نے کہا ہے کہ یہ بنی حارثہ تھے جنہوں نے غزوۂ احد کے دن بنی سلمہ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ پس جب ان کے بارے میں آیت کریمہ نازل ہوئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ وہ اس کی مثل دوبارہ نہیں کریں گے۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو غزوۂ بدر میں حاضر نہیں تھے اور جب انہوں نے وہ اعزاز و اکرام دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو عطا فرمایا تو اس وقت انہوں نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسی جنگ میں حاضر ہونے کا موقع فراہم فرمایا تو ہم ضرور بر ضرور جنگ لڑیں گے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انہی کی طرف اشارہ فرمایا۔(1)

۲؎ اور اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا جاتا ہے اس کے متعلق ضرور باز پرس کی جاتی ہے اور اس پر جزا بھی دی جائے گی۔

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ⑯

"فرما دیجئے (اے بھگوڑو!) تمہیں نفع نہیں دے گا اگر تم بھاگنا چاہتے ہو موت اور قتل سے ۱؎ (اور اگر بھاگ کر تم نے جان بچا بھی لی) تو تم لطف اندوز نہ ہو سکو گے مگر تھوڑی مدت ۲؎"

۱؎ اے محمد! ﷺ آپ انہیں فرما دیجئے (اے بھگوڑو!) تمہیں بھاگنا نفع نہیں دے گا اگر تم موت سے یا قتل سے بھاگنا چاہتے ہو۔ کیونکہ جس کا وقت مقرر آ جائے تو اس کے لیے مرنا ضروری ہے، چاہے قتل کے سبب مرے یا اپنی ناک ٹوٹنے کے سبب۔ اور جب تک وقت مقرر نہیں آئے گا قطعاً کوئی نہیں مرے گا۔

۲؎ اور اگر تم نے بھاگ کر جان بچا بھی لی تو تم دنیا میں زندہ رہتے ہوئے لطف اندوز نہیں ہو سکو گے مگر انتہائی کم یا بہت تھوڑا وقت۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر بفرض محال تمہارے لیے میدان سے بھاگنا نفع مند بھی ہو تو تم بہت تھوڑا وقت اس سے لطف اندوز ہو سکو گے کیونکہ بالیقین یہ دنیا فنا ہونے والی ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 447 (الفکر)

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ وَ لَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا ﴿۱۷﴾

''فرمائیے کون بچا سکتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ سے اگر وہ تمہیں عذاب دینے کا ارادہ کر لے یا اگر وہ تم پر رحمت فرمانا چاہے ۱؎ اور نہیں پائیں گے وہ لوگ اللہ کے سوا اپنے لیے کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار ۲؎''

۱؎ فرمائیے تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کون بچا سکتا ہے؟ اگر وہ تمہیں عذاب دینے کا ارادہ کر لے۔ یا اگر وہ تم پر رحمت فرمانا چاہے تو پھر کون ہے جو تمہیں عذاب دے سکتا ہے۔ یہاں کلام کو مختصر کیا گیا ہے جیسے عربوں کے اس قول میں ہے متقلدا سیفا و رمحا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ دوسرے کو پہلے پر محمول کیا جائے کیونکہ عصمۃ (بچاؤ) میں منع (روکنے) کا معنی موجود ہے (یعنی اگر وہ تم پر رحمت فرمانا چاہے تو کون ہے جو رحمت خداوندی کو تم سے روک سکے)

۲؎ اور وہ لوگ اپنے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست نہیں پائیں گے جو انہیں نفع پہنچا سکے اور نہ ہی کوئی مددگار جو ان سے ضرر اور نقصان دور کر سکے۔

قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِیْنَ مِنْكُمْ وَ الْقَآىِٕلِیْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَیْنَا ۚ وَ لَا یَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ﴿۱۸﴾

''اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جہاد سے روکنے والوں کو تم میں سے ۱؎ اور انہیں جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں (اسلامی کیمپ چھوڑ کر) ہماری طرف آجاؤ ۲؎ اور خود بھی جنگ میں شرکت نہیں کرتے مگر برائے نام ۳؎''

۱؎ مُعَوِّقِیْنَ تَعْوِیْق سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے پھیر دینا، روک دینا۔ اور اَلْعَوْق کا معنی روکنا، پھیرنا اور العائق سے مراد خیر اور بھلائی سے پھیرنے اور روکنے والا۔ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہنے سے روکتے تھے اور وہ منافقین تھے۔ اور اخوان سے مراد مدینہ طیبہ کے رہنے والے لوگ تھے۔

۲؎ کہ ہمارے قریب آجاؤ اور محمد (ﷺ) کو چھوڑ دو اور ان کے ساتھ جنگ میں شریک نہ ہو کیونکہ ہمیں تمہارے ہلاک ہونے کا خطرہ ہے۔ قتادہ نے کہا ہے ان سے مراد منافقین میں سے وہ لوگ ہیں جو انصار النبی ﷺ کو روکتے تھے اور اپنے بھائیوں سے کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب تو فقط ایک سردار کا لقمہ ہیں اور یہ گوشت ہیں۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھی انہیں لقمہ بنا لیں گے۔ لہٰذا تم اس آدمی کو چھوڑ دو کیونکہ یہ تو ہلاک ہونے والا ہے (۱)۔ مقاتل نے کہا ہے کہ یہودیوں نے منافقین کی طرف پیغام بھیجا اور کہا کونسی شے ہے جو تمہیں اس پر برانگیختہ کر رہی ہے کہ تم اپنی جانوں کو ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں سے قتل کرا دو۔ کیونکہ اگر اس مرتبہ وہ قتل کرنے پر قادر ہو گئے تو تم میں سے کسی ایک کو وہ باقی نہیں رہنے دیں گے۔ اور ہم تمہارے بارے میں خوفزدہ ہو رہے ہیں کیونکہ تم ہمارے بھائی اور پڑوسی ہو۔ لہٰذا ہماری طرف آجاؤ۔ پس اس کے بعد عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھ اہل ایمان کے پاس آئے اور انہیں ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کرنے سے روکنے لگے اور انہیں خوفزدہ کرنے لگے۔ اور یہ کہنے لگے کہ اگر وہ تم پر قادر ہو گئے تو تم میں سے کسی کو زندہ باقی نہیں چھوڑیں گے۔ تم محمد (ﷺ) سے کیا امید رکھتے ہوئے ان کے پاس خیر اور بھلائی تو ہے نہیں مگر یہ کہ وہ

یہاں ہمیں قتل کرادیں گے۔ اس لیے تم ہمارے ساتھ ہمارے بھائیوں (یہودیوں) کی طرف چلو۔ مگر منافقین کی ان باتوں کے سبب اہل ایمان کا ایمان اور مضبوط ہو گیا اور ثواب کی امید مزید بڑھ گئی۔ پس اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔(1)

۳۔ اور منافقین خود بھی جنگ میں شرکت نہیں کرتے مگر بہت تھوڑا یا بہت قلیل وقت یا انتہائی معمولی جنگ۔ کیونکہ وہ طرح طرح کے عذر کرتے اور مومنین کو بھی ممکن حد تک روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ یا پھر وہ جنگ کے لیے مومنین کے ساتھ نکلتے تو تھے مگر جو قلیل وقت جنگ میں شریک ہوتے وہ بھی ریاکاری اور شہرت کے حصول کے لیے ثواب کی نیت سے شریک نہیں ہوتے تھے۔ اگر وہ قلیل وقت بھی فقط اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے شامل ہوتے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی کثیر بنا دیتا۔ کہا گیا ہے کہ یہ منافقین کے کلام کا تتمہ ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب ان گروہوں کے ساتھ یہ جنگ نہیں لڑیں گے اور اسے زیادہ دیر تک جاری نہیں رکھ سکیں گے۔

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَإِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۭ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿19﴾

”پرلے درجے کے کنجوس ہیں تمہارے معاملے میں ۱۔ پھر جب خوف (ودہشت) چھا جائے تو پھر آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں چکرا رہی ہوتی ہیں اس شخص کی مانند جس پر موت کی غشی طاری ہو ۲۔ پھر جب خوف دور ہو جائے تو تمہیں سخت اذیت پہنچاتے ہیں اپنی تیز زبانوں سے ۳۔ بڑے حریص ہیں مال غنیمت کے حصول میں ۴۔ (درحقیقت) یہ لوگ ایمان ہی نہیں لائے پس اللہ نے ضائع کر دیئے ان کے اعمال اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے ۵۔“

۱۔ اَشِحَّةً یہ شحیح کی جمع ہے۔ ترکیب کلام میں یاتون کے فاعل یا المعوقین سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یا ذم کی بناء پر منصوب ہے یعنی بُخلاً پرلے درجے کنجوس ہیں۔ تمہاری معاونت کرنے میں یا اللہ تعالیٰ کے راستے میں کچھ خرچ کرتے ہیں یا پھر تمہارے لیے کامیابی اور مال غنیمت کے حصول میں۔

۲۔ پھر جب خوف ودہشت چھا جائے تو آپ انہیں ملاحظہ فرمائیں گے کہ وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں خوف کے سبب اپنے حلقوں میں چکرا رہی ہوتی ہیں۔ اس شخص کی نظر کی مانند جس پر موت کی غشی طاری ہو۔ یا اس شخص کی آنکھوں کے چکرانے کی طرح جس پر موت کی غشی طاری ہو۔ (پہلی صورت میں مشبہ بہ مدہوش آدمی کی نظر ہے اور دوسری صورت میں اس کی آنکھیں ہیں) یا پھر مشبہ بہ مذکورہ دونوں چیزیں ہیں۔ اور مدہوش آدمی کی آنکھوں کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ جب آدمی قریب الموت ہوتا ہے اور اس پر سکرات الموت طاری ہوتے ہیں تو عقل زائل ہو جاتی ہے اور شدت خوف کی وجہ سے اس کی آنکھیں پتھرا کر ایک جگہ رک جاتی ہیں۔

۳۔ پھر جب خوف دور ہو جائے تو تمہیں سخت اذیت پہنچاتے ہیں اپنی تیز زبانوں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یعنی وہ تمہاری تنقیص کرتے ہیں، تم میں عیب نکالتے ہیں اور غیبت کرتے ہیں(2) اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ وہ تمہیں اذیت پہنچاتے ہیں اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 448 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 449 (الفکر)

حالت امن میں تم پر طعن و تشنیع کے تیر برساتے ہیں۔ قتادہ نے کہا ہے کہ مال غنیمت کی تقسیم کے وقت وہ تم سے اپنی زبانیں پھیلاتے ہوئے کہتے ہیں ہمیں بھی دو ہم بھی تمہارے جنگ میں شریک تھے۔ لہٰذا تم ہم سے زیادہ مال غنیمت کا حق نہیں رکھتے۔(1)

۴ ترکیب کلام میں حال یا مخصوص بالذم ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اس کے سبب کلام میں تکرار ثابت نہیں ہوتا کیونکہ یہ دونوں مقامات پر یہ لفظ خاص وجہ کے ساتھ مقید ہے۔ (یہاں معنی ہے مال غنیمت کے حصول میں بڑے حریص ہیں)۔

۵ درحقیقت یہ خلوص دل سے ایمان ہی نہیں لے آئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے خلوص اور حسن نیت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اعمال کا اعتبار ہی نہیں کیا کیونکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے۔ اور اعمال کا ضائع کرنا اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے۔ کیونکہ ہر ممکن کے وجود کے لیے اس کا ارادہ ہی کافی ہوتا ہے اس کے فعل کو کوئی بھی رد نہیں کر سکتا۔

يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَ اِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ؕ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲۰

"(دشمن بھاگ گیا لیکن یہ بزدل) یہ خیال کر رہے ہیں کہ ابھی جتھے نہیں گئے اگر جتھے (دوبارہ پلٹ کر) آ جائیں تو یہ پسند کریں گے کہ کاش! وہ صحرا میں بدوؤں کے ہاں ہوتے (آنے جانے والوں سے) تمہاری خبریں پوچھتے ۱ اگر یہ (بزدل) تم میں موجود بھی ہوتے تو یہ (دشمن سے) جنگ نہ کرتے مگر برائے نام ۲"

۱ یعنی یہ اپنی بزدلی کے سبب گمان کر رہے ہیں کہ جتھے ابھی تک نہیں گئے۔ پس وہ مدینہ کے اندر تک بھاگ گئے۔ اور اگر جتھے دوبارہ پلٹ کر آ جائیں تو یہ پسند کریں گے کہ کاش! وہ صحراء میں بدوؤں کے ہاں ہوتے۔ یعنی کاش یہ ثابت ہو جاتا کہ وہ دیہات کی طرف نکلنے والے ہیں۔ جب کوئی دیہات کی طرف نکلے تو کہا جاتا ہے بدا یبدوا و بَدْوًا۔ اور "فِي الْاَعْرَابِ" ترکیب کلام میں یہ بادُون کی ضمیر سے حال ہے یا یہ ایک خبر کے بعد دوسری خبر ہے، یعنی کائنون فی الاعراب۔ اور يَسْئَلُوْنَ کا جملہ خبر کے بعد ایک اور خبر ہے۔ یا حال مترادف ہے یا حال متداخل ہے اور لَوْ کا جواب محذوف ہے اور وہ ہے لکان خیرًا۔

۲ اور اگر یہ منافقین تم میں موجود بھی ہوتے اور اس بار تم سے بھاگ کر نہ جاتے تو یہ فقط ریاکاری اور عار کے خوف سے تھوڑی ہی جنگ کرتے۔ مقاتل نے یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝۲۱

"بے شک تمہاری راہنمائی کے لیے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے ۱ یہ نمونہ اس کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملنے اور قیامت کے آنے کی امید رکھتا ہے ۲ اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے ۳"

۱ اے مومنین! بے شک تمہاری راہنمائی کے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں خوبصورت نمونہ ہے (ا)۔ اسوہ کا معنی قدوہ (نمونہ)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 449 (الفکر)

(ا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود پر جھک کر کہا میں خوب جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے اگر میں نے اپنے محبوب ﷺ کو

ہے۔یعنی ایسا طریقہ جس کی اقتداء کی جاتی ہو۔یہاں مراد یہ ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ایسے حسین و جمیل خصائل موجود ہیں جو یہ حق رکھتے ہیں کہ ان کی اتباع و پیروی کی جائے جیسے جنگ میں ثابت قدمی کا مظاہرہ فرمانا اور شدائد و مصائب کو برداشت کرنا وغیرہ۔یا معنی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمہارے لیے ایک نمونہ ہیں ان کی پیروی انتہائی مستحسن ہے۔اور یہ مفہوم اس قول کی طرح ہے "فی البیضۃ عشرون منًا حدید" یعنی خود میں بیس سیر کی مقدار لوہا ہے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُسوۃ فُعلَۃ کے وزن پر ایتساء سے ماخوذ ہے۔جیسا کہ قُدْوَۃ اقتداء سے ماخوذ ہے۔یہ اسم ہے جسے مصدر کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔یعنی تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اچھا طریقہ اپنانا لازم ہے۔یعنی تم بھی ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے دین کی معاونت کرو جیسے وہ کرتے رہے۔اور جو تکلیف اور مصیبت تمہیں پہنچے اس پر ایسے ہی صبر کرو جیسے وہ صبر کرتے رہے جبکہ ان کے دنداں مبارک جنگ میں شہید ہوئے، چہرہ مبارک زخمی ہوا، آپ کے چچا شہید ہوئے اور علاوہ ازیں انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں مگر انہوں نے اپنی ذات میں یہ سب برداشت کرتے ہوئے تمہارے ساتھ غم خواری اور ہمدردی کا سلوک کیا۔اسی لیے تم ایسے ہی صبر کا مظاہرہ کرو اور آپ ﷺ کی سنت پر ہی عمل پیرا رہو۔(1)

۲۔ یعنی یہ اس کے لیے اسوہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ثواب کے حصول، اس کی ملاقات اور دیگر اخروی نعمتوں کا آرزومند ہے۔حضرت ابن عباسؓ نے اسی طرح بیان فرمایا ہے۔یا معنی یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ایام خصوصاً یوم آخرت کی امید رکھتا ہے۔یہ مفہوم عربوں کے اس قول کی مثل ہے۔ارجو زیدا وفضله میں زید خصوصاً اس کی مہربانی کا امیدوار ہوں۔اور مقاتل نے کہا ہے کہ معنی یہ ہے اس کے لیے (اسوہ ہے) جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اس یوم بعث سے ڈرتا ہے جس میں اعمال کی جزاء دی جائے گی(2)۔قول باری تعالیٰ لِمَنْ كَانَ ترکیب کلام میں حسنۃ کا صلہ ہے یا اس کی صفت ہے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لَكُمْ سے بدل ہے اور اکثر کا نظریہ یہ ہے کہ ضمیر مخاطب سے بدل نہیں بنایا جا سکتا۔

۳۔ اور خوشی اور تکلیف کی حالت میں کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے۔یہاں رجا (امید) کو کثرت ذکر سے ملایا گیا ہے جو کہ دائمی طاعت و فرمانبرداری تک پہنچانے والا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء و پیروی کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جو اس طرح ہو (یعنی جو ثواب کا امیدوار بھی ہو اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے والا بھی ہو۔)

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾

"(منافقین کا حال آپ پڑھ چکے) جب ایمان والوں نے (کفار کے) لشکروں کو دیکھا تو (فرط جوش) سے پکار اٹھے کہ یہ ہے وہ لشکر جن کا وعدہ ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا۱ اور سچ فرمایا تھا اللہ اور اس کے رسول نے اور دشمن

تجھے بوسہ دیتے اور چومتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے نہ چومتا اور نہ بوسہ دیتا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ حضرت یعلی بن منبہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ طواف کیا تو جب میں اس رکن کے پاس پہنچا جو اس دروازے کے قریب ہے جو حجر سے متصل ہے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا تاکہ وہ بھی چوم لیں۔اس وقت آپ نے فرمایا کیا تو نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں طواف نہیں کیا۔میں نے کہا کیوں نہیں۔تو انہوں نے کہا کیا تو نے رسول اللہ ﷺ کو اسے چومتے دیکھا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔تو انہوں نے کہا پھر اسے اپنے سے دور کر کیونکہ تیرے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں اچھا نمونہ ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 450 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 450 (الفکر)

کے لشکر جرار نے ان کے ایمان اور جذبہ تسلیم میں اور اضافہ کر دیا[2]۔“

[1] اس میں وعدہ سے اشارہ اس ارشاد کی طرف ہے جو سورۂ بقرہ میں ہے اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۚ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۗ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ کیونکہ یہ آیت اس مفہوم کو متضمن ہے کہ اہل ایمان کو بہت زیادہ تکلیفیں اور مصیبتیں پہنچیں گی (مگر آخر کار اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ کی مدد قریب ہے)۔ شاید رسول اللہ ﷺ نے اہل ایمان کو جنگ احزاب کی خبر اس کے واقع ہونے سے پہلے ہی دے دی تھی۔

[2] اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا تھا جس کے بارے انہوں نے خبر دی تھی۔ اور دشمن کے لشکر جرار نے ان کے ایمان اور جذبہ تسلیم میں اور اضافہ کر دیا۔ یہاں ایمان سے مراد اس شے کی تصدیق ہے جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے اور تسلیم سے مراد اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کی تقدیر کے سامنے سر جھکا دینا ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

”اہل ایمان میں ایسے جواں مرد ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا[1] ان جواں مردوں سے کچھ تو اپنی نذر پوری کر چکے[2] اور بعض (اس ساعت سعید کا) انتظار کر رہے ہیں (جنگ کے مہیب خطرات کے باوجود) ان کے رویہ میں ذرا تبدیلی نہیں ہوئی[3]۔“

[1] یعنی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کر دیا کہ وہ آپ ﷺ کی معیت میں دشمنان دین کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے ثابت قدم رہیں گے۔ آیت طیبہ میں صَدَقُوْا اس قول کا ہم معنی ہے کہ جب کوئی تجھ سے سچ بولے تو کہے گا صَدَقَنِيْ (اس نے میرے ساتھ سچ بولا) تو چونکہ وعدہ کرنے والا جب اپنا وعدہ وفا کر دیتا ہے تو وہ اسے سچا ثابت کر دیتا ہے۔ (اسی لیے یہاں وعدہ وفا کرنے والے اہل ایمان کے بارے فرمایا صَدَقُوْا)۔

[2] پس ان جواں مردوں میں سے کچھ تو اپنی نذر پوری کر چکے اور انہوں نے اپنا وعدہ وفا کر دیا۔ پس جو وعدہ انہوں نے کیا تھا اس میں سے کوئی شے بھی ان کے ذمہ باقی نہیں رہی، یعنی انہوں نے جہاد اور اطاعت پر صبر کئے رکھا یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے یا فوت ہو گئے۔ نحب کا معنی نذر بھی ہے اور موت بھی۔ مثلاً کہا جاتا ہے قضٰی نحبه ای اجله (وہ اپنی زندگی کی مدت پوری کر چکا) پس اسے شہید کر دیا گیا جیسے حضرت حمزہ وغیرہ تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے قضٰی نحبه، یعنی اس نے اپنا عہد پورا کرنے کے لیے اپنی ساری جدوجہد صرف کر دی۔ یہ مفہوم عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے نَحِبَ فُلَانٌ فِيْ مَيْسِرَةٍ يَوْمِهٖ وَلَيْلَتِهٖ (فلاں نے رات دن چلنے میں اپنی مکمل طاقت اور کوشش صرف کر دی)۔

[3] اور بعض اس ساعت سعید کا انتظار کر رہے ہیں جس میں وہ اپنی نذر پوری کر سکیں اور وہ اس کے آرزومند ہیں کہ ان کی موت ایفائے عہد پر ہو۔ (جنگ کے مہیب خطرات کے باوجود) انہوں نے عہد کو تبدیل نہیں کیا بلکہ ذرہ بھر بھی رویہ میں تغیر نہیں ہونے دیا۔ شیخین، ترمذی، ابن ابی شیبہ، طیالسی، ابن سعد اور بغوی نے حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ان کے چچا حضرت انس بن نضر ؓ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اس کا انہیں بہت قلق تھا۔ انہوں نے کہا یہ پہلی جنگ تھی جس میں رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس

تشریف لے گئے لیکن میں وہاں غیر حاضر تھا۔ اگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ساتھ لڑنے کا موقع فراہم کیا تو وہ دیکھ لے گا میں کیسی جرأت کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ پس جب غزوۂ احد کے دن مسلمانوں پر ناکامی کے آثار ظاہر ہوئے تو حضرت انس بن نضر نے رب کریم کی بارگاہ میں عرض کی اے اللہ! جو کچھ ان صحابہ کرام نے کیا میں تیری بارگاہ میں اس پر معذرت خواہ ہوں اور جو کچھ ان مشرکین نے کیا میں اس سے تیری بارگاہ میں اپنی برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ پھر وہ مہاجرین وانصار میں سے ان لوگوں کے پاس گئے جو اپنے ہاتھوں سے ہتھیار پھینک چکے تھے۔ انہیں جا کر کہا کون سی شے ہے جس نے تمہیں بٹھا دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا رسول اللہ ﷺ تو شہید ہو چکے ہیں (لڑنے کا کیا فائدہ ہے؟) تو حضرت انس بن نضر نے انہیں کہا حضور نبی کریم ﷺ کی شہادت کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے اٹھو اور اس دین کی خاطر جانیں قربان کر دو جس پر رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے۔ پھر وہ دشمن قوم کی طرف بڑھ گئے تو احد کے قریب حضرت سعد بن معاذؓ سے ملاقات ہو گئی۔ تو انہوں نے کہا میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ حضرت سعد فرماتے ہیں حضرت انسؓ دشمن کی طرف آگے بڑھتے گئے اور انہوں نے ایسی جرأت کا مظاہرہ کیا جس کی میں طاقت نہیں رکھتا۔ پھر انہوں نے کہا اے سعد! (اور ایک روایت میں الفاظ ہیں اے ابا عمرو) یہ جنت کی ہوا ہے، رب نضر کی قسم میں احد کے قریب جنت کی خوشبو پا رہا ہوں پھر دشمن کی صفوں میں داخل ہو گئے اور مردانہ وار لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر لیا۔ آپ کو اس حال میں پایا گیا کہ آپ کے جسم پر تلواروں، نیزوں اور تیروں کے اسی سے زائد زخم لگے ہوئے تھے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مشرکین نے آپ کا مثلہ کر دیا اور آپ کی پہچان فقط آپ کی ہمشیرہ شامہ نے انگلیوں کے پوروں سے کی تھی۔ اس لیے ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ آیت کریمہ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ۔ حضرت انس بن نضرؓ اور آپ جیسے دیگر لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت حباب بن ارتؓ سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ہجرت کی۔ اور ہم میں سے کچھ ایسے لوگ تھے جو جلدی ہی اس دنیا سے چل بسے اور انہوں نے اپنی محنت و کاوش کا کوئی پھل یہاں نہیں کھایا۔ انہی میں سے ایک حضرت مصعب بن عمیرؓ تھے جو غزوۂ احد میں شہید ہوئے۔ ہم نے انہیں کفن دینے کے لیے سوائے ایک کمبل کے اور کوئی کپڑا نہیں پایا۔ جب وہ ان کے سر پر رکھتے تو پاؤں اس سے باہر نکل جاتے اور جب ان کے پاؤں ڈھانپتے تو سر ننگا ہو جاتا۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کمبل سے ان کا سر ڈھانپ دو اور پاؤں کی جانب اذخر گھاس رکھ لو۔ اور کچھ لوگ تھے جن کی مساعی کا پھل پکا اور وہ اسے (دنیا میں ہی) کھا رہے ہیں(2)۔ ترمذی نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ کی طرف دیکھا تو ارشاد فرمایا جو کوئی ایسے آدمی کی طرف دیکھنا پسند کرتا ہے جو چہرہ زمین پر اس حال میں چل رہا ہے کہ وہ اپنی نذر پوری کر چکا ہے (اور وعدہ وفا کر چکا ہے)(ا) تو وہ اس کی طرف دیکھ لے(3)۔ امام بخاریؒ نے قیس بن حازم سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے حضرت طلحہؓ کا شل ہاتھ دیکھا جس کے ساتھ وہ غزوۂ احد کے دن حضور نبی کریم ﷺ کی حفاظت کرتے رہے(4)۔ ترمذی، ابن حبان اور حاکم وغیرہم نے یہ حضرت زبیرؓ کی مرفوع حدیث سے حضرت طلحہؓ کے لیے ثابت کیا ہے۔(5)

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 151 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 204 (التجاریۃ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 215 (وزارت تعلیم) 4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 561 (وزارت تعلیم)
5۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 215 (وزارت تعلیم)

(ا) حضرت عیسیٰ بن طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور عائشہ بنت طلحہ کے پاس آیا۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾

''(اذن جہاد میں ایک حکمت یہ بھی ہے) کہ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اپنا وعدہ سچا کرنے والوں کو ان کے سچ کے باعث ۱؎ اور عذاب دے منافقوں کو اگر اس کی مرضی ہو یا ان کی توبہ قبول فرمالے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۲؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اپنا وعدہ سچا کرنے والوں کو ان کی سچائی کی جزاء عطا فرمائے یا ان کی سچائی کے سبب جزائے خیر عطا فرمائے یہاں صدق سے مراد ایفائے عہد ہے۔

۲؎ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ ان منافقین کی موت کفر اور نفاق پر ہی ہو تو اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دے گا۔ یا اگر چاہے کہ وہ توبہ کرلیں اور اس کے دین کے لیے مخلص ہو جائیں (تو پھر انہیں توبہ کی توفیق عطا فرمادے)۔ ترکیب کلام میں لِيَجْزِيَ قول باری تعالیٰ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ کے متعلق ہے۔ یہ منطوق کلام کی علت ہے اور اس کے ساتھ بیان یہ کیا گیا ہے کہ جس طرح مخلصین نے ایفائے عہد سے ثواب کا قصد کیا ہے اسی طرح منافقین نے وعدہ توڑنے سے عذاب کا ارادہ کیا ہے۔

وَ رَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿۲۵﴾

''اور (ناکام) لوٹا دیا اللہ تعالیٰ نے کفار کو درآنحالیکہ اپنے غصہ میں (پیچ وتاب کھارہے) تھے (اس لشکر کشی سے) انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا ۱؎ اور بچالیا اللہ نے مومنوں کو جنگ سے اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور، ہر چیز پر غالب ہے ۲؎''

۱؎ اور اللہ تعالیٰ نے کفار یعنی قریش اور غطفان کے جتھوں کو (ناکام) لوٹا دیا اس حال میں کہ انہوں نے جو ارادہ کیا تھا اسے نہ پانے کے سبب وہ غصے میں پیچ وتاب کھا رہے تھے۔ اس لشکر کشی سے انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا، یعنی نہ تو کامیابی ہوئی اور نہ ہی مال ہاتھ آیا۔ ترکیب کلام میں یہ ایک حال کے بعد دوسرا حال ہے۔ یا تو یہ حال متداخل ہے یا پھر اس کے پیچھے دوسرا حال ہے۔

۲؎ اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ہوا اور ملائکہ کے سبب جنگ سے بچالیا۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور، ہر چیز پر غالب ہے۔ یعنی وہ اپنے ملک میں وہ کچھ کرنے کی طاقت رکھتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے اور وہ (مشرکین) سے انتقام لینے میں غالب ہے۔

وَ اَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَ قَذَفَ فِيْ

(گزشتہ سے پیوستہ)

میری بہن عائشہ بنت طلحہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کو کہنے لگی میں تجھ سے بہتر ہوں اور میرا باپ تیرے باپ سے بہتر ہے۔ پس حضرت اسماء نے اسے برا بھلا کہنا شروع کردیا اور کہنے لگیں تو مجھ سے بہتر ہے۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کیا میں تم دونوں کا فیصلہ نہ کردوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں تو پھر انہوں نے فرمایا: ایک بار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا اَنْتَ عَتِيْقٌ مِنَ النَّارِ (تو جہنم کی آگ سے آزاد ہے)۔ پس اس دن سے آپ کا لقب عتیق پڑ گیا۔ اس کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنْتَ يَا طَلْحَةُ مِمَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ (اے طلحہ تو ان میں سے ہے جو اپنی نذر پوری کرچکے ہیں)۔ ترمذی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ طلحہ ان میں سے ہے جو اپنی نذر پوری کرچکے ہیں۔

قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿۲۶﴾

''اہل کتاب سے جن لوگوں نے کفار کی امداد کی تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قلعوں سے اتار دیا[1] اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور ایک گروہ کو تم قیدی بنا رہے ہو[2]''

[1] اور اللہ تعالیٰ نے انہیں نیچے اتار لیا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف قریش اور غطفان کے جتھوں کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ آیت میں اَهْلِ الْكِتٰبِ سے مراد بنی قریظہ ہیں۔ ''صَيَاصِيْهِمْ'' یہ صیعۃ کی جمع ہے اور اس سے مراد ایسا قلعہ ہے جس کے ذریعہ حفاظت کی جا سکتی ہو۔ اسی لیے بیل اور ہرن کے سینگ، مرغ کا کانٹا (چھری) اور جولاہے کے تانا بانا برابر کرنے والے آلہ کو بھی صیصہ کہا جاتا ہے۔

[2] ابن اسحاق کے نزدیک قتل کیے جانے والے مردوں کی تعداد چھ سو تھی اور ابو عمرو نے بھی سعد بن معاذ کے حالات پر بھی اسی قول پر اعتماد کیا ہے۔ اور ابن عائذ نے قتادہ کے مرسل قول نقل کیا ہے کہ مردوں کی تعداد سات سو تھی۔ اور سہیلی نے کہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد بیان کرنے والوں نے آٹھ سو سے لے کر نو سو تک تعداد ذکر کی ہے۔ لیکن ترمذی، نسائی اور ابن حبان نے صحیح سند کے ساتھ جابرؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ ان کی تعداد چار سو تھی۔ اور یہ جنگجو تھے لہٰذا تطبیق کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ چار سو جنگجو تھے اور بقیہ ان کے تابع تھے۔ اور ابن اسحاق نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ان کی تعداد نو سو بھی ذکر کی گئی ہے۔ اور وہ عورتیں اور بچے جنہیں قیدی بنایا گیا۔ ان کی تعداد سات سو پچاس تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ ان کی تعداد نو سو تھی (1)۔ اور سبیل الرشاد میں مذکور ہے کہ ایک ہزار عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا گیا۔

وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِيَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۚ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا ﴿۲۷﴾

''اور اس نے وارث بنا دیا تمہیں ان کی زمینوں اور ان کے مکانوں اور ان کے مال و متاع کا اور وہ ملک بھی تمہیں دے دیے جہاں تمہارے قدم ابھی نہیں پہنچے اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے[1]''

[1] اور اس نے تمہیں ان کی زمینوں یعنی کھیتوں کا، ان کے قلعوں، ان کے مال و متاع کا یعنی نقود (دراہم و دنانیر وغیرہ) اجناس (زمینوں سے حاصل ہونے والی پیداوار) اور مویشیوں کا وارث بنا دیا اور وہ ملک بھی تمہیں عطا فرما دیے جہاں تمہارے قدم ابھی نہیں پہنچے تھے۔ مقاتل اور ابن زید نے کہا ہے کہ اس سے مراد خیبر کی زمین ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد سرزمین مکہ ہے۔ حسن نے فارس اور روم مراد لیے ہیں جبکہ عکرمہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ ساری زمین ہے جو قیامت تک فتح کی جائے گی۔ (2)

غزوۂ بنی قریظہ کا واقعہ: محمد بن عمر نے اپنے شیوخ سے نقل کیا ہے کہ جب مشرکین غزوۂ خندق سے واپس چلے گئے تو بنو قریظہ کو شدید خوف لاحق ہو گیا (3)۔ امام احمدؒ اور شیخین نے مختصراً، بیہقی اور حاکم نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے تفصیلاً نقل کیا ہے اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، ابو نعیم اور بیہقی نے آپ ہی سے ایک دوسری سند سے، ابن عابد نے حمید بن ہلال سے، ابن جریر نے

1۔ سیرت ابن ہشام، جلد 4 صفحہ 93 (الخیریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 458 (الفکر) 3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 3 (العلمیہ)

ابن ابی اوفی سے، بیہقی نے عروہ سے، ابن سعد نے ماجشون اور یزید بن اصم سے اور محمد بن عمر نے اپنے شیوخ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان جب غزوۂ خندق سے واپس لوٹے تو بہت تھکے ہوئے تھے۔ لہٰذا آتے ہی ہتھیار کھول دیے اور حضور نبی کریم ﷺ حجرہ عائشہ صدیقہ میں تشریف لے گئے۔ پانی طلب فرمایا اور سر مبارک دھونا شروع کیا(1)۔ اور علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ حضرت زینب بنت جحشؓ کے پاس تشریف فرما تھے۔ وہ آپ ﷺ کا سر مبارک دھو رہی تھیں اور ابھی تک صرف ایک طرف سے دھویا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں ہم گھر میں ہی تھے کہ ایک آدمی نے ہمیں سلام کیا(2)۔ محمد بن عمر نے کہا ہے کہ وہ آدمی جنازے رکھنے کی جگہ کھڑا ہوا اور پکار کر کہا۔ تمہارا کیا عذر ہے کہ ہتھیار کھول دیے ہیں۔؟ پس رسول اللہ ﷺ گھبرا کر اٹھے اور انتہائی تیزی سے اچھلتے ہوئے اس کی طرف تشریف لے گئے۔ میں بھی آپ ﷺ کے پیچھے اٹھی اور دروازے کے سوراخوں سے دیکھا کہ وہ حضرت دحیہ کلبی ہیں میں نے انہیں دیکھا کہ وہ اپنے سر سے گرد و غبار جھاڑ رہے ہیں (اور ابن اسحاق نے کہا ہے کہ وہ آدمی عمامہ شریف باندھے ہوئے تھا۔) اس نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ آپ نے کتنے جلد ہتھیار کھول دیے ہیں، آپ کا کیا عذر تھا؟ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے تم نے تو ہتھیار اتار دیے ہیں۔ لیکن ملائکہ نے تو اس وقت سے ہتھیار نہیں اتارے جب سے دشمن نے یلغار کی ہے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ چالیس راتوں سے ملائکہ نے ہتھیار نہیں کھولے۔ اور ابھی ہم دشمن کے تعاقب سے واپس لوٹ رہے ہیں۔ ہم نے ان جتھوں کو صحرا الاسد تک پہنچا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھگا دیا ہے اور آپ کو بنی قریظہ کے قتال کا حکم دیا ہے۔ اور میں اپنے ساتھی ملائکہ کو لے کر انہی کی طرف جا رہا ہوں تاکہ ان کے قلعوں میں زلزلہ برپا کر دوں لہٰذا آپ بھی لوگوں کو لے کر آئیے(3)۔ حمید بن ہلال نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک میرے صحابہ کرام سخت تھکے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اگر تم انہیں چند روز کی مہلت دو (تو بہتر ہے) لیکن انہوں نے کہا آپ ان کی جانب تشریف لے تو جائیں قسم بخدا میں انہیں ایسے ریزہ ریزہ کر دوں گا جیسے کوئی انڈہ پتھر پر دے مارا جائے۔ پھر میں ان کے قلعوں کو ہلا کر رکھ دوں گا۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ واپس اندر تشریف لے آئے تو میں نے پوچھا وہ آدمی کون تھا جس سے آپ محو گفتگو تھے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے بھی اسے دیکھا ہے؟ میں نے عرض کی جی ہاں۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا تو نے اسے کس کے مشابہ پایا؟ میں نے عرض کی دحیہ کلبی کے۔ اس وقت حضور نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا وہ جبرائیل علیہ السلام ہیں انہوں نے مجھے بنی قریظہ کی طرف جانے کے لیے کہا ہے۔ حمید نے کہا ہے کہ پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام اور ان کے ساتھی فرشتے پیٹھ پھیر کر چلے گئے یہاں تک کہ انصار کے قبیلہ بنی غنم کی گلیوں میں غبار اڑنے لگا۔ بخاری کی روایت میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں گویا کہ میں وہ غبار اڑتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اور ابن عابد نے حضرت قتادہؓ کی روایت نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس دن منادی کو بھیجا کہ وہ یہ آواز لگائے یا خیل اللّٰہ ارکبی (اے شہسوارو! اپنے گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ) اور حضرت بلالؓ کو حکم ارشاد فرمایا تو انہوں نے لوگوں کو آواز دی کہ جو بھی مطیع و فرمانبردار آواز سن رہا ہے وہ بجز ورعصر کی نماز بنی قریظہ میں جا کر ادا کرے۔ شیخین نے حضرت ابن عمرؓ، بیہقی نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ اور ابن عقبہ اور طبرانی نے کعب بن مالکؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو ارشاد فرمایا میں تمہیں

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 3 (العلمیہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 453 (الفکر)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 3 (العلمیہ)

قسم دیتا ہوں کہ تم (بنی قریظہ پہنچنے سے پہلے) عصر کی نماز ادا نہ کرنا۔ اور مسلم شریف میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ ظہر کی نماز بنی قریظہ میں ادا کرنا۔ چنانچہ بعض صحابہ کرام نے عصر کی نماز (یا دوسری روایت کے الفاظ کے مطابق ظہر کی نماز) کا وقت راستے میں ہی پالیا۔ تو اس وقت بعض نے کہا کہ ہم تو نماز بنی قریظہ میں ہی پہنچ کر ادا کریں گے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں قسم دے رکھی ہے۔ اور ہم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ لہٰذا جب وہ بنی قریظہ پہنچے تو انہوں نے غروب آفتاب کے بعد عصر کی نماز ادا کی اور بعض نے یہ کہا کہ ہم تو نماز پڑھ لیں گے کیونکہ آپ ﷺ نے ہمیں نماز چھوڑنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا۔ پس انہوں نے نماز پڑھ لی۔ پھر اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کیا گیا تو آپ ﷺ نے دونوں فریقوں میں سے کسی کو بھی عتاب نہیں فرمایا۔(1)

فائدہ: نماز ظہر اور عصر کی حدیثوں کے درمیان وجہ تطبیق یہ ہے کہ ان میں سے ایک طائفہ پہلے چلا اور دوسرا گروہ بعد میں روانہ ہوا۔ پہلے طائفہ کو یہ کہا گیا کہ وہ ظہر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچ کر ادا کریں اور دوسرے طائفہ کو عصر کی نماز کے بارے یہی کہا گیا۔ یہ قول بھی ہے کہ وجہ تطبیق یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے طاقتور یا وہ افراد جن کے گھر قریب تھے۔ انہیں یہ ارشاد فرمایا کہ وہ ظہر کی نماز بنی قریظہ میں جا کر ادا کریں اور ان کے سوا کو عصر کی نماز کا حکم دیا۔

مسئلہ: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر مجتہد سے اجتہاد کرتے وقت خطا سرزد ہو جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں فریقوں میں سے جنہوں نے راستے میں نماز ادا کی اور جنہوں نے نہیں پڑھی کسی کو بھی عتاب نہیں فرمایا۔ زادالمعاد میں ہے کہ دونوں فریقوں میں سے ہر ایک قصد اور ارادے کی وجہ سے اجر کا مستحق ہو گیا مگر جنہوں نے راستے میں نماز ادا کی وہ دو فضیلتوں کے مستحق ہوئے۔ ایک بروقت نماز ادا کرنے کی فضیلت اور دوسری فضیلت یہ کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں بنی قریظہ کی طرف جانے میں جلدی کی۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ کے حکم کا مقصود بھی یہی تھا کہ وہ بنی قریظہ میں پہنچ کر ہی نماز ادا کریں۔ اسے مجازاً مراد یہی تھی کہ حکم کی تعمیل میں تیزی کی جائے۔ واللہ اعلم۔

حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ کو بلایا اور انہیں اپنا علم عطا فرمایا۔ علم ابھی تک اپنی پہلی حالت پر ہی تھا۔ غزوہ خندق سے واپس لوٹنے پر ابھی تک کھولا بھی نہیں گیا تھا کہ اتنے میں لوگ تیزی سے ادھر روانہ ہو گئے۔ محمد بن عمرو بن سعد، ابن ہشام اور بلاذری نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو مدینہ طیبہ کا عامل مقرر فرمایا(2)۔ محمد بن عمرو نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تیئیس ذی قعدہ کو مدینہ طیبہ سے بنی قریظہ کی طرف تشریف لے گئے(3)۔ علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ 5ھ میں پیش آیا(4)۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ہتھیار سجائے، زرہ پہنی، خود سر پر رکھا، نیزہ دست مبارک میں پکڑا، ڈھال لٹکائی اور اپنے لحیف گھوڑے پر سوار ہوئے۔ صحابہ کرام آپ ﷺ کے گرد جمع ہوئے۔ وہ بھی ہتھیار سجا کر گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان میں شہسواروں کی تعداد چھتیس تھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے جلو میں بنی قریظہ کی جانب چلے۔ آپ ﷺ کے اردگرد شہسواروں اور پیادوں کا ایک ہجوم تھا۔ ابن سعد کا قول ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ چلنے والوں کی تعداد تین ہزار تھی۔

مسئلہ: یہ واقعہ تو اس پر دلالت کرتا ہے اشہر حرام میں جنگ کا آغاز کرنا جائز ہے لیکن اس کے بعد حضور نبی کریم ﷺ نے خطبہ حجۃ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 4 (العلمیۃ)
2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 5 (العلمیۃ)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 5 (العلمیۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 458 (الفکر)

الوداع میں اشہر حرام میں جنگ کرنے سے منع فرمادیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کے لیے اس بار اشہر حرام میں جنگ کرنا اسی طرح مباح فرمادیا ہو جیسا کہ فتح مکہ کے دن حرم پاک میں دن کے مخصوص وقت میں جنگ کی اجازت عطا فرمادی تھی۔ اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اس جنگ کا آغاز حضور نبی کریم ﷺ کی جانب سے نہ ہوا ہو بلکہ اس کی ابتدا بنی قریظہ کی طرف سے ہوئی جیسا کہ ان کی طرف سے قریش اور ان کی ساتھیوں کی مدد کرنے سے صاف ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔ طبرانی نے ابورافع اور ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بنی قریظہ کی طرف تشریف لائے تو آپ ﷺ کی پشت والے گدھے پر سوار تھے جس کا نام یعفور رکھا اور لوگ آپ ﷺ کے اردگرد جمع تھے (1)۔ حاکم، بیہقی اور ابونعیم نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے، محمد بن عمرو نے اپنے شیوخ سے، اور ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گذر صورین کے مقام سے بنی نجار کے ایک گروہ کے پاس سے ہوا۔ ان میں حارثہ بن نعمان بھی تھے۔ وہ سب ہتھیار سجائے صف بستہ کھڑے تھے تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کیا تمہارے پاس سے کوئی گزرا ہے۔ انہوں نے عرض کی جی ہاں دحیہ کلبی ادھر سے گزرے ہیں۔ وہ ایک خچر پر سوار تھے اور اس پر ریشمی زین پڑی ہوئی تھی۔ اور انہوں نے ہمیں بھی ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا۔ چنانچہ ہم نے بھی ہتھیار اٹھا لیے اور صف بستہ ہو گئے۔ اور انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ ابھی ابھی رسول اللہ ﷺ بھی تمہارے پاس تشریف لانے والے ہیں۔ حارثہ بن نعمان نے کہا ہم دو صفیں بنائے ہوئے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ جبرائیل امین تھے جنہیں بنی قریظہ کی طرف بھیجا گیا ہے تاکہ وہ ان کے قلعوں میں زلزلہ برپا کر دیں اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیں اور حضرت علی بن ابی طالبؓ مہاجرین وانصار کے ایک گروہ کے ساتھ آگے چلے گئے اور انہی میں حضرت ابوقتادہؓ بھی تھے (2)۔ محمد بن عمر نے حضرت ابوقتادہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب ہم بنی قریظہ کے پاس پہنچے تو ہم نے انہیں دیکھا اور یہ خیال کیا کہ ان لوگوں کو جنگ کا یقین ہو چکا ہے۔ حضرت علیؓ نے قلعہ کے پاس علم گاڑ دیا۔ پس جونہی انہوں نے ہمیں اپنے قلعوں کے اندر سے دیکھا تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کی ازواج مطہرات کے بارے نازیبا غلیظ الفاظ استعمال کرنے لگے۔ ابوقتادہ کہتے ہیں کہ ہم نے خاموشی اختیار کی اور صرف اتنا کہا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ تلوار کرے گی۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ بھی تشریف فرما ہو گئے اور آپ ﷺ نے بھی ان کے قلع کے قریب بنی قریظہ کے پتھریلے میدان کی نچلی جانب بئر انا کے پاس نزول فرمایا۔ پس جب حضرت علیؓ نے آپ ﷺ کو دیکھا۔ تو انہوں نے مجھے علم تھامنے کو کہا۔ چنانچہ میں نے اسے پکڑ لیا۔ حضرت علیؓ کو یہ پسند نہ تھا کہ آقادو جہاں ﷺ ان کی جانب سے اذیت ناک اور نازیبا الفاظ سنیں۔ اس لیے انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ ان خبیثوں کے قریب آنا آپ پر لازم نہیں (یعنی اگر آپ ان کے قریب نہ بھی آئیں تو یہ باعث حرج نہیں)۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تو مجھے واپس لوٹنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا میرا خیال ہے تم نے ان سے اذیت ناک الفاظ سنے ہیں۔ حضرت علیؓ نے عرض کی جی ہاں (ایسے ہی ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو وہ قطعاً ایسے الفاظ نہ کہتے۔ پس رسول اللہ ﷺ ان کی طرف چلے اور آپ کے آگے آگے حضرت اسید بن حضیرؓ تھے۔ تو انہوں نے کہا اے دشمنان خدا! ہم تمہارے قلعوں کے پاس سے نہیں جائیں گے یہاں تک کہ تم بھوک سے مر جاؤ گے تم اس لومڑی کی مثل ہو جو اپنی بل میں چھپی ہو۔ تو انہوں نے جواب میں کہا اے ابن حضیر! ہم تو خزرج کے مقابلے میں تمہارے حلیف اور دوست تھے۔ تو آپؓ نے فرمایا اب میرے اور

تمہارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں اور نہ ہی کوئی دوستی ہے۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ قریب آ گئے اور ہم تو آپ ﷺ کے بارے میں کچھ خوف زدہ تھے لیکن آپ ﷺ نے انتہائی بلند آواز سے ان کے سرداروں کو بلایا یہاں تک کہ آپ ﷺ نے انہیں اپنی آواز سنوا لی۔ آپ نے فرمایا مجھے جواب دو اے بندروں اور خنزیروں کے بھائیو! اے شیطانوں کی پوجا کرنے والو! کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذلیل وخوار اور رسوا کر دیا ہے؟ کیا اس نے تم پر اپنا عذاب نازل کر دیا ہے؟ کیا تم میرے بارے میں غلیظ الفاظ استعمال کرتے ہو؟ تو وہ وہیں سے قسمیں اٹھا اٹھا کر کہنے لگے ہم نے تو ایسا نہیں کیا اور کہنے لگے اے ابو القاسم! آپ تو جاہل نہیں ہیں۔ اور ایک روایت میں الفاظ ہیں آپ تو فحش گو نہیں ہیں۔ شام کے وقت مسلمان رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے اور حضرت سعد بن عبادہؓ نے آپ ﷺ کے لیے کچھ کھجوروں کے ٹوکرے بھیج دیئے۔ اس دن تمام کا کھانا یہ کھجوریں تھیں۔ حضور نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کھجوریں بہت اچھا کھانا ہے۔ پھر آپ ﷺ سحری کے وقت اٹھے تیر اندازوں کو آگے بھیجا، انہوں نے یہودیوں کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا اور ان پر پتھر اور تیر برسانے شروع کر دیئے وہ بھی اپنے قلعوں کے اندر سے جواباً تیر اور پتھر پھینکتے رہے یہاں تک کہ شام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حضور ﷺ کے جانبازوں نے رات بھر قلعوں کا محاصرہ جاری رکھا وہ بدل بدل کر اپنا فرض ادا کرتے رہے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں تیر اندازی کا عمل مسلسل جاری رکھا حتیٰ کہ یہودیوں کو اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا اور انہوں نے مسلمانوں پر تیر چھوڑنا بند کر دیئے اور یہ کہنے لگے تم ہمیں موقع فراہم کرو، ہم تمہارے ساتھ گفتگو کریں گے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی اس پیشکش کو مان لیا۔ چنانچہ انہوں نے نباش بن قیس کو نیچے اتارا۔ تو اس نے آپ ﷺ سے یہ بات کی کہ ہم بنو نضیر کی شرط کے مطابق ہی نیچے اتر آئیں گے، یعنی اپنا تمام تر مال ومتاع اور اسلحہ ساتھ لیں گے اور اپنے بچوں اور عورتوں کو ساتھ لے کر تمہارے شہر سے نکل جائیں گے۔ اور اسلحہ کے علاوہ جو سامان اونٹوں پر لاد سکے وہ ساتھ لے جائیں گے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے یہ شرط تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے یہ کہا کہ آپ ہماری جانیں محفوظ رہنے دیں، ہماری عورتیں اور بچے ہمارے حوالے کر دیں اور پھر اونٹوں پر لدے ہوئے سامان کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ مگر آپ ﷺ اس شرط کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا اب تو میرے حکم اور فیصلے کے مطابق بلا شرط انہیں نیچے اترنا ہوگا۔ نباش یہ سن کر ان کی طرف واپس چلا گیا۔ اور ان کے پاس پہنچ کر مکمل گفتگو سے انہیں آگاہ کر دیا۔ اس وقت کعب بن اسد نے کہا اے گروہ بنی قریظہ! قسم بخدا! تم پر مصیبت نازل ہو چکی ہے جسے تم ملاحظہ کر رہے ہو۔ اب میں تم پر تین چیزیں پیش کرتا ہوں۔ ان میں سے جو چاہو اپنا لو۔ انہوں نے کہا وہ کیا ہیں؟ اس نے کہا پہلی بات یہ ہے کہ ہم اس آدمی کی بیعت کر لیں اور اسے سچا تسلیم کر لیں قسم بخدا! تم پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ نبی مرسل ہے۔ بے شک یہ وہی ہے جس کا ذکر تم اپنی کتاب میں پاتے ہو۔ پس اس کے سبب تمہاری جانیں، عورتیں اور مال ہر شے محفوظ ہو جانے گی قسم بخدا! تم یقیناً جانتے ہو کہ محمد (ﷺ) نبی ہیں۔ اور ہمارے لیے اس کو تسلیم کرنے سے صرف یہ مانع ہے کہ ہم ان کے عربی ہونے کے سبب اس سے حسد رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ نبی بنی اسرائیل میں سے نہیں ہے۔ لیکن اب تو اسے اللہ تعالیٰ نے بنا دیا ہے۔ اور میں بذات خود وعدہ خلافی اور معاہدہ توڑنے کو ناپسند کرتا تھا۔ لیکن یہ مصیبت اور نحوست اس بیٹھنے والے یعنی حیی بن اخطب کے سبب پڑی ہے۔ (حیی بن اخطب اس وقت ان کے پاس قلعہ میں موجود تھا۔ جب قریش اور غطفان کے جتھے واپس چلے گئے تو وہ کعب بن اسد کے ساتھ کیے گئے وعدے کے مطابق قلعہ میں واپس لوٹ آیا تھا)۔ کیا تمہیں یاد ہے جو ابن جواس نے تمہیں کہا تھا جبکہ تمہاری شراب، گدھے اور امارت

ختم کر دی گئی اور تمہیں شفاء (دوا) کھجور اور جو کے قریب کر دیا گیا؟۔ انہوں نے کہا وہ کیا تھا جو اس نے کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس بستی میں ایک نبی کا ظہور ہوگا اگر اس کے ظہور کے وقت میں زندہ ہوا، تو میں اس کی اتباع بھی کروں گا اور مدد بھی کروں گا۔ اور اگر اس کا ظہور میرے بعد ہو تو تم اس کے بارے کسی کے دھوکہ میں نہ آنا، بلکہ اس کی اتباع و پیروی کرنا اور اس کے مددگار اور دوست بن جانا تو اس طرح تمہارا ایمان دونوں کتابوں یعنی پہلی اور آخری پر ہو جائے گا۔ انہیں میری طرف سے سلام عرض کرنا اور یہ اطلاع کرنا کہ میں ان کی تصدیق کرتا ہوں۔ پھر کعب نے کہا آؤ ہم اس نبی کی بیعت کر لیں اور اسے سچا تسلیم کر لیں۔ لیکن اس کا جواب قوم نے اس طرح دیا کہ ہم تو کبھی بھی تورات کے حکم سے علیحدگی اختیار نہیں کریں گے اور نہ ہی ہم اسے کسی اور دین کے ساتھ تبدیل کریں گے۔ پھر کعب نے کہا اگر تم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو قتل کر دیں اور پھر تلواریں سونت کر محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں کی طرف خروج کریں اور ہم کوئی کسر نہ چھوڑیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور محمد (ﷺ) کے مابین فیصلہ کر دے۔ پس اس طرح اگر ہم ہلاک بھی ہو گئے تو ہم اپنے پیچھے کوئی ایسی چیز چھوڑ کر نہیں مریں گے جس کے بارے ہمیں کوئی خوف و اندیشہ ہو۔ اور اگر ہم غالب آ گئے تو مجھے اپنی عمر کی قسم ہم یقیناً عورتیں اور بچے پا لیں گے۔ تو قوم نے اس کا جواب یہ دیا۔ ہم تو اس مساکین کو قتل نہیں کریں گے کیونکہ ان کے بعد زندگی میں کوئی بھلائی اور لطف باقی نہیں رہے گا۔ پھر کعب نے کہا کہ اگر تم یہ بات بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو پھر آج کی رات ہفتے کی رات ہے اس رات میں محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی بالکل پر امن ہوں گے لہٰذا تم نیچے اترو اور محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب کو غفلت میں پا کر ان پر حملہ کر دو۔ (شاید ہم کامیاب ہو جائیں) تو قوم نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ کیا ہم اپنے یوم السبت کے تقدس کو پامال کر دیں۔ اور ہم اس میں ایسا عمل کریں جو ہم سے پہلے لوگوں نے نہیں کیا۔ کیا تو جانتا نہیں کہ جس نے بھی اس دن کا خیال نہیں رکھا اس کی گرفت کی گئی اور شکل مسخ کر دی گئی۔ یہ سن کر کعب نے کہا جب سے تم میں سے کسی کو اپنی ماں نے جنم دیا ہے اس وقت سے لے کر آج تک اس پر ایک رات بھی ایسی نہیں گزری کہ وہ بات پر یقین کرنے والا اور دانا ہو۔ سعیہ کے دونوں بیٹوں ثعلبہ اور اسید اور ان کے چچا کے بیٹے اسد بن عبید نے کہا (یہ لوگ بنی قریظہ اور بنی نضیر سے نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق بنی ھذیل کے ساتھ تھا اور کہیں اوپر سے ان کی نسبت بنی قریظہ اور بنی نضیر کے ساتھ ملتی تھی) اے گروہ بنو قریظہ! قسم بخدا! تم بالیقین جانتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ ہیں آپ کے اخلاق و کمالات اور حلیہ مبارک کا تذکرہ ہمارے سامنے ہمارے علماء بھی بیان کرتے رہے ہیں اور بنی نضیر کے علماء نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اور بنی نضیر کا یہ اول آدمی حی بن اخطب ابن ہیان سے خوب واقف ہے کہ وہ ہمارے نزدیک تمام لوگوں کی نسبت زیادہ سچ بولنے والا تھا۔ اس نے بھی اپنی موت کے وقت آپ (رسول اللہ ﷺ) کے اوصاف کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے یہی جواب دیا ہم قطعاً تورات سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ پس جب انہوں نے انہیں انکار کرتے دیکھا تو اس رات کی صبح کو نیچے اتر کر اسلام قبول کر لیا اور اپنی جانوں، اہل و عیال اور مال و متاع کو محفوظ و مامون کر لیا۔ عمرو بن سعد نے کہا اے گروہ یہود! تم جانتے ہو کہ تم نے محمد (ﷺ) کی مخالفت کی ہے اور تمہارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ طے پایا تھا اسے تم نے توڑ دیا ہے اور میں نہ معاہدہ کرنے میں شامل تھا اور نہ ہی اسے توڑنے میں شریک تھا۔ پس اگر تم نے انکار کر ہی دیا ہے تو اب یہودیت پر ثابت قدم ہو جاؤ اور جزیہ ادا کرو۔ قسم بخدا! میں یہ نہیں جانتا کہ وہ اسے قبول کریں گے یا نہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم عربوں کو جزیہ دینے کا اقرار نہیں کر سکتے کہ وہ ہم سے لیتے رہیں بلکہ اس سے تو قتل ہو جانا بہتر ہے۔ پس اس نے انہیں کہا میں تو

تم سے بری ہوں اور وہ اسی رات سعیہ کے دونوں بیٹوں کے ساتھ وہاں سے نکل گیا۔ جب اس کا گزر رسول اللہ ﷺ کے محافظوں سے ہوا۔ تو ان کے سردار محمد بن مسلمہ تھے۔ محمد بن مسلمہ نے کہا یہ کون ہے؟ اس نے کہا عمرو بن سعد۔ تو اس وقت محمد بن مسلمہ نے کہا اے اللہ! مجھے معزز ومحترم لوگوں کی سنگت سے محروم نہ کرنا اور پھر اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ وہ آگے بڑھا اور حضور نبی کرم ﷺ کی مسجد تک آ پہنچا۔ اس نے رات بسر کی یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ پس جب دوسرے دن صبح ہوئی تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اس وقت تک کہاں ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ آدمی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایفائے عہد کے سبب (اپنی گرفت سے) نجات عطا فرمادی ہے(1)۔ اہل مغازی نے لکھا ہے۔ کہ پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف یہ پیغام بھیجا کہ حضرت ابولبابہ کو ہماری طرف بھیجا جائے ہم اپنے امور کے بارے ان سے مشاورت چاہتے ہیں (حضرت ابولبابہؓ بنی عمرو بن عوف سے تعلق رکھتے تھے اور وہ قبیلہ اوس کے حلیف تھے)۔ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں ان کی طرف بھیج دیا۔ پس جونہی انہوں نے آپ کو دیکھا تو مرد احتراماً کھڑے ہوگئے اور عورتوں اور بچوں نے ان کے سامنے رونا شروع کردیا۔ پس ان کی کیفیت دیکھ کر حضرت ابولبابہ کا دل ان کے لیے نرم ہوگیا اور پسیج گیا۔ پھر انہوں نے آپ سے پوچھا اے ابولبابہ! کیا آپ مناسب خیال کرتے ہیں کہ ہم محمد (ﷺ) کے حکم پر نیچے اتر آئیں؟ تو اس پر آپ نے فرمایا جی ہاں۔ مگر ساتھ ہی اپنے ہاتھ سے حلق کی طرف اشارہ بھی کردیا اور اس سے مراد یہ تھی کہ تمہیں ذبح کردیا جائے گا۔ حضرت ابولبابہ فرماتے ہیں قسم بخدا میں ابھی وہیں تھا کہ میں نے پہچان لیا میں نے اللہ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے ساتھ خیانت کی ہے۔ پھر ابولبابہؓ وہاں سے چلے تو حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آنے کی بجائے سیدھے مسجد میں پہنچے۔ اور ایک ستون کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ دیا۔ اور یہ کہا میں اسی جگہ پڑا رہوں گا یہاں تک کہ میری موت آ جائے یا اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمالے۔ اور میں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کرلیا ہے کہ میں کبھی بھی بنی قریظہ کی زمین پر نہیں جاؤں گا اور میں اس شہر میں کبھی دکھائی نہیں دوں گا جس میں میں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے خیانت کی ہے۔ جب میرے چلے جانے اور جو کچھ میں نے کہا تھا اس کی خبر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے اسی حال پر چھوڑ دو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے اس کے لیے نیا حکم نازل فرمادے۔ اگر وہ میرے پاس آجاتا تو میں اس کے لیے مغفرت طلب کرتا۔ لیکن جب وہ میرے پاس آیا ہی نہیں اور چلا گیا ہے تو اب اسے چھوڑ دو۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ ابولبابہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جب رسول اللہ ﷺ حضرت ام سلمہؓ کے گھر تشریف فرما تھے تو آپ پر ابولبابہ کی توبہ کا حکم نازل ہوا۔ حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مسکراتے سنا۔ تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ آپ کیوں مسکرا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ مسکراتا رکھے۔ تو اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا ابولبابہ کی توبہ قبول کرلی گئی ہے۔ تو میں نے عرض کی کیا میں انہیں اس کی بشارت نہ دے دوں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں اگر تو چاہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ میں اٹھ کر اپنے حجرے کے دروازے تک گئی (یہ واقعہ پردے کا حکم نازل ہونے کے پہلے کا ہے) اور پکار کر کہا اے ابولبابہ تجھے مبارک اور خوش خبری ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول فرمالی ہے۔ پس لوگ دوڑ کر آئے تاکہ ابولبابہ کو کھول دیں مگر انہوں نے کہا ہرگز نہیں۔ قسم بخدا رسول اللہ ﷺ ہی اپنے دست مبارک سے مجھے کھولیں گے۔ پس جب صبح کے وقت رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے اور ان

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 6-5 (العلمیہ)

کے پاس سے گزر ہوا تو انہیں ستون سے کھول دیا۔ حماد بن سلمہ علی بن زید بن جدعان سے اور وہ علی بن حسینؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہ حضرت ابولبابہؓ کو کھولنے کے لیے تشریف لے آئیں تو انہوں نے کہا میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی نہیں کھولے گا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فاطمہ تو میرا ہی ایک حصہ (ٹکڑا) ہے۔ اس کی سند میں علی بن جدعان ضعیف ہے اور علی بن حسین کی روایت مرسل ہے۔ حضرت ابولبابہؓ کہتے ہیں مجھے وہ خواب یاد تھا جو میں نے حالت نیند میں دیکھا تھا جب کہ ہم بنی قریظہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ خواب یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو سیاہ بدبودار مٹی کے کیچڑ میں اپنے آپ کو پھنسے دیکھا اور میں (کوشش بسیار کے باوجود) اس سے نکل نہیں سکا حتیٰ کہ میں اس کی بدبو سے مرنے کے قریب ہو گیا۔ بعد ازاں میں نے ایک جاری نہر دیکھی اور مجھے یہ دکھایا گیا کہ میں نے اس میں غسل کیا ہے یہاں تک کہ میں نے (غلاظت اور گندگی) کو دور کر دیا ہے اور انتہائی عمدہ اور اچھی خوشبو محسوس کرنے لگا ہوں۔ میں نے اس خواب کی تعبیر حضرت ابوبکر صدیقؓ سے پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ تو بالیقین ایسے کام کا ارتکاب کرے گا جو تجھے غم اور پریشانی میں مبتلا کر دے گا پھر وہ حزن وملال تجھ سے دور ہو جائے گا۔ جب میں ستون سے بندھا ہوا تھا تو مجھے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ قول یاد تھا اور میں یہ امید کر رہا تھا کہ رب کریم میری توبہ کی قبولیت کے بارے وحی ضرور نازل فرمائے گا۔ وہ فرماتے ہیں پس میں اسی حالت پر پڑا رہا حتیٰ کہ تکلیف اور شدت کی وجہ سے مجھے کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تھی اور رسول اللہ ﷺ یہ سب ملاحظہ فرما رہے تھے (1)۔ ابن ہشام نے کہا ہے کہ وہ چھ راتوں تک بندھے رہے ہر نماز کے وقت ان کی زوجہ محترمہ آتیں اور انہیں کھول دیتیں یہاں تک کہ وہ وضو کر کے نماز ادا کرتے اور پھر وہ انہیں باندھ دیتیں (2)۔ ابن عقبہ نے کہا ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بیس رات تک بندھے رہے بدایہ میں ہے کہ یہ زیادہ مناسب قول ہے (3)۔ اور ابن اسحاق نے کہا ہے کہ وہ پچیس راتوں تک بندھے رہے۔ جب نماز کا وقت ہوا یا قضائے حاجت کے لیے جانے کا ارادہ کرتے تو ان کی بیٹی آ کر کھول دیتی اور جب وہ فارغ ہو جاتے تو وہ انہیں دوبارہ باندھ دیتی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی کھولنے کے لیے ان کی زوجہ محترمہ آتی تھیں اور کبھی ان کی بیٹی (4)۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابولبابہؓ کی توبہ قبول فرماتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کا محاصرہ پچیس دنوں تک جاری رکھا یہاں تک کہ انہیں محاصرے کے سبب انتہائی مشقت میں ڈال دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب اور خوف ڈال دیا (5)۔ پس جب وہ محاصرے کے سبب تنگ ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق نیچے اتر آئے۔ اور آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ ان کی مشکیں باندھ دی جائیں۔ چنانچہ محمد بن مسلمہ ان کی مشکیں باندھ کر انہیں ایک طرف لے گئے۔ پھر قلعوں سے ان کی عورتوں اور بچوں کو باہر نکالا اور یہ ذمہ داری عبداللہ بن سلام کے سپرد کی گئی۔ اور پھر ان کا ساز و سامان اکٹھا کیا گیا۔ مسلمانوں نے اس سامان میں پندرہ سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے، پندرہ سو چمڑے کی چھوٹی بڑی ڈھالیں، بہت سا دیگر سامان، کثیر تعداد میں برتن، شراب اور نشہ آور مشروب پایا۔ وہ سارے کا سارا بہا دیا گیا اور اس کا خمس نہیں نکالا۔ پانی لانے والے بہت اونٹ پائے اور علاوہ ازیں کثیر جانور بھی ہاتھ آئے۔ جب یہ سب کچھ اکٹھا کر دیا گیا۔ تو رسول اللہ ﷺ تھوڑی دور جا کر ایک

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 8 (العلمیہ)
2۔ سیرت ابن ہشام، جلد 4 صفحہ 90-89 (الخیریہ)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 9 (العلمیہ)
4۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 9 (العلمیہ)

طرف تشریف فرما ہو گئے۔ اور قبیلہ اوس کے لوگ آپ ﷺ کے قریب حاضر ہوئے اور عرض کناں ہوئے یارسول اللہ! ﷺ یہ ہمارے حلیف ہیں نہ کہ خزرج کے۔ آپ نے ابن ابی کے حلیف قبیلہ قینقاع سے کل جو رویہ اختیار فرمایا اس سے آپ خوب واقف ہیں۔ آپ نے ان کے تین سو غیر مسلح اور چار سو زرہ افراد کو معاف فرما دیا۔ آج ہمارے حلیف بھی اپنی وعدہ خلافی اور معاہدہ شکنی پر بہت نادم اور شرمندہ ہیں۔ لہٰذا آپ انہیں بھی ہماری وجہ سے معاف فرما دیجیے۔ اس مکمل گفتگو کے دوران رسول اللہ ﷺ خاموش رہے اور کوئی گفتگو نہ فرمائی۔ یہاں تک کہ جب ان کی طرف سے بات بڑھ گئی اور اصرار زور پکڑ گیا تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس پر راضی ہو کہ ان کا فیصلہ تم میں سے ہی ایک آدمی کے حوالے کر دیا جائے؟ انہوں نے عرض کی کیوں نہیں (یارسول اللہ ﷺ ہم ضرور اس پر راضی اور خوش ہوں گے) تو آپ ﷺ نے فرمایا پس یہ فیصلہ سعد بن معاذ کے ذمہ ہے (1)۔ اور ابن عقبہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ کرام میں سے جسے چاہو چن لو۔ تو انہوں نے حضرت سعد بن معاذؓ کو منتخب کیا۔ اور حضرت سعد بن معاذؓ کو حضور نبی کریم ﷺ نے رفیدہ نامی ایک مسلمان عورت کے پاس مسجد میں خیمہ لگا کر رکھا ہوا تھا۔ یہ عورت زخمیوں کا علاج کرتی تھی اور جس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ ثواب کے ارادے سے اس کی خدمت بذات خود کرتی تھی۔ جب غزوۂ خندق میں تیر لگنے کے سبب حضرت سعدؓ زخمی ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو فرمایا انہیں رفیدہ کے خیمے میں پہنچا دو تاکہ میں قریب سے ان کی عیادت کرتا رہوں۔ پس جب حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فیصلہ حضرت سعدؓ کے سپرد کیا تو قبیلہ اوس کے لوگ آپ ﷺ کے پاس سے نکل کر ان کے پاس پہنچے اور آپ کو ایک عربی گدھے پر سوار کر کے لے گئے۔ گدھے کے اوپر ریشوں سے بنا ہوا ایک چار جامہ تھا اور اس کے اوپر ایک کمبل رکھا گیا تھا۔ اور گدھے کی لگام بھی ریشوں سے بنی ہوئی تھی۔ حضرت سعدؓ عظیم الجثہ آدمی تھے۔ راستے میں آپ کے اردگرد چلتے ہوئے قبیلہ اوس کے افراد انہیں یہ کہنے لگے اے ابوعمرو! بے شک رسول اللہ ﷺ نے تمہیں اپنے حلیفوں کے بارے فیصلہ کرنے کا اختیار عطا فرما دیا ہے تاکہ تم ان کے بارے اچھا فیصلہ کرو۔ لہٰذا تم بھی ان پر احسان کرنا اور ان کے بارے فیصلہ کرنا۔ تم نے ابن ابی کو دیکھا ہے اس نے اپنے حلیفوں کے بارے کیسا فیصلہ کیا تھا۔ وہ کلام کرتے رہے لیکن آپ خاموش رہے اور ابھی تک کوئی گفتگو نہ فرمائی۔ جب وہ گفتگو کے ذریعے آپ پر زیادہ ہی دباؤ ڈالنے لگے تو اس وقت آپ نے کہا اب سعد کے لیے وقت آ گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرے۔ پس یہ سن کر ضحاک بن خلیفہ بن ثعلبہ انصاری نے کہا ہائے افسوس میری قوم تباہ ہو گئی۔ اسی طرح کئی دوسروں نے بھی کہا۔ پھر ضحاک اوس کی طرف لوٹ گیا اور حضرت سعدؓ کے پہنچنے سے پہلے ہی انہیں بنی قریظہ کے مردوں کی ہلاکت کی خبر دے دی۔ اور اس نے یہ خبر صرف آپ کے کلام سن کر پہنچا دی۔ صحیحین میں ہے کہ جب حضرت سعدؓ اس مسجد کے قریب پہنچے جو بنی قریظہ کے محاصرہ کے دوران رسول اللہ ﷺ نے نماز کے لیے تیار کرائی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا قُوْمُوْا اِلٰى سَيِّدِكُمْ (اپنے سردار کے (استقبال) کے لیے اٹھ کھڑے ہو) اور یہ الفاظ بھی ہیں قُوْمُوْا اِلٰى خَيْرِكُمْ (اپنے میں سے بہترین آدمی کے لیے اٹھ کھڑے ہو)۔ پس اس سے مہاجرین قریش یہ کہنے لگے کہ آپ ﷺ نے اس ارشاد میں فقط انصار کا ارادہ کیا ہے اور انصار نے یہ سمجھا کہ آپ ﷺ نے عام مسلمان مراد لیے ہیں۔ اور امام احمدؒ کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے سردار کے لیے اٹھو اور انہیں نیچے اتارو۔ اور بنی عبدالاشہل کے لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ان کے

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 9 (العلمیہ)

(استقبال) کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے اور دورویا صف بنالی۔

ابن عائذ کے نزدیک حدیث جابرؓ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے سعد! ان کے بارے فیصلہ کرو۔ تو انہوں نے عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول مکرم فیصلہ کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ تو اس پر حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے بارے تمہیں فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اوس کے وہ افراد جو ان کے پاس باقی تھے۔ انہوں نے کہا اے ابو عمرو! بے شک رسول اللہ ﷺ نے تمہیں اپنے دوستوں کے بارے فیصلے کرنے کا اختیار عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا تم ان کے بارے اچھا فیصلہ کرنا اور ان پر احسان کرنا۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تم بنی قریظہ کے بارے میرے فیصلہ پر راضی ہو گے؟ انہوں نے جواب دیا جی ہاں ہم تو تمہارے فیصلے پر اس وقت بھی راضی تھے جبکہ تم یہاں موجود نہ تھے اور ہم نے تمہیں فیصلے کے لیے چنا تھا اور یہ امید تھی کہ تم ہم پر احسان کرو گے جیسا کہ دوسروں (ابن ابی وغیرہ) نے اپنے حلیفوں بنی قینقاع سے کیا۔ ہم نے تمہیں ترجیح دی ہے اور آج کے دن تمہاری طرف سے جزاء اور بدلے کا ہم سے زیادہ محتاج اور کوئی نہیں۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے تمہیں اپنے قول سے کوئی ضرر تو نہیں پہنچایا؟ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہیں اللہ تعالیٰ کے عہد و میثاق کی قسم کیا جو فیصلہ بھی میں نے ان کے بارے کیا تم اسے ان پر لازم کر دو گے؟ انہوں نے کہا جی ہاں۔ جس جانب رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور حضرت سعد آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم کے لیے اس جانب سے پھرے ہوئے تھے۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کیا میرا فیصلہ انہیں بھی قبول ہوگا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا میرا ان کے بارے میں فیصلہ یہ ہے کہ ان کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا جائے، ساز و سامان کو تقسیم کر دیا جائے اور ان کے گھر مہاجرین و انصار کو رہائش کے لیے دے دیئے جائیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تحقیق تم نے ان کے بارے میں وہی فیصلہ کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے مطابق ہے جو اس نے ان کے بارے میں سات آسمانوں سے اوپر فرمایا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اسی طرح کا فیصلہ فرشتے نے سحری کے وقت مجھ تک پہنچا دیا تھا۔ جس رات کی صبح بنو قریظہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق نیچے اترے تھے اسی رات حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ دعا کی تھی۔ اے اللہ! اگر تو نے قریش کے ساتھ جنگ ابھی تک باقی رکھی ہوئی ہے تو پھر مجھے اس کے لیے باقی رکھنا کیونکہ میرے نزدیک ان سے بڑھ کر کوئی قوم نہیں جس سے جنگ کرنا میں پسند کرتا ہوں۔ انہوں نے تیرے رسول کو جھٹلایا، اسے اذیت پہنچائی اور شہر سے باہر نکال دیا۔ اور اگر ہمارے اور ان کے درمیان جنگ ختم ہو چکی ہے تو پھر اسی زخم کو میرے لیے باعث شہادت بنادے۔ اور مجھے اس وقت تک موت نہ دینا جب تک کہ بنی قریظہ کے سبب میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے بنی قریظہ کے (قتال کے) سبب ان کی آنکھیں ٹھنڈی فرما دیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ ذوالحجہ کی نو یا پانچ تاریخ کو بروز جمعرات وہاں سے واپس تشریف لے گئے اور ان کے بارے میں آپ ﷺ نے حکم ارشاد فرمایا کہ بنی نجار میں سے رملہ بنت حارث کے گھر انہیں بند کر دیا جائے۔ پس جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ کے اسی بازار کی طرف تشریف لے گئے جو آج بھی ہے۔ اور کھائیاں کھودنے کا حکم ارشاد فرمایا پس ابو جہم عدوی کے گھر سے لے کر احجار الزیت تک بازار میں کھائیاں کھود دی گئیں۔ صحابہ کرام وہاں حاضر رہے اور رسول اللہ ﷺ بھی اپنے صحابہ کرام کی معیت میں وہیں تشریف فرما رہے۔ اور پھر بنی قریظہ کے مردوں کو بلایا پس انہیں لایا جاتا اور ان کھائیوں میں ان کی گردنیں ماردی جاتیں۔ چونکہ کعب بن اسد انہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف لے جا رہا تھا تو انہوں نے

کعب سے کہا اے کعب! تمہارا کیا خیال ہے محمد (ﷺ) ہم سے کیسا سلوک کریں گے؟ اس نے جواب دیا تمہاری ہلاکت ہو وہ تم سے اچھا برتاؤ نہیں کریں گے اور کسی حال میں تم سے دیت وصول نہیں کریں گے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ بلانے والا اب رکنے والا نہیں ہے اور تم میں سے جو جائے گا وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ قسم بخدا! اب تو تلوار ہی ہے۔ میں نے تمہیں اس سے قبل اور بات کی طرف دعوت دی تھی لیکن تم نے انکار کر دیا۔ انہوں نے اسے کہا اب یہ وقت عتاب اور جھڑکنے کا نہیں ہے۔ اگر ہم تمہاری رائے کو قبول کرنا ناپسند نہ کرتے تو اس معاہدے کو توڑنے میں شامل نہ ہوتے جو ہمارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان تھا۔ حیی بن اخطب نے کہا اب ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرنا چھوڑو۔ کیونکہ اس سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اب صبر سے تلوار کا سامنا کرو۔ انہیں قتل کرنے کا فریضہ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما نے سرانجام دیا۔ پھر اس کے بعد حیی بن اخطب کو اس حال میں لایا گیا کہ اس کے دونوں ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے پہلے قتل کے لیے فقاحی حلہ (جبہ) پہنا۔ لیکن پھر اسے پھاڑ کر انگلی کے پوروں کی مثل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تاکہ کوئی اور اسے چھین کر پہن نہ لے۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آیا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا اے دشمن خدا! کیا اللہ تعالیٰ نے مجھے تجھ پر قدرت دے نہیں دی؟ اس نے کہا کیوں نہیں۔ قسم بخدا! میں نے تمہارے ساتھ عداوت رکھنے کے سبب اپنے آپ کو ملامت نہیں کی۔ اور میں اپنے گمان میں تم پر غالب آنے کا متمنی تھا۔ لیکن اللہ نے ایسا نہ ہونے دیا۔ بلکہ آپ کو مجھ پر قدرت دے دی۔ میں نے مکمل کوشش کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ جسے رسوا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے اسے رسوا کر دیا جاتا ہے۔ بعد ازاں وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا اللہ تعالیٰ کے حکم میں کوئی حرج نہیں بنی اسرائیل کے بارے یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے لکھ دیا گیا ہے اور مقدر بنا دیا گیا ہے۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور اس کی گردن ماردی گئی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے قیدیوں سے اچھا سلوک کیجئے، انہیں تھوڑا سا آرام پہنچایئے اور انہیں پانی پلایئے تاکہ یہ کچھ ٹھنڈک محسوس کریں۔ پھر جو باقی ہیں انہیں قتل کر دیجئے۔ ان پر سورج اور تلوار کی گرمی جمع نہ کیجئے۔ وہ دن بھی بہت گرم تھا۔ چنانچہ انہیں تھوڑا سا آرام کرنے دیا گیا اور پانی پلایا گیا۔ پس جب وہ ٹھنڈے ہو چکے تو پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور باقی کو قتل کر دیا گیا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں کعب بن اسد کو پیش کیا گیا، تو آپ نے اسے فرمایا تجھے ابن حواس کی نصیحتوں نے کوئی نفع نہیں دیا حالانکہ وہ تو میری تصدیق کرتا تھا۔ کیا اس نے تمہیں میری اتباع پیروی کرنے کا حکم نہیں دیا تھا (اور یہ نہیں کہا تھا) کہ اگر تم مجھے پالو تو اس کی جانب سے مجھے سلام پیش کرنا اس نے جواب دیا۔ کیوں نہیں۔ تورات کی قسم اے ابو القاسم! اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ یہودی مجھے تلوار سے ڈر جانے کی عار دلائیں گے تو میں ضرور آپ کی پیروی اختیار کر لیتا۔ لیکن اب تو میں دین یہودی پر ہی ثابت قدم ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے آگے لاؤ اور اس کی گردن ماردو۔ اور حضور نبی کریم ﷺ نے ہر اس آدمی کو قتل کرنے کا حکم دیا جس کے موئے زہار اگے ہوئے ہوں۔

امام احمد اور اصحاب سنن نے عطیہ قرظی سے نقل کیا ہے کہ میں بچہ تھا۔ پس انہوں نے مجھے اس حال میں پایا کہ میرے بال نہیں اگے تو انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ طبرانی نے اسلم انصاری سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے بنی قریظہ کے قیدیوں پر مقرر کیا۔ پس میں بچے کی شرمگاہ دیکھتا تھا اگر میں اس کے موئے زہار اگے دیکھتا تو میں اس کی گردن مار دیتا۔ اور اگر اسے اس حال میں نہ دیکھتا تو اسے مسلمانوں کے مال غنیمت میں شامل کر دیتا۔ رفاعہ بن شمول قرظی بالغ مرد تھا لیکن اس نے سلیط بن قیس کی بہن ام المنذر سلمی بنت قیس کے پاس پناہ لے لی۔ یہ حضور نبی کریم ﷺ کی خالاؤں میں سے ایک تھیں، یعنی یہ آپ کے دادا عبدالمطلب کی خالہ تھیں۔ کیونکہ

ان کی والدہ بنی نجار میں سے تھی۔ اور سلمیٰ کو دونوں قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل تھی۔ پس انہوں نے کہا یا نبی اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ رفاعہ مجھے عطا فرما دیجئے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ وہ عنقریب نماز بھی پڑھے گا اور اونٹ کا گوشت بھی کھائے گا۔ پس آپ ﷺ نے وہ انہیں ہبہ کر دیا۔ پس اس طرح انہوں نے رفاعہ کو زندگی بخش دی۔ پھر بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ غروب شفق تک تمام کو قتل کر دیا گیا۔ پھر خندق میں ہی ان تمام پر مٹی ڈال دی گئی۔ یہ سب کچھ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبول عطا فرمایا۔ اس دن بنی نضیر کی ایک عورت کے سوا ان کی کسی عورت کو قتل نہیں کیا گیا اس عورت کا نام بنانہ تھا۔ یہ بنی قریظہ کے ایک آدمی کی زوجیت میں تھی۔ اس کو حکم کہا جاتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ پس جب ان پر محاصرہ شدت پکڑ گیا۔ تو وہ مرد کے پاس آ کر رونے لگی اور کہنے لگی تو تو اب مجھ سے جدا ہو جائے گا۔ تو اس نے کہا تورات کی قسم! تیرے لیے کوئی حرج نہیں اور تو ایک عورت ہے۔ پس یہ چکی ان پر لڑھکا دے کیونکہ ہم تو ابھی تک ان میں سے کسی کو قتل نہیں کر پائے۔ اور تو عورت ہے اگر محمد (ﷺ) ہم پر غالب آ گئے (تو وہ تجھے قتل نہیں کریں گے) کیونکہ وہ عورتوں کو قتل نہیں کرتے۔ اور میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ تجھے قیدی بنایا جائے۔ لہٰذا میں یہ چاہتا ہوں کہ تجھے بھی قتل کر دیا جائے۔ وہ اس وقت زبیر بن باطا کے قلعہ میں تھی۔ پس اس نے قلعہ کے اوپر سے چکی لڑھکا دی۔ مسلمان قلعہ کی دیواروں کے ساتھ سایہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ جب انہوں نے اسے دیکھا تو وہاں سے اٹھ گئے لیکن وہ چکی خلاد بن سوید کے سر میں آ لگی۔ جس کے سبب ان کا سر پھٹ گیا اور ان پر موت واقع ہو گئی۔ عروہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا قسم بخدا بنانہ میرے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور خوب ہنس کر الٹی سیدھی ہو رہی تھی جبکہ رسول اللہ ﷺ تلواروں کے ساتھ ان کے مردوں کے سر قلم کر رہے تھے۔ اور ایک روایت میں آپ فرماتی ہیں کہ بنی قریظہ کے سردار قتل کیے جا رہے تھے کہ اچانک ایک بلانے والے نے اس کا نام لے کر بلند آواز سے پکارا کہ فلاں عورت کہاں ہے۔ تو اس نے جواب دیا قسم بخدا! میں یہاں ہوں۔ میں نے اسے کہا تو ہلاک ہو جائے! تجھے کیا ہے؟ تو اس نے کہا مجھے بھی قتل کیا جائے گا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو اس نے کہا میں نے بھی ایک واقعہ کیا ہوا ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ پھر وہ چلی گئی اور خلاد بن سوید کے بدلے اسے بھی قتل کر دیا۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ میں بنانہ کی خوش طبعی کو کبھی نہیں بھولوں گی کہ وہ اپنے قتل ہونے کا علم رکھنے کے باوجود خوب ہنس کھیل رہی تھی۔ (1)

مسئلہ: یہ حدیث ان کی دلیل ہے جو یہ حکم لگاتے ہیں کہ بھاری شے کے سبب بھی کسی کو قتل کرنے کے ساتھ قصاص لازم ہوتا ہے۔ جمہور کا یہی نظریہ ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ تعالیٰ کا موقف یہ ہے کہ بھاری شئی کے ساتھ قتل کرنے کے سبب قصاص لازم نہیں آتا اگرچہ کسی پر کوہ ابوقبیس پھینک دیا جائے۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قتل اور زخم کا قصاص نہیں لیا جائے گا مگر جبکہ آلہ کاٹنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس مسئلہ کے بارے میں تفصیلی بحث سورۃ البقرہ کی آیت كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ محمد بن اسحاق نے زہری سے یہ روایت نقل کی ہے کہ زبیر بن باطا قرظی جس کی کنیت ابوعبدالرحمن تھی دور جاہلیت کی جنگ بعاث کے دنوں میں ثابت بن قیس بن شماس کے پاس آیا اور اسے پکڑ کر لے گیا۔ پھر صرف اس کی پیشانی کے بال کاٹ کر اسے چھوڑ دیا (نہ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 14-10 (العلمیۃ)

اسے قتل کیا اور نہ ہی غلام بنا کر رکھا)۔ پھر جب بنی قریظہ کے ان ایام میں ثابت بن قیس کی ملاقات زبیر بن باطا قرظی کے ساتھ ہوئی تو اس وقت وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ تو اس وقت ثابت نے اسے کہا اے ابوعبدالرحمٰن! کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ تو اس نے کہا کیا میرے جیسا آدمی تیرے جیسے آدمی سے ناواقف رہ سکتا ہے۔ تو پھر ثابت نے کہا میں چاہتا ہوں کہ میں تیرے احسان کا بدلہ ادا کروں۔ اس نے کہا بے شک کریم اور سخی لوگ بدلہ دیا کرتے ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر ثابت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ! ﷺ زبیر کا میرے اوپر احسان ہے اور اس کا بدلہ دینا مجھ پر لازم ہے۔ آج میں چاہتا ہوں کہ اس کا بدلہ چکا ہوں۔ اس لیے آپ اس کا خون (جان) مجھے ہبہ کر دیجئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ تجھے عطا کر دیا۔ پھر وہ اس کے پاس آیا اور اسے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے تیرا خون مجھے ہبہ کر دیا ہے۔ تو اس نے کہا ایسا بوڑھا انسان جس کی نہ بیوی ہو اور نہ بچے۔ وہ زندہ رہ کر کیا کرے گا۔ چنانچہ ثابت پھر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ! ﷺ اس کے اہل اور اولاد بھی مجھے عطا کر دیجئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ بھی تجھے ہبہ کر دیئے۔ پھر اس نے آکر اسے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے تیرے بیوی بچے مجھے عطا فرما دیئے ہیں۔ پس وہ بھی تیرے پاس رہیں گے۔ تو اس نے کہا حجاز میں رہنے والے ایسے افراد جن کے پاس ساز وسامان نہ ہو تو وہ کس طرح زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ثابت پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور اس کے مال کا بھی مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے وہ مال بھی عطا فرما دیا اور پھر اسے آکر بتایا کہ آقائے دو جہاں ﷺ نے تیرا مال بھی مجھے عنایت فرما دیا ہے۔ پس میں وہ تجھے دیتا ہوں۔ پھر زبیر نے کہا اے ثابت! اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا جس کا چہرہ چینی آئینہ کی مثل حسین تھا اور اس سے سارے قبیلے کی پیشانیاں دکھائی دیتی تھیں اس سے اس کی مراد کعب بن اسد تھا۔ ثابت نے جواب دیا اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ اس نے پھر کہا اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا جو شہر اور دیہات میں رہنے والوں کا سردار تھا، دونوں قبیلوں کا قائد تھا، جنگ کے دنوں میں لوگوں کو سواریاں مہیا کرتا تھا اور خشک سالی کے ایام میں لوگوں کو کھانا کھلاتا تھا۔ اس کی مراد حی بن اخطب تھا۔ ثابت نے جواب دیا اسے بھی قتل کر دیا گیا ہے۔ اس نے پھر پوچھا اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا کہ جب ہم حملہ کرتے تو وہ آگے آگے ہوا کرتا تھا اور جب ہم حملہ کر کے واپس لوٹتے تو وہ ہماری حفاظت کے لیے ہماری اطراف میں رہا کرتا۔ اس سے اس کا مقصود عزال بن شمول تھا۔ ثابت نے اسے بتایا کہ وہ بھی قتل ہو چکا ہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ بنی کعب بن قریظہ اور بنی عمرو بن قریظہ دونوں کی مجلسوں کا کیا بنا۔ تو ثابت نے اسے بتایا کہ وہ سب چلے گئے اور قتل کر دیئے گئے۔ یہ سن کر زبیر نے کہا اے ثابت! میرا جو احسان تیرے ذمہ ہے میں اس کے واسطہ سے تجھے کہتا ہوں مجھے اپنی قوم کے ساتھ ملا دے۔ قسم بخدا! ان لوگوں کے بعد زندہ رہنے میں کوئی بھلائی اور فائدہ نہیں۔ مجھے اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ میں ان گھروں کی طرف واپس لوٹ کر جاؤں جن میں وہ رہا کرتے تھے اور ان کے بعد میں ان میں باقی رہوں۔ لیکن اے ثابت! میرے بیوی بچوں کا خیال رکھنا اپنے صاحب سے ان کے بارے میں یہ مطالبہ کرنا کہ انہیں آزاد کر دیا جائے اور ان کا مال بھی واپس لوٹا دیا جائے۔ چنانچہ ثابت نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں زبیر کے گھر والوں اور ان کے مال ومتاع کے بارے میں عرض کی تو آپ ﷺ نے اس کے اہل وعیال کو بھی واپس کر دیا اور اسلحہ کے علاوہ دیگر ساز وسامان بھی عطا فرما دیا۔ زبیر نے کہا اے ثابت! میں تجھے اپنے احسان کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے بالفور اپنی قوم کے ساتھ ملا دو قسم بخدا! میں اتنی دیر بھی اب صبر نہیں کر سکتا جتنی دیر میں بھرے ہوئے ڈول کو کنوئیں میں انڈیل کر دوبارہ بھرنے کے لیے لٹکایا جاتا ہے۔ پس میں اس سے بھی پہلے اپنے دوستوں کے پاس پہنچنا چاہتا

ہوں۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ثابت اسے لے گئے اور اسے قتل کر دیا گیا اور محمد بن عمر نے کہا ہے کہ ثابت نے اسے کہا میں تجھے قتل نہیں کر سکتا۔ زبیر نے کہا مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ مجھے قتل کس نے کیا ہے۔ پس پھر حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا۔ اور جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس زبیر کا یہ قول اَلْقَى الْاَحِبَّةَ (کہ میں اپنے دوستوں سے ملوں گا) پہنچا تو آپ نے فرمایا وہ جہنم کی آگ میں ان سے ہمیشہ ہمیشہ ملتا رہے گا(1)۔ پھر بنی قریظہ کا ساز و سامان اور ان کی عورتیں مسلمانوں میں تقسیم کی گئیں۔ یہ وہ پہلا مال فے ہے جس میں بعض کے لیے دو دو حصے رکھے گئے۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی اور چھتیس گھوڑے تھے گھوڑوں اور آدمیوں کے مجموعی حصوں کی تعداد تین ہزار بہتر 3072 تھی۔ ان میں دو حصے گھوڑے کے دیئے گئے اور ایک حصہ اس کے مالک کا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس تین گھوڑے تھے لیکن حصہ صرف ایک گھوڑے کا رکھا گیا۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ کے اس موقف کی دلیل یہی واقعہ ہے کہ مال غنیمت میں سے صرف ایک گھوڑے کا حصہ دیا جائے گا۔ جبکہ امام ابو یوسف امام محمد اور امام احمد کا موقف یہ ہے کہ دو گھوڑوں کا حصہ دیا جائے گا۔ لیکن بالاتفاق دو سے زائد گھوڑوں کا حصہ نہیں نکالا جائے گا۔ سورۃ الانفال میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔ اس مال میں سے حضور نبی کریم ﷺ نے خلاد بن سوید کا حصہ بھی علیحدہ کیا جنہیں قلعہ کے قریب اوپر سے چکی پھینک کر شہید کر دیا گیا تھا اور سنان بن محصن کا حصہ بھی نکالا جو کہ بنی قریظہ کے محاصرہ کے دوران وصال فرما گئے اور وصال سے قبل مسلمانوں کی معیت میں جنگ کرتے رہے۔ یہ ائمہ ثلاثہ کے اس موقف کی دلیل ہے کہ اسے مال غنیمت سے حصہ دیا جائے گا جو جنگ کے وقت حاضر ہوا۔ پھر اگرچہ کفار کے شکست خوردہ ہو کر بھاگ گئے اور مال غنیمت دارالاسلام میں محفوظ کرنے سے قبل ہی فوت ہو گیا۔ ابن ابی شیبہ نے صحیح سند سے روایت نقل کی ہے کہ جو بھی میدان جنگ میں حاضر ہوا اس کے لیے مال غنیمت میں سے حصہ ہوگا(2)۔ یہ روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔ اور طبرانی نے اسے مرفوع اور موقوف دونوں طرح روایت کیا ہے اور موقوف روایت زیادہ صحیح ہے۔ اور امام شافعیؒ نے اسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت کیا ہے اور اس کی سند میں انقطاع بھی ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ نے کہا ہے کہ مال غنیمت میں حق اس وقت تک ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ مال دارالاسلام میں محفوظ نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا جو کوئی مال محفوظ کیے جانے سے قبل فوت ہو گیا یا قتل کر دیا گیا اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوگا اور اس کے ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ اور جنگ ختم ہونے کے بعد اگر کمک دارالحرب میں پہنچ جائے اس سے قبل کہ مال دارالسلام میں محفوظ کیا جائے تو پھر ان کے لیے حصہ نکالا جائے گا۔ یہ مسئلہ بھی سورۃ الانفال میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ: یہ واقعہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے خلاف جمہور کے اس موقف کی دلیل ہے کہ مال غنیمت میں سے گھوڑ سوار کے لیے تین حصے ہیں ایک حصہ شہسوار کا دو حصے گھوڑے کے، جبکہ امام صاحب کا موقف یہ ہے کہ ایک حصہ شہسوار کو دیا جائے گا اور ایک گھوڑے کو۔ یہ مسئلہ بھی سورۃ الانفال میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: حضور نبی کریم ﷺ قیدیوں میں سے پانچواں حصہ لیتے تھے ان میں سے جسے چاہتے آزاد فرما دیتے اور جسے چاہتے کسی کو ہبہ کر دیتے اسی طرح آپ نے اپنا پانچواں حصہ کھجوروں میں سے بھی علیحدہ کیا۔ کل مال غنیمت کے پانچ حصے کیے جاتے تھے ان میں سے آپ ﷺ کا ایک حصہ محمیہ بن جزالزبیدی کے حوالے کر دیا گیا اور پھر بقیہ چار حصے لوگوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ رسول اللہ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 15-14 (العلمیۃ) 2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6 صفحہ 494 حدیث: 33226 (العلمیۃ)

ﷺ نے ان عورتوں کو بھی مال عطا فرمائے جو جنگ میں حاضر ہوئیں۔ لیکن ان کے لیے باقاعدہ کوئی حصہ مقرر نہیں کیا۔ اس جنگ میں شریک ہونے والی عورتیں صفیہ بنت عبدالمطلب، ام عمارہ نسیبہ، ام سلیط، ام علاء الانصاریہ، سمیری بنت قیس، ام سعد بن معاذ اور کبشہ بنت رافع تھیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے قیدیوں کا ایک گروہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھیجا تاکہ ان کے بدلے ہتھیار اور گھوڑے خریدے جاسکیں۔ محمد بن عمر نے اسی طرح کہا ہے۔ اور ابن اسحاق نے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے سعد بن زید انصاری اشہلی کو بنی قریظہ کے قیدیوں کے ساتھ بھیجا اور انہوں نے انہیں بیچ کر گھوڑے اور اسلحہ خریدا۔ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما نے قیدیوں میں سے ایک گروہ خریدا اور پھر اسے آپس میں تقسیم کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ تقسیم کرتے وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے جوان عورتوں کو علیحدہ کیا اور بوڑھی عورتوں کو علیحدہ کر دیا اور پھر حضرت عبدالرحمٰن نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اختیار دے دیا کہ جو چاہیں لے لیں۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بوڑھی عورتوں کو لے لیا۔ پس ان کے سبب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مال کثیر کا منافع ہوا۔ کیونکہ بوڑھی عورتوں کے پاس سے بہت سا مال پایا گیا تھا جو کہ نوجوان عورتوں کے پاس موجود نہیں تھا۔ ابن سیرہ نے کہا ہے جو مال بوڑھی عورتوں سے لیا گیا تھا وہ مال غنیمت میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ وہ مال ایک یا دو ماہ کے بعد ان سے برآمد ہوا تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے خریدے ہوئے قیدیوں میں سے ہر ایک کے لیے سامان دینے کا وقت مقرر کر دیا۔ پس جس نے بھی اس مقررہ وقت میں سامان دے دیا آپ نے اسے آزاد کر دیا اور ان سے کوئی تعرض نہ کیا (1)۔ اور رسول اللہ ﷺ نے تقسیم اور بیع کرنے کے وقت عورتوں اور ان کے بچوں کے درمیان تفریق اور علیحدگی کرنے سے منع فرما دیا۔ اور ارشاد فرمایا ماں اور اس کی اولاد کے درمیان تفریق نہ کی جائے یہاں تک کہ بچے بالغ ہو جائیں۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ بلوغت کی علامت کیا ہے؟ فرمایا بچی حائضہ ہو جائے اور بچے کو احتلام ہونے لگے (2)۔ اسے حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور اسے صحیح کہا ہے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ماں اور اس کے بچے کے درمیان تفریق نہ کرو۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ کب تک؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہاں تک کہ بچہ بالغ ہو جائے اور لڑکی کو حیض آنے لگے۔ ابن جوزی نے کہا ہے کہ دار قطنی نے کہا ہے کہ اس کی سند میں عبداللہ بن عمر بن حسان ضعیف الحدیث ہے۔ علی بن مدینی نے اسے متہم بالکذب قرار دیا ہے۔

امام ترمذی نے ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس کسی نے ماں اور اس کے بچے کے درمیان تفریق کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے اور اس کے محبوبوں کے درمیان جدائی ڈال دے گا (3)۔ ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے اور حاکم نے اسے مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی حیی بن عبداللہ ہے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں اس سے کوئی روایت نقل نہیں کی۔ اور اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ اسی لیے ترمذی نے اسے صحیح نہیں قرار دیا۔ حاکم نے مستدرک میں عمران بن حصین سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ ملعون ہے جس نے والدہ اور اس کے بچے کے درمیان تفریق کی (4)۔ حاکم نے کہا ہے اس کی سند صحیح ہے۔ اس میں ایک راوی طلیق بن محمد ہے۔ حاکم کبھی یہ روایت طلیق بن محمد کے واسطہ سے عمران بن حصین سے نقل کرتے

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 16 (العلمیہ)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 68، حدیث: 258 (المحاسن)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 154 (وزارت تعلیم)
4۔ مستدرک حاکم: 2333 (العلمیہ)

ہیں۔ کبھی اسی واسطہ سے ابو بردہ سے روایت کرتے ہیں اور کبھی طلیق کے واسطہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے مرسل روایت نقل کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان میں تطبیق ممکن ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ طلیق بن محمد نے اس حدیث کو عمران بن حصین اور ابو بردہ دونوں سے سنا ہو اور پھر وہ کبھی ایک سے روایت کرتا ہے، کبھی دوسرے سے اور کبھی مرسلاً روایت کرتا ہو۔ ابن قطان نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ طلیق معروف الحال نہیں ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ ابن قطان نے اپنے قول میں خاص سلسلہ سند مراد لیا ہے۔ ورنہ یہ حدیث تو کثیر طرق سے مروی ہے اور مشہور ہے اور اس کے الفاظ معنی مشترک کے صحیح ہونے کو ثابت کرتے ہیں اور معنی مشترک سے مراد ماں اور اس کی اولاد کے درمیان تفریق کرنے سے منع کرنا ہے۔ دارقطنی نے اپنی سند سے میمون بن ابی شعیب کے واسطہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بچی اور اس کی ماں کے درمیان تفریق کی تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس سے منع کر دیا۔ چنانچہ آپ نے بیع توڑ دی(1)۔ اسے ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے اور اسے میمون بن ابی شعیب اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع پائے جانے کے سبب رد کر دیا ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ ہمارے نزدیک حدیث کے لیے مرسل ہونا نقصان دہ نہیں اور اسے حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے اسے ترجیح دی ہے۔

مسئلہ: امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اسی سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ بیع، ہبہ یا ان کی مثل کسی طریقہ کے سبب دو چھوٹے غلاموں (نابالغ)، ایک چھوٹے اور ایک بڑے غلام اور دو بڑے (بالغ) غلاموں کے درمیان تفریق کرنا جائز نہیں جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے محرم رشتہ دار ہوں۔ یہی موقف امام احمدؒ کا بھی ہے۔ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ صرف ماں اور اس کے بچوں کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی۔ اور امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ چھوٹے بچے اور اس کے والدین کے درمیان تفریق نہ کی جائے اگرچہ وہ نسباً کتنے اوپر والے درجہ میں کیوں نہ ہوں۔ (اس سے مراد والدین کی جانب سے تمام اصول یعنی دادا پردادا اور نانی پرنانی وغیرہ ہیں)۔ حضرت امام مالکؒ کے قول کی علت یہ ہے کہ حدیث طیبہ میں صرف ماں اور اس کے بچے کے درمیان تفریق کرنے کی نہی مذکور ہے۔ اور امام شافعیؒ نے اپنے قول میں ماں کے ساتھ مطلقاً تمام اصول کو ملا دیا ہے (یعنی جو حکم ماں کا ہے وہی تمام اصول کا ہے) اور امام اعظم ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک دو غلاموں کے درمیان تفریق کرنے سے روکنے کی علت ان کے درمیان پایا جانے والا رشتہ محرمیت ہے۔ کیونکہ بعض احادیث میں اصول و فروع کے علاوہ بھی تفریق کرنے سے روکنے کا ذکر ہے۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دو غلام عطا فرمائے جو آپس میں دونوں بھائی تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو بیچ دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے پوچھا تیرے غلام کو کیا ہوا ہے؟ میں نے اس کے بارے میں آپ ﷺ کو مطلع کیا تو آپ ﷺ نے مجھے فرمایا اسے ضرور واپس لوٹا لو(2)۔ ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔ ابو داؤد نے ان کی گرفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حدیث میمون بن ابی شعیب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے حالانکہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں کی۔ تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ روایت مرسل ہے اور مرسل حدیث ہمارے نزدیک حجت ہے۔ اور حاکم اور دارقطنی نے ایک دوسری سند سے عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے واسطہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس کچھ قیدی آئے تو آپ ﷺ نے مجھے دو بھائیوں کو بیچنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پس میں نے انہیں فروخت کیا اور انہیں

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 66 حدیث: 251 (المحاسن) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 154 (وزارت تعلیم)

علیحدہ علیحدہ بیچ ڈالا۔ پھر میں حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور آپ کو اس کی اطلاع دی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ان دونوں کو تلاش کرو اور واپس لوٹاؤ، ان دونوں کو اکٹھا بیچو اور ان کے درمیان تفریق نہ کرو(1)۔ حاکم نے اس روایت کو شیخین کی شرائط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے۔ ابن قطان نے کہا ہے اس میں کوئی عیب نہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ اس باب میں یہی سب سے زیادہ قابل اعتماد روایت ہے۔ ایک دوسری سند سے اسے امام احمد اور بزار نے بھی نقل کیا ہے اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ اس کی سند میں انقطاع ہے لیکن یہ ہمارے معروف اصول کے لیے ضرر رساں نہیں۔ دارقطنی نے طلیق بن عمران سے انہوں نے ابو بردہ سے اور انہوں نے ابو موسیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر لعنت کی ہے جس نے والدہ اور اس کے بچے کے درمیان یا دو بھائیوں کے درمیان تفریق کر دی(2)۔ جب دو بھائیوں کے مابین بھی تفریق کرنے کی ممانعت ثابت ہوگئی تو اس سے یہ ظاہر ہوگیا کہ ممانعت کی علت ایسی رشتہ داری ہے جس میں محرمیت پائی جائے۔ لیکن وہ محرمیت جو رضاعت کے سبب ثابت ہو وہ تفریق کے مانع نہیں۔ اسی طرح ایسی رشتہ داری جس میں محرمیت نہ ہو وہ بھی تفریق کے مانع نہیں مثلاً چچا کا بیٹا وغیرہ۔

مسئلہ: جو کوئی والدہ اور اس کے بچے کے درمیان جدائی کرے گا وہ گنہگار ہوگا۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیع منعقد ہو جائے گی اور نافذ بھی ہو جائے گی۔ جب کہ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی منعقد نہیں ہوتی بلکہ بیع باطل ہوتی ہے۔ اسی طرح امام احمدؒ کے نزدیک اگر دونوں کے مابین ولادت کا تعلق نہ بھی ہو تو پھر بھی بیع منعقد نہیں ہوتی۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بیع صرف اس صورت میں فاسد ہوتی ہے جبکہ دونوں کے درمیان رشتہ ولادت موجود ہو۔ اور آپ ہی سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایسی بیع مطلق فاسد ہوگی، چاہے دونوں کے درمیان ولادت کا رشتہ موجود ہو یا کوئی اور تعلق محرمیت پایا جائے۔ ائمہ کے مذکورہ اختلاف کا دارومدار ایک اصولی اختلاف پر ہے۔ کیونکہ اگر امور شرعیہ سے نہی بغیر کسی قرینہ کے ہو تو وہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک موجب بطلان ہوتی ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین کے نزدیک موجب فساد ہوتی ہے۔ لیکن پھر امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد نے کہا ہے کہ جس طرح اذان جمعہ کے وقت بیع ممنوع ہے اور اس کا سبب امر خارجی ہے (یعنی ایسا امر ہے جو نفس بیع میں داخل نہیں اور وہ ہے جمعہ کی تیاری میں تاخیر اور غفلت) اسی طرح ایسی بیع جس سے ماں اور بچے کے درمیان تفریق لازم آتی ہو وہ بھی ممنوع ہے اور اس کا سبب بھی امر خارجی ہے۔ لہٰذا امر خارجی نفس بیع میں فساد ثابت نہیں کرتا۔ ہاں اگر ممنوع ہونے کا سبب کوئی وصف لازم ہو تو اس سے نفس بیع فاسد ہو جاتی ہے۔ جبکہ امام یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بیع توڑنے اور غلاموں کو واپس لوٹانے کا حکم ارشاد فرمایا اور یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ بیع بنیادی طور پر فاسد ہو۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ نے غلاموں کے واپس لوٹانے کو طلب اقالہ پر محمول کیا ہے (یعنی پہلی بیع کو فسخ کرنے پر محمول کیا ہے اور اس سے پہلی بیع کا فاسد ہونا لازم نہیں آتا)۔

مسئلہ: اگر دونوں غلام بالغ ہوں تو ان کے درمیان تفریق کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے۔ اور امام احمدؒ نے کہا ہے کہ مذکورہ روایات کے مطلق ہونے کی وجہ سے دو بالغوں کے درمیان تفریق کرنا بھی جائز نہیں۔ اور علامہ ابن جوزی نے حضرت عبادہ کی روایت کو رد کر دیا ہے جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ہمارے موقف کی دلیل حضرت سلمہ بن اکوع

1۔ مستدرک حاکم: 2331 (العلمیۃ)
2۔ سنن الدارقطنی، حدیث: 255 (المحاسن)

رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکلے اور ہم نے بنی فزارہ کے ساتھ جنگ کی یہاں تک کہ انہوں نے کہا کہ میں انہیں پکڑ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں لے آیا۔ ان میں ایک عورت تھی اور اس کے ساتھ عرب کی حسین ترین اس کی بیٹی بھی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وہ لڑکی مجھے عطا فرمادی۔ اور میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوگیا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا اے سلمہ! یہ عورت مجھے ھبہ کردے تو میں نے عرض کی حضور! یہ آپ ہی کی ملک ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے عوض تین (مسلمان) قیدیوں کو رہائی دلائی۔ یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ محترمہ حضرت ماریہ قبطیہ اور ان کی بہن سیرین کے درمیان بھی تفریق کردی تھی۔ یہ دونوں بہنیں شہنشاہ اسکندریہ مقوقس نے رسول اللہ ﷺ کو تحفۃً پیش کیں۔ تو آپ ﷺ نے سیرین حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو عطا فرمادی۔ اور اسی کے بطن سے حضرت عبدالرحمٰن بن حسان پیدا ہوئے (اور حضرت ماریہ کو اپنے پاس رکھا)۔ ابن عبدالبر نے یہ روایت الاستیعاب میں ذکر کی ہے۔ اور بزار نے ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ابن خزیمہ میں ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: جب کسی صغیر بچے کے ساتھ اس کے والدین ہوں تو ان میں سے کسی کو بھی انفرادا بیچنا جائز نہیں۔ اور اگر صغیر بچے کے ساتھ ماں اور بھائی ہو یا ماں اور پھوپھی ہو یا ماں اور خالہ ہو یا ماں اور بھائی ہو تو ظاہر روایت کے مطابق ماں کے سوا دوسرے قریبی کو بیچنا جائز ہے۔ کیونکہ ماں کی شفقت سب پر غالب ہے اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر کسی کے پاس چھ بھائی ہوں ان میں سے تین بڑے ہوں اور تین چھوٹے۔ اور اس نے ہر چھوٹے کے ساتھ ایک بڑا ملا کر فروخت کردیا تو یہ جائز ہے۔ اور اگر صغیر کے ساتھ دادی، پھوپھی اور خالہ ہو تو پھوپھی اور خالہ کو علیحدہ بیچنا جائز ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ دادی نہ ہو بلکہ صرف پھوپھی اور خالہ ہو تو ان میں سے کسی کو علیحدہ نہیں بیچا جاسکتا (بلکہ صغیر کو بھی ان کے ساتھ فروخت کیا جائے گا)۔ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر صغیر کے ساتھ متعدد قریبی افراد موجود ہوں۔ ان میں سے بعض دور کے رشتہ دار ہوں اور بعض قریب تر ہوں تو ان میں سے دور کے رشتہ داروں کو علیحدہ فروخت کرنا جائز ہے (جبکہ اقرب کو علیحدہ بیچنا جائز نہیں) اور اگر تمام افراد ایک ہی درجے کے رشتہ دار ہوں اور ان کی جنس مختلف ہو مثلاً باپ اور ماں، خالہ اور پھوپھی تو پھر ان میں تفریق نہیں کی جائے گی بلکہ یا تمام کو اکٹھا فروخت کردیا جائے گا یا تمام کو روک لیا جائے گا۔ اور اگر وہ تمام ایک ہی جنس میں سے ہوں مثلاً دو بھائی ہوں یا دو چچا ہوں تو اس صورت میں یہ جائز ہے کہ ایک کو صغیر کے ساتھ روک لیا جائے اور اس کے سوا جتنے ہوں تمام کو فروخت کردیا جائے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: سبیل الرشاد میں مذکور ہے کہ بنی قریظہ کے قیدیوں میں سے چھوٹے بچوں اور ان کی ماؤں کو عرب کے مشرکوں اور یہودیوں کے ہاتھ فروخت کیا جاتا تھا۔ اور اگر کسی صغیر بچے کے ساتھ اس کی ماں نہ ہوتی تو اسے صرف مسلمانوں کے ہاتھ ہی فروخت کیا جاتا۔ کیونکہ جب چھوٹے بچے کو اس کے والدین میں سے کسی ایک کی معیت میں قیدی بنایا جائے تو اسے کافر شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے اسے کافر کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہوتا ہے، چاہے وہ کافر مشرک ہو یا یہودی ہو کیونکہ تمام کافر ملت واحدہ ہیں۔ اور اگر صرف بچے کو قیدی بنایا جائے اور اس کے والدین میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ نہ ہو تو پھر دار اسلام میں آجانے کی وجہ سے مسلمان شمار کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

غزوہ بنی قریظہ میں صرف خلاد بن سوید اور منذر بن محمد رضی اللہ عنہما شہید ہوئے۔

فائدہ: حضور نبیٔ کریم ﷺ نے بنی نضیر کی ریحانہ بنت زید بن عمرو بن حذافہ کو اپنے لیے چنا۔ اس کی شادی بنی عمرو بن قریظہ میں ہو چکی تھی اور وہ ایک حسین و جمیل عورت تھی۔ آپ ﷺ نے اسے اسلام لانے کی دعوت دی تو اس نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپ ﷺ نے اسے علیحدہ کر دیا لیکن اپنے دل میں اس کا تصور رکھا۔ لہٰذا ابن سعیہ کو بلا بھیجا اور اس کا ذکر اس کے سامنے کیا۔ ابن سعیہ نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں وہ اسلام قبول کر لے گی۔ چنانچہ وہ آپ ﷺ کے پاس سے اٹھ کر اس کے پاس آئے اور اسے کہنے لگے تو اب اپنی قوم کی خواہش نہ کر۔ تو نے وہ مصیبت اور تکلیف دیکھ لی ہے جو حیی بن اخطب نے ان پر ڈالی ہے۔ پس تو اسلام قبول کر لے۔ رسول اللہ ﷺ تجھے اپنے لیے منتخب فرما لیں گے۔ چنانچہ وہ دعوت کو قبول کرتے ہوئے مشرف باسلام ہو گئی۔ اس اثناء میں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام میں تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے جوتوں کی آہٹ سنی تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ ابن سعیہ کے جوتوں کی آہٹ ہے۔ وہ مجھے ریحانہ کے اسلام لانے کی خوشخبری سنانے آ رہا ہے۔ پس وہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ ریحانہ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ تو آپ ﷺ یہ سن کر انتہائی خوش ہوئے۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ہی رہیں یہاں تک کہ آپ ﷺ کا وصال ہو گیا۔ اس وقت تک وہ آپ ﷺ کی ملکیت میں ہی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ تو اس سے شادی کرنے اور اسے پردہ میں رکھنے کے خواہش مند تھے۔ لیکن اس نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ آپ مجھے ویسے ہی اپنی ملکیت میں رہنے دیجئے۔ یہ میرے لیے بھی باعث راحت ہو گا اور آپ کے لیے بھی آسانی کا سبب ہو گا۔ پس آپ ﷺ نے اسے ویسے ہی ملکیت میں رہنے دیا۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: جب بنی قریظہ کا معاملہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا تو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا زخم بھی کھل گیا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما حضرت سعد رضی اللہ عنہ (کا حال معلوم کرنے کے لیے) ان کے پاس تشریف لے گئے۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد کی جان ہے میں نے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے رونے کی آواز علیحدہ علیحدہ پہچان لی اور اس وقت میں اپنے حجرہ میں تھی۔ وہ بالیقین ایسے ہی تھے جیسے رب العالمین نے ارشاد فرمایا رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے مناقب کا بیان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا جنازہ اٹھایا گیا تو منافقین نے کہا کہ ان کا جنازہ کتنا ہلکا ہے اور اس کا سبب بنی قریظہ کے بارے ان کا فیصلہ ہے۔ جب یہ خبر حضور نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے تو ملائکہ اٹھائے ہوئے تھے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی موت کے سبب عرش رحمٰن بھی لرز گیا۔ متفق علیہ۔(2)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ایک ریشمی حلہ بطور ہدیہ پیش کیا گیا۔ پس صحابہ کرام اسے چھو کر اس کے نرم و ملائم ہونے پر اظہار تعجب کرنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس کی نرمی پر تعجب کر رہے ہو،

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 225 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 536 (وزارت تعلیم)

جنت میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے رومال اس سے بہتر اور زیادہ نرم ہوں گے۔ متفق علیہ (1)۔

علامہ بغوی وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات نے آپ سے دنیوی ساز وسامان مانگا اور نفقہ میں اضافہ کرنے کا مطالبہ کیا ان کے اس رویے سے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچی تو آپ نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی اور ایک مہینہ تک ان کے قریب نہ آنے کی قسم کھالی۔ اور اپنے صحابہ کرام کی طرف بھی باہر تشریف نہ لے گئے۔ تو صحابہ کرام کو فکر دامن گیر ہوئی اور وہ کہنے لگے آپ ﷺ کا حال کیا ہے؟ (آپ باہر تشریف نہیں لائے)۔ ان میں سے کچھ یہ کہنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی عورتوں کو طلاق دے دی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کہا میں تمہیں حقیقت حال سے آگاہ کروں گا۔ چنانچہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کیا آپ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی ہے ﷺ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں! میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں مسجد میں داخل ہوا تو مسلمان کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے طلاق دے دی ہے۔ کیا میں انہیں مطلع کر دوں کہ آپ نے ازواج کو طلاق نہیں دی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں! اگر تو چاہے۔ پس میں مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوا اور بلند آواز کے ساتھ ندا دی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق نہیں دی ہے۔ اور یہ آیت نازل ہوئی وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ (اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر آتی ہے تو (بلا تحقیق) اس کو پھیلا تے ہیں اور اگر اس خبر کو رسول کی جانب اور اپنے سمجھدار لوگوں کی جانب راجع کر دیتے تو اصل واقعہ کا استنباط کرنے والوں کو اس کا (صحیح) علم ہو جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس معاملہ کی حقیقت معلوم کی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔(2)

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ﴿۲۸﴾

"اے نبی مکرم! آپ فرمادیجئے اپنی بیبیوں کو کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی آرائش (وآسائش) کی خواہاں ہو[1] تو آؤ تمہیں مال ومتاع دے دوں اور پھر تمہیں رخصت کر دوں بڑی خوبصورتی کے ساتھ[2]"

[1] آیت طیبہ میں زِیْنَتَهَا سے مراد دنیوی زندگی کی خوشحالی، راحت اور آرائش وآسائش ہے۔ اور تَعَالَ اصل میں بلند جگہ پر موجود آدمی کا نیچی جگہ والے آدمی کو اپنی طرف بلانا ہے کہ اوپر آ جاؤ۔ پھر کثرت استعمال کی وجہ سے یہ لفظ تمام جگہوں کے لیے یکساں استعمال ہونے لگا۔ اس کا معنی ہے میری طرف آ جاؤ۔ یہاں اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ مطالبہ طلاق کے لیے آ جاؤ۔

[2] تاکہ میں تمہیں مال ومتاع دے کر طلاق دے دوں۔ اور بڑی خوبصورت کے ساتھ کوئی ضرر پہنچائے بغیر تمہیں رخصت کر دوں۔

وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۲۹﴾

"اور اگر تم چاہتی ہو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دار آخرت کو تو بے شک اللہ تعالیٰ نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے جو تم میں سے نیکوکار ہیں اجر عظیم[1]"

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 536 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 459 (الفکر)

لے اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مراتب قرب اور اس کی رضا اور اس کے رسول کا قرب چاہتی ہو اور آخرت کی نعمتوں اور راحتوں کا ارادہ رکھتی ہو، یعنی جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم ﷺ کی رضامندی اور دار آخرت کی راحتوں اور نعمتوں کا ارادہ کیا تو بے شک اللہ تعالیٰ نے تم میں سے نیکوکاروں کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ کیونکہ وہی محسنہ ہیں اور احسان کا معنی ہے اَنْ تَعْبُدَ رَبَّکَ بِالْحُضُوْرِ کَاَنَّکَ تَرَاهُ (تیرا اپنے رب کی ایسے حضور قلب کے ساتھ عبادت کرنا گویا تو اسے دیکھ رہا ہے احسان کہلاتا ہے)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ اس وقت حضور نبی کریم ﷺ کی نو ازواج مطہرات تھیں پانچ قریش میں سے تھیں۔ ان کے اسماء یہ ہیں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا، حضرت ام المومنین حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا، حضرت ام المومنین ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا، حضرت ام المومنین ام سلمہ بنت امیہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا۔ اور چار دوسرے قبائل سے تھیں۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں ام المومنین حضرت زینب بنت جحش الاسدیہ رضی اللہ عنہا، ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث الہلالیہ رضی اللہ عنہا، ام المومنین حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب الخیبر یہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین حضرت جویریہ بنت حارث المصطلقیہ رضی اللہ عنہا۔ جب یہ آیت تخییر نازل ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے اس اختیار کا آغاز ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کیا کیونکہ یہی آپ ﷺ کی محبوب ترین زوجہ محترمہ تھیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں قرآن حکم پڑھ کر سنایا اور پھر طلاق چاہنے یا نہ چاہنے کا اختیار انہیں سونپ دیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ، رسول مکرم ﷺ اور دار آخرت کو اختیار فرما لیا اور آپ ﷺ کے چہرۂ مقدس پر فرحت و مسرت کے آثار ملاحظہ کیے تو پھر دیگر ازواج نے بھی آپ ہی کی اتباع و پیروی کی۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ان ازواج مطہرات نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کو اختیار کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر ان کی قدردانی فرمائی اور آپ ﷺ کو انہی پر اکتفا کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ (ان کے بعد مزید عورتوں سے نکاح آپ کے لیے جائز نہیں)(1)۔ مسلم، احمد اور نسائی نے ابو الزبیر کی سند سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت طلب کی مگر آپ کو اجازت نہ دی گئی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت چاہی مگر انہیں بھی اجازت نہ دی گئی۔ پھر کچھ دیر بعد دونوں کو اذن باریابی ہوا۔ جب دونوں اندر حاضر خدمت ہوئے تو حضور نبی کریم ﷺ کو غمزدہ حالت میں خاموش بیٹھے ہوئے پایا کہ آپ ﷺ کی ازواج مطہرات بھی آپ کے ارد گرد بیٹھی ہوئی ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خیال کیا کہ ضرور کوئی ایسی بات کہوں جو حضور نبی کریم ﷺ کو ہنسا دے۔ چنانچہ اسی خیال سے آپ نے کہا اگر آپ خارجہ کی بیٹی (یعنی میری بیوی) کو دیکھیں کہ اس نے مجھ سے اپنے نفقہ میں اضافہ کا مطالبہ کیا ہے تو میں اٹھ کر اس کی گردن توڑ دوں۔ پس یہ سن کر رسول اللہ ﷺ مسکرا دیئے اور فرمایا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، میرے گرد تو بیٹھ کر یہ اپنے اپنے نفقہ میں اضافے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ پس یہ سنتے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ ان کی گردن پر شدید ضرب لگائیں اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی گردن پر ضرب لگانے کے لیے اٹھے اور دونوں یہ کہنے لگے کہ کبھی بھی رسول اللہ ﷺ سے ایسی شے کا مطالبہ نہ کرنا جو آپ ﷺ کے پاس نہ ہو۔ پھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 459 (الفکر)

آپ ﷺ نے ان سے ایک مہینہ یعنی انتیس دن تک علیحدگی اختیار فرمائی اور پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ راوی کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ابتدا کی اور فرمایا اے عائشہ! میں چاہتا ہوں کہ ایک بات تیرے سامنے رکھوں اور اس کے بارے میری پسند یہ ہے کہ تو اپنے والدین سے مشورہ کیے بغیر اس کے جواب میں جلدی نہ کرے۔ تو انہوں نے عرض کی وہ کیا ہے یارسول اللہ! ﷺ۔ تو پھر آپ ﷺ نے ان کے سامنے یہ آیات تلاوت فرمائیں۔ تو انہوں نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ کیا میں آپ کے بارے اپنے والدین سے مشورہ کروں گی (ہرگز نہیں) بلکہ میں تو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول معظم اور دار آخرت کو اختیار کرتی ہوں۔ ساتھ ہی میری آپ سے یہ بھی عرض ہے کہ آپ اپنی ازواج میں سے کسی کو بھی اس سے مطلع نہ کیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھ سے جو عورت بھی پوچھے گی میں اسے یہ بتاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فتنہ پرداز بنا کر نہیں بھیجا بلکہ اس نے تو مجھے مبشر اور معلم بنا کر بھیجا ہے(1)۔ اور صحیح میں زہری کی روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قسم کھائی کہ آپ ایک مہینہ تک اپنی ازواج کے پاس نہیں جائیں گے۔ زہری کہتے ہیں کہ عروہ نے مجھے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے آغاز کیا، تو میں نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ بے شک آپ نے قسم کھائی ہے کہ آپ ایک مہینہ تک ہمارے پاس نہیں آئیں گے۔ آپ کو انتیس دن ہو چکے ہیں میں انہیں شمار کرتی رہی ہوں آپ ﷺ نے فرمایا مہینہ انتیس دن کا ہی ہے(2)۔

فائدہ: علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ علماء کے مابین اس خیار کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ آیا یہ تفویض طلاق کا اختیار تھا کہ صرف ازواج کے اپنے آپ کو اختیار کرنے کے ساتھ طلاق واقع ہو جاتی (اور مزید طلاق دینے کی ضرورت نہ ہوتی) یا ایسا نہیں تھا (بلکہ اس سے فقط عورتوں کی پسند کا اظہار مقصود تھا اور طلاق کا اختیار رسول اللہ ﷺ کے پاس ہی تھا) تو اس بارے میں حسن، قتادہ اور اکثر اہل علم کا موقف یہ ہے کہ یہ تفویض طلاق کا اختیار نہیں تھا بلکہ آپ ﷺ نے انہیں صرف طلاق کے مطالبہ کا اختیار سونپا۔ پس اگر وہ دنیا کو اختیار کر لیتیں تو آپ انہیں جدا کر دیتے۔ اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْکُنَّ وَ اُسَرِّحْکُنَّ۔ اور ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ یہ تفویض طلاق کا اختیار تھا لہٰذا اگر وہ اپنے آپ کو اختیار کر لیتیں تو طلاق ہو جاتی۔(3)

مسئلہ: جب کوئی مرد اپنی عورت سے یہ کہے اختاری (تجھے اپنے بارے میں اختیار ہے تو اپنے آپ وہ اختیار کر لے) اور اس سے نیت یہ کرتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے آپ کو طلاق دے لے تو جب تک وہ عورت اسی مجلس میں ہے اس کے لیے اپنے آپ کو طلاق دینا جائز ہے۔ اور جب وہ اس مجلس سے اٹھ کھڑی ہوگی یا کسی دوسرے کام میں شروع ہو جائے گی تو طلاق دینے کا اختیار اس کے پاس باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ اس طرح خاوند عورت کو فعل منھی عنہ کا مالک بنا دیتا ہے اور تمام تملیکات مجلس میں ہی جواب کا تقاضا کرتی ہیں۔ جیسا کہ بیع کی صورت میں جب ایجاب ہو جائے تو مجلس میں ہی قبول کا اختیار باقی ہوتا ہے۔ صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ عورت کے لیے مجلس کا خیار اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے کہ وہ آدمی جو اپنی زوجہ کو اختیار دیتا ہے اس کے بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ عورت کا اختیار اس مجلس تک اس کے پاس رہتا ہے۔ پس اگر وہ اپنی مجلس سے اٹھ کھڑی ہو تو اس کے پاس اختیار باقی نہیں رہے گا۔ ہم نے یہ قول حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے۔ لیکن ان کی اسانید میں کچھ کلام ہے۔ علاوہ ازیں جابر بن عبداللہ، عطاء، مجاہد،

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 480 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 482 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 460 (الفکر)

شعبی، نخعی، مالک، سفیان الثوری، اوزاعی، شافعی، ابوثور اور اصحاب رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بھی یہی کہا ہے اور دوسرے گروہ کا موقف یہ ہے کہ عورت کا اختیار مجلس میں اور اس کے بعد بھی اس کے پاس باقی رہتا ہے۔ یہ قول زہری قتادہ، ابوعبیدہ اور ابن نصر رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے اور ہمارا نظریہ بھی یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تو (جواب دینے میں) جلدی نہ کرنا یہاں تک کہ اپنے والدین سے مشورہ لے لے(1)۔ اور صاحب مغنی نے صحابہ کرام میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی قول نقل کیا ہے۔ ابن ہمامؒ نے ابن منذر کے قول کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت مضبوط اور پختہ نہیں ہے کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ سے وہ قول بھی مروی ہے جو صحابہ کرام کی جماعت کے قول سے موافق ہے۔ جیسا کہ امام محمدؒ نے بلاغات میں بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے پاس حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم سے اس آدمی کے بارے میں یہ خبر پہنچی ہے جو اپنی بیوی کو اختیار دیتا ہے کہ جب تک وہ عورت اسی مجلس خیار میں رہے گی تو اس کے پاس وہ اختیار رہے گا۔ اور جب وہ اپنی مجلس سے اٹھ کھڑی ہوگی تو پھر اس کے لیے اختیار باقی نہیں رہے گا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی اس کے خلاف قول مروی نہیں۔ پس اس مسئلہ پر یہ اجماع سکوتی ہوا۔ اور ان کا یہ قول کہ ان کی اسانید میں کلام ہے اس کے لیے قطعاً نقصان دہ نہیں کیونکہ ساری امت نے اسے قبول کرلیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عبدالرزاق نے حضرت جابر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے اس سند جید کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد "لاتعجلی" ((جواب میں) جلدی نہ کرنا) سے استدلال کرنا ضعیف ہے۔ کیونکہ آیت میں طلاق کا اختیار دینے اور طلاق تفویض کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا۔

مسئلہ: مرد کے قول اختاری (تو اپنے کو اختیار کرلے) میں نیت کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ مرد نے عورت کو اپنے نفس کے بارے میں اختیار کیا ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ اپنے نفس کے علاوہ کسی اور کام کے کرنے کا اختیار دیا ہو (اس لیے اختیار دیتے وقت تفویض طلاق کی نیت کرنا ضروری ہے)۔

مسئلہ: جب خاوند نے کہا "اِخْتَارِیْ" اور عورت نے جواب میں کہا "اِخْتَرْتُ نَفْسِیْ" (میں نے اپنے نفس کو اختیار کرلیا ہے) تو اس سے ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ یہ حضرت عمر، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ یہی موقف امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا ہے۔ کیونکہ خاوند کا قول اختاری اس کے قول طَلِّقِيْ نَفْسَكِ (تو اپنے آپ کو طلاق دے لے) کے قائم مقام ہے۔ اور عورت کا قول اِخْتَرْتُ نَفْسِيْ اس کے قول "طَلَّقْتُ نَفْسِيْ" (میں نے اپنے آپ کو طلاق دے لی) کے قائم مقام ہے۔ اور اس سے بالا جماع طلاق رجعی واقع ہوتی ہے۔ اور کتاب اللہ کی آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ طلاق کے بعد رجوع ہوسکتا ہے مگر جب طلاقیں تین ہوجائیں تو پھر رجوع کا حق باقی نہیں رہتا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ مذکورہ صورت میں تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں اور مدخول بہا عورت کے بارے میں امام مالکؒ کا نظریہ بھی یہی ہے۔ اور غیر مدخول بہا عورت کو ایک طلاق واقع ہونے کا دعویٰ کیا جائے تو وہ قابل قبول ہوگا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قول کا سبب یہ ہے کہ عورت کا اختیار یہ تقاضا کرتا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 482 (قدیمی)

ہے کہ وہ اس کے لیے اس طرح ثابت ہو کہ اب مرد کو اس پر اس کی رضامندی کے بغیر کوئی اختیار نہ ہو گر نہ اسے اختیار سونپے جانے کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس طرح تو مرد اس کی طرف ہر حال میں رجوع کر سکتا ہے چاہے وہ راضی ہو یا نہ ہو۔ اور یہ اختصاص تب ہی ثابت ہو سکتا ہے جبکہ واقع ہونے والی طلاق بائن ہو۔ اور کتاب اللہ سے یہ ثابت کہ تین طلاقوں کے سوا ہر طلاق کے بعد رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔ اس لیے اس سے تین طلاقیں ہی واقع ہوں گی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ ثابت ہے کہ اس سے ایک طلاق بائن واقع ہوگی اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہی ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ عورت کے ساتھ اختیار کا اختصاص فقط طلاق بائن کی صورت میں ثابت ہوتا ہے اور بینونت بالا جماع ایک طلاق سے واقع ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ طلاق بالمال اور طلاق قبل الدخول ہے۔ لہٰذا مقصود حاصل ہو جانے کی وجہ سے مسئلہ کو اسی پر محمول کیا جائے گا۔ ایک طلاق سے مقصد حاصل ہو جانے کے بعد اسے تین پر محمول کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ امام ترمذیؒ نے حضرت ابن مسعود اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اس سے طلاق بائن واقع ہوگی(1) جیسا کہ ان دونوں سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے طلاق رجعی واقع ہوگی۔ پس ان دونوں سے روایت مختلف ہوگئی (اس لیے دونوں روایات قابل استدلال نہ رہیں)۔ میں کہتا ہوں کہ بینوت کی دو قسمیں ہیں بینونت غلیظہ اور بینونت خفیفہ۔ پس اگر مرد نے اختیار تفویض کرتے وقت بینونت غلیظہ کی نیت کی تو اس سے بالضرور تین طلاقیں واقع ہوں گی۔ لیکن امام اعظم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مرد کا قول ''اختاری'' بینونت پر دلالت بھی نہیں کرتا۔ بلکہ یہ قول تو خالصۃً طلاق کا اختیار عورت کے سپرد کیے جانے کا فائدہ دیتا ہے۔ اور بینونت تو اس سے اقتضاء ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ قول بینونت عامہ کو شامل نہیں بلکہ بقدر ضرورت بینونت کو شامل ہے بخلاف انت بائن وغیرہ اقوال کے۔ لہٰذا خاوند کے قول اختاری کے ساتھ تین طلاقیں واقع نہیں ہوں گی اگرچہ اس نے تین کی نیت بھی کر لی۔ کیونکہ نیت پر عمل اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب لفظ بھی اس کا احتمال رکھتا ہو۔ اور خاوند کے قول انت بائن کے ساتھ تین واقع ہو جائیں گی اگر اس نے تین کی نیت کی۔ ہاں اگر وہ الفاظ یہ استعمال کرتا ہے اختاری اختاری اختاری تو چونکہ اس صورت میں الفاظ کا متعدد ہونا مقصود کے متعدد ہونے پر دلالت کرتا ہے (اس لیے تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی)۔

مسئلہ: اگر خاوند نے اپنی زوجہ سے کہا ''اختاری'' تو عورت نے جواب میں کہا اِخْتَرْتُ زَوْجِیْ (میں نے اپنے خاوند کو اختیار کیا) تو جمہور کے نزدیک اس سے کوئی شے بھی واقع نہیں ہوگی۔ کیونکہ خاوند نے اسے طلاق نہیں دی بلکہ صرف طلاق کا اختیار اس کے سپرد کیا ہے اور اس نے طلاق اختیار نہیں کی بلکہ اس نے نکاح کے باقی رکھنے کو اختیار کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس سے طلاق رجعی واقع ہو جائے گی گویا کہ آپ نے لفظ اختیار کو ہی ایقاع طلاق قرار دیا ہے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول (جمہور کے موقف کی تائید کرتا ہے) کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اختیار دیا تو ہم نے آپ ﷺ کو ہی اختیار کر لیا اور آپ ﷺ نے ہمارے اختیار کو کچھ بھی شمار نہیں کیا۔ اسے صحاح ستہ نے روایت کیا ہے(2)۔ اور صحیحین کے الفاظ ''فلم یعدّہ'' کوئی شے واقع نہ ہونے کا فائدہ دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جیسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کا اپنی ازواج کو اختیار دینا طلاق کا اختیار نہیں تھا بلکہ یہ صرف طلاق کے مطالبے کا اختیار تھا۔ اس لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول جمہور کے لیے حجت نہیں بن سکتا۔ واللہ اعلم

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 141 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 792 (وزارت تعلیم)

مسئلہ: خاوند یا عورت کے کلام میں لفظ نفس مذکور ہونا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اگر مرد نے کہا اختاری اور عورت نے کہا، اخترتُ تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ لفظ الفاظ طلاق میں سے نہیں ہے۔ اس لیے قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس سے کوئی شئی بھی واقع نہ ہو۔ کیونکہ تملیک (مالک بنانا) مملک (مالک بنانے والا) کی ملکیت کی فرع ہے (یعنی دوسرے کو مالک بنانے سے قبل خود اس شئے کا مالک ہونا ضروری ہے) اور خاوند بذات خود اس لفظ اختیار کے ساتھ عورت پر طلاق واقع کرنے کا مالک نہیں (تو پھر وہ عورت کو اس لفظ کے ساتھ طلاق دینے کا کیسے مالک بنا سکتا ہے)۔ لیکن ہم نے قیاس کو چھوڑ دیا ہے۔ اور ہم نے کہا ہے کہ اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے کہ اگر عورت نے اختیار تفویض کیے جانے کے بعد اپنے آپ کو اختیار کر لیا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اجماع اسی صورت میں ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کے کلام میں لفظ نفس صراحۃً موجود ہو۔ کیونکہ مرد کا قول اختاری مبہم ہے اور یہ اپنے نفس کو اختیار کرنے کا بھی احتمال رکھتا ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کام میں تصرف کرنے کے اختیار کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ اور مبہم کی تفسیر مبہم کے ساتھ نہیں کی جا سکتی۔ اور ابہام کی صورت میں کسی شئے کی تعیین ممکن نہیں ہوتی۔ اور جب مرد کے قول اختاری کے ساتھ طلاق کا واقع ہونا خلاف قیاس ہے تو پھر اس حکم کا انحصار صرف اسی حالت پر ہوگا جس پر اجماع منعقد ہوا ہے۔ صرف نیت پر اکتفا نہیں کیا جائے گا، اگرچہ اس کے ساتھ قرینہ حالیہ بھی موجود ہو جب تک کہ کسی ایک کے کلام میں لفظ نفس موجود نہ ہو۔ کیونکہ اس حالت پر اجماع منعقد نہیں ہوا۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے کہا ہے کہ اگر خاوند نے اختاری کہہ کر وقوع طلاق کی نیت کی اور نیت کے ساتھ قرینہ حالیہ بھی پایا جائے تو اس صورت میں نیت پر ہی اکتفا کر لیا جائے گا جبکہ دونوں اس مسئلہ پر متفق ہوں (تو پھر اس صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی) اور امام اعظم ابو حنیفہؒ نے کہا ہے کہ ایسی نیت جس کا لفظ احتمال نہ رکھتا ہو وہ لغو ہوتی ہے۔ اس کا اعتبار نہیں کیا جاتا ورنہ تو صرف نیت کے ساتھ ایسے لفظ کے ساتھ بھی طلاق واقع ہو جائے گی جو قطعاً اس کا احتمال نہ رکھتا ہو مثلاً مرد عورت کو کہے اسقنی (مجھے پانی پلاؤ) (اس سے اگر وہ طلاق کی نیت کر لے تو کیا طلاق واقع ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں) (لفظ اختیار کے ساتھ بھی حقیقۃً طلاق واقع نہیں ہو سکتی) مگر ہم نے اس سے طلاق واقع ہونے پر اجماع ہونے کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام صاحب کا یہ قول کہ لفظ کے احتمال کے بغیر نیت لغو ہوتی ہے۔ یہ قول اپنے محل میں ذکر نہیں ہوا کیونکہ الفاظ اختاری اور اخترت لفظ نفس ذکر کیے بغیر بھی عورت طلاق کا اختیار سونپے جانے کا احتمال رکھتے ہیں اور عورت کو اختیار ہوتا ہے کہ چاہے تو اپنے نفس کو اختیار کر لے اور چاہے تو کسی اور کام کو۔ اگرچہ اس میں کوئی صراحۃً مذکور نہیں اسی لیے اگر مرد نے کہا اختاری اور عورت نے جواباً کہہ دیا اخترت نفسی تو اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے بشرطیکہ خاوند نے طلاق کی نیت کی کیونکہ اس صورت میں عورت کا کلام مرد کے کلام کی تفسیر ہے اور مرد نے جو نیت کی ہے اس کا کلام اس کا احتمال رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر مرد نے کہا اختاری اختیارۃ اور عورت نے جواباً کہا اخترت۔ تو اس صورت میں بھی طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ لفظ اختیارۃ کے آخر میں تا متحد اور منفرد ہونے کی خبر دیتی ہے اور عورت کا اپنے نفس کو اختیار کرنا کبھی متحد ہوتا ہے۔ اور کبھی متعدد ہوتا ہے پس اس طرح مرد کی جانب سے کلام مفسر ہو گیا (یعنی اگر عورت اپنے نفس کو ایک طلاق کے ساتھ اختیار کرے تو اس میں اتحاد پایا جاتا ہے اور اگر وہ تین طلاقوں کے ساتھ اپنے آپ کو اختیار کرے تو اس میں تعدد پایا جاتا ہے تو اس طرح مرد کی جانب سے کلام مفسر ہے۔ گویا اس نے یہ کہا ہے کہ تو اپنے نفس کو اختیار کر۔ اس لیے طلاق واقع ہو جائے گی)

مسئلہ: اور اگر خاوند نے کہا اختاری اور عورت نے کہا انا اَخْتَارُ نَفْسِيْ (یعنی ماضی کی بجائے اس نے مضارع کا صیغہ استعمال

کیا) تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ قیاس تو یہ تھا کہ طلاق واقع نہ ہوتی (میں اپنے نفس کو اختیار کرلوں گی) کیونکہ یہ تو صرف مستقبل میں اختیار کرنے کا وعدہ ہے یا پھر یہ کلام اس وعدہ کا احتمال رکھتا ہے تو پس یہ ایسے ہی ہے جبکہ مرد کہے طَلِّقِیْ نَفْسَکِ (تو اپنے آپ کو طلاق دے لے) اور وہ جواب میں کہہ دے اَنَا اُطَلِّقُ نَفْسِیْ (میں اپنے آپ کو طلاق دے لوں گی) تو اس صورت میں طلاق واقع نہیں ہوگی)۔ صاحب ہدایہ نے دلیل استحسان کے طور پر حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ذکر کیا ہے لَا بَلْ اَخْتَارُ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (نہیں بلکہ میں تو اللہ اور اس کے رسول مکرم کو اختیار کرتی ہوں۔ تو آپ نے اس کلام میں صیغہ مضارع ہی استعمال کیا ہے) اور رسول اللہ ﷺ نے آپ کے جواب کو صحیح تسلیم فرمالیا۔ یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ واقعہ تو پہلے گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے تو انہیں طلاق دینے کا اختیار نہیں دیا تھا بلکہ صرف طلب طلاق کا اختیار سونپا تھا۔ کیونکہ یہاں ہمارا مقصود صرف یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس اختیار کے جواب میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول تسلیم کرلیا تھا چاہے اختیار کا تعلق طلاق دینے کے ساتھ تھا یا طلاق کے مطالبہ کے ساتھ۔ اور اس لیے بھی کہ آپ کا قول اَنَا اَخْتَارُ نَفْسِیْ موجودہ حالت کو بیان کرنے کے لیے ہے اور وہ حالت اپنے نفس کو اختیار کرنے کی حالت ہے جبکہ اس کے برعکس عورت کا قول اُطَلِّقُ نَفْسِیْ موجودہ حالت کی حکایت نہیں بن سکتا (اس لیے اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا) واللہ اعلم

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝

"اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی [1] تو اس کے لیے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا [2] اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے [3]"

[1] اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہاں فاحشۃ سے مراد نافرمانی اور بداخلاقی ہے۔(1)

[2] ابن کثیر اور ابن عامر نے نُضَعِّفُ صیغہ جمع متکلم باب تفعیل سے پڑھا ہے اور اَلْعَذَابَ کو مفعول ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یاء کے ساتھ صیغہ واحد مذکر غائب مجہول حالت میں پڑھا ہے اور العَذَابُ کو نائب الفاعل ہونے کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے۔ ابوجعفر اور ابوعمرو نے عین کلمہ کو مشدد بغیر الف کے باب تفعیل سے پڑھا ہے اور باقیوں نے عین کلمہ کو مخفف اور باب افعال سے پڑھا ہے۔ لفظ ضعف ان اضافی الفاظ میں سے ہے جن کا سمجھنا دوسری شے کے سمجھنے پر موقوف ہوتا ہے۔ جیسا کہ نصف (اور کل میں تضایف ہے) اور لفظ زوج بھی انہی الفاظ میں سے ہے (کہ مرد کا جوڑا عورت اور عورت کا جوڑا مرد ہے)۔ ضعف سے مراد وہ شے جو دو مساوی مقداروں سے مرکب ہو۔ اَضْعَفْتُ الشَّیْءَ کا معنی ہے میں نے فلاں شے کے ساتھ اسی کی مثل شے ملا دی۔ یہی معنی ضَعَّفْتُهٗ اور ضَاعَفْتُهٗ کا بھی ہے۔ اور ضِعْفَيْنِ سے مراد ایسی دو ہم مثل چیزیں ہیں جن میں سے ہر ایک کو دوسری سے ملا دیا جائے جیسے زوجین کیونکہ ان میں ہر ایک دوسرے سے ملا ہوتا ہے اور اسے جوڑا بنا تا ہے۔ اور کبھی دو ہم مثل مقداروں کے مجموعہ پر کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ کفار کے متبعین کے قول کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ۔ یعنی جس عذاب میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 461 (الفکر)

ہم ہیں اس سے دوگنا عذاب انہیں دے کیونکہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور انہوں نے ہمیں بھی گمراہ کیا۔

جب ضعف کو کسی عدد کی طرف مضاف کیا جائے تو اس سے مراد اسی عدد کا دو چند ہوتا ہے پس ضعف عشرۃ سے مراد بیس ضعف مائۃ سے مراد دوسو اور ضعف الواحد سے مراد دو ہے۔ اور جب ضعفین کو واحد کی طرف مضاف کیا جائے تو وہ اسے تین بنا دیتا ہے (یعنی ایک دو ہم مثل عددوں سے مل کر تین ہو جاتا ہے)۔ قاموس میں ہے کہ ضعف الشیء سے مراد اس کی مثل دوسرا ہے اور ضعفا الشیء سے مراد اس کی مثل دو اور ہیں یا ضعف سے مراد اس شے کی وہ مثل ہے جو اس پر زائد ہو اور جہاں تک زائد ہو سکے۔ مثلاً کہا جاتا ہے لک ضعفہٗ تو اس سے عرب لوگ مراد یہ لیتے ہیں کہ تیرے لیے اس کا دوگنا، تین گنا وغیرہ ہے کیونکہ اس میں زیادتی غیر محصور ہے۔ علامہ جزری نے النھایہ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابوالدحداح کی حدیث میں جو ضعف مذکور ہے اس سے مراد دوگنا (دو مثل) ہے۔ اور بطور استشہاد یہ کہا ہے کہ یہ کہا جاتا ہے اِنْ اَعْطَیْتَنِیْ دِرْھَمًا فَلَکَ ضِعْفٌ۔ (اگر تو مجھے ایک درہم دے گا تو میں تجھے دو درہم دوں گا) اور کبھی کہتے ہیں فَلَکَ ضِعْفَاہُ۔ اور کہا گیا ہے ضعف الشیء سے مراد اس کی ایک مثل ہے اور ضعفاہ سے مراد اس کی دو مثلیں ہیں۔ اور علامہ زہری نے کہا ہے کہ کلام عرب میں لفظ یا ضعف سے مراد کسی شے کی مثل ہوتی ہے حتیٰ کہ وہ جتنی بھی زائد ہو جائے وہ دو مثل تک محدود نہیں رہتی۔ لہٰذا کم سے کم ضعف ایک مثل ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اسی معنی میں یہ حدیث طیبہ بھی ہے۔ ''یَضْعَفُ صَلٰوۃُ الْجَمَاعَۃِ عَلٰی صَلٰوۃِ الْفَذِّ خَمْسًا وَّ عِشْرِیْنَ دَرَجَۃً'' (باجماعت ادا کی جانے والی نماز کا ثواب منفرد کی نماز سے پچیس درجہ زیادہ دیا جاتا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَیُضْعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً۔ یعنی اس کے لیے بہت زیادہ گنا بڑھا دیا جائے گا۔ یہ کہا جاتا ہے ضَعَفْتُ الشَّیْءَ وَ اَضْعَفْتُہٗ وَضَاعَفْتُہٗ۔ جب تو کسی چیز میں اضافہ کر دے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ ضَعَّفَ اور ضَاعَفَ دو لغتیں ہیں، یعنی باب تفعیل اور باب مفاعلہ جیسے بَعَّدَ اور بَاعَدَ ان دونوں کا معنی ایک ہے۔ ابوعمرو اور ابوعبید نے کہا ہے کہ جب تو کسی شے کو دو مثل کر دے تو اس کے لیے کہے گا ضَعَّفْتُہٗ (یعنی اس کے لیے باب تفعیل استعمال ہوگا) اور جب تو کسی شے کو کئی گنا کر دے تو پھر اسے ضاعفتہ سے تعبیر کیا جائے گا(1) (یعنی اس کے لیے باب مفاعلہ استعمال ہوگا)۔ چونکہ یہاں آیت کریمہ میں لفظ ضعفین مذکور ہے اس لیے ابوعمرو نے قرأت یُضَاعِف کی بجائے یضعّف (باب تفعیل سے) کی ہے۔ اور ترکیب کلام میں قول باری تعالیٰ ضعفین مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے کیونکہ تضعیف اور مضاعفۃ دونوں تعبیر کے معنی کو متضمن ہیں یا مفعول مطلق (معنی مصدریہ) کی بناء پر منصوب ہے۔ اور یہ ان مثالوں کی مثل ہے ضربتہ ضربتین یا ضربتہ سوطین۔ یا پھر العَذَابُ سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور امہات المومنین کے لیے عذاب دو چند کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس وافر مقدار میں نعمتیں ہونے کے سبب ان سے گناہ کا صادر ہونا زیادہ قبیح اور ناپسندیدہ ہے۔ اسی حکمت کی بناء پر آزاد آدمی کے لیے سزا کی حد غلام کی حد سے دوگنا مقرر کی گئی ہے۔ اور اس لیے بھی کہ امہات المومنین سے گناہ کے صادر ہونے کے سبب حضور نبی کریم ﷺ کی مصاحبت کی حرمت داغدار ہوتی ہے۔ اور یہ عمل انتہائی ناپسندیدہ اور بہت قبیح ہے۔

۳۰ اور عذاب کو دو چند کرنا اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے۔

وَ مَنْ یَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَاۤ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ ۙ وَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 461 (الفکر)

اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿٣١﴾

''اور جو تم میں سے فرمانبردار بنی رہی اللہ اور اس کے رسول کی اور نیک عمل کرتی رہی [1] تو ہم اس کو اس کا اجر بھی دو چند دیں گے [2] اور ہم نے اس کے لیے عزت والی روزی تیار کر رکھی ہے [3]۔''

[1] یَقْنُتْ قنوت سے ماخوذ ہے جس کا معنی اطاعت وفرمانبرداری ہے۔ یعقوب نے مَنْ تَاْتِ اور تَقْنُتْ قرأت کی ہے اور انہوں نے ان دونوں میں معنی کا اعتبار کیا ہے۔ اور باقیوں نے انہیں یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے لفظ مَنْ کا اعتبار کیا ہے۔ یعنی جو اطاعت وفرمانبرداری پر قائم رہی۔ حمزہ اور کسائی نے لفظ مَنْ پر محمول کرتے ہوئے یَعْمَلْ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے اسے تَعْمَلْ پڑھا ہے۔ اور صَالِحًا مصدریت (مفعول مطلق) یا مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

[2] تو ہم اس کو (دوسری ازواج کی نسبت) اس کا اجر بھی دو چند دیں گے۔ ایک اجر اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرنے کا اور ایک اجر اس کا کہ انہوں نے قناعت اور حسن معاشرت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی رضا کو طلب کیا۔ مقاتل نے کہا ہے کہ ہر ایک نیکی کی جگہ دس نیکیاں عطا ہوں گی۔ حمزہ اور کسائی نے اسے یُؤْتِهَا یاء کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ اس میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کی طرف راجع ہے۔ اور باقیوں نے صیغہ جمع متکلم ہونے کی بناء پر نون کے ساتھ قرأت کی ہے۔

[3] اور ہم نے اس کے لیے عزت والی روزی تیار کر رکھی ہے۔ رزق کریم سے مراد جلیل القدر اور عالیشان رزق ہے۔ اور اس سے مراد وہ جنت ہے جو اصلی اجر پر زائد ہوگی۔ میں کہتا ہوں کہ حضور نبی کریم ﷺ کی متابعت میں انہیں وہ کچھ عطا کیا جائے گا جو کچھ آپ ﷺ کو عطا فرمایا جائے گا۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿٣٢﴾

''اے نبی کی ازواج (مطہرات) تم نہیں ہو دوسری عورتوں میں سے کسی عورت کی مانند [1] اگر تم پرہیزگاری اختیار کرو [2] پس ایسی نرمی سے بات نہ کرو [3] کہ طمع کرنے لگے وہ (بے حیا) جس کے دل میں روگ ہے [4] اور گفتگو کرو تو باوقار انداز سے کرو [5]۔''

[1] یعنی تم میں سے کوئی ایک دوسری عورتوں میں سے کسی عورت کی مانند نہیں ہے۔ یا معنی ہے عورتوں کی جماعت میں سے کوئی ایک جماعت بھی نہیں پائی جاتی جو فضیلت میں تمہاری مثل ہو۔ جملہ لَسْتُنَّ مذکورہ مضمون کی تعلیل ہے۔ اَحَد اصل میں وَحَدٌ ہے اور یہ واحد کے معنی میں ہے۔ پھر اسے نفی عام کے لیے وضع کیا گیا ہے جس میں مذکر ومونث اور واحد وکثیر سب برابر ہیں (یعنی یہ ان تمام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی ہے میرے نزدیک تمہاری قدر ومنزلت دوسری نیک اور صالحہ عورتوں کی قدر ومنزلت کی مثل نہیں ہے بلکہ تم تو میرے نزدیک ان کی نسبت انتہائی زیادہ مکرم ومحترم ہو اور میری بارگاہ میں تمہارا اجر وثواب انتہائی عظیم ہے۔(1)

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ازواج مطہرات تمام عورتوں سے افضل واعلیٰ ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد گرامی اس کے

معارض آتا ہے جو حضرت مریم بنت عمران علیہا السلام کے بارے ہے۔ اور وہ یہ ہے اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصۡطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الۡعٰلَمِيۡنَ (اے مریم) بے شک اللہ تعالیٰ نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاک فرمادیا ہے اور تجھے عالمین کی عورتوں پر فضیلت عطا فرمادی ہے) تو اگر اس کے بارے یہ کہا جائے کہ اس ارشاد میں نِسَآءِ الۡعٰلَمِيۡنَ سے مراد ان کے اپنے زمانے کی عورتیں ہیں (لہٰذا معارضت ثابت نہیں ہوتی) تو اس کا انکار اس روایت سے لازم آتا ہے جو امام ترمذیؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے لیے عالمین کی عورتوں میں سے یہ کافی ہیں، یعنی مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد ﷺ اور فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہن (1)۔ (اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان عورتوں کو تمام جہان کی عورتوں پر فضیلت اور فوقیت حاصل ہے)۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ قول باری تعالیٰ لَسۡتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ میں یہ کہا جائے کہ چونکہ تم حضور سید البشر ﷺ کی ازواج مطہرات ہو اس لیے کوئی غیر عورت اس فضیلت و شرف میں تمہارے ساتھ شریک نہیں۔ جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ عالمین کی عورتوں میں سب سے افضل حضرت فاطمۃ الزہراء بنت رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے سب سے افضل حضرت خدیجۃ الکبریٰ بنت خویلد رضی اللہ عنہا ہیں۔ پھر حضرت مریم بنت عمران، حضرت آسیہ زوجہ فرعون اور حبیبہ رسول اللہ ﷺ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بنت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وعنہن افضل ہیں۔

شیخین نے صحیحین میں، احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مردوں میں سے کثیر افراد کامل اور عورتوں میں سے حضرت آسیہ زوجہ فرعون اور حضرت مریم بنت عمران کے سوا کوئی کامل نہیں ہوئی اور عائشہ صدیقہ کو دوسری عورتوں پر ایسے ہی فضیلت حاصل ہے جیسے ثرید کو دوسرے کھانے پر ہے (2)۔ صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت منقول ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے عورتوں میں سے بہتر عورت حضرت مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد تھیں (3)۔ اور کریب کی روایت میں ہے کہ یہ حدیث بیان کرتے وقت وکیع نے آسمان اور زمین کی طرف اشارہ بھی کیا تھا (یعنی یہ دونوں زمین و آسمان کی عورتوں میں سے بہتر عورتیں تھیں)۔ صحیحین میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث مروی ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے فاطمہ! کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تو تمام جنتی عورتوں کی سردار ہو جائے یا فرمایا کہ تو تمام اہل ایمان کی عورتوں کی سردار ہو جائے (4)۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ فرشتہ ہے جو اس رات سے قبل کبھی بھی زمین پر نہیں اترا۔ اس نے اپنے رب سے اجازت طلب کی کہ وہ مجھے آکر سلام عرض کرے اور مجھے آکر یہ خوشخبری سنائے کہ فاطمہ جنتی عورتوں کی سردار ہے۔ اور حسن وحسین جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں (5)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔

۲۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے رسول مکرم ﷺ کی رضامندی کی مخالفت کرنے سے پرہیز اختیار کرو۔ یہ شرط جزاء سے مستغنی ہے کیونکہ کلام سابق اس کی جزاء پر دلالت کرتی ہے (لہٰذا دوبارہ ذکر کی ضرورت نہیں)۔

۳۔ یہ فاء سببیہ ہے۔ یعنی جب تقویٰ اور پرہیزگاری کی شرط کے ساتھ تمہاری فضیلت تمام عورتوں پر ثابت ہو چکی ہے تو پھر ضروری ہے کہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 229 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 5 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 488 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 930 (وزارت تعلیم)
5۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 219 (وزارت تعلیم)

تم سے کوئی ایسی شے ظاہر نہ ہو جو تقویٰ کے منافی ہو مثلاً مردوں کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرنا وغیرہ۔ یعنی اگر کوئی عورت اجنبی مرد سے نرم لہجہ میں ہمکلام ہو گی تو یہ اسے حریص اور لالچی بنا دے گی۔ علامہ جزری نے النہایہ میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ کوئی مرد کسی اجنبی اور غیر عورت کے ساتھ ایسے دھیمے اور نرم لہجے میں گفتگو کرے کہ وہ عورت کو اپنا حریص بنا دے (اور اس کا میلان اس کی طرف ہونے لگے) اور خضوع کا معنی اطاعت وفرمانبرداری ہے (1)۔ اور النہایہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک آدمی کا گزر ایک مرد اور عورت کے پاس سے ہوا، اس حال میں کہ وہ دونوں آپس میں دھیمے اور نرم لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔ پس اس آدمی نے اسے اتنی شدید ضرب لگائی کہ وہ آدمی زخمی ہو گیا۔ لیکن حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسے ہدر قرار دیا (2)۔ (یعنی اسے کوئی سزا وغیرہ نہ دی) کیونکہ وہ ایسے نرم اور دھیمے انداز میں گفتگو میں مصروف تھے کہ دونوں میں سے ہر ایک کا میلان دوسرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ طبرانی نے سند حسن کے ساتھ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ عورتیں اپنے خاوندوں کی اجازت کے بغیر (غیر مردوں سے) باتیں کریں۔ دارقطنی نے الافراد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ کوئی آدمی نماز کے دوران یا اپنی زوجہ اور باندیوں کے سوا دوسری عورتوں کے سامنے انگڑائی لے۔

۴۔ فَيَطْمَعَ نھی کے جواب میں فا کے بعد اَنْ مقدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ سے مراد ایسا آدمی ہے جس میں نفاق کا شائبہ ہے۔ کیونکہ مومن کامل تو وہ ہوتا ہے جو ایمان کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے اور اپنے رب کی برہان دیکھ رہا ہوتا ہے اور وہ ایسی چیزوں میں میلان ورغبت نہیں رکھتا جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ اور وہ آدمی جس کا ایمان ضعیف اور کمزور ہو اور اس میں نفاق کا شائبہ پایا جائے تو وہ ان چیزوں کی اشتہاء اور چاہت رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر حرام قرار دی ہیں۔ غیر متواتر قرأت میں فَيَطْمَعْ مجزوم پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف محل نھی پر ہے اور وہ عورتوں کو نرم لہجہ میں گفتگو کرنے سے روکنے کے بعد ایسے آدمی کو ان کی طرف میلان سے روکتا ہے جن کے دل میں روگ ہے۔

مسئلہ: عورت کے لیے یہ مستحب ہے کہ جب وہ اجنبی مردوں سے گفتگو کرنے لگے تو لہجہ درشت اور سخت رکھے تاکہ کسی قسم کی رغبت اور میلان کا اظہار نہ ہو۔

۵۔ اور ایسی گفتگو کرو جو اچھی اور باوقار ہو اور ہر قسم کے شک وشبہ سے انتہائی دور ہو۔

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾

''اور ٹھہری رہو گھروں میں ۱؎ اپنی آرائش کی نمائش نہ کرو ۲؎ جیسے سابق دور جاہلیت میں رواج تھا ۳؎ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اطاعت کیا کرو اللہ اور اس کے رسول کی ۴؎ اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتا کہ تم سے دور کر دے پلیدی کو ۵؎ اے نبی کے گھر والو! ۶؎ اور تم کو پوری طرح پاک وصاف کر دے ۷؎''

1؎ نافع اور عاصم نے قَرْنَ کو قاف مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قَرَّ یَقَرُّ سے ماخوذ ہے۔ اس کی ماضی میں عین کلمہ مکسور ہے اور مضارع میں مفتوح ہے۔ اس کی اصل اقْرَرْنَ ہے۔ پہلی راء کو حذف کر دیا گیا اور اس کی حرکت قاف کی طرف نقل کر دی گئی اور پھر ہمزہ وصل کی ضرورت نہ ہونے کے سبب اسے گرا دیا اور باقیوں نے قاف کو مکسور پڑھا ہے، یعنی یہ قَرَّ یَقِرُّ قَرَاراً سے ماخوذ ہے۔ اس کی ماضی میں عین کلمہ مفتوح اور مضارع میں مکسور ہے۔ اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ اسی طرح دونوں کی تعلیل بھی ایک ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے گھروں میں ٹھہرے رہنے اور معصیت کے قصد سے باہر نہ نکلنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ جیسا کہ اس پر یہ قول باری تعالیٰ وَلَا تَبَرَّجْنَ دلالت کرتا ہے۔

2؎ اور اپنی آرائش کی نمائش نہ کرو۔ یہاں عطف تفسیری ہے اور معنوی طور پر تاکید کے لیے ہے۔ اس آیت طیبہ میں مطلقاً گھر سے نکلنے سے نہیں روکا گیا کہ اگرچہ وہ نماز، حج یا کسی انسانی حاجت کے لیے ہی ہو۔ جیسا کہ روافض نے گمان کر دیا جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس کے سبب حبیبۃ الرسول ﷺ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بنت صدیق اکبر رضی اللہ عنہما پر طعن و اعتراض کیا۔ کہ آپ اپنے گھر سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئیں اور وہاں سے بصرہ چلی گئیں جہاں جنگ جمل کا واقعہ پیش آیا۔ حالانکہ آپ اپنے گھر سے حج کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئیں اور آپ کے مدینہ طیبہ سے خروج کے بعد وہاں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔ اور اہل مصر نے مدینہ طیبہ میں ایسا فتنہ برپا کر دیا۔ جس کے سبب حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما بھی وہاں سے نکل پڑے اور مکہ مکرمہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جا ملے۔ وہاں ان دونوں نے آپ کو لوگوں کے مابین صلح کرانے اور فتنہ و فساد کی آگ کو فرو کرنے کے لیے خروج کا مشورہ دیا جب آپ نے اس خروج سے انکار فرمایا تو انہوں نے اپنے موقف کی تائید کے لیے اس ارشاد گرامی سے استدلال کیا لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ۔ چنانچہ آپ بصرہ کی طرف تشریف لے گئیں اور وہاں آپ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کے مابین صلح بھی طے پا گئی مگر پھر عبد اللہ بن سبا یہودی جو منافق تھا اور اپنے آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں شمار کرتا تھا۔ اس نے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دی یہاں تک کہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ہم نے یہ واقعہ اپنی کتاب السیف المسلول میں تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ تبرج بروج سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ظہور (ظاہر ہونا) ہے۔ اور یہاں مراد مردوں کے لیے اپنی زیب و آرائش کا اظہار کرنا اور اپنے حسن و جمال کو ظاہر کرنا ہے۔ ابن نجیح نے کہا ہے کہ تبرج کا معنی ہے مٹک مٹک کر تکبر سے چلنا(1)۔ علامہ بیضاویؒ نے بھی اپنی تفسیر میں یہی معنی بیان کیا ہے کہ تم فخر و مباہات سے مٹک مٹک کر نہ چلو۔(2)

3؎ سابق دور جاہلیت میں رواج عام تھا۔ ترکیب کلام میں تبرج مصدریت (مفعول مطلق) کی بناء پر منصوب ہے۔ الجاھلیۃ الاولیٰ سے مراد اسلام سے قبل کفر کی جہالت ہے اور جاھلیۃ اخریٰ سے مراد اسلام کے بعد فسق کی جہالت ہے۔ علامہ شعبی نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ زمانہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور نبی کریم ﷺ کے درمیان تھا۔ ابو العالیہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ کہ اس دور میں عورتیں ایسی قمیصیں پہنتی تھیں جو اطراف سے سلی ہوئی نہیں ہوتی تھیں جس کے سبب اطراف سے ان کا بدن دکھائی دیتا تھا۔ کلبی کا قول ہے کہ جاہلیت اولیٰ سے مراد ظالم و جابر حکمران نمرود

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 463 (الفکر)
2۔ تفسیر بیضاوی، جلد 4 صفحہ 373 (الفکر)

کا زمانہ ہے کہ عورتیں موتیوں سے قمیصیں بنا کر پہنتی تھیں اوران کے علاوہ ان کے بدن پر کوئی شے نہیں ہوتی تھی۔ وہ راستے کے درمیان میں چلتی تھیں اور اپنے آپ کو مردوں کے لیے پیش کرتی تھیں(1)۔ حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ جاہلیت اولیٰ سے مراد حضرت نوح اور حضرت ادریس علیہما السلام کا درمیانی زمانہ ہے اور یہ ہزار سال پر مشتمل تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے دو قبیلے تھے۔ ایک قبیلہ میدانی علاقہ میں سکونت پذیر تھا اور دوسرا پہاڑی علاقہ میں رہائش پذیر تھا۔ پہاڑ میں رہنے والے مرد خوبصورت تھے۔ ان کے چہرے حسین تھے لیکن عورتیں کمزور اور بدصورت تھیں اور میدانی علاقے میں رہنے والی عورتیں حسن و جمال کا پیکر تھیں اور مرد نحیف اور بدصورت تھے۔ ایک دن میدان میں سکونت پذیر لوگوں میں سے ایک کے پاس ابلیس آیا اور اجرت پر اس کی خدمت شروع کر دی۔ اسی دوران اس نے چرواہوں کی بانسری کی مثل ایک چیز تیار کی اور اس سے ایسی آواز نکلنے لگا جس کی مثل لوگوں نے اس سے قبل نہیں سنی تھیں۔ چنانچہ اس نے وہ آواز گردونواح کے تمام لوگوں میں پہنچائی۔ پس وہاں کے لوگ آواز سننے کے لیے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ لہٰذا انہوں نے ایک معین دن بنالیا جس میں اس کے لیے جمع ہوتے تھے۔ پس اس میلے میں عورتیں مردوں کے لیے بناؤ سنگھار کرتیں اور مرد ان کے لیے اپنی زیب و آرائش کا اظہار کرتے۔ پس ایک دفعہ پہاڑ میں رہنے والے لوگوں میں سے ایک آدمی ان کے اس میلے کے اجتماع میں شامل ہوا اور اس نے ان مردوں اور عورتوں کے بناؤ سنگھار اور حسن و جمال کو دیکھا۔ اور پھر واپس آ کر اپنے ساتھیوں کو اس کی خبر دی۔ تو وہ بھی انہی کی طرف چلے گئے اور وہیں میدانی علاقہ میں جا کر رہائش پذیر ہو گئے۔ پس اس طرح ان میں فحاشی اور بدکاری پھیل گئی اور عام ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولٰى۔ اور کبھی کبھی اولیٰ کا ذکر اس طرح بھی کیا جاتا ہے کہ اس کے لیے اخریٰ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے اَهْلَكَ عَادًا الْأُولٰى۔ حالانکہ عاد اخریٰ کوئی نہیں(2)۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ جاہلیت سے مراد وہ زمانہ ہے جو تمہارے زمانے سے پہلے تھا۔

۴؎ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اطاعت کیا کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی ہر اس کام میں جس کا تمہیں حکم دیا جائے اور جس سے تمہیں روکا جائے۔ کیونکہ یہی وہ تقویٰ ہے جو عالمین کی تمام عورتوں پر تمہاری افضلیت کی شرط ہے۔

۵؎ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اس کا حکم حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات اور آپ ﷺ کی اولاد میں سے دیگر افراد کو بھی شامل ہے۔ اسی تعمیم کے ارادہ کے لیے ہی عَنْكُمُ میں ضمیر مذکر ذکر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کلام سابقہ کلام کی علت بیان کرنے کے لیے ذکر فرمائی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں اوامر و نواہی کی پابندی کرنے کا حکم اس لیے ارشاد فرمایا ہے تاکہ وہ تم سے پلیدی یعنی شیطانی عمل کو دور فرما دے مثلاً گناہ اور ایسی قباحتیں اور برائیاں جو شرعاً یا طبعاً ایسی ہوں جن میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی نہ ہو انہیں تم سے اور تمہارے علاوہ دیگر اہل بیت سے دور کر دے۔

۶؎ ترکیب کلام میں اَهْلَ الْبَيْتِ محل نداء یا مدح میں ہونے کے سبب منصوب ہے۔ اہل بیت سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کے افراد خانہ ہیں۔

عکرمہ اور مقاتل نے کہا ہے کہ اہل بیت سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات ہیں کیونکہ وہی آپ ﷺ کے گھر میں تھیں۔ یہی روایت سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔ اور آپ نے یہ آیت کریمہ بھی تلاوت فرمائی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 463 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 463 (الفکر)

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ۔ اسے ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے اور ابن جریر نے عکرمہ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اور انہوں نے آیت کے سیاق وسباق سے استدلال کیا ہے۔ لیکن کُمْ ضمیر مذکر صرف ازواج مطہرات کے ساتھ حکم کی تخصیص کے مانع ہے (لہٰذا یہ حکم مردوں کو بھی شامل ہے اور ان کی تغلیب کا اظہار کرنے کے لیے ضمیر مذکر ذکر کی گئی ہے)۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور تابعین کی ایک جماعت جس میں مجاہد، قتادہ اور دیگر تابعین شامل ہیں، نے کہا ہے کہ اہل بیت حضرات علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم ہیں(1) کیونکہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے اس حال میں کہ آپ ﷺ سیاہ بالوں سے بنا ہوا کمبل اوڑھے ہوئے تھے جس پر کجاوے کی تصویریں تھیں۔ اتنے میں حسن بن علی رضی اللہ عنہما آئے تو آپ ﷺ نے انہیں اپنی چادر کے نیچے لے لیا۔ پھر حسین بن علی رضی اللہ عنہما حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے انہیں بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ پھر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا حاضر خدمت ہوئیں تو آپ ﷺ نے انہیں بھی اپنی چادر میں لے لیا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے انہیں بھی چادر میں داخل کر لیا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا اور حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو بلایا اور رب کریم کی بارگاہ میں التجاء کی اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔ حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ الآیۃ۔ اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اور ان کے دونوں صاحبزادوں کے بارے فرمایا اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں اور میرے خاص افراد ہیں۔ پس تو ان سے پلیدی کو دور فرما دے اور ان کو پوری طرح پاک صاف کر دے(4)۔ ترمذی وغیرہ نے حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے اور ابن جریر وغیرہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اور حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو بلایا۔ جبکہ یہ آیت نازل ہوئی اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ۔ پھر انہیں اپنی چادر مبارک کے نیچے لے کر رب کریم کی بارگاہ میں التجا کی اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے پلیدی دور فرما دے اور انہیں مکمل طور پر پاک صاف کر دے(5)۔

مذکورہ بالا اور ان جیسی دیگر احادیث اس پر دلالت نہیں کرتیں کہ آیت کریمہ کا یہ حکم صرف ان چار نفوس رضی اللہ عنہم کے ساتھ خاص ہے۔ اور آیت کریمہ کا ماقبل اور مابعد بھی اس تخصیص کے مانع ہے۔ اور عرف ولغت بھی اس کی تائید نہیں کرتی۔ کیونکہ لغوی طور پر بھی اہل بیت کا اصل اطلاق عورتوں پر ہے اور بچوں اور دیگر افراد خانہ پر اس کا اطلاق تبعاً ہوتا ہے۔ کیونکہ اکثر اور اغلباً بیویوں کے لیے گھر علیحدہ علیحدہ بنائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے اس قول کو بطور حکایت بیان فرمایا ہے جو انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو پکارتے ہوئے کہا تھا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ (کیا تجھے اللہ تعالیٰ کے حکم پر تعجب ہو رہا ہے تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور برکت ہو اے گھر والو!)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 464 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 288 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 278 (قدیمی)
4۔ مسند احمد، جلد 4 صفحہ 107 (صادر) 5۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 152 (وزارت تعلیم)

صحیح مفہوم وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے کہ آیت کریمہ کا حکم تمام اہل بیت کو شامل ہے، اگرچہ کلام ازواج مطہرات کے لیے ذکر کی گئی ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آیت طیبہ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ میرے گھر میں نازل ہوئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو بلا بھیجا اور فرمایا یہ میرے اہل بیت ہیں۔ تو پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کیا میں آپ کے اہل بیت میں سے نہیں ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں ان شاء اللہ۔ اسے علامہ بغویؒ وغیرہ نے روایت کیا ہے(1)۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اہل بیت کا لفظ تمام گھر والوں کو شامل ہے۔ اور ان شاء اللہ کا کلمہ محض تبرک کے لیے ہے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے اہل بیت وہ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے اور وہ آل علی، آل عقیل، آل جعفر، آل عباس اور آل حارث بن عبد المطلب رضی اللہ عنہم ہیں۔

یہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو پوری طرح گناہوں کی نجاست سے پاک صاف کر دے، دنیا میں ان سے محفوظ رکھتے ہوئے اور آخرت میں مغفرت فرماتے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو بعض چیزوں سے منع فرمایا اور بعض کے کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور انہیں وعظ و نصیحت فرمائی تاکہ رسول اللہ ﷺ کے گھر والے گناہوں سے آلودہ نہ ہوں اور وہ تقویٰ و پرہیزگاری سے متصف و مزین رہیں۔ استعارۃً گناہوں کو رجس کہا گیا اور طہارت کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا۔ کیونکہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والا ان سے ایسے ہی آلودہ ہو جاتا ہے جیسے نجاست سے اس کا بدن ملوث ہوتا ہے۔ اور متقی پاک وصاف کپڑے کی مثل پاک صاف ہوتا ہے۔ گناہوں اور رجس کے درمیان کامل مناسبت کی وجہ سے ہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مستعمل پانی نجس ہوتا ہے چاہے، وہ قربت کے لیے استعمال کیا جائے یا حدث کو دور کرنے کے لیے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کسی نے وضو کیا اور خوب اچھی طرح وضو کیا تو اس کے جسم سے خطائیں نکل جاتی ہیں یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتی ہیں۔ اسے بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب مسلمان بندہ وضو کرتا ہے۔ یا فرمایا جب مومن وضو کرتا ہے تو جب وہ اپنے چہرہ کو دھوتا ہے تو اس کے چہرہ سے وہ تمام خطائیں نکل جاتی ہیں جن کی طرف اس نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا (یعنی آنکھ کے وہ تمام گناہ پانی کے ساتھ بہہ جاتے ہیں) الحدیث، رواہ مسلم(3)۔

اسی آیت سے روافض نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت علی، فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم تمام معصوم ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفاء بھی ہیں ان کے سوا اور کوئی نہیں۔ اور اسی آیت سے اس پر بھی استدلال کیا ہے کہ ان چاروں نفوس اور ان کے سوا ان کی اولاد میں سے دیگر ائمہ کا اجماع بھی حجت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں پاک کرنے کا ارادہ فرمایا ہے تو پھر وہ معصوم ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مراد (یعنی وہ شے جس کا وہ ارادہ فرمائے) اس کے ارادہ سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اور گناہ کرنے والا تو طاہر (پاک) نہیں ہوتا اور امامت کے لیے معصوم ہونا شرط ہے جبکہ حضرات ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم بالا جماع غیر معصوم ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ائمہ تو صرف اہل بیت ہی ہیں ان کے سوا اور کوئی نہیں۔ روافض کا مذکورہ استدلال باطل اور غلط ہے اور اس کی متعدد وجوہ ہیں۔

(1) آیت کریمہ اپنے حکم کے اعتبار سے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور ان کے دونوں صاحبزادوں کے

ساتھ مختص نہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے بلکہ یہ آیت تو امہات المومنین کے بارے نازل ہوئی ہے لیکن یہ چاروں مقتدر اور معزز نفوس ان کے حکم میں داخل ہیں۔

(2) یہ آیت ان کے معصوم ہونے پر دلالت ہی نہیں کرتی کیونکہ اس کی مثل الفاظ آیت وضو میں تمام امت کے لیے مذکور ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس آیت وضو کے مقتضی ہیں تو اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ تمہارے وضو کرنے سے تمہارے بدنوں کو نجاستوں اور حدثوں سے پاک فرما دے اور اس آیت کا مقتضی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں گناہوں سے پاک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ دونوں آیتوں کے مقتضی میں یہ فرق کیسے کیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ دونوں آیتوں کا انداز ایک طرح کا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جس طرح مومنین کے بدنوں کو پاک صاف کرنے کا ارادہ فرماتا ہے جبکہ وہ وضو کریں اور اعضائے وضو کے لیے پانی استعمال کریں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ حضور نبی کریم ﷺ کے اہل بیت کو گناہوں سے پاک صاف کرنے کا ارادہ فرماتا ہے اگر وہ تقویٰ اور پرہیز گاری اختیار کریں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لیے طہارت ظاہرہ کے حصول کے لیے پانی کے استعمال کا طریقہ بیان فرمایا اور اہل بیت کے لیے طہارت باطنہ کے حصول کے لیے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور انہیں فَلَا تَخْضَعْنَ ارشاد فرمایا۔ لہٰذا جس طرح ظاہر بدن کی طہارت بندے کے اس اختیار پر موقوف ہے کہ وہ پانی استعمال کرے اسی طرح گناہوں سے طہارت اس پر موقوف ہے کہ وہ تقویٰ و پرہیز گاری اختیار کرے۔ واللہ اعلم

(3) عصمت (معصوم ہونا) امامت کے لیے شرط نہیں ہے۔ بلکہ یہ جائز ہے کہ معصوم کے موجود ہونے کے باوجود غیر معصوم امام ہو۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو امامت اور بادشاہی عطا فرمائی حالانکہ ان میں اللہ تعالیٰ کے معصوم نبی حضرت اشموئیل اور حضرت داؤد علیہما السلام موجود تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا الی قولہ تعالیٰ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ۔ واللہ اعلم۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

"اور یاد رکھو[1] اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور حکمت کی باتوں کو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں[2]۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا لطف فرمانے والا ہر بات سے باخبر ہے[3]"

[1] اس کا عطف اَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ پر ہے۔ اور ان کے درمیان حکم کی علت بیان کرنے کے لیے جملہ معترضہ بیان کیا گیا ہے۔

[2] اٰيٰتِ اللّٰهِ سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور حکمت سے مراد وحی غیر متلو یعنی سنت ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ آیت اللہ اور حکمت سے مراد قرآن کریم کے احکام اور اس کی نصیحتیں ہیں۔ علامہ بیضاویؒ نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ تم اس کتاب کو یاد رکھو جو دونوں امروں کی جامع ہے۔ ایک تو اس انعام کی یاد دلانا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس صورت میں فرمایا کہ انہیں نبی کا اہل بیت بنا دیا اور ان کے گھروں کو مہبط وحی قرار دیا اور دوسرا یہ کہ انہوں نے نزول وحی کی اس مشقت آمیز کیفیت کا مشاہدہ کیا ہے جو ایمان کی تقویت کا موجب ہے اور اوامر و نواہی کی صورت میں انہیں جن امور کا پابند بنایا گیا ہے وہ ان کے جذبات کو ان کی اطاعت و اتباع کرنے پر برانگیختہ کرتی ہے۔(1)

[3] بے شک اللہ تعالیٰ تم پر بڑا لطف فرمانے والا ہے کہ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے اور تمہیں ایسے امور کی تعلیم دیتا ہے جو دین میں اصلاح کا

1۔ تفسیر بیضاوی، جلد 4 صفحہ 374 (الفکر)

سبب بنتے ہیں۔ اور وہ ہر شے سے باخبر ہے وہ جانتا ہے کہ کون اس کا نبی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کون نبی کا اہل بیت ہونے اور اس کی صحبت میں رہنے کے قابل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ۔ واللہ اعلم۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مردوں کا ذکر تو کیا ہے لیکن عورتوں کا ذکر تو بھلائی کے ساتھ نہیں فرمایا کیا ہم میں کوئی ایسی اچھائی اور بھلائی موجود نہیں جس کے سبب ہمارا بھی تذکرہ کیا جائے۔ ہمیں تو خوف ہونے لگا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری طرف سے اطاعت الٰہی بھی قبول نہ کی جائے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ الآیۃ نازل فرمائی (1)۔ طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور اسی طرح ابن سعد نے حضرت قتادہؓ سے بھی طبرانی نے سند مقبول کے ساتھ حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ عورتوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان مردوں کا ذکر تو فرماتا ہے لیکن اہل ایمان عورتوں کا ذکر نہیں فرماتا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ اسے ابن جریر نے حضرت قتادہؓ سے مرسل روایت کیا ہے۔ امام ترمذیؒ نے ام عمارہ انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے کہ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور عرض کی میں تو ہر شے مردوں کے لیے ہی دیکھ رہی ہوں اور عورتوں کو نہیں دیکھتی کہ کسی اچھی شے کے سبب ان کا بھی تذکرہ کیا جارہا ہو تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (3)

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ مقاتل نے بیان کیا ہے کہ ام سلمہ بنت ابی امیہ اور آسیہ بنت الکعب انصاریہ رضی اللہ عنہما حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کیا وجہ ہے ہمارا رب اپنی کتاب میں مردوں کا ذکر تو فرماتا ہے لیکن عورتوں کی کسی شے کا ذکر نہیں کرتا ہمیں تو یہ خوف ہونے لگا ہے کہ شاید عورتوں میں کوئی بھلائی ہی نہ ہو۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ جب حضرت اسماء بنت عمیس اپنے خاوند حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبشہ سے واپس لوٹیں تو ازواج مطہرات کے پاس حاضر ہوئیں اور کہا کیا ہمارے بارے میں قرآن کریم میں کوئی آیت نازل ہوئی ہے؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ تو پھر وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ بے شک عورتیں تو نقصان (نامراد) اور خسارے میں ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ایسے کیوں؟ تو انہوں نے عرض کی عورتوں کا اس طرح بھلائی اور خیر کے ساتھ ذکر نہیں کیا جاتا جیسے مردوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (4)

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

" بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، سچ بولنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 374 (الفکر)
2۔ معجم کبیر، جلد 12 حدیث: 12614 (العلوم والحکم)
3۔ ... جلد 2 صفحہ 152-53 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 465 (الفکر)

والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں، خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والیاں اور کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں [1] تیار کر رکھا ہے اللہ نے ان سب کے لیے مغفرت اور اجر عظیم [2]۔"

[1] یعنی مردوں اور عورتوں میں سے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے حکم کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں، اپنے معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے والے اور اسی پر توکل وبھروسہ کرنے والے ہیں۔ اور اس دین کی تصدیق کرنے والے ہیں جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مردوں اور عورتوں میں سے محفوظ رہیں گے جب اللہ تعالیٰ لوگوں کو ہلاک کرے گا۔ دونوں فریقوں میں سے اطاعت وفرمانبرداری پر مداومت اختیار کرنے والے اور قول وعمل میں سچ اختیار کرنے والے مرد اور عورتیں یعنی ایسے اعمال کرنے والے جن پر ان کی تعریف کرنے والے کو سچا مانا جاتا ہو۔ اور مصائب وآلام میں صبر کرنے والے مرد اور عورتیں، اطاعت وفرمانبرداری پر ڈٹ جانے والے اور اتباع شہوات اور گناہوں سے اجتناب کرنے والے مرد اور عورتیں۔ اور تواضع وانکساری اختیار کرنے والے مرد اور عورتیں جن میں تکبر اور غرور نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہتے ہوئے اس رزق سے صدقہ وخیرات کرنے والے مرد اور عورتیں، جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا ہے۔ اور روزے رکھنے والے مرد اور عورتیں چاہے وہ روزے فرض ہوں یا نفل اور اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور ایسے عمل سے اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والی عورتیں جو عمل حلال نہیں۔ اور اپنے دلوں اور اپنی زبانوں سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں (۱)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ مجاہد نے کہا ہے بندہ اس وقت تک کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والوں میں سے نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ وہ کھڑے ہونے، بیٹھنے اور لیٹنے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہے(1)۔ یعنی کسی وقت بھی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے میں غفلت اور سستی نہیں برتتے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا تصور تب ہی کیا جا سکتا ہے جب دل ذکر الٰہی میں فنا اور مستغرق ہو جائے اور دائمی حضوری کا مقام حاصل ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مفردون سبقت لے گئے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مفردون کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور عورتیں۔ اسے مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے والی اور کوئی شے نہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کی کیا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں مگر ایک صورت ہے کہ مجاہد اپنی تلوار کے ساتھ اتنا لڑے کہ تلوار ٹوٹ جائے (تو اس صورت میں اس کا مقام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 466 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 341 (قدیمی)

(۱) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے پوچھا کون سا مجاہد بلند درجہ پر فائز ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے زیادہ کرنے والا ہوگا۔ پھر عرض کی کون سا روزہ دار اعظم درجہ پر فائز ہوگا؟ فرمایا جو اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ کرنے والا ہوگا۔ پھر اس نے نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقے میں سے ہر ایک کے بارے استفسار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے جو اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے زیادہ کرنے والا ہوگا۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے کہا اے ابو حفص! ذکر کرنے والے ہر بھلائی لے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جی ہاں (ایسے ہی ہے)۔ از مفسر رحمہ اللہ۔

بڑھ جائے گا) اسے امام بیہقی نے الدعوات الکبیر میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض سے عرض کی گئی کون سے لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دوسروں سے افضل اور بلند درجہ پر فائز ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ مرد اور عورتیں جو کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے سے بھی افضل و اعلیٰ مرتبہ پر ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر (مجاہد) اپنی تلوار کے ساتھ اتنا لڑے یہاں تک کہ تلوار ٹوٹ جائے اور وہ خون میں لت پت ہو جائے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے کا اس سے درجہ افضل اور بلند تر ہوگا۔ (1) اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ یاد الٰہی سے غافل رہنے والوں میں ذکر کرنے والا ایسے ہوتا ہے جیسے خشک درخت میں سر سبز شاداب ٹہنی، غافلین میں ذکر کرنے والا ایسے ہوتا ہے جیسے تاریک مکان میں چراغ، غافلوں میں ذکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کا مقام اسے دکھا دیتے ہیں حالانکہ وہ ابھی زندہ ہوتا ہے۔ اور غافلین میں ذکر کرنے والے کی تمام بولنے والوں اور گونگوں کی تعداد کے برابر اللہ تعالیٰ مغفرت فرما دیتا ہے بولنے والوں سے مراد تمام نسل انسانی ہے اور گونگوں سے مراد چوپائے ہیں۔ رواہ رزین۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ عطا بن ابی رباح نے کہا جس کسی نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا وہ اس ارشاد میں داخل ہے اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ۔ جس نے یہ اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ اس کا رب ہے محمد ﷺ اس کے رسول ہیں اور دل نے اس کی زبان کی مخالفت نہ کی (یعنی دل نے بھی اس قول کی تصدیق کر دی) تو وہ اس ارشاد کے تحت داخل ہے وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ، جس نے فرائض میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کی اور سنت میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کی تو وہ اس ارشاد کے تحت دخل ہے وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ۔ جس نے اپنے قول کو کذب سے محفوظ رکھا تو وہ اس ارشاد کے زمرے میں داخل ہو گیا وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ، جو کوئی اطاعت و فرمانبرداری پر کاربند رہا، معصیت سے ڈرتا رہا اور تکلیف و مصیبت پر صبر کرتا رہا تو وہ اس ارشاد کے تحت داخل ہو گیا وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ، جس کسی نے نماز ادا کی اور یہ نہ پہچانا کہ اس کی دائیں طرف کون ہے اور اس کی بائیں جانب کون ہے تو وہ اس قول باری تعالیٰ کے تحت آ گیا وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ، جس کسی نے ہر ہفتے میں ایک درہم صدقہ کیا تو وہ اس ارشاد کے تحت داخل ہو گیا وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ، جس کسی نے ہر مہینہ میں ایام بیض (چاند کی تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں تاریخ) کے روزے رکھے تو وہ اس ارشاد کے زمرہ میں آ گیا وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ، جس کسی نے اپنی شرم گاہ کو حرام عمل سے محفوظ رکھا تو وہ اس قول کے تحت داخل ہو گیا وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ اور جس کسی نے پانچ نمازیں پابندی سے ادا کیں تو وہ ان لوگوں کے زمرہ میں داخل ہو گیا جن کا ذکر قول باری تعالیٰ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ میں ہے۔ (2) علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ مؤنثوں کا عطف مذکروں پر دونوں جنسوں کے اختلاف کی بناء پر ضروری ہے اور زوجین (جوڑے یعنی مذکر و مؤنث دونوں) کا عطف زوجین پر دونوں وصفوں کے متغائر ہونے کی وجہ سے ضروری نہیں۔ اسی لیے قول باری تعالیٰ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ الخ میں حرف عطف ذکر نہیں کیا گیا۔ اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس پر دلالت ہو جائے کہ اعداد اور موعود لھم تمام ان صفات کے درمیان جمع ہیں۔ (3)

لے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ان تمام گناہوں سے مغفرت تیار کر رکھی ہے۔ جو ان سے صادر ہوئے ہیں اور ان کی اطاعت

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 173 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 466 (الفکر)
3۔ تفسیر بیضاوی، مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 375 (الفکر)

فرمانبرداری پر اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ﴿۳۶﴾

''نہ کسی مومن مرد کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ مومن عورت کو[1] کہ جب فیصلہ فرما دے اللہ تعالیٰ اور رسول کسی معاملہ کا تو پھر انہیں کوئی اختیار ہو اس معاملہ میں[2] اور جو نافرمانی کرتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی تو وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا[3]''

[1] طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت قتادہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زید بن حارثہؓ کے ساتھ نکاح کے ارادہ سے زینب بنت جحش کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ تو انہیں یہ گمان ہوا کہ آپ ﷺ نے اپنے لیے یہ پیغام بھیجا ہے۔ لیکن جب انہیں علم ہوا کہ آپ ﷺ تو ان کا نکاح زیدؓ سے کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے انکار کر دیا چنانچہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ الآیہ''(1) (کہ نہ کسی مومن مرد کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ کسی مومن عورت کو۔ تو پھر وہ راضی ہو گئیں اور (فیصلہ) کو تسلیم کر لیا۔) علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ کو زمانہ جاہلیت میں عکاظ کی منڈی سے خریدا تھا اور پھر آزاد کر کے انہیں متبنیٰ بنا لیا تھا۔ پس جب حضور نبی کریم ﷺ نے (حضرت زینب بنت جحشؓ) کو پیغام نکاح بھیجا تو انہوں نے یہ گمان کرتے ہوئے کہ آپ ﷺ نے یہ پیغام اپنے لیے دیا ہے اسے تسلیم کر لیا پھر جب انہیں یہ علم ہوا کہ آپ ﷺ نے انہیں حضرت زیدؓ کے لیے پیغام نکاح بھیجا ہے تو انہوں نے انکار کر دیا اور اسے ناپسند کیا۔ اسی طرح ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ (حضرت زینب اور ان کے بھائی حضرت عبداللہؓ کی ماں امیمہ بنت عبدالمطلب رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی تھی)(2)۔ ابن جریر نے حضرت عکرمہ اور عوفی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش کو حضرت زید بن حارثہؓ کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا۔ تو انہوں نے انہیں حقیر سمجھا اور انہیں پسند نہ کرتے ہوئے کہا میں حسب و نسب میں ان سے بہتر ہوں۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ۔(3) تو اس میں مومن سے مراد حضرت عبداللہ بن جحشؓ ہیں اور مومنہ سے مراد حضرت زینب بنت جحشؓ ہیں۔

[2] اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ حتمی طور پر کسی معاملہ کا فیصلہ فرما دیں۔ تو پھر وہ اپنے معاملات میں سے جو چاہیں اختیار کریں بلکہ ان پر وہی امر واجب ہے جس کا حکم انہیں اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اختیار کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے اختیار کے تابع بنا لیں۔ لَهُمُ میں ضمیر جمع ذکر کیے جانے کی علت یہ ہے کہ لفظ مومن اور مومنہ دونوں نکرہ ہیں اور یہ محل نفی میں واقع ہوتے کے سبب عموم پر دلالت کر رہے ہیں۔ اور دوسری ضمیر جمع تعظیم کے لیے ہے۔ قراء کوفہ اور ہشام نے فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ ہونے کی وجہ سے یکون کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے فاعل مؤنث ہونے کی وجہ سے اسے تاء کے ساتھ تکون پڑھا ہے۔ خیرہ اور خیار دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ مطلق امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ عالم اور جسے دینی فضیلت حاصل ہوتی ہے وہ علوی اور دیگر شرفاء کا کفو

1۔ معجم کبیر، جلد 24 صفحہ 45 حدیث: 124 (العلوم والحکم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 467 (الفکر)
3۔ تفسیر طبری، جلد 22 صفحہ 10 (الامیریہ)

ہوتا ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابن زید سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا یہ آیت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی۔ عورتوں میں سے سب سے پہلے انہوں نے ہی ہجرت کی۔ پھر انہوں نے اپنا آپ حضور نبی کریم ﷺ کو ہبہ کر دیا۔ پس آپ ﷺ نے زید بن حارثہؓ کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ اس پر ان کے بھائی ناراض ہو گئے اور دونوں نے کہا کہ ہماری مراد تو حضور نبی کریم ﷺ کی اپنی ذات تھی (کہ اپنے ساتھ نکاح فرمائیں گے) لیکن آپ نے ہماری شادی دوسروں سے کر دی۔(1)

سو اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔ ضللاً مبیناً سے مراد صحیح اور درست نظریہ سے واضح طور پر منحرف ہو جانا ہے۔ اگر یہ انحراف اور نافرمانی حکم کو مکمل طور پر رد کرنے اور اس کے انکار کی صورت میں ہو تو یہ کفر ہے۔ اور اگر انحراف اور نافرمانی صرف عملاً ہو جبکہ حکم کو قبول کرتے ہوئے اس کا وجوب کا اعتقاد ہو تو ایسا انحراف فسق ہے۔ جملہ فقد ضل محذوف شرط کی جزاء کی علت بیان کرنے کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہلک فَقَدْ ضَلَّ۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور حضرت زینب بنت جحش اور ان کے بھائی رضی اللہ عنہما نے سنی تو دونوں اس پر راضی ہو گئے اور اسے تسلیم بھی کر لیا نتیجۃً حضرت زینبؓ نے اپنے بارے میں اختیار رسول اللہ ﷺ کے سپرد کر دیا اسی طرح ان کے بھائی نے بھی کیا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان کا نکاح حضرت زیدؓ سے فرما دیا اور وہ ان کے ساتھ رہنے لگے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں دس دینار، ساٹھ درہم، اوڑھنی، قمیص، تہبند، ایک چادر، پچاس سیر غلہ اور تیس صاع کھجوریں عطا فرمائیں۔ اور وہ ایک مدت تک آپ ﷺ کے پاس ٹھہری رہیں۔ پھر ایک دن رسول اللہ ﷺ کسی کام کی غرض سے ان کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ نے حضرت زینبؓ کو اس حال میں دیکھا کہ وہ اوڑھنی اور قمیص پہنے کھڑی تھیں۔ ان کی رنگت سفید تھی اور قریش کی عورتوں میں سے انتہائی حسین وجمیل تھیں۔ وہ آپ کے دل میں اتر گئیں اور آپ ﷺ نے ان کے حسن وجمال پر ازراہ تعجب فرمایا سبحان اللہ! اے دلوں کو پھیرنے والے۔ پس اس کے بعد آپ ﷺ واپس تشریف لے آئے۔ جب حضرت زیدؓ آئے تو آپ ﷺ نے ان کے سامنے اس کا ذکر کر دیا۔ پس زید سمجھ گئے۔ پس اسی وقت انہوں نے اپنے دل میں حضرت زینب کے بارے کراہت اور ناپسندیدگی ڈال لی۔ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی میں اپنی بیوی کو اپنے سے جدا کرنا چاہتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تجھے کیا ہوا ہے کیا تم نے اس میں کوئی ناپسندیدہ حرکت دیکھی ہے؟ انہوں نے عرض کی نہیں قسم بخدا یا رسول اللہ! میں نے ہمیشہ اس سے خیر اور بھلائی ہی پائی ہے۔ لیکن وہ مجھ پر اپنی خاندانی عظمت وشرف کا اظہار کرتی رہتی ہیں اور اس طرح مجھے اپنی زبان سے اذیت پہنچاتی رہتی ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی زوجہ کو اپنے پاس ہی روکے رکھو اور ان کے بارے اللہ تعالیٰ سے ڈرو(2)۔ اسی طرح ابن جریر نے ابو زید سے روایت نقل کی ہے۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآىٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۳۷﴾

1۔ [illegible]　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 467 (الفکر)

''اور یاد کیجیے جب آپ نے فرمایا اس شخص کو جس پر اللہ نے بھی احسان فرمایا اور آپ نے بھی احسان فرمایا[1] اپنی بی بی کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اللہ سے ڈر[2] اور آپ مخفی رکھے ہوئے تھے اپنے جی میں وہ بات جسے اللہ ظاہر فرمانے والا تھا[3] اور آپ کو اندیشہ تھا لوگوں (کے طعن وتشنیع) کا حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس سے ڈریں[4] پھر جب پوری کر لی زید نے اسے طلاق دینے کی خواہش، تو ہم نے اس کا آپ سے نکاح کر دیا[5] تاکہ (اس عملی سنت کے بعد) ایمان والوں پر کوئی حرج نہ ہو اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں جب وہ انہیں طلاق دینے کا ارادہ پورا کر لیں اور اللہ کا حکم تو ہر حال میں ہو کر رہتا ہے[6]''

1۔ حاکم نے حضرت انسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت زید بن حارثہؓ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حضرت زینب بنت جحشؓ کی شکایت لے کر حاضر ہوئے تو حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا کہ اپنی زوجہ کو اپنے پاس ہی روکے رکھو۔ تو اس وقت آیت وَاِذْتَقُوْلُ الآیہ نازل ہوئی(1)۔ اے محمد ﷺ یاد کیجیے جب آپ نے اسے فرمایا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی طرف ہدایت عطا فرمائی اسے آپ کی مصاحبت اور سنگت عطا فرمائی اور اس کی محبت اور اس پر رحمت کرنے کے جذبات آپ کے دل میں ڈال دیے اور آپ نے اس پر خرچ کرنے اور اسے آزاد کرنے کا احسان فرمایا یعنی حضرت زید بن حارثہؓ۔

2۔ کہ وہ اپنے پاس اپنی بیوی کو روکے رکھے یعنی حضرت زینب بنت جحشؓ کو اور وہ اپنی زوجہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اسے طلاق نہ دے کیونکہ طلاق تمام مباح اعمال میں سے زیادہ ناپسندیدہ اور مبغوض عمل ہے۔

3۔ قول باری تعالیٰ اَمْسِکْ تَقُوْلُ کا مقولہ ہے اور تُخْفِیْ کا جملہ تَقُوْلُ پر معطوف ہے۔ یعنی آپ اپنے جی میں وہ بات مخفی رکھے ہوئے تھے جسے اللہ تعالیٰ ظاہر فرمانے والا تھا۔ امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت زینب بنت جحش اور حضرت زید بن حارثہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے(2)۔ حسن نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زید کی بات کو پسند کیا لیکن حیا اور کرامت کی وجہ سے اسے اپنے جی میں چھپائے رکھا۔ یہ قول بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے دل میں یہ بات مخفی رکھی کہ اگر زید نے زینب کو علیحدہ کر دیا تو آپ اس سے شادی کر لیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا کہ آپ ﷺ نے ان کی محبت چھپائے رکھی۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے پسند فرمایا کہ زید انہیں طلاق دے دیں(3)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ سفیان بن عیینہ نے علی بن زید بن جدعان سے روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے امام زین العابدین علی بن حسینؓ نے پوچھا کہ اس قول باری تعالیٰ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ کے بارے حسن کیا کہتے ہیں؟ تو میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت زیدؓ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا نبی اللہ! میں زینب کو اپنے سے جدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے ان کی اس بات کو پسند کیا لیکن یہ فرمایا اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰهَ۔ تو اس پر امام زین العابدین علی بن حسینؓ نے فرمایا اس طرح نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مطلع فرما دیا تھا کہ وہ آپ کی ازواج میں سے ہوں گی اور زید عنقریب انہیں طلاق دے دیں گے۔ پھر جب زید آئے اور آ کر عرض کی میں تو انہیں طلاق دینے کا ارادہ رکھتا ہوں اور آپ نے فرمایا اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بطور عتاب یہ فرمایا۔ اور فرمایا آپ نے اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ کیوں کہا ہے جبکہ ہم نے آپ کو مطلع فرما دیا ہے کہ وہ عنقریب آپ کی ازواج میں سے ہو جائیں گی۔ یہی مفہوم زیادہ اولیٰ

1۔ مستدرک حاکم: 3563 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 706 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 468 (الفکر)

ہے اور انبیاء علیہم السلام کی شان کے زیادہ لائق ہے اور الفاظ تلاوت کے مطابق بھی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ظاہر کرنے کے بارے آگاہ فرمادیا ہے جسے آپ مخفی رکھے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ساتھ حضرت زینب کی شادی کے سوا اور کچھ بھی ظاہر نہیں فرمایا اور فرمایا زَوَّجْنٰكَهَا (ہم نے آپ کا نکاح ان سے کر دیا)۔ پس اگر وہ بات جسے رسول اللہ ﷺ چھپائے ہوئے تھے وہ ان کی محبت اور ارادہ طلاق ہوتا تو بالیقین اللہ تعالیٰ اس کا اظہار فرمادیتے۔ اور نکاح کی بات آپ ﷺ نے اس لیے مخفی رکھی کہ آپ ﷺ کو حیا محسوس ہونے لگی کہ آپ زید کو یہ کہیں کہ وہ زینب جو تیری بیوی اور تیرے نکاح میں ہے وہ عنقریب میری بیوی ہو جائے گی (1)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ امام زین العابدین کا بیان کردہ یہ قول انتہائی پسندیدہ اور خوبصورت ہے۔ اور دوسرا یہ قول کہ آپ ﷺ نے ان کی محبت کو مخفی رکھا یا زید کے طلاق دینے کی صورت میں ان سے نکاح کرنے کی خواہش کو چھپائے رکھا تو اس سے بھی انبیاء علیہم السلام کی شان میں کوئی عیب یا نقص نہیں نکالا جا سکتا۔ کیونکہ بندے کے دل میں جو بات پیدا ہوتی ہے تو صرف اس کے سبب اس پر ملامت نہیں کی جا سکتی کیونکہ ان کی مثل وہ اشیاء جن کا قصد نہ کیا جائے صرف ان کے دل میں وارد ہونے سے ان پر کوئی گناہ نہیں (2)۔ کیونکہ محبت تو فقط نفس کا میلان ہے اور طبع بشری میں سے ہے۔ اور آپ کا قول اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ یہ امر بالمعروف ہے اور یہ اچھائی اور نیکی ہے اس میں کوئی گناہ نہیں۔ میں کہتا ہوں بلکہ اس پر تو اجر عظیم ہے کیونکہ یہ تو ایسا امر بالمعروف ہے جو اپنی طبیعت کے خلاف ہے۔ رب کریم نے ایسے ہی امر کے بارے فرمایا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (وہ دوسروں کو اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انہیں بھی سخت حاجت ہو اور جو شخص حرص نفس سے محفوظ رہتے ہیں وہ ہی کامیاب ہونے والے ہیں)۔ اور حسن کے قول کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے اس وقت فرمایا جب زینب کو دیکھا سُبْحَانَ اللّٰهِ مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ۔ کیونکہ یہ قول اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کا دل حضرت زینب کے ساتھ شادی کرنے کی طرف پھیر دیا جبکہ پہلے آپ ﷺ کے دل میں یہ تھا کہ آپ ان کا نکاح زیدؓ سے کرا دیں گے۔

وَتَخْشَى النَّاسَ کا عطف تُخْفِيْ پر ہے۔ یعنی آپ لوگوں کے طعن و تشنیع سے ڈرتے تھے کہ وہ یہ کہیں گے کہ انہوں نے ایک آدمی کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ کا جملہ تَخْشَى کے فاعل سے حال ہے (حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس سے ڈریں) حضرت عمر، ابن مسعود اور عائشہ صدیقہؓ نے کہا ہے کہ اس آیت سے بڑھ کر کوئی شدید اور سخت آیت رسول اللہ ﷺ پر نازل نہیں ہوئی۔ اور مسروق سے روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ اگر حضور نبی کریم ﷺ اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی میں سے کوئی چیز مخفی رکھتے تو یہ آیت ضرور چھپا لیتے وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (3)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت نازل فرما کر اللہ تعالیٰ نے یہ قصد نہیں فرمایا کہ حضور نبی کریم ﷺ اس سے ڈرتے ہی نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ہے اِنِّيْ اَخْشَاكُمْ وَاَتْقَاكُمْ (بے شک تم سے زیادہ خشیت و تقویٰ رکھتا ہے)(4)۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام کے بارے ارشاد فرمایا يَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے بھی نہیں ڈرتے)۔ لیکن جب لوگوں سے ڈرنے کا ذکر فرمایا تو فرمایا کہ اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 468 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 469 (الفکر)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 152 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 469 (الفکر)

تعالیٰ ہی زیادہ حق رکھتا ہے کہ تمام حالات میں اور جمیع اشیاء میں اسی سے ڈرا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ آیت طیبہ کا معنی یہ ہے کہ آپ لوگوں کے طعن وتشنیع سے ڈرتے ہیں اور آپ لوگوں سے ڈرنے کی نسبت کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زیادہ حق رکھتا ہے کہ آپ اس سے خوفزدہ رہیں۔ پس آپ نے لوگوں سے ڈرتے ہوئے اور ان سے حیا کرتے ہوئے ہی ایک پوشیدہ بات کو مخفی رکھا اور اللہ تعالیٰ کی خشیت کے سبب آپ نے (حضرت زیدؓ) کو خیر اور نیکی کا حکم دیا اور آپ نے کوئی بھی ایسی شے نہیں چھوڑی جس کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا ہو۔ اور ان دونوں کے درمیان کوئی منافاۃ نہیں۔ اور قول باری تعالیٰ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ کا معنی یہ ہے کہ وہ کسی سے بھی اس طرح خوفزدہ نہیں ہوتے جس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی اور تعمیل چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ رہا لوگوں سے ڈرنے کا مفہوم تو اس کا معنی ہے دیگر امور میں لوگوں سے حیا کرنا اور یہ اچھی شے ہے کیونکہ حیاء تو ایمان کا حصہ ہے۔ متفق علیہ (1)۔ یہ حدیث حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً روایت ہے۔ صحیحین میں حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حیاء مکمل طور پر خیر اور بھلائی ہے (2) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا حیا اور ایمان دونوں ایک ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ پس جب ان میں سے ایک کو اٹھا لیا جاتا ہے تو دوسرے کو بھی اٹھا لیا جاتا ہے (3)۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ جب ان میں سے ایک کو سلب کر لیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اس کے تابع ہوتا ہے (4)۔ (یعنی اسے بھی ساتھ ہی سلب کر لیا جاتا ہے) اسے بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔ امام مالکؒ نے اسے زید بن طلحہ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ ابن ماجہؒ اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت انس اور ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک ہر دین کا کوئی خلق ہوتا ہے اور دین اسلام کا خلق حیا ہے (5) واللہ اعلم۔ مسلم، احمد، نسائی، ابو یعلی، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ نے روایت نقل کی ہے۔ اور اسے علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے اور بغویؒ کے یہ الفاظ حضرت انسؓ سے مروی ہیں کہ جب حضرت زینبؓ کی عدت کے ایام گزر گئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ کو فرمایا جاؤ اور اسے میرے بارے میں یاد دلاؤ۔ چنانچہ حضرت زیدؓ چلے گئے یہاں تک کہ ان کے پاس پہنچے تو وہ اپنا آٹا خمیر کر رہی تھیں۔ حضرت زیدؓ فرماتے ہیں کہ جب میری نظر ان پر پڑی تو وہ مجھے اپنے سینے سے اتنی عظیم اور ذی مرتبہ محسوس ہوئیں کہ میں نے ان کی طرف دیکھنے کی طاقت بھی نہیں رکھی۔ کیونکہ اس وقت میں یہ جانتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے (نکاح کے ارادہ سے) ان کا ذکر کیا تھا۔ پس میں نے فوراً اپنی پیٹھ پھیر لی اور میں نے الٹے پاؤں مڑتے ہوئے کہا اے زینب! مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے آپ تجھے یاد فرما رہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا میں کچھ کرنے والی نہیں یہاں تک کہ میں اپنے رب سے مشورہ کر لوں۔ پس آپ اٹھ کر (اپنے گھر کی) مسجد (نماز کی مخصوص جگہ) کی طرف چلی گئیں اور پھر قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا الآیہ" (6)

پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور حضرت زینب کے پاس بلا اجازت چلے گئے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں ہمیں یاد ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے (ان کے ولیمہ کے وقت) ہمیں گوشت روٹی کھلائی۔ یہاں تک کہ نصف کے قریب دن گزر گیا۔ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر چلے گئے اور دو آدمی گھر میں کھانے کے بعد باتیں کرتے ہوئے باقی رہ گئے۔ پس رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور میں بھی آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ پس آپ ﷺ باری باری تمام ازواج مطہرات کے حجروں میں تشریف لے گئے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 47 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 48 (قدیمی) 3۔ شعب الایمان: 7727 (العلمیہ)
4۔ شعب الایمان: 7726 (العلمیہ)

آپ ﷺ انہیں سلام فرماتے اور وہ آپ کو سلام پیش کرتیں اور عرض کرتیں یارسول اللہ! ﷺ آپ نے اپنی زوجہ محترمہ کو کیسے پایا ہے؟ حضرت انسؓ فرماتے ہیں مجھے یاد نہیں کہ پھر میں نے خبردی کہ وہ لوگ جا چکے ہیں یا کہ انہوں نے مجھے اطلاع دی۔ پس اطلاع پا کر آپ ﷺ تشریف لے گئے اور حجرہ شریفہ میں داخل ہو گئے حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ گھر میں داخل ہونے لگا کہ میرے اور آپ ﷺ کے درمیان پردہ ڈال دیا گیا۔ اور اس وقت پردے کے احکام نازل ہوئے (1)۔ قول باری تعالیٰ فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا میں ھا سے مراد حضرت زیدؓ کی اہلیہ حضرت زینب بنت جحشؓ ہیں۔ اور وَطَرًا سے مراد حاجت اور ضرورت ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جب حضرت زیدؓ ان سے اکتا گئے اور آپ کو ان کی کوئی حاجت اور ضرورت باقی نہ رہی اور انہیں طلاق دے دی اور پھر ان کی عدت گزر گئی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خواہش وحاجت پوری کرنا طلاق سے کنایہ ہے (یعنی اس سے مراد طلاق ہے)۔ تو ہم نے انہیں آپ کی زوجہ بنا دیا۔ امام بخاری، احمد، ترمذی، حاکم، ابن مردویہ، عبد بن حمید اور بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت زینبؓ دیگر ازواج مطہرات سے اظہار فخر کرتیں اور کہتیں کہ تمہارے نکاح تمہارے گھر والوں نے کیے ہیں اور میرا نکاح سات آسمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (2) اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں بے شک اللہ تعالیٰ میرے نکاح کا ولی ہے اور تمہارے نکاح تمہارے اولیاء نے کیے ہیں۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ امام شعبیؒ نے کہا ہے حضرت زینبؓ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کرتی تھیں کہ میں آپ کو ایسی تین چیزیں پیش کرتی ہوں جو آپ کی ازواج میں سے کسی اور زوجہ محترمہ کو حاصل نہیں۔ پھر آپ ان پر اپنی ترجیح کا اظہار اس طرح کرتیں کہ میرا اور آپ کا دادا ایک ہے، آپ کے ساتھ میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے آسمان میں فرمایا ہے اور میرے نکاح کے سفیر حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں (3)۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینبؓ کی طرح کسی اور زوجہ کا ولیمہ نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے ایک بکری ذبح فرمائی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ شب زفاف بسر کرلی تو آپ ﷺ نے ان کا ولیمہ کیا اور مسلمانوں کو خوب پیٹ بھر کر گوشت روٹی کھلایا۔

۲۔ تاکہ (اس عملی سنت کے بعد) ایمان والوں پر کوئی حرج نہ ہو، یعنی حرمت کی تنگی باقی نہ رہے۔ اَدْعِیَآء دعیّ کی جمع ہے اس سے مراد ہے متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) یعنی ہم نے آپ کا نکاح اس زید کی بیوی زینب سے کر دیا جسے آپ نے متبنیٰ بنایا ہوا تھا۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ متبنیٰ کی بیوی حلال ہے۔ اگر چہ منہ بولا بیٹا اپنی بیوی سے قربت اختیار کر چکا ہو۔ جبکہ اس کے برعکس نسبی بیٹے کی بیوی باپ کے لیے حلال نہیں ہوتی۔ اس میں اس امر پر بھی دلیل موجود ہے کہ جب تک نبی کریم ﷺ کے ساتھ کسی حکم کے خالص ہونے پر دلیل قائم نہ ہو جائے تو وہ حکم نبی اور امت کے لیے ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم (فیصلہ) تو ہر حال میں ہو کر رہتا ہے جیسا کہ حضرت زینبؓ کی شادی کے بارے ہوا۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ﴿۳۸﴾

"نہیں ہے نبی پر کوئی مضائقہ [1] ایسے کام کرنے میں جنہیں حلال کر دیا ہے اللہ نے [2] اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہی

سنت ہے ان (انبیا) کے بارے میں جو پہلے گزر چکے ہیں ؂ اور اللہ کا حکم ایسا فیصلہ ہوتا ہے جو طے پا چکا ہوتا ہے ؂ ''

؂ مَا کَانَ عَلَی النَّبِیِّ کا تعلق حرج کے مضمون سے ہے نہ کہ اس کے لفظوں سے۔ کیونکہ مجرور کا معمول جار سے مقدم نہیں آ سکتا۔ مِنْ حَرَجٍ میں مِنْ زائدہ ہے اور حرج کَانَ کا اسم ہے۔''

؂ یعنی کوئی مضائقہ نہیں عورتوں کی اس تعداد میں جو اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کے لیے مقرر فرما دی ہے۔ یہ معنی عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے فرض له في الديوان (رجسٹر میں اس کا حصہ مقرر کر دیا گیا) اسی سے فوج کی تنخواہ کے لیے مقرر کردہ حصص بھی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ کام کرنے میں جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے حلال فرما دیئے ہیں۔

؂ فعل محذوف کا مصدر ہے یعنی سَنَّ اللّٰهُ سُنَّةً (یعنی اللہ تعالیٰ نے یہی طریقہ مقرر کیا ہے)۔ یا یہ منصوب ن بنزع الخافض ہے یعنی اصل میں کسنة الله ہے۔ یا پھر اغراء کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی اِلْتَزِمُوْا سُنَّةَ اللّٰهِ۔ (اللہ تعالیٰ کی سنت کو لازم پکڑ لو) ان انبیاء علیہم السلام کے بارے میں جو پہلے گزر چکے ہیں۔ کلبی نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت داؤد علیہ السلام ہیں اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نکاح اس عورت سے کرا دیا تھا جس کی طرف ان کا میلان تھا(1)۔ پس اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ اور حضرت زینب کا نکاح بھی کرا دیا۔ یہ قول بھی ہے کہ سنت سے مراد نکاح ہے کیونکہ نکاح انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا اشارہ کثرت ازواج کی طرف ہے جیسا کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی بیویاں کثیر تھیں۔

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۳۹

''وہ لوگ جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں وہ نہیں ڈرا کرتے کسی سے اللہ تعالیٰ کے سوا۔ اور کافی ہے اللہ تعالیٰ حساب لینے والا ؂''

؂ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے پیغامات پہنچاتے ہیں۔ یہ ان کی صفت ہے جو پہلے گزر چکے ہیں یا یہ ان کی مدح و تعریف ہے، چاہے یہ حالت نصبی میں ہو یا حالت رفعی میں۔ اور اس سے ڈرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرا کرتے جیسا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور آپ ان امور میں کسی اور سے نہیں ڈرتے جن کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے اور جس نے منع فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ڈرانے اور حساب لینے والا کافی ہے۔ پس اس کے سوا کسی نہیں ڈرنا چاہیے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝۴۰

''نہیں ہیں محمد (فداہ روحی) کسی کے باپ تمہارے مردوں میں سے ؂ بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں ؂ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ؂''

؂ ترمذی نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ نے سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زینب سے شادی کی تو لوگوں نے کہا کہ آپ ﷺ نے اپنے بیٹے کی بیوی سے شادی کر لی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ھا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 471 (الفکر)

كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ یعنی محمد ﷺ زید بن حارثہؓ کے باپ نہیں ہیں کہ آپ ﷺ پر ان کی زوجہ سے نکاح حرام ہو۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت قاسم، طیب، طاہر اور ابراہیم حضور نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے تھے اسی طرح حضرت امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بھی آپ کے صاحبزادوں میں ہی شمار کیا گیا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے امام احمد کے بارے ارشاد فرمایا بے شک میرا یہ بیٹا تو سردار ہے (تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں؟) تو اس کے بارے ہمارا جواب یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے چھوٹی عمر میں ہی وصال فرما گئے وہ مردوں کی عمر تک پہنچے ہی نہیں (یعنی ان میں سے کوئی بھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا) (اس لیے ان پر لفظ رجل کا اطلاق نہیں ہوسکتا)۔ اور حسنین کریمین پر بیٹا ہونے کا اطلاق مجازاً ہے (کیونکہ حقیقۃً یہ دونوں آپ ﷺ کے نواسے تھے نہ کہ بیٹے)۔

۲۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور ہر رسول اپنی امت کے لیے باپ ہوتا ہے لیکن نسبی حیثیت سے نہیں کہ اس پر وہ رشتے حرام ہوں جو نسب کے سبب حرام ہوتے ہیں بلکہ وہ تو شفقت ونصیحت کے اعتبار سے اپنی امت کا باپ ہوتا ہے۔ اور آپ خاتم النبیین ہیں عاصم نے لفظ خَاتَمَ کو اسم ہونے کی بناء پر تاء مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی آخر ہے۔ اور باقیوں نے فاعل کے وزن پر تاء کو مکسور پڑھا ہے (اس کا معنی ہے ختم کرنے والا)۔ مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ آپ ﷺ پر نبوت کو ختم نہ فرماتا تو وہ آپ ﷺ کے بعد بالیقین آپ کے صاحبزادے کو نبوت عطا فرماتا (1)۔ عطا نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ فیصلہ فرمالیا کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایسا بچہ عطا ہی نہیں فرمایا (جو سن بلوغت کو پہنچ کر مرد ہوتا)۔ ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وصال کے وقت فرمایا اگر یہ زندہ رہتا تو یہ نبی ہوتا (2)۔ آپ ﷺ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے سبب آپ ﷺ کی ختم نبوت پر کوئی جرح نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ جب نزول فرمائیں گے تو آپ ﷺ کی شریعت پر ہوں گے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضور نبی کریم ﷺ سے پہلے نبی بنائے گئے اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو نبوت عطا فرما کر نبوت کو ختم فرمادیا اور کسی سابق نبی کا باقی ہونا ختم نبوت کے منافی نہیں ہوتا۔

۳۔ پس اللہ تعالیٰ جانتا ہے کون اس لائق ہے کہ اس پر نبوت ختم کردی جائے اور اس کی شان کیسے ہونی چاہیے۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی مثال اس محل کی ہے جسے انتہائی حسین وجمیل انداز میں تعمیر کیا گیا ہو اور اس میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی گئی ہو۔ اور اس کا نظارہ کرنے والے اس کے گرد چکر لگاتے ہوئے اس اینٹ کی جگہ کے سوا محل کے حسن تعمیر کو بہت پسند کرتے ہوں، اس پر اظہار تعجب کرتے ہوئے۔ پس میں وہ ہوں جس نے اس اینٹ کی خالی جگہ کو بھر دیا اور درست کردیا ہے۔ میرے ساتھ اس کی تعمیر مکمل ہوگئی اور میرے ساتھ ہی رسل علیہم السلام کا اختتام ہوگیا (3) اور ایک روایت میں ہے کہ پس میں ہی وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔ متفق علیہ۔ حضرت جبر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میرے بہت سے اسماء ہیں میں محمد (ﷺ) ہوں، میں ماحی ہوں کہ میرے سبب اللہ تعالیٰ کفر مٹادے گا،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 471 (الفکر) 2۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 110 (وزارت تعلیم) 3۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 511 (وزارت تعلیم)

میں حاشر ہوں کہ لوگوں کو میرے قدموں پر اٹھایا جائے گا اور میں وہ عاقب (پیچھے آنے والا) ہوں جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ متفق علیہ(1)۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے سامنے اپنے مختلف اسماء ذکر فرماتے تھے پس آپ ﷺ فرماتے میں محمد (ﷺ) ہوں میں احمد ہوں، میں مقفی، حاشر، نبی التوبۃ اور نبی الرحمۃ ہوں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔(2)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿٤١﴾ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿٤٢﴾

''اے ایمان والو! یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو کثرت سے ۱؎ اور اس کی پاکی بیان کیا کرو صبح و شام ۲؎''

۱؎ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی فریضہ اپنے بندوں پر لازم نہیں فرمایا مگر اس کی ایک معینہ حد مقرر فرمادی اور پھر حالت عذر میں اسے ادا کرنے والوں کے عذر کو قبول بھی فرمایا مگر ذکر (الٰہی) کے لیے کوئی ایسی حد مقرر نہیں فرمائی جہاں اس کی انتہاء ہوتی ہو اور اسے چھوڑنے کے لیے مجنون کے سوا کسی کو بھی معذور قرار نہیں دیا بلکہ تمام حالات میں اسے ادا کرنے کا حکم فرمایا اور فرمایا فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ (اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کھڑے ہونے کی حالت میں) بیٹھے ہونے اور پہلو کے بل لیٹے ہونے (کی حالت میں) اور مزید ارشاد فرمایا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو)۔ یعنی رات کے وقت، دن کے وقت۔ خشکی میں، سمندر میں حالت صحت میں اور بیماری کی حالت میں، مخفی طور پر اور اعلانیہ طور پر۔ مجاہد کا قول ہے کہ ذکر کثیر کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کو کبھی بھی نہ بھلائے(3)۔ میں کہتا ہوں کہ اس حالت کا تصور تو فناء قلب اور دائمی حضور حاصل ہونے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

۲؎ اور اس کی پاک بیانی کرو، یعنی اس کے لیے نماز پڑھو۔ بُكْرَةً سے مراد صبح کی نماز ہے۔ کلبی نے کہا ہے کہ اَصِيْلًا سے مراد ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں (یعنی تمام نمازیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہی پڑھو)۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الٰہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلیّ العظیم کہو۔ پس آیت کریمہ میں تسبیح کے اخوات یعنی تحمید، تہلیل اور تکبیر وغیرہ کو لفظ تسبیح سے بیان کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ذکر کثیر سے مراد یہی کلمات ہیں جنہیں آدمی باوضو، بلاوضو اور جنبی حالت میں کہہ سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پہلے عمومی ذکر کا حکم فرمایا کہ اس کی یاد کو کبھی بھی نہ بھولو پھر اس ذکر کو اوقات مخصوصہ کے ساتھ خاص کر دیا۔ پس پہلے سے مراد ذکر خفی اور حضور دائم ہے۔ اور دوسرے سے مراد ذکر جلی اور مقرر کردہ عبادات ہیں، یعنی فرائض وسنن وغیرہ۔ اور کہا گیا ہے کہ دن کے پہلے اور آخری حصے کو ذکر کے لیے خاص کیا گیا ہے کیونکہ دن اور رات کے ملائکہ ان اوقات میں جمع ہوتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رات اور دن کے فرشتے اپنے اپنے اوقات میں ایک دوسرے کے پیچھے تمہارے پاس آتے رہتے ہیں اور وہ صبح اور عصر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ ملائکہ جنہوں نے رات تم میں بسر کی وہ اوپر چڑھ جاتے ہیں اور ان سے رب کریم پوچھتا ہے (حالانکہ وہ خود ہی اچھی طرح جانتا ہے) تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا ہے تو وہ عرض کرتے ہیں کہ ہم نے انہیں اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس پہنچے تھے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ متفق علیہ(4)۔ کہا گیا ہے کہ تنازع الفعلین کے طریقہ پر بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا دو فعلوں کے معمول ہیں۔ اور وہ دونوں فعل ان دونوں کی طرف متوجہ ہیں۔ یعنی اذکروہ بكرة واصيلا اور سبّحوه بكرةً

1۔ صحیح مسلم، جلد 15 صفحہ 86 حدیث:2354 (العلمیہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 15 صفحہ 86 حدیث:2355 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 218 (التجاریہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 5 صفحہ 113 حدیث:210 (العلمیہ)

وَ اَصِیلًا۔ معنی یہ ہے کہ تم نمازیں اور تمام عبادات اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہوئے ادا کرو درآنحالیکہ تمہارے دل حاضر ہوں غافل نہ ہوں۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ جب نماز پڑھ رہا ہوتا ہے تو رب کریم اس وقت تک مسلسل اس کی طرف متوجہ رہتا ہے جب تک بندہ کہیں اور متوجہ نہ ہو اور جب بندے کی توجہ ادھر ادھر (دیگر خیالات میں) ہو جاتی ہے تو رب کریم بھی اس سے نظر توجہ پھیر لیتا ہے (1)۔ اسے احمد، ابوداؤد، نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ۝

''اللہ وہ ہے جو رحمت نازل کرتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے بھی (تم پر نزول رحمت کی دعا کرتے ہیں) [1] تاکہ وہ نکال لے جائے تمہیں (طرح طرح کے) اندھیروں سے نور کی طرف [2] اور وہ مومنوں پر ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے [3]''

[1] علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ جب آیت طیبہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓىِٕكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کی (یارسول اللہ! ﷺ) اللہ تعالیٰ نے جو شرف و عزت بھی آپ کے لیے خاص فرمایا ہے ہمیں بھی اس میں ضرور شریک فرمایا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىِٕكَتُهٗ (2)۔ عبد بن حمید نے مجاہد سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ لفظ صلوٰۃ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہو تو اس سے مراد رحمت ہوتی ہے۔ اور ملائکہ کی طرف ہو تو اس سے مراد استغفار (مغفرت طلب کرنا) ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے پر صلوٰۃ فرمانے کا مطلب بندوں میں اس کے ذکر جمیل کو عام کرنا ہوتا ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے کی ثناء اور تعریف ہونا (3)۔ قاموس میں ہے کہ صلوٰۃ کا معنی دعا، رحمت اور استغفار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے رسول کی اچھی طرح تعریف ہونا (4)۔ اور اس کا معنی ایسی عبادت ہے جس میں رکوع و سجود بھی ہو۔ یہ عبارت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے۔ پس جنہوں نے ایک سے زیادہ معانی کے لیے لفظ مشترک کا استعمال جائز قرار دیا ہے انہوں نے یہ معنی جائز قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحمت فرماتا ہے اور فرشتے تمہارے لیے استغفار کرتے ہیں۔ لیکن جمہور کے نزدیک مشترک میں عمومیت جائز نہیں ہوتی (یعنی لفظ مشترک کا اطلاق ایک سے زیادہ معانی پر نہیں ہوسکتا)۔ لہٰذا یہاں یہ کہا جائے گا کہ لفظ صلوٰۃ ایسے مجازی معنی میں استعمال ہے جو دو حقیقی معنوں میں مشترک ہے اور وہ ہے تمہارے امور کی اصلاح اور تمہارے عزوشرف کے ظہور کی طرف متوجہ ہونا۔ اسے عموم مجاز کہا جاتا ہے۔ کثیر اہل لغت نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کا معنی دعا ہے کہا جاتا ہے صلیت علیہ یعنی میں نے اس کے لیے دعا کی۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو کھانے کی طرف بلایا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ دعوت قبول کرلے اور اگر وہ روزے دار ہو تو اسے چاہیے کہ وہ دعوت دینے والے کے لیے دعا کردے الفاظ یہ ہیں وَاِنْ كَانَ صَائِمًا فلیصل (5) ای لیدع لاهل۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَصَلِّ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ آپ ان کے لیے دعا فرمادیں بے شک آپ کی دعا ان کے لیے باعث تسکین ہے۔ اور ارکان مخصوصہ کو صلوٰۃ اسی لیے کہا گیا ہے کیونکہ وہ دعا پر مشتمل ہیں۔ اور وہ دعا یہ ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ تو اس میں کل کو

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 4 صفحہ 133 (الرشد) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ)
4۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1709 (التراث العربی) 5۔ جامع ترمذی، جلد 3 صفحہ 429 (الفکر)

جزء کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (اگر صلوٰۃ کا معنی دعا ہے تو پھر صلوٰۃ اللہ کا معنی کیا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ بھی دعا کرتا ہے؟) تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہی ذات سے اپنے بندوں کے لیے رحمت و مغفرت طلب فرماتا ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندوں کے لیے دعا ہوتی ہے۔ اور اپنی ذات سے طلب کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی طرف سے اپنی ذات پر رحمت فرمانے کو لازم کر لیا ہے۔ یہی معنی اس قول باری تعالیٰ سے مستفاد ہوتا ہے كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ کیونکہ ایجاب اور طلب دونوں کا معنی ایک ہے۔ کیونکہ ایسی طلب جو قطعی ہو وہ ایجاب ہی ہوتی ہے۔ اور یہاں ایجاب سے مراد تفضّل اور مہربانی فرماتے ہوئے کسی شے کو اپنے ذمہ لینا ہے۔ اور جب یہاں صلوٰۃ سے مراد دعا لی جائے گی تو اس سے عموم مشترک لازم نہیں آئے گا۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کیا ہمارا رب بھی صلوٰۃ کرتا ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام پر یہ بات گراں گزری تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ ان سے کہہ دو بے شک میں صلوٰۃ کرتا ہوں اور میری صلوٰۃ میری رحمت ہے جو ہر شے سے وسیع ہے۔ (1)

۲۔ بے شک وہ اپنی رحمت اور ملائکہ کی دعا سے تمہیں ہمیشہ کفر اور گناہوں کی تاریکیوں سے ایمان اور اطاعت کے نور کی طرف نکالتا ہے۔ اور یہ کہنا بھی ممکن ہے تا کہ وہ ہمیشہ تمہیں وقتاً فوقتاً بعد اور دوری کی تاریکیوں سے نور قرب کی طرف نکالتا ہے۔ اور وہ آدمی جس کے دو دن ایک جیسے (مساوی) گزر جائیں تو وہ خسارے میں ہے۔

۳۔ اور وہ مومنوں پر ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ اس طرح کہ اس نے ان کے امور کی اصلاح اور ان کے مقام و مرتبہ کو بلند کرنے کا اہتمام فرمایا ہے۔ اور ان کے لیے دعا میں ملائکہ مقربین کو شامل کیا ہے۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف صلہ جملہ پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اَلَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَالَّذِیْ کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا۔

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۖۚ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا ۝

''انہیں یہ دعا دی جائے گی جس روز وہ اپنے رب کریم سے ملیں گے ہمیشہ سلامت رہو اور اس نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے عزت والا اجر۔''

۱۔ اس دن ''تَحِیَّتُهُمْ'' کے ساتھ مومنین کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے دعا دی جائے گی جس دن ان کی ملاقات اپنے رب کریم سے ہوگی، یعنی موت کے وقت یا قبر سے باہر آتے وقت یا جنت میں داخل ہونے کے وقت یا پھر رب کریم کے دیدار کے وقت۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان پر بطور تحیہ سلام فرمائے گا اور تمام تکالیف دہ امور سے اللہ تعالیٰ انہیں محفوظ و مامون رکھے گا۔ اس جملہ میں صدر کلام مفعول کی طرف مضاف ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سے مراد وہ دن ہے جس دن ان کی ملاقات ملک الموت سے ہوگی اور سَلٰمٌ کا معنی ہے کہ وہ کسی مسلمان پر سلام کئے بغیر اس کی روح قبض نہیں کرتا۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جب مومن کی روح قبض کرنے کے لیے ملک الموت آتا ہے تو وہ کہتا ہے تیرا رب تجھے سلام فرما رہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس وقت انہیں قبروں سے باہر نکالا جائے گا تو ان پر ملائکہ سلام کریں گے اور انہیں خوشخبری سنائیں گے (2) اور اس نے ان کے لیے عزت والا اجر تیار کر رکھا ہے، یعنی جنت، دیدار الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی رضا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ)

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾

"اے نبی (مکرم!) ہم نے بھیجا ہے آپ کو (سب سچائیوں کا) گواہ بنا کر اور خوشخبری سنانے والا اور بروقت ڈرانے والا لے اور دعوت دینے والا اللہ کی طرف اس کے اذن سے ۲ے اور آفتاب روشن کر دینے والا ۳ے"

لے اے نبی (مکرم!) ہم نے آپ کو آپ کی امت پر گواہ بنا کر بھیجا ہے۔ ابن مبارک نے حضرت سعید بن المسیب کا قول نقل کیا ہے کہ ہر دن صبح و شام حضور نبی کریم ﷺ پر آپ کی امت پیش کی جاتی ہے پس آپ ﷺ ان کی پیشانیوں سے انہیں پہچانتے ہیں(1)۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ ان کے بارے شہادت دیں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ جس وقت آپ ﷺ کی امت سابقہ امتوں کے بارے یہ شہادت دے گی کہ ان کے انبیاء علیہم السلام نے ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا تھا تو آپ ﷺ اپنی امت کی تصدیق فرمائیں گے۔ اسے امام بخاری، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کیا تم نے پیغام پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے جی ہاں! پھر ان کی امت کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کیا انہوں نے تم تک پیغام پہنچایا تھا ﷺ تو وہ کہیں گے ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، ہمارے پاس تو کوئی بھی نہیں آیا۔ پس حضرت نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کون تمہاری شہادت دے سکتا ہے؟ تو وہ کہیں گے محمد ﷺ اور آپ کی امت۔ الحدیث۔ اس بارے میں کثیر احادیث ہیں(2)۔ ترکیب کلام میں شاھدا حال مقدرہ ہے جیسا کہ اس قول میں ہے مررت برجل معه صقر صائدا به غدا۔ اور انہیں خوشخبری سنانے والا جو رسولوں پر ایمان لائے اور انہیں جہنم سے ڈرانے والا جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔

۲ے اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور اطاعت کی طرف بلانے والا یا جنت کی طرف یا بے کیف دیدار الٰہی کی طرف بلانے والا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور اس کے آسان بنانے سے (یعنی اس کی توفیق سے)۔ دعوت کو اذن کی قید سے اس لیے مقید کیا ہے کیونکہ یہ انتہائی مشکل امر ہے اللہ تعالیٰ کی توفیق اور معاونت کے بغیر یہ کام نہیں کیا جا سکتا، بالخصوص اللہ تعالیٰ کے دیدار کی طرف دعوت دینے کا عمل، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک بندے کا پہنچنا ایک ایسا امر ہے جو اس کے فضل کے بغیر ممکن ہی نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ آپ اگر کسی کو ہدایت یاب کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو سیدھے راستہ پر چلانا چاہتا ہے اس کو راہ راست پر چلنے کی توفیق دیتا ہے۔ حضرت ربیعہ جرشیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس (حالت خواب میں) کوئی آیا اور آپ ﷺ کو کہا گیا چاہیے کہ آپ کی آنکھیں سو جائیں، چاہیے کہ آپ کے کان سنیں اور چاہیے کہ آپ کا دل سمجھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میری آنکھیں سو گئیں، میرے کانوں نے سنا اور قلب نے سمجھا پھر آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ کہا گیا ہے کہ ایک سردار نے گھر بنوایا، اس نے اس میں دستر خوان بچھایا اور پھر دعوت دینے کے لیے کسی کو بھیجا۔ پس جس نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کر لیا وہ گھر میں داخل ہوا، اس نے دستر خوان سے کھانا کھایا اور سردار اس سے راضی ہو گیا۔ اور جس نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ گھر میں داخل نہ ہوا اور نہ اس نے دستر خوان سے کچھ کھانا کھایا۔ نتیجۃً سردار اس پر ناراض ہو گیا۔

1۔ التذکرۃ، جلد 1 صفحہ 397 (ابن زیدون)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 1092 (وزارت تعلیم)

فرمایا (اس کی تعبیر یہ ہے) کہ سردار اللہ تعالیٰ ہے۔ دعوت دینے والے محمد ﷺ ہیں، دار یعنی وہ گھر جو سردار نے بنوایا وہ اسلام ہے اور دسترخوان سے مراد جنت ہے۔ اسے دارمی نے روایت کیا ہے۔(1)

۳۔ اور روشن کردینے والا آفتاب (بنا کر بھیجا ہے) اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سراج (چراغ) فرمایا ہے کیونکہ آپ ﷺ سے ایسے ہی نور اور ہدایت حاصل کی جاتی ہے جیسے تاریک رات میں چراغ سے روشنی بھی حاصل کی جاتی ہے اور راستے کی راہنمائی بھی۔ یعنی حضور نبی کریم ﷺ اپنی زبان اقدس سے تو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے تھے اور اپنے دل اور جسم کے اعتبار سے چراغ کی مثل تھے۔ تمام مومنین آپ ﷺ کے رنگوں سے ہی رنگ حاصل کرتے اور آپ ﷺ کے انوار سے ہی اپنے کو منور کرتے جیسا کہ عالم سورج کے نور سے روشنی حاصل کرتا ہے اور گھر کے چراغ سے نور۔ اسی وجہ سے صحابہ کرام دیگر تمام لوگوں پر فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ وہ علوم جو امت نے آپ ﷺ کی زبان اقدس سے حاصل کیے ہیں ان میں تو صحابہ کرام اور دیگر لوگوں میں کوئی تفاوت نہیں۔ بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کے پاس علم پہنچایا جائے وہ بلاواسطہ سننے والے کی نسبت زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔ لیکن وہ نور جو صحابہ کرام کو بلاواسطہ آپ ﷺ کے انوار سے حاصل ہوا وہ اگر چہ اور لوگوں کو صحابہ کرام پھر تابعین پھر تبع تابعین وغیرہ کے واسطہ سے قیامت تک حاصل ہوتا رہے گا لیکن اس میں نائب شاہد کی مثل نہیں ہوسکتا (یعنی وہ لوگ جنہیں یہ فیضان نبوت بالواسطہ پہنچا وہ ان کی مثل اور مساوی نہیں ہوسکتے جنہوں نے یہ فیضان بلاواسطہ حاصل کیا) بلکہ ان کی مثال اس کمرے کی ہے جو صحن کے نور سے بالواسطہ روشن ہوتا ہے جبکہ صحن سورج کے مقابل ہونے کی وجہ سے بلاواسطہ اس کی شعاعوں سے منور ہوتا ہے۔ تو صحن اور کمرے کی روشنی میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عطا بن یسار فرماتے ہیں میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے ملا۔ تو میں نے ان سے کہا رسول اللہ ﷺ کے وہ اوصاف جو تورات میں ہیں بیان فرمائیے۔ یہ سن کر انہوں نے فرمایا جی ہاں قسم بخدا! آپ ﷺ کے وہ اوصاف جو تورات میں ہیں ان میں سے کچھ قرآن کریم میں بھی ہیں مثلاً فرمایا اے نبی (مکرم!) بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہ بنا کر اور خوشخبری سنانے والا اور بروقت ڈرانے والا اور امیوں کے لیے پناہ بنا کر بھیجا ہے۔ آپ میرے بندے اور میرے رسول ہیں۔ میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے۔ وہ بدخو اور تندمزاج نہیں ہوں گے، بازاروں میں چیخ چیخ کر آواز بلند نہیں کریں گے اور برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیں گے (2) بلکہ عفو و درگزر سے کام لیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی روح ہرگز قبض نہیں فرمائے گا یہاں تک کہ لا الہ الا اللہ کہنے کے سبب صراط مستقیم سے بھٹکی ہوئی ملت پھر صراط مستقیم پر گامزن نہ ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور بند اور غافل دلوں کو کھول دے گا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح دارمی نے عطاء بن سلام سے بھی نقل کی ہے۔ واللہ اعلم۔ امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت ربیع بن انس سے روایت نقل کی ہے کہ جب آیت مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ نازل ہوئی۔ پھر اس کے بعد لِّیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ نازل ہوئی تو اہل ایمان میں سے بعض نے آپ ﷺ کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا یا رسول اللہ! ﷺ تحقیق ہم نے یہ تو جان لیا جو کچھ آپ کے ساتھ کیا جائے گا (لیکن ابھی تک یہ معلوم نہیں) کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

1۔ سنن دارمی جلد 1 صفحہ 15 (المحاسن)
2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 390 (العلمیۃ)

وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿۴۷﴾

''اور آپ مژدہ سنادیں مومنوں کو کہ ان کے لیے اللہ کی جناب سے بڑا ہی فضل ہے ۔''

لے (اور آپ مژدہ سنادیں مومنوں کو کہ ان کے لیے اللہ کی جناب سے بڑا ہی فضل ہے۔) اسی طرح ابن جریر نے عکرمہ اور حسن سے نقل کیا ہے۔ اور حضرت انسؓ نے فرمایا فضل کبیر سے مراد جنت ہے (1) اور یہ جملہ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ پر معطوف ہے۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾

''اور نہ کہنا مانو کافروں اور منافقوں کا لے اور پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی ۲ے اور بھروسہ رکھو اللہ پر اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کا) کارساز ۳ے''

لے اور نہ کہنا مانو کافروں اور منافقوں کا ان امور میں جن میں وہ آپ کی شریعت کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس میں گویا آپ ﷺ کو ان کی مخالفت میں اپنے موقف پر ڈٹے رہنے پر برانگیختہ کیا جارہا ہے۔

۲ے حضرت ابن عباس اور قتادہؓ نے فرمایا اس کا معنی ہے وہ آپ کو جو اذیت پہنچاتے ہیں اس پر صبر اختیار کیجیے (2)۔ اس میں مصدر فاعل کی طرف مضاف ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ وہ آپ کو جو اذیت دیتے ہیں اسے ایک طرف رکھ دیجیے، اس کی پرواہ نہ کیجیے اور نہ اس کا خوف کیجیے۔ زجاج نے کہا ہے کہ معنی اس طرح ہے کہ آپ ان سے جھگڑا نہ کیجیے اور انہیں اذیت پہنچانے کا قطعاً ارادہ بھی نہ کیجیے۔ اس صورت میں مصدر مفعول کی طرف مضاف ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔

۳ے اور بھروسہ رکھو اللہ پر کیونکہ وہی آپ کے لیے کافی ہے۔ یعنی جب آپ اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیں گے تو وہ آپ کے لیے کافی ہوگا۔ وہ کسی غیر کی طرف جانے کے لیے آپ کی کوئی حاجت نہیں رہنے دے گا۔ علامہ بیضاویؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کے پانچ اوصاف بیان فرمائے ہیں (یعنی شاہد، مبشر، نذیر، داعیا الی اللہ اور سراجا منیرا) اور پھر ان میں سے ہر ایک کے بالمقابل ایسا خطاب فرمایا جو اس وصف سے مناسبت رکھتا ہے۔ لیکن شاہد کے بالمقابل امر کو حذف کردیا اور وہ ہے تاکنے اور نگاہ رکھنے کا امر۔ اور حذف کا سبب یہ ہے کہ مابعد کلام اسی امر کی تفصیل بیان کررہا ہے۔ مبشر کے بالمقابل مومنین کی بشارت کا امر ہے، نذیر کے بالمقابل کفار کی بات نہ ماننے اور ان کی اذیت کی پرواہ نہ کرنے کا حکم دیا ہے، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کی طرف دعوت دینے والے وصف کے بالمقابل اس پر توکل کرنے کا امر ہے اور سراج منیر کے بالمقابل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی بطور کارساز کافی ہے۔ کیونکہ وہ رب کریم جس نے ساری مخلوق سے بڑھ کر آپ کو دلائل سے منور فرمایا ہے حقیقتاً وہی اس لائق ہے کہ کسی غیر کی بجائے صرف اسی پر اکتفاء کیا جائے۔ (3)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۴۹﴾

''اے ایمان والو! جب تم نکاح کرو مومن عورتوں سے لے پھر تم انہیں طلاق دے دو اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ ۲ے پس تمہارے لیے ان پر عدت گزارنا ضروری نہیں جسے تم شمار کرو ۳ے لہٰذا انہیں کچھ مال دے دو اور انہیں رخصت کردو

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 391 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر ... جلد 4 صفحہ 379 (الفکر)

خوبصورتی سے ہے۔"

ل آیت طیبہ میں صرف مومنات کا ہی ذکر کیا گیا ہے حالانکہ مومن مردوں کا نکاح کتابیہ عورتوں سے بھی جائز ہے اور قبل از دخول طلاق ہونے کی صورت میں ان کا حکم بھی مومنہ عورتوں کی مثل ہی ہے۔ تو اس تخصیص سے فقط اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ مومن مردوں کے لائق اور شایان شان یہی ہے کہ وہ مومنہ عورتوں سے نکاح کرے نہ کہ کتابیہ سے۔

ع علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ نکاح سے قبل طلاق واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کو نکاح پر مرتب کیا ہے حتیٰ کہ اگر کسی نے اجنبیہ عورت کو یہ کہا جب میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے یا یہ کہا ہر وہ عورت جس سے میں نکاح کروں تو اسے طلاق ہے۔ پھر اس کے بعد اس نے اسی اجنبیہ سے نکاح کر لیا تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ یہ قول حضرت علی، ابن عباس، معاذ، جابر اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ کا ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن المسیب، سعید ابن جبیر، عروہ، قاسم، طاؤس، حسن، عکرمہ، عطاء، سلیمان بن یسار، مجاہد، شعبی، قتادہ اور اکثر اہل علم نے کہا ہے۔ حضر امام شافعیؒ کا موقف بھی یہی ہے(1)۔ ایسی آزادی جو ملکیت کے ساتھ معلق ہو اس کے بارے بھی ان تمام کا موقف یہی ہے کہ وہ آزادی واقع نہیں ہوگی (مثلاً اگر کوئی کسی غیر کے غلام یا لونڈی کو یہ کہہ دے جب میں تیرا مالک بنوں گا تو تو آزاد ہے۔ بعد میں اس کا مالک ہو گیا تو وہ آزاد نہیں ہوگا)۔ مسئلہ کی مذکورہ صورت میں حضرت ابن مسعودؓ سے یہ مروی ہے کہ طلاق واقع ہو جائے گی یہی موقف ابراہیم نخعی، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور آپ کے صحابہ کا ہے۔ حضرت ربیعہؒ، امام اوزاعیؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر اس نے مذکورہ الفاظ کسی معینہ عورت سے کہے تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر تعیین کے بغیر عام عورتوں کے لیے مذکورہ الفاظ کہہ دیے تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ حضرت عکرمہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ لوگوں نے حضرت ابن مسعودؓ کی طرف مذکورہ مسئلہ میں جھوٹی نسبت کی ہے۔ اور اگر حقیقتاً انہوں نے ایسا کیا ہے تو یہ ایک عالم کی لغزش ہے۔ اگرچہ انہوں نے یہ کسی ایسے مخصوص آدمی کے بارے کہا ہو جس نے یہ کہا کہ اگر میں فلاں عورت سے شادی کروں تو اسے طلاق ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ۔ یہ نہیں فرمایا اِذَا طَلَّقْتُمُوْهُنَّ ثُمَّ نَكَحْتُمُوْهُنَّ(2) (یعنی نکاح کا ذکر پہلے ہے پھر طلاق کا۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلے طلاق کا ذکر ہو پھر نکاح کا)۔ اور علامہ بغویؒ نے حضرت جابرؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہے(3)۔ میں کہتا ہوں کہ حاکم نے مستدرک میں اسے نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور ساتھ کہا ہے کہ مجھے شیخین پر تعجب ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو کیسے چھوڑ دیا ہے حالانکہ یہ ان دونوں کی شرائط کے مطابق ہے۔ امام احمدؒ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے اجنبیہ عورت کی طلاق کو نکاح کی شرط سے معلق کر دیا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر آزادی کو ملکیت کی شرط سے معلق کیا تو اس بارے میں آپ سے دو روایتیں ہیں۔ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر اس نے شہر یا قبیلہ یا صنف یا کسی عورت کو خاص کر دیا اور پھر اس کی طلاق کو نکاح کے ساتھ معلق کر دیا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر اس نے مطلقاً بلا تخصیص عام قول کیا تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ علامہ ابن جوزیؒ نے امام احمدؒ کا قول ثابت کرنے کے لیے چھ احادیث سے استدلال کیا ہے۔

(1) عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی آدمی کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ)

طرف سے ایسی عورت پر طلاق واقع نہیں ہوگی جس پر اسے ملکیت نکاح حاصل نہ ہو، اس پر آزادی واقع نہیں ہوتی جس پر ملک رقبہ حاصل نہ ہو اور ایسی شے کی بیع صحیح نہیں ہوتی جس کا وہ مالک نہ ہو(1)۔ اسے ابن جوزی نے امام احمدؒ کی سند سے روایت کیا ہے۔ اصحاب سنن نے بھی اسے نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا اس باب میں مذکورہ احادیث میں سے یہ احسن ہے۔ بزار نے اسے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ نکاح سے پہلے نکاح نہیں اور ملکیت سے پہلے آزادی نہیں۔ امام بیہقی نے خلافیات میں کہا ہے کہ امام بخاریؒ نے اس باب کی تمام احادیث میں سے اسے زیادہ صحیح کہا ہے۔

(2) حضرت عمرو بن شعیب نے طاءوس کے واسطہ سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس پر ملکیت حاصل نہ ہو اسے طلاق دینا، آزاد کرنا، فروخت کرنا اور اس کی نذر پوری کرنا جائز نہیں اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے(2)۔ اور دارقطنی نے ایک دوسری سند سے ابراہیم ابی اسحاق الضریر سے انہوں نے یزید بن عیاض سے انہوں نے زہری سے انہوں نے سعید بن المسیب سے اور انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا طلاق نہیں ہے مگر نکاح کے بعد اگرچہ معینہ عورت کا نام ذکر کر دیا جائے(3)۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے یہ روایت منقطع ہے اور اس میں راوی یزید بن عیاض متروک ہے۔ علامہ ذہبی نے استیعاب اسماء الرجال میں ذکر کیا ہے کہ امام مالکؒ نے کہا ہے یزید بن عیاض کذاب ہے۔ یحییٰ بن معین نے کہا ہے یہ ضعیف ہے اور کسی کام کا نہیں۔ احمد بن صالح نے کہا ہے یہ لوگوں کے لیے حدیثیں وضع کرتا تھا (یعنی اپنی جانب سے بنالیتا تھا)۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے کہا ہے یہ منکر الحدیث ہے۔ ابوداؤدؒ نے کہا اس کی حدیث چھوڑ دی جائے اور امام نسائی نے کہا ہے یہ متروک ہے اور ایک دوسرے مقام پر کہا ہے یہ کذاب ہے۔

(3) یہ حدیث بھی دارقطنی نے روایت کی ہے۔ اور کہا ہے کہ بقیہ بن ولید نے ثور بن یزید سے انہوں نے خالد بن معدان سے اور انہوں نے حضرت ابوثعلبہ خشنی سے ہمیں حدیث بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے چچا نے کہا میرے ساتھ مل کر کام کرو یہاں تک کہ میں تمہارا نکاح اپنی بیٹی کر دوں گا۔ تو میں نے اسے یہ کہہ دیا اگر میں اس سے شادی کروں تو اسے تین طلاقیں پھر کچھ عرصہ بعد مجھے اس سے شادی کرنے کا خیال آیا۔ تو میں حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس کے بارے میں دریافت کیا۔ تو آپ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا اس سے شادی کرلو کیونکہ طلاق نہیں ہوتی مگر نکاح کے بعد پس میں نے اس سے شادی کر لی اور اس سے میرے دو بیٹے اسعد اور سعید پیدا ہوئے(4)۔ امام ذہبیؒ نے میزان میں ذکر کیا ہے کہ امام نسائی وغیرہ نے یہ کہا ہے کہ جب بقیہ بن ولید حدثنا اور اخبرنا کے الفاظ کہے تو وہ ثقہ اور قابل اعتماد ہے۔ لیکن کئی ایک نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ مدلس تھا۔ لہٰذا جب وہ عن فلاں کے الفاظ سے کوئی روایت نقل کرے تو وہ قابل حجت نہیں۔ اور ثور بن یزید ثقہ اور صحیح الحدیث راوی ہے اور اس کا فرقہ قدریہ میں شامل ہونا مشہور ہے۔ چونکہ بقیہ بن ولید نے یہ روایت لفظ عن کے ساتھ بیان کی ہے (اس لیے یہ قابل حجت نہیں)۔ علامہ ابن ہمامؒ نے بھی اس پر طعن کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی علی بن قرین ہے جسے امام احمدؒ نے جھوٹا کہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ علامہ ابن جوزیؒ نے جس طرح اس حدیث کو بیان کیا ہے وہ دارقطنی کی سند میں سے نہیں اور نہ اس میں کوئی راوی علی بن قرین ہے۔ واللہ اعلم

(4) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے یہ کہا کہ جس دن

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 14 (المحاسن)　2۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 14 (المحاسن)

3۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 17 (المحاسن)　4۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 35 (المحاسن)

میں فلاں عورت سے شادی کروں تو اسے طلاق ہے۔ (آیا نکاح کے بعد اسے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟) تو اس کے جواب میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس نے ایسی طلاق دی ہے جس کا وہ مالک ہی نہیں۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے (1)۔ اس کی سند میں ایک راوی ابوخالد الواسطی یعنی عمرو بن خالد ہے اس کے بارے میں امام ذہبی نے کہا ہے کہ اسے ابوحاتم نے ضعیف قرار دیا ہے اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ امام احمدؒ اور ابن معینؒ نے اسے کذاب کہا ہے۔ ابن عدی نے نافع کی سند سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طلاق واقع نہیں ہوتی مگر نکاح کے بعد۔ علامہ ابن حجر نے کہا ہے کہ اس کی سند میں ثقہ راوی ہیں۔

(5) طاؤس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر (پوری کرنا لازم نہیں ہوتی مگر اس صورت میں جس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری ہو، قطع تعلقی کی قسم (صحیح) نہیں ہوتی اور جس کا مالک نہ ہوا سے طلاق دینا یا آزاد کرنا (نافذ العمل) نہیں ہوتا۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے (2)۔ اور حاکم نے اسے ایک دوسری سند سے بھی روایت کیا ہے۔ اور اس میں بعض راوی غیر معروف ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ قبل از نکاح وقوع طلاق کا قول، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نہیں کیا اور اگر کہا ہے تو یہ ایک عالم کی لغزش ہے۔ (یہ قول ایسے آدمی کے بارے میں ہے جو یہ کہے کہ اگر میں فلاں عورت سے شادی کروں تو اسے طلاق ہے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ اللہ تعالیٰ نے اس طرح نہیں فرمایا اِذَا طَلَّقْتُمُوْهُنَّ ثُمَّ نَكَحْتُمُوْهُنَّ۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لا طلاق قبل نکاح کی روایت کا مرفوعاً حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہونا صحیح نہیں ہے۔ اس بارے میں صحیح ترین روایت منکدر کی ہے جو انہوں نے طاؤس کے واسطہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے مرسلاً نقل کی ہے۔

(6) حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان بن حرب کو یمن کے علاقے نجران کا حکم بنا کر بھیجا۔ تو وہ ذمہ داریاں جو آپ کو تفویض کی گئی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کوئی آدمی ایسی عورت کو طلاق نہ دے جس سے اس نے شادی نہیں کی اور ایسے غلام وغیرہ کو آزاد نہ کرے جس کا وہ مالک نہیں (3)۔ علامہ ابن حجر نے کہا ہے کہ ابن ابی حاتم نے علل الحدیث میں ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ حاکم نے اسے حجاج بن منہال کی سند سے ہشام الدستوائی سے انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ علامہ ابن جوزی نے کہا ہے کہ اسی طرح یہ حدیث حضرت علی اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ لیکن یہ اسناد واجب الاجتناب ہیں (ان میں سے کوئی بھی قابل اعتماد نہیں)۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ابن ماجہ نے مرفوع نقل کیا ہے کہ نکاح سے قبل طلاق نہیں ہے (4) اس کی سند میں ایک راوی جو بیر ہے اور وہ ضعیف ہے۔ حدیث جابر کے بارے میں ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اسی بارے میں ایک حدیث حضرت مسور بن مخرمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نکاح سے قبل طلاق نہیں ہے اور ملکیت سے پہلے آزادی نہیں ہے (5)۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے موقف کی دلیل یہ ہے کہ وہ طلاق جو کسی شرط کے ساتھ معلق ہو وہ طلاق نہیں ہوتی۔ کیونکہ تعلیق بالشرط اس کے مانع ہے کہ وہ

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 16 (المحاسن) 2۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 16 (المحاسن)
3۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 15 (المحاسن) 4۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 148 (وزارت تعلیم) 5۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 148 (وزارت تعلیم)

طلاق کا سبب بنے، حکم کے مانع نہیں ہے۔ مثلاً کسی کا یہ قول ان دخلت الدار فانت طالق (اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق) اور ان نکحتک فانت طالق (اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق)۔ یہ قسم ہے جو گھر میں داخل ہونے اور نکاح کرنے کے مانع ہے۔ اور یہی دونوں طلاق کے وجود کے لیے شرط ہیں۔ پس یہ تعلیق طلاق سے مانع ہے۔ اور یہ ایسا سبب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی جو موجب طلاق ہو۔ کیونکہ یہ دونوں وصف یعنی مانع طلاق ہونا اور موجب طلاق ہونا باہم متضاد ہیں۔ لیکن جب شرط پائی جائے گی تو پھر طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ اس صورت میں یہ طلاق کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور جب تعلیق طلاق نہیں ہے تو پھر آیت طیبہ سے استدلال صحیح نہیں اور وہ احادیث جو نکاح سے قبل طلاق ہونے کی نفی پر دلالت کرتی ہیں تو ان میں سے حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہم حدیثوں میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے اور ان کے صحیح نہ ہونے کے اسباب ہم نے پہلے ذکر کر دیئے ہیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب معلق بالشرط طلاق طلاق ہی نہیں تو پھر ان دو قولوں کے مابین کیا فرق ہے کہ اگر کوئی اجنبیہ عورت سے کہے ان دخلت الدار فانت طالق اور ان نکحتک فانت طالق۔ تو ان دونوں جملوں کی نوعیت ایک ہونے کے باوجود پہلی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی جبکہ دوسری صورت میں شرط پائے جانے کے ساتھ طلاق واقع ہو جاتی ہے (تو ان دونوں کے حکموں میں یہ فرق کیوں ہے؟)

تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں جملے اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ قسم دو اعتبار سے کسی فعل کے کرنے سے مانع ہوتی ہے یا تو وہ کرنے سے گناہ کا خوف ہوتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کے لیے کسی کام کی قسم کھانا وغیرہ یا پھر اس کے کرنے سے ایسا خوف لاحق ہو جسے قسم اٹھانے والا پسند نہیں کرتا مثلاً طلاق اور عتاق وغیرہ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر طلاق اور آزادی کو کسی شرط پر معلق کر دیا جائے تو یہ تب ہی اسے کرنے سے مانع ہو سکتے ہیں جب قسم اٹھانے والے کو ان کی ملکیت اور اختیار حاصل ہو (کیونکہ خوف کے سبب وہ اسے کرنے سے رکا رہے گا۔ لہٰذا اگر اجنبیہ عورت کی طلاق کو اس نے نکاح کی شرط پر معلق کیا تو چونکہ نکاح کے سبب اسے ملکیت حاصل ہو جاتی ہے اس لیے یہ قسم ہو گی اور تعلیق صحیح ہو گی۔ نتیجۃً نکاح کرنے کی صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی) جبکہ اس کے برعکس اگر کوئی اجنبیہ عورت کی طلاق اور اجنبی غلام کی آزادی کو دخول دار کی شرط پر معلق کرتا ہے تو یہ اسے گھر میں داخل ہونے سے روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، تو پھر یہ قسم بننے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی نتیجۃً اس صورت میں طلاق بھی واقع نہیں ہو گی اور کلام لغو ہو گا) کیونکہ کسی اجنبیہ کے کسی گھر میں داخل ہونے سے تعلیق کرنے والے کو اس پر ملکیت حاصل نہیں ہوتی۔ جب ملکیت حاصل نہیں ہوتی تو یہ طلاق وجود شرط کے لیے سبب خوف بھی نہیں بن سکتی، تو جب خوف کا سبب نہیں بن سکتی تو پھر یہ قسم بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ نتیجۃً کلام ہی لغو ہو جائے گا)۔

علامہ ابن ہمام نے ذکر کیا ہے کہ ہمارا مذہب حضرت عمر، ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں سالم، قاسم بن محمد، عمر بن عبدالعزیز، شعبی، نخعی، زہری، اسود، ابوبکر بن عبدالرحمٰن اور مکحول شامی سے ایسے آدمی کے بارے میں نقل کیا ہے کہ جس نے یہ کہا کہ اگر میں نے فلاں عورت سے شادی کی تو اسے طلاق ہے۔ یا یہ کہا اگر میں فلاں عورت سے شادی کروں تو اسے طلاق ہے یا ہر وہ عورت جس سے میں شادی کروں تو اسے طلاق ہے تو ان تمام صورتوں میں مذکورہ بالا جلیل القدر افراد نے یہ کہا ہے کہ ایسے ہی ہو گا جیسے اس نے کہا ہے (یعنی نکاح ہوتے کے بعد طلاق واقع ہو جائے گی)۔ علاوہ ازیں ہمارا مسلک حضرت سعید بن المسیب، عطاء، حماد بن ابی سلیمان اور شریح رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی منقول ہے۔

امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ وہ طلاق جو کسی شرط سے معلق ہو تو وہ طلاق ہے اور تعلیق سبب کے لیے سبب بننے سے مانع نہیں بلکہ یہ حکم سے مانع ہے۔ جیسا کہ ایسی بیع جس میں خیار شرط ہو (تو وہ بیع ہی ہوتی ہے مشتری یا بائع کا خیار اس کے لیے بیع ہونے سے مانع نہیں۔ البتہ مدت خیار کے اختتام تک حکم بیع یعنی ملکیت کے حصول کے مانع ہیں) اور حضرت ابوثعلبہ خشنی کی حدیث اس بارے میں ایک واضح نص ہے۔ علامہ ابن جوزی نے اسے ذکر کیا ہے اور اس کی سند پر کوئی طعن وغیرہ نہیں کیا حالانکہ وہ اظہار حق میں غیر متہم اور بے باک ہیں۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی لا طلاق قبل النکاح اور اس کے ہم معنی الفاظ کے ذریعے طلاق کو نکاح پر معلق کرنے سے منع کیا گیا ہے (اگر نہی کے معنی لیے جائیں)۔ یا پھر اس کی نفی کی گئی ہے اور نکاح سے قبل بالفور طلاق ہونے کی تو کسی عقلمند سے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور اس کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہے لہٰذا حضور نبی کریم ﷺ کے کلام کو اس پر محمول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس صورت میں یہ کلام ایسے آدمی کے قول کی مثل ہو جاتا ہے جو یہ کہے جو پیدا نہیں ہوا اس پر نماز فرض نہیں ہے (یعنی پیدا ہونے سے پہلے اس پر نماز فرض نہیں ہے)۔ آیت میں مس کرنے سے مراد مجامعت کرنا ہے۔

۱؎ عدت سے مراد وہ ایام ہیں جن میں عورت انتظار کرتی رہتی ہے اور ان ایام میں اس کے لیے نکاح ممنوع ہوتا ہے۔ یہ ایسا حکم ہے جس پر تمام امت کا اجماع ہے اور قول باری تعالیٰ فَمَا لَكُمْ میں اس پر دلیل ہے کہ عدت مردوں کا حق ہے کیونکہ اس کا مقصود پانی کی حفاظت اور نسب میں شک داخل ہونے سے محفوظ رکھنا ہے اور نسب کی نسبت مردوں کی طرف ہی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے امام اعظم ابو حنیفہؒ نے کہا ہے کہ جب کسی ذمی مرد نے ذمیہ عورت کو طلاق دی اور وہ یہ اعتقاد رکھتے ہوں کہ اس کی عدت نہیں ہے تو ایسی عورت پر عدت نہیں ہوگی۔ اور اگر اس کے معتقدین عدت واجب ہونے کا اعتقاد رکھتے ہوں تو اس عورت پر عدت واجب ہوگی اور جب کوئی حربیہ (دارالحرب میں رہنے والی) مسلمان ہو کر ہماری طرف آئے گی تو اس پر عدت نہیں ہوگی اور اگر اس نے بالفور شادی کر لی تو اس کا نکاح جائز ہوگا کیونکہ حربی عورت جمادات کی مثل ہے یہاں تک کہ دیگر سامان کی طرح اس کا بھی مالک بنا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس کا شرعاً کوئی حق نہیں۔ مگر جب عورت حاملہ ہو تو وضع حمل تک انتظار ضروری ہے کیونکہ اس کے پیٹ میں بچہ ثابت النسب ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے کہ اس سے نکاح تو جائز ہے لیکن اس سے قربت جائز نہیں جیسا کہ حاملہ من الزنا کا حکم ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

۲؎ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ فمتعوھن کا حکم اس صورت میں ہے جب کہ عورت کے لیے مہر مقرر نہ کیا جائے تو اس صورت میں عورت کے لیے متعہ ہوگا۔ اور اگر عورت کے لیے مہر مقرر کیا گیا ہو تو مذکورہ صورت میں اس کے لیے نصف مہر ہوگا اور اس کے لیے متعہ نہیں ہوگا(1) (متعہ سے مراد تین کپڑے ہیں قمیص، تہبند اور اوڑھنی) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق یہ آیت عام مخصوص عند البعض ہے۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس قول سے منسوخ ہے فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ(2)۔ دونوں قولوں کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ایسی عورت جس کے لیے مہر مقرر کیا جائے اور پھر مس کرنے سے قبل اسے طلاق ہو جائے تو اسے متعہ دینا نہ واجب ہے اور نہ مستحب (بلکہ اسے نصف مہر دیا جائے گا)۔ یہ بھی کہا گیا کہ یہ امر استحباب کے لیے ہے لہٰذا نصف مہر کے ساتھ عورت کو متعہ دینا مستحب ہے۔ اور حضرت حسن اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ اس آیت کے مطابق عورت کے لیے متعہ واجب ہے اور سورۃ البقرہ کی آیت فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ کے مطابق نصف مہر لازم ہے۔ ہم نے متعہ کے وجوب، استحباب اور اس کی

1۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریہ)
2۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریہ)

مقدار کے بارے میں تفصیلی اختلاف سورۃ البقرہ میں ذکر کر دیا ہے یہاں اسے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور انہیں اپنے گھروں سے رخصت کر دو اوران کے راستے خالی کر دو کیونکہ تمہارے لیے ان پر کوئی عدت وغیرہ نہیں۔ بغیر کوئی تکلیف اور ضرر پہنچائے بڑی خوبصورتی کے ساتھ (انہیں رخصت کر دو)۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ١ٞ وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا١ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ١ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْۤ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ١ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۰۰۵۰

''اے نبی (مکرم!) ہم نے حلال کر دی ہیں آپ کے لیے آپ کی ازواج جن کے مہر آپ نے ادا کر دیئے ہیں [1] اور آپ کی کنیزیں جو اللہ نے بطور غنیمت آپ کو عطا کی ہیں [2] اور آپ کی چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کے خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے ہجرت کی آپ کے ساتھ [3] اور مومن عورت اگر وہ اپنی جان نبی کی نذر کر دے [4] اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے۔ یہ (اجازت) صرف آپ کے لیے ہے دوسرے مومنوں کے لیے نہیں [5] ہمیں خوب علم ہے جو ہم نے مقرر کیا ہے مسلمانوں پر ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں [6] تا کہ آپ پر کسی قسم کی تنگی نہ ہو اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہے، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے [7]''

[1] اُجُوْرَهُنَّ سے مراد ان کے مہر ہیں۔ کیونکہ مہر ملک بضع کا اجر ہوتا ہے۔ یہاں حضور نبی کریم ﷺ کے لیے ازواج کے حلال کرنے کو مہر کی ادائیگی سے مقید کرنا امر واقعہ کے مطابق ہے اور آپ ﷺ کی عین عادت شریفہ کے بیان کے لیے ہے کیونکہ آپ ﷺ اپنی ازواج کے مہر انہیں بالفور ادا فرما دیتے تھے۔ یا اس قید کا مقصد بالفور مہر کی ادائیگی کی فضیلت کو ظاہر کرنا ہے۔ اور بالا جماع یہاں مفہوم مخالف مراد نہیں (یعنی یہ معنی ہرگز نہیں لیا جاسکتا کہ اگر کسی بیوی کا مہر نقد ادا نہ کیا گیا ہو تو وہ آپ کے لیے حلال نہ تھی)۔

[2] اور آپ کی کنیزیں جو اللہ تعالیٰ نے کفار کی طرف سے آپ کو مال غنیمت کے طور پر عطا فرمائی ہیں اس طرح کہ انہیں قیدی بنایا گیا اور آپ ان کے مالک بن گئے مثلاً حضرت صفیہ اور جویریہؓ (وہ بھی آپ کے لیے حلال کر دی گئی ہیں)۔ مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ کی قید بھی احترازی نہیں اور مفہوم مخالف کے قائلین کے نزدیک بھی اس میں مفہوم مخالف معتبر نہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ محترمہ حضرت ماریہ قیدی بنا کر نہیں لائی گئی تھیں بلکہ مقوقس شاہ مصر نے وہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں بطور ہدیہ اور تحفہ پیش کی تھیں۔

[3] وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ سے مراد قریش کی بیٹیاں ہیں اور وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ سے مراد بنی زہرہ کی بیٹیاں ہیں اور الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ سے مراد وہ ہیں جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی۔ اس میں لفظ مع نفس فعل میں موافقت کے اثبات کے لیے ہے زمانے اور وقت میں موافقت کے لیے نہیں (یعنی وہ جو فعل ہجرت میں آپ کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ مراد نہیں کہ انہوں نے ہجرت

آپ کی رفاقت اور معیت میں کی ہو) جیسا کہ اس ارشاد میں لفظ مع موافقت فعلی کے لیے ہے اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ۔ گویا آیت میں مطلقاً ہجرت کرنے والی عورتیں مراد ہیں (چاہے انہوں نے ہجرت آپ ﷺ سے پہلے کی یا بعد میں)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے مذکورہ خاندانوں میں سے جن عورتوں نے ہجرت نہیں کی ان کے ساتھ آپ ﷺ کا نکاح جائز نہیں تھا(1)۔ امام ترمذیؒ نے روایت نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے اور حاکم نے سدی کی سند سے حدیث نقل کی ہے اور اسے صحیح کیا ہے۔ کہ وہ ابو صالح سے اور حضرت ابن عباسؓ کے واسطہ سے ام ہانی بنت ابی طالب سے روایت کیا ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے پیغام نکاح بھیجا تو میں نے معذرت پیش کر دی۔ پس آپ ﷺ نے میرا عذر قبول فرما لیا پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو میں آپ ﷺ کے لیے حلال ہی نہ رہی۔ کیونکہ ہجرت کرنے والی عورتوں میں سے نہیں تھی اور میں طلقاء میں سے تھی(2)۔ (یعنی میں ان میں سے تھی جنہیں رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن آزادی عطا فرما دی تھی)۔ ابن ابی حاتم نے اسماعیل بن ابی خالد کی سند سے ابو صالح سے اور انہوں نے ام ھانی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی ہے وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے میرے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ فرمایا تو آپ ﷺ کو مجھ سے روک دیا گیا کیونکہ میں نے ہجرت نہیں کی تھی۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ پھر حلت کے لیے ہجرت کی شرط منسوخ کر دی گئی(3)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہجرت سے مراد اسلام ہے یعنی جو آپ ﷺ کے ساتھ اسلام لائیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے مہاجر وہ ہے جس نے اس عمل کو چھوڑ دیا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ ان کی اس تاویل کے مطابق آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے لیے غیر مسلمہ سے نکاح حلال نہیں تھا چاہے وہ یہودیہ ہو یا نصرانیہ۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ غیر مومنہ عورت جب اپنی جان نبی کی نذر کر دے تو وہ آپ ﷺ کے لیے حلال نہیں (اور مومنہ کی قید سے یہی ثابت ہوتا ہے)۔ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا مہر کے عوض آپ ﷺ کے لیے یہودیہ اور نصرانیہ سے نکاح کرنا حلال تھا؟ تو اس بارے میں ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کے لیے ان سے نکاح کرنا حلال نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً۔ اور ہم نے بعض کی جانب سے قول باری تعالیٰ الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ کی تاویل بھی ذکر کر دی ہے کہ ہجرت سے مراد اسلام ہے(4)۔ (جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلمہ سے آپ کا نکاح جائز نہیں تھا)۔ ماقبل کلام کی وجہ سے یہ شرط جزاء سے مستغنی ہے۔ اور امرأۃ اس فعل محذوف کے سبب منصوب ہے جس کی تفسیر ماقبل فعل کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ونحل لک امرأۃ مؤمنۃ۔ یا یہ سابقہ کلام پر معطوف ہے۔ اور اس کے لیے "اِنْ" جو کہ استقبال کا معنی دیتا ہے سے مقید کرنا باعث حرج نہیں۔ کیونکہ یہاں احلال کا معنی ہے حلال ہونے کی خبر دینا۔ یعنی ہم نے آپ کو اس مومن عورت کے ساتھ نکاح کے حلال ہونے کی اطلاع دے دی ہے جو اپنی جان آپ ﷺ کی نذر کر دے اور مہر کا مطالبہ نہ کرے (یعنی آپ اس سے نکاح کر سکتے ہیں) اگر کہیں ایسا اتفاق ہو۔ اسی وجہ سے اسے نکرہ ذکر کیا ہے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 153 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریہ)
4۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریہ)

اِنۡ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنۡ یَّسۡتَنۡکِحَہَا پہلی شرط کے لیے معنی شرط ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے جس نے اپنی جان ہبہ کی ہے تو ہم نے آپ کے لیے حلال کر دیا ہے اگر وہ اپنی جان نذر کر دے۔ کیونکہ اپنی جان ہبہ کر دینا نکاح کا ایک رکن ہے جو کہ اس کی جانب سے ایجاب کے قائم مقام ہے۔ اور آپ ﷺ کے لیے اس کا حلال ہونا ثابت نہیں ہوگا جب تک کہ نبی مکرم ﷺ اس سے نکاح کا ارادہ نہ فرمائیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کا ارادہ اس کے لیے قبول کے قائم مقام ہے جس کے ساتھ نکاح مکمل ہوتا ہے۔ پس حلت دو شرطوں پر موقوف ہے اور وہ دونوں علت یعنی نکاح کے لیے رکن ہیں۔ لفظ نبی کو مکرر لانے کے سبب خطاب سے غیبت کی طرف عدول کیا گیا تھا۔ پھر اسی کی طرف رجوع کرتے ہوئے فرمایا خَالِصَۃً لَّکَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ یہ (اجازت) صرف آپ کے لیے ہے، دوسرے مومنوں کے لیے نہیں۔ کیونکہ ان پر جماع یا موت کے سبب مہر دینا واجب ہوتا ہے اگر چہ عقد نکاح کے وقت اس کا ذکر بالکل نہ کیا جائے۔ لیکن آپ ﷺ کے شرف نبوت کے اظہار اور استحقاق کرامت کی مضبوطی کے لیے آپ کو یہ خصوصی اجازت عطا فرمائی گئی (کہ آپ بلا مہر نکاح کر سکتے ہیں)۔ خَالِصَۃً عافیۃ کے وزن پر مصدر ہے جو تاکید کے لیے ذکر کیا گیا ہے یعنی خلص احلال ما احللنا لک علی القیود المذکورۃ خلوصاً لک۔ (مذکورہ قیود کے مطابق ہم نے جو عورتیں آپ کے لیے حلال کی ہیں وہ تحلیل صرف آپ ہی کے لیے ہے)۔ یہ مفہوم تب ہی متصور ہو سکتا ہے جب مذکورہ قیود احترازی ہوں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خالصۃ وہبت کی ضمیر سے حال ہے اور معنی یہ ہوگا کہ اگر وہ اپنے آپ کو بغیر مہر کے ہبہ کر لے اس حال میں کہ وہ صرف آپ ہی کے لیے ہو۔ یا پھر یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی ھبۃ خالصۃ۔ قول باری تعالیٰ وَامۡرَاَۃً مُّؤۡمِنَۃً الآیہ کے بارے ابن سعد نے حضرت عکرمہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت ام شریک دوسیہ کے بارے نازل ہوئی(1)۔ ابن سعد نے منیر بن عبداللہ دوسی سے نقل کیا ہے کہ ام شریک عزیہ بنت جابر بن حکیم دوسی نے اپنے آپ کو حضور نبی کریم ﷺ پر پیش کیا۔ یہ بہت خوبصورت تھیں تو آپ ﷺ نے انہیں قبول فرمالیا پھر ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا وہ عورت جو اپنی جان مرد کے لیے ہبہ کر دیتی ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں۔ ام شریک نے کہا پس میں ہی وہ ہوں پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں مومنہ کا نام دیا اور فرمایا وَامۡرَاَۃً مُّؤۡمِنَۃً اِنۡ وَّہَبَتۡ نَفۡسَہَا لِلنَّبِیِّ۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آپ کی خواہش جلد پوری فرما دیتا ہے(2)۔ ابن سعد نے ابورزین سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی عورتوں میں سے کسی کو طلاق دینے کا قصد فرمایا۔ پس جب انہوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے اپنے نفسوں کے حقوق کے بارے آپ کو آزاد کر دیا۔ آپ عورتوں میں سے جسے چاہیں ترجیح دے سکتے ہیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَکَ اَزۡوَاجَکَ سے تُرۡجِیۡ مَنۡ تَشَآءُ مِنۡہُنَّ الایہ تک آیات نازل فرمائیں۔(3) اور قول باری تعالیٰ خَالِصَۃً لَّکَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے ہے کہ بغیر مہر کے آپ کے لیے نکاح کرنا جائز ہے۔ اور قول باری تعالیٰ اِنۡ وَّہَبَتۡ نَفۡسَہَا لِلنَّبِیِّ سے یہی مراد ہے۔ یعنی اگر کسی نے بغیر مہر کے اپنی شادی کر لی جیسا کہ چار سے زائد عورتوں سے شادی کرنا آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ لفظ ہبہ سے نکاح کا منعقد ہونا آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا۔ کسی غیر کے لیے یہ جائز نہیں۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہی قول حضرت سعید بن المسیب، زہری، مجاہد اور عطاء کا قول بھی ہے اور ربیعہ، امام مالک رحمۃ

1۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 8 صفحہ 155 (صادر)
2۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 8 صفحہ 156 (صادر)
3۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 8 صفحہ 196 (صادر)

اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے (1)۔ انہوں نے مزید کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی کا نکاح لفظ نکاح اور تزویج کے بغیر منعقد نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ امام احمدؒ نے بھی یہی کہا ہے۔ اور آیت کے ترجمہ میں ائمہ کے اختلاف میں امام احمدؒ کا قول ذکر کیا گیا ہے کہ لفظ ہبہ سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے جبکہ اس کے ساتھ مہر ذکر کیا جائے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے کہا ہے کہ لفظ ہبہ کے ساتھ نکاح کا منعقد ہونا حضور نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک کا نکاح لفظ ہبہ، بیع، صدقہ اور تملیک کے ساتھ جائز ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر اس لفظ کے ساتھ نکاح منعقد ہو جاتا ہے جو ہمیشہ کے لیے معین چیز کی تملیک کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ اور لفظ اجارہ اور اعارہ سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔

امام کرخیؒ نے کہا ہے کہ لفظ اجارہ اور اعارہ سے بھی نکاح جائز ہوتا ہے کیونکہ ان سے بھی منفعت حاصل کرنے کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے۔ اور نکاح میں بھی منفعت کے حصول کی تملیک ہی حاصل ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ میں مہر پر لفظ اجرت کا اطلاق کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں چونکہ لفظ اجارہ اور اعارہ ملک متعہ کے حصول کا سبب نہیں بن سکتے اس لیے انہیں بطور استعارہ نکاح کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح لفظ وصیت سے بھی نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ کیونکہ وصیت موت کے بعد ملکیت کا سبب بن سکتی ہے (پہلے نہیں)۔ امام طحاویؒ نے ذکر کیا ہے کہ لفظ وصیت سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے ملک رقبہ تو ثابت ہو جاتی ہے۔ اور امام کرخیؒ نے لفظ وصیت سے نکاح منعقد ہونے کے لیے اسے ایسے لفظ کی قید سے مقید کیا ہے جو زمانہ حال پر دلالت کر رہا ہو مثلاً کسی نے یہ کہا او صیت لک بنتی ھذہ الان (میں نے تیرے لیے اپنی اس بیٹی کی اب وصیت کر دی، یعنی اسے تیرے نکاح میں دے دیا) تو اس سے نکاح منعقد ہو جائے گا کیونکہ اس صورت میں لفظ وصیت مجازاً تملیک کے معنی میں ہو جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ لفظ وصیت کے مفہوم میں اضافت کا معنی لیا جاتا ہے (یعنی لفظ وصیت کے مفہوم سے ہی تمیک بعد الموت کا معنی ماخوذ ہوتا ہے) جبکہ لفظ نکاح کے مفہوم میں اضافت کا معنی نہیں پایا جاتا (یعنی لفظ نکاح سے تملیک دائمی کا معنی ماخوذ ہوتا ہے)۔ اس طرح یہ دونوں لفظ باہم متضاد ہیں (لہٰذا یہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال نہیں ہو سکتے) اور ایک گروہ نے یہ بھی کہا ہے کہ جس طرح عام افراد امت کا نکاح لفظ نکاح یا تزویج کے بغیر صحیح نہیں ہوتا۔ اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ کے لیے بھی ان دو لفظوں کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا۔ اور آیت طیبہ میں نکاح پر لفظ ہبہ کا اطلاق مجازاً کیا گیا ہے۔ علامہ بیضاویؒ نے اس آیت سے امام شافعیؒ کے مسلک پر استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ لفظ معنی کے تابع ہوتا ہے اور اس پر تو اجماع ہے کہ معنوی طور پر یہ حکم (بغیر مہر کے نکاح کا جائز ہونا) حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ مختص ہے (2)۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ہبہ سے نکاح کا انعقاد بھی آپ ﷺ کے ساتھ خاص تھا)۔ علامہ بیضاویؒ کا یہ قول درست نہیں ہے۔ کیونکہ مجازی طور پر لفظ ہبہ سے نکاح مراد لینا جائز ہے۔ اور لفظ مجاز کو حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص کرنے کا کوئی سبب نہیں۔ اور نکاح لفظ ہبہ کا مجازی معنی ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس میں یہ قطعاً تخصیص نہیں کہ اس کا مجازی معنی صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی خاص ہو۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آیت میں حقیقی معنی بالیقین مراد نہیں۔ کیونکہ لفظ ہبہ کا حقیقی معنی تملیک العین (معینہ شے کا مالک بنانا) ہے۔ اور یہ معنی یہاں مراد نہیں بلکہ یہاں اس سے مراد بغیر عوض کے بضع کا مالک بنانا ہے۔ تو جب لفظ ہبہ کا مجازی معنی آپ ﷺ کے ساتھ مختص

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 381 (الفکر)

ہے۔ اور لفظ معنی کے تابع ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ کے بغیر کسی کے لیے لفظ ہبہ کے ساتھ مجازی طور پر نکاح کرنا جائز نہیں۔ تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ لفظ ہبہ کا مجازی معنی صرف بلاعوض تملیک بضع میں منحصر نہیں۔ بلکہ یہ بھی جائز ہے کہ لفظ ہبہ بولا جائے اور اس سے مراد مطلقاً تملیک بضع ہو چاہے وہ عوض کے ساتھ حاصل ہو یا بغیر عوض کے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ کلام طریق مجاز کے متحقق ہونے کے بارے میں ہے اور امام شافعیؒ نے اس کی نفی کر دی ہے کیونکہ وہ دلیل جس کے سبب مجازی معنی مراد لینا جائز ہوتا ہے وہی موجود نہیں۔ آپ نے اس پر اجمالی دلیل قائم کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر کسی لفظ سے مجازی معنی مراد لینا صحیح ہو تو پھر دونوں الفاظ میں سے ہر ایک سے دوسرے کا معنی مراد لینا جائز ہوتا ہے۔ لہٰذا انکحتک ھذا الثوب بول کر اس سے وھبتک یا ملکتک مراد لیا جانا چاہیے (لیکن اس طرح کہنا لغت کے خلاف ہے) اور اگر اس طرح ممکن نہ ہو تو پھر مجازی معنی مراد لینا صحیح نہیں ہوتا۔ تفصیلی دلیل یہ ہے کہ وضع کے اعتبار سے لفظ تزویج کا معنی تلفیق (دو چیزوں کو باہم جوڑ دینا اور ملا دینا) ہے۔ اور لفظ نکاح کا معنی بھی ملا دینا اور جمع کر دینا ہے۔ لیکن مالک اور مملوک کے درمیان تو ازدواج اور ضم کا معنی قطعاً موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک جب دوسرے کا مالک بنتا ہے تو ان کا نکاح فاسد ہو جاتا ہے۔ اگر یہ ملکیت نکاح کے منافی نہ ہوتی تو نکاح اس کے سبب مزید پختہ ہو جاتا (لہٰذا لفظ ہبہ سے نکاح مراد لینا صحیح نہیں ہے)۔ امام شافعیؒ کے خلاف ہماری اجمالی دلیل تو یہ ہے کہ اگر ہبہ اور نکاح کے درمیان مجازی معنی کے صحیح ہونے کے لیے کوئی علاقہ موجود نہیں تو پھر لفظ ہبہ سے حضور نبی کریم ﷺ کا نکاح بھی صحیح نہیں ہونا چاہیے حالانکہ وہ تو جائز ہے۔ اور جب مجاز کے صحیح ہونے کے لیے لفظ ہبہ اور بلاعوض نکاح کے درمیان علاقہ ثابت ہے تو وہ مطلق نکاح اور ہبہ کے درمیان بھی بالیقین ثابت ہوگا کیونکہ اخص کے ضمن میں اعم بھی پایا جاتا ہے۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ ہبہ کا حقیقی معنی تملیک العین (نفس شے کا مالک بنا دینا) ہے۔ اور تملیک العین ملک رقبہ کے واسطہ سے ملک متعہ کے لیے اس کے محل میں سبب ہے۔ اور ملک متعہ اپنے محل میں نکاح سے ثابت ہوتی ہے (اس سے معلوم ہوا کہ ہبہ اور نکاح کے مابین علاقہ سببیت موجود ہے) اور سببیت بطریق مجاز ہے (اس لیے لفظ ہبہ بول کر نکاح مراد لینا صحیح ہے)۔ رہا مسئلہ یہ کہ پھر لفظ نکاح کو بطریق مجاز تملیک عین کے لیے بولنا کیوں جائز نہیں۔ تو یہ مسئلہ کتب اصول میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہمارے نزدیک مجازی طور پر سبب کے لیے مسبب کا استعمال جائز نہیں۔ مگر جبکہ سبب سے مقصود اس کی مشروعیت ہو۔ جیسا کہ لفظ بیع ملک رقبہ کے حصول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور وہ ملک متعہ جو موجب نکاح ہے وہ تملیک کا مقصود نہیں بلکہ اس کا مقصود تو ملک رقبہ ہے۔ اور امام شافعیؒ کا یہ قول کہ مالک اور مملوک کے درمیان نہ ازدواج ہے نہ ضم۔ تو یہ قول ممنوع ہے قابل تسلیم نہیں۔ واللہ اعلم۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا حضور نبی کریم ﷺ کے پاس کوئی ایسی عورت تھی جس نے اپنی جان آپ ﷺ کو ہبہ کر دی تھی؟ اور اس کے بارے حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی ایسی عورت نہیں تھی جس سے آپ نے عقد نکاح نہ کیا ہو یا وہ آپ کی ملکیت میں (لونڈی) نہ ہو۔ اور قول باری تعالیٰ اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ شرط جزاء کے طریقہ پر ہے۔ اور دوسروں نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس ایسی عورتیں تھیں۔ امام شعبی نے کہا ہے کہ ان میں سے ایک عورت زینب بنت خزیمہ انصاریہ تھی جسے ام المساکین کہا جاتا تھا قتادہ نے کہا ہے کہ ان میں سے میمونہ بنت حارث تھی۔ حضرت علی بن حسینؓ، ضحاک اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ بنی اسد میں سے ام شریک

بنت جابر تھی (1)۔ ابن سعد نے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ وہ ام شریک بنت جابر تھی۔ اور عروہ بن زبیر نے کہا ہے کہ وہ بنی سلیم میں سے خولہ بنت حکیم تھی (2)۔

1 ہمیں خوب علم ہے جو ہم نے واجب کیا ہے مومنین پر ان کی بیویوں کے بارے میں۔ مثلاً نکاح کی شرائط، باری کی تقسیم، وطی کے سبب مہر کا لازم ہونا جبکہ پہلے مہر مقرر نہ کیا جائے اور یہ کہ وہ چار سے زیادہ عورتوں سے شادی نہ کریں۔ اور کنیزوں کے بارے میں چاہے انہیں خرید اگیا ہو یا کسی اور طریقے سے ملکیت میں آئی ہوں۔ اور کنیز ایسی ہو جو اپنے مالک کے لیے حلال ہو مثلاً کتابیہ بخلاف مجوسیہ (آتش پرست) اور وثنیہ (بت پرست) کے (کیونکہ یہ مالک کے لیے حلال نہیں ہوتی) اور وطی سے قبل استبراء رحم کرنا۔ ان کے بارے اللہ تعالیٰ نے وسعت دیتے ہوئے ان کی تعداد مقرر نہیں فرمائی اور ان کے درمیان باری کی تقسیم بھی واجب نہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے۔

2 تا کہ آپ پر کسی قسم کی تنگی نہ ہو۔ یہ قول باری تعالیٰ خالصۃً کے متعلق ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے اعمال کو بہت بخشنے والا ہے جن سے بچنا اور پرہیز کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ جہاں حرج اور تنگی کا گمان ہو وہاں وسعت اور گنجائش پیدا فرما کر وہ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ شیخین نے صحیحین میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ فرماتی ہیں کہ کیا عورت کو حیا نہیں آتی کہ وہ اپنا نفس ہبہ کرتی ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ ۭ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ﴿٥١﴾ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ﴿٥٢﴾

"(آپ کو اختیار ہے) دور کر دیں جس کو چاہیں اپنی ازواج سے 1 اور اپنے پاس رکھیں جس کو آپ چاہیں 2 اور اگر آپ (دوبارہ) طلب کریں جن کو آپ نے علیحدہ کر دیا تھا تب بھی آپ پر کوئی مضائقہ نہیں۔ اس (رخصت) سے پوری توقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور وہ آزردہ خاطر نہ ہوں گی اور سب کی سب خوش رہیں گی جو کچھ آپ انہیں عطا فرمائیں گے 3 اور (اے لوگو!) اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا بردبار ہے 4 حلال نہیں آپ کے لیے دوسری عورتیں اس کے بعد 5 اور نہ اس کی اجازت ہے کہ آپ تبدیل کر لیں ان ازواج سے دوسری بیویاں 6 اگر چہ آپ کو پسند آئے ان کا حسن 7 بجز کنیزوں کے 8 اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران ہے 9"

1 حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا میں دیکھ رہی ہوں آپ کا رب آپ کی خواہش بہت جلد پوری فرما دیتا ہے۔ اور ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا میں ان عورتوں کو عار دلاتی تھی جو اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے لیے ہبہ کرتی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 221 (التجاریہ)

تھیں اور میں کہتی تھی کیا ایک عورت بھی اپنے آپ کو ہبہ کر سکتی ہے پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ الایہ تو میں نے کہا میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی خواہش بہت جلدی پوری فرما دیتا ہے (1)۔ نافع، حمزہ، کسائی اور حفص نے تُرْجِیْ کو یاء ساکن کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اسے ہمزہ مضموم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے جسے چاہیں آپ دور کر دیں۔

ﷺ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ مفسرین کا اس آیت کے معنی میں اختلاف ہے۔ مشہور قول یہ ہے کہ یہ آیت ازواج کے درمیان باری تقسیم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ پر ازواج مطہرات کے درمیان باری کی تقسیم میں مساوات واجب تھی۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ سے یہ وجوب ساقط ہو گیا۔ اور آپ ﷺ کو ان کے بارے میں اختیار حاصل ہو گیا۔ ابو زید اور ابن زید نے کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جبکہ بعض امہات المؤمنین نے حضور نبی کریم ﷺ پر رشک کیا اور بعض نے نفقہ میں زیادتی کا مطالبہ کر دیا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے ایک ماہ تک ان سے علیحدگی اختیار فرمائی۔ یہاں تک کہ آیت تخییر نازل ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم فرمایا کہ آپ انہیں دنیا اور آخرت میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا اختیار دے دیں۔ پس ان میں سے جو دنیا کو اختیار کر لے اسے آزاد چھوڑ دو اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم کو اختیار کرے اسے اپنے پس روک لو۔ اس کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ امہات المؤمنین ہیں۔ اس لیے وہ کبھی بھی کسی اور سے نکاح نہیں کریں گی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ آپ ﷺ کو یہ اختیار ہے آپ ان میں سے جسے چاہیں اپنے پاس رکھیں گے اور جسے چاہیں اپنے سے دور کر دیں گے۔ پس وہ تمام آپ ﷺ کے ساتھ راضی ہو گئیں، چاہے آپ ان کے لیے باری مقرر فرمائیں یا مقرر نہ کریں یا ایک کے لیے زیادہ وقت مقرر کریں اور دوسری کے لیے کم۔ یا آپ ان میں سے بعض کو نفقہ اور باری کی تقسیم میں بعض پر فضیلت دیں۔ یہ تمام اختیارات آپ ﷺ کے پاس ہوں گے آپ جیسے پسند کریں گے وہی کریں گے۔ یہ اختیار بھی حضور نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ پس وہ ان شرائط پر آپ ﷺ سے راضی ہو گئیں اور انہوں نے آپ کو اختیار کر لیا (2)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے نہیں ہے بلکہ امت کے لیے بھی حکم اسی طرح ہے۔ پس وہ آدمی جس کے نکاح میں ایک سے زائد عورتیں ہوں۔ اور وہ اس سے اپنے حقوق نکاح نفقہ اور باری تقسیم میں مساوات کا مطالبہ کر دیں اور وہ آدمی ان سے یہ کہے فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (کہ آؤ میں تمہیں سامان دوں اور تمہیں خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دوں۔) اور جو تم میں سے نفقہ کے مطالبہ کے بغیر میرے ساتھ نکاح باقی رکھنے پر راضی ہو، اس شرط پر کہ میں تم میں سے جسے چاہوں گا اپنے پاس رکھوں گا اور جسے چاہوں گا اپنے سے دور کر دوں گا، چاہے میں تمہارے لیے باری مقرر کروں یا نہ کروں یا بعض کے لیے زیادہ اور بعض کے لیے کم مقرر کروں یا تم میں سے بعض کو نفقہ، لباس اور باری کی تقسیم میں بعض پر فضیلت اور ترجیح دوں۔ پس اس کے جواب میں ان عورتوں نے اسے کہہ دیا کہ ہم تجھے اختیار کرتی ہیں اور ہم نے نفقہ اور باری میں سے اپنا حق چھوڑ دیا ہے۔ تو اس صورت میں تمام اختیارات مرد کو حاصل ہو جائیں گے وہ جیسے چاہے وہی کر سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ اس بارے میں علماء کی مختلف روایات ہیں کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعض ازواج مطہرات میں سے کسی کو باری سے خارج کیا تھا یا نہیں۔؟ تو اس کے بارے بعض نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ نے کسی کو باری سے خارج نہیں

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 706 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 221 (التجاریۃ)

فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفویض کردہ تمام اختیارات ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان باری کی تقسیم میں مساوات اختیار فرمائی۔ مگر حضرت سودہؓ بذات خود اپنا حق چھوڑنے پر راضی ہوگئیں اور آپ ﷺ نے ان کی باری کا دن حضرت عائشہ صدیقہؓ کو دے دیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ابن جریر نے منصور کے واسطہ سے ابورزین سے یہ نقل کیا ہے کہ جب آیت تخییر نازل ہوئی تو ازواج مطہرات کو خطرہ لاحق ہوا کہ آپ ﷺ انہیں طلاق دے دیں گے تو انہوں نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ آپ اپنے مال اور نفس میں سے جو چاہیں ہمیں عطا فرمائیں لیکن ہمیں ہمارے حال پر ہی رہنے دیں تو پھر یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ ان میں سے جنہیں چاہیں اپنے سے دور فرمادیں تو پھر آپ ﷺ نے بعض کو دور فرمادیا۔ اور بعض کو اپنے پاس رکھا جنہیں اپنے پاس رکھا ان میں حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت حفصہ، حضرت زینب اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہن تھیں آپ ﷺ ان کے درمیان باری کی تقسیم مساوی کرتے تھے۔ اور جنہیں آپ نے دور فرمادیا وہ پانچ تھیں یعنی حضرت ام حبیبہ، حضرت سودہ، حضرت صفیہ، حضرت میمونہ اور حضرت جویریہ رضی اللہ عنہن۔ جب آپ ان کے لیے چاہتے تھے باری بنالیتے تھے (1)۔ امام بخاریؒ نے حضرت معاذہ کے واسطہ سے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ آیت طیبہ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ الآیہ نازل ہونے کے بعد کسی زوجہ کی باری کے دن ہم سے اجازت طلب فرماتے تھے۔ تو حضرت معاذہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ سے عرض کی، پھر آپ کیا کہتی تھیں؟ تو انہوں نے فرمایا میں آپ ﷺ سے یہ عرض کرتی تھی یارسول اللہ! ﷺ اگر اس کا اختیار میرے پاس ہے تو میں نہیں چاہتی کہ اپنے معاملہ میں کسی اور کو اپنے آپ پر ترجیح دوں۔ (2) مجاہد نے کہا ہے کہ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ کا معنی یہ ہے کہ آپ ان میں سے جنہیں چاہتے ہیں بغیر طلاق کے علیحدہ کردیں اور پھر جب چاہیں تجدید نکاح کے بغیر انہیں واپس لے آئیں (3)۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ آپ ان میں سے جنہیں چاہیں طلاق دے دیں اور جنہیں چاہیں اپنے پاس روک لیں۔ حسن نے کہا ہے اس کا معنی ہے اپنی امت کی عورتوں میں سے جس سے چاہیں نکاح نہ کریں اور جس سے چاہیں نکاح کرلیں اور کہا کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کسی عورت کو پیغام نکاح بھیجتے تھے تو پھر کسی اور کے لیے اسے پیغام نکاح دینا جائز نہیں تھا یہاں تک کہ آپ ﷺ اس سے دستبردار ہو جاتیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جن مومنہ عورتوں نے آپ کے لیے اپنی جانیں ہبہ کی ہیں آپ ان میں سے جنہیں چاہیں انہیں قبول کرلیں اور انہیں اپنے پاس روک لیں اور جنہیں چاہیں انہیں چھوڑ دیں اور قبول نہ کریں (4)۔ علامہ بغویؒ نے ہشام سے اور انہوں نے اپنے باپ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ خولہ بنت حکیم ان عورتوں میں سے تھی جنہوں نے اپنی جانیں حضور نبی کریم ﷺ کے لیے ہبہ کی تھیں۔ تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا کیا کسی عورت کو اپنا نفس مرد کے لیے ہبہ کرنے سے حیا نہیں آتی۔ پھر جب یہ آیت تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ الآیہ نازل ہوئی تو میں نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی خواہش بہت جلدی پوری فرمادیتا ہے۔ (5)

اور اگر آپ دوبارہ ان عورتوں میں سے کسی کو اپنے پاس رکھنے کی طلب اور ارادہ کریں جنہیں آپ نے علیحدہ کردیا تھا تب بھی آپ پر کوئی مضائقہ (گناہ) نہیں۔ اور یہ اختیار جو آپ کو تفویض کیا گیا ہے۔ یہ ان کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے، ان کے غمزدہ نہ ہونے اور ان تمام کی رضا اور خوشی کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ اس میں ان تمام کے لیے حکم برابر ہے۔ پھر آپ ان میں سے جسے اپنے پاس روک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 221 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 706 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 221 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 221 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 221 (التجاریہ)

لیں گے وہ اسے فضل اور مہربانی تصور کرے گی اور جسے آپ علیحدہ فرما دیں گے وہ یہ یقین کرے گی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا ہے اور وہ اسے بھی آپ کی طرف سے مہربانی اور احسان تصور کرے گی کہ آپ نے بغیر حاجت کے اسے اپنے نکاح میں باقی رکھا ہوا ہے۔

ؔ اور (اے لوگو!) اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے۔ پس تم اس کے احسان کے لیے کوشاں رہو۔ اور اس میں اس بیوی کے لیے وعید ہے جو ان میں سے رسول اللہ ﷺ کی مشیت کے ساتھ راضی نہ ہو۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عورتوں کے بارے میں اور ان میں سے بعض کی طرف میلان اور جھکاؤ کے بارے میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے جانتا ہے۔ اور ہم نے آپ کی آسانی کے لیے عورتوں کے بارے میں اختیار آپ کے سپرد کر دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سینوں میں چھپی ہوئی چیزوں کو بھی جاننے والا ہے اور بڑا بردبار ہے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ پس حق یہی ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ ابن سعد نے عکرمہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ازواج مطہرات کو اختیار دیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم ﷺ کو اختیار کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ؕ ابو عمرو اور یعقوب نے لَا یَحِلُّ کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کے ساتھ کیونکہ اس کا فاعل جمع مونث غیر حقیقی ہے۔ یعنی حلال نہیں آپ کے لیے دوسری عورتیں اس دن کے بعد حتیٰ کہ اگر ان میں سے ایک فوت بھی ہو جائے تو آپ کے لیے کسی دوسری سے نکاح کرنا حلال نہیں۔

ؖ مِنْ اَزْوَاجٍ میں من زائدہ ہے اور نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی آپ کے لیے یہ جائز نہیں کہ آپ ان میں سے کسی ایک کو طلاق دیں اور اس کی جگہ کسی دوسری سے نکاح کر لیں۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں اختیار دیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم ﷺ کو اختیار دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قدر افزائی فرمائی اور ان کے سوا دیگر عورتیں آپ ﷺ پر حرام قرار دیں اور آپ ﷺ کو انہیں طلاق دینے اور ان کے بدلے نئی عورت سے نکاح کرنے سے منع فرما دیا۔ یہی قول حضرت ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور علماء کے مابین اس میں اختلاف ہے کہ کیا اس حکم ممانعت کے بعد پھر آپ ﷺ کے لیے اباحت نکاح کا حکم نازل کیا گیا یا نہیں؟(1) تو اس بارے میں عبدالرزاق، سعید بن منصور، ابن سعد، احمدؒ، عبد بن حمیدؒ، ابوداؤدؒ نے اپنی ناسخ میں، ترمذیؒ اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے، نسائیؒ، ابن جریرؒ، ابن منذرؒ، حاکمؒ اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے، ابن مردویہؒ اور امام بیہقیؒ نے عطاءؒ کی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال نہیں ہوا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قول تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ کے سبب آپ ﷺ کے لیے یہ حلال کر دیا کہ آپ محرمات کے سوا جن عورتوں سے چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ آیت اگرچہ قرأت کے اعتبار سے مقدم اور پہلے ہے لیکن نزول کے اعتبار سے (آیت ممانعت سے) مؤخر ہے۔ ابن ابی حاتم نے بھی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح روایت کیا ہے اور ابن سعدؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی کی مثل نقل کیا ہے۔

علامہ بغویؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ ابھی تحریم کا حکم باقی تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا(2)۔ اور علامہ بغویؒ نے عکرمہ اور ضحاک کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے آپ کے لیے ان عورتوں کے بعد کسی سے نکاح

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 222 (التجاریۃ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 222 (التجاریۃ)

حلال نہیں ہے جو ہم نے آپ کے لیے ان صفات کے سبب حلال قرار دی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا اگر حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کا وصال ہو جاتا تو کیا آپ ﷺ کے لیے نئی شادی کرنا جائز تھی؟ تو آپ نے فرمایا کونسی شے آپ ﷺ کے لیے مانع تھی؟ تو عرض کی گئی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۢ بَعْدُ۔ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے ایک خاص قسم کی عورتیں حلال فرمائیں اور ارشاد فرمایا يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الآیہ۔ اور پھر ارشاد فرمایا لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنۢ بَعْدُ (یعنی اس خاص قسم کے سوا دیگر عورتیں آپ کے لیے حلال نہیں)۔ ابو صالح نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ کسی اعرابی یا عام عربی عورت سے شادی نہ کریں۔ اور آپ اپنی قوم (قبیلہ) کی عورتوں مثلاً چچا کی بیٹیاں، پھوپھی کی بیٹیاں۔ ماموں کی بیٹیاں اور خالہ کی بیٹیاں ہوں سے شادی کر سکتے ہیں اگر چہ وہ تین سو ہوں۔

مجاہد کا قول ہے کہ آپ کے لیے مسلمان عورتوں کے بعد یہودی اور نصرانی عورتوں سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے۔ اور نہ یہ حلال ہے کہ مسلمان عورتوں کو چھوڑ کر ان کے بدلے غیر مسلموں سے شادی کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ ام المومنین نہ کوئی یہودی عورت ہو سکتی ہے اور نہ عیسائی مگر اہل کتاب میں سے جو آپ کی کنیزیں ہیں آپ ان سے شب باشی کر سکتے ہیں۔

ضحاکؒ سے روایت ہے کہ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ کا معنی ہے کہ وہ ازواج مطہرات جو آپ کے حبالہ عقد میں ہیں انہیں طلاق دے کر ان کے بدلے دوسری عورتوں سے نکاح کرنا آپ کے لیے حلال نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ آپ ﷺ پر حرام قرار دیا کہ آپ اپنی موجودہ ازواج میں سے کسی کو طلاق دیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں امہات المومنین بنا دیا ہے اور جب انہوں نے آپ ﷺ کو اختیار کر لیا ہے تو آپ کے سوا کسی غیر پر اللہ تعالیٰ نے انہیں حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ کسی اور عورت سے نکاح کرنے سے آپ ﷺ کو منع نہیں فرمایا گیا۔

ابن زید نے قول باری تعالیٰ وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ کے بارے میں یہ کہا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنی ازواج کا تبادلہ کر لیتے تھے، ایک آدمی دوسرے سے کہتا تو میرے ساتھ اپنی بیوی کا تبادلہ کر لے، میں اپنی بیوی کا تبادلہ تجھ سے کرتا ہوں، یعنی تو اپنی بیوی سے میرے لیے دستبردار ہو جا اور میں تیرے لیے اپنی بیوی سے دستبردار ہو جاتا ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ یعنی اپنی ازواج کا کسی غیر سے تبادلہ نہ کیجئے اس طرح کہ آپ اپنی زوجہ اس کے حوالے کر دیں اور اس کی بیوی خود لے لیں۔ مگر کنیزیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ یعنی اپنی جس کنیز کے بارے میں آپ چاہیں تبادلہ کر لیں اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن جہاں تک بیویوں کا تعلق ہے تو ان کا تبادلہ ہرگز حلال نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عیینہ بن حصین بغیر اجازت کے حضور نبی کریم ﷺ کے پاس داخل ہوا اور اس وقت حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کے پاس موجود تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اجازت طلب کیوں نہیں کی؟۔ تو اس نے کہا یا رسول اللہ! ﷺ جب سے میں سن شعور وادراک کو پہنچا ہوں میں نے شہر کے کسی آدمی سے داخل ہونے کے لیے اجازت طلب نہیں کی۔ پھر اس نے کہا آپ کے پہلو میں یہ حسین وجمیل عورت کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ عائشہ ام المومنین ہے۔ تو عیینہ نے کہا کیا میں تمہیں (اس کے بدلے) حسین ترین عورت نہ دے دوں؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایسا تبادلہ حرام قرار دیا ہے۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ کون تھا؟ آپ ﷺ نے

فرمایا یہ احمق اور بیوقوف ہے جس کی پیروی کی جاتی ہے یہ باوجود اس حالت کے جس پر تم نے اسے دیکھا ہے یہ اپنی قوم کا سردار ہے۔(1)

ے ترکیب کلام میں وَلَوْ اَعْجَبَکَ الآیہ تبدّل کے فاعل سے حال ہے نہ کہ مفعول سے۔ کیونکہ مفعول من ازواج ہے جو متوغل فی التنکیر ہونے کی وجہ سے (ذوالحال نہیں بن سکتا)۔ تقدیر عبارت ہے مَفْرُوْضًا اِعْجَابُکَ بِھِنَّ۔

علامہ بغویؒ نے مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ آپ کے لیے یہ جائز نہیں کہ آپ اپنی ازواج میں سے کسی کو طلاق دیں اور اس کے بدلے دوسری سے نکاح کریں، اگرچہ اس کا حسن و جمال آپ کو کتنا ہی پسند آئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیوی بنت عمیس خثعمیہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں پیغام نکاح بھیجنے کا ارادہ فرمایا۔ تو آپ ﷺ کو اس سے روک دیا گیا۔(2)

۸۔ یہاں لفظ مَا محل رفع میں ہے اور یہ النسآء سے مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ النسآء کا لفظ ازواج کو بھی شامل ہے اور کنیزوں کو بھی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ اس کے بعد ماریہ کے مالک بنے تھے(3) جو کہ آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ محترمہ تھیں۔

۹۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران ہے۔ پس تم اپنے معاملات کی حفاظت کرو اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو حد مقرر فرمائی ہے اس سے تجاوز نہ کرو۔

مسئلہ: علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ آدمی جس عورت سے شادی کا ارادہ رکھتا ہو اس کی طرف دیکھنا جائز ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی کسی عورت کو نکاح کا پیغام دے تو اگر وہ ان اعضاء کی طرف دیکھنے کی طاقت رکھتا ہو جو اس کے ساتھ نکاح کرنے کی دعوت دیتے ہوں تو اسے ایسا کر لینا چاہئے(4) (یعنی اسے دیکھ لینا چاہئے) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک عورت کو پیغام نکاح بھیجا تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تو نے اسے دیکھا ہے؟ میں نے عرض کی نہیں۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا اسے دیکھ لے کیونکہ تم دونوں کے مابین اتفاق و اتحاد قائم رکھنے کے لیے یہ زیادہ بہتر اور مناسب ہے(5)۔ اسے احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے انصار میں سے ایک عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تو حضور نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا اس کی طرف دیکھ لے کیونکہ انصار کی عورتوں کی آنکھوں میں کچھ ہوتا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(6)۔ حمیدی نے کہا ہے کیونکہ ان کی آنکھوں میں زردی (پیلا پن) ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

شیخین نے صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا تو آپ ﷺ نے قوم کی دعوت کی۔ پس جب وہ کھانا کھا چکے تو وہ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پھر آپ ﷺ نے ایسا انداز اپنایا گویا کہ آپ اٹھنے کی تیاری فرما رہے ہیں لیکن وہ لوگ نہ اٹھے۔ پس جب آپ ﷺ نے یہ دیکھا تو آپ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (التجاریۃ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (التجاریۃ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (التجاریۃ)　　4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (التجاریۃ)

5۔ سنن [illegible]، جلد 2 صفحہ 72 ([illegible] تعلیم)　　6۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 456 (قدیمی)

اٹھ کھڑے ہوئے۔ جونہی آپ ﷺ اٹھے تو لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے لیکن ان میں سے تین آدمی بیٹھے ہی رہے۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ اندر داخل ہونے کے لیے واپس تشریف لائے لیکن وہ لوگ ابھی تک بیٹھے ہوئے تھے (تو آپ انہیں دیکھ کر پھر واپس چلے گئے) پھر کچھ دیر کے بعد وہ لوگ اٹھے تو میں چلا اور حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اطلاع دی کہ وہ لوگ چلے گئے ہیں۔ آپ ﷺ تشریف لائے یہاں تک کہ آپ اندر داخل ہو گئے۔ پس میں بھی اندر داخل ہونے کے لیے ساتھ گیا مگر آپ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ ڈال دیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۫ وَ اللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ ؕ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ۝ اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْۤ اٰبَآىِٕهِنَّ وَ لَاۤ اَبْنَآىِٕهِنَّ وَ لَاۤ اِخْوَانِهِنَّ وَ لَاۤ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَ لَاۤ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَ لَا نِسَآىِٕهِنَّ وَ لَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَ اتَّقِيْنَ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝

''اے ایمان والو! نہ داخل ہوا کرو نبی کریم کے گھروں میں [1] بجز اس (صورت) کے کہ تم کو کھانے کے لیے آنے کی اجازت دی جائے (اور) نہ کھانا پکنے کا انتظار کیا کرو [2] لیکن جب تمہیں بلایا جائے تو اندر چلے آؤ پس جب کھانا کھا چکو تو فوراً منتشر ہو جاؤ۔ اور نہ وہاں جا کر دل بہلانے کے لیے باتیں شروع کر دیا کرو [3] تمہاری یہ حرکتیں (میرے) نبی کے لیے تکلیف کا باعث بنتی ہیں۔ پس وہ تم سے حیا کرتے ہیں (اور چپ رہتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کسی کو شرم نہیں کرتا حق بیان کرنے میں [4] اور جب تم مانگو ان سے کوئی چیز تو مانگو پس پردہ ہو کر۔ یہ طریقہ پاکیزہ تر ہے تمہارے دلوں کے لیے نیز ان کے دلوں کے لیے [5] اور تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اذیت پہنچاؤ اللہ کے رسول کو اور اس کی بھی اجازت نہیں کہ نکاح کرو ان کی ازواج سے ان کے بعد کبھی [6] بے شک ایسا کرنا اللہ کے نزدیک گناہ عظیم ہے [7] چاہے تم کسی بات کو ظاہر کر دیا اسے چھپاؤ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز سے خوب آگاہ ہے [8] کوئی حرج نہیں ان پر اگر ان کے ہاں آئیں ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے اور ان کے بھانجے [9] اسی طرح مسلمان عورتوں اور لونڈیوں کی آمد و رفت پر بھی کوئی پابندی نہیں (اے عورتو!) ڈرا کرو اللہ (کی نافرمانی) سے، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ فرما رہا ہے [10]''

[1] علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ ابن شہاب حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضور نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ تشریف

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 461 (قدیمی)

فرما ہوئے تو اس وقت میری عمر دس برس تھی۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرنے پر میری ماں میرے ساتھ تعاون فرماتی تھی۔ لہٰذا میں نے دس سال تک آپ ﷺ کی خدمت کی اور جب حضور نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا تو اس وقت میری عمر بیس برس تھی۔ اور میں آیت حجاب کے شان نزول کے بارے تمام لوگوں کی نسبت زیادہ جانتا ہوں۔ حضور نبی کریم ﷺ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی خواب گاہ میں تھے کہ پہلی بار آیت حجاب کا نزول ہوا۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جب ان کے ساتھ شادی کی تو صبح کے وقت آپ ﷺ نے لوگوں کو کھانے کی دعوت دی اور وہ کھانا کھانے کے لیے حاضر ہوئے، الحدیث (1)۔ یہ روایت بھی بخاری کی روایت کی مثل ہی ہے۔ بخاری شریف کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں آیت حجاب کو تمام لوگوں کی نسبت زیادہ جانتا ہوں جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیج دیا گیا۔ وہ آپ ﷺ کے ساتھ گھر میں ہی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کھانے کی دعوت کا اہتمام کیا اور لوگوں کو کھانے پر بلایا پس لوگ (کھانے سے فارغ ہونے کے بعد) وہاں بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ پھر رسول اللہ ﷺ اٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ جب کچھ دیر کے بعد واپس لوٹ کر آئے تو ابھی تک وہ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)۔ آپ ﷺ نے پردہ ڈال دیا اور لوگ اٹھ کر چلے گئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت اس طرح ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے خلوت اختیار فرمائی تو پھر آپ ﷺ نے ولیمے کا اہتمام کیا اور گوشت روٹی تیار کروایا۔ پھر مجھے کھانے کی دعوت دینے کے لیے بھیجا۔ پس لوگ آنے لگے کھاتے اور نکلتے جاتے۔ پھر اور لوگ آتے کھاتے اور نکلتے جاتے۔ پس میں لوگوں کو بلاتا رہا یہاں تک کہ میں نے کوئی ایسا آدمی نہ پایا جسے میں دعوت دوں۔ پھر میں نے عرض کر دی یا نبی اللہ! میں کوئی ایسا آدمی نہیں پا رہا جسے میں دعوت دوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کھانا اٹھالو۔ پس تین آدمی گھر میں باتیں کرتے ہوئے باقی رہ گئے۔ حضور نبی کریم ﷺ باہر تشریف لے گئے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کی طرف چلے گئے اور انہیں فرمایا السلام علیکم اهل البیت و رحمة اللّٰه۔ تو انہوں نے بھی آگے سے کہا وعلیکم السلام و رحمة اللّٰه۔ آپ نے اپنی اہلیہ کو کیسے پایا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو مبارک کرے۔ پھر آپ ﷺ اپنی تمام ازواج کے حجروں میں تشریف لے گئے اور انہیں وہی کچھ فرمایا جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تھا اور انہوں نے بھی آپ کو وہی کچھ کہا جو حضرت عائشہ صدیقہ نے کہا تھا۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ واپس لوٹے لیکن ابھی تک وہ لوگ گھر میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ چونکہ حضور ﷺ تو شرم و حیاء کا پیکر تھے اس لیے پھر واپس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کی طرف تشریف لے گئے۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ میں نے آپ کو خبر دی یا کسی اور کی جانب سے خبر دی گئی کہ وہ لوگ نکل گئے ہیں تو آپ واپس لوٹ آئے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ایک پاؤں دروازے کی دہلیز سے اندر رکھا اور دوسرا ابھی باہر ہی تھا تو آپ ﷺ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ لٹکا دیا۔ اور آیت حجاب نازل ہوئی۔ (3)

بخاری کی ایک روایت اس طرح ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ خلوت اختیار فرمائی تو آپ نے ولیمے کا اہتمام کیا اور لوگوں کو خوب پیٹ بھر کر گوشت روٹی کھلائی، پھر آپ ﷺ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (التجاریۃ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 706 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 707 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 707 (وزارت تعلیم)

امہات المومنین کے حجروں کی طرف تشریف لے گئے جیسا کہ آپ ﷺ کا ایسے مواقع پر معمول تھا۔ پس آپ ﷺ انہیں سلام فرماتے رہے اور دعا دیتے گئے اور وہ بھی جواباً سلام عرض کرتی رہیں اور آپ کو دعا دیتی رہیں۔ پھر جب آپ ﷺ واپس اپنے گھر کی طرف لوٹے تو دو آدمیوں کو دیکھا وہ بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ پس جونہی آپ نے انہیں دیکھا تو اپنے گھر سے پھر واپس لوٹ گئے۔ پس جب ان دونوں آدمیوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو دیکھا تو اٹھ کر چلے گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ لوٹ کر آئے یہاں تک کہ گھر میں داخل ہو گئے اور میرے اور اپنے درمیان پردہ لٹکا دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت امام ترمذیؒ نے نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا کہ آپ ﷺ اس عورت کے دروازے کے پاس آئے جس سے شادی کی تھی تو وہاں دیکھا کہ ان کے پاس کچھ لوگ موجود ہیں تو آپ ﷺ وہاں سے چلے گئے۔ پھر جب وہ لوگ باہر نکل گئے تو آپ واپس لوٹ آئے اور اندر تشریف لے گئے اور اسی دوران میرے اور اپنے درمیان پردہ ڈال دیا۔ میں نے اس کا تذکرہ ابوطلحہؓ سے کیا تو انہوں نے کہا اگر ایسے ہی ہے جیسے تم کہہ رہے ہو تو بالیقین اس کے بارے کچھ نازل ہوگا تو پھر آیت حجاب نازل ہوئی۔ طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے، آپ فرماتی ہیں کہ میں ایک دفعہ حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ مل کر ایک پیالے میں کھانا کھا رہی تھی کہ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہاں سے گزر ہوا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے انہیں بھی کھانے پر بلا لیا اور وہ بھی ساتھ کھانے لگے۔ اسی اثناء میں اچانک ان کی انگلی میری انگلی سے آ لگی۔ تو فوراً ان کی زبان سے یہ نکلا اوہ! اگر تم عورتوں کے بارے میں میری رائے تسلیم کر لی جاتی تو کوئی آنکھ دیکھ تک نہ سکتی۔ پس پھر آیت حجاب نازل ہوئی (1)۔ امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں اور امام نسائی نے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ حضور نبی کریم ﷺ تین مرتبہ باہر تشریف لے گئے تاکہ وہ بھی چلا جائے لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ پس اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے تو انہوں نے آپ ﷺ کے چہرۂ مقدس پر ناپسندیدگی کے آثار دیکھے تو آپ نے اس آدمی سے کہا شاید تو نے حضور نبی کریم ﷺ کو تکلیف پہنچائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تین بار اٹھا تاکہ وہ بھی میرے پیچھے اٹھ کھڑا ہو لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ اگر آپ پردہ بنا لیتے (تو یہ بہتر تھا) کیونکہ آپ کی ازواج دیگر عام عورتوں کی مثل نہیں ہیں۔ اور یہ ان لوگوں کے دلوں کو بھی زیادہ پاک کرنے والا ہوتا (2)۔ پس اس کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی۔ سورۂ بقرہ میں وہ روایت گزر چکی ہے جو امام بخاری وغیرہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میری رائے (۱) نے تین چیزوں میں اپنے رب کے حکم کے ساتھ موافقت کی ہے۔ پس میں نے کہا کاش آپ

1۔ الادب المفرد للبخاری، جلد 2 صفحہ 523 (المدنی قاہرہ) 2۔ معجم کبیر، جلد 11 صفحہ 439 (العلوم والحکم)

(۱) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو چار چیزوں کے سبب دوسرے لوگوں پر فضیلت دی گئی۔ ایک یہ تھی کہ آپ نے غزوۂ بدر کے قیدیوں کو قتل کرنے کی رائے دی تھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ الآیہ۔ دوسری چیز یہ تھی آپ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج کے لیے پردہ کرنے کا مشورہ دیا تو حضرت زینبؓ نے آپ سے کہا اے ابن خطاب! آپ ہم پر بھی غیرت کھانے لگے ہیں حالانکہ وحی ہمارے گھروں میں نازل ہوتی ہے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

مقام ابراہیم کو جائے نماز بنا لیتے تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ کی ازواج کے پاس نیک اور فاجر لوگ آتے رہتے ہیں۔ پس اگر آپ انہیں پردہ کرنے کا حکم ارشاد فرمائیں (تو یہ بہتر ہو)۔ پس اس پر آیت حجاب نازل ہوئی۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آپ کی ازواج مطہرات غیرت اور رقابت کے سبب جمع تھیں کہ میں نے ان سے کہا عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ۔ تو آیت بھی اسی طرح نازل ہوگئی (1)۔ نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے اسی طرح نقل کیا ہے اور علامہ بغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ آیت حجاب کے سبب نزول میں صحیح واقعہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے اونچے ٹیلوں کی طرف نکلتی تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے یہ عرض کرتے تھے کہ آپ اپنی ازواج کو پردے کا حکم دیجئے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ ایسا نہیں کرتے تھے۔ پھر ایک رات عشاء کے وقت حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا باہر تشریف لے گئیں۔ آپ ایک طویل القامت عورت تھیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پردے کا حکم نازل ہونے کی شدید خواہش کرتے ہوئے آپ کو آواز دی ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت حجاب نازل فرما دی (2)۔ حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے مذکورہ بالا تمام روایات کو جمع کرنا ممکن ہے اس طرح کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے قصہ سے کچھ پہلے پیش آیا ہو۔ لہٰذا اس واقعہ کے نزول آیت سے قریب ہونے کی وجہ سے اسے ہی سبب نزول قرار دیا گیا ہو اور ایک آیت کے اسباب نزول متعدد ہونے سے کوئی شے مانع نہیں ہے۔

۲۔ یہ استثناء مفرغ ہے ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یا مصدر ہونے کی بناء پر (مفعول مطلق کی بناء پر) یا پھر حال ہونے پر وجہ سے منصوب ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی لَا تَدْخُلُوْا فِیْ وَقْتٍ اِلَّا وَقْتِ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ یالَاتَدْخُلُوا دُخُولًا اِلَّا دُخُولًا مَاْذُوْنًا لَكُمْ یالَاتَدْخُلُوْا فِیْ حَالٍ اِلَّا حَالِ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ۔ "اِلٰى طَعَامٍ" یُؤْذَنَ کے متعلق ہے کیونکہ وہ یدعٰی کے معنی کو متضمن ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ بھی دیا گیا ہے کہ بغیر دعوت کے کھانے پر جانا اچھا نہیں ہوتا اگرچہ داخلے کی اجازت دے دی گئی ہو۔ جیسا کہ اس ارشاد میں بھی اشارہ ہے۔ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰىهُ کھانا پکنے کے وقت کا انتظار کیے بغیر۔ ترکیب کلام میں یہ لَا تَدْخُلُوْا کے فاعل سے حال ہے یا لکم کی ضمیر مجرور سے حال ہے اور یہ استثناء میں داخل ہے۔ یعنی تم داخل نہ ہو مگر اجازت کے ساتھ اور کھانا پکنے کا انتظار کیے بغیر۔ یہ استثناء صرف ان لوگوں کے ساتھ مختص ہے جو کھانے کے لیے داخل ہوتے ہیں مطلقاً لوگوں کے لیے نہیں۔ حمزہ اور کسائی نے اِنٰهُ میں امالہ کیا ہے۔ یہ اس صورت میں مصدر ہے۔ جب کھانا پک جائے تو کہا جاتا ہے اَنیَ الطعام اسی طرح کہا جاتا ہے أنی الحمیم جب پانی شدید گرم ہو جائے۔ اسی طرح جب کوئی کام کرنے کا وقت ہو جائے تو کہا جاتا ہے أنی ان یفعل کذا۔ علامہ بغوی نے کہا

1۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 558 (وزارت تعلیم)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 224 (التجاریۃ)

(گزشتہ سے پیوستہ)

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ۔ تیسری چیز یہ تھی کہ حضور نبی کریم ﷺ نے آپ کے لیے یہ دعا کی تھی اَللّٰهُمَّ اَیِّدِ الْاِسْلَامَ بِعُمَرَ (اے اللہ! اسلام کو عمر کے سبب تقویت عطا فرما) اور چوتھی چیز یہ تھی کہ آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا مشورہ دیا اور سب سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ (من المفسر رحمۃ اللہ تعالیٰ)

ہے کہ یہ اِنٰی ہمزہ مقصورہ کسرہ کے ساتھ ہے اور جب اسے فتحہ دیں گے تو ہمزہ ممدودہ ہوگا۔ اور کہیں گے الاناء۔ اس کی دو لغتیں ہیں اَنٰی یَأنِیْ(1) یہ رَمٰی یَرْمِیْ کے وزن پر باب ضَرَبَ یَضْرِبُ ہے۔ اور دوسری لغت اٰنَ یَئِیْنُ ہے یہ بَاعَ یَبِیْعُ کے وزن پر باب ضرب یضرب ہے۔ اور قاموس میں ہے اَنیَ الشیء یأنی اینا و اِناء و اِنًا۔ یہ غنٰی کے وزن پر انی آتا ہے۔ اس کا معنی ہے۔ کام کا وقت ہوگیا، چیز پک گئی، تیار ہوگئی۔ انیَ الحمیم یانی اپنی گرمی اور تپش کی انتہاء کو پہنچ گیا۔ فَھُوَ اٰن انتہاء کو پہنچنے والا۔ وبلغ ھذا اناہ، چاہے فتحہ کے ساتھ ہو یا کسرہ کے ساتھ ہو معنی ہو گا وہ اپنی انتہاء کو پہنچ گیا یا چیز پک گئی یا تیار ہوگئی۔

ﷺ جب تم کھانا کھا چکو تو فوراً منتشر ہو جاؤ اور آپ ﷺ کے کاشانہ اقدس سے نکل جاؤ اور کھانے کے بعد وہاں نہ ٹھہرو۔ وَلَا مُسْتَانِسِیْنَ نَاظِرِیْنَ پر معطوف ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ یا یہ محل نصب میں ہے۔ یعنی لا تدخلوھا مستانسِیْنَ (دل بہلانے کے لیے ان کے پاس داخل نہ ہو)۔ بعض نے تقدیر عبارت اس طرح ذکر کی ہے ولا تمکثوا مستانسین (اور تم دل بہلانے کے لیے وہاں نہ رکو)۔ اس صورت میں جملہ کا عطف جملے پر ہے۔ اس جملہ میں انہیں دیر تک بیٹھے رہنے سے منع کیا گیا ہے کہ وہ دیر تک وہاں بیٹھے بیٹھے آپس میں باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کے دل بہلانے لگیں۔

ﷺ بے شک تمہارا ٹھہرنا نبی کے لیے تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ ایک تو اس اعتبار سے کہ گھر آپ ﷺ اور آپ کے گھر والوں پر تنگ ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا اعتبار سے کہ آپ ﷺ کو اس طرح لایعنی (بے مقصد) کاموں میں مشغول رہنا پڑتا ہے۔ یہ جملہ کلام سابق کی علت بیان کر رہا ہے۔ پس وہ تم سے حیا کرتے ہیں اور تمہیں (گھر سے باہر) نہیں نکالتے۔ فَیَسْتَحْیٖ کا عطف سابقہ جملہ اسمیہ پر ہے۔ وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ جملہ معطوف ہے یا حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حیا کے سبب تمہیں ادب سکھانا نہیں چھوڑے گا۔ کیونکہ ادب کی تعلیم دینا حق ہے۔ اور علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا تمہیں نبی مکرم کے گھر سے نکالنا حق ہے۔ پس چاہئے کہ نبی مکرم ﷺ حیاء کو ترک نہ کریں جیسا کہ اللہ تعالیٰ حق کو نہیں چھوڑتا لہٰذا وہ تمہیں نکلنے کا حکم دے رہا ہے۔(2)

ﷺ اور جب تم حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج سے کوئی چیز مانگو۔ کیونکہ بیوت النبی کے الفاظ انہی پر دلالت کرتے ہیں اس لیے کہ گھروں میں آپ ﷺ کی ازواج مطہرات ہی تھیں۔ ایسی شے جس سے نفع اٹھایا جا سکتا ہو۔ چاہے عاریۃً طلب کرو یا ہبۃً مانگو یا پھر عاریۃً لی ہوئی چیز واپس لوٹانے جاؤ۔ وہ شے ان سے مانگو تو پس پردہ ہو کر مانگو یہ جملہ شرطیہ قول باری تعالیٰ لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ پر معطوف ہے۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ آیت حجاب نازل ہونے کے بعد کسی کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ازواج میں سے کسی کی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں تھی چاہے وہ نقاب اوڑھے ہوئے ہو یا نہ ہو(3)۔ پردے کے پیچھے سے مانگنے کا طریقہ شیطانی وساوس سے تمہارے دلوں کو پاک رکھنے والا ہے اور ان کے دلوں کو بھی۔ یہ جملہ سابقہ کلام کی علت بیان کر رہا ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابن زید سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ کوئی آدمی یہ کہتا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کا وصال ہوگا تو میں آپ کے بعد آپ کی فلاں زوجہ سے شادی کروں گا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ﷺ اور تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اللہ کے رسول کو اذیت پہنچاؤ، یعنی ایسی باتیں کرو جو آپ کے لیے پسندیدہ نہ ہوں۔ اور تمہیں اس کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 224 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 383 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 224 (التجاریہ)

بھی اجازت نہیں کہ آپ کے وصال یا جدائی اختیار کرنے کے بعد آپ کی ازواج میں سے کسی سے کبھی بھی نکاح کرو۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اس آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج میں سے آپ کے بعد شادی کرنے کا قصد کیا تھا(1)۔ سفیان نے کہا ہے کہ یہ قصد حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے کیا گیا تھا۔ اور سدی سے مروی ہے کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ طلحہ بن عبید اللہ نے یہ کہا کہ کیا محمد (ﷺ) ہمیں اپنی چچا کی بیٹیوں کے پاس جانے سے پردہ کے باعث روکتے ہیں اور خود ہمارے بعد ہماری بیویوں سے نکاح کر لیتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی واقعہ پیش آ گیا تو ہم بھی آپ کے بعد آپ کی بیویوں سے نکاح کریں گے۔ پس اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن سعد نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت طلحہ بن عبید اللہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ اس نے یہ کہا تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ وصال فرمائیں گے تو میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے شادی کروں گا۔ جو یبر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے کسی کے پاس آیا اور ان سے گفتگو کرنے لگا اور وہ ان کے چچا کا بیٹا تھا تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا آج کے دن کے بعد اس مقام پر کھڑے نہ ہونا تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ میرے چچا کی بیٹی تھی قسم بخدا! میں نے اسے کوئی بری بات نہیں کی اور نہ ہی اس نے مجھے کوئی ایسی بات کہی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں یہ جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں اور نہ مجھ سے بڑھ کر اور کوئی غیرت مند ہے۔ پھر وہ آدمی چلا گیا اور کہنے لگا یہ مجھے میری چچا کی بیٹی سے باتیں کرنے سے روکتے ہیں۔ میں ان کے بعد اس سے ضرور شادی کروں گا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آدمی نے اپنی اس بات سے توبہ کرتے ہوئے ایک غلام آزاد کیا، دس اونٹوں کا ساز و سامان اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیا اور پیدل چل کر حج کیا۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ معمر نے زہری سے روایت نقل کی ہے کہ عالیہ بنت ظبیان وہ عورت ہے جسے حضور نبی کریم ﷺ نے طلاق دے دی تھی۔ پھر اس نے ایک اور آدمی سے شادی کی اور اس کے ہاں اولاد بھی ہوئی۔ لیکن یہ واقعہ لوگوں پر ازواج مطہرات کے ساتھ نکاح کے حرام ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے(2)۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ حکم تحریم سے وہ عورتیں مستثنیٰ ہیں جن کے ساتھ آپ ﷺ نے خلوت اختیار نہیں فرمائی (اور انہیں طلاق دے دی)۔ روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں اشعث بن قیس نے مستعیذہ سے شادی کی۔ (مستعیذہ کا معنی ہے پناہ طلب کرنے والی)۔ اس کا نام جوینہ کلبیہ تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس سے قربت کا ارادہ فرمایا تو اس نے کہا میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ سنتے ہی اسے چھوڑ دیا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسے رجم کرنے کا ارادہ فرمایا۔ پھر آپ کو یہ معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے تو اسے مس کرنے سے قبل ہی جدا کر دیا تھا۔ تو پھر بغیر کسی انکار اور اعتراض کے آپ نے اسے چھوڑ دیا۔(3)

یہ بے شک ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ عظیم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تحریم نکاح کا حکم اس وجہ سے ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنی قبر انور میں زندہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ کوئی آپ کا وارث بنا اور نہ آپ ﷺ کی ازواج مطہرات بیوہ ہوئیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی

1۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 6 صفحہ 2840 (ابن حزم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 225 (التجاریہ)

اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کوئی میری قبر کے پاس مجھ پر درود شریف پڑھے گا میں اس کا درود خود سنوں گا اور جو دور سے مجھ پر درود پڑھے گا تو مجھے وہ پہنچا دیا جائے گا۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔(1)

۸۔ چاہے تم کسی بات کو ظاہر کرو، یعنی رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچانے یا آپ کی ازواج میں سے کسی سے نکاح کرنے کی بات کرو۔ یا تم اسے اپنے دلوں میں چھپاؤ۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے بعد ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنے کا ارادہ دل میں چھپا رکھا تھا(2)۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز سے خوب آگاہ ہے۔ یہ جملہ جزاء محذوف کی علت ہے اور اس کے قائم مقام ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے یَعْلَمُهُ اللّٰهُ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا۔ اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے خوب آگاہ ہے۔ پس وہ تمہیں اس پر سزا دے گا۔ ازواج مطہرات سے نکاح کی حرمت کا حکم صراحۃً بیان کرنے کے بعد یہ تعمیم اور مقصود پر دلیل مزید خوف زدہ کرنے اور وعید و عذاب میں مبالغہ کے اظہار کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس نے ازواج مطہرات میں سے کسی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس نے اپنے قول سے توبہ کرتے ہوئے ایک غلام آزاد کیا، دس اونٹوں کا ساز و سامان اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیا اور پیدل چل کر حج کیا۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں گزر چکا ہے۔

۹۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ جب آیت حجاب نازل ہوئی تو باپوں، بیٹوں اور دوسرے رشتہ داروں نے کہا کہ ہم بھی پردے کے پیچھے سے ازواج مطہرات سے گفتگو کریں گے(3) تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِي آبَائِهِنَّ الآیہ اپنے باپوں سے پردہ نہ کرنے میں ان پر کوئی حرج نہیں ہے۔ آیت طیبہ میں چچا اور ماموں کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ جب امہات المومنین کے بھتیجوں کے لیے رشتہ میں پھوپھیاں ہیں اور بھانجوں کے لیے خالائیں ہیں اور چچا اور پھوپھی ایک ہی جنس سے ہیں، یعنی دونوں کا رشتہ ایک اور مساوی ہے۔ اسی طرح ماموں اور خالہ کا رشتہ بھی ایک ہی ہے۔ بخاری شریف میں عروہ بن زبیر سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آیت حجاب نازل ہونے کے بعد ابو القعیس کے بھائی افلح نے میرے پاس اندر آنے کی اجازت طلب کی تو میں نے کہا میں اس وقت تک اجازت نہیں دے سکتی جب تک کہ میں رسول اللہ ﷺ سے اجازت نہ لے لوں۔ کیونکہ اس کے بھائی ابو القعیس نے تو مجھے دودھ نہیں پلایا تھا بلکہ ابو القعیس کی بیوی نے مجھے دودھ پلایا تھا۔ پس حضور نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کہ ابو القعیس کے بھائی افلح نے میرے پاس آنے کی اجازت طلب کی لیکن میں نے اسے اجازت دینے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ میں آپ سے اجازت لے لوں۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنے چچا کو اجازت دے دو۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ بے شک اس آدمی نے تو مجھے دودھ نہیں پلایا تھا بلکہ ابو القعیس کی بیوی نے مجھے دودھ پلایا تھا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا ہاتھ خاک آلود ہو، اسے اندر آنے کی اجازت دے دو، وہ تمہارا چچا ہے۔ عروہ کہتے ہیں کہ اسی بناء پر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں رضاعت کے سبب وہ تمام رشتے حرام کر دیئے گئے ہیں جو نسب سے تم پر حرام کیے گئے ہیں۔(4)

1۔ شعب الایمان: 1583 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 225 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 225 (التجاریہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 707 (وزارت تعلیم)

1 اور آزاد مسلمان عورتوں اور غلاموں اور لونڈیوں کی آمدورفت پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اجازت صرف لونڈیوں کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ ہم سورۂ نور میں ذکر کر چکے ہیں۔ یہ جملہ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ کے مضمون پر معطوف ہے۔ یعنی اے عورتو! اجنبی لوگوں کے سامنے بغیر پردہ کے آنے سے اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جن احکام کا تمہیں حکم دیا گیا ہے ان میں نافرمانی اور غفلت برتنے سے اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ جملہ میں غیب سے خطاب کی طرف التفات مزید تاکید کے لیے ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا مشاہدہ فرما رہا ہے اور اس پر وہ جزاء بھی عطا فرمائے گا۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٥٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿٥٧﴾ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿٥٨﴾

”بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس نبی مکرم پر 1۔ اے ایمان والو! تم بھی آپ پر درود بھیجا کرو اور (بڑے ادب و محبت سے) سلام عرض کیا کرو 2۔ بے شک جو لوگ ایذاء پہنچاتے ہیں اللہ اور اسکے رسول کو 3۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اس نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے رسوا کن عذاب 4۔ اور جو لوگ دل دکھاتے ہیں مومن مردوں اور مومن عورتوں کا بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی (معیوب) کام کیا ہو تو انہوں نے اٹھا لیا (اپنے سر پر) بہتان باندھنے اور کھلے گناہ کا بوجھ 5۔“

1۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نبی مکرم ﷺ پر رحمت فرماتا ہے اور فرشتے آپ کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ آپؓ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ يُصَلُّونَ کا معنی ہے وہ برکت دیتے ہیں اور بعض نے یہ کہا ہے کہ صلوٰۃ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کا معنی رحمت کرنا ہوتا ہے اور اگر نسبت ملائکہ کی طرف ہو تو معنی استغفار کرنا ہوتا ہے۔(1) ابوالعالیہ نے کہا ہے کہ آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ میں آپ کی ثنا فرماتا ہے اور صلوٰۃ ملائکہ کا معنی دعا کرنا ہے(2) صلوٰۃ کے معنی کی مکمل وضاحت قول باری تعالیٰ هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ کے ضمن میں ہم نے ذکر کر دی ہے۔

2۔ اے اہل ایمان! تم بھی آپ ﷺ کے لیے دعا مانگو اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کرو کہ وہ آپ پر رحمت نازل فرمائے اور بڑے ادب و محبت سے سلام عرض کرو اور کہو السلام علیک ایها النبیُّ ورحمة الله وبرکاته۔ یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اہل ایمان کے لیے آپ ﷺ کی بارگاہ میں صلوٰۃ و سلام پیش کرنا واجب ہے، اگرچہ عمر میں ایک بار ہی ہو۔ یہی موقف امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالکؒ کا ہے۔ اور امام طحاویؒ نے بھی اسے ہی پسند کیا ہے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ امر قطعی کا مقتضی یہ ہے کہ عمر بھر میں ایک بار صلوٰۃ والسلام پیش کرنا فرض ہے کیونکہ امر تکرار کا تقاضا نہیں کرتا اور ہمارا موقف یہی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ہر نماز کے آخری قعدہ کے بعد درود پڑھنا واجب ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے۔ اور امام احمدؒ نے اسی طرح کہا ہے۔ رحمة الامة فی اختلاف الائمة میں ہے کہ آخری قعدہ میں تشہد کے بعد حضور نبی کریم ﷺ پر درود پڑھنا امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک

1۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 225 (التجاریة)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 225 (التجاریة)

سنت ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے۔ اور امام احمدؒ کی مشہور ترین روایت یہ ہے کہ درود پاک چھوٹ جانے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور علامہ ابن جوزی نے کہا ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک درود پاک پڑھنا فرض ہے اور انہی سے دوسری روایت اس طرح ہے کہ درود پڑھنا سنت ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ جب بھی آقائے دوجہان ﷺ کا ذکر آئے آپ پر درود پڑھنا واجب ہے۔ علامہ کرخیؒ نے یہی کہا ہے جن کا نظریہ یہ ہے کہ حالت نماز میں درود پاک پڑھنا واجب ہے وہ حضرت سہل بن سعدؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اس آدمی کی نماز ہی نہیں ہوتی جس نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر درود پاک نہ پڑھا(1)۔ اسے ابن جوزی نے دارقطنی کی سند سے نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی عبدالمہیمن ابن عباس بن سہل بن سعد ہے جو اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کرتا ہے۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ عبدالمہیمن قوی راوی نہیں ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ ابن جوزی نے یہ حدیث ان الفاظ میں بھی ذکر کی ہے کہ اس آدمی کی نماز نہیں جس نے وضو نہیں کیا، اس کا وضو نہیں جس نے وضو کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی نہیں لیا، اس کی نماز نہیں جس نے حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک نہیں پڑھا اور اس کی نماز نہیں جس نے انصار سے محبت نہیں کی۔ اس کی سند میں راوی عبدالمہیمن ضعیف ہے وہ قابل حجت نہیں، طبرانی نے ابی بن عباس بن سعد سے کہ انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اسی طرح مرفوع روایت نقل کی ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ عبدالمہیمن کی حدیث صحت کے زیادہ قریب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ محدثین کی ایک جماعت نے ابی بن عباس کے بارے میں کلام بھی کیا ہے حضرت ابومسعود انصاریؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نماز پڑھی اور مجھ پر اور میرے اہل بیت پر درود پاک نہ پڑھا تو اس کی نماز مقبول نہیں(2)۔ اسے بھی علامہ ابن جوزیؒ نے دارقطنی کی سند سے روایت کیا ہے اور ابن جوزی نے کہا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی جابر الجعفی ضعیف ہے۔ اور اس نے اس کی روایت میں خود اختلاف کیا ہے۔ کہ کبھی اسے ابن مسعود سے موقوفاً روایت کرتا ہے اور کبھی مرفوعاً نقل کرتا ہے۔ علامہ ابن ہمام نے یہی روایت ابن مسعود سے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ علامہ ابن جوزیؒ نے کہا ہے اس کی سند میں ایک راوی جابر الجعفی ضعیف ہے۔ اور اس نے اس کی روایت میں اختلاف کیا ہے کہ کبھی اسے موقوف ذکر کیا ہے اور کبھی مرفوع۔ حاکم اور بیہقی نے یحییٰ ابن سباق سے انہوں نے بنی حارث کے ایک آدمی کی وساطت سے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی بھی تشہد پڑھ چکے تو پھر یہ کہے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِکْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّارْحَمْ مُحَمَّدًا وَاٰلَ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ وَبَارَكْتَ وَتَرَحَّمْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ(3)۔ حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے تمام روات حارثی کے سوا ثقہ ہیں لیکن وہ ایک محل نظر ہے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ اس حدیث "جس نے مجھ پر درود پاک نہیں پڑھا اس کی نماز نہیں" کو تمام محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور اگر یہ صحیح بھی ہو تو اس کا معنی ہے کہ اس کی نماز کامل نہیں ہوتی جس نے مجھ پر درود پاک پڑھا۔ یا یہ معنی ہے کہ جس نے عمر بھر میں ایک بار بھی مجھ پر درود پاک نہیں پڑھا اس کی نماز نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس سے قوی ترین حدیث فضالہ بن عبید کی حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو نماز میں دعا کرتے سنا کہ اس نے حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک نہیں پڑھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس نے جلدی کی ہے۔ پھر آپ ﷺ

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 1 صفحہ 355 (المحاسن)
2۔ سنن الدارقطنی، جلد 1 صفحہ 355 (المحاسن)
3۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 402 (العلمیہ)

نے اسے بلایا اور اسے اور اس کے علاوہ دیگر افراد کو فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اسے چاہیے کہ وہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرے پھر نبی مکرم ﷺ پر درود پاک پڑھے پھر جو چاہے دعا مانگے (1)۔ اسے ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی کے الفاظ اس طرح ہیں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے کہ اسی اثناء میں ایک آدمی آیا اور اس نے نماز پڑھی۔ پھر اس نے دعا مانگتے ہوئے کہا اے اللہ! میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے نمازی! تو نے جلدی کی ہے۔ جب تو نماز پڑھ کر بیٹھ جائے تو اس طرح اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد ایک دوسرے آدمی نے نماز پڑھی۔ پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی، حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا اے نمازی! دعا مانگ، وہ قبول کی جائے گی (2)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد اور نسائی نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تشہد کے بعد حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھنے کے وجوب پر استدلال اس طرح بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں امر سے مراد حالت نماز میں آپ ﷺ پر درود پاک پڑھنا ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ سے مراد حالت نماز میں تکبیر تحریمہ، وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ سے مراد قیام، ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا سے مراد رکوع وسجود کرنا اور فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ سے مراد حالت نماز میں قرأت کرنا ہے۔ اس پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جو امام بخاریؒ نے حضرت کعب بن عجرہؓ سے نقل کی ہے۔ اسی طرح حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ ہم یہ تو پہچانتے ہیں کہ آپ پر سلام کیسے بھیجا جائے لیکن درود پاک پڑھنے کا طریقہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسی طرح کہو اللّٰھم صلّ علٰی مُحمّدٍ الٰی آخرہ (3)۔ یعنی تشہد میں سلام پڑھنے سے تو ہم واقف ہیں اور وہ آپ کا یہ ارشاد ہے السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ لیکن اس حالت میں ہم درود پاک کیسے پڑھیں گے؟ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے اس طرح درود پاک پڑھنے کا طریقہ تعلیم دیا کہ اللّٰھم صلّ علٰی محمّدٍ الٰی آخرہ پڑھو۔ اس حدیث کو ساری امت نے قبول کیا ہے اور درود پاک کے تشہد کے بعد پڑھنے پر اجماع کیا ہے، اگرچہ اس کے فرض ہونے کے بارے اختلاف کیا ہے۔ پس اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں امر سے مراد حالت نماز میں تشہد کے بعد درود پاک پڑھنا ہے۔ واللہ اعلم۔

وہ لوگ جو یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ جب بھی حضور نبی کریم ﷺ کا ذکر کیا جائے آپ پر درود پڑھنا واجب ہے وہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کے سامنے میرا ذکر کیا گیا لیکن اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا اور اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کی زندگی میں رمضان المبارک کا مہینہ آیا لیکن اس کی مغفرت اور بخشش کا سبب بنے بغیر گزر گیا۔ اور اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کی زندگی میں اس کے والدین یا ان میں سے ایک بوڑھے ہو گئے لیکن وہ اسے جنت میں داخل نہ کرا سکے (4) (یعنی بیٹا ان کی خدمت نہ کرنے کے سبب جنت کا مستحق نہ بن سکا)۔ اسے ترمذی اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا تو وہ آگ میں داخل ہوا اور اللہ تعالیٰ اسے دور رکھے (5)۔ حضرت ابن عباسؓ کی

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 186 (وزارت تعلیم)　2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 186 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 708 (وزارت تعلیم)　4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 193 (فاروقی)
5۔ معجم کبیر، جلد 19 صفحہ 292 (العلوم والحکم)

مرفوع روایت اس طرح ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے پاس جبرئیل امین آئے اور کہا جس کے پاس آپ کا ذکر کیا گیا لیکن اس نے آپ پر درود پاک نہ پڑھا تو وہ آگ میں داخل ہوا اور اللہ تعالیٰ اسے دور رکھے مذکورہ دونوں حدیثیں طبرانی نے نقل کی ہیں۔ابن السنی حضرت جابرؓ سے مرفوع روایت ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں کہ جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا تو وہ بدبخت (شقی) ہو گیا۔حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بخیل وہ ہے جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا(1)۔اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام احمدؒ نے حضرت حسین بن علیؓ سے نقل کیا ہے۔اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔طبرانی نے سند حسن کے ساتھ حضرت حسین بن علیؓ سے مرفوع روایت اس طرح نقل کی ہے کہ جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس سے مجھ پر درود پاک پڑھنا چھوٹ گیا تو اس سے جنت کا راستہ چھوٹ گیا(2)۔امام نسائی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا تو اسے چاہیے کہ وہ مجھ پر درود پاک پڑھے کیونکہ جو مجھ پر (ایک بار) درود پاک پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔(3)

فصل: حضور نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام پڑھنے کی فضیلت و کیفیت کا بیان

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے کہ حضرت کعب بن عجرہؓ مجھ سے ملے اور کہا۔کیا میں (ایک حدیث) بطور تحفہ تمہیں پیش نہ کروں جو میں نے حضور نبی کریم ﷺ سے سنی ہے؟ تو میں نے کہا کیوں نہیں! آپ ضرور وہ تحفہ مجھے عطا فرمائیے تو انہوں نے فرمایا۔ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ پر سلام بھیجنے کا طریقہ تو سکھلا دیا ہے لیکن ہم آپ پر اور آپ کی اہل بیت پر درود پاک کیسے پڑھیں؟ تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا اس طرح کہو **اَللّٰھُمَّ صلّ علی محمّد وعلی اٰل محمّد کما صلیتَ علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انک حمیدمجید، اللّٰھم بارک علی محمد وعلی اٰل محمّد کمابارکتَ علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انک حمید مجید**۔متفق علیہ(4)۔لیکن مسلم نے دونوں مقامات پر علی ابراھیم کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔ابوحمید الساعدی سے روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ ہم آپ پر درود پاک کیسے پڑھیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس طرح پڑھو **اللّٰھم صل علی محمّد وازواجه وذریته کماصلّیت علی اٰل ابراھیم وبارک علی محمّدوازواجه وذریته کما بارکت علی اٰل ابراھیم انک حمید مجید**۔متفق علیہ(5)۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود پاک پڑھا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔اسے مسلم نے روایت کیا ہے(6)۔حضرت انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو مجھ پر ایک مرتبہ درود پاک پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا، اس کے دس گناہ معاف کر دیئے جائیں گے(7) اور اس کے دس درجات بلند کر دیئے جائیں گے۔اسے امام احمدؒ، بخاری نے الادب میں، نسائی اور حاکم نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن تمام

1۔جامع ترمذی، جلد2 صفحہ193 (فاروقی)
2۔معجم کبیر، جلد3 صفحہ128 (العلوم والحکم)
3۔سنن نسائی، جلد1 صفحہ91 (وزارت تعلیم)
4۔صحیح بخاری، جلد2 صفحہ940 (وزارت تعلیم)
5۔صحیح مسلم، جلد1 صفحہ175 (قدیمی)
6۔صحیح مسلم، جلد1 صفحہ64 (فاروقی)
7۔الادب المفرد، جلد2 صفحہ101 (المدنی)

لوگوں کی نسبت میرے زیادہ قریب وہ (آدمی) ہوگا جو زیادہ درود پاک پڑھنے والا ہوگا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔ آپ ؓ سے یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے ملائکہ ہیں جو زمین میں چکر کاٹتے رہتے ہیں اور وہ میری امت کی جانب سے مجھے سلام پہنچاتے ہیں(2)۔ اسے نسائی اور دارمی نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کوئی مجھ پر سلام پیش کرے گا تو اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر لوٹا دے گا یہاں تک کہ میں اسے سلام کا جواب عطا فرماؤں گا(3)۔ اسے ابوداؤد اور بیہقی نے الدعوت الکبیر میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ تم اپنے گھروں کو قبریں نہ بنالو اور میری قبر کو عید (میلا) نہ بنانا اور مجھ پر درود پاک پڑھوں کیونکہ تمہارا درود مجھ تک پہنچا دیا جاتا ہے تم جہاں بھی ہو(4)۔ حضرت ابوطلحہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن تشریف لائے درآنحالیکہ آپ کے چہرۂ انور پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میرے پاس جبرائیل امین آئے اور کہا آپ کا رب فرمارہا ہے اے محمد! ﷺ کیا تم اس پر خوش نہیں ہو گے کہ آپ کا جو امتی ایک مرتبہ آپ پر درود پاک پڑھے گا میں اس پر دس رحمتیں نازل فرماؤں گا۔ اور آپ کا جو امتی ایک مرتبہ آپ پر سلام بھیجے گا میں اس پر دس مرتبہ سلام بھیجوں گا(5)۔ اسے نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں آپ پر کثرت سے درود پاک پڑھتا ہوں۔ پس میں کتنی بار آپ پر درود پاک پڑھا کروں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جتنی بار تو چاہے۔ میں نے عرض کی (کیا میں اپنے اوراد و وظائف کے وقت کا) چوتھائی حصہ (درود پاک پڑھوں)؟ جیسے تم چاہو اور اگر اس میں اور اضافہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ میں نے عرض کی کیا نصف وقت (درود پاک پڑھوں) تو آپ ﷺ نے فرمایا جیسے چاہو اور اگر اضافہ کرلو تو بہتر ہوگا۔ میں نے پھر عرض کی کیا میں دوتہائی وقت (درود پاک پڑھوں)؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جیسے چاہو اور اگر مزید اضافہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ پھر میں نے عرض کی میں سارا وقت آپ پر درود پاک پڑھنے کے لئے وقف کردوں گا تو آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر یہ تمہارے تمام غموں کو دور کرنے کے لئے کافی ہوگا اور تمہارے گناہ مٹا ڈالے جائیں گے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(6)۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کے لئے یہ خوشی اور مسرت کا باعث ہو کہ جب وہ ہم پر اہل بیت سمیت درود پاک پڑھے تو اسے پورے پیمانے کے ساتھ اجر دیا جائے تو اسے اس طرح کہنا چاہیے اَللّٰھم صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاَزْوَاجِه اُمَّھَاتِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَذُرِّیَّتِهٖ وَاَھْلِ بَیْتِهٖ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(7)۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے کہا ہے کہ جو کوئی ایک مرتبہ حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے ستر رحمتیں اس پر نازل فرماتے ہیں۔ اسے امام احمدؒ نے نقل کیا ہے(8)۔ حضرت رویفعؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے مجھ پر درود پاک پڑھتے ہوئے اس طرح کہا اَللّٰھُمَّ اَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَکَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ (اے اللہ! محمد ﷺ کو قیامت کے دن اپنی بارگاہ میں مقام قرب عطا فرما) تو اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔ اسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 64 (فاروقی)
2۔ سنن نسائی، جلد 1 صفحہ 189 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 279 (وزارت تعلیم)
4۔ مسند احمد، جلد 2 صفحہ 367 (المکتب الاسلامی)
5۔ سنن نسائی، جلد 1 صفحہ 189 (وزارت تعلیم)
6۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 68 (وزارت تعلیم)
7۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 141 (وزارت تعلیم)
8۔ مسند احمد، جلد 2 صفحہ 187 (المکتب الاسلامی)

سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ (باہر) تشریف لے گئے۔ یہاں تک کہ ایک نخلستان میں داخل ہوئے اور سجدے میں پڑ گئے اور اتنا طویل سجدہ فرمایا کہ مجھے یہ خوف ہونے لگا شاید اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وفات دے دی۔ چنانچہ میں آپ ﷺ کو دیکھنے کے لیے قریب آیا۔ تو آپ ﷺ نے سجدے سے اپنا سر مبارک اٹھایا اور فرمایا تمہیں کیا ہوا ہے؟ تو میں نے اپنے خوف کا تذکرہ کر دیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جبرائیل امین علیہ السلام میرے پاس آئے اور آ کر کہا۔ کیا میں آپ کو بشارت نہ دے دوں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے جو کوئی آپ پر درود پاک پڑھے گا میں اس پر رحمت نازل فرماؤں گا اور جو آپ پر سلام پیش کرے گا میں اس پر سلام فرماؤں گا(1)۔ اسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا دعا زمین آسمان کے مابین ہی موقوف رہتی ہے اور دعا کا کوئی حصہ بھی اوپر نہیں چڑھتا یہاں تک کہ تو نبی مکرم ﷺ پر درود پاک پڑھ لے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔ عبداللہ بن عامر بن ربیعہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا جو کوئی مجھ پر جتنا درود پاک پڑھے گا اتنی ہی فرشتے اس پر رحمتیں نازل کریں گے اب چاہے تو آدمی قلیل مقدار میں درود پاک پڑھے یا زیادہ مقدار میں(3)۔ اسے بغویؒ نے روایت کیا ہے حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی مجھ پر ایک مرتبہ درود پاک پڑھتا ہے اس کے لیے ایک قیراط (اجر) لکھ دیا جاتا ہے اور ایک قیراط جبل احد کے برابر ہے۔ اسے عبدالرزاق نے الجامع میں سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے۔ حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی دس دس مرتبہ صبح شام مجھ پر درود پاک پیش کرے گا قیامت کے دن اسے میری شفاعت نصیب ہوگی(4)۔(۱) اسے طبرانی نے الکبیر میں سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے۔

مسئلہ: کیا غیر انبیاء پر صلوٰۃ السلام جائز ہے؟ تو اس بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی اتباع میں تو غیر کے لیے الصلوٰۃ والسلام جائز ہے (یعنی پہلے نبی علیہ السلام کا ذکر ہو اور ان کے بعد کسی اور کا تو اس طرح نبی کے واسطے سے دوسرے کے لیے بھی جائز ہے)۔ لیکن مستقل طور پر غیر انبیاء کے لیے الصلوٰۃ والسلام مکروہ ہے جیسا کہ یہ کہنا مکروہ ہے محمد عزوجل۔ حالانکہ آپ ﷺ معزز بھی ہیں اور جلیل القدر بھی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ عزوجل کے الفاظ خاص ہیں اسی طرح عرفاً صلوٰۃ السلام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہیں ہم نے یہ مسئلہ مکمل تفصیل کے ساتھ سورۂ توبہ کی آیت وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ کی

1۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 191 (المکتب الاسلامی) — 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 64 (فاروقی)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 226 (التجاریہ) — 4۔ کنز العمال، جلد 1 صفحہ 491 (التراث الاسلامی)

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا کہ آپ کی بارگاہ میں ایک آدمی حاضر ہوا اور اس نے سلام عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سلام کا جواب دیا اور بڑی خندہ پیشانی اور کشادہ روئی کے ساتھ اسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ پس جب وہ آدمی اپنا کام کر چکا تو اٹھ کر چلا گیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے ابوبکر ہر روز ساری زمین کے باسیوں کے اعمال کی مثل اس آدمی کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں۔ میں نے عرض کی ایسے کیوں ہے؟ تو آپ نے فرمایا یہ ہر صبح تمام مخلوق کے درود کی مثل مجھ پر دس مرتبہ درود پاک پیش کرتا ہے (یعنی اس کا درود اجر و ثواب میں ساری مخلوق کے درود کے برابر ہے)۔ میں نے عرض کی وہ کیا ہے! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اس طرح پڑھتا ہے اَللّٰھُمَّ صلّ علٰی محمد النبی عدد من صلی من خلق وصلّ علٰی محمّد النبی کما ینبغی لنا ان نصلّی علیه وصل علی محمد النبی کما امر تنا ان نصلّی علیه۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھنا پانی کے آگ کو بجھانے کی نسبت زیادہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پیش کرنا غلام آزاد کرنے سے زیادہ افضل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے سے افضل ہے یا فرمایا اللہ کی راہ میں شمشیر زنی سے زیادہ افضل ہے۔ از مفسر رحمہ اللہ تعالیٰ۔

تفسیر میں ذکر کر دیا ہے۔

سے علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے ان سے مراد یہود و نصاریٰ اور مشرکین ہیں۔ کیونکہ یہودیوں نے یہ کہا تھا عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ (عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں) یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (اللہ تعالیٰ کا دست قدرت بندھا ہوا ہے) اور مزید یہ کہا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ (بے شک اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں) اور عیسائیوں کا نظریہ یہ تھا اَلْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ (مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں) مزید یہ کہا ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (عیسیٰ علیہ السلام) تین میں سے تیسرے ہیں) اور مشرکین نے یہ کہا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور بت اس کے شریک ہیں(1)۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (یعنی یہ حدیث قدسی ہے) ابن آدم نے میری تکذیب کی ہے حالانکہ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور اس نے مجھے گالی دی ہے حالانکہ اسے ایسا نہیں چاہیے تھا۔ اس نے میری تکذیب تو اس طرح کی ہے کہ اس نے یہ کہا اللہ تعالیٰ مجھے دوبارہ اس طرح نہیں بنا سکے گا جیسے اس نے پہلی مرتبہ مجھے پیدا فرمایا حالانکہ میرے لئے دوبارہ زندہ کرنے کی نسبت پہلی بار پیدا کرنا کوئی آسان نہیں تھا۔ اور اس نے مجھے گالی اس طرح دی ہے کہ اس نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد بنالی ہے حالانکہ میں احد اور ایسا بے نیاز ہوں کہ نہ کسی کا باپ ہوں اور نہ بیٹا اور میرا کوئی ہمسر نہیں(2)۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ اس کا مجھے گالی دینا اس طرح ہے کہ یہ کہتا ہے میری اولاد ہے حالانکہ میری ذات اس سے پاک ہے کہ میں کسی کو بیوی بناؤں یا بیٹا۔ اسے امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ابن آدم مجھے ایذاء پہنچاتا ہے اس طرح کہ وہ زمانے کو گالیاں دیتا ہے حالانکہ زمانہ میں ہوں اس کے تمام معاملات میرے قبضے میں ہیں۔ میں ہی رات اور دن کو تبدیل کرتا ہوں۔ متفق علیہ (3)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یُؤْذِیْنِیْ (وہ مجھے ایذاء پہنچاتا ہے) کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کے بارے میں کجروی اختیار کرتے ہیں۔ اور عکرمہ نے کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ سے مراد تصویریں بنانے والے لوگ ہیں ۔ابوزرعہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ سنا ہے کہا انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو میری تخلیق کی طرح پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے پس انہیں چاہیے کہ وہ ایک چیونٹی تو پیدا کریں اور ایک دانہ یا جو تو بنا کر دکھائیں۔ متفق علیہ (4)۔ امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جس کسی نے تصویر بنائی تو اللہ تعالیٰ اسے عذاب دیتا رہے گا یہاں تک کہ وہ اس میں روح پھونک دے لیکن وہ کبھی بھی اس میں روح نہیں پھونک سکے گا(5) (لہٰذا وہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہے گا)۔ بعض نے کہا ہے کہ اذی کا معنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت اور گناہ کا ارتکاب کرنا ہے۔ لیکن یہاں الفاظ ایسے ذکر کئے گئے ہیں جو لوگوں کے درمیان متعارف ہیں (کیونکہ لوگ آپس میں حکم کی خلاف ورزی کو ایذاء دینے سے ہی تعبیر کرتے ہیں) ورنہ حقیقۃً اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے مبرہ اور منزہ ہے کہ اسے کوئی اذیت پہنچا سکے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ کو ایذاء دینے سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی کیا گیا، دنداں مبارک شہید کئے گئے آپ ﷺ کو جادوگر، شاعر اور مجنوں کہا گیا(6)۔ ہماری یہ تفسیر ان کے قول کے مطابق صحیح ہے جن کے نزدیک ایک لفظ کا اطلاق دو معنوں پر کرنا جائز ہوتا ہے۔ اور جمہور کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے بے شک وہ لوگ جو ایسے اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کو ناپسند ہے۔ اور یہ بھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 226 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 227 (التجاریہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 237 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 880 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 880 (وزارت تعلیم) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 227 (التجاریہ)

جائز ہے کہ آیت کا معنی اس طرح ہو بے شک وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے رسول کو ایذاء پہنچاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر فقط رسول اللہ ﷺ کی عظمت کے اظہار کے لیے ہو، یعنی جو رسول اللہ ﷺ کو ایذاء پہنچائے گا گویا اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذاء پہنچائی ہے۔ ابن ابی حاتم نے العوفی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے اس وقت حضور نبی کریم ﷺ پر طعن و تشنیع کی جب کہ آپ ﷺ نے صفیہ بنت حیی کو اپنی (ازواج) میں شامل کیا۔ جویبر نے ضحاک کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن ابی اور اس کے ان ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی جنہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ طیبہ طاہرہ پر تہمت عائد کی تھی۔ اور پھر حضور نبی کریم ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا اس آدمی کی جانب سے کون میرے سامنے عذر پیش کر سکتا ہے جو خود مجھے اذیت دیتا ہے اور ایسے لوگوں کو اپنے گھر میں جمع رکھتا ہے جو مجھے ایذا پہنچاتے ہیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت انس اور حضرت ابو ہریرہؓ دونوں روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جو کوئی میرے ولی (دوست) کی اہانت کرتا ہے۔ دوسری روایت کے الفاظ ہیں جو کوئی میرے ولی سے عداوت رکھتا ہے گویا وہ مجھے جنگ کے لیے دعوت مبارزت دیتا ہے(1)۔ اور مجھے کوئی کام کرتے ہوئے اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا اپنے مومن بندے کی جان قبض کرتے ہوئے ہوتا ہے وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کی ناراضگی کو ناپسند کرتا ہوں حالانکہ اس کے لیے موت لازم اور ضروری ہے عبد مومن کو کسی عمل سے میرا اتنا قرب نصیب نہیں ہوتا جتنا دنیا میں زہد اختیار کرنے سے ہوتا ہے اور اس کی میرے لیے کوئی عبادت میرے اس پر فرض کردہ احکام کی بجا آوری کی مثل نہیں ہوتی۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا اے ابن آدم! میں بیمار ہوا لیکن تو نے میری تیمارداری نہیں کی۔ بندہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار! تو تو رب العالمین ہے میں تیری عیادت کیسے کرتا تو رب کریم ارشاد فرمائے گا کیا تو نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تو نے اس کی بیمار پرسی نہیں کی۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو تو بالیقین مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ الحدیث۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اولیاء اللہ کی عداوت اللہ تعالیٰ کے ساتھ عداوت اور جنگ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کی بیماری کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ وہ ان تمام حوادث سے بالا اور بلند تر ہے تو اس کا سبب ایسا وصل ہے جو غیر متکیف ہے (یعنی اسے کسی کیفیت میں بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ کیفیات سے پاک ہے)۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا بدرجہ اولیٰ صحیح ہے۔ ہماری ذکر کردہ احادیث کی بناء پر ہی بعض نے آیت کا معنی اس طرح کیا ہے۔ کہ وہ لوگ جو اولیاء اللہ کو ایذا پہنچاتے ہیں یعنی لفظ اللہ سے پہلے اولیاء کا لفظ محذوف نکالا ہے۔ جیسا کہ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ میں اَهْل محذوف ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ قول صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے رسول اللہ ﷺ کے ذکر پر اولیاء اللہ کے ذکر کی تقدیم لازم آتی ہے۔ (اور یہ صحیح نہیں) اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ تخصیص بعد التعمیم ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ بھی اولیاء اللہ میں داخل ہیں (یعنی پہلے عام اولیاء اللہ کا ذکر ہے جو انبیاء اور غیر انبیاء تمام کو شامل ہے۔ پھر رسولہ ذکر فرما کر آپ ﷺ کو عام اولیاء اللہ میں سے خاص کر دیا ہے) تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ اگر صورت حال اس طرح ہو تو پھر قول باری تعالیٰ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ کے ذریعہ تکرار لازم

1۔ معجم اوسط، جلد 1 صفحہ 360 (المعارف) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 318 (قدیمی)

آتا ہے۔ (کیونکہ مومنین بھی اولیاء ہی ہیں)

۳ؔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اس نے ان کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا کہ یہ ان کے جواب میں ہے جنہوں نے یہ سوال کیا کہ ہمیں تو حضور نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن جو آپ کو ایذاء پہنچانے والے ہیں ان کا کیا حال ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا لَعَنَهُمُ اللّٰهُ الآیہ (کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیا ہے)۔

مسئلہ: جس کسی نے رسول اللہ ﷺ کی ذات، دین، نسب یا آپ ﷺ کی صفات میں سے کسی صفت پر طعن و تشنیع کرتے ہوئے یا وجوہ عیب میں سے کسی کے سبب اعتراض کرتے ہوئے آپ کو اذیت پہنچائی، چاہے اس کا یہ قول صراحۃً ہو یا کنایۃً، تعریضاً ہو یا اشارۃً یہ کفر ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں ایسے آدمی پر لعنت کی ہے اور اس کے لیے جہنم کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ تو کیا ایسے آدمی کی توبہ قبول کی جائے گی؟۔ تو اس کے بارے علامہ ابن ہمامؒ نے کہا ہے ہر وہ آدمی جو اپنے دل میں رسول اللہ ﷺ سے بغض رکھتا ہے وہ مرتد ہے۔ لہٰذا آپ کے بارے گالی گلوچ کرنے والا بدرجہ اولیٰ مرتد ہوگا۔ ہمارے نزدیک (ایسے آدمی کی سزا یہ ہے) کہ اسے حداً قتل کر دیا جائے گا اور قتل کی سزا ساقط کرنے کے بارے میں اس کی توبہ بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ فقہاء نے کہا ہے کہ یہ مذہب اہل کوفہ (امام اعظم حنیفہؒ، صاحبین اور ان کے متبعین وغیرہ) اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے (ایسے شخص کو سزا ضرور دی جائے گی) چاہے تو وہ خود جرم کا اقرار کر کے اظہار توبہ کرے یا (وہ خود جرم کا اقرار نہ کرے) بلکہ اس کے خلاف شہادتیں موجود ہوں (اور جرم ثابت ہو جائے) بخلاف دیگر اسباب کفر کے۔ کیونکہ ان میں انکار توبہ متصور ہوتا ہے اور انکار کے ساتھ شہادت قابل عمل نہیں رہتی۔ حتیٰ کہ علماء نے یہاں تک لکھا کہ اگر کسی نے نشے کی حالت میں بھی آپ ﷺ کے لیے غلیظ الفاظ استعمال کیے تو اسے قتل کر دیا جائے گا اور معاف نہیں کیا جائے گا بشرطیکہ اس کا نشہ ممنوع شے کے سبب ہو اور اس نے اس شے کا استعمال بلا اکراہ اپنے اختیار سے کیا ہو۔ بصورت دیگر وہ مجنون کی مثل ہوگا (اور اس کے لیے سزا نہیں ہوگی)۔ علامہ خطابی نے کہا ہے کہ میں کسی ایک کو بھی نہیں جانتا جس نے ایسے شخص کے واجب القتل ہونے کے بارے اختلاف کیا ہو۔ اور اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے کسی کے سبب قتل کرنا واجب ہو جائے پھر وہ توبہ کر لے تو اس سے قتل کی سزا ساقط ہو جائے گی۔ اور اگر نشے کی حالت میں کسی کی زبان سے حضور نبی مکرم ﷺ کی شان میں گستاخانہ کلمات کے سوا کوئی اور کلمہ کفر نکل جائے تو اسے مرتد قرار نہیں دیا جائے گا اگرچہ اس کا نشہ کسی ممنوع شے کے سبب ہو اور اس نے اسے بالا کراہ اپنے اختیار سے استعمال کیا ہو۔

۵ؔ اور جو لوگ دل دکھاتے ہیں مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ان کے ایسا عمل کیے بغیر جو انہیں ایذا پہنچانے کا موجب ہو یا جو لوگ انہیں بغیر جرم کے اذیت دیتے ہیں اور انہیں ایسے جرائم سے متہم کرتے ہیں جو انہوں نے نہیں کیے۔ تو انہوں نے بہتان باندھنے اور کھلے گناہ کا بوجھ (اپنے سر پر) اٹھا لیا۔ اس میں بہتان اور اثم کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے تا کہ ان کی تفخیم اور بڑائی کا اظہار ہو۔ مقاتل کا قول ہے کہ یہ آیت حضرت علی بن ابی طالبؓ کے بارے نازل ہوئی ہے(1)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے نازل ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ آیت طیبہ کے الفاظ عام ہیں اور یہ ہر اس آدمی کو شامل ہیں جو کسی بھی مومن مرد یا عورت کو کسی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 227 (التجاریۃ)

بھی وجہ سے اذیت پہنچاتا ہے۔ اگرچہ اس کا سبب نزول خاص ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اور مومن وہ ہے جس سے لوگوں کی جان اور مال محفوظ و مامون ہو(1)۔ اسے ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرنا عرفاً، عقلاً اور نقلاً حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنا ہی ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم نے جویبر کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے ضحاک کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کون ایسے آدمی کی جانب سے میرے سامنے عذر پیش کرسکتا ہے جو مجھے ایذاء پہنچاتا ہے اور اپنے گھر میں ایسے آدمیوں کو جمع رکھتا ہے جو مجھے دکھ دیتے ہیں۔ اس سے مراد عبداللہ بن ابی ہے جبکہ اس نے ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ پر تہمت عائد کی تھی۔ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے نازل ہوئی ہے ان کے نزدیک یہ آیت اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ سے لے کر اِثْمًا مُّبِيْنًا تک آپؓ کی شان میں نازل ہوئی نہ کہ صرف آخری جملہ آپ کے بارے میں نازل ہوا۔ اسی طرح جس نے حضرت علیؓ کو گالیاں دیں تو اس نے رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچائی کیونکہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا (اے علی!) تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں(2)۔ اسے شیخین نے براء بن عازب سے صحیحین میں نقل کیا ہیں۔ بلکہ عام صحابہ کرام کو برا کہنا بھی حضور نبی کریم ﷺ کو ایذاء پہنچانے کے مترادف ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مغفلؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ سے ڈرو، میرے صحابہ کرام کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اللہ تعالیٰ سے ڈرو، میرے صحابہ کرام کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، میرے بعد انہیں (اپنے طعن و تشنیع) کا نشانہ نہ بنانا۔ پس جو ان سے محبت رکھے گا تو وہ میری محبت کے سبب ان سے محبت کرے گا اور جو کوئی ان کا بغض رکھے گا تو وہ میرے ساتھ بغض رکھنے کے سبب ان سے بغض رکھے گا۔ اور جس نے انہیں ایذا پہنچائی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے ایذاء پہنچائی گویا اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچائی اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کو ایذاء پہنچائے گا تو قریب ہی اللہ تعالیٰ اسے پکڑ لے گا(3)۔ اسے ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔ واللہ اعلم۔

ضحاک اور کلبی نے کہا ہے کہ یہ آیت ان بدکاری کرنے والے لوگوں کے بارے نازل ہوئی جو مدینہ طیبہ کے گلی کوچے میں چلتے پھرتے تھے اور وہ منافقین تھے۔ جب رات کے وقت عورتیں قضائے حاجت کے لیے گھروں سے باہر نکلتیں۔ تو یہ ان کا پیچھا کرتے اور عورتوں کو آنکھوں سے اشارے کرتے اور دست درازی کی کوشش کرتے۔ پس اگر کوئی عورت خاموش رہ جاتی تو وہ اس کے پیچھے ہو لیتے اور اگر انہیں جھڑک دیتی تو پھر وہ اس سے رک جاتے۔ وہ اگرچہ اس طرح لونڈیوں کو تلاش کرتے تھے۔ لیکن وہ آزاد عورتوں کی لونڈیوں سے علیحدہ پہچان نہیں کرسکتے تھے کیونکہ تمام عورتوں کا لباس ایک ہی جیسا تھا آزاد اور لونڈیاں تمام عورتیں ہی قمیص پہنے اور دوپٹہ اوڑھے باہر نکلتی تھیں۔ لہٰذا آزاد عورتوں نے اس معاملہ کی شکایت اپنے خاوندوں سے کی اور انہوں نے اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور پھر اس کے بعد آنے والی آیت میں آزاد عورتوں کو لونڈیوں جیسا لباس پہننے سے روک دیا گیا۔ واللہ اعلم۔(4)

ابن سعد نے طبقات میں حضرت ابو مالکؓ سے روایت نقل کی ہے۔ اور اسی کی مثل حسن اور محمد بن کعب قرظی سے بھی مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے باہر نکلتی تھیں اور منافقین میں سے کچھ افراد ان سے

1۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 266 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 525 (وزارت تعلیم)
3۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 554 (وزارت تعلیم) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 227 (التجاریۃ)

تعرض کرتے اور انہیں اس طرح ایذاء پہنچاتے۔ انہوں نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی۔ جب اس کے بارے منافقین سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہہ دیا ہم تو یہ چھیڑ چھاڑ کا عمل لونڈیوں سے کرتے ہیں (یعنی ہم تو لونڈیاں سمجھ کر ایسا کرتے ہیں ہمیں ازواج مطہرات کی کوئی پہچان نہیں ہے) تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾

''اے نبی مکرم! آپ فرمائیے اپنی ازواج مطہرات کو، اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ (جب وہ باہر نکلیں) ڈال لیا کریں اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو۔[1] اس طرح وہ بآسانی پہچان لی جائیں گی پھر انہیں ستایا نہیں جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہر دم رحم فرمانے والا ہے۔[2] اگر (اپنی حرکتوں سے) باز نہ آئے منافق اور جن کے دلوں میں بیماری ہے[3] اور شہر میں جھوٹی افواہیں اڑانے والے[4] تو ہم آپ کو مسلط کر دیں گے ان پر پھر وہ نہ ٹھہر سکیں گے آپ کے پاس مدینہ طیبہ میں مگر چند روز[5]''

یُدْنِیْنَ صیغہ امر ہے اور اس سے پہلے لام امر مقدر ہے۔ اصل میں لِیُدْنِیْنَ ہے۔ اور جَلَابِیْب جِلْبَاب کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چادر ہے جس کے ساتھ عورت قمیص اور اوڑھنی کے اوپر سے اپنے آپ کو لپیٹ سکتی ہے۔ امام بخاریؒ نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت سودہؓ پردے کا حکم نازل ہونے کے بعد کسی کام سے باہر نکلیں۔ کیونکہ آپ عظیم الجثہ عورت تھیں اور جو کوئی آپ کو پہچانتا تھا آپ اس سے قطعاً نہیں چھپ سکتی تھیں۔ پس حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے انہیں دیکھ لیا اور پکار کر کہا اے سودہ! قسم بخدا تم ہم سے چھپ نہیں سکتیں۔ پس دیکھو تم کیسے باہر نکل رہی ہو۔ وہ فرماتی ہیں کہ حضرت سودہؓ فوراً واپس لوٹ آئیں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تشریف فرما تھے اور شام کا کھانا تناول فرمارہے تھے۔ اور آپ ﷺ کے دست مبارک میں ایک ہڈی بھی تھی۔ اتنے میں حضرت سودہؓ اندر داخل ہوئیں اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں اپنے کسی کام کے لیے باہر نکلی تو عمرؓ نے مجھے اس اس طرح کہا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں حضور نبی مکرم ہڈی پکڑے ہوئے تھے، ابھی آپ نے اسے رکھا بھی نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی نازل فرما دی اور جونہی وہ ختم ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اپنے کام کی غرض سے باہر نکلنے کی اجازت عطا فرما دی ہے (1)۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے بڑی چادریں اوڑھ کر باہر نکلنے کی اجازت فرما دی ہے۔ حضرت ابن عباس اور ابوعبیدہؓ نے فرمایا ہے کہ اہل ایمان کی عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے سروں اور چہروں کو بڑی چادروں کے ساتھ ڈھانپ کر باہر نکلیں مگر ایک آنکھ ننگی رہے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ آزاد عورتیں ہیں (2)۔ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ میں مِنْ تبعیضیہ ہے کیونکہ عورت اپنی چادر کا بعض حصہ ہی چہرہ پر لٹکا سکتی ہے۔

؎ اس میں اَنْ یُّعْرَفْنَ سے پہلے الیٰ مضمر ہے جو کہ ادنیٰ کے متعلق ہے۔ مفہوم عبارت یہ ہے اقرب الی اَنْ یُّعْرَفْنَ (اس طرح ان کی پہچان زیادہ آسان اور قریب ہوگی) یا پھر اس سے پہلے مضاف مقدر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے ادنی اسباب معرفتھن۔ یہ ان کی پہچان کے اسباب میں سے زیادہ آسان اور قریب ہے کہ وہ آزاد عورتیں ہیں اور "فَلَا یُؤْذَیْنَ" کا عطف یُعْرَفْنَ پر ہے، یعنی پھر منافقین اور فاسق ان سے کوئی تعرض اور چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے۔ اور جو کچھ گزر چکا اللہ تعالیٰ اسے بہت بخشنے والا ہے (اور) اپنے بندوں پر ہر دم رحم فرمانے والا ہے۔ اس طرح کہ وہ اپنے بندوں کی مصالح کا لحاظ رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے جزئیات کی رعایت بھی کرتا ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک لونڈی پردہ کیے ہوئے حضرت عمر و فاروق اعظمؓ کے پاس سے گزری۔ آپ نے درّے کے ساتھ اس کا نقاب اٹھایا اور فرمایا اے کمینی! کیا تو آزاد عورتوں کی مثل بن رہی ہے؟ پھر آپ نے اس کا پردہ پھینک دیا۔

؎ اگر منافقین اپنی منافقانہ حرکات اور عورتوں کے ساتھ تعرض کرنے سے باز نہ آئے اور جن کے دلوں میں بیماری ہے۔ یعنی جن کے ایمان کمزور ہیں اور ایمان پر ثبات و استقلال اور کمزور ہے یا ان میں دین کے بارے متزلزل ہونے یا گناہوں میں منہمک ہونے کے سبب فسق و فجور زیادہ ہے۔

؎ اور شہر میں جھوٹی افواہیں اڑانے والے لوگ۔ یعنی وہ لوگ جو شہر میں زلزلہ اور شدید اضطراب پیدا کرتے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ اپنے جنگی دستے باہر بھیجا کرتے تھے تو منافقین میں سے بعض لوگوں میں جھوٹی خبریں پھیلا دیا کرتے تھے۔ اور کہنے لگتے وہ قتل کر دیئے گئے ہیں اور شکست خوردہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔ یا یہ کہتے عنقریب دشمن تم پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ کلبی نے کہا ہے وہ یہ پسند کرتے تھے کہ اہل ایمان میں بری اور تکلیف دہ باتیں پھیلیں۔ چنانچہ وہ جھوٹی خبریں اڑاتے رہتے تھے۔ (1)

؎ لَنُغْرِیَنَّكَ بِهِمْ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور معنی قسم اور شرط دونوں کے لیے ہے۔ یعنی ہم آپ کو انہیں قتل کرنے اور جلا وطن کرنے کا حکم دیں گے۔ یا ہم تمہیں ایسی شئی کا حکم دیں گے جو انہیں جلا وطنی کے مطالبہ پر مجبور کر دے گی یا ہم آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے۔ اور ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَكَ فِیْهَآ۔ لَنُغْرِیَنَّكَ پر معطوف ہے۔ کیونکہ اسے بھی جواب قسم بنانا جائز ہے۔ معنی یہ ہوگا۔ کہ اگر وہ اپنی حرکات سے باز نہ آئے تو وہ آپ کے پاس مدینہ طیبہ میں نہیں ٹھہر سکیں گے۔ چونکہ جلا وطنی انتہائی شدید سزا ہے بلکہ اعظم المصائب ہے اس لیے معطوف اور معطوف علیہ کے حال کے درمیان بعد اور دوری کے اظہار کے لیے حرف عطف ثُمَّ ذکر کیا گیا ہے۔ مگر انتہائی قلیل وقت حتیٰ کہ انہیں مدینہ طیبہ سے نکال دیا جائے گا یا قتل کر دیا جائے گا۔ ترکیب کلام میں قلیلاً یا تو زماناً کی صفت ہے یا جواراً کی (پہلی صورت میں مفعول فیہ ہے اور دوسری صورت میں مفعول مطلق)

مَّلْعُوْنِیْنَ ۚ اَیْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا ﴿٦١﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ﴿٦٢﴾ یَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِیْبًا ﴿٦٣﴾

" وہ بھی اس حال میں کہ ان پر لعنت برس رہی ہوگی۔ جہاں پائے جائیں گے پکڑ لیے جائیں گے اور جان سے مار ڈالے جائیں گے؎ اللہ کی سنت ان (بدقماشوں) کے متعلق بھی یہی تھی جو پہلے گزر چکے۔ اور آپ سنت الٰہی میں ہرگز کوئی تغیر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 227 (التجاریۃ)

وتبدل نہ پائیں گے ۲؎ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں ۳؎ فرمائیے اس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اور (اے سائل!) تو کیا جانے شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو ۴؎۔"

۱؎ مَلْعُوْنِیْنَ کے منصوب ہونے کی چند صورتیں ہیں۔ یا تو اس سے پہلے فعل ذم مقدر ہے یا یہ حال ہے اور استثناء اسے بھی شامل ہے یعنی لا یُجَاوِرُوْنَکَ اِلَّا مَلْعُوْنِیْنَ (وہ چند روز آپ کے پاس ٹھہریں گے اس حال میں کہ ان پر لعنت برس رہی ہوگی)۔ مَلْعُوْنِیْنَ کو مابعد کلام کی وجہ سے نصب دینا جائز نہیں کیونکہ کلمہ شرط کا مابعد اس کے ماقبل میں عامل نہیں بن سکتا۔ قُتِّلُوْا باب تفعیل ہے اور یہ فعل قتل کی کثرت پر دلالت کر رہا ہے۔

۲؎ سُنَّةَ مصدر تاکید کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے امم ماضیہ کے لیے بھی یہی ضابطہ قائم کر رکھا تھا کہ ان میں سے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام سے منافقانہ برتاؤ کیا اور جھوٹی افواہوں کے ذریعے ان کے مقصد کو کمزور کرنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں قتل کر دیا جہاں بھی وہ پائے گئے۔ یا سنة اللّٰه منصوب بنزع الخافض ہے (یعنی اس سے پہلے حرف جار محذوف ہے)۔ تقدیر عبارت یہ ہے کَسُنَّةِ اللّٰهِ۔ چونکہ اللہ تعالیٰ خود اپنی سنت کو تبدیل نہیں کرتا لہٰذا کوئی اور بھی اسے بدلنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

۳؎ لوگ آپ سے قیامت قائم ہونے کے بارے میں پوچھتے ہیں ان کا یہ سوال یا تو استہزاء ہے یا بطور عداوت یا بطور امتحان۔ پس مشرکین آپ ﷺ سے استہزاء کرتے تھے اور اسی استہزاء اور انکار کے سبب وہ قیامت کے بارے میں پوچھتے تھے۔ جبکہ یہودی آپ ﷺ سے عداوت رکھتے ہوئے اور آپ ﷺ کا امتحان لینے کے لیے اس کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تورات اور دیگر تمام کتب میں قیامت کے معینہ وقت کا ذکر نہیں فرمایا۔

۴؎ اے محمد! ﷺ آپ فرمائیے اس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اس نے انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ میں سے کسی کو اس پر مطلع نہیں کیا۔ اور (اے سائل) کونسی شے تجھے اس کے قائم ہونے کا وقت بتا سکتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس پر مطلع کیا ہی نہیں۔ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔ تقدیر عبارت ہے شیئاً قریباً یا یکون الساعة عن قریب۔ یا پھر ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور چونکہ الساعة الیوم کے معنی میں ہے اس لیے قریباً کو مذکر ذکر کرنا جائز ہے۔ اور قیامت کے قریب ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ شے جس کا آنا یقینی ہوتا ہے وہ قریب ہی ہوتی ہے (اگرچہ بظاہر کتنی دور ہی کیوں نہ ہو) اور لعل (اگرچہ ترجی اور آرزو کے لیے آتا ہے لیکن جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو پھر یہ یقین کے معنی دیتا ہے) لہٰذا یہاں اس معنی پر دلالت کر رہا ہے کہ قیامت کا قائم ہونا واجب اور یقینی امر ہے (اس میں ذرہ بھر شبہ نہیں ہے) اور اس میں استہزاء جلدی قیامت قائم ہونے کا مطالبہ کرنے والوں کے لیے تہدید اور جھڑک ہے اور وہ منکرین جو عداوۃً انکار کرتے تھے انہیں اس کے سبب خاموش کرا دیا گیا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿۶۴﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۶۵﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَاۤ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿۶۷﴾ رَبَّنَاۤ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے محروم کر دیا کفار کو اور تیار کر رکھی ہے اس نے ان کے لیے بھڑکتی آگ وہ ہمیشہ رہیں گے اس میں تاابد نہ پائیں گے کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار ۱؎ جس روز وہ منہ کے بل آگ میں پھینکے جائیں گے ۲؎ تو (بصد یاس) کہیں گے اے کاش! ہم نے اطاعت کی ہوتی اللہ تعالیٰ کی اور ہم نے اطاعت کی ہوتی رسول اکرم کی ۳؎ اور عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے پیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی ۴؎ پس ان (ظالموں نے) ہمیں بہکا دیا سیدھی راہ سے۔ اے ہمارے رب! ان کو دو گنا عذاب دے اور لعنت بھیج ان پر بہت بڑی لعنت ۵؎ ''

۱؎ وہ ہمیشہ تاابد اس میں رہیں گے۔ خٰلِدِیْنَ لَهُمْ کی ضمیر سے حال ہے، یعنی آگ میں ہمیشہ رہنا ان کا مقدر بنا دیا گیا ہے وہ کوئی دوست نہیں پائیں گے جو ان کی حفاظت کرے گا۔ اور نہ کوئی مددگار (پائیں گے) جو ان سے عذاب کو دور کرے گا۔

۲؎ یَوْمَ تُقَلَّبُ ترکیب کلام میں یا تو لَا یَجِدُوْنَ کی ظرف ہے یا اُذْکُر فعل محذوف کے سبب منصوب ہے، یعنی اس دن کو یاد کرو جس دن ان کے چہروں کو آگ میں ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف پھیرا جائے گا جیسا کہ گوشت کو بھونتے وقت کیا جاتا ہے یا ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پھیرا جائے گا۔ بالخصوص چہروں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ جسم کے تمام اعضاء میں سے سب سے محترم اور ذی مرتبہ عضو چہرہ ہے۔ یا پھر چہرہ ذکر کر کے مراد پورا بدن لیا گیا ہے۔

۳؎ یَقُوْلُوْنَ ترکیب کلام میں وُجُوْهُهُمْ کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ چونکہ مضاف مضاف الیہ کا جز ہے اور وہ مسند الیہ ہے اس لیے اس کا اس سے حال واقع ہونا صحیح ہے (تو بصد یاس) کہیں گے اے کاش! اس میں یَا حرف نداء ہے اور منادیٰ محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح یا قومنا لیتنا (اے ہماری قوم کاش!)۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یَا مطلق تنبیہ کے لیے ہے ہم نے (دنیا میں) اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے (دنیا میں) رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کی ہوتی، تو ہم آخرت میں اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔ فواصل کی رعایت (آخری حرف کو ہم وزن کرنے) کے لیے الرَّسُوْلَا اور السَّبِیْلَا کے آخر میں الف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ انقطاع کلام پر بھی دلالت کرتی ہے اور اس کا مابعد جملہ مستانفہ ہے۔

۴؎ اور عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے پیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی۔ ان سے مراد اپنے وہ قائدین ہیں جنہوں نے ان کے لیے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ ابن عامر اور یعقوب نے سَادَتِنَا تاء مکسور ماقبل الف کے ساتھ جمع الجمع کی صورت میں اسے پڑھا ہے۔ تاکہ کثرت پر دلالت کرے۔ اور باقیوں نے الف کے بغیر اور تاء مفتوح کے ساتھ اس کی قرأت کی ہے۔

۵؎ پس ان (ظالموں نے) ہمیں سیدھی راہ سے بہکا دیا اس کفر کے سبب جسے انہوں نے ہمارے لیے مزین کر کے پیش کیا۔ اے ہمارے رب! ان کو دو گنا عذاب دے اس کی نسبت جو عذاب تو نے ہمیں دیا کیونکہ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور ہمیں بھی گمراہ کیا۔ اور ان پر لعنت بھیج بہت بڑی لعنت۔ عاصم نے باء کے ساتھ کبیرا پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہوگا شدید ترین لعنت اور بہت بڑی پھٹکار۔ اور باقیوں نے اسے تاء کے ساتھ کثیرا پڑھا ہے۔ یعنی بہت زیادہ اور کثرت کے ساتھ لعنت ان پر برسا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿۶۹﴾

''اے ایمان والو! نہ بن جانا ان (بدبختوں) کی طرح جنہوں نے موسیٰ کو ستایا۔ پس بری کر دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اس

سے جوانہوں نے کہا[1] اور آپ اللہ کے نزدیک بڑی شان والے تھے[1]''

[1] اے ایمان والو! نہ بن جانا ان (بدبختوں) کی طرح جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیب کی باتیں کر کے انہیں ستایا۔ کہا گیا ہے کہ یہ وہی واقعہ ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام انتہائی شرم و حیا والے، شریف النفس اور ستر پوش آدمی تھے حتیٰ کہ ان کے شرم و حیا کے باعث ان کے جسم کا کوئی اندرونی حصہ بھی دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن بنی اسرائیل کے کچھ افراد اسی سبب سے انہیں ستاتے تھے۔ اور یہ کہتے تھے کہ یہ اپنے جسم کو بالیقین کسی عیب کی وجہ سے بھی چھپائے رکھتے ہیں یا تو انہیں کوئی جلدی بیماری ہے یا برص ہے یا خصیتین میں پانی ہے یا پھر کوئی اور بیماری ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ان کی اس نوع کے عیب سے برأت ظاہر فرما دے۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ ایک دن آپ نے تنہائی میں غسل کے ارادہ سے کپڑے اتارے اور ایک پتھر پر رکھ دیئے پھر غسل فرمایا جب آپ فارغ ہوئے اور اپنے کپڑے لینے کے لیے پتھر کی جانب تشریف لائے تو وہ آپ کے کپڑے لے کر بھاگ پڑا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی عصا مبارک اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے پتھر کے پیچھے پیچھے بھاگ پڑے۔ اے پتھر! میرے کپڑے، میرے کپڑے (میرے حوالے کردے) بالآخر پتھر وہاں جا کر رکا جہاں بنی اسرائیل کی مجلس لگی تھی۔ پس انہوں نے آپ کو ننگے بدن دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو انتہائی حسین پیدا فرمایا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس بات سے آپ کی برأت ظاہر فرمادی جو وہ آپ کے بارے میں کہتے تھے۔ وہاں پتھر ٹھہر گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے پہن لیے اور پھر اپنے عصا کے ساتھ پتھر کو مارنا شروع کر دیا قسم بخدا! آپ کے مارنے کے سبب پتھر پر تین، چار یا پانچ ضربوں کے نشان باقی رہے۔ پس اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (1)۔ اسے بخاری، ترمذی، احمد، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، عبدالرزاق اور عبد بن حمید نے روایت کیا ہے۔ ابوالعالیہ نے یہ کہا ہے کہ قارون نے ایک عورت کو اس مقصد کے لیے اجرت پر لیا کہ وہ برسر مجلس موسیٰ علیہ السلام پر اپنے ساتھ زنا کرنے کی تہمت لگائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچالیا آپ کی برأت ظاہر فرمادی اور قارون کو ہلاک کر دیا(2)۔ مذکورہ آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ القصص میں گزر چکی ہے۔

ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اذیت دینے کا مفہوم یہ ہے کہ جب حضرت ہارون علیہ السلام کا وادی التیہ میں وصال ہوا تو لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے خلاف یہ دعویٰ کر دیا کہ انہوں نے ہارون علیہ السلام کا قتل کر دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا اور وہ ان کا جنازہ اٹھا کر بنی اسرائیل کے پاس سے گزرے تو انہوں نے آپ کی میت کو دیکھ کر یقین کر لیا کہ آپ کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کے دعویٰ سے بری فرما دیا۔ اسے ابن منیع، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطہ سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

بخاری شریف میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے کچھ مال تقسیم فرمایا تو ایک آدمی نے کہا یہ تقسیم ایسی نہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ کیا گیا ہو۔ پس میں حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپ کو اس بات

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 154 (فاروقی)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 228 (التجاریۃ)

سے مطلع کر دیا۔ آپ ﷺ یہ سن کر اتنے غضبناک ہوئے کہ میں نے غصے کے آثار چہرۂ مقدس پر دیکھ لیے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے انہیں اس سے کہیں زیادہ ستایا گیا لیکن انہوں نے صبر کیا۔(1)

۳۔ اور موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نزدیک بڑی شان والے تھے۔ جب کوئی آدمی عظمت وشان کا مالک ہوتو اسے کہا جاتا ہے وجه الرجل یوجه و جاهة فهو وجیه۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ علیہ السلام کا مقام یہ تھا کہ جو بھی اللہ تعالیٰ سے طلب کرتے تھے وہ آپ کو عطا فرما دیتا تھا۔ حسن نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انتہائی مقرب اور مقبول تھے۔(2)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ۝ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہا کرو اور ہمیشہ سچی (اور درست) بات کیا کرو۱؎ تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو درست کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو بھی بخش دے گا۲؎ اور جو شخص حکم مانتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا تو وہی شخص حاصل کرتا ہے، بہت بڑی کامیابی۳؎''

۱۔ اے ایمان والو! ایسے اعمال کا ارتکاب کرنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو جو اسے ناپسند ہیں، چہ جائیکہ ایسے اعمال کا ارتکاب کرو جو اس کے رسول مکرم کے لیے باعث اذیت ہوں۔ اور ہمیشہ سچی اور درست بات کیا کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا قَوْلًا سَدِيْدًا سے مراد ہے درست اور سچی بات۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے انصاف کی بات، حسن نے کہا ہے سچی بات۔ بعض نے کہا ہے سیدھی بات(3)۔ اور بعض نے کہا ہے اس سے مراد ایسی بات ہے جس کے ذریعے حق تک پہنچنے کا ارادہ ہو۔ ان تمام اقوال میں اگرچہ الفاظ مختلف ہیں لیکن تمام کا مقصود اور نتیجہ ایک ہے کہ قَوْلًا سَدِيْدًا سے مراد ایسی سچی بات ہے جس میں نہ تو جھوٹ کی آمیزش ہو اور نہ ہی وہ محض ظن وتخمین سے کہی گئی ہو۔ کیونکہ جھوٹ مٹ جاتا ہے اور صدق باقی رہتا ہے۔

بعض نے کہا ہے اس سے مراد لوگوں کو ایسی باتوں سے روکنا ہے جو انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے واقعہ کے وقت عدل وانصاف کی راہ اختیار کیے بغیر کہی تھیں اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت عائد کرنے کے واقعہ میں بے اعتدال کی راہ پر چلتے ہوئے کہی تھیں۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ قول سدید سے مراد لا الٰہ الا اللّٰہ کا قول ہے۔(4)

۲۔ يُصْلِحْ یہ مضارع امر کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے اور اسی وجہ سے اس پر معطوف ہونے والا مابعد فعل بھی مجزوم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ تمہاری نیکیاں قبول فرمالے گا۔ مقاتل کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو پاک فرما دے گا(5) یعنی انہیں اس قابل بنا دے گا کہ انہیں قبول کرلیا جائے اور ان پر اجروثواب عطا فرمایا جائے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائے گا۔ اور تمہارے گناہوں کو بھی بخش دے گا یعنی قول وعمل

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 901 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 228 (التجاریہ)
3۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 228 (التجاریہ)
4۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 228 (التجاریہ)
5۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 228 (التجاریہ)

پر تمہاری استقامت کو گناہوں کا کفارہ بنادے گا۔

ٍ۳ے اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم کا حکم مانتا ہے تو وہی شخص بہت بڑی کامیابی حاصل کرتا ہے۔ یعنی دنیا میں وہ قابل تعریف زندگی بسر کرتا ہے اور آخرت میں اسے سعادت مندی اور خوش بختی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِينَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿٧٣﴾

"ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے (کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھائیں) تو انہوں نے انکار کر دیا اس کے اٹھانے سے اور وہ ڈر گئے اس سے اور اٹھا لیا اس کو انسان نے ۱ے بے شک یہ ظلوم بھی ہے (اور) جہول بھی ۲ے تاکہ عذاب دے اللہ تعالیٰ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں کو اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو اور نگاہ لطف و کرم فرمائے اللہ تعالیٰ ایمان والوں اور ایمان والیوں پر۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہر دم رحم فرمانے والا ہے ۳ے"

۱ے ہم نے یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی (کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھائیں) تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ اس سے ڈر گئے اور اس کو انسان نے اٹھا لیا۔ اس آیت طیبہ کی وضاحت میں چند امور بحث طلب ہیں۔ (1) امانت سے مراد کیا ہے؟ (2) کیا آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مراد حقیقتاً آسمان، زمین اور پہاڑ ہی ہیں یا ان سے مراد ان کے باسی (رہنے والے) ہیں؟ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ میں مراد اہل القریہ ہیں؟ (3) ان پر پیش کرنے سے مراد خطاب لفظی ہے یا خطاب حالی (یعنی کیا لفظاً انہیں امانت اٹھانے کے بارے کہا گیا یا ایسا نہیں؟) (4) امانت اٹھانے اور اس سے انکار کرنے کا معنی و مفہوم کیا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ امانت سے مراد اطاعت اور وہ فرائض ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وہی فرائض واقعۃً آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر خطاب لفظی کے ساتھ پیش فرمائے کہ اگر تم انہیں ادا کرو گے تو اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرمائے گا اور اگر انہیں ضائع کر دو گے تو عذاب دے گا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امانت سے مراد ہے نماز اور زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان المبارک کے روزے رکھنا، بیت اللہ شریف کا حج کرنا، بات کرتے وقت سچ بولنا، ناپ تول میں انصاف کرنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امانتوں کی حفاظت کرنا۔ مجاہد کا قول ہے امانت سے مراد فرائض کی ادائیگی اور دین کی حفاظت کرنا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا ہے کہ امانت سے مراد اوامر و نواہی ہیں (یعنی ہر وہ شے جس پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جس پر عمل کرنے سے منع کیا گیا ہے)۔ زید بن اسلم نے کہا ہے کہ امانت سے مراد روزہ، غسل جنابت اور شریعت کے مخفی امور ہیں اور ان سے مراد ایسے امور ہیں جن میں ریاکاری کا کوئی دخل نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعضاء میں سب سے پہلے شرمگاہ بنائی اور فرمایا یہ امانت ہے، میں اسے بطور ودیعت تیرے حوالے کر رہا ہوں۔ پس شرمگاہ امانت

ہے، کان امانت ہیں، آنکھ امانت ہے، اور پاؤں بھی امانت ہے اور جو امانت کی (حفاظت) نہیں کرتا اس میں ایمان نہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ امانت سے مراد لوگوں کی امانتیں ہیں اور وعدہ کو پورا کرنا ہے۔ لہٰذا ہر مومن پر لازم ہے کہ وہ دوسرے مومن اور ایسے آدمی سے دھوکہ نہ کرے جس سے اس نے کوئی معاہدہ کر رکھا ہو، چاہے وہ قلیل شے کے بارے میں ہو یا کثیر کے بارے میں یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ضحاک کی روایت ہے۔

مذکورہ تمام اقوال کا مرجع اور نتیجہ یہ ہے کہ امانت سے مراد وہ احکام شرعیہ ہیں جن کا انسان کو پابند بنایا گیا ہے، چاہے وہ اوامر ہوں یا نواہی۔ اور آسمانوں اور زمین سے مراد واقعۃً آسمان اور زمین بھی ہیں۔ علامہ بغویؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہ موقف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ایک جماعت اور اکثر علماء سلف کا ہے۔ اور عرض (پیش کرنے) سے مراد خطاب لفظی ہے۔ علامہ بغوی نے یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین سے ارشاد فرمایا کیا تم اس امانت کو اس کے جمیع لوازمات سمیت اٹھا سکتے ہو؟ انہوں نے عرض کی اس کے لوازمات کیا ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرتے ہوئے نیکی کرو گے تو تمہیں اس پر اجر و جزاء عطا کی جائے گی اور اگر نافرمانی کرو گے تو پھر سزا دی جائے گی۔ تو انہوں نے عرض کی اے ہمارے پروردگار! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم تو فقط تیرے حکم کے تابع ہیں نہ ہم اجر وثواب کے خواہشمند ہیں اور نہ سزا برداشت کر سکتے ہیں۔ آسمان وزمین نے یہ قول اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی اور مخالفت میں ہرگز نہیں کہا تھا بلکہ انہوں نے یہ قول خوف اور خشیت خداوندی کی بناء پر کہا تھا اور دین الٰہی کی تعظیم کی خاطر ایسا کہا کہ وہ اس کا حق ادا نہیں کر سکیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر امانت پیش فرمائی اور اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا انہیں اختیار دیا، ان پر اس کی قبولیت کو لازم نہیں فرمایا (گویا یہ امر اختیاری تھا الزامی نہیں تھا)۔ اگر اللہ تعالیٰ ان پر اسے قبول کرنا لازم قرار دیتا تو وہ ہرگز اسے اٹھانے سے انکار نہ کرتے(1)۔ اور بعض نے کہا ہے کہ عرض سے مراد خطاب لفظی ہے اور آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مراد ان کے باسی ہیں اعیان نہیں جیسا کہ قول باری تعالیٰ وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ میں اہل القریۃ (بستی والے) مراد ہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مراد واقعۃً آسمان وزمین اور پہاڑ ہی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مراد بعینہ آسمان، زمین اور پہاڑ ہیں اور عرض سے مراد وہ ہے جس کی نسبت ان کی ذاتی استعداد کی طرف کرنا معتبر ہے۔ اباء (انکار) سے مراد طبعی انکار ہے یعنی طبعی طور پر قابلیت اور استعداد کا نہ ہونا ہے۔ اور انسان کے امانت کو اٹھا لینے کا معنی یہ ہے کہ اس میں اسے برداشت کرنے کی صلاحیت واستعداد موجود ہے۔ اور اس کے ظلوماً جھولاً ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان پر قوت غضبیہ اور قوت شہویہ غالب ہیں۔ اس وضاحت کے مطابق یہ دونوں اچھی صفات ہیں جو اس بار امانت کو اٹھانے پر برانگیختہ کرتی ہیں۔

علامہ بیضاویؒ نے فرمایا ہے کہ شاید امانت سے مراد عقل یا تکلیف (احکام شرعیہ کی پابندی) ہے۔ عقل کا فائدہ یہ ہے کہ یہ مذکورہ دونوں قوتوں (قوت غضبیہ اور قوت شہویہ) کی نگرانی کرتی ہے اور تعدی اور حدود شرعیہ سے تجاوز کرنے سے ان دونوں کی حفاظت کرتی ہے۔ اور احکام شرعیہ کی پابندی کا مقصود اعظم ہی مذکورہ دونوں قوتوں کو معتدل رکھنا، اور ان کی شدت وعظمت کو کم کرنا ہے(2) اور علامہ بیضاویؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ سابقہ آیت میں اطاعت کی تعظیم اور عظمت شان کا جو وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ آیت اس کی تقریر وتائید کے لیے ہے اور اس میں اسی اطاعت کو امانت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ کیونکہ امانت کی طرح اطاعت بھی واجب الاداء ہے۔ اور آیت کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 229 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 389 (الفکر)

معنی و مفہوم یہ ہوگا کہ یہ امانت اپنی عظمت شان کے سبب اتنی ثقیل اور بھاری ہے کہ اگر اسے ان عظیم الجثہ (بڑے بڑے جسموں والی چیزیں مراد آسمان، زمین اور پہاڑ وغیرہ) چیزوں پر پیش کیا جاتا اور ان میں ادراک وشعور بھی ہوتا تو یہ اسے اٹھانے سے انکار کر دیتیں اور اس سے خوفزدہ ہو جاتیں لیکن انسان نے اپنے نحیف و کمزور جسم اور اپنی قوت و طاقت انتہائی کم ہونے کے باوجود اسے اٹھالیا۔ لہٰذا جو اس امانت کی پاسداری کرے گا اور اس کے حقوق ادا کرتا رہے گا تو بالیقین دونوں جہاں کی کامیابیاں اور بھلائیاں اس کا مقدر رہوں گی(1)۔

میں کہتا ہوں اسی آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِؕ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ (اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپ اس کو دیکھتے کہ وہ جھک جاتا (اور) پاش پاش ہو جاتا اللہ کے خوف سے۔ اور یہ مثالیں ہم بیان کرتے ہیں لوگوں کے لیے تاکہ وہ غور وفکر کریں)۔ پس اس تاویل کے مطابق زیر بحث آیت طیبہ ایک مثال کا بیان ہے۔ ان دونوں قوتوں یعنی آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مجازاً ان کے رہنے والے مراد لینے اور عرض اور خطاب کو مجازی معنی پر محمول کرنے کا دارومدار جمادات سے خطاب بعید از عقل خیال کرنے پر ہے۔ لہٰذا بعض نے اس استبعاد (بعید از عقل سمجھنا) کو دور کرنے کے لیے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ان اجرام کو پیدا فرمایا تو ان میں فہم وادراک کی قوت بھی تخلیق فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا میں نے کچھ فرائض لازم کیے ہیں میں نے ان پر اپنی اطاعت وفرمانبرداری کرنے والے کے لیے جنت پیدا کی ہے اور نافرمانی کرنے والے کے لیے جہنم۔ تو انہوں نے جواباً یہ کہا جن اوصاف پر ہمیں پیدا فرمایا گیا ہے ہم ان ہی کے پابند اور تابع ہیں ہم مزید کوئی فریضہ برداشت نہیں کر سکتے اور نہ اجر وثواب کے خواہش مند ہیں۔ اور جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ان پر اسی کی مثل امانت کو پیش فرمایا تو انہوں نے اسے اٹھالیا۔ لہٰذا اسی بوجھ کو اٹھانے کے سبب جو ان کے لیے انتہائی ثقیل اور گراں تھا، وہ اپنے نفس کے لیے ظلوم (ظلم کرنے والے) تھے اور اس کے انجام سے ناواقف ہونے کے سبب جھول تھے۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے اسی طرح کی وضاحت نقل کی ہے۔ اور اس میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے اس بار امانت کو اٹھانے اور جنت سے نکالے جانے کے درمیان اتنا ہی وقت تھا جتنا ظہر اور عصر کی نمازوں کے درمیان ہوتا ہے۔

اور بعض نے اس استبعاد کو دور کرنے کے لیے یہ کہا ہے کہ تمام کی تمام جمادات اپنی طرف نسبت کے اعتبار سے غیر ذوی العقول ہیں (یعنی وہ ہماری بات نہیں سمجھتے اس کا جواب نہیں دے سکتے) لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کے اعتبار سے وہ ذوی العقول بھی ہیں۔ مطیع وفرمانبردار بھی ہیں اور اس کی بارگاہ میں سجدہ کرنے والے بھی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو فرمایا ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًاؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىٕعِیْنَ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ (اور بے شک کچھ پتھر ایسے ہیں جن سے دریا پھوٹ کر نکلتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نیچے گرتے ہیں)۔ مزید فرمایا اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ (کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور سارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے)۔

بعض نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ میں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 388 (الفکر)

علیہ السلام کو فرمایا میں نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی ہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اسے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھی (اور نہ اسے قبول کیا) کیا تو اسے اس کے تمام لوازمات سمیت لینے کے لیے تیار ہے؟ آدم علیہ السلام نے عرض کی اے رب! اس کے لوازمات کیا ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر تو نیکی اور احسان کرے گا تو تجھے اس پر اجر وثواب عطا کیا جائے گا اور اگر برائی اور نافرمانی کرے گا تو تجھے سزا دی جائے گی۔ پس آدم علیہ السلام نے اسے اٹھالیا۔ اور عرض کی میں اسے اپنے کانوں اور کندھوں کے درمیان اٹھاتا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا جب تو نے اسے قبول کرلیا ہے تو پھر میں بھی تیرا معاون و مددگار ہوں گا۔ میں تیری آنکھوں کے لیے حجاب بنادوں گا۔ پس جب تجھے ایسی شے کی طرف دیکھنے کا خطرہ لاحق ہو تو اس پر اپنا حجاب ڈال لینا، میں تیری زبان کے لیے دو جبڑے بنادوں گا اور ان میں بند ہونے کی طاقت رکھ دوں گا۔ پس جب بھی تجھے خطرہ لاحق ہو تو اسے بند کرلینا۔ اور میں تیری شرمگاہ کے لیے لباس بنادوں گا اور اسے قطعاً اس کے سامنے نہ کھولنا جس پر کھولنا اسے میں نے حرام قرار دیا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ آپ کے امانت اٹھانے اور جنت سے نکلنے کے درمیان اتنا ہی وقت ہے جتنا ظہر اور عصر کی نمازوں کے درمیان ہوتا ہے(1)۔ میں کہتا ہوں کہ شاید امانت اٹھالینے کے بعد آپ کو جنت سے نکال لے جانے میں حکمت یہ ہے کہ جنت ادائے امانت کا محل نہیں بلکہ وہ تو ادائے امانت پر اجر وثواب کا محل ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو ادائے امانت کے لیے اس دنیا کی طرف بھیج دیا جو کہ آخرت کی کھیتی ہے۔

علامہ بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ نقاش نے اپنی اسناد کے ساتھ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ (آیت طیبہ میں) امانت کو انتہائی وزنی اور بھاری چٹان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ جو کسی بھی جگہ پڑی ہوئی ہو۔ پھر آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کو اسے اٹھانے کی دعوت دی گئی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی اسے اٹھانے کے لیے قریب نہ ہوا اور ان تمام نے کہہ دیا ہم تو اسے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام دعوت کے بغیر ادھر آئے اور چٹان کو حرکت دیتے ہوئے کہا اگر مجھے اسے اٹھانے کا حکم دیا جائے تو میں اسے اٹھالوں گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اٹھانے کا حکم فرمایا تو آپ علیہ السلام نے اسے گھٹنوں تک اٹھا لیا اور پھر اسے رکھ دیا۔ اور کہا قسم بخدا! اگر میں اسے مزید اٹھانا چاہوں تو اسے اٹھا سکتا ہوں۔ تو اس پر آسمانوں اور زمین وغیرہ نے آپ سے کہا اسے اٹھالو۔ تو آپ نے اسے اٹھا کر اپنے کندھوں پر رکھ لیا۔ پھر آپ نے اسے نیچے رکھنے کا ارادہ فرمایا، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اسے اپنی جگہ پر رہنے دو پس یہ امانت یوم قیامت تک آپ کی اور آپ کی اولاد کی گردن پر رہے گی۔(2)

زجاج اور دیگر علمائے معانی نے یہ ذکر کیا ہے کہ امانت سے مراد ایسی اطاعت ہے جو اطاعت طبعیہ ہے اور اختیاریہ دونوں کو شامل ہو۔ اور عرض امانت سے مراد اس اطاعت کا مطالبہ کرنا ہے جو کہ طلب فعل کو شامل ہو چاہے وہ اختیاری ہو یا تکوینی اور امانت اٹھانے سے مراد امانت میں خیانت کرنا اور اسے ادا نہ کرنا ہے۔ اسی وجہ سے حامل الامانة اور محتمل الامانة (امانت اٹھانے والا) اس آدمی کے لیے بولا جاتا ہے جو امانت ادا نہ کرے اور اس کی ادائیگی سے بری الذمہ نہ ہو۔ پس اس طرح امانت اٹھانے سے انکار کرنے کا مفہوم اپنی استطاعت کے مطابق بقدر ممکن ادا کرنا ہوگا۔ اور امانت کی ادائیگی میں خیانت اور کوتاہی کا مرتکب ہونے کی وجہ سے انسان کو ظَلُوْمًا جَهُوْلًا کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ (اور وہ اپنے بوجھ اٹھائیں گے)۔ حسن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 230 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 230 (التجاریہ)

سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ آیت طیبہ کی اس تاویل وتشریح کے مطابق وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ میں انسان سے مراد کافر اور منافق ہیں جنہوں نے (رب کریم کی) اس امانت میں خیانت کا ارتکاب کیا ہے۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ علمائے سلف کا قول پہلا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سیاق آیت یہ تقاضا کرتا ہے کہ امانت اٹھانا فقط انسان کے ساتھ مختص ہے کوئی دوسری مخلوق اس میں شریک نہیں۔ لہٰذا اس تخصیص کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ امانت سے مراد احکام شرعیہ کی پابندی ہے، یہ مناسب نہیں کیونکہ ان احکام میں تو جنات اور ملائکہ بھی شریک ہیں۔ بلکہ اس سے ملائکہ کی انسان پر فضیلت لازم آتی ہے کیونکہ وہ معصوم ہونے کے سبب کامل طور پر امانت کی ادائیگی میں مصروف ہیں۔ جیسا کہ ان کے بارے میں ارشاد ربانی ہے يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (وہ (ملائکہ) رات دن (اللہ تعالیٰ کی) تسبیح بیان کرتے ہیں اور (کبھی) سست نہیں پڑتے)۔ جبکہ اس کے برعکس انسان کے بارے میں فرمایا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ (کیونکہ انسانوں میں سے بعض اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض میانہ روی اختیار کرنے والے ہیں اور بعض بھلائیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں)۔ اس وجہ سے عالی مرتبہ صوفیاء نے کہا ہے کہ امانت سے مراد عقل کا نور اور عشق کی آگ ہے۔ پس نور عقل کے ساتھ استدلال کرنے سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور عشق کی آگ سے تمام حجابات جل جانے کے سبب معرفت الٰہی نصیب ہوتی ہے۔ اور ملائکہ اگرچہ مقربین بارگاہ الٰہی ہیں لیکن وہ ایسی مخلوق ہیں جن کے لیے مقام قرب وعرفان معلوم اور معین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہی کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (ہمارے نزدیک ہر ایک کے لیے مقام معین ہے)۔ پس مراتب غیر متناہیہ کی طرف ترقی نار عشق کے سبب ہوتی ہے اور وہ انسان کے خصائص میں سے ہے۔ اور جو کچھ میں نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے کلام سے استفادہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ امانت سے مراد تجلیات ذاتیہ دائمہ کو قبول کرنے کی وہ استعداد ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ماہیت میں ودیعت فرما رکھی ہے۔ کیونکہ جن اگرچہ ایمان لانے اور اعمال صالحہ کرنے کے سبب ملائکہ سے مل سکتے ہیں اور ان میں تجلیات صفاتیہ کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو سکتی ہے لیکن تجلیات ذاتیہ صرف وہی برداشت کر سکتا ہے جس کا مزاج خاکی ہو۔ اور یہی تجلی ذات کو قبول کرنے کی استعداد ہی (انسان کے لیے) خلافت کو ثابت کرنے والی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حضرت آدم علیہ السلام کے حق میں جو یہ ارشاد فرمایا اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اس میں علم سے مراد یہی استعداد ہے۔ یعنی تم جان لو کہ تجلی ذاتی کو وہ برداشت نہیں کر سکتا جس کا مزاج خاکی نہ ہو۔ اور اسی طرف اپنے اس ارشاد میں بھی اشارہ فرمایا۔

۲۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ انسان میں ایسی قوائے سبعیہ ودیعت فرما دی گئی ہیں جو اسے تفوق اور بلندی کی طرف دعوت دیتی ہیں اور اس کے لیے بلند سے بلند تر مراتب معرفت کی طرف ترقی کرنے کا تقاضا کرتی ہیں۔ جہول سے مراد وہ قوائے بہیمیہ ہیں جو انسان میں یہ طاقت پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ عبادت وریاضت کی مشکلات کو برداشت کر سکتا ہے۔ اور وصال محبوب کی طلب میں عاشق کے لیے ریاضات شاقہ برداشت کرنا ضروری ہیں۔ پس اس طرح ظلوم وجہول انسان کے لیے مستحق خلافت ہونے کی علت ہیں اور یہ اس کے لیے اچھی اور قابل تعریف صفات ہیں۔ اور یہ دونوں قوتیں (قوۃ سبعی اور قوۃ بہیمی) زمین سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ مادۂ زمین اپنی کمال کثافت کے سبب تجلی ذاتی کو برداشت کر لیتا ہے جیسا کہ اجرام ارضیہ اپنی کثافت کے سبب سورج کے نور سے منور ہوتے ہیں بخلاف اجرام لطیفہ کے (کہ وہ اس نور سے منور نہیں ہوتے، یعنی وہ اسے اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے) اور ملائکہ

مقربین اپنے مقامات اور ولایتوں میں محصور ہیں۔ اگرچہ ان کی ولایت انبیاء علیہم السلام کی ولایت سے اوپر ہے کیونکہ ان کی ولایت صفات من حیث البطون سے مستفاد ہے، یعنی اس حیثیت سے کہ صفات کا قیام اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی ولایت صفات من حیث الظهور سے مستفاد ہے، یعنی فقط اس حیثیت سے کہ وہ صفات ہیں اس حیثیت سے نہیں کہ ان کا قیام ذات کے ساتھ ہے۔ اور اسی اعتبار سے یہ صفات تعینات عالم کی مبادی کے لیے مبادی ہیں۔ لیکن ملائکہ کا اس تجلی ذات میں کوئی حصہ نہیں جو کہ کمالات نبوت میں سے ہے۔ اسی وجہ سے نبوت انسانوں کے ساتھ مختص ہے اور انبیاء علیہم السلام کے خواص ملائکہ کے خواص سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ اور جنت انسانوں کے لیے ہے اور ملائکہ ہر دروازے سے ان کے احترام کے لیے داخل ہوں گے۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ امانت سے مراد احکام شرعیہ ہیں اور اسے اٹھانے سے مراد انہیں اختیار کے ساتھ قبول کرنا ہے تو ان کے نزدیک اس جملے یعنی انه كان ظَلُوْماً جَهُوْلًا کا معنی یہ ہوگا کہ انسان ایسے بوجھ کو اٹھا کر جو اس کے لیے انتہائی شاق اور بھاری ہے اپنے اوپر ظلم کرنے والا ہے اور امانت کو ادا نہ کرنے کے سبب اسے جو عذاب ہوگا اس انجام سے ناواقف ہونے کے سبب وہ جہول ہے۔ تو اس اعتبار سے بھی (ان صفات کے بیان میں) انسان کے لیے مذمت نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت اور امر واقعی کا بیان ہے۔ اور علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ یہ آیت سابقہ وعدے کی تائید و تقریر کے لیے ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ یہ امانت اتنی عظیم الشان اور اعلیٰ ہے کہ اگر ان بڑے بڑے عظیم اجسام کو بھی باشعور اور ذی عقل فرض کر لیا جائے تو یہ اسے اٹھانے کی طاقت نہ رکھتے بلکہ انسان نے اپنے نحیف و کمزور جسم کے باوجود اسے اٹھا لیا ہے۔ پس جو اس امانت کے حقوق ادا کرے گا تو وہ دونوں جہاں کی بھلائیاں اور منافع حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔ اس وضاحت کے مطابق آپ کے نزدیک إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْماً کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نے امانت ادا کرنے کا وعدہ پورا نہیں کیا اور اس کے حقوق کو ادا نہیں کیا (اس اعتبار سے یہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے) اور جہول اس اعتبار سے ہے کہ یہ امانت ادا نہ کرنے کے انجام کی حقیقت و کُنہ سے ناواقف ہے۔ لہٰذا یہ دونوں جنس انسان کے وصف ہیں لیکن اس میں اعتبار اعم اور اکثر افراد کا ہے (تمام افراد کا نہیں کیونکہ بعض افراد مثلاً انبیاء، اولیاء اور متقی مومنین نے تو امانت کا وعدہ وفا کیا ہے)۔

صاحب بحر المعراج نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ انسان ظلوم اس اعتبار سے ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اس امانت کے ادا کرنے پر قادر گمان کیا ہے جس امانت نے آسمانوں اور ان جیسے دیگر اجرام کو خوفزدہ کر دیا۔ اور پھر اسے ادا نہیں کیا اور انسان جہول اس اعتبار سے ہے کہ وہ امانت کو ادا کرنے سے اپنے عاجز ہونے سے ناواقف تھا۔ یہ تاویل میرے نزدیک پسندیدہ نہیں کیونکہ امانت کو اٹھانے والے حضرت آدم علیہ السلام تھے اور الانسان سے مراد آپ ہی کی ذات گرامی ہے۔ اور آپ تو نبی تھے اور معصوم تھے آپ نے جو بوجھ اٹھایا اسے پورا پورا ادا کیا۔ اور إنَّهُ کی ہ ضمیر کا مرجع وہی ذات ہے جس نے بار امانت کو اٹھایا یعنی حضرت آدم علیہ السلام۔ صوفیہ نے کہا ہے کہ انسان اپنے اکثر افراد کے اعتبار سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے کیونکہ انسان کے اکثر افراد نے معرفت الٰہی اور تجلیات ربانی کو قبول کرنے کی استعداد ضائع کر دی ہے جو اللہ تعالیٰ کی فطرت ہے اور اسی فطرت پر اس نے تمام لوگوں کو پیدا فرمایا ہے۔ اور اکثر افراد جہول اس اعتبار سے ہیں کہ ان سے جو نعمت ضائع ہوگئی وہ اس کی خوبی اور عظمت و شان سے ناواقف ہیں اور جو کچھ انہوں نے حاصل کیا اس کے قبیح انجام کو وہ نہیں جانتے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی بچہ نہیں مگر وہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ الحدیث متفق علیہ (1)۔ اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

1۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 333 (قدیمی)

میں کہتا ہوں کہ جب تو نے یہ سن رکھا ہے کہ ظلم قوت سبعیہ (قوت غضبیہ) سے کفایہ ہے اور جہل قوت بہیمیہ (قوت شہوانیہ) سے اور ان دونوں قوتوں کے حسن و قبح کا اظہار ان کے متعلق اور مصرف کے اعتبار سے ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اگر قوت سبعیہ کا استعمال دین کے دشمنوں مثلاً شیطان وغیرہ کو دور بھگانے کے لیے کیا جائے اور بلند مرتبہ کے حصول اور مدارج قرب میں ترقی کرنے کے لیے یہ قوت استعمال کی جائے تو یہ انتہائی حسین اور اچھی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (بے شک اللہ تعالیٰ انہیں پسند کرتا ہے جو اس کے راستے میں صف بند ہو کر قتال کرتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے)۔ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ بلند ہمت لوگوں کو پسند فرماتا ہے۔ اور اگر اسی قوت کا استعمال بے گناہ اور بے قصور لوگوں پر ظلم و ستم ڈھانے کے لیے کیا جائے اور رب العالمین کے مقابلہ میں تکبر و تعلی کے اظہار کے لیے کیا جائے تو پھر یہی قوت قبیح اور بری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ (خبردار! ظلم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے)۔ اور اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (بے شک اللہ تعالیٰ ہر تکبر کرنے والے اور شیخی بھگارنے والے کو پسند نہیں کرتا)۔

اسی طرح قوت بہیمیہ بھی اگر حصول سعادت کے لیے صرف کی جائے تو اچھی ہے اور اگر فقط لذات کے حصول کے لیے استعمال کی جائے تو قبیح ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اس کو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا) اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں قوتوں کے استعمال کے حسن کا انحصار تزکیہ نفس و قلب اور طہارت عناصر پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک بنی آدم کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا جسم درست ہوتا ہے اور جب وہ خراب ہوتا ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ خبردار! غور سے سن لو وہ ٹکڑا دل ہے۔ رواہ البخاری۔(1)

رب کریم نے ارشاد فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (یقیناً فلاح پا گیا جس نے (اپنے) نفس کو پاک کر لیا اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں دبا دیا) اور احکام شرعیہ کی اتباع و پیروی تزکیہ نفس کا سبب اور ذریعہ ہے پس اگر امانت سے مراد احکام شرعیہ ہوں تو اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا اس علت کی طرف اشارہ ہے جس کے سبب انسان پر بار امانت ڈالا گیا اور اس نے اس امانت کو اٹھا لیا۔ پس معنی یہ ہوگا کہ انسان کے ظلوم و جہول ہونے کی وجہ سے ہم نے اس پر امانت پیش فرمائی اور آدم علیہ السلام نے اسے اٹھا لیا تاکہ اس کے سبب انسان رذیل اور ناپسندیدہ خصلتوں سے پاک ہو جائے، فضائل و کمالات حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور دونوں جہان میں قابل ستائش اور کامیاب ہو جائے۔ اور اگر امانت سے مراد تجلیات ذاتیہ ہوں تو ظَلُوْمًا جَهُوْلًا اس طرف اشارہ ہے کہ انسان ہی اس امانت کے اہل تھے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ کیونکہ اس امانت کو اٹھانے کا تصور اسی کے بارے کیا جا سکتا ہے جس میں یہ دونوں اوصاف موجود ہوں اور علاوہ ازیں اس میں حواس اور موٹی بھی ہوں۔ مذکورہ بالا دونوں تقدیروں پر یعنی چاہے امانت سے مراد احکام شرعیہ ہوں یا امانت سے مراد تجلیات ذاتیہ ہوں جب مذکورہ دونوں قوتوں کا استعمال تزکیہ نفس کے لیے نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی جانب سے تائید اور مدد حاصل نہ ہو اور ان دونوں قوتوں کو باطل میں ہی مصروف رکھا گیا ہو تو یہ دونوں باعث عذاب ہیں۔ اور اگر ان کا استعمال تزکیہ نفس کے لیے ہو۔ تائید ربانی حاصل ہو اور ان دونوں کو حق اور سچ میں ہی مصروف رکھا جائے تو یہ موجب رحمت و ثواب ہیں۔ اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ دونوں قوتیں طبع انسان میں اس لیے ودیعت فرمائی گئی ہیں کہ یہ انسان پر بار امانت

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 13 (وزارت تعلیم)

ڈالنے اوراس بوجھ کو اٹھانے کی علت ہیں۔

لِیُعَذِّبَ پر لام عاقبت کے لیے ہے جیسا کہ اس قول میں ہے لِدُوْا لِلْمَوْتِ وَابْنُوْا لِلْخَرَابِ (موت کے لیے جنم دو اور خرابی کے لیے بناؤ) یعنی ولادت کا انجام موت ہے اور تعمیر کا انجام ویرانی ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ عذاب دے نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں کو اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو۔ کیونکہ یہی امانت کو ضائع کرنے والے ہیں اور ظلم ولذات میں منہمک ہیں۔ اور نگاہ لطف وکرم فرمائے اللہ تعالیٰ ایمان والوں اور ایمان والیوں پر۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت، مغفرت، مراتب قرب کے انتخاب اور عطا کے لیے اہل ایمان کی طرف توجہ فرمائے کیونکہ اہل ایمان ہی امانتوں کو ادا کرنے والے ہیں اور تجلیات الٰہیہ میں مستغرق ہیں۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے امانت پیش کی یعنی احکام شرعیہ یا وہ استعداد جو انسان میں ودیعت کی گئی ہے تاکہ منافق کا نفاق اور مشرک کا شرک ظاہر ہو جائے اور اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دے۔ اور مومن کا ایمان ظاہر ہو جائے (1)۔ (میں کہتا ہوں عارف کا نور عرفان ظاہر ہو جائے) تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت ومغفرت کی توجہ فرمائے اگر ان میں سے کسی اطاعت کی ادائیگی میں سستی او غفلت ہو جائے۔ میں کہتا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی دائمی ذاتی تجلیات نازل فرمائے اور انہیں بغیر حجاب کے اپنا بلا کیف وصال عطا فرمائے۔ اور وعدہ کے مقام پر توبہ کا ذکر اس طرف اشارہ ہے کہ چونکہ انسان اپنی فطرت وجبلت کے اعتبار سے ظلوم وجہول ہے اس لیے وہ کچھ نہ کچھ غفلت اور کمزوری سے خالی نہیں رہ سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ مومنین کو بہت بخشنے والا ہے، ان کی غفلتوں اور خطاؤں کو معاف فرما دیتا ہے، ہر دم ان پر رحم فرمانے والا ہے، اپنے خاص فضل واحسان سے اہل ایمان کی اطاعتوں پر ثواب عطا فرمائے گا اور ان پر اپنی تجلیات وبرکات کی بارش نازل فرماتا ہے۔

الحمد للّٰہ رب العالمین والعاقبة للمتقین۔ ربنا علیک توکلنا والیک انبنا والیک المصیر

اللہ تعالیٰ کے خاص فضل واحسان سے سورۂ احزاب کا ترجمہ آج مورخہ 3 اپریل 2000ء بروز پیر شام آٹھ بجے اپنے اختتام کو پہنچا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 231 (التجاریہ)